پی ایم ایس
پاکستان سٹڈیز
برائے:
پی ایم ایس، سی ایس ایس و دیگر مقابلے کے امتحانات
ایم اکرام ربانی
کاروان بک ہاؤس، لاہور
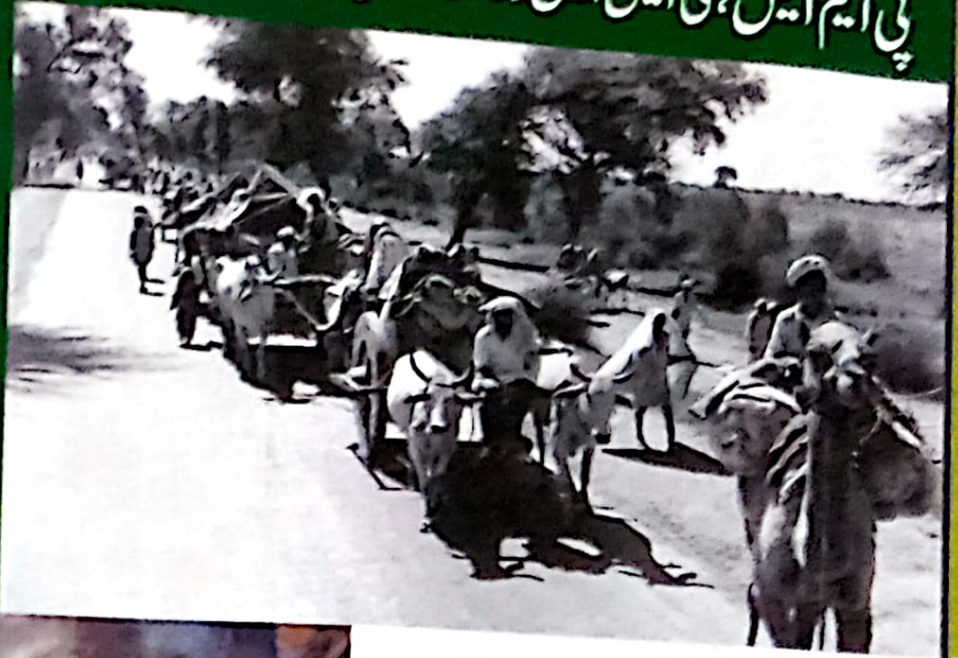
فہرست

باب نمبر 1

نظریہ پاکستان

قیام پاکستان کے اغراض ومقاصد

1947ء میں قیام پاکستان کے ساتھ ہی مسلمانوں کی ایک عظیم اور خود مختار سلطنت معرض وجود میں آئی جس کے ساتھ ہی مملکت اسلامیہ کے قیام اور فروغ کا آغاز ہوا۔ پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم قربانیوں اور جدوجہد کا ثمرہ تھا جو انہوں 1857ء سے لے کر 1940ء تک کی اور بالاخر اپنی منزل کو پالیا۔

برصغیر پر انگریزی حکومت کا اقتدار قائم ہوتے ہی مسلمان جو کبھی ہندوستان کے حکمران تھے اپنے اعلیٰ منصب سے گر گئے اور ایک قوم کی حیثیت سے ان کا زوال شروع ہوگیا 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر ترقی کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے اور ہندوستان کی ایک عظیم قوم اپنا ملی اور قومی تشخص کھو چکی تھی۔ مسلمان انگریزی حکومت کی ظالمانہ پالیسی اور ہندو کی ازلی مسلمان دشمنی کی بناء پر معاشرے میں باعزت مقام کھو چکے تھے اور ذلت آمیز زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اپنا اقتدار اور قومی مقام چھن جانے کا انتہائی دکھ تھا جسے دوبارہ حاصل کرنے کی تڑپ ان کے دلوں میں زندہ تھی۔ مسلمانوں نے اپنے قومی وقار کی بحالی کے لئے حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، سرسید احمد خانؒ، اور کئی دوسرے جید اکابرین کی قیادت میں اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور آزادی کے لئے جنگیں لڑیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی لڑی گئی اور اس کے بعد تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ کو زندہ رکھا جسے علامہ اقبال اور قائداعظم نے منزل مقصود تک پہنچایا۔

1906ء میں مسلم لیگ کے معرض وجود میں آجانے کے ساتھ ہی مسلم تحریک آزادی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ مسلم لیگ نے سرسید احمد خان کی چلائی ہوئی تحریک آزادی کو آگے بڑھایا اور مسلمانوں کی ان کی آخری منزل تک رہبری ورہنمائی کی۔ قائداعظم کی بے باق قیادت میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی قندیل کو روشن رکھا اور بالاخر 1947ء کو انہیں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کیا۔

برصغیر کے مسلمانوں نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیوں کیا؟ وہ کیا محرکات تھے جن کی بناء پر برصغیر کے مسلمان صدیوں تک ہندوؤں کے ساتھ رہنے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ متحدہ ہندوستان میں ان کا مستقبل مخدوش ہے اور ایک قوم کی حیثیت سے وہ کبھی بھی متحدہ ہندوستان میں ترقی نہ کر سکیں گے؟ ذیل میں ان محرکات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی کا موجب بنے۔

ہندو اکثریت کا خوف

1۔ متحدہ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں ہونے کی بناء پر زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے تعلیمی میدان میں ہندو اپنی انگریز نواز پالیسی کی بناء پر بہت ترقی کر گئے تھے اور مسلمان انگریزوں سے نفرت کی بناء پر بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ معاشی لحاظ سے ہندو مسلمانوں سے بہت آگے تھے حکومت کی پالیسی اور ہندو نواز اقدامات کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی حالت بہت دگرگوں

تھی۔ ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر ... تھے۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی تمام جائیدادیں قرق کر لی گئی تھیں اور حکومت کی اعلیٰ ملازمتوں سے انہیں نکال دیا گیا تھا۔ ان اقدامات کی وجہ سے مسلمان کسمپرسی کا شکار تھے اور معاشی لحاظ سے بالکل تباہ حال ہو چکے تھے۔ کسی بھی قوم کو ختم کرنے کے لئے اس کی معاشی حالت کو ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ انگریزوں نے ہندوؤں کی ملی بھگت سے ایسی پالیسی اختیار کی جس سے مسلمان معاشی طور پر تباہ ہو گئے۔ اگر متحدہ ہندوستان ان حالات میں آزاد ہو جاتا جہاں معاشرے کے ہر شعبے میں ہندوؤں کی اجارہ داری ہوتی تو مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاتے۔

2۔ ہندوؤں کا متعصبانہ رویہ

برصغیر میں ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کی جانب متعصبانہ رویہ روا رکھا۔ ہندو کبھی یہ برداشت کرنے کیلئے تیار نہ تھے کہ مسلمان زندگی کے کسی شعبے میں ترقی کریں۔ ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کے جائز سیاسی اور معاشی حقوق کو غصب کئے رکھا۔ تقسیم بنگال، اردو ہندی تنازعہ اور ہندوستان میں چلائی گئی شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں ہندوؤں کے متعصبانہ رویہ کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ ہندوؤں نے انگریزوں کی ملی بھگت سے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے سے نکالنے کی پالیسی اپنائے رکھی۔ ہندوؤں کے اس متعصبانہ رویہ نے بھی مسلمانوں کے دلوں میں خدشات پیدا کئے اور وہ اپنے لئے علیحدہ وطن کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

3۔ دوقومی نظریہ

قیام پاکستان اور مسلمانوں کی تحریک آزادی کی سب سے بڑی وجہ دوقومی نظریہ تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمان ہر لحاظ سے ایک منفرد اور علیحدہ قوم ہیں۔ مسلمانوں کے قائدین ہمیشہ مسلمانوں کو علیحدہ اور منفرد قوم کہتے رہے کیونکہ مسلمان کا مذہب اسلام ہے جو کسی دوسرے مذہب یا نظام میں مدغم نہیں ہوسکتا۔ اس لحاظ سے مسلمان ہمیشہ ایک علیحدہ قوم رہے ہیں۔ سرسید احمد خان، اور قائداعظم نے مسلمانوں کو ہمیشہ علیحدہ قوم سمجھا۔ سرسید احمد خان اور قائداعظم ایک خاص دور میں ہندو مسلم اتحاد کے داعی رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے ان دونوں قوموں کو کبھی ایک قوم نہ سمجھا۔

قوم اور قومیت کے الفاظ لاطینی زبان کے ایک لفظ Nation سے لئے گئے ہیں۔ جس کے معنی پیدائش یا نسل کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قوم سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایک ہی نسل سے پیدا ہوئے ہوں اور خونی رشتے نے ان میں اتحاد واتفاق پیدا کر دیا ہو۔

برجس نے قوم کی تعریف یوں کی ہے کہ:

"قوم ایک ایسی آبادی ہے جس کا ادب، زبان، روایات، تاریخ، رسوم غلط اور صحیح نظریات کا مفہوم مشترک ہو"۔

Barker نے قوم کی تعریف یوں کی ہے:

"قوم ایسے افراد کا گروہ ہوتا ہے جو ایک معین علاقے میں آباد ہو اور جو مشترک زبان اور مشترکہ مذہب رکھتے ہوں"۔

قومیت ایک ایسے احساس اور جذبے کا نام ہے جو دو احساسات سے مل کر بنتا ہے اور لوگوں کے کسی گروہ میں ایک ہونے کا احساس پایا جاتا اور دوم دوسرے گروہوں اور لوگوں سے علیحدہ ہونے کا احساس پایا جاتا ہو۔

قوم اور قومیت کی مندرجہ بالا تعریفوں کے پیش نظر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ برصغیر کے مسلمان ہر لحاظ سے ایک قوم تھے اور انہیں اپنے علیحدہ اور منفرد قوم ہونے کا پورا احساس تھا۔ اپنے علیحدہ قوم ہونے کا احساس ہی مسلمانوں کے دلوں میں علیحدہ وطن

حاصل کرنے کا موجب بنا کیونکہ مسلمانوں کیلئے ہندوستان میں ہندو اکثریت کے ساتھ ان کا قومی مستقبل کوئی نہیں تھا۔لہٰذا اپنے قومی اور ملی وجود کی بقاء کے لئے مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ ناگزیر تھا۔

نظریہ پاکستان۔تعریف وتوضیح

نظریہ پاکستان کی تعریف کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

''پاکستان تو اسی دن معرض وجود میں آ گیا تھا جب پہلا ہندوستانی باشندہ مسلمان ہوا تھا''۔

قائداعظم کا یہ ارشاد نظریہ پاکستان کو واضح کر دیتا ہے اور یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ نظریہ پاکستان کی بنیاد دراصل اسلام ہے اور اسلام ہی وہ نظریہ اور قوت تھی جو پاکستان کی تحریک کا باعث بنی۔نظریہ پاکستان کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

1. نظریہ پاکستان کا اولین مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے آپ کو ایک قوم کی حیثیت سے اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع میسر آسکیں تا کہ وہ غیر اسلامی روایات اور اصولوں سے بچے رہیں اور اسلامی اصولوں کو پوری طرح رائج کر سکیں۔
2. نظریہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کیلئے علیحدہ وطن کا حصول ہے جہاں پر ملت اسلامیہ کے قیام اور فروغ کیلئے جدوجہد کی جاسکے اور جہاں اسلامی اصولوں کو جاری کیا جاسکے۔
3. نظریہ پاکستان اور اسلامی نظریہ کے ایک ہی معنی ہیں۔نظریہ پاکستان کا بنیادی مطلب اسلام کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانا ہے اور لوگوں کی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہے۔
4. نظریہ پاکستان مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق کے تحفظ اور مسلمانوں کی اپنے حقوق کے حصول کیلئے جدوجہد کا نام ہے۔نظریہ پاکستان کا مقصد ایک ایسا اسلامی معاشرہ تشکیل کرنا ہے جہاں پر رہنے والوں کو اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع میسر آسکیں۔
5. نظریہ پاکستان کا مطلب مسلمانوں کا غیر مسلموں کے غلبہ سے آزادی حاصل کر کے اپنی زندگی کو اسلامی اُصولوں کے مطابق استوار کرنا ہے۔
6. نظریہ پاکستان کا مطلب توحید الٰہی کی بنیاد پر قوم کی تشکیل کر کے وطن یا نسل کی اساس پر قائم کرنے والی ریاست یا قوم کی نفی کرنا ہے۔

نظریہ پاکستان کا ارتقاء

برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے پہلے مسلمانوں کی حکومت قائم تھی اور مسلمان زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے۔شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں انگریز ایک تاجر کی حیثیت سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔انہوں نے جلد ہی اس چیز کو بھانپ لیا کہ ہندوستان میں پاؤں جمانے کے لئے مسلمانوں کی قوت کو ختم کرنا ہوگا۔

اورنگ زیب کے بعد مسلمانوں کا زوال شروع ہوا تو انگریز نے آہستہ آہستہ حکومت کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور جلد ہی بنگال میں اپنے پاؤں جمالئے۔اورنگ زیب کے بعد مغلیہ خاندان کے جانشین نااہل ثابت ہوئے جس کا انگریزوں نے فائدہ اُٹھایا۔دوسری طرف ہندو بھی مسلمانوں کا اقتدار پسند نہ کرتے تھے اور مسلمانوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ہندوؤں نے انگریز کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور اس طرح ہندوؤں کی ملی بھگت سے انگریز ہندوستان پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد پورے ہندوستان میں انگریز راج قائم ہو چکا تھا اور مسلمان جو کبھی ہندوستان کے حکمران تھے اپنا اقتدار کھو چکے تھے۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہونا شروع ہوا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنے اقتدار کیلئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہوئے صفحہ ہستی سے مٹانے کی پالیسی اختیار کی جس میں ہندوؤں نے انگریز کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ مسلمانوں کے خلاف انتہائی ظالمانہ پالیسی اختیار کی گئی اور انہیں ایک قوم کی حیثیت ختم کرنے کیلئے ان کی معاشی حالت کو تباہ کر دیا گیا۔

جب تک مسلمانوں کا اقتدار قائم رہا مسلم معاشرہ اور تہذیب و تمدن بھی محفوظ رہا اور مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرتے رہے لیکن مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندوستان کی تمام قومیں مسلمانوں کے درپے ہو گئیں اور انہیں ہندستان سے ختم کرنے کے لئے متحد ہو گئیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کے اندر اپنے علیحدہ اور منفرد قومی و ملی وجود کی بقا اور بحالی کا جذبہ پیدا ہوا مسلمان نئی صورت حال سے سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ تھے انہیں اپنے اقتدار کے چھن جانے اور اپنی تہذیب و تمدن کے زوال پر انتہائی قلق تھا اس جذبے نے مسلمانوں کی کئی تحریکوں کو جنم دیا اور انہوں نے اپنے جید اکابرین اور علماء کرام کی قیادت میں اسلام کی بحالی کے لئے تگ و دو کا آغاز کیا۔ تحریک علی گڑھ جس کی بنیاد سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین اور مولوی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک نے ڈالی تھی مسلمانوں اور اسلام کی بحالی اور بقاء کے لئے منظم کی گئیں۔ یہی تحریکیں آگے چل کر نظریہ پاکستان کی ارتقائی منازل ثابت ہوئیں۔ اسی طرح ہندومت کی طرف سے مسلمانوں اور اسلام کو ختم کرنے کی کوششوں نے بھی مسلمانوں کو متحد کیا اور ان کے اندر ایک ایسے نظریہ کو پیدا کیا جس نے آگے چل کر نظریہ پاکستان کو جنم دیا۔ ہندوؤں نے ہندستان سے مسلمانوں کو نکالنے اور اسلام کو ایک ضابطہ حیات کے طور پر ختم کرنے کے لئے کئی تحریکیں چلائیں ان تحریکوں نے مسلمانوں کو اپنا علیحدہ ملی تشخص بحال کرنے کے لئے متحد کیا اور مسلمانوں کو اپنے منفرد وجود کی بقاء کے لئے تگ و دو کرنا پڑی جو نظریہ پاکستان کے ارتقاء میں معاون ثابت ہوئی ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ سے ایک علیحدہ قومی وجود کے حامل رہے تھے جسے قائم رکھنے کے لئے 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انہیں زیادہ جدوجہد کرنا پڑی اور بالآخر 1940ء میں مسلم لیگ نے قائداعظم کی عظیم قیادت میں علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تو نظریہ پاکستان مکمل طور پر اجاگر ہوا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی منزل کی نشاندہی کی۔

قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد

1۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نفاذ

اسلامی نظریہ کے مطابق پوری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے کہ "اللہ ہر چیز پر قادر ہے" اور اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہے، مطالبہ پاکستان اور قیام پاکستان کا بنیادی مقصد ایک ایسی ریاست کا قیام تھا جہاں پر اسلامی نظریہ کے مطابق خداوند تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کیا جا سکے اور ایسی حکومت قائم کی جا سکے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔

قیام پاکستان کے ضمن میں قائداعظم نے فرمایا:

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک قطعہ اراضی حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا بلکہ ہم ایک ایسا علیحدہ وطن چاہتے تھے جہاں ہم اسلامی اصولوں کو رائج کر سکیں"

2۔ اسلامی جمہوریت کا قیام

اسلام نے جمہوریت کا بڑا منفرد تصور پیش کیا ہے جو کہ مغربی نظریہ جمہوریت سے مختلف ہے اسلامی جمہوریت میں ہر شخص برابر

ہے اور کسی کو اس کی حیثیت کی بناء پر اعلیٰ مقام حاصل نہیں خلیفہ اپنے احکامات میں قرآن وسنت پر عمل پیرا ہوتا ہے اور زمین پر انسانوں کے سامنے اور آخرت میں اللہ کے روبرو اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہے اسلامی جمہوریت میں قوانین قرآن اور سنت کی روشنی میں مرتب کئے جاتے ہیں اور اس سے روگردانی ممکن نہیں

قیام پاکستان کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ایک ایسی ریاست قائم کی جائے جہاں پر اسلامی جمہوری نظام تشکیل دیا جائے۔ اسلامی جمہوریت میں تمام فیصلے باہمی مشورے سے کئے جاتے ہیں اور شورائیت کا نظام اسلامی جمہوریت کے لئے لازم ہے۔ مطالبہ پاکستان کا مقصد ایسی ہی ریاست کا قیام تھا جہاں پر اسلامی نظام رائج کیا جاسکے۔ قائداعظم نے فرمایا ''ہمیں اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اُصولوں اور تصورات پر رکھنی چاہئیں''۔

3۔ مسلمانوں کے قومی تشخص کی بحالی

متحدہ ہندوستان میں ہندو کی عددی اکثریت کی وجہ سے مسلمان دبے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ معاشرتی میدان میں مقابلہ نہ کرسکتے تھے۔ ہندوؤں کے متعصبانہ رویے نے مسلمانوں کے لئے ترقی کے راستے مسدود کردیئے تھے جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کا بحیثیت ایک قوم مستقبل سخت خطرے میں تھا اگر انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جاتے تو مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے محکوم ہوکر رہ جاتے اور ان کا ملی و مذہبی وجود ختم ہوجاتا ہے۔

قیام پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں کے اسی علیحدہ ومنفرد ملی و مذہبی وجود کی بقاء کیلئے کیا گیا تاکہ مسلمان پاکستان میں اپنے مذہبی اُصولوں کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو ڈھال سکیں۔

4۔ مسلمانوں کے ادب، ثقافت اور تہذیب وتمدن کا تحفظ

مسلمان ہمیشہ سے اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے کی بناء پر دوسری قوموں سے علیحدہ حیثیت رکھتے تھے مسلمانوں کا تہذیب وتمدن، ادب اور ثقافت ہی مسلمانوں کی علیحدہ پہچان تھا اور انہی وجوہات کی بنا پر مسلمان دوسری قوموں سے منفرد مقام رکھتے آئے ہیں۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے ختم کردیا جائے اور انہیں ہندو معاشرے میں مدغم کرلیا جائے۔ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کو ختم کرنے کیلئے ہندوؤں نے ہندی اردو تنازعہ کھڑا کیا اور اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی تحریک چلائی۔ اس کے علاوہ بھگتی اور سنگھٹن کی پرتشدد تحریکیں چلا کر مسلمانوں کو زبردستی ہندومت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی ان تمام اقدامات کا مطلب مسلمانوں کے ثقافتی ورثے کو ختم کرنا تھا تاکہ مسلمان بحیثیت ایک قوم ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائیں۔

مطالبہ پاکستان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان حاصل کرکے مسلمانوں کے ثقافتی اور تہذیبی ورثے کا تحفظ کیا جائے۔ مسلمانوں نے اپنے تہذیب وتمدن اور ثقافت کے تحفظ اور بقاء کے لئے ہندوؤں سے علیحدگی کا فیصلہ کیا اور پاکستان کا مطالبہ کیا۔

5۔ دوقومی نظریہ

قیام پاکستان کی اصل اور اہم ترین بنیاد دوقومی نظریہ تھا۔ دوقومی نظریئے کو مختلف ادوار میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اکبراعظم کے زمانے میں جب دین الٰہی کا فتنہ کھڑا کیا گیا جس کا مقصد اسلامی اُصولوں کو ختم کرنا تھا تو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مسلمانوں کے علیحدہ

وجود کو منوانے کے لئے بھرپور کوشش کی۔ آپ نے دین الہی کی فتنہ پروری کو لوگوں پر واضح کیا اور انہیں اس غیر اسلامی دینی فلسفے کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ اگرچہ آپ نے دوقومی نظریئے کی اصطلاح استعمال نہیں کی لیکن آپ ہمیشہ مسلمانوں کے علیحدہ وجود پر زور دیتے رہے۔

سرسید احمد خان دراصل وہ پہلے راہنما تھے جنہوں نے دوقومی نظریئے کی اصطلاح پیش کی اور یہ کہا کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں آپ شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے لیکن آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو کبھی ایک قوم نہ سمجھا تھا۔ جب آپ نے مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں اور کانگریس کا رویہ دیکھا تو آپ کو بہت مایوسی ہوئی اور آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندو کبھی مسلمان کے ساتھ مخلص نہیں ہوسکتا۔ آپ نے پھر دوقومی نظریہ پیش کیا اور کہا کہ مسلمان ہمیشہ سے ایک قوم ہیں اور یہ کسی دوسری قوم میں مدغم نہیں ہو سکتے۔

سرسید احمد خانؒ کے بعد علامہ اقبال اور قائداعظم نے سرسید کے دوقومی نظریہ کو آگے بڑھایا اور مسلمانوں کی تحریک آزادی اور مطالبہ پاکستان کی بنیاد اسی نظریہ پر استوار کی۔

6۔ متعصب ہندو اکثریت سے نجات حاصل کرنا

کانگریس کے قیام کے موقعہ پر تاثر دیا گیا کہ کانگریس ہندوستان کے تمام لوگوں کی نمائندگی کرے گی جب تک کانگریس کی قیادت روشن خیال رہنماؤں کے ہاتھوں میں رہی انہوں نے مسلمانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے رکھا لیکن جب کانگریس کی قیادت متعصب رہنماؤں کے ہاتھ میں آگئی تو انہوں نے مسلمانوں کی طرف نفرت اور دشمنی کی پالیسی اختیار کی جس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کی طرف سے خدشات پیدا ہوئے جب تک ہندوؤں نے مسلمانوں کی طرف دوستی اور بھائی چارے کی پالیسی اختیار کئے رکھی مسلمان بھی ہمیشہ خوش رہے اور ہندوستان سے اپنی وابستگی کا اظہار بھی کرتے رہے جوں جوں ہندوؤں کا متعصبانہ رویہ بڑھتا گیا مسلمانوں کے دلوں میں علیحدہ وطن کا احساس زور پکڑتا گیا اور انہیں یہ یقین ہوگیا کہ متحدہ ہندوستان میں بحیثیت ایک قوم ان کا کوئی مستقبل نہیں 1937ء میں کانگریس وزارتوں نے مسلمانوں کے اس خدشے کو مزید تقویت پہنچائی اور مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئے کہ سوائے علیحدگی کے ان کے لئے ان کا کوئی راستہ نہیں۔

حصول پاکستان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی ازلی دشمنی سے نجات دلائی جائے اور ان کے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کیا جائے جہاں پر ان کے لئے ترقی کے راستے کھلے ہوں۔

7۔ متوازن معاشی نظام کا قیام

آزادی سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی حالت نہایت ابتر تھی اور مسلمان کسمپرسی کا شکار تھے۔ کاروبار اور تجارت پر ہندوؤں کی اجارہ داری قائم تھی اور حکومتی پالیسی کی وجہ سے مسلمان تجارت میں داخل ہونے سے قاصر تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد حکومت نے مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کردیئے تھے اور صرف چپڑاسیوں اور نچلے درجہ کی ملازمتوں کے لئے مسلمانوں کو اہل سمجھا جاتا تھا۔ فوج اور سول انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر ہندو فائز تھے زمینوں پر بھی ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی تمام جاگیریں ضبط کرلی گئی تھیں۔ مسلمان کاشت کار ہندو زمیندار کے ہاتھوں بالکل بے بس تھے اور انہیں زمینوں کی کاشت کے لئے ہندو مہاجن سے قرض لینا پڑتا تھا جو سود کے ساتھ واپس کرنا پڑتا تھا مسلمان تمام زندگی ہندو مہاجن کے قرض تلے دبا رہتا تھا اور قرض اتارتے اتارتے اس کی عمر تمام ہوجاتی تھی۔

ان حالات نے مسلمانوں کی معاشی حالت کو نہایت ابتر بنا دیا تھا۔ سیاسی طور پر مسلمان انگریز کے غلام تھے تو معاشی طور پر ان پر ہندو کی حکمرانی قائم تھی مسلمان انتہائی بے چارگی کی زندگی گزار رہے تھے اور ان کے سامنے کوئی مستقبل نہ تھا۔

برصغیر کے مسلمانوں کے معاشی استحصال نے بھی انہیں علیحدہ وطن کے لئے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مسلمان ایک ایسا ملک حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں پر اسلام کا معاشی نظام قائم کیا جا سکے جس میں ہر کوئی اپنی بنیادی ضروریات کے لئے خود کفیل ہو۔ پاکستان کی تعمیر وقیام کا مقصد اسلامی اُصولوں کے مطابق ایک متوازن معاشی نظام کی تشکیل تھی جہاں پر ہر شخص معاشی لحاظ سے مضبوط ہو، اور معاشرے کے کسی طبقہ کو کسی دوسرے طبقہ کا استحصال کرنے کی اجازت نہ ہو۔ اسلام کا معاشی نظام اعتدال کے اصول پر قائم ہے اور اسلام کے معاشی نظام میں اپنی ضرورت سے زیادہ دولت اپنے پاس رکھنا ناجائز ہے اسلام میں زکواۃ اور عشر کے لازمی ٹیکسوں کے ذریعہ رقوم اکٹھی کی جاتی ہیں اور انہیں معاشرے کے نادار اور ضرورت مند افراد میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تا کہ معاشرہ طبقاتی طور پر آزاد رہے۔

قائداعظم نے سٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا:

> ''مغربی دنیا صنعتی قابلیت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظام اپنایا تو ہمیں اپنے عوام کے لئے خوشحالی حاصل کرنے میں مشکلات درپیش ہوں گی ہمیں اپنی تقدیر اپنے علیحدہ اور منفرد انداز میں بنانی پڑے گی ہمیں دنیا کے سامنے ایک ایسا معاشی نظام پیش کرنا ہوگا جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی اصولوں پر قائم ہو۔''

8۔ اسلامی مملکت کا قیام

تاریخ کے ہر دور میں برصغیر کے مسلمان رہنماؤں نے یہ کوشش کی کہ برصغیر میں اسلامی نظام رائج کیا جائے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جائے جو اسلامی اُصولوں پر قائم ہو۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ، سید اسمٰعیل شہیدؒ، سید احمد شہیدؒ اور دیگر کئی مسلمان اکابرین نے اپنی زندگیوں کو اسی مقصد کے حصول کے لئے لگائے رکھا۔ شاہ ولی اللہؒ کے بعد آپ کے جانشین بھی اسی کوشش میں لگے رہے ان علماء کرام کے بعد سرسید احمد خان، علامہ اقبال اور قائداعظم نے بھی انہی کوششوں کو آگے بڑھایا اور ہندوستان میں مسلم معاشرے کے قیام کے لئے انتھک جدوجہد کی لیکن چونکہ ہندو کی ازلی اسلام دشمن سوچ کی وجہ سے متحدہ ہندوستان میں اس مقصد کا حصول ناممکن تھا اس لئے مسلمانوں نے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا جہاں وہ اپنی مرضی اور اپنے مذہب کے مطابق ایک معاشرتی نظام قائم کر سکیں۔ قیام پاکستان کا مقصد ہندو کی اسلام دشمن سوچ اور پالیسی سے نجات حاصل کر کے ایک ایسے معاشرتی نظام کا قیام تھا جہاں اسلامی مملکت اپنے مکمل رنگ میں ہو اور جہاں اسلام کے سیاسی، معاشی اور سماجی اصول کار فرما ہوں۔ مسلمان دراصل قیام پاکستان کی شکل میں اپنے اس خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے۔ جو وہ سالہا سال سے اسلامی مملکت کے قیام کے لئے دیکھ رہے تھے۔ اس خواب کی تکمیل کے لئے قائداعظم نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پاکستان کا مطلب کیا لا الہٰ الا اللہ کا خوش آئند نعرہ دے کر مسلمانوں کو متحد کیا اور ان کے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کیا۔

نظریہ پاکستان اور علامہ اقبال

علامہ اقبال ایک عظیم فلسفی شاعر تھے۔ آپ نے مغربی تعلیم بھی حاصل کی۔ انگلستان سے آپ نے قانون کی ڈگری لی۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیئے۔ آپ نے اسلام کے نظام حیات کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور اسلام سے آپ کو گہرا شغف تھا۔ آپ نے اسلامی اور مغربی تہذیب کا موازنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ انسانیت کی بھلائی اور نجات اسلام کے سنہری اُصولوں کو اپنانے میں ہے۔

بنیادی طور پر آپ شاعر وکیل اور استاد تھے۔لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے آپ کو سیاست کے میدان میں آنا پڑا۔سیاسی میدان میں آپ کی آمد سے مسلمانوں کو بہت تقویت پہنچی۔آپ قائد اعظم کے عظیم ساتھی ثابت ہوئے اور اپنے افکار اور شاعری سے ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر ایک نئی روح پھونکی۔آپ نے اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے ہر قدم پر قوم کی رہنمائی کی اور مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کے حصول کے لئے گراں قدر کوشش کی۔آپ نے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا خواب دیکھا جسے قائد اعظم نے عملی شکل دے کر زندہ حقیقت بنا دیا۔

علامہ اقبال نے سب سے پہلے مسلمانوں کو ان کی ذہنی پراگندگی اور غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنا صحیح مقام پہچانیں۔آپ نے امت مسلمہ کے شاندار ماضی کو اُجاگر کیا اور فرمایا:

کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

1۔ نظریہ قومیت

آپ نے ملت کو مسلمانوں کی پہچان بتایا جس کی بنیاد مذہب پر ہے۔آپ نے متحدہ قومیت کے تصور کو ناقابل عمل قرار دیا اور مسلمانوں کے علیحدہ ملی و مذہبی وجود پر زور دیا۔آپ پاکستان کے حصول کو مسلمانوں کے ملی و مذہبی وجود کی بقا اور بحالی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

آپ کی شاعری سے وطن کے لئے عظیم محبت ظاہر ہوتی ہے۔آپ نے کئی نظمیں لکھیں جن سے وطن کے لئے آپ کی محبت کی نشاندہی ہوتی ہے۔آپ نے فرمایا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن ہے اس کا وہ مذہب کا کفن ہے

2۔ وطنی قومیت

علامہ اقبال نے نظریہ وطنی قومیت کو جھٹلایا اور اس کی تباہ کاریوں کو مسلمانوں پر واضح کیا۔آپ نے وطنی قومیت کے تصور کو مسترد کیا اور ملت اسلامیہ کو اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا۔آپ نے فرمایا:

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہء دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

3۔ اسلام مکمل ضابطہ حیات

حکیم الامت نے اسلام کو حقیت پسندانہ انداز میں مکمل ضابطہ حیات کہا اور اسے ایک اسلامی ریاست میں رائج کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔آپ نے ملک کی بنیاد مذہبی فلسفے پر رکھی اور یہی نظریہ پاکستان کا نظریہ کہلایا۔خطبہ آلہ آباد میں آپ نے فرمایا اسلام زندگی کی وحدت کو ختم نہیں کرتا۔اسلام میں خدا اور کائنات ،روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں ۔آپ نے دین سے علیحدہ کسی بھی سیاسی نظام کی نفی کی اور کہا کہ اسلام میں دین اور سیاست ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور دین سے علیحدہ ہو کر سیاست کا کوئی وجود

اور تصور نہیں۔آپ نے فرمایا:

نظام پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

4۔ اسلامی اتحاد

آپ نے فرمایا کہ ایک اسلامی ریاست کا انحصار اخلاقی ضابطے پر ہوتا ہے جس کی روح سے انسان کسی مخصوص خطہ ارضی سے منسلک نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک روحانی رشتے میں بندھ جاتا ہے۔آپ نے اسلامی اتحاد کے تصور کو اجاگر کیا اور فرمایا

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر

5۔ مسلمانوں کا علیحدہ وجود

علامہ اقبال برصغیر کے ہندوااور مسلمانوں کو دو علیحدہ قومیں سمجھتے تھے اور علیحدہ وطن کے حصول کو مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی تحفظ کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔آپ نے فرمایا:

''میں اس خیال کا حامی رہ چکا ہوں کہ ملک سے مذہبی امتیاز ختم ہو لیکن اب میرے خیال میں قومی شخصیت کا تحفظ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے بہتر ہے''۔

6۔ مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ

1930ھ میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ الہ آباد میں اپنا صدارتی خطبہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ان میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں اور گذشتہ ایک ہزار سال سے وہ ہندوستان میں اپنی الگ حیثیت قائم رکھے ہوئے ہیں۔ان دو قوموں کے نظریہ آزادی میں نمایاں فرق ہے اور میں واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی سیاسی کش مکش کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہر جماعت کو اپنی اپنی مخصوص قومی اور تہذیبی بنیادوں پر آزادانہ شوریٰ کا حق حاصل ہونا چاہیے۔میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔یہ الگ وجود ایک ڈومنین کی حیثیت اختیار کرے یا جمہوری ملک بنے اس سے بحث نہیں مطالبہ یہ ہے کہ اسے باقی ہندوستان سے جغرافیائی طور پر علیحدہ کر دیا جائے، مسلمانوں کی بہتری کے لئے اس سے بہتر حل کوئی مجھے نظر نہیں آتا اور یہ ہی ان کی منزل ہے۔''

خطبہ الہ آباد نے علامہ اقبال کو سیاسی میدان میں ان کا جائز مقام دیا۔اس خطبے میں آپ نے برصغیر کے مسلمانوں کی نشاندہی کی جس کی بنیاد دو قومی نظریے پر رکھی۔جو آگے چل کر قیام پاکستان کا باعث بنی۔آپ نے فرمایا برصغیر کے مسلمان ایک الگ اور منفرد قوم ہیں اور اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں،ان کا کلچر، زبان، لباس، سوچ اور مذہب سب کچھ الگ ہے۔آپ نے کہا کہ:

''کسی قوم کے مذہبی اقدار اور تہذیبی و معاشرتی اصولوں کا احترام کرنا دوسری قوموں کا فرض ہے۔چونکہ ہندوستان کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور وہ اپنی مرضی کا مقام چاہتے ہیں۔اس لئے انہیں ایک الگ قوم تصور کرتے ہوئے اپنی مرضی کا نظام چاہتے ہیں۔اس لئے انہیں ایک الگ قوم تصور کرتے ہوئے اپنی مرضی کے نظام کے تحت رہنے کا موقعہ

دینا چاہئے۔ مسلمانوں کا تہذیب و تمدن اور معاشرتی اصول بالکل مختلف ہیں اور اگر وہ انہیں اپنانا چاہیں تو اس کا انہیں پورا حق حاصل ہے۔''

علامہ اقبال نے مسلم لیگ میں شرکت اختیار کی اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے قائداعظم کے دست راست ثابت ہوئے۔ آپ نے قانون ساز اسمبلی کا انتخاب مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت میں جیتا۔ 1931ء اور 1932ء کی گول میز کانفرنسوں میں آپ نے مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ آپ نے اپنے خطبہ الہ آباد میں جو تصور اور نظریہ پیش کیا وہ جلد ہی مسلمانوں میں مقبول ہوگیا۔ 1940ء میں مسلم لیگ نے قرارداد لاہور پاس کی جس کی بنیاد علامہ اقبال کے نظریئے پر ہی رکھی گئی اور جس کی رو سے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن حاصل کیا گیا۔

نظریہ پاکستان اور قائداعظم

قائداعظم محمد علی جناح مسلمانوں کے عظیم راہنما تھے۔ جنہوں نے مسلمانوں کی ان کی آخری منزل پاکستان تک راہبری و راہنمائی کی۔ آپ نے علامہ اقبال کے دیئے ہوئے نظریہ پاکستان کو عملی جامہ پہنایا اور اس کی حقیقی روح کو انگریزوں اور ہندوؤں سے تسلیم کروایا۔

قائداعظم نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کانگریس سے کیا۔ آپ نے 1906ء میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں حصہ لیا۔ آپ کانگریس میں اس لئے شامل ہوئے کیونکہ کانگریس حق خود اختیاری حاصل کرنے کے لئے آئینی کوششیں کر رہی تھی۔ چار سال بعد آپ لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔

قائداعظم ابتداء ہی سے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے دونوں قوموں کو مل کر جدوجہد کرنی چاہئے۔ آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب تر لانے کی کوشش کی اور آپ ہی کی کوشش سے 1916ء میں معاہدہ لکھنؤ طے پایا۔ معاہدہ لکھنؤ کے بعد آپ کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا گیا۔ آپ نے دونوں قوموں کو قریب لانے اور ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر آپ ہندو قوم کے متعصبانہ رویہ سے بددل ہو گئے۔ نہرو رپورٹ کی اشاعت نے آپ کی رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور آپ کو مجبوراً مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے چودہ نکات مرتب کرنا پڑے۔

1920ء میں آپ نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

1۔ ہندو مسلم تصفیہ

گول میز کانفرنس کے دوران گاندھی کی ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے آپ کو یہ یقین ہوگیا کہ کانگریس مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دینا نہیں چاہتی اور انہیں اپنے اندر ضم کر لینا چاہتی ہے۔ 1931ء کی گول میز کانفرنس کے دوران مسلم لیگ کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ نے کہا:

> ''اب ہم ایک ایسے مقام پر آپہنچے ہیں جہاں اگر میں یہ نہ بتا دوں کہ مسلمانوں کا موقف کیا ہے تو میں اپنے فرض منصبی سے غفلت برتوں گا۔ میں کھلے الفاظ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم تصفیہ ہندوستان میں کوئی نیا دستور نافذ کرنے سے پہلے ایک ضروری اور ناگزیر اقدام ہے اور ایک بنیادی شرط ہے جب تک آپ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہ دیں جس کی بناء پر وہ حکومت ہند کے آئندہ دستور کے تحت مکمل سلامتی اور خود اعتمادی محسوس کرنے لگیں۔

جب تک آپ ان کا تعاون، خلوص اور رضا مندی حاصل نہ کریں گے اس وقت تک جو دستور بھی آپ ہندوستان کے لئے بنائیں گے چوبیس گھنٹے بھی نہ چل سکے گا۔"

ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب تر لانے کے لئے آپ نے اپنی کوششیں جاری رکھیں لیکن 1937ء کانگریس وزارتوں کے طرز عمل نے آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہندو اور کانگریس مسلمانوں کے ساتھ مخلص نہیں ہیں اور انہیں بحیثیت ایک قوم کے ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ قائداعظم نے ہندو اکثریت کو مارچ 1939ء میں یہ جواب دیا:

"تمہاری تعداد سب سے زیادہ ہی سہی۔ تم ترقی یافتہ اور مستحکم ہی سہی اور تم نے یہ سمجھا کہ سروں کی گنتی ہی آخری فیصلہ ہے لیکن میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم ہماری روح کو فنا کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہ ہوسکو گے۔ تم اس تہذیب کو کبھی نہ مٹا سکو گے اس اسلامی تہذیب کو جو ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ ہمارا نور ایمان زندہ ہے۔ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بے شک تم ہمیں مغلوب کرو۔ ہم پر ظلم وستم کرو۔ ہمارے ساتھ بدترین سلوک روا رکھو لیکن ہم ایک نتیجے پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ سنگین فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر مرنا ہی ہے تو لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔"

2۔ دوقومی نظریہ:

آپ ہندو اور مسلمانوں کو دو علیحدہ قومیں تصور کرتے تھے اور ہمیشہ مسلمانوں کو جداگانہ قوم سمجھتے تھے۔ 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے تاریخی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں درحقیقت دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو خواب و خیال ہی کہنا چاہئے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت کی تخلیق کر سکیں گے۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ میں واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں۔ اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔"

قائداعظم دوقومی نظریہ کے زبردست حامی تھے اور مسلمانوں کو ہر لحاظ سے ایک علیحدہ اور منفرد قوم سمجھتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

"قومیت کی جو بھی تعریف کی جائے مسلمان اس تعریف کی رو سے الگ قوم ہیں اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ اپنی الگ مملکت قائم کرلیں۔ مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنی روحانی، اخلاقی، تمدنی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کامل ترین نشوونما بخشیں اور اس مقصد کے لئے وہ جو طریق اپنانا چاہیں اپنائیں۔"

3۔ مسلم ملت کی بنیاد:

قائداعظم نے مسلم ملت کی بنیاد ہمیشہ اسلام پر رکھی اور قیام پاکستان کو اسلام کا بنیادی مطالبہ تصور کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

"وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔ وہ رشتہ وہ چٹان وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا ایک رسول ﷺ ایک کتاب ایک امت۔"

4۔ اسلامی جمہوریت

قائداعظم مساوات، آزادی اور جمہوری اقدار میں یقین رکھتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ مغربی نظام جمہوریت ہندوستان جیسے ملک جہاں بے شمار قومیں آباد ہیں میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ آپ نے مغربی جمہوریت کی بجائے اسلام کے اصولوں پر مبنی جمہوریت کو ملت اسلامیہ کا نصب العین قرار دیا ہے۔ آپ نے 14 فروری 1947ء کو کہا:

''ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔''

5۔ اسلام کا معاشی نظام

قائداعظم پاکستان کو ایک فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے اور یہاں پر ایک ایسا معاشی نظام تشکیل دینا چاہتے تھے جہاں ہر شخص برابر ہو اور سب کو یکساں مواقع میسر ہوں۔ آپ ایک ایسے معاشرتی نظام کو قائم کرنا چاہتے تھے جس میں کوئی طبقہ کسی دوسرے طبقے کا استحصال نہ کر سکے اور ہر فرد کو اس کی اہلیت کے مطابق روزگار کے مواقع میسر آ سکیں۔ آپ معاشی انصاف اور مساوات میں مکمل یقین رکھتے تھے اور اسلام کے دیئے ہوئے معاشی نظام کو پاکستان میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''اسلام نے ہمیں مساوات سکھائی ہے اور ہر شخص سے انصاف اور رواداری کا حکم دیا ہے۔''

آپ پاکستان میں ایک ایسا معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر استوار ہوں تاکہ مسلمان جنہوں نے پاکستان حاصل کرنے کے لئے بے پناہ قربانیاں دیں وہ اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال سکیں۔ آپ نے فرمایا:

''ہم نے پاکستان کا مطالبہ محض ایک قطعہ زمین حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا؟ بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔''

6۔ اسلام مکمل ضابطہ حیات

اسلام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''اسلام محض رسومات، روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ نہیں ہے۔ اسلام ہر مسلمان کے لئے ضابطہ حیات بھی ہے جس کے مطابق وہ اپنی روزمرہ زندگی اپنے افعال و اعمال اور حتیٰ کہ سیاست اور معاشیات اور دوسرے شعبوں میں بھی عمل پیرا ہے۔ اسلام سب انسانوں کے ساتھ انصاف، رواداری، شرافت ، دیانت اور عزت کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہے۔ صرف ایک خدا کا تصور اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اسلام میں انسان انسان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مساوات، آزادی اور اخوت اسلام کے اساسی اصول ہیں۔''

7۔ اقلیتوں کا تحفظ

قیام پاکستان کے بعد آپ نے پاکستان کے عوام کو یہ تلقین کی وہ پنجابی، بلوچی، سندھی اور پٹھان کے جھگڑوں میں نہ پڑیں بلکہ اپنے آپ کو اول تا آخر مسلمان اور پاکستانی سمجھیں۔ آپ نے پاکستان میں رہنے والی اقلیتوں کو مکمل تحفظ کا یقین دلایا اور کہا کہ پاکستان میں ہر ایک کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے گا کیونکہ اسلام نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔

پاکستان کے مستقبل کے بارے میں آپ نے یہ کہا کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ختم ہو جائے گا وہ سخت بھول میں ہیں۔ پاکستان قائم رہنے کے لئے وجود میں آیا ہے اور انشاء اللہ قائم و دائم رہے گا۔

8۔ پاکستان مسلمانوں کی منزل

کانگریس کی سیاست نے مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں ترقی اور باعزت زندگی کے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے۔ قائداعظم نے بجا طور پر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کو اپنا محکوم بنانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آپ نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی سے نجات دلا کر رہیں گے۔ اس مقصد کے لئے قائداعظم نے پاکستان کو اپنی منزل مقصود بنا لیا تھا۔ 1940ء میں مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

''ہم نے قطعی طور پر پاکستان کو اپنی منزل مقصود بنا لیا ہے اور ہم اس کے لئے لڑنے مرنے کو تیار ہیں۔''

9۔ اسلام کی بقاء کے لئے پاکستان ناگزیر تھا

اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے۔ متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اسلامی طرز زندگی اپنا سکیں۔ لہٰذا اسلام کو زندگی کے ہر شعبے میں لاگو کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کا اپنا علیحدہ آزاد وطن ہو جہاں پر اسلام کے اصولوں کو اپنایا جا سکے۔ قائداعظم نے فرمایا:

''ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا کہ ہم مسلمان تھے اور مسلمان رہنا چاہتے تھے اس لئے ایک خطہ زمین کی ضرورت تھی جہاں ہم اپنی زندگیوں کو اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق ڈھال سکیں۔''

باب نمبر 2

نظریہ پاکستان کا تاریخی پہلو

ملی و اصلاحی تحریکیں

introduction

پاکستان کا وجود عظیم اور بے مثال جدو جہد کا مرہون منت ہے۔ پاکستان 1947ء میں طویل جدو جہد آزادی کے بعد ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا۔ نظریہ پاکستان مکمل طور پر تو 1940 میں اجاگر ہوا لیکن اس کے تصور کی تشکیل صدیوں سے جاری تھی۔ جس طرح قائداعظم نے فرمایا:

''کہ پاکستان تو اسی دن معرض وجود میں آ گیا تھا جس روز پہلا ہندوستانی باشندہ مسلمان ہوا تھا۔''

قائداعظم کے اس ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کا وجود دراصل اسلامی نظریہ پر قائم ہوا اور برصغیر میں اسلام کے ظہور پذیر ہوتے ہی پاکستان کی تحریک شروع ہوگئی۔ جوں جوں برصغیر میں اسلام ایک نظام حیات کے طور پر مقبول ہوتا گیا توں توں مسلمانوں کی تحریکیں زور پکڑتی گئیں جو بالآخر 1947ء میں پاکستان کی شکل میں اپنی منزل مقصود کو پہنچیں۔ ذیل میں اس ارتقائی عمل کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کے حصول کا باعث بنا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد

Point # 01

اسلام برصغیر کے باشندوں کے لئے کوئی اجنبی شے نہ تھی۔ برصغیر میں عرب تاجروں کی آمد کا سلسلہ طلوع اسلام سے کئی ہزار سال پہلے شروع ہوگیا تھا۔ ظہور اسلام سے قبل برصغیر کے باشندوں کے عربی باشندوں سے روابط چلے آتے تھے جنہیں اسلام کے ظہور کے بعد مزید تقویت ملی۔ مسلمان تاجر اور عرب ملاح ہندوستان کے ساحل تک اپنی تجارتی اشیاء لے کر آتے تھے۔ ان کے بحری جہاز ہندوستان، انڈونیشیا اور ملائشیا کے ساحلی علاقوں تک تجارت کی غرض سے آتے تھے۔ عرب تاجروں کی ہندوستان میں آمد دن بدن بڑھتی گئی۔ جس کی وجہ سے مسلمان اور ہندوستان کے باشندوں کے درمیان واسطہ ناگزیر تھا۔ ان میں سے کچھ افراد نے جنوبی ہندوستان کے ساحلی علاقے میں مستقل قیام گاہیں بنالیں اور سکونت ترک کر کے ہندوستان میں آباد ہو گئے۔

مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور اپنے حسن اخلاق سے یہاں کے باشندوں کو بہت متاثر کیا۔ مسلمان اپنے تجارتی کاموں کے لئے جہاں بھی جاتے اسلام کی تبلیغ کرتے اور نبی کریم ﷺ کا پیغام پہنچاتے تھے۔ برصغیر میں مسلمان تاجروں نے اسلام کی روشنی پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مسلمانوں کی حق گوئی اور اعلیٰ تجارتی اصولوں نے یہاں کے باشندوں کو بہت متاثر کیا اور بہت سے مقامی لوگ اسلام کے حلقے میں آ گئے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام کے حلقہ میں شامل ہونے والا کرنگ نور کا ہندو راجہ تھا جو ایک تبلیغی جماعت کے سربراہ کی دعوت پر حلقہ بگوش اسلام ہوا۔

تبلیغی جماعت کے سربراہ

Sheikh Sharaf Bin Malik

محمد بن قاسم کا حملہ

بنو امیہ کے دور میں سندھ پر ہندو راجہ داہر کی حکومت تھی جو نہایت ظالم اور سفاک حکمران تھا۔ راجہ داہر مسلمانوں کا سخت مخالف تھا۔ اسی دور میں لنکا کے راجہ نے عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کے لئے جہازوں میں تحائف ارسال کئے۔ ان جہازوں میں ان مسلمانوں کے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں بھی سوار تھیں۔ جو لنکا میں وفات پا چکے تھے۔ جب یہ جہاز سندھ میں دیبل کی بندرگاہ کے قریب پہنچے تو انہیں بحری قزاقوں نے لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔ جیل میں سے ایک بیوہ عورت نے حجاج بن یوسف کو مدد کے لئے پکارا۔ حجاج بن یوسف نے راجہ داہر سے عورتوں اور بچوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جسے راجہ داہر نے رعونت سے ٹھکرا دیا اور کہا کہ اگر حجاج بن یوسف میں ہمت ہے تو خود آ کر چھڑا لے۔

حجاج بن یوسف نے سندھ پر فوجی کارروائی کا حکم دیا۔ پہلے جو دو مہمیں روانہ کی گئیں وہ ناکام رہیں اور ان کے سردار بھی شہید ہو گئے۔ سندھ پر بھرپور چڑھائی کے لئے حجاج بن یوسف نے اپنے سترہ سالہ بھتیجے محمد بن قاسم کا انتخاب کیا۔

محمد بن قاسم 712ء میں سندھ پر حملہ آور ہوا۔ کئی روز کی لڑائی کے بعد محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کر لیا۔ راجہ داہر لڑائی میں مارا گیا۔ محمد بن قاسم نے عورتوں اور بچوں کو قید سے آزاد کیا اور مزید فتوحات کے لئے آگے بڑھا۔ محمد بن قاسم نے سندھ کے دوسرے شہروں سیہون، سکھر، روہڑی اور ملتان پر قبضہ کر لیا۔

محمد بن قاسم کی فتوحات سے ہندوستان کی سیاست میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اسلام ہندوستان میں ایک سیاسی قوت بن کر ابھرا۔ ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کا آغاز عمل میں آیا۔ برصغیر میں باضابطہ طور پر اسلام سب سے پہلے سندھ میں پھیلنا شروع ہوا۔ اسی لئے سندھ کو "باب الاسلام" بھی کہتے ہیں۔ محمد بن قاسم کی واپسی کے بعد تقریباً تین سو سال تک ہندوستان میں اسلام کا غلبہ قائم رہا۔

محمد بن قاسم نے ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران اپنے حسن اخلاق سے لوگوں کے دل موہ لئے جس کہ وجہ سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد اسلام کے حلقے میں شامل ہو گئی۔ محمد بن قاسم نے اپنے عادلانہ رویہ سے لوگوں میں ایک انقلاب برپا کیا۔

محمد بن قاسم نے ہندوستان میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ مال گزاری کا پرانا نظام بحال رکھا۔ پرانے ملازموں کو بحال کر دیا۔ مسلمانوں کے لئے بستیاں آباد کیں۔ دفتری اور انتظامی کاموں میں مقامی باشندوں کو خود مختاری دی۔ عوام کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی گئی۔ ہندوؤں کو ان کے مذہب پر کاربند رہنے کی اجازت دے دی گئی اور انہیں پوجا پاٹ کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ ہندوؤں نے جب مسلمانوں کے حسن سلوک کا مقابلہ راجہ داہر سے کیا تو ان کے دلوں میں اسلام کے لئے عزت و تکریم کے جذبات پیدا ہوئے اور انہوں نے جوق در جوق اسلام قبول کیا۔

اسلام اور ہندومت

ہندوستان میں محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ ہی اسلام دوسرے علاقوں میں بھی تیزی سے پھیلنے لگا۔ اسلام کی مقبولیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندومت تھا۔ جس نے ہر ممکن یہ کوشش کی کہ اسلام کی انفرادیت کو ختم کر کے اسے اپنے اندر ضم کر لے۔ لیکن اسلام نے اپنے سنہرے اصولوں کی بناء پر ہندومت کا مقابلہ کیا اور عوام میں ہر دلعزیز ہوتا گیا۔

اسلام کی آمد سے پہلے ہندوستان کے مذہبی حالات خاصے ابتر تھے۔ ہندو مت، جین مت اور بدھ مت رائج تھے۔ ان تمام مذاہب کے عقائد ایک دوسرے سے علیحدہ تھے۔ ہندو مت زیادہ مقبول عام مذہب تھا جس نے دوسرے تمام مذاہب کی انفرادیت کو ختم کر کے انہیں اپنے اندر ضم کر لیا تھا۔

اسلام کی مقبولیت کے پیش نظر ہندو مت نے اسلام کی انفرادیت کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس کی بنیاد کو بگاڑنا چاہا۔ لیکن اسلام کے اعلیٰ اصولوں کی وجہ سے ہندو مت اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسلام کی آمد کے بعد اسلامی طرز عبادت، مساوات اور بھائی چارے کے اصولوں نے ہندوستان کے عوام کو خاصا متاثر کیا اور ان کے مذہبی خیالات میں ایک انقلاب برپا ہوا۔

دوسری طرف ہندو مت نے معاشرے کو ذات پات کے غیر انسانی نظام میں جکڑا ہوا تھا۔ معاشرے میں برہمنوں کی اجارہ داری تھی۔ چھوٹی ذات کے لوگوں کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ اسلام نے اپنے مساوات اور برابری کے اصولوں کی وجہ سے ان لوگوں کی زندگی کی حقیقتوں سے متعارف کرایا۔ جس کی بناء پر انہیں اپنے انسان ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ چنانچہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔ ہندوستان میں اسلام کی روشنی پھیلانے میں صوفیائے کرام کی کوششوں کا بہت عمل دخل ہے جنہوں نے اپنی شبانہ روز کوششوں سے ہندوستان کو اسلام کی روشنی سے منور کیا۔

ہندو تحریکیں —— Movements (1)

برصغیر میں اسلام کی مقبولیت کے ساتھ ہی مسلمان ایک قوت بن گئے اور ان کا قومی و ملی تشخص مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتا چلا گیا۔ ہندوستان میں اسلام کو ہر دلعزیز بنانے میں مسلمان فرمانرواؤں اور صوفیائے کرام کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ صوفیائے کرام نے ہندوستان کے کونے کونے میں اسلام پھیلایا اور اس کے لئے بے شمار مشکلات کا سامنا کیا۔

اسلام کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسلام کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے ہندوؤں کی کئی تحریکوں نے جنم لیا جن کا مقصد ہندو مت کی اصلاح کر کے اسے اسلام کے مقابلے پر لانا تھا تا کہ اسلام کو پھیلنے سے روکا جا سکے۔ ہندوؤں میں کئی فلسفی پیدا ہوئے جنہوں نے یہ سوچا کہ ہندو مت کی از سر نو تشکیل کی جائے اور زیادہ قابل قبول بنایا جائے۔

بھگتی تحریک (2)

بھگتی کے لغوی معنی محبت کے ہیں۔ تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں ایک باقاعدہ تحریک چلائی گئی جسے بھگتی تحریک کہتے ہیں۔ اس تحریک کا مقصد ہندو مت کی خرابیوں کو دور کر کے اس کی اصلاح کرنا تھا تا کہ اسے زیادہ قابل قبول بنایا جائے۔ اس تحریک کا بانی ہندو فلسفی رامانج اور مبلغ رامانند تھا۔ بھگتی تحریک کے بانیوں نے تمام مذاہب کو برحق قرار دیا اور بھگتی یعنی محبت کو سب سے بڑا مذہب ٹھہرایا انہوں نے ذات پات اور رنگ و نسل کو ختم کرنے کی تلقین کی۔ ان کے نزدیک رام، رحیم، قرآن پران اور کاشی اور کعبہ میں کوئی فرق نہیں۔ اس تحریک کے حامی بت پرستی کی ممانعت کرتے تھے۔ سکھ مذہب کا بانی بابا گرونانک بھگتی تحریک کے بانیوں کا پیروکار تھا۔ بابا گورونانک نے اپنے آپ کو اسلام کے قریب ظاہر کیا اور بت پرستی کی ممانعت کی اور سادہ زندگی اپنانے کی تلقین کی۔ بھگتی تحریک اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

دین الٰہی (3)

شہنشاہ اکبر کے دربار میں ہندوؤں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اکبر نے کئی ہندو عورتوں سے شادیاں کیں جن کی وجہ سے ہندو دربار اکبری میں اہم عہدوں پر فائز تھے اور انہیں دربار کے کاموں میں بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ اکبر پر اپنی ہندو بیویوں کا بہت

زیادہ اثر تھا جنہیں خوش کرنے کے لئے اکبر نے اپنی حکومت میں ہندوؤں کو بہت زیادہ آزادی دے رکھی تھی۔

ہندوؤں کے بہکاوے پر اکبر نے ایک دینی فلسفہ پیش کیا جسے دین الٰہی کہتے ہیں۔ دین الٰہی کا اصل مقصد اسلام کی شکل کو بگاڑنا تھا اور اس کی بنیاد اسلام دشمنی پر رکھی گئی تھی۔ ہندوؤں نے اکبر کو بہکایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں محبت اور بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے کے لئے اور تمام آبادی کو اپنا وفادار بنانے کے لئے دینی اصلاح کرے۔ چنانچہ اکبر نے اپنے ہندو مشیروں کے مشوروں کی بناء پر ایک نیا دین جاری کیا جس میں تمام اصول اسلام کے اصولوں کے منافی تھے۔ اکبر کو ظل الٰہی کا خطاب دیا گیا اور ہر شخص کے لئے یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ اکبر کو سجدہ کرے۔ نماز، روزہ، حج اور اسلام کے دوسرے اصولوں کا مذاق اڑایا گیا۔ گائے کا ذبیحہ ممنوع قرار دیا گیا اور سور اور کتے کو متبرک جانور سمجھا جانے لگا۔

دین الٰہی دراصل اسلام کے خلاف ہندوؤں کی ناپاک سازش تھی تا کہ اسلام کی مقبولیت کو ختم کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد سے صوفیائے کرام نے اسلام کے خلاف ایسی سازشوں کو ختم کرنے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ صوفیائے کرام کی کوششوں سے بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ برصغیر کے کونے کونے میں صوفیائے کرام نے اسلام کی روشنی پھیلائی۔ ہندوؤں کی مذہبی تحریکوں کی سرکوبی کی اور اسلام کے منافی جو نظریات ابھر رہے تھے ان کی فتنہ پروری کو آشکار کیا۔ اس نیک کام کا آغاز حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ آپ کے بعد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عظیم مشن کو جاری رکھا۔

(4) 1564 امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (شیخ احمد سرہندی)

برصغیر میں اسلامی معاشرے کے قیام کے سلسلے میں صوفیائے کرام اور مشائخ کی بے لوث کوششوں کا بہت عمل دخل ہے۔ ہندوستان میں اسلام کو ایک مقبول عام ضابطہ حیات بنانے میں صوفیائے کرام نے عظیم کوششیں کیں۔ ان علماء کرام نے اپنی ذاتی مثال سے اسلام کو ہندوستان میں متعارف کروایا اور اسلام کا نور دور دور تک پھیلایا۔ جب مسلمان ہندوستان میں مشکلات کا شکار تھے اور ان کے مذہب کے خلاف بے شمار کفر و الحاد کی قوتیں کام کر رہی تھیں تو ان صوفیائے کرام نے باطل قوتوں سے ٹکر لی اور اسلام کی عظمت کو بحال کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ان بزرگ و برتر ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اسلام کی عظمت کی بحالی کے لیے اکبر، جہانگیر اور کئی دوسرے طاقت ور حکمرانوں کو للکارا اور انہیں اسلام کی عظمت کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا اصل نام شیخ احمد اور لقب بدرالدین تھا۔ آپ کے والد کا نام ابوالاحد تھا۔ آپ 14 شوال بمطابق 26 جون 1564ء کو ہندوستان کے شہر سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ کو امام ربانی بھی کہا جاتا ہے۔ آپ بچپن ہی سے متقی اور پرہیزگار تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے جس کی بناء پر آپ کو فاروقی بھی کہا جاتا ہے۔

1۔ ہندو جارحیت کا مقابلہ

آپ نے اپنی تبلیغ کا آغاز اکبر کے دور سے کیا۔ اکبر اعظم کے دور میں کفر الحاد کی قوتیں بڑے زور و شور سے اسلام کے خلاف سرگرم عمل تھیں۔ ہندو مذہبی تحریکیں چل رہی تھیں جن کا مقصد اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو ختم کر کے اسے ہندومت میں ضم کرنا تھا۔ لوگ ہندوانہ رسومات اپنا رہے تھے اور اس سے کھلے عام بیگانگی کا اظہار کیا جاتا تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے عزم کے ساتھ کفر و الحاد کی ان قوتوں سے ٹکر لی اور اسلام کی تجدید کا بیڑہ اٹھایا۔ آپ اپنے وقت کے عظیم مجدد تھے اور اسلام کی بحالی کے لئے بڑے سے بڑے خطرے سے بھی نہ گھبرائے۔ آپ نے اسلام کو خالص

انداز میں پیش کیا اور راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو سیدھا راستہ دکھایا۔ آپ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر آگرہ میں آباد ہوئے اور یہیں سے تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا۔

2۔ وحدت الوجود کی مخالفت

آپ نے نظریہ وحدت الوجود کی مخالفت کی۔ یہ نظریہ مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے لئے بہت بڑا خطرہ ثابت ہو رہا تھا۔ وحدت الوجود کا نظریہ اکبر کے دور کے چند صوفیوں نے پیش کیا تھا۔ جن کا عقیدہ تھا کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی مظہر ہے۔ صوفیوں کا یہ گروہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ خدا اور بندے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عقیدہ وحدت الوجود کی رو سے خدا تعالیٰ اور بندہ ایک دوسرے سے جدا نہیں اور کائنات کے ہر ذرہ میں اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لئے مظاہر قدرت کی پرستش بھی کی جا سکتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی پرستش کے مترادف سمجھی جائے گی۔

3۔ نظریہ واحدت الشہود

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کھلے عام وحدت الوجود کے فلسفے کی مخالفت کی اور اسے اسلام کے اصولوں کے منافی قرار دیا۔ اس کے جواب میں آپ نے وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ جس کا مطلب تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا بندہ الگ الگ ہیں۔ آپ نے نظریہ وحدت الوجود کی نئی توجیہہ پیش کی۔ آپ کے دیے ہوئے نظریہ وحدت الشہود کا مطلب تھا کہ خالق ومخلوق الگ الگ وجود ہیں اور کائنات میں موجود تمام مخلوق خالق کی عظمت کی شہادت دیتی ہے۔

آپ نے بھگت کبیر، رامانند اور بابا گرونانک کی چلائی ہوئی تحریکوں کی مخالفت کی اور کہا کہ اسلام کا ان تحریکوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ نے کفر اور اسلام میں فرق کو واضح کیا اور کہا کہ ہم کسی صورت بھی بت پرستی اور خدائے واحد کی پرستش کو ایک تسلیم نہیں کر سکتے۔

4۔ علمائے سو کا ازالہ

علمائے سو سے مراد وہ علماء ہیں جو دنیاوی باتوں کی خاطر آخرت کو نظر انداز کر کے غلط عقائد پھیلاتے ہیں۔ یہ علماء قرآن اور سنت سے متصادم اصولوں کو مذہب کا حصہ قرار دیتے ہیں۔

اکبر کے دور میں ایسے علماء کا بہت زور تھا۔ ان میں سب سے مشہور ابو الفضل اور فیضی تھے جنھوں نے اکبر کو دین الٰہی جیسے شر انگیز مذہبی فلسفے کو رائج کرنے پر ابھارا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ معاشرے کی بے راہ روی کا ذمہ دار انہی علمائے سو کو ٹھہراتے تھے۔ آپ نے جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد بادشاہ کو علمائے سو کے اثر سے بچانے کی ہر ممکن سعی کی۔

دین الٰہی اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

اکبر کے دور میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پھیلائی جاتی تھی۔ دونوں قومیں مذہبی تضاد کی بناء پر ایک دوسرے سے بد ظن تھیں۔ اکبر کے درباریوں نے جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اکبر کو یہ مشورہ دیا کہ دونوں قوموں کی نفرت کو ختم کرنے کے لئے دینی اصلاح کی جائے اور نیا مذہب جاری کیا جائے جس میں ہندومت اور اسلام کے اصولوں کو یک جا کر دیا جائے تاکہ دونوں قومیں اسے اپنا سکیں اور اس طرح ملک میں سیاسی ہم آہنگی پیدا کی جا سکے۔ اس نئے دین کا نام دینِ الٰہی رکھا گیا۔ جس کے مطابق خدا اور بھگوان اور رحمٰن اور رام میں کوئی فرق نہ رکھا گیا۔ اکبر کو ظل الٰہی کا خطاب دیا گیا اور اسے سجدہ کرنا لازمی قرار دیا گیا۔

اکبر کا یہ دینی فلسفہ ہندوؤں کی منشا کے عین مطابق تھا کیونکہ اس کا مقصد اسلام کی انفرادیت کو ختم کرنا تھا اس کے علاوہ دین الٰہی کے اجراء سے ہندوستان میں مشترکہ قومیت کا تصور ابھرتا تھا جو کہ مسلمانوں کے مفاد کے منافی تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے دین الٰہی کو ماننے سے انکار کر دیا اور اسے جھٹلانے کے لئے فتویٰ جاری کیا۔ آپ نے کھلے عام اس دینی فلسفے کی فتنہ پروری کو لوگوں پر واضح کیا اور اکبر کے دربار کے سپہ سالاروں اور اہم عہدے داروں کو اسلام کی دعوت دی۔ اکبر کا غیض و غضب بھی آپ کو نعرہ حق بلند کرنے سے نہ روک سکا۔ آپ نے معاشرے میں غیر اسلامی رسومات پھیلانے پر اکبر کی شدید مخالفت کی اور دین الٰہی کو اسلام کے عین منافی قرار دیا۔ آپ اپنی کوششوں سے دربار اکبری کے بہت سے عہدے داروں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اکبر پر آپ کی تبلیغ کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ اکبر کی موت کے ساتھ ہی دین الٰہی بھی اپنی موت مر گیا۔

جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد بھی آپ نے اپنا تبلیغی کام جاری رکھا اور لوگوں کو اسلام کی طرف بلاتے رہے۔ جہانگیر کے بہت سے درباریوں نے بادشاہ کو آپ کے خلاف بھڑکایا۔ آپ نے جہانگیر کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سجدہ صرف خدا کی ذات کو جائز ہے اس پر آپ کے مخالفین نے جہانگیر کو اکسایا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے شہنشاہ کی توہین کی ہے اور بغاوت کا اظہار کیا ہے۔ جہانگیر نے دوسروں کے کہنے میں آکر آپ کو گوالیار کے قلعہ میں بند کر دیا۔ آپ نے قید و بند کی تکلیفیں بخوشی قبول کر لیں۔ لیکن اپنے موقف سے نہ ہٹے۔ قید کے دوران بھی آپ نے اسلامی تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ کافی مدت کے بعد بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو آپ کو رہا کر دیا گیا۔ آپ کی تعلیم و تبلیغ کی وجہ سے مغل دربار سے غیر اسلامی رسومات ختم کر دی گئیں۔ آپ کو رہا کرنے کے بعد جہانگیر نے آپ کی بہت عزت کی اور تبلیغ اسلام کی اجازت دے دی۔ آپ کی کوشش سے جہانگیر کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی اور اس نے دین کی خدمت کے لئے متعدد اقدامات کئے

دو قومی نظریہ اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان میں اسلام کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے بعض صوفیائے کرام نے اپنی تبلیغ میں لوگوں کی طرف رواداری کا رویہ اختیار کیا تاکہ لوگوں کو زیادہ تعداد میں اسلام کی طرف بلایا جا سکے۔ اس رویے سے اسلام پھیلانے میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مشترکہ قومیت کا تصور بھی اجاگر ہوا جو مسلم قومیت کے علیحدہ اور منفرد تشخص کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ معاشرے کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مسلمانوں میں ان کے علیحدہ اور منفرد ملی وجود کا احساس نہ جگایا گیا تو مسلمان ہمیشہ کے لئے ایک قوم کی حیثیت سے ختم ہو جائیں گے۔ معاشرے کے اس رجحان کے خاتمے کے لئے آپ نے فلسفہ وحدت الوجود کی نفی کی اور مسلمانوں کے دینی و ملی تشخص کو زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دو قومی نظریہ کے سختی سے حامی تھے۔ اگرچہ آپ نے دو قومی نظریہ کی اصطلاح استعمال نہ کی لیکن آپ مسلمانوں کے علیحدہ دینی اور ملی وجود کے حامی تھے اور مسلمانوں کو ہر لحاظ سے ایک علیحدہ قوم سمجھتے تھے۔ آپ نے ہندو مسلم امتیاز کو برقرار رکھنے کی بھرپور سعی کی اور فرمایا کہ مسلمان اور ہندو معاشرے اور تہذیب و تمدن میں واضح فرق موجود ہے۔ آپ نے اسلامی معاشرے سے ہندوانہ رسومات ختم کرنے کی جدوجہد کی۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ مسلمان اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھیں۔ آپ نے حکمرانوں کی اصلاح بھی کی اور انہیں غیر اسلامی عادات ترک کرنے کی تلقین کی۔ آپ نے دربار اکبری کے با اثر عہدے داروں کو خطوط لکھے جن میں انہیں اسلامی عادات و اطوار اپنانے کی تلقین کی۔ امراء اور حکمرانوں کو لکھے ہوئے آپ کے خطوط مکتوبات امام ربانی کے نام سے مرتب ہوئے۔ یہ مکتوبات تین جلدوں میں مرتب کئے گئے اور ان کی تعداد 525 بنتی ہے۔ ان مکتوبات کا شمار فارسی ادب کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا شمار مسلمانوں کی ان برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جن کی کوششوں سے ہندوستان کے مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے متحد ہوئے۔ آپ نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھایا اور مسلمانوں کے دینی تشخص کی بحالی اور بقا کے لئے تگ و دو کی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، 21 فروری 1703ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصلی نام قطب الدین تھا اور لقب شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم اپنے دور کے بلند پایہ صوفی اور عالم دین تھے۔ آپ بہت بڑے دینی مفکر اور عظیم مصلح ہوئے ہیں۔ آپ نے برصغیر کے مسلمانوں کی دینی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی اصلاح کے لئے بے پناہ جدوجہد کی اور مسلمانوں کے اندر دینی اتحاد اور قومی شعور پیدا کیا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور بچپن میں قرآن پاک ختم کیا۔ آپ نے حدیث، فقہ اور تفسیر پر عبور حاصل کیا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور مدرسہ رحیمیہ میں علوم اسلامیہ کا درس جاری رکھا۔ آپ نے 1762ء میں وفات پائی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ہندوستان کے حالات دگرگوں تھے۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور حکومت کی باگ ڈور نا اہل حکمرانوں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمان کسمپرسی کا شکار تھے اور ہندو سکھ اور مرہٹے سر ابھار رہے تھے۔ ملک کی سیاسی حالت ابتر تھی اور مسلمانوں کا تہذیب و تمدن سخت خطرے میں تھا۔

ان حالات میں آپ نے مسلمانوں کی قیادت کی اور مسلمانوں کے اندر ان کے قومی شعور کو اجاگر کیا۔ آپ نے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو ختم کرنے اور مساوات کو رائج کرنے پر زور دیا۔ آپ نے مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ ایک قوم کی حیثیت سے اپنا مقام پہچانیں اور غیر اسلامی رسومات سے گریز کریں۔ مسلمانوں کے اندر صحیح اور اسلامی روح پھونکنے کے لئے آپ نے لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی مدنی زندگی کو لوگوں سے روشناس کرایا اور اسلام کے ارکان سے واقفیت دلائی۔ آپ نے مسلمانوں کو اسلامی اقدار اپنانے کی تلقین فرمائی۔ ان پڑھ اور جاہل لوگوں کو اسلام سے متعارف کرایا۔ عوام کو توہم پرستی سے روکا، رزق حلال کھانے کی تلقین کی اور کفایت شعاری اپنانے پر زور دیا۔ آپ مسلمانوں کو ایک ملت سمجھتے تھے اور جغرافیائی بنیادوں کی بناء پر مسلمانوں کی تقسیم کے سخت مخالف تھے۔

آپ نے اسلامی قوانین کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اسلام کے اندر ان تمام خیالات و نظریات کو ختم کرنے پر زور دیا جو اسلام کی روح کے منافی تھے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں حجۃ اللہ البالغہ ازالتہ الخفاء بہت مشہور ہیں۔ آپ نے لوگوں کی سہولت کے لئے قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جو ''فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس ترجمہ سے عوام کے لئے قرآن کو پڑھنا اور سمجھنا آسان ہوگیا۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک رسالہ ''الفوز الکبیر فی اصول تفسیر'' بھی تحریر فرمایا جس میں آپ نے قرآنی علوم کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال فرمایا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہی مسائل اور تقلید و اجتہاد میں معتدل رویہ اختیار کیا۔ آپ نے ایک رسالہ العناف فی بیان سبب الاختلاف'' لکھا اور فقہ میں اعتدال قائم کرنے کی سعی کی۔ اس رسالہ میں آپ نے خلافت راشدہ سے لے کر پانچویں ہجری تک فقہ کی تدوین کی۔ آپ فقہ کے چاروں اماموں کو معتبر قرار دیتے ہیں۔ آپ نے تمام فقہی مسائل کا تفصیل سے ذکر کیا جو کہ

باعث اختلاف تھے۔ آپ کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ لیکن آپ اجتہاد کا اختیار ہر کسی کو دینے کے خلاف تھے بلکہ اس کے لئے نہایت تفصیل اور احتیاط سے اصول و قواعد متعین کرنے کے حق میں تھے۔ آپ کسی ایک امام اور اس کے مذہب و عقیدے سے وابستگی نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ کے نزدیک اس طرح فرقہ واریت کے رجحان کو تقویت ملتی ہے۔ آپ کسی ایک امام کے حکم پر اکتفا کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ بلکہ دوسرے اماموں کے احکام سے بھی استفادہ کرنے کے حق میں تھے۔ اس طرح آپ نے فقہی فرقہ بندی کے رجحان کو ختم کر کے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا۔

سیاسی خدمات

دینی تعلیم کے علاوہ آپ نے مسلمانوں کی سیاسی میدان میں راہنمائی فرمائی اور ان کے اندر سیاسی شعور اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مسلمانوں کے اندر سیاسی اتحاد مفقود تھا اور مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی۔ مغلیہ دربار میں سازشوں کا دور دورہ تھا اور ہر طرف بغاوتوں کا زور تھا۔ مغلیہ سلطنت کی باگ ڈور نا اہل حکمرانوں کے ہاتھ آ چکی تھی۔ دوسری قوموں بالخصوص سکھوں اور مرہٹوں نے ان حالات سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کیا ہوا تھا۔ اور جنوبی ہند میں مرہٹے مسلمانوں کے لئے وبال جان بنے ہوئے تھے۔ جاٹ، سکھ اور مرہٹے مسلمانوں اور اسلام کے لئے عظیم خطرہ بن گئے تھے۔ آپ نے مرہٹوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے اندرون ملک امراء کو اکٹھا کیا اور ان سے مرہٹوں کے خلاف فوجی امداد طلب کی۔

آپ کی آواز پر روہیلہ نواب، نجیب الدولہ نے لبیک کہی اور بہت سے مسلمان اور سرداروں اور امراء کا اتحاد قائم کر لیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''تفہیمات الٰہیہ'' میں ملت کے تمام طبقوں کو خطاب کرتے ہوئے انہیں اپنے فرائض ایمانداری اور دیانت داری سے ادا کرنے کی تلقین کی ہے۔ آپ نے تاجروں مزدوروں اور کاشتکاروں کو زندگی میں دیانت داری کے اصولوں کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔ آپ نے لوگوں کو غیر اسلامی شعائر کو ترک کرنے کی تلقین کی اور اسلامی رسومات اپنانے پر زور دیا۔ آپ نے نام نہاد پیروں کی سرزنش کی اور انہیں محنت سے رزق حلال کمانے کی تلقین کی۔

آپ نے مسلمانوں کو بیدار کیا اور انہیں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آمادہ کیا۔ آپ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ احمد شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کی مدد سے حضرت شاہ ولی اللہ کی دعوت پر ہندوستان پر حملہ کیا اور 1761ء کی مشہور لڑائی میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی۔ اگر آپ احمد شاہ ابدالی کو حملہ کی دعوت نہ دیتے مرہٹے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا غلام بنا لیتے۔ مسلمانوں کا یہ تحفظ آپ کی سیاسی بصیرت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

آپ نے حکمرانوں کو یہ تلقین کی کہ نظام سلطنت کو اسلامی قوانین کے مطابق ڈھالیں۔ امراء کو خدا سے ڈرنے اور سادہ زندگی اپنانے کی تلقین کی۔ فوجیوں کے اندر جہاد کی اہمیت کو واضح کیا اور انہیں جذبہ جہاد سے سرشار کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے جانشین

آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزندوں نے دینی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کے چار فرزند تھے۔ جنہوں نے آپ کے بعد آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلام کی خدمت کی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ

حضرت شاہ ولی اللہ کے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے آپ کے بعد اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور دینی درس وتدریس کا کام سنبھالا۔ آپ تمام زندگی اسلام کی تعلیم دیتے رہے اور اسلامی تبلیغ کے لئے نئی کارکن اور مرید تیار کئے۔ آپ بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے اپنی تعلیم اور درس سے شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی شہید جیسے عظیم و برتر مرید پیدا کئے جنہوں نے آگے چل کر اسلام کی راہ میں جان قربان کی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد آپ نے مدرسہ رحیمیہ میں درس وتدریس کا کام جاری رکھا۔

حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ

حضرت شاہ ولی اللہ کے ان دو فرزندان نے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا تاکہ مسلمان زیادہ سے زیادہ قرآن پاک کی تعلیم سے استفادہ کر سکیں۔ شاہ عبدالقادر کا کیا ہوا ترجمہ بہترین تراجم میں شمار ہوتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالغنیؒ

آپ نے مسلمانوں کی دینی تعلیم وتدریس کے علاوہ سیاسی راہنمائی بھی کی۔ شاہ اسماعیل شہید آپ ہی کے فرزند تھے جو اپنے تایا شاہ عبدالعزیز کے مریدوں میں سے تھے۔

(6) تحریک مجاہدین

سید احمد شہید بریلوی 1786

ہندوستان کی سیاسی صورت حال دن بدن بگڑتی جا رہی تھی اور مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کیا ہوا تھا اور مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی جان و مال محفوظ نہ تھے۔ انہیں مذہبی آزادی بھی حاصل نہ تھی۔ گائے کا ذبیحہ ممنوع تھا اور مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند تھے۔

سکھوں کے اس دور کو سکھا شاہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سکھ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ سکھوں کے بڑھتے ہوئے مظالم اور مسلمانوں کی دن بدن بگڑتی ہوئی حالت نے مسلمانوں کی ایک تحریک کو جنم دیا۔ جسے تحریک مجاہدین کہا جاتا ہے۔ اس تحریک میں مسلم مجاہدین ہندوستان کے کونے کونے سے شریک ہوئے اور سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کی۔

تحریک مجاہدین کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیز کی قیادت میں ہو چکا تھا۔ لیکن اس تحریک کو سید احمد شہید نے بامِ عروج تک پہنچایا جو کہ شاہ عبدالعزیز کے مرید تھے۔

سید احمد شہید 1786ء میں رائے بریلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے اثرات سے بہت متاثر تھے اور ان کے بڑے فرزند شاہ عبدالعزیز کے مریدوں میں سے تھے۔ آپ نے عسکری تربیت بھی حاصل کی تھی اور ایک بلند پایہ فوجی منتظم تھے۔ آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر بہت رنجیدہ تھے اور اسلام کی عظمت کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ آپ اسلام کے فروغ اور بحالی کے لئے عملی اقدامات میں یقین رکھتے تھے۔ آپ ایک عظیم دینی رہنما اور معاشرتی مصلح تھے۔ آپ ایک ایسی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے جس کی بنیاد اسلامی روایات اور اصولوں پر ہو۔ آپ نے مسلمانوں کو سکھوں کے مظالم سے آزاد کرانے کے لئے تحریک مجاہدین کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور سکھوں کی غیر اسلامی حکومت کے خلاف جہاد کا ارادہ کیا۔ 1818ء میں آپ نے شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئی کے ساتھ ہندوستان کے علاقوں کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو غیر اسلامی قوتوں

سے خبردار کیا۔ آپ نے عوام کے اندر جذبہ جہاد بیدار کیا۔ آپ چاہتے تھے کہ سرحد اور پنجاب میں مسلمانوں کے قدم مضبوط ہو جائیں اور انہیں سکھوں کی غیر اسلامی حکومت سے نجات مل جائے۔

11 جنوری 1826ء کو سید صاحب تقریباً سات ہزار ساتھیوں کے ہمراہ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ آپ نے شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئی کو ریاست میں بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو جہاد پر آمادہ کر سکیں۔ دسمبر 1826ء میں آپ نوشہرہ پہنچے جہاں آپ نے اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ یہاں سے آپ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام الٹی میٹم روانہ کیا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جسے اس نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

اکوڑہ کے مقام پر سکھوں کے خلاف پہلا معرکہ ہوا جس میں مجاہدین کو کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد حضرو کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ یہاں بھی مسلمانوں کو کامیابی نصیب ہوئی۔ ان کامیابیوں کے بعد بہت سے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت لی۔ اس کے بعد سید احمد شہید نے اسلامی حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ آپ کو مسلمانوں کے امیر کے بطور تسلیم کر لیا گیا۔ آپ نے مفتوحہ علاقوں میں اسلامی قوانین اور تعزیرات جاری کر دیں۔

مسلمانوں کی کامیابی سے سکھوں کو سخت تشویش ہوئی اور انہوں نے تحریک کو سیاست اور غداری کے ذریعے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ سکھوں نے رشوت کے ذریعے چند مسلمان سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ سکھوں کے اکسانے پر سردار یار محمد آپ کے مخالفین سے مل گیا اور بالآخر مسلمانوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔

اس کے بعد سید احمد شہید پشاور کی طرف روانہ ہوئے سید احمد شہید نے پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد پٹھان قبائل جنگی قیادت یار محمد خان کا بھائی سلطان محمد خان کر رہا تھا کے خلاف تورد کے مقام پر لڑائی ہوئی جس میں پٹھان قبائل کو شکست ہوئی۔

1830ء میں سید احمد شہید نے اپنا ہیڈ کوارٹر بالاکوٹ کے مقام پر قائم کیا اور سکھوں کے خلاف فیصلہ کن لڑائی کی تیاری شروع کی۔ سکھوں نے بالاکوٹ کے مقام پر مسلمانوں پر حملہ کیا۔ سکھوں کی امداد کئی مقامی سرداروں نے کی۔ مجاہدین نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے اس لڑائی میں جام شہادت نوش کیا۔ سکھوں کو لڑائی میں کامیابی ہوئی۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کو بالاکوٹ میں دفن کیا گیا۔

سید احمد شہید کی شہادت کے بعد تحریک میں پہلی سی شدت نہ رہی اور بالآخر غداروں کی وجہ سے تحریک ختم ہو گئی۔

تعلیمی تحریکیں

Educational Movements

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز نے مسلمانوں کے خلاف نہایت ظالمانہ پالیسی اختیار کی کیونکہ وہ مسلمانوں کو جنگ آزادی کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کو معاشرتی طور پر تباہ کرنے کے لئے ان کی معاشی حالت کو تباہ کیا گیا۔ مسلمانوں پر باعزت زندگی کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے اور ان کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر باقی نہ رکھی گئی۔ انگریز کی اس پالیسی کے نتیجے میں مسلمان معاشرتی اور معاشی طور پر پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتے چلے گئے اور قریب تھا کہ وہ ایک قوم کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے۔ لیکن ایک عظیم تحریک نے انہیں مکمل تباہی سے بچا لیا یہ تحریک سرسید احمد خان کی چلائی ہوئی تحریک علی گڑھ ہے جس نے مسلمانوں کے اندر اپنے ملی مقام کے احیاء کا جذبہ پیدا کیا اور ایک دفعہ پھر ان کو جائز مقام دلایا۔

① تحریک علی گڑھ

سرسید احمد خان

سرسید احمد خان 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی کے ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا خواجہ فرید الدین خان سے حاصل کی۔ آپ کے نانا ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھے۔ اور والد ایک گوشہ نشین بزرگ تھے۔ ابتدائی تعلیم میں آپ نے قرآن پاک کا مطالعہ کیا اور عربی اور فارسی ادب کا مطالعہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے حساب طب اور تاریخ میں بھی مہارت حاصل کی۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ سے عدالتی کام سیکھا۔ 1837ء میں آپ نے دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔ 1839ء میں آگرہ میں کمشنر کے دفتر میں بطور نائب منشی فرائض سنبھالے۔ 1841ء اور 1842ء میں مین پوری اور 1842ء سے 1846ء تک فتح پور سیکری میں سرکاری خدمات سرانجام دیں۔ محنت اور ایمانداری سے ترقی کرتے ہوئے 1846ء میں دہلی میں صدر امین مقرر ہوئے۔ دہلی میں قیام کے دوران آپ نے اپنی مشہور کتاب ''آثار الصنادید'' 1847ء میں لکھی۔ 1854ء میں آپ کا تبادلہ ضلع بجنور ہوگیا۔ ضلع بجنور میں قیام کے دوران آپ نے اپنی کتاب سرکشی ضلع بجنور لکھی۔ جنگ آزادی کے دوران آپ بجنور میں قیام پذیر تھے۔ اس کٹھن وقت میں آپ نے بہت سے انگریز مرد وعوروں اور بچوں کی جانیں بچائیں۔ آپ نے یہ کام انسانی ہمدردی کے لئے ادا کیا۔ جنگ آزادی کے بعد آپ کو آپ کی خدمات کے عوض انعام دینے کے لئے ایک جاگیر کی پیشکش ہوئی جسے آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

1857ء میں آپ کو ترقی دے کر صدر الصدور بنا دیا گیا اور آپ کی تعیناتی مراد آباد کر دی گئی۔ 1862ء میں آپ کا تبادلہ غازی پور ہو گیا۔ 1867ء میں آپ بنارس میں تعینات ہوئے۔

1877ء میں آپ کو امپیریل کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ 1888ء میں آپ کو ''سر'' کا خطاب دیا گیا اور 1889ء میں انگلستان کی یونیورسٹی اڈنبرا نے آپ کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔

تحریک علی گڑھ کا آغاز

1857ء کی جنگ آزادی کی تمام تر ذمہ داری انگریزوں نے مسلمانوں پر ڈال دی تھی اور انہیں سزا دینے کے لئے ان کے خلاف نہایت ظالمانہ اقدامات کئے گئے۔ ہندو جو کہ جنگ آزادی میں برابر کے شریک تھے انہیں بالکل کچھ نہ کہا گیا۔ انگریز کی اس پالیسی کی وجہ سے مسلمان معاشرتی طور پر تباہ ہو گئے اور ان کی معاشی حالت ابتر ہو گئی۔ انگریزوں نے فارسی کی بجائے جو کہ مسلمانوں کی زبان تھی انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا تھا۔ مسلمان کسی صورت بھی انگریزی زبان سیکھنے پر رضا مند نہ تھے۔ دوسری طرف ہندوؤں نے فوری طور پر انگریزی زبان کو اپنا لیا تھا اور اس طرح تعلیمی میدان میں مسلمانوں سے آگے نکل گئے۔

ان اقدامات نے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت کو بہت متاثر کیا تھا۔ مسلمان جو کبھی ہندوستان کے حکمران تھے اب ادنیٰ درجے کے شہری تھے جنہیں ان کے تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔

سرسید احمد خان مسلمانوں کی ابتر حالت اور معاشی بدحالی کو دیکھ کر بہت کڑھتے تھے۔ آپ مسلمانوں کو زندگی کے باعزت مقام پر دیکھنا چاہتے تھے اور انہیں ان کا جائز مقام دلانے کے خواہاں تھے۔ آپ نے مسلمانوں کی راہنمائی کا ارادہ کیا اور انہیں زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کی تلقین کی۔

سرسید احمد خان نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی زیادہ ذمہ داری خود مسلمانوں کے انتہا پسند رویئے کی وجہ سے ہے۔ ہندوستان کے مسلمان انگریز کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور انگریزی تعلیم سیکھنا اپنے مذہب کے خلاف تصور کرتے تھے۔ مسلمانوں کے اس رویئے کی وجہ سے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک خلیج حائل رہی۔ سرسید احمد خان نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ جب تک مسلمان انگریزی تعلیم اور انگریزوں کے متعلق اپنا رویہ تبدیل نہ کریں گے ان کی حالت بہتر نہ ہو سکے گی اور وہ تعلیمی میدان میں ہمیشہ ہندوؤں سے پیچھے رہیں گے۔ آپ نے مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ انگریزوں کے متعلق اپنا رویہ بدلیں کیونکہ انگریز ملک کے حکمران ہیں۔ آپ نے اپنی تحریک کا آغاز مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان غلط فہمی کی فضا کو ختم کرنے سے کیا۔

ج تحریک علی گڑھ کا تعلیمی پہلو

سرسید احمد خان یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی موجودہ بد حالی کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کا انگریزی علوم سے بے بہرہ ہونا ہے۔ آپ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو انگریزی زبان اور تہذیب سے نفرت کا رویہ ترک کر کے مفاہمت کا رستہ اختیار کرنا چاہیے۔ دوسری طرف ہندو جدید تعلیم حاصل کر کے تعلیمی میدان میں مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے اور اعلیٰ ملازمتیں حاصل کر لی تھیں۔ آپ نے مسلمانوں کو اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کی تلقین کی اور انہیں یہ باور کرایا کہ جب تک وہ اپنا انتہا پسند رویہ ترک کر کے انگریزی علوم نہیں سیکھیں گے وہ کسی طرح بھی اپنی موجودہ بد حالی پر قابو نہ پا سکیں گے۔ آپ نے قرآن پاک سے حوالے دے کر مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ انگریزی علوم کو سیکھنا اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ آپ نے انتہا پسند عناصر سے مسلمانوں کو خبردار کیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی بہتری کے لئے آپ نے متعدد اقدامات کئے۔

1859ء میں مراد آباد کے مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا گیا جہاں فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مدرسے میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ 1863ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی گئی جس کا مقصد انگریزی علوم کو اردو اور فارسی میں ترجمہ کرنا تھا تاکہ ہندوستانی عوام جدید علوم سے استفادہ کر سکیں۔ 1866ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک اخبار جاری کیا گیا جسے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کہا جاتا ہے۔ یہ اخبار اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا جاتا تھا۔ اس اخبار کے ذریعے انگریزوں کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا جاتا تھا۔

1869ء میں آپ کے بیٹے سید محمود کو حکومت کی طرف سے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا گیا۔ آپ بھی 1869ء میں اپنے بیٹے کے ساتھ انگلستان چلے گئے۔ وہاں جا کر آپ نے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کا مشاہدہ کیا۔ آپ ان یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم سے بہت متاثر ہوئے اور یہ ارادہ کیا کہ ہندوستان جا کر ان یونیورسٹیوں کی طرز کا ایک کالج قائم کریں گے۔

آپ انگلستان سے 1870ء میں واپس آئے اور ہندوستان میں انجمن ترقی مسلمانان ہند کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانا تھا۔ 1870ء میں آپ نے رسالہ تہذیب الاخلاق لکھا جس میں آپ نے مسلمانوں کے ان معاشرتی پہلوؤں کی نشاندہی کی جن کی اصلاح کرنا مقصود تھی اور مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنے ان پہلوؤں کی فوری اصلاح کریں۔

ی علی گڑھ کالج کا قیام

انگلستان سے واپسی پر آپ نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے ایک کمیٹی قائم کر دی جس نے اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج کے قیام کے لئے کام شروع کیا۔ اس کمیٹی کو محمڈن کالج کمیٹی کہا جاتا ہے۔ کمیٹی نے ایک فنڈ کمیٹی قائم کی جس نے ملک کے طول و عرض سے کالج کے لئے چندہ اکٹھا کیا۔ حکومت سے بھی امداد کی درخواست کی گئی۔

1875ء میں انجمن ترقی مسلمانان ہند نے علی گڑھ میں ایم۔اے۔او ہائی سکول قائم کیا۔ اس ادارے میں جدیداور مشرقی علوم پڑھانے کا بندو بست کیا گیا۔ 1877ء میں اس سکول کو کالج کا درجہ دے دیا گیا جس کا افتتاح لارڈلٹن نے کیا۔ یہ کالج رہائشی کالج تھا اور یہاں پر تمام علوم پڑھائے جاتے تھے۔ سرسید کی یہ دلی خواہش تھی کہ اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلا دیں۔ یہ کالج سرسید کی وفات کے بعد 1920ء میں یونیورسٹی بن گیا۔ یہاں سے فارغ التحصیل طلباء نے آگے چل کر تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

سرسید احمد خان نے 27دسمبر 1886ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے اقدامات کرنا تھا۔ اس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں ہوا کانفرنس نے تعلیم کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر جلسے کئے۔ ہر شہر اور قصبے میں اس کی ذیلی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اس کانفرنس کی کوششوں سے مسلمانوں کے اندر تعلیمی جذبہ اور شوق پیدا ہوا۔ اس کانفرنس نے ملک کے ہر حصے میں اجلاس منعقد کئے اور مسلمانوں کو جدید تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ اس کانفرنس کے سربراہوں میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا شبلی اور مولانا حالی جیسی ہستیاں شامل ہیں۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ مختلف شہروں میں ہوتا تھا۔ جہاں مقامی مسلمانوں سے مل کر تعلیمی ترقی کے اقدامات پر غور کیا جاتا تھا اور مسلمانوں کے تجارتی، تعلیمی، صنعتی اور زراعتی مسائل پر غور کیا جاتا تھا۔

تحریک علی گڑھ، سرسید کی وفات کے بعد

سرسید احمد خان علی گڑھ کی تحریک کے روح رواں تھے۔ آپ ہی کے دم سے علی گڑھ کی تحریک اپنی منزلیں طے کرتی ہوئی ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی و کامرانی کا نشان بن گئی۔ علی گڑھ کالج جو مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ تھا سرسید ہی کی قیادت اور رہنمائی میں ایک عظیم ادارہ بن گیا۔ آپ اس کے سیکرٹری تھے جس کے ذمے علی گڑھ کالج کا انتظام و انصرام تھا۔ آپ نے اپنی شبانہ روز محنت کی بدولت کالج کو بہت ترقی دی اور اس کی مالی حالت کو مستحکم کیا۔

1889ء میں سرسید احمد خان نے ایک ٹرسٹی بل تجویز کیا جس کا مقصد کالج کے انتظام کو ایک ٹرسٹ کے حوالے کرنا تھا۔ سرسید احمد خان بورڈ آف ٹرسٹیز کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور آپ کے صاحبزادے سید محمود جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ سید محمود کی تقرری پر کچھ اختلافات پیدا ہوئے لیکن سرسید احمد خان کے اصرار پر کمیٹی نے سید محمود کی تقرری کو منظور کر لیا۔ سرسید احمد خان کے انتقال کے بعد سید محمود سیکرٹری مقرر ہوئے لیکن اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے سرانجام نہ دے سکے اور مستعفی ہو گئے۔

سرسید احمد خان کے آخری ایام میں کالج کے ہندو خزانچی شام بہاری لال نے ایک لاکھ پانچ ہزار روپے کا غبن کر لیا جس کی وجہ سے کالج کی شہرت کو بہت نقصان پہنچا۔ غبن کے نتیجے میں کالج کے چندے میں کمی آ گئی جس کی وجہ سے کالج کی مالی حالت بہت متاثر ہوئی اور کالج مقروض ہو گیا۔ سید محمود کے استعفیٰ کے بعد نواب محسن الملک ٹرسٹ کے سیکرٹری بنے تو کالج بدنظمی کا شکار تھا۔ آپ نے محنت شاقہ سے کالج کو سنبھالا اور کالج کا وقار بحال کیا۔ آپ نے کالج کی مالی حالت سنبھالنے کے لئے حکومت کی لگائی ہوئی شرط کو پورا کرنے کے لئے چھ لاکھ روپیہ چندہ اکٹھا کیا۔ آپ نے دیو بند کے علماء کا تعاون حاصل کیا اور انہیں ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک کیا۔ آپ نے اردو کے دفاع اور فروغ کے لئے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔

نواب محسن الملک کے دور میں علی گڑھ کے اولڈ بوائز دو متحارب گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان کا گروپ کالج کے یوروپین سٹاف کا حامی تھا اور یوروپین سٹاف کو بڑھانے کے حق میں تھا جبکہ مولانا محمد علی جوہر کا گروپ کالج سے یوروپین

سٹاف کے اثر ونفوذ کو ختم کرنے کا حامی تھا۔ نواب محسن الملک نے دونوں گروپوں میں تصادم کی صورت حال پیدا نہ ہونے دی۔ 1907ء میں نواب محسن الملک وفات پا گئے۔

1907ء میں علی گڑھ کالج میں ایک اور ہنگامہ پیدا ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کرکے آئے تھے۔ نواب محسن الملک مولانا جوہر کو کالج میں پروفیسر مقرر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انگریز پرنسپل مولانا جوہر کے تقرر کے خلاف تھا۔ انگریز پرنسپل مولانا کی انقلابی طبعیت سے خائف تھا۔ یہ مسئلہ خاصا سنگین صورت اختیار کر گیا اور کالج میں ہڑتال ہوگئی لیکن یہ معاملہ بعد میں مصالحت سے طے پا گیا۔

1907ء میں نواب وقار الملک (نواب مشتاق حسین خان) کالج کے سیکرٹری بنے آپ کا تعلق جوہر گروپ سے تھا۔ آپ نے انگریز پرنسپل کے اختیارات کو کم کر دیا۔ جس کی وجہ سے انگریز سٹاف اور کالج کی انتظامیہ کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی۔ آپ کے دور میں علی گڑھ تحریکوں کا مرکز بنا رہا۔

1912ء میں نواب وقار الملک نے صحت کی خرابی کی بناء پر استعفیٰ دے دیا۔ آپ کے بعد نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق کو کالج ٹرسٹ کا سیکرٹری بنایا گیا۔ آپ کے دور میں حکومت نے کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لئے 20 لاکھ روپے فنڈ کی شرط رکھی تھی۔ یہ رقم سر آغا خان نے فراہم کر دی۔ اس کے بعد حکومت نے پھر روڑے اٹکانے شروع کر دیئے اور کئی ایسی نا معقول شرائط عائد کر دیں جنہیں مولانا جوہر گروپ ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس مسئلہ پر کالج اولڈ بوائز کے دونوں گروپ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہو گئے۔

1919ء میں تحریک خلافت کے دوران مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ کالج کے طلباء کو ہڑتال کرنے کی ترغیب دی۔ اس وقت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین تھے۔ جنہوں نے ہڑتال کی مخالفت کی۔ لیکن کالج کے طلباء نے پرنسپل کی مخالفت کے باوجود مولانا جوہر کا ساتھ دیا اور بہت سے طلباء کالج چھوڑ کر چلے گئے۔ علی گڑھ کالج نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اور یہ کالج مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں قومی جذبہ پیدا کرنے کا مرکز رہا۔

ح) تحریک علی گڑھ کے نتائج و اثرات

تحریک علی گڑھ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے نئی زندگی کا پیام لائی اور انہیں اپنا کھویا ہوا ملی وقومی تشخص بحال کرنے میں مدد دی۔ تحریک نے مسلمانوں کے اندر اعتماد بحال کیا اور ان کے اندر اپنی معاشی و معاشرتی بحالی کا جذبہ پیدا کیا۔ مسلمانوں کے اندر ایسی قیادت ابھری جس نے تحریک آزادی میں مسلمانوں کی بے پایاں خدمت سرانجام دی۔ تحریک علی گڑھ کی بدولت مسلمان معاشی طور پر خوش حال ہوئے اور ایک قوم کی حیثیت سے معاشرے میں اپنا وقار بحال کیا۔

ط) تحریک علی گڑھ کی تعلیمی خدمات

تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کی سب سے نمایاں خدمت تعلیمی میدان میں سرانجام دی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز مسلمانوں سے سخت بدظن ہو چکے تھے اور مسلمانوں کو جنگ آزادی کا ذمہ دار گردانتے ہوئے انہیں معاشی اور معاشرتی طور پر تباہ کرنے کے درپے ہو گئے تھے۔ مسلمانوں سے ان کی جاگیریں چھین لی گئی تھیں اور سرکاری ملازمت کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ کئی ایسی پالیسیاں اپنائی گئیں کہ مسلمان روٹی کے محتاج ہو گئے۔

دوسری طرف مسلمان بھی انگریزوں سے بدظن تھے اور انگریزوں سے ہر قسم کے میل ملاپ کو غیر اسلامی سمجھتے تھے۔ مسلمان انگریزی علوم سیکھنے سے گریز کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان سرکاری ملازمت کے اہل نہ رہے اور ان کی معاشی حالت دگرگوں ہوگئی۔ ہندوؤں نے جلد ہی انگریزی علوم سیکھ کر ترقی کر لی تھی اور حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں پر انگریزوں کی نوازشات بھی تھیں جس کی وجہ سے معاشرے میں ان کی حالت مسلمانوں سے بہت بہتر تھی۔ چونکہ تمام مغربی علوم انگریزی زبان میں تھے۔ اس لئے مسلمان اس سے بے بہرہ رہے اور معاشی اور سیاسی میدان میں ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے۔

سرسید احمد خان نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ کسمپرسی ان کی اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے ہے اور جب تک مسلمان انگریزی تعلیم حاصل نہ کرلیں گے ان کی حالت کبھی نہ سدھر سکے گی۔ آپ نے تحریک علی گڑھ کے تحت مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے کئی عملی اقدامات کئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو تعلیم دینے کے لئے کئی تعلیمی اداروں کا اجراء کیا جس میں علی گڑھ کالج کا قیام سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ انگریزی تعلیم کا حاصل کرنا غیر اسلامی نہیں اور انہیں اپنا انتہا پسند رویہ ترک کر کے حصول تعلیم کی کوشش کرنا چاہئے۔

سرسید احمد خان کی پر خلوص کوششوں سے ہندوستان کے مسلمان مغربی علوم کی طرف راغب ہوئے۔ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک نے مسلمانوں پر مغربی علوم کے فوائد کو اجاگر کیا اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے مغربی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں نے ہندوؤں کے شانہ بشانہ سرکاری ملازمتیں حاصل کیں اور اپنی معاشی بدحالی پر قابو پالیا۔

ب) مفاہمت کی فضا پیدا کرنا

تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان بدگمانی کو دور کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے شدید بدگمانی پیدا ہو چکی تھی اور انگریز مسلمانوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں میں بھی انگریزوں کے متعلق سخت نفرت پائی جاتی تھی اور مسلمان انگریزوں سے میل ملاپ کو پسند نہ کرتے تھے۔

جنگ آزادی کے بعد اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ دونوں اطراف میں پائی جانے والی کشیدگی اور نفرت کو ختم کیا جائے اور انگریزوں کے ساتھ تصادم اور نفرت کو ترک کر کے مفاہمت کا راستہ اپنایا جائے۔ تحریک علی گڑھ نے سرسید کی راہنمائی میں یہ مقاصد پورے کئے اور مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ مفاہمت اور رواداری کا رویہ اپنانے کی تلقین کی۔ سرسید احمد خان نے ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر 1857ء کی جنگ آزادی کے اصل محرکات کی نشاندہی اور مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کے شکوک وشبہات کو دور کیا۔ آپ نے ایک اور رسالہ ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' بھی لکھا جس میں انگریزوں کے لئے مسلمانوں کی خدمات کا ذکر کیا۔ علی گڑھ کالج میں انگریز پرنسپل اور یوروپین سٹاف مقرر کر کے رواداری کی بہترین مثال قائم کی۔ علی گڑھ کالج سے ایسے مسلمان طلباء فارغ التحصیل ہوئے جو انگریزوں کے وفادار تھے۔ تحریک علی گڑھ کے ان اقدامات کی وجہ سے انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف پائی جانے والی بدگمانی دور ہوگئی اور انگریزوں نے مسلمانوں کے متعلق اپنی پالیسی میں ردوبدل کیا۔

ج) مذہبی خدمات

ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت اور انکے انتہا پسند رویے کی وجہ سے مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہ تھی اور وہ اپنے مذہبی اصولوں پر عمل کرنے سے قاصر تھے۔ تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کا پورا تحفظ کیا۔ ان دنوں عیسائی مشنریاں اسلام

کے خلاف برسرپیکار تھیں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ کر رہی تھیں۔ تحریک نے اس پراپیگنڈے کا مؤثر جواب دیا۔ سرسید احمد خان نے انگریز مصنف ولیم میور کی لکھی ہوئی کتاب کا مؤثر جواب دیا۔ اس کتاب میں حضور نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ پر نازیبا حملے کیے گئے تھے۔ آپ نے اس کتاب کا جواب "خطبات احمدیہ" میں دیا۔ آپ نے بائبل کی تفسیر لکھی جسے "تبئین الکلام" کہا جاتا ہے۔ اس میں آپ نے اسلام اور عیسائیت کے تعلق کو واضح کیا جس کی وجہ سے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی مذہبی چپقلش کو دور کرنے میں مدد ملی۔

ii) سیاسی راہنمائی

تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کی سیاسی میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جنگ آزادی کے بعد سرسید نے مسلمانوں کو اس وقت تک عملی سیاست سے دور رہنے کی تلقین کی جب تک کہ وہ تعلیمی میدان میں ترقی نہیں کرتے۔ آپ نے مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ ہندو تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے سیاسی میدان میں مسلمانوں سے آگے نکل گئے ہیں اور اگر مسلمانوں نے اس حالت میں سیاسی میدان میں ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو وہ ہندوؤں سے مات کھا جائیں گے اور پھر کبھی دوبارہ اپنے حقوق حاصل نہ کر سکیں گے۔ آپ نے مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ انہیں پہلے اپنی تعلیمی حالت کو بہتر بنانا چاہئے اور مسلمانوں کو حصول تعلیم پر زور دینے کو کہا۔

کانگریس کی چیرہ دستیوں کو دیکھتے ہوئے آپ نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ ہونے کی تلقین کی۔ آپ نے کہا کہ کانگریس خالصتاً ایک ہندو جماعت ہے جو کبھی بھی مسلمانوں کی خیر خواہ نہیں ہو سکتی۔

علی گڑھ کالج مسلمانوں کی بہترین سیاسی تربیت گاہ ثابت ہوا اور یہاں سے مسلمانوں کے عظیم راہنما فارغ التحصیل ہوئے جنہوں نے سیاسی میدان میں مسلمانوں کے بے پایاں خدمات سرانجام دی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے جنہوں نے مسلمانوں کی تحریک آزادی کو صحیح سمت میں موڑا۔

i) تحریک دیوبند (2)

تحریک علی گڑھ ہندوستان کے مسلمانوں کے معاشی اور معاشرتی فلاح کے لئے چلائی گئی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور انہیں انگریز کے بدترین عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ جنگ آزادی میں علماء کرام نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس لئے جنگ کی ناکامی کے بعد انہیں بھی عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ مسجدوں کو مسمار کر دیا گیا اور دینی علوم کی تمام درس گاہوں کو بند کر دیا گیا۔ ان اقدامات کی وجہ سے اشاعت اسلام کو سخت نقصان پہنچا۔

تحریک علی گڑھ نے جنگ کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی معاشرتی بحالی کے لئے کام کیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لئے کئی تعلیمی اداروں کا اجراء کیا جہاں سے مسلمانوں نے مغربی علوم سیکھ کر معاشرے میں اپنی حالت بہتر بنائی۔ مسلمانوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیاسی میدان میں ہندوؤں سے ٹکر لی اور اپنے حقوق حاصل کیے۔

تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کو صرف دنیاوی مقاصد کے حصول کے لئے تیار کیا۔ علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں تعلیم یافتہ مسلمان میدان عمل میں آئے اور حکومت کی کلیدی آسامیوں پر فائز ہوئے اور اس طرح مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر ہوئی اور معاشرے میں ان کا وقار بحال ہوا۔

لیکن تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کی دینی اور روحانی اصلاح کے لئے کوئی قابل ذکر کام نہ کیا۔ تحریک علی گڑھ کی بنیاد انگریز سے مفاہمت پر رکھی گئی۔ اس وجہ سے علماء کرام کا ایک خاص طبقہ تحریک علی گڑھ کو مسلمانوں کی بہتری کے لئے چلائی گئی تحریک تسلیم نہیں کرتا۔ ان علماء کے نزدیک تحریک علی گڑھ مغربی علوم سیکھنے پر زور دیتی رہی، جبکہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی فلاح صرف اسلامی اصولوں پر کاربند ہونے سے تھی وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان عربی اور فارسی سیکھیں اور قرآن وسنت سے بہرہ ور ہوں۔ تحریک علی گڑھ کے دینی پہلو کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اور اس کے مغربی رجحان کو کم کرنے کے لئے ایک دینی تحریک چلائی گئی جسے تحریک دیو بند کہا جاتا ہے۔

تحریک دیو بند کے مقاصد میں مسلمانوں کی روحانی اور دینی اصلاح شامل تھی۔ یہ تحریک چاہتی تھی کہ مسلمان اسلامی شعائر اپنائیں۔ تحریک دیو بند کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی وجہ اسلام سے دوری اور مغربیت پرستی تھی۔ تحریک مغربی علوم کے حصول کے خلاف تھی اور مسلمانوں کی دینی تعلیم پر زور دیتی تھی۔

دارالعلوم دیو بند

تحریک دیو بند نے اپنے مقدس مقاصد کے حصول کے لئے دیو بند کو اپنا مرکز بنایا۔ 30 مئی 1867ء یعنی جنگ آزادی کے ٹھیک دس سال بعد سہارن پور کے قصبے دیو بند میں دارالعلوم دیو بند کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس دار العلوم کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے جنہوں نے اپنے دوستوں مولانا حاجی عابد حسین، مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا ذوالفقار علی کے ساتھ مل کر اس مقدس کام کی ابتداء کی۔ دار العلوم کے لئے چونکہ کوئی عمارت موجود نہ تھی اس لئے مسجد کے صحن میں ایک درخت کے نیچے درس و تدریس کے نیک کام کا آغاز کیا گیا۔ مدرسے نے جلد ہی بہت ترقی کر لی اور یوپی، بنگال، پنجاب اور کشمیر اور افغانستان سے طلباء نے بڑی تعداد میں داخلہ لینا شروع کیا۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی مدرسے کے پہلے رئیس مقرر ہوئے۔ آپ کی قیادت میں مدرسے نے بہت ترقی کی۔ آپ نے بے لوث جذبے سے مدرسے کی ترقی کے لئے کام کیا۔ آپ کی خدمات کی وجہ سے مدرسے نے بہت ترقی کی اور اسے قاسم العلوم دیو بند کے نام سے پکارا جانے لگا۔ آپ نے اعلیٰ ملازمت چھوڑ کر مدرسے میں پچیس روپے ماہوار تنخواہ پر کام کیا۔ لیکن صرف 10 روپے ماہوار مشاہرہ وصول کیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بہت بڑے عالم اور مناظر تھے۔ دارالعلوم دیو بند کے تمام اساتذہ بے لوث جذبے سے سرشار مدرسے کی خدمت کر رہے تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے صرف پچاس روپے ماہوار تنخواہ وصول کی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے بغیر تنخواہ کے کام کیا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تحریک دیو بند کو پورے برصغیر میں پھیلایا اور ملک میں کئی مدارس قائم کئے جنہوں نے اسلامی تعلیم پھیلانے میں گراں قدر کام کیا۔ ان مدارس میں مراد آباد، سہارن پور اور مدراس میں قائم ہونے والے مدرسے خاص طور پر مشہور ہیں۔ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا حلقہ صرف برصغیر تک محدود نہ رکھا۔ بلکہ پوری دنیا میں اسلام کی ترقی کے لئے بے پایاں کام کیا۔ دیو بند کے قیام کے بعد ابتدائی 100 سالوں میں دنیا کے چودہ مختلف ممالک کے سینکڑوں طلباء یہاں سے فیض یاب ہوئے۔ دارالعلوم دیو بند نے برصغیر کے دوسرے تعلیمی اداروں کی امتحانات، نصاب اور درس و تدریس کے کام میں رہنمائی کی اور بہت سے تعلیمی اداروں کا الحاق دیو بند سے تھا جن کے امتحانات دارالعلوم دیو بند کی نگرانی میں ہوتے تھے۔

دارالعلوم دیو بند کے قیام کے فوری بعد مدرسے کی عمارات کی تعمیر شروع ہوگئی اور آہستہ آہستہ یہ عمارت ترقی کرتی گئی اور کئی منزلہ عمارت میں مختلف شعبے کام کرنے لگے۔ جن میں دارالحدیث اور دار التفسیر اور دار المطالعہ شامل ہیں۔ جہاں پر اسلامی علوم پر نادر

کتب اور دوسرے وسائل کا بے بہا ذخیرہ موجود ہے۔ اس ادارے میں عالمی شہرت کے حامل اساتذہ نے درس و تدریس کا کام کیا ہے۔ یہ ادارہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا حامل رہا ہے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء نے برصغیر میں اپنی قابلیت اور علمیت کا لوہا منوایا ہے۔

دارالعلوم دیو بند سے بڑے بڑے جید اکابر پیدا ہوئے جنہوں نے برصغیر میں اسلام کی ترقی و ترویج کے لئے کام کیا اور اسلامی علوم کو ملک کے کونے کونے میں پھیلایا۔ ان حضرات میں شاہ عبدالرحیم، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا عبدالحق، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا مفتی محمد شفیع، شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی اور مولانا احتشام الحق تھانوی کے نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان علماء کرام نے اسلام کی بے پناہ خدمت کی اور قوم کو بہترین قیادت مہیا کی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے تحریک پاکستان میں قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا۔

تحریک پاکستان کے دوران دیو بند کے علماء کرام دو سیاسی گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ تھانوی گروپ کی قیادت مولانا شبیر احمد عثمانی کر رہے تھے۔ آپ نے تحریک پاکستان میں قائداعظم کی بھرپور مدد کی۔ دوسری طرف مدنی گروپ تھا۔ جس میں مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ شامل تھے۔ یہ گروپ مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر اثر تھا۔ اس لئے اس گروپ نے کانگریس کے حق میں کام کیا۔ لیکن اس سیاسی اختلاف کے باوجود دارالعلوم دیو بند کے علماء کرام کی دینی خدمات قابل قدر ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی 1880ء تک دارالعلوم کے سربراہ رہے۔ آپ کا 15 اپریل 1880ء کو انتقال ہوا۔ آپ کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہی دارالعلوم کے سربراہ بنے۔ آپ بہت بڑے محدث اور صوفی تھے اور سیاست میں معقول رویہ کے حامل تھے۔ آپ نے مسلمانوں کی کانگریس میں شمولیت کو صحیح کہا اور کانگریس میں شمولیت کی تلقین کی۔

1905ء میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے انتقال کے بعد دیو بند کا انتظام و انصرام شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے سنبھالا۔ آپ دیو بند کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ 1873ء میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دار العلوم میں بطور استاد مقرر ہوئے۔ آپ نے قرآن پاک کا ترجمہ کیا اور بہت سی اعلیٰ کتابیں لکھیں۔

3۔ ریشمی رومال کی تحریک

1914ء میں جنگ عظیم اوّل شروع ہوئی تو علماء کرام نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو تیز کیا۔ جب ترکی کی خلافت کے لئے تحریک چلائی گئی تو شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ ہندوستان کی آزادی کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ ہندوستان انگریز کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔

آپ نے اس مقصد کے لئے جرمنی، ترکی اور افغانستان کی حکومتوں سے رابطہ پیدا کیا اور ان سے ہندوستان کی آزادی کے لئے مدد مانگی۔ آپ نے اپنے شاگرد عزیز مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجا اور خود مکہ تشریف لے گئے۔ مولانا سندھی نے حاجی ترنگ زئی کے ساتھ مل کر ہندوستان کی آزادی کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا۔ منصوبہ کے مطابق ترک فوجیں افغانستان کے راستے ہندوستان میں داخل ہو کر ہندوستان پر حملہ آور ہوتیں اور ہندوستان کے انقلابیوں سے مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا جاتا۔ مولانا سندھی نے افغان حکمرانوں کو ترک فوجوں کو راستہ دینے کے لئے آمادہ کر لیا۔ اس کے لئے دو معاہدے کئے گئے ایک معاہدہ ترک حکومت اور مجاہدین کے درمیان طے پایا اور دوسرا معاہدہ ترک حکومت اور افغان حکومت کے مابین طے ہوا جس کے مطابق ترک فوجیں انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے بعد واپس چلی جاتیں۔

تحریک آزادی کے اس پروگرام کو انتہائی خفیہ رکھا گیا اور سارے پروگرام کو ایک ریشمی رومال پر لکھ کر تقسیم کیا گیا۔ چونکہ اس تحریک کے متعلق تمام ہدایات مجاہدین کو ریشمی رومال پر لکھ کر روانہ کی جاتی تھیں اس لئے اسے ریشمی رومال کی تحریک کہا جاتا ہے۔

حملے کی تاریخ 19 فروری 1917ء مقرر کی گئی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ تحریک خفیہ نہ رہ سکی اور حکومت نے ریشمی رومال برآمد کر لیا۔ اس تحریک سے منسلک علماء کرام کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اس وقت مکہ میں تھے۔ آپ کو انگریزوں کے ایماء پر شریف حسین آف مکہ نے 10 فروری 1917ء کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ آپ کو جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں سے آپ تین سال بعد رہا ہو کر واپس ہندوستان آئے اسی نسبت سے آپ کو ''اسیر مالٹا'' بھی کہا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیو بند اور علی گڑھ کالج

تحریک دیو بند شروع ہی سے تحریک علی گڑھ کے حق میں نہ تھی۔ کیونکہ تحریک علی گڑھ انگریزوں سے مفاہمت کی پالیسی اپنائے ہوئے تھی۔ جبکہ تحریک دیو بند مسلمانوں کے دینی پہلو پر زور دیتی تھی اور انگریزوں سے مفاہمت اور مصالحت کو اچھا نہ سمجھتی تھی۔ سر سید احمد خاں کے نزدیک قوم کی فلاح و بہتری اسی میں تھی کہ مسلمان انگریزی علوم حاصل کریں اور انگریزوں کی طرف نفرت و حقارت کا رویہ ترک کر دیں۔ سر سید کے یہ خیالات خلوص نیت پر مبنی تھے اور وہ سچے دل سے مسلمانوں کی بحالی کے خواہاں تھے۔ آپ کے نزدیک مسلمان ہندوؤں سے صرف اسی صورت میں مقابلہ کر سکتے تھے جبکہ وہ مغربی تعلیم سے پوری طرح آراستہ ہوں۔ تحریک دیو بند کے قائدین اور علماء بڑی سختی سے اسلامی تعلیمات پر کاربند تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی دینی روایات کو ترک نہ کریں تاکہ وہ لادینیت کے اثر سے محفوظ رہ سکیں۔ سر سید احمد خاں کانگریس کے مخالف تھے اور کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے خلاف تھے۔ دیو بند کے مولانا رشید احمد گنگوہی نے آپ کے ان نظریات کی مخالفت کی اور مسلمانوں کی کانگریس میں شمولیت کی حمایت کی۔

علی گڑھ کالج اور دارالعلوم دیو بند کے طریق کار اور نظام تعلیم میں بہت نمایاں فرق پایا جاتا تھا۔ دونوں کے مقاصد مختلف تھے۔ علی گڑھ کالج انگریزی علوم کا مرکز تھا جبکہ دارالعلوم دیو بند اسلامی اور دینی تعلیم کو گہوارہ تھا۔

لیکن اس اختلاف کے باوجود علی گڑھ اور دیو بند میں بعض معاملات میں اتفاق پایا جاتا تھا۔ دونوں اداروں کے بعض اکابرین ہندوستان کے مسلمانوں کی فلاح و بہتری کے خواہش مند تھے۔ جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیو بند کے رئیس مقرر ہوئے تو ان کے دور میں علی گڑھ کالج اور دارالعلوم دیو بند کے درمیان خیر سگالی اور مفاہمت کے جذبات کو فروغ دیا گیا۔ آپ نے علی گڑھ کالج کے ساتھ تعاون کی خواہش کی اور آپ کے دور میں علی گڑھ کالج اور دارالعلوم دیو بند کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا کہ انگریزی خواندہ طلباء جو اسلامی تبلیغ کا شوق رکھتے ہوں وہ دارالعلوم دیو بند جا کر علوم اسلامیہ حاصل کریں۔ دارالعلوم اس کا خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلباء کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی تعلیم دے گا جو دارالعلوم دیو بند سے فارغ ہو کر علی گڑھ کالج جائیں گے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تحریک علی گڑھ نے بے پایاں خدمات سرانجام دیں اور انہیں پستی کے گہرے غار سے نکال کر معاشرے میں باعزت مقام پر فائز کیا۔ تحریک علی گڑھ کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی بحالی تھی تاکہ مسلمان معاشرے میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر سکیں۔ تحریک علی گڑھ نے سب سے زیادہ مغربی تعلیم کے حصول پر زور دیا تاکہ مسلمان حکومت کی ملازمت کر سکیں اور ہندوؤں کے ساتھ سیاسی میدان میں نبرد آزما ہو سکیں۔

تحریک علی گڑھ کوئی مذہبی تحریک نہ تھی۔ اس لئے علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلباء مذہبی اقدار سے نابلد رہے اور ان پر مذہبی رنگ غالب نہ آ سکا۔ علی گڑھ نے ایسے مسلمان طلباء تیار کئے تھے جنہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازمتیں حاصل کیں اور اس طرح اپنی معاشی بد حالی کو دور کیا۔

تحریک دیو بند بھی مسلمانوں کی تعلیمی خدمات سر انجام دے رہی تھی۔ لیکن تحریک دیو بند خالصتاً مذہبی تحریک تھی اور اسلامی اور دینی علوم کے حصول پر زور دیتی تھی اور اس طرح جدید دور کے تقاضوں کو نظر انداز کر رہی تھی۔ دیو بند نے بڑے بڑے عالم اور فاضل علماء پیدا کئے جنہوں نے برصغیر میں اسلام کے نور کو پھیلایا۔ لیکن یہ علماء جدید علوم اور جدید دور کے تقاضوں سے بے بہرہ رہے۔ دیو بند کے فارغ التحصیل طلباء امامت، خطابت اور مناظرے کے علاوہ کسی دوسرے پیشے سے منسلک نہ ہو سکتے تھے۔ ان کی تعلیم کا مقصد صرف اشاعت اسلام تھا۔

اس طرح علی گڑھ اور دیو بند اپنے اپنے طریق کار اور اندازفکر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ایک ایسے ادارے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جو ان دونوں اداروں کی خوبیوں کا حامل ہو۔ لیکن انتہا پسندی کے رجحان سے پاک ہو۔

1892ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے اجلاس میں یہ طے پایا کہ علماء کی ایک مستقل انجمن ہو جو مسلمانوں کی راہنمائی و راہبری کر سکے۔ 1894ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ معرض وجود میں آیا۔ اس کے بانی مولانا محمد علی کانپوری اور مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا عبدالحق نے اس کے قواعد و ضوابط تیار کیے اور ایک پروگرام تشکیل دیا جو جدید و قدیم کی انتہا پسندی کو ختم کر کے دونوں ضرورتوں کو پورا کرے۔

ندوہ کے مقاصد

ندوہ کے اہم مقاصد میں مسلمانوں کی اصلاح کرنا اور انہیں دینی علوم کی طرف راغب کرنا تھا۔ ندوہ دینی علوم کی ترقی، تہذیب و شائستگی کے اطوار اور اخلاقی ترقی کے لئے معرض وجود میں آیا۔ اس کے دوسرے مقاصد میں علماء کرام کے باہمی اختلاف کو ختم کرنا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے تدابیر کرنا تھا۔ ندوہ کے مقاصد میں سیاسی معاملات سے علیحدگی پر زور دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک عظیم الشان دار العلوم کا قیام جہاں علوم وفنون کے علاوہ عملی صنائع کی تعلیم کا بھی بندوبست ہو ندوہ کے مقاصد میں شامل تھا۔

ندوہ کا آغاز

ندوۃ العلماء کے اصل محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن اس کے آغاز میں مولانا محمد علی مونگیری نے اہم کردار ادا کیا اور اس کی بنیاد رکھی۔ ندوہ کے قیام کے وقت برصغیر میں اس کا وسیع پیمانے پر خیر مقدم کیا گیا۔ 1894ء میں محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے سالانہ جلسے میں نواب محسن الملک نے ندوہ کی حمایت میں قرار داد پیش کی۔ سر سید احمد خاں نے بھی ندوہ کے قیام کی حمایت کی۔ 2 دسمبر 1898ء کو ندوہ کے باقاعدہ دفتر کا آغاز لکھنؤ میں کیا گیا۔

ندوہ کے قیام پذیر ہوتے ہی کلاسوں کا اجراء ہوا۔ شاہجہان پور کے امرا نے ندوہ کے لئے اراضی مختص کی۔ سر آغا خان اور والئے بھوپال نے سالانہ عطیات مقرر کئے۔ حکومت نے ندوہ کے لئے ایک وسیع و عریض قطعہ اراضی دے دیا۔ 28 دسمبر 1908ء کو سر جان ہیوٹ لیفٹیننٹ گورنر یوپی نے دار العلوم کا سنگ بنیاد رکھا۔

ندوہ کے قیام کے ساتھ اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ سر انٹونی میکڈانلڈ جو اردو دشمنی کی وجہ سے خاصا مشہور تھا ندوہ کے قیام کے وقت یو پی کا گورنر تھا۔ میکڈانلڈ نے ندوہ کو سیاسی سرگرمیوں کا اکھاڑہ قرار دیا اور اس کی مخالفت شروع کر دی۔ اس کے علاوہ مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ندوہ کی مخالفت کی اور اس کے دینی عقائد اور مقاصد پر اعتراضات کئے۔

8 ندوۃ العلماء اور مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی تقریباً 13 برس تک علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد رہے۔ آپ سر سید احمد خان کے مذہبی نظریات سے اختلافات رکھتے تھے۔ 1904ء میں آپ علی گڑھ کالج کی انتظامیہ اور سر سید سے اختلافات کی بناء پر مستعفی ہوئے اور ندوۃ العلماء سے منسلک ہو گئے۔ آپ کی آمد سے ندوہ میں نیا نکھار پیدا ہوا اور آپ نے ندوہ کے تعلیمی معیار میں قابل قدر اضافہ کیا۔ ندوہ کے متعلق حکام کی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں آپ نے بہت زیادہ کام کیا۔ آپ کے زمانے میں ندوہ نے بہت ترقی کی اور اس کی مالی حالت مستحکم ہوئی۔ 1913ء میں مولوی عبدالکریم نے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے سر سید اور مولانا شبلی کے نظریات پر سخت تنقید کی تھی اور حکومت کو ان دونوں کے متعلق واضح رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مولانا شبلی نے اس مضمون پر مولوی عبدالکریم پر شدید نکتہ چینی کی جس کی بناء پر مولوی عبدالکریم کو تدریسی عملہ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مولوی عبدالکریم کی علیحدگی سے مولانا شبلی کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بننا پڑا جس کی وجہ سے مولانا شبلی نے 1913ء میں ندوہ سے استعفیٰ دے دیا۔ آپ کے بعد مولانا عبدالحئی نواب حسین علی خان اور ڈاکٹر سید عبدالعلی ندوہ کی نظامت پر فائز ہوئے مولانا شبلی نعمانی کی علیحدگی سے ندوہ کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی اور ندوہ پر پھر وہ عروج کبھی نہ آسکا جو مولانا شبلی نعمانی کے دور میں آیا۔

ندوہ نے اپنے قیام کے وقت پر دعویٰ کیا تھا وہ علی گڑھ اور دیوبند کی خوبیوں کو لے کر ایک نئی فکر کی بنیاد ڈالے گا جو انتہا پسندی کے رجحان سے عاری ہوگی۔ لیکن ندوہ کو اپنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی لیکن اس کے باوجود ندوہ کی علمی اور اسلامی خدمات قابل تحسین ہیں۔ ندوہ سے ایسے جید اکابر پیدا ہوئے جنہوں نے تحریک آزادی اور تحریک پاکستان میں قوم کی بے لوث قیادت کی اور قوم کو اپنی منزل کے حصول میں مدد دی۔ ان علماء میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، سید نجیب اشرف، معین الدین ندوی، اور ابوالحسن ندوی اور مسعود عالم ندوی شامل ہیں۔ مولانا شبلی نے دار المصنفین کی بنیاد ڈالی جس نے علمی اور تحقیقی جریدے "معارف" کا اجراء کیا جو علمی اور تحقیقی اعتبار سے ممتاز مقام رکھتا ہے۔

9 ندوۃ العلماء تحریک دیوبند اور تحریک علی گڑھ

تینوں تحریکیں ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی اور معاشرتی اصلاح کے لئے چلائی گئیں اور بیک وقت شروع ہوئیں۔ تحریک دیوبند اور تحریک علی گڑھ میں چند اختلافات پائے جاتے تھے جو زیادہ تر سر سید احمد خان کے نظریات کی وجہ سے تھے۔ سر سید نے انگریزوں کی طرف مصالحت اور مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور مسلمانوں کی فلاح کے لئے انگریزی تعلیم کے حصول پر زور دیا۔ جب کہ تحریک دیوبند دینی تعلیم پر زور دیتی تھی اور مسلمانوں کی فلاح کے لئے اسلامی تعلیمات پر عملی پیرا ہونا ضروری سمجھتی تھی۔

ان اختلافات کے باوجود علی گڑھ اور دیوبند میں خیر سگالی اور مفاہمت کے جذبات موجود رہے ہیں۔ جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبند کے رئیس مقرر ہوئے تو ان کے زمانے میں علی گڑھ کے ساتھ تعاون و اشتراک کے جذبات کا اظہار کیا گیا۔ دوسری طرف نواب محسن الملک بھی اس قسم کے جذبات رکھتے تھے جس کے نتیجے میں علی گڑھ اور دیوبند میں طلباء کے تبادلے کا عہد نامہ عمل میں آیا۔

سیاسی نکتہ نظر سے دونوں اداروں میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ دیوبند کے علماء نے 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریز کے خلاف حصہ لیا تھا اس لئے ان پر ہمیشہ آزادی کا رنگ غالب رہا جبکہ تحریک علی گڑھ انگریزوں سے صلح جوئی کی پالیسی پر گامزن تھی اور

چاہتی تھی کہ انگریزوں کو حاکم وقت تسلیم کرتے ہوئے ان سے تعاون کیا جائے۔ بہر حال دونوں تحریکیں اپنے اپنے نکتہ نظر میں انتہا پسند کے راستے کو اپنائے ہوئے تھیں۔

ندوۃ العلماء نے علی گڑھ اور دیو بند کی انتہا پسندی سے ہٹ کر درمیانی راستہ اختیار کیا اور کوشش کی کہ تحریک علی گڑھ اور تحریک دیو بند کی خوبیوں کو ندوہ میں جمع کر لیا جائے۔ ندوۃ العلماء نے ایسے طلباء تیار کرنے کا دعویٰ کیا جو اسلامی تعلیمات کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کو بھی پورا کریں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ندوۃ العلماء اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

شروع میں ندوہ اور علی گڑھ میں خوشگوار تعلقات رہے۔ علی گڑھ کے اکابرین نے اس کے قیام کا خیر مقدم کیا۔ سرسید احمد خان نے بھی ندوہ کے مقاصد سے اتفاق کا اظہار کیا۔ مولانا شبلی نعمانی کی کوششوں سے دونوں تحریکیں ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔ لیکن چونکہ مولانا شبلی مذہبی معاملات میں سرسید احمد خان سے اختلاف رکھتے تھے اس لئے ندوہ اور علی گڑھ کے تعلقات متاثر ہوئے۔

ندوہ کے قیام کے وقت دیو بند سے اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ دونوں تحریکیں ایک دوسرے پر تنقید کرتی رہیں۔ لیکن سید سلیمان ندوی کوششوں سے دونوں تحریکوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا گیا۔

اگرچہ تینوں تحریکیں اپنے اپنے نظریات کے ساتھ مختلف پروگرام کے تحت چلتی رہیں لیکن تینوں تحریکوں کی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے خدمات بیش بہا ہیں۔ ان تحریکوں نے اسلام کی ترقی و ترویج کے لئے گراں قدر خدمات سر انجام دیں اور قوم کو جدوجہد آزادی میں اعلیٰ پایہ کی قیادت مہیا کی۔

(7) انجمن حمایت اسلام لاہور

برصغیر میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریک نے بہت اچھے نتائج پیدا کئے تھے اور مسلمانوں کی تعلیمی استعداد کو بڑھانے کے لئے خاطر خواہ کام کیا تھا۔ پنجاب اس وقت سکھوں کی عملداری میں تھا جس کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی معاشرتی اور دینی حالت پسماندہ تھی۔ پنجاب میں عیسائی اور ہندوؤں کے تعلیمی اداروں کی بہتات تھی جہاں پر مسلمانوں کے لئے داخلہ کا حصول بے حد مشکل تھا۔

کئی دردمند مسلمان راہنما پنجاب میں اپنی قوم کی تعلیمی پسماندگی سے پریشان تھے اور صدق دل سے یہ چاہتے تھے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی تعلیمی بحالی کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ مسلمان اپنے انتہا پسند رویے کی وجہ سے انگریزی تعلیم سے گریزاں رہے جس کا ہندوؤں نے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور تعلیمی میدان میں مسلمانوں سے آگے نکل گئے۔

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہو کر کئی تعلیمی تحریکیں میدان عمل میں آ گئی تھیں۔ ان حالات کے پیش نظر پنجاب سے چند مسلمان راہنماؤں نے مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم اور عیسائی مشنریوں کے اثر و نفوذ کا توڑ کرنے کے لئے لاہور میں انجمن حمایت اسلام قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ 24 ستمبر 1884ء کو اندرون موچی دروازہ لاہور مسجد بکن خان میں تقریباً اڑھائی سو مسلمانوں کے اجتماع میں انجمن حمایت اسلام کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔

انجمن حمایت اسلام کی بنیاد خلیفہ حمید الدین نے رکھی جو اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ ان کے علاوہ منشی چراغ دین ڈاکٹر محمد دین ناظر اور منشی عبدالرحیم انجمن کے چیدہ چیدہ کارکنوں میں سے تھے۔ انجمن کا دفتر ایک کمرے میں قائم کیا گیا۔

شروع میں انجمن کے مالی وسائل بہت کم تھے۔ انجمن کے کارکنوں نے نہایت محنت سے انجمن کے لئے چندہ اکٹھا کیا۔ انجمن کے کارکن گھر گھر جا کر لوگوں کو انجمن کے مقاصد سے روشناس کراتے تھے اور انہیں اس کار خیر میں شریک ہونے کے لئے کہتے تھے۔ انجمن کے مالی اخراجات پورا کرنے کے لئے مٹھی بھر آٹا سکیم شروع کی گئی۔ انجمن کے کارکن مسلمان گھروں میں برتن رکھ آتے تھے۔ جن میں

عورتیں روٹی پکاتے وقت مٹھی بھر آٹا نکال کر ڈال دیتی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہ برتن اکٹھے کر لئے جاتے تھے اور اس طرح جو آٹا جمع ہوتا تھا اسے فروخت کر کے اس کی آمدنی انجمن کو دے دی جاتی تھی۔ جس سے انجمن کے مالی اخراجات پورے کئے جاتے تھے۔

1۔ اغراض و مقاصد

انجمن حمایت اسلام کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے:

1- مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے ایسے اداروں کا قیام جہاں پر جدید اور قدیم تقاضوں سے پیش نظر تعلیم کا بندوبست کیا جا سکے۔
2- عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا ازالہ کرنا اور ان کے پروپیگنڈے کا تحریر و تقریر کے ذریعے جواب دینا۔
3- مسلمانوں کے یتیم اور لاوارث بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بندوبست کرنا۔
4- مسلم معاشرے کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا۔
5- مسلمانوں کی ثقافتی اور سماجی ترقی کیلئے کوشش کرنا۔
6- اسلام کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم کرنا۔

2۔ تعلیمی خدمات

اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انجمن حمایت اسلام نے بے لوث جذبے کے ساتھ گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انجمن نے اپنی تعلیمی خدمات کا آغاز مسلمان بچیوں کے لئے پرائمری سکول کے قیام سے کیا۔ انجمن کا طریق کار علی گڑھ تحریک کی تعلیمی تحریک سے ملتا جلتا تھا۔ 1884ء میں دو سکول کھولے گئے جن کی تعداد دس سال کے عرصے میں پندرہ تک پہنچ گئی۔ 1925ء میں لڑکیوں کے لئے مڈل سکول کھولا گیا۔ جو ایک سال کے عرصے میں ہائی سکول بنا دیا گیا۔

3۔ کالجوں کا قیام

انجمن نے مردوں اور عورتوں دونوں کی تعلیم کا بندوبست کیا۔ 1938ء میں اسلامیہ کالج کوپر روڈ برائے خواتین کی بنیاد ڈالی گئی اور 1939ء میں کریسنٹ ہوسٹل میں 75 طالبات کے ساتھ اسلامیہ کالج کوپر روڈ برائے خواتین کی کلاسوں کا اجراء ہوا۔ اس ادارے نے جلد ہی بہت ترقی کی اور 1942ء اور 1943ء میں یہاں پر ایم۔اے عربی اور جغرافیہ کی کلاسیں شروع ہو گئیں۔

مردانہ تعلیم کے لئے انجمن نے پہلا ادارہ شیرانوالہ گیٹ میں 1889ء میں قائم کیا۔ یہ ایک پرائمری سکول تھا جسے مدرسۃ المسلمین کہا جاتا تھا۔ بعد میں اسے مڈل اور ہائی سکول بنا دیا گیا۔ آج کل یہ سکول اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ کے نام سے مشہور ہے۔

1893ء میں مردوں کے کالج کی بنیاد ڈالی گئی اور اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ کے دو کمروں میں اسلامیہ کالج کی کلاسوں کا اجراء ہوا۔ 1905ء میں ریلوے روڈ پر 50 کنال اراضی حاصل کی گئی۔ جہاں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ قائم کیا گیا۔ کالج کی عمارت 1913ء میں مکمل ہوئی جس کا سنگ بنیاد امیر حبیب اللہ خان والی افغانستان نے رکھا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج سول لائنز اسلامیہ کالج کینٹ اور حمایت اسلام لاء کالج قائم کئے گئے۔ انجمن نے تعلیمی اداروں کے علاوہ یتیم خانے، دار الامان، طبیہ کالج، تعلیم بالغاں کے مراکز اور لائبریریاں بھی قائم کیں۔

انجمن ہر سال اپنے سالانہ جلسے منعقد کرتی تھی اور ان کی صدارت کے لئے متعدد شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ سر سید احمد خان، علامہ اقبال، نواب محسن الملک، مولانا الطاف حسین حالی، شیخ عبدالقادر، جسٹس شاہ دین نے انجمن کے جلسوں کی صدارت کی۔ ملک کی

بڑی بڑی ہستیوں کی انجمن کی صدارت کے لئے چنا جاتا تھا۔ انجمن کے جلسوں نے قوم میں بیداری پیدا کی اور انہیں اپنے حقوق سے روشناس کرایا۔

۱۶۔ انجمن حمایت اسلام کی سیاسی خدمات

انجمن کے مختلف اداروں نے تحریک پاکستان کے دوران بے مثال خدمات سرانجام دیں۔ انجمن کے سالانہ اجلاس مسلم لیگ کے اجلاس سمجھے جاتے تھے اور ان میں ممتاز مسلم لیگی راہنما شریک ہوتے تھے۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں پاکستان کے حق میں قرار دادیں پاس کی جاتی تھیں۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے طلباء اور اساتذہ نے تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیا۔ اسلامیہ کالج کے طلباء مسلم لیگ کے بہترین کارکن تھے اور تحریک پاکستان کے دوران ان طلباء نے قیام پاکستان کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے میں نمایاں کام انجام دیا۔ اسلامیہ کالج کے طلباء نے مسلم لیگ کے پیغام کو ملک کے کونے کونے میں پھیلایا۔ اسلامیہ کالج کے تاریخی گراؤنڈ میں قائداعظم نے پاکستان کا پرچم لہرایا تھا۔ اسلامیہ کالج کے طلباء قائداعظم کے جان نثار ساتھی اور کارکن تھے۔ 1940ء میں مسلم لیگ کے تاریخی جلسے کو کامیاب بنانے میں اسلامیہ کالج کے طلباء نے قابل قدر کام کیا تھا۔ اور قائداعظم کو جلسہ گاہ تک بحفاظت پہنچایا تھا۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے طلباء نے جناب حمید نظامی کی قیادت میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی تھی جس نے تحریک پاکستان میں قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا۔ سر شفیع، علامہ اقبال، سر عبدالقادر اور سر فضل حسین جیسے نامور حضرات انجمن حمایت اسلام کی صدارت پر فائز رہ چکے ہیں۔

دو قومی نظریئے کی اشاعت و ترویج کے لئے انجمن نے عملی مظاہرے کئے۔ لاہور اور پنجاب میں پاکستان کے حق میں تحریک اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے طلباء نے منظم کی۔ انجمن نے علامہ اقبال کے پیغام کو ملک کے کونے کونے تک پہنچایا۔ انجمن کے سالانہ جلسوں کے ذریعے سر سید احمد خان، نواب وقار الملک، مولانا الطاف حسین حالی اور سر عبدالقادر نے مسلمانوں کی رہبری کی۔

۱۷۔ سندھ مدرسہ کراچی

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے دوران سر سید احمد خان نے مسلمان رہنماؤں کو یہ تلقین کی کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں علی گڑھ کی طرز پر تعلیمی ادارے کھولیں تاکہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے بھرپور جدوجہد کی جا سکے۔ علی گڑھ کی تحریک کی کامیابی سے متاثر ہو کر کئی تعلیمی ادارے اور دوسری تنظیمیں معرض وجود میں آئیں جنہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ترقی کے لئے بھرپور کوششیں کیں۔

صوبہ سندھ میں کوئی ایسا ادارہ موجود نہ تھا جو مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری کر سکتا۔ 1884ء میں جب سید امیر علی کراچی آئے تو ان کو مسلمانوں کی تعلیمی بدحالی دیکھ کر شدید صدمہ پہنچا اور آپ نے سندھ میں کسی ایسے تعلیمی ادارے کے قیام پر زور دیا جو مسلمانوں کو جدید تقاضوں کے مطابق تعلیم سے بہرہ مند کر سکے۔ کراچی کے ایک دردمند شہری جناب حسن علی آفندی بھی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے دل سے خواہش مند تھے۔ آپ سید امیر علی کی سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کراچی کے بانی اور صدر تھے۔ آپ سر سید احمد خان کے بہت بڑے مداح تھے اور ان کی چلائی ہوئی علی گڑھ تحریک کے زبردست حامی تھے۔ آپ نے کراچی میں ایک مدرسہ قائم کرنے کے لئے کمیٹی بنائی۔ مدرسہ قائم کرنے کے لئے آپ نے چندے اکٹھے کئے۔ 1885ء میں بولٹن مارکیٹ کے قریب آپ نے ایک چھوٹی سی عمارت میں مدرسہ کی بنیاد رکھی جسے سندھ مدرسۃ الاسلام کہا جاتا ہے۔ بعد میں مدرسے کی عمارت کے لئے اراضی لی گئی

اور مدرسہ کی عمارت تعمیر ہوئی جس کا افتتاح یکم نومبر 1886ء کو لارڈ ڈفرن نے کیا۔

مدرسے کے بانی حسن علی آفندی ایک دردمند مسلمان راہنما تھے اور مسلمانوں کی بہتری کے خواہش مند تھے۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے عملی کام کرنا چاہتے تھے۔ آپ 1830ء حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وکالت پاس کی اور حیدر آباد میں قانون کی پریکٹس شروع کی۔ جلد ہی آپ کراچی منتقل ہو گئے۔ آپ کی خدمات کے پیش نظر ترکی کی حکومت نے آپ کو اپنا کونسل مقرر کیا۔ آپ کی وفات 1896ء میں ہوئی۔

1896ء میں حسن علی آفندی کی وفات کے بعد آپ کے بیٹے ولی محمد مدرسے کے منتظم مقرر ہوئے۔ آپ کے دور میں مدرسے کو سرکاری سر پرستی حاصل ہوئی۔ حکومت نے سالانہ گرانٹ مقرر کی لیکن ساتھ ہی مدرسے پر چند پابندیاں بھی عائد کیں۔ حکومتی پابندیوں کی وجہ سے مدرسے کی انتظامیہ میں بد دلی پھیلی اور حکومت کی عائد کردہ پابندیوں پر انتظامیہ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

مدرسے کا نظام تعلیم مرتب کرتے وقت علی گڑھ کی مثال سامنے رکھی گئی۔ اساتذہ کا چناؤ بڑی جانچ پڑتال کے بعد کیا جاتا تھا۔ مدرسے کے پہلے پرنسپل انگریز تھے۔ مدرسے میں انگریزی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم پر بھی زور دیا جاتا تھا۔ طلباء کو باقاعدگی سے نماز پڑھائی جاتی تھی۔

1938ء میں ولی محمد کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حسن علی عبدالرحمٰن مدرسے کے سربراہ بنے۔ آپ نے مدرسے کو سرکاری کنٹرول سے آزاد کرایا۔ 1943ء میں مدرسے کے بورڈ نے سندھ مدرسہ کو سندھ مسلم کالج بنانے کا فیصلہ کیا۔ سندھ مسلم کالج کا افتتاح قائداعظم نے اپنے ہاتھوں سے کیا۔ قائداعظم کی وصیت کے مطابق آپ کی جائداد کا خاصہ حصہ سندھ مسلم کالج کو دیا گیا۔

سندھ مدرسۃ الاسلام نے تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیا۔ یہ مدرسہ دو قومی نظریہ کا مرکز بن گیا اور دو قومی نظریہ کی ترقی و ترویج میں نمایاں کام سرانجام دیا۔ حسن علی آفندی نے مسلم لیگ کے کارکن کی حیثیت سے تحریک آزادی کے لئے بے پایاں کام کیا۔

9۔ اسلامیہ کالج پشاور

صوبہ سرحد میں تعلیم کا آغاز عیسائی مشنریوں نے کیا تھا۔ 1868ء میں مشن سکول کھولا گیا جو بعد میں ایڈورڈ کالج بن گیا۔ پشاور میں پہلا سکول 1888ء میں کھولا گیا۔ جو میونسپل ہائی سکول کے نام سے کھولا گیا۔ یہ سکول بعد میں گورنمنٹ کالج پشاور بن گیا جس کے پہلے پرنسپل علامہ عنایت اللہ خان المشرقی مقرر ہوئے۔

صوبہ سرحد میں دینی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ یہاں کے مسلمان راہنماؤں کا خیال تھا کہ صوبہ سرحد میں کوئی تعلیمی ادارہ قائم کیا جانا چاہئے جو مسلمانوں کو جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ سے روشناس کرائے ان دردمند راہنماؤں میں صاحبزادہ عبدالقیوم کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے بے مثال جدوجہد کی۔ اس مقصد کے لئے ٹھیکیدار بابو غلام حیدر اور میاں عبدالکریم نے صوبہ سرحد میں انجمن حمایت اسلام کی بنیاد ڈالی گئی۔

صاحبزادہ عبدالقیوم 12 دسمبر 1863ء کو ضلع مردان کی تحصیل صوابی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مشن ہائی سکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1887ء میں آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور ذاتی محنت اور لگن سے ترقی کرتے کرتے پولیٹکل ایجنٹ کے عہدہ تک پہنچے۔ آپ نے صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات کے نفاذ کے لئے گراں قدر کام کیا۔ آپ نے 4 دسمبر 1937ء کو وفات پائی۔

6۔ دار العلوم اسلامیہ کا قیام

صاحبزادہ عبدالقیوم علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد میں بھی علی گڑھ کی طرز کا کوئی تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے۔ 1912ء میں آپ نے تعلیمی ادارہ کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے کمیٹی تشکیل دی جس نے تقریباً پندرہ لاکھ روپیہ جمع کیا۔ درہ خیبر کو جانے والی سڑک پر پشاور سے پانچ میل دور 200 ایکڑ اراضی حاصل کی گئی۔ جہاں پر 1913ء میں اپنے انگریز دوست جارج روس کیپل کے تعاون سے صاحبزادہ صاحب نے دارالعلوم اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارے کا سنگ بنیاد حاجی ترنگ زئی کے ہاتھوں رکھا گیا جو کہ ریشمی رومال کی تحریک کے ایک عظیم مجاہد تھے۔

7۔ اسلامیہ کالج پشاور کا قیام

دار العلوم اسلامیہ صاحبزادہ عبدالقیوم کی خدمات اور کوششوں سے جلد ہی ترقی کر گیا اور اسلامیہ کالج پشاور کے نام سے مشہور ہوا۔ اسلامیہ کالج پشاور صوبہ کا سب سے بڑا تعلیمی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔ کالج کو ترقی دینے میں صاحبزادہ صاحب کی محنت اور کوششوں کا بہت دخل ہے۔ آپ نے کالج کی عمارتوں کو خوبصورت بنایا اور کالج کے تعلیمی معیار میں قابل قدر اضافہ کیا۔ آپ کالج کی انتظامیہ کے تاحیات سیکرٹری رہے۔ صوبہ سرحد میں آپ کی تعلیمی خدمات کے عوض آپ کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔

اسلامیہ کالج کے طلباء نے تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیا اور 1947ء کے استصواب رائے کو مسلم لیگ کے حق میں کامیاب بنانے میں اس کالج کے طلباء کا بہت بڑا حصہ ہے۔ قائداعظم کو اسلامیہ کالج کے طلباء سے بڑی محبت تھی اور کالج کے طلباء سے آپ دلی لگاؤ رکھتے تھے۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے ترکے سے وسیع حصہ اسلامیہ کالج پشاور کو دیا گیا۔

8۔ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد

ایسٹ انڈیا کمپنی جو ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئی تھی جلد ہی ہندوستان کے سیاسی نظام پر چھا گئی اور مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تقریباً ختم ہو گیا۔ مسلمان نئی صورت حال سے سخت پریشان تھے اور اپنا اقتدار کھونے کے بعد معاشرے میں اپنی اعلیٰ حیثیت بھی کھو چکے تھے۔ مسلمانوں کو اپنی آزادی اور اپنے اقتدار کے خاتمے کا سخت افسوس تھا اور وہ اپنی سابقہ حیثیت بحال کرنے کے خواہش مند تھے۔ مسلمانوں نے اپنی آزادی اور اپنا اقتدار بحال کرنے کے لئے جدوجہد کی اور تحریک مجاہدین سے مسلمانوں کی تحریک آزادی کا آغاز ہوا۔ بدقسمتی سے تحریک مجاہدین غداروں کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ 1857ء کی جنگ آزادی لڑی گئی لیکن یہ کوشش بھی رائیگاں گئی اور مسلمان انگریزوں کے زیر عتاب آ گئے۔ مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور انگریز ہندوؤں اور دوسری قوموں کے تعاون سے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے در پے ہو گئے۔

مسلمانوں پر باعزت معاشرتی زندگی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اور ان کی معاشی حالت کو تباہ کرنے کے لئے کئی اقدامات کیے گئے جس کی وجہ سے مسلمان پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتے چلے گئے۔

اس آڑے وقت میں سرسید احمد خان نے قوم کی رہبری کی۔ آپ نے مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی اور انہیں سیاست سے دور رہنے کی نصیحت کی۔ آپ کے خیال میں جب تک مسلمان پوری طرح مغربی تعلیم سے بہرہ ور نہ ہو جاتے سیاسی سرگرمیاں ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتیں۔ تحریک علی گڑھ کے ذریعے آپ نے مسلمانوں کو نئی راہ دکھائی اور ان کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالت کو سنبھالا اور انہیں اپنا کھویا ہوا معاشرتی مقام حاصل کرنے میں مدد دی۔

یکم نومبر 1858ء کو ہندوستان کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے لیا گیا اور اسے تاج برطانیہ کے سپرد کر دیا گیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی نے انگریز حکمرانوں پر یہ بات عیاں کر دی تھی کہ اگر ہندوستان کے لوگوں کو حکومتی کاموں میں شریک نہ کیا گیا اور انہیں مراعات نہ دی گئیں تو ہندوستان میں انگریز اپنے پاؤں نہ جما سکیں گے۔ سرسید احمد خان نے ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر حکومت کی کمزوری کی نشاندہی کی تھی اور برطانوی حکومت کو مقامی باشندوں کو حکومت کے انتظام میں شریک کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ آپ نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے حکومت پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اب ہندوستان کے مقامی باشندوں کو کسی نہ کسی شکل میں حکومت کے انتظام میں شامل کرنا پڑے گا۔ آپ نے حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ مقامی باشندوں کو لیجسلیٹو کونسل میں نمائندگی دی جائے۔ اس طرح مقامی باشندوں میں حکومت کے لئے وفاداری کے جذبات پیدا ہوں گے۔

ہندوستان میں پہلا قانونی ڈھانچہ 1861ء میں نافذ کیا گیا۔ اس ایکٹ کی رو سے حکومت کے سربراہ جسے گورنر جنرل کہا جاتا تھا کی انتظامی کونسل میں پہلی بار ہندوستانی باشندوں کو شامل کیا گیا۔ 1892ء میں دوسرا قانون جاری کیا گیا جسے انڈین کونسلز ایکٹ 1892ء کہا جاتا ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے مجلس قانون ساز کے ممبران کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔

1885ء میں کانگریس معرض وجود میں آئی۔ اپنے قیام کے موقع پر کانگریس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کے تمام لوگوں کی نمائندگی کرے گی۔ شروع شروع میں کانگریس نے اپنے وعدہ کا تھوڑا بہت احساس کیا۔ لیکن آہستہ آہستہ کانگریس کی سرگرمیاں ہندوآنہ ہوتی چلی گئیں۔

کانگریس نے اپنے متعصبانہ رویہ کا سب سے پہلے اظہار اس وقت کیا جب اس نے گورنر جنرل کی کونسل، اور صوبائی کونسلوں میں نامزدگی کے طریق کار کو ختم کر کے انتخاب کے ذریعے تقرری کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد کانگریس نے سرکاری ملازمت میں بھرتی کے لئے مقابلے کے امتحان کا مطالبہ کیا۔ اور یہ کہا کہ تمام سرکاری عہدوں پر تقرری مقابلے کے امتحان کے ذریعے کی جائے۔

بظاہر یہ مطالبات نہایت معصوم اور بے ضرر نظر آتے تھے۔ لیکن ان کے پس پردہ ہندو کی ازلی مسلمان دشمنی چھپی تھی۔ کانگریس کو یہ علم تھا کہ اگر ہندوستان میں مغربی جمہوریت کا اجراء کر دیا جائے تو مسلمان کبھی بھی انتخاب نہ جیت سکیں گے۔ اور اس طرح حکومت کے اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح مقابلے کے امتحان کا مطالبہ کرنے کا مقصد بھی مسلمانوں کو سرکاری ملازمت سے خارج کرنا تھا کیونکہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے اور کسی صورت میں بھی مقابلے کے امتحان میں ہندوؤں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔

سرسید احمد خان نے کانگریس کے مطالبات کی شدت سے مخالفت کی اور حکومت پر یہ واضح کیا کہ ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت نہیں چل سکتی۔ کیونکہ ہندوستان میں کئی قومیں آباد ہیں۔ آپ نے مقابلے کے امتحانوں پر بھی نکتہ چینی کی اور کہا کہ مقابلے کے امتحان ایسی صورت میں لاگو کئے جا سکتے ہیں جب کہ تمام قوموں کو یکساں تعلیمی سہولتیں میسر ہوں۔ آپ نے مسلمانوں پر کانگریس کی سیاسی چالوں کی وضاحت کی اور انہیں کانگریس سے علیحدہ ہونے کی تلقین کی۔

9 اردو ہندی تنازعہ

اردو زبان کی ترقی و ترویج کا آغاز مغلیہ دور سے شروع ہوا اور یہ زبان جلد ہی ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی ہندوؤں کے مسلمانوں کی زبان بن گئی۔ اردو کئی زبانوں کے امتزاج سے معرض وجود میں آئی تھی۔ اس لئے اسے لشکری زبان بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی ترقی میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو ادیبوں نے بھی بہت کام کیا ہے۔ سرسید احمد خان نے بھی اردو کی ترقی و ترویج میں نمایاں کام کیا ہے۔ لیکن چونکہ ہندو فطری طور پر اس چیز سے نفرت کرتا تھا جس سے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ثقافت وابستہ ہو لہٰذا ہندوؤں نے

اردو زبان کی مخالفت شروع کر دی۔

1867ء میں بنارس کے چیدہ چیدہ ہندو راہنماؤں نے یہ مطالبہ کیا کہ سرکاری عدالتوں اور دفاتر میں اردو اور فارسی کو یکسر ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ ہندی کو سرکار زبان کے طور پر رائج کیا جائے۔ ہندوستان کے اس مطالبے سے سرسید احمد خان پر ہندوؤں کا تعصب عیاں ہو گیا اور انہیں ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں اپنے خیالات بدلنے پڑے۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ

''مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اب ہندو اور مسلمان بطور ایک قوم کے کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔''

سرسید احمد خان نے ہندوؤں کی اردو زبان کی مخالفت کے پیش نظر اردو کے تحفظ کے لئے اقدامات کرنے کا ارادہ کیا۔ 1867ء میں آپ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایک ''دار الترجمہ'' قائم کیا جائے تا کہ یونیورسٹی کے طلباء کے لئے کتابوں کا اردو ترجمہ کیا جا سکے۔ ہندوؤں نے سرسید احمد خان کے مطالبے کی شدت سے مخالفت کی لیکن آپ نے تحفظ اردو کے لئے ہندوؤں کا خوب مقابلہ کیا۔ آپ نے الہ آباد میں ایک تنظیم سنٹرل ایسوسی ایشن قائم کی اور سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے اردو کی حفاظت کا بخوبی بندوبست کیا۔

ہندوؤں نے اردو کی مخالفت میں اپنی تحریک کو جاری رکھا۔ 1871ء میں بنگال کے لیفٹنٹ گورنر کیمبل نے اردو کو نصابی کتب سے خارج کرنے کا حکم دیا۔ ہندوؤں کی تحریک کی وجہ سے 1900ء میں یو پی کے بدزمانہ گورنر انٹونی میکڈانل نے احکامات جاری کیے کہ دفاتر میں اردو کی بجائے ہندی کو بطور سرکاری زبان استعمال کیا جائے۔

اس حکم کے جاری ہونے پر مسلمانوں میں زبردست ہیجان پیدا ہوا۔ 13 مئی 1900ء کو علی گڑھ میں نواب محسن الملک نے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے حکومت کے اقدام پر سخت نکتہ چینی کی۔ نواب محسن الملک نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔ جس کے تحت ملک میں مختلف مقامات پر اردو کی حمایت میں جلسے کیے گئے اور حکومت کے خلاف سخت غصے کا اظہار کیا گیا۔ اردو کی حفاظت کے لئے علی گڑھ کے طلباء نے پر جوش مظاہرے کیے جس کی بنا پر گورنر میکڈانل کی جانب سے نواب محسن الملک کو یہ دھمکی دی گئی کہ کالج کی سرکاری گرانٹ بند کر دی جائے گی۔ اردو کے خلاف تحریک میں کانگریس اپنی پوری قوت کے ساتھ شامل کار رہی۔ گاندھی نے بھی اردو کے خلاف زہر اگلا اور اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اردو زبان کی مخالفت کے نتیجے میں مسلمانوں پر ہندو ذہنیت پوری طرح آشکار ہو گئی۔ اس تحریک کے بعد مسلمانوں کو اپنے ثقافتی ورثے کا پوری طرح احساس ہوا اور قوم اپنی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے لئے متحد ہوئی۔

1 تقسیم بنگال

صوبہ بنگال رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا صوبہ تھا اور اس کی آبادی 7 کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اتنے بڑے صوبے کا انتظام چلانا ایک لیفٹیننٹ گورنر کے بس کی بات نہ تھی۔

1899ء میں لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے بنا جو اپنی انتظامی صلاحیتوں کے لئے بہت مشہور تھا۔ لارڈ کرزن نے صوبہ بنگال کا دورہ کیا اور یہ محسوس کیا کہ یہ صوبہ انتظامی نقطہ نظر سے بہت بڑا ہے۔ اس سے پہلے صوبے کے مختلف گورنر بھی صوبے کی انتظامی مشکلات کا تذکرہ کر چکے تھے اور انتظامی سہولت کے پیش نظر اس کی تقسیم کی سفارش کر چکے تھے۔

بالآخر 1905ء میں لارڈ کرزن نے یہ فیصلہ کیا کہ صوبہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ صوبہ بنگال کی تقسیم کا منصوبہ برطانوی حکومت کی منظوری کے لئے بھیجا گیا۔ تاج برطانیہ کی منظوری کے بعد 16 اکتوبر 1905ء کو صوبہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ مشرقی بنگال اور دوسرا حصہ مغربی بنگال کہلایا۔ نیا صوبہ مشرقی بنگال کا صوبہ تھا جس میں ڈھاکہ، میمن سنگھ، فرید پور، چٹاگانگ، آسام، راج شاہی، کھلنا، رنگ پور، مالدہ اور بوگرہ کے اضلاع شامل تھے۔ یہ تقسیم صرف انتظامی نقطہ نظر سے کی گئی تھی اور اس صوبہ کا صدر مقام ڈھاکہ مقرر ہوا۔ مغربی بنگال کا صدر مقام کلکتہ مقرر ہوا جس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔

مشرقی بنگال کے معرض وجود میں آ جانے سے نئے صوبے میں مسلمان اکثریت میں آ گئے تھے۔ اس تقسیم سے مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی نقطہ نظر سے فائدہ پہنچنے کی توقع تھی۔ لیکن ہندو کسی صورت میں بھی مسلمانوں کی ترقی کے خواہش مند نہ تھے۔ نئے صوبہ میں ہندوؤں کی بالا دستی ختم ہو گئی تھی۔ ہندو وکلاء کو یہ خدشہ تھا کہ ڈھاکہ میں ہائی کورٹ کے قیام سے کلکتہ کے وکلاء کی قانونی پریکٹس متاثر ہوگی۔ اسی طرح ہندو پریس بھی خائف تھا کہ اب ڈھاکہ صحافتی سرگرمیوں کا مرکز بن جائے گا جہاں سے مسلمانوں کے سیاسی نقطہ نظر کی اشاعت کی جائے گی۔ اس کے علاوہ تقسیم بنگال سے صوبہ کا مشرقی حصہ مغربی بنگال کے تسلط سے آزاد ہو گیا تھا۔ مغربی بنگال کی تمام صنعت و حرفت کا دارومدار مشرقی بنگال سے آنے والے خام مال پر تھا اور مغربی بنگال کی تمام تجارت مشرقی بنگال کے سرمائے سے چلتی تھی۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ مشرقی بنگال کے صوبے کی وجہ سے مغربی بنگال کی معاشی حالت پر برے اثرات پڑیں گے۔

ان حالات کے پیش نظر ہندوؤں نے تقسیم بنگال کے خلاف سخت قسم کی تحریک چلائی۔ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کو ہتک آمیز قرار دیا۔ کلکتہ کو تحریک کا مرکز بنایا گیا اور تقسیم بنگال کو کالی ماتا کی تقسیم کہا گیا۔ ہندو اس بات سے متفق نہیں تھے کہ بنگال کی تقسیم انتظامی سہولتوں کے لئے کی گئی ہے۔ ان کے مطابق اس کا اصل مقصد ہندوستانیوں کی قومی تحریکوں کو کمزور کرنا تھا اور تقسیم بنگال کے ذریعے بنگال کے رہنے والوں کے درمیان نفرت کے بیج بوئے گئے تھے۔

16 اکتوبر 1905ء کے دن کو ہندوؤں نے قومی المیہ قرار دیا۔ ملک میں ہڑتالیں کی گئیں جلوس نکالے گئے کاروبار بند کر دیا گیا۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس بھی تقسیم کے خلاف میدان عمل میں آ گئی۔ اس تحریک کو مذہبی رنگ دیا گیا۔ ہندو طلباء نے مظاہرے کئے اور تشدد کی وارداتیں ہوئیں۔ کانگریس نے 1906ء کے سالانہ جلسے میں تقسیم بنگال کے خلاف بائیکاٹ کو جائز قرار دیا اور تقسیم بنگال پر شدید تنقید کی۔

ہندوؤں کی تحریک نے جلد ہی متشددانہ رنگ اختیار کر لیا۔ بنگال میں کرایہ نہ دو کی تحریک چلائی گئی۔ سیاسی بے چینی بڑھتی گئی اور بنگال اور دوسرے علاقوں میں فسادات شروع ہو گئے۔ انگریزوں پر جانی حملے کئے گئے اور بموں کے دھماکے کئے گئے۔ جس میں ایک انگریز بیرسٹر کی بیوی اور بیٹی ہلاک ہو گئیں۔ سودیشی تحریک کے ذریعے ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ مشرقی بنگال کے گورنر کی گاڑی پر حملہ کیا گیا اور اسے پٹڑی سے اتارنے کی کوشش کی گئی۔ وائسرائے کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی جو ناکام ہو گئی۔

تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو صدیوں بعد یہ موقع ملا تھا کہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکیں۔ مسلمانوں نے تقسیم بنگال کا خیر مقدم کیا اور حکومت کے اس اقدام کو بے حد سراہا اور حکومت سے اصرار کیا کہ اسے برقرار رکھا جائے۔ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو بے حد فائدہ پہنچا تھا اور ان پر معاشی و معاشرتی ترقی کے راستے کھل گئے تھے۔

حکومت آخر کار ہندوؤں کے ایجی ٹیشن کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ ہندوؤں نے شہنشاہ جارج پنجم کے دورہ ہندوستان کے دوران حکومت سے تعاون نہ کرنے کی دھمکی دی تھی جو بہت کارگر ثابت ہوئی۔ بالآخر 12 دسمبر 1911ء کو تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان کیا گیا اور اس طرح ایک ایسی اصلاح جو صرف انتظامی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے کی گئی تھی ناکام ہو گئی۔

تقسیم بنگال کی منسوخی سے مسلمانوں پر ہندوؤں کی ذہنیت واضح ہوئی اور مسلمان یہ سمجھ گئے کہ ہندو کسی طرح بھی مسلمانوں کی طرف مخلص نہیں۔ تقسیم بنگال کے خلاف ہندو ایجی ٹیشن نے دو قومی نظریہ کو تقویت دی اور مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

2۔ شملہ وفد

ہندوستان کے سیاسی حالات کے پیش نظر برطانوی حکومت نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں کچھ آئینی اصلاحات نافذ کی جانی چاہیں۔ 1905ء کے عام انتخابات میں لبرل پارٹی واضح اکثریت سے انتخابات جیت کر برسر اقتدار آ گئی تھی۔ یہ پارٹی اس بات کے حق میں تھی کہ ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیے اور انہیں حکومت کے انتظام میں خاطر خواہ حصہ دینا چاہیے تاکہ وہ حکومت سے وفاداری کا اظہار کریں اور قوانین کو بحالت مجبوری قبول نہ کریں۔ چنانچہ لبرل پارٹی نے برسر اقتدار آنے پر اعلان کیا کہ وہ عنقریب ہندوستان میں آئینی اصلاحات نافذ کرے گی۔

اس اعلان کے ساتھ ہی مسلمان لیڈروں نے یہ فیصلہ کیا کہ وائسرائے سے ملاقات کی جائے اور اسے ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات بتائے جائیں۔ نواب محسن الملک نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملاقات کے لئے دیگر اکابر سے گفت وشنید کی اور طے پایا کہ مسلمان راہنماؤں کا ایک وفد وائسرائے ہند سے ملاقات کے لئے تشکیل دیا جائے۔

وائسرائے لارڈ منٹو سے ملاقات کا وقت لینے کے لئے علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بالڈ سے رابطہ قائم کیا گیا جو ان دنوں شملہ میں گرمیوں کی تعطیلات گزار رہے تھے۔ اتفاق سے وائسرائے ہند لارڈ منٹو بھی ان دنوں شملہ میں مقیم تھے۔ مسٹر آرچ بالڈ نے وائسرائے کے پرائیوٹ سیکرٹری کرنل ڈنلپ سمتھ سے ملاقات کی اور انہیں وائسرائے سے ملاقات کا وقت لینے کے لئے کہا۔ کرنل ڈنلپ نے وائسرائے سے ملاقات کا وقت طے کر کے آرچ بولڈ کو اطلاع دی کہ وائسرائے ہند مسلمانوں کے وفد سے ملاقات کے لئے تیار ہیں۔ کرنل ڈنلپ نے یہ کہا کہ مطالبات کا ڈرافٹ بنا کر انہیں ارسال کر دیا جائے جس میں حکومت برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا گیا ہو۔ کرنل ڈنلپ نے یہ بات بھی کہی کہ مسلمان رہنما اپنے ڈرافٹ میں یہ بات ضرور لکھیں کہ ہندوستان میں جمہوری نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یکم اکتوبر 1906ء کو آغا خان کی قیادت میں 35 افراد پر مشتمل مسلمان راہنماؤں کے ایک وفد نے شملہ میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملاقات کی۔ وفد نے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے۔

1. قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کی نسبت زیادہ نشستیں دی جائیں اور ان کا انتخاب جدا گانہ انتخاب کے اصول پر کیا جائے۔
2. سرکاری گزٹیڈ اور نان گزٹیڈ ملازمتوں پر آبادی کے لحاظ سے مسلمان افسروں کا تقرر کیا جائے۔ مسلمانوں کو ملک کی اعلیٰ آسامیوں میں بھی حصہ دیا جائے۔
3. مسلمانوں کو ہائی کورٹ اور چیف کورٹ میں جج مقرر کیا جائے۔
4. یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹوں اور سینٹوں میں مسلمانوں کے لئے نشستیں مخصوص کی جائیں۔
5. مسلم یونیورسٹیوں کے قیام کے لئے مدد دی جائے۔
6. تقسیم بنگال کو منسوخ نہ کیا جائے۔
7. مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی تشخص کی بقاء کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے وفد کے مطالبات کو پورے غور سے سنا اور ان سے مکمل اتفاق کیا۔ لارڈ منٹو نے مسلمان راہنماؤں سے یہ وعدہ کیا کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے اپنے پورے اختیارات استعمال کرے گا۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق کو تسلیم کیا اور تقسیم بنگال کو حتمی اور قطعی قرار دیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام 1906ء

کانگریس کی سیاست نے مسلمان رہنماؤں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کانگریس کے ہتھکنڈوں کا موثر جواب دینے کے لئے اور مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی سیاسی تنظیم ہونی چاہئے جو مسلمانوں کو ان کے حقوق سے آگاہ کرے۔ شملہ وفد کی کامیابی نے بھی مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ مسلمانوں کے تحفظ کے لئے منظم کوشش ہونی چاہئے اور اب مسلمانوں کو عملی سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔

دسمبر 1906ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ کی درخواست پر ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ جس میں تمام زعماء نے شرکت کی۔ 30 دسمبر 1906ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں تمام اکابرین نے مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم بنانے پر زور دیا۔ سلیم اللہ نے ایک سیاسی تنظیم کا خاکہ پیش کیا جس کا نام ''آل انڈیا مسلم کنفیڈریسی'' تجویز کیا۔ نواب وقار الملک نے بھی اپنی صدارتی تقریر میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا جس کا نام ''آل انڈیا مسلم لیگ'' رکھا گیا۔ نواب سلیم اللہ کی پیش کی ہوئی قرار داد کی تائید حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان نے کی۔ اس طرح 30 دسمبر 1906ء کو آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی جو مسلمانوں کی سیاسی تنظیم تھی اور جس نے مسلمانوں کی تحریک آزادی میں رہبری کی۔

مسلم لیگ کے مقاصد

مسلم لیگ مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کے لئے قائم کی گئی۔

1- مسلمانوں میں برطانوی حکومت سے وفاداری کے جذبات پیدا کرنا اور حکومت کے اقدامات کے متعلق ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔
2- مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا اور حکومت کو ان سے آگاہ کرنا۔
3- مندرجہ بالا مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر ہندوستان کی دوسری قوموں اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرنا اور خیر سگالی اور مفاہمت کے جذبات پیدا کرنا۔

نواب وقار الملک کو مسلم لیگ کا سیکرٹری چنا گیا۔ اس کے ساتھ ہی چھ افراد پر مشتمل کمیٹی مقرر کی گئی جس کے ذمے مسلم لیگ کا دستور بنانے کا کام تھا۔ 29 اور 30 دسمبر 1907ء کو مسلم لیگ کا پہلا جلسہ کراچی میں منعقد ہوا جس کی صدارت سر آدم جی پیر بھائی نے کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کے دستور کی منظوری دی گیء۔ 18 مارچ 1908 کو مسلم لیگ کا دوسرا جلسہ علی گڑھ میں منعقد ہوا جس کی صدارت جسٹس شاہ دین نے کی۔ کراچی کے اجلاس سے پہلے نواب محسن الملک فوت ہو چکے تھے۔ علی گڑھ کے اجلاس میں سر آغا خان کو مسلم لیگ کا صدر اور میجر سید حسن بلگرامی کو سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ مسلم لیگ کی شاخیں تمام ملک میں قائم کی جائیں۔ سید امیر علی نے لندن میں محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی تھی جسے مسلم لیگ کی لندن شاخ بنا دیا گیا۔

مسلم لیگ کو اپنے ابتدائی مقاصد میں بڑی کامیابی ہوئی۔ 1909ء کی منٹو مارلے اصلاحات میں مسلم لیگ نے سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ آسامیوں پر مسلمانوں کی تعیناتی کا مطالبہ کیا۔ جس کے نتیجے میں جناب شرف الدین، جناب کرامت حسین اور جناب شاہ دین کلکتہ، پنجاب اور الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔

مسلم لیگ نے اوقاف بل منظور کرایا جس کا مسلمانوں کو بے پناہ فائدہ ہوا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے اوقاف کا کوئی معقول انتظام موجود نہ تھا جس کی وجہ سے مسلمان ان سے استفادہ نہ کر سکتے تھے۔ قائداعظم کی کوشش سے 1913ء اوقاف بل کا مسودہ تیار کر کے وائسرائے کی کونسل میں پیش کیا گیا جو فوری طور پر منظور کر لیا گیا اور قانونی شکل میں نافذ کر دیا گیا۔

منٹو مارلے اصلاحات 1909ء

ہندوؤں کے انتہا پسندانہ رویے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان تھے۔ انہیں اس خیال سے سخت پریشانی لاحق تھی کہ اگر کبھی انگریز ہندوستان سے چلے گئے تو وہ ہمیشہ کے لئے ہندو کی ظالمانہ برتری تلے پس کے رہ جائیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی جداگانہ حیثیت کو منوانے کے لئے تگ و دو کی تاکہ ان کے حقوق کا بھرپور تحفظ ہو سکے۔ مسلم لیگ کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس نے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری اقدامات کئے۔

ہندو اور مسلمان ثقافتی، تاریخی اور تہذیبی لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے اور کبھی بھی مشترکہ قومیت کا تصور پیش نہ کر سکے تھے۔ انگریز حکمران مسلمانوں اور ہندوؤں کے ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی فرق سے بخوبی آگاہ تھے اور اسی لئے انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ اور ثقافت کے تحفظ کے لئے ہندوستانی جمہوری اقدار کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

1908ء میں شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی گولڈن جوبلی منائی گئی اور اس موقع پر برطانوی حکومت نے ہندوستان کے نام اپنے پیغام میں یہ کہا کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں جمہوریت کی ترقی کی خواہش مند ہے اور چاہتی ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ جمہوری تقاضوں کے پیش نظر سلوک کیا جائے۔ چنانچہ 1909ء میں ایک ایکٹ کا نفاذ کیا گیا جس میں آئینی اصلاحات کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ کا نام وائسرائے ہند لارڈ منٹو اور وزیر ہند مسٹر مارلے کے ناموں کی مناسبت سے منٹو مارلے اصلاحات 1909ء رکھا گیا۔

منٹو مارلے اصلاحات کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں۔

1. جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا۔ ہندو اور مسلمانوں کے رائے دہندگان کے لئے علیحدہ علیحدہ لسٹیں تیار کرنے کا حکم دیا گیا۔
2. مجالس قانون ساز کی توسیع کی گئی۔
3. کونسلوں کے اختیارات بڑھا دیئے گئے۔ اب کونسل کا ہر رکن کوئی بھی قرارداد اسمبلی میں بحث کیلئے پیش کر سکتا تھا۔
4. وائسرائے کی کونسل کے اراکین کی تعداد ساٹھ کر دی گئی۔
5. بنگال، یوپی، بہار، بمبئی، مدراس اور اڑیسہ کی مجالس قانون ساز کی تعداد بڑھا کر 50 کر دی گئی۔
6. پنجاب، برما اور آسام کی مجالس قانون ساز کی تعداد تیس کر دی گئی۔
7. قانون ساز اسمبلی کو بجٹ پر بحث کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔
8. وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانی باشندوں کو شامل کیا گیا۔
9. یونیورسٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں اور دیگر تجارتی اداروں کو اپنے ارکان منتخب کرنے کی اجازت دے گئی۔

10- بنگال، بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں لیفٹنٹ گورنر مقرر کرنے کی اجازت دے دی گئی اور انہیں اپنی کونسلوں کی تشکیل کا اختیار دیا گیا۔

ان اصلاحات میں چند خامیاں پائی جاتی تھیں۔ لیکن وقتی طور پر یہ اصلاحات سودمند ثابت ہوئیں اور انہوں نے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں اور ہندوؤں میں پائی جانے والی نفرت کو کسی حد تک ختم کیا۔ یہ اصلاحات زیادہ دیر تک نہ چل سکیں اور ملک میں سیاسی بے چینی اور افراتفری میں اضافہ ہوا۔

مسلم لیگ سیاست کے نئے موڑ پر

مسلم لیگ اپنے قیام کے ساتھ ہی مسلمانوں کے حقوق کے لئے سرگرم عمل ہوگئی تھی۔ مسلم لیگ نے سرسید احمد خان کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھایا اور حکومت سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کئی مراعات حاصل کرلیں۔ جن میں سب سے زیادہ اہم جداگانہ انتخاب کا مطالبہ تھا جسے حکومت نے 1909ء کی اصلاحات میں قانونی شکل دے دی تھی۔ حکومت کا یہ اقدام ملک میں نمائندہ حکومت کے قیام کی طرف پہلا قدم تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاسی استحکام نصیب ہوا۔

ابتدائی کامیابیوں کے باوجود مسلم لیگ ابھی اتنی سیاسی اہمیت حاصل نہ کرسکی تھی جتنی کہ کانگریس کو حاصل تھی۔ مسلم لیگ کی جانب حکومت کا رویہ ابھی اتنا ہمدردانہ نہ تھا جتنا کہ کانگریس کی طرف تھا۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ اور کانپور مسجد کے واقعات نے مسلمانوں کو بھڑکایا ہوا تھا اور مسلمان حکومت کی پالیسی سے ناخوش تھے۔ بیرونی طور پر بھی حالات کافی مخدوش تھے۔ ستمبر 1911ء میں اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا تھا جہاں تیرہ سو سال سے مسلمانوں کی حکومت قائم تھی انگریزوں نے ترک فوجوں کو مصر سے نہ گزرنے دیا جو کہ اٹلی کی فوجوں کو طرابلس سے نکالنا چاہتی تھیں۔ چونکہ ترک خلیفہ کو عالم اسلام کا سربراہ سمجھا جاتا تھا اس لئے اس واقعہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کو اور بھڑکا دیا۔

ان حالات کے پیش نظر اور حکومت کے رویے کو دیکھتے ہوئے مسلم لیگ کو اپنے مقاصد میں تبدیلی کرنا پڑی اور اپنے لائحہ عمل کو از سر نو مرتب کرنا پڑا۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ حکومت طاقت اور اتحاد کی زبان سمجھتی ہے اور صرف منظم طریقے ہی سے حکومت کو مطالبات ماننے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا مسلم لیگ نے اپنی جدوجہد کا رخ قومی اتحاد کی طرف موڑا اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں شروع کردیں۔

1910ء میں مسلم لیگ کا دفتر علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل کیا گیا۔ مسلم لیگ کی قیادت اب نوجوان راہنماؤں کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ 1913ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ آپ بیک وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے رکن تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔

1913ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں دو قرار دادیں پاس کیں جن کی رو سے مسلم لیگ کے آئین میں تبدیلی کی گئی اور خود مختار نظام حکومت کا حصول جو ہندوستان کے حالات کے مطابق ہو کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کرلیا اور اس کے حصول کے لئے دستوری طریقے اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔ دوسری قرار داد کے ذریعے یہ طے پایا کہ ہندستان کے عوام کی ترقی کا انحصار دو بڑی قوموں کے آپس میں خوشگوار تعلقات استوار کرنے پر ہے۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی جائے گی اور دونوں قوموں کے لیڈر مل کر ہندو مسلم اتحاد کے لئے مشترکہ لائحہ عمل تیار کریں گے۔

میثاق لکھنؤ (1916ء)

مسلم لیگ کے مقاصد میں تبدیلی کی وجہ سے ہندوستان کی سیاست نئے دور میں داخل ہوئی۔ مسلم لیگ میں قائداعظم کی شمولیت مسلم تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھی جس نے مسلم لیگ کی سیاسی جدو جہد کو نیا رخ دیا۔ قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اس لئے آپ نے کانگریس اور مسلم لیگ کو قریب تر لانے کے لئے اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ 1913ء میں مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس میں خود مختار نظام حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا جس کی وجہ سے کانگریس مسلم لیگ کے قریب آ چکی تھی اور ہندو مسلم اتحاد کی فضا بحال ہو چکی تھی۔ دونوں پارٹیوں کے عمائدین اس بات پر متفق تھے کہ حکومت سے مطالبات منوانے کے لئے سیاسی قوت میں اضافہ بہت ضروری ہے۔

1915ء میں کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہو رہا تھا۔ قائداعظم نے مسلم لیگ کو اپنا اجلاس بمبئی میں کرنے کی درخواست کی تاکہ دونوں جماعتوں کے درمیان اتحاد اور مفاہمت کی فضا قائم کی جا سکے۔

مسلم لیگ اور کانگریس کے مشترکہ تعاون اور سمجھوتہ کے بعد دونوں پارٹیوں کا مشترکہ اجلاس دسمبر 1916ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت قائداعظم نے کی اور کانگریس کے اجلاس کی صدارت ایکا چرن مجمدار نے کی۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین واقع تھا کہ ہندوستان کی دو بڑی جماعتیں ایک ہی جگہ پر مشترکہ اجلاس کر رہی تھیں۔ دونوں جماعتوں کی کمیٹیوں نے ہندوستان میں سیاسی و آئینی اصلاحات کی جو مشترکہ سکیم مرتب کی اسے توثیق کے لئے مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاسوں میں پیش کیا گیا۔

مسلم لیگ اور کانگریس نے کمیٹیوں کی مرتب کی ہوئی سکیم کی منظوری دے دی اور اس طرح مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان آئینی و سیاسی اصلاحات کے لئے ایک معاہدہ طے پایا جسے معاہدہ لکھنؤ 1916ء کہا جاتا ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے مشترکہ اجلاس میں جو مطالبات پیش کئے گئے ان میں سے چیدہ چیدہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1- مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد 1/3 ہوگی۔
2- صوبائی کونسلوں میں منتخب ممبروں کی تعداد کل تعداد کا 4/5 ہوگی۔
3- بڑے صوبوں میں ممبروں کی تعداد کم سے کم 125 اور چھوٹے صوبوں میں 50 سے 75 ہونی چاہیے۔
4- انتخابات عام رائے شماری سے کرائے جائیں گے اور صوبائی کونسلوں کو صوبے کے مالیاتی مسائل کے بارے میں پورا کنٹرول حاصل ہوگا۔
5- صوبائی حکومتیں خود مختار ہونی چاہئیں۔
6- مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا حق برقرار رہے گا۔
7- قانون ساز اداروں کی مدت پانچ سال ہوگی۔
8- جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے وہاں انہیں تحفظ دیا جائے گا۔ اسی طرح جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے وہاں ہندوؤں کو تحفظ دیا جائے گا۔
9- صوبائی اور مرکزی اسمبلی میں کوئی ایسی تحریک پیش نہیں کی جائے گی جو کسی ایک فرقے کو متاثر کر سکتی ہو۔
10- مختلف صوبوں میں مسلمانوں کو صوبائی کونسلوں میں جداگانہ انتخاب کے ذریعے نمائندگی دی جائے گی جس کا تناسب مندرجہ ذیل ہوگا:

پنجاب کے صوبے میں کل نشستوں کا 50 فیصد حصہ مسلمانوں کا ہوگا۔ بنگال میں 40 فیصد۔ سی پی میں 15 فیصد۔ مدراس میں

15 فیصد، بہار میں 25 فیصد، یوپی میں 30 فیصد اور بمبئی میں 3 فیصد۔
11- فرقہ وارانہ مسائل کو حل کیا جائے گا۔

اس معاہدہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ہندوؤں نے بالاخر پہلی بار مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم کر لیا اور ان کے دیرینہ مطالبہ جدا گانہ انتخاب کے اصول کو بھی تسلیم کر لیا۔ کانگریس نے پہلی مرتبہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی تنظیم تسلیم کیا۔ اس معاہدے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کے درمیان نفرت اور دشمنی کے جذبات کو کم کرنے میں مدد ملی اور امن عامہ کی صورت حال بہتر ہوئی۔ برطانوی حکومت کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کا اثر ٹوٹ گیا اور ہندو اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کیا۔

میثاق لکھنؤ قائداعظم کی فہم و فراست اور سیاسی سوجھ بوجھ کا مرقع تھا۔ اس معاہدے سے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد پڑی جس نے ہندوستان کی سیاست میں دور رس تبدیلیاں کی۔ اس معاہدے کے بعد قائداعظم کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جانے لگا۔

8 رولٹ ایکٹ اور قائداعظم کی مخالفت

ہندوستان میں سیاسی مخالفین کو دبانے کے لئے حکومت نے 1917 میں ایک کمیٹی مقرر کی جس کے سربراہ جسٹس ایس اے رولٹ تھے۔ اس کمیٹی کا مقصد ہندوستان میں ہونے والی سیاسی سازشوں کی نشاندہی کرنا تھا اور ان کے خاتمے کے لئے مناسب سزا تجویز کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ اپریل 1918ء میں حکومت کو پیش کی جس میں سیاسی سرگرمیوں پر انتہائی ظالمانہ سزائیں تجویز کی گئی تھیں۔ کمیٹی نے اس رپورٹ میں انتظامیہ کو لامحدود اختیارات دینے کی سفارش کی تاکہ وہ آسانی سے حکومت کے خلاف ہونے والی ''سیاسی سازشوں'' سے نبٹ سکے۔ یہ وہ اختیارات تھے جن سے انتظامیہ کو ہندوستان کے شہری باشندوں کے شہری حقوق پامال کرنے کے سارے اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔ حکومت برطانیہ نے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر فروری 1919ء میں امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی میں دو مسودات (انڈین کریمنل لاء اور دی کریمنل لاء) بل پیش کئے جن کی اشاعت پر ملک میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

قائداعظم نے رولٹ کمیٹی پر یوں تبصرہ کیا:

''مجرمانہ سیاسی سازش کا مسئلہ رولٹ کمیٹی نے اس طرح پیدا کیا ہے گویا ہندوستان میں تمام جرائم پیشہ قبائل آباد ہیں۔ اس وقت ایسے قانون کی تخلیق اور نفاذ کی ضرورت ہے جس سے ہر وحشیانہ قانون کو ختم کیا جا سکے۔ قانون بنانا ایک الگ مسئلہ ہے اور مرض کا علاج ایک الگ معاملہ۔ اگر حکومت اپنی پالیسیوں میں تبدیلی کرے تو تمام سازشیں ختم ہو سکتی ہیں۔''

قائداعظم نے اس مسودہ قانون پر شدید نقطہ چینی کی اور کہا کہ کسی مہذب حکومت میں ایسے ظالمانہ قوانین کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ گاندھی نے بیان دیا کہ اگر ایسے قوانین کو لاگو کیا گیا تو وہ ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دیں گے۔ ان مسودات کی اسمبلی میں منظوری کے بعد قائداعظم نے اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ آپ نے وائسرائے ہند کو خط لکھا اور کہا کہ:

''میں امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہوتا ہوں۔ کیونکہ حالات نے اس طرح پلٹا کھایا ہے کہ میرا کونسل کا ممبر رہنا بے سود ہے۔ یہ مسئلہ میری عزت نفس کے عین مخالف ہے کہ میں ایسی حکومت سے تعاون کروں جہاں کونسل کے اندر منتخب اراکین کی رائے کو اور اسی طرح ایوان سے باہر تمام ہندوستان کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی حکومت جو امن و

سکون کے دور میں ایسے قوانین نافذ کرتی ہو اسے مہذب و شائستہ حکومت نہیں کہا جا سکتا۔"

ان قوانین کے نفاذ سے ملک کے طول و عرض میں مظاہرے ہوئے۔ گاندھی نے 20 مارچ 1919ء کو ہڑتال کی اپیل کی جس سے حالات زیادہ سنگین ہوگئے۔ گاندھی نے ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی۔ 20 اپریل 1919ء کو لوگوں نے دہلی میں جلوس نکالا جس پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ عوام نے جلسے منعقد کئے اور احتجاج کا سلسلہ بڑھتا گیا۔

9 جلیانوالہ باغ

رولٹ ایکٹ کے منظور ہونے پر ملک کے طول و عرض میں شدید احتجاج ہوا۔

11 اپریل 1919ء کو عوام نے امرتسر میں احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس سے پہلے گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جس کی بناء پر ملکی صورت حال سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ 11 اپریل 1919ء والے جلسے کے روح رواں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال تھے جنہیں حکومت نے جلسے والے دن گرفتار کر لیا تھا۔ ان لیڈروں کی گرفتاری سے صورت حال مزید بگڑ گئی تو امرتسر کا کنٹرول فوج کے حوالے کر دیا گیا جس کا کمانڈر جنرل ڈائر تھا۔

13 اپریل 1919ء کو امرتسر کے مشہور باغ جلیانوالہ باغ میں جلسہ منعقد کرانے کا انتظام کیا گیا۔ یہ باغ گنجان آبادی میں واقع تھا اور چاروں طرف سے چار دیواری میں گھرا ہوا تھا۔ جس میں داخل ہونے کے لئے چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ اس جلسے میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ شہر میں جلسے اور جلوسوں کی ممانعت تھی۔ جلسہ گاہ کے دروازے پر جنرل ڈائر کی قیادت میں فوجوں نے مورچے سنبھال لئے۔

جنرل ڈائر نے ہجوم کو دو منٹ کے اندر منتشر ہونے کا حکم دیا اور ساتھ ہی نہتے عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ فوجیوں نے اندھا دھند فائرنگ کی جس سے ہزاروں افراد مارے گئے بے بس لوگوں کے لئے جان بچا کر جانے کے تمام راستے مسدود تھے۔

جنرل ڈائر کے اس وحشیانہ اقدام کے نتیجے میں جلسہ گاہ میں موجود ہزاروں افراد مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ اس کے بعد صوبے میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

جلیانوالہ باغ کے واقع نے عوم میں حکومت کے خلاف سخت نفرت پھیلائی اور انتقام کی ایسی آگ بھڑک اٹھی کہ حکومت کا سارا ڈھانچہ ہل کر رہ گیا۔ جلیانوالہ باغ کے واقع نے ہندوستان کی سیاست کو نئے رخ پر موڑا اور ایسی تحریک کو جنم دیا جس نے آگے چل کر برطانوی حکومت کو ڈگمگا دیا۔

10 مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات 1919ء

ہندوستان کے حالات کے پیش نظر اور ہندوستانی باشندوں کے مطالبات کو دیکھتے ہوئے وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے 20 اگست 1917ء کو یہ اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے باشندوں کو حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل کرنا چاہتی ہے۔ حکومت نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ آہستہ آہستہ ہندوستانی باشندوں کو سرکاری ملازمت پر فائز کیا جائے گا اور انہیں اہم ذمہ داریاں سونپی جائیں گی۔ حالات کا جائزہ لینے کے لئے وزیر ہند مسٹر مانٹیگو ایک وفد کے ساتھ ہندوستان آئے اور ہندوستان کا دورہ کیا۔ وفد میں سر ولیم ڈیوک اور لارڈ ڈانومولہ شامل تھے۔ وائسرائے سے مشورہ کرنے کے بعد یہ وفد اپریل 1918ء میں واپس انگلستان چلا گیا۔ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے ہندوستان کے حالات کے پیش نظر ایک رپورٹ تیار کی جسے وائسرائے کی منظوری کے بعد 1919ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نام سے نافذ کر دیا گیا۔ وائسرائے ہند اور وزیر ہند کے ناموں کی نسبت سے اس ایکٹ کو مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات

1919ء بھی کہا جاتا ہے۔ 1919ء کے قانون کی اہم تجاویز مندرجہ ذیل تھیں۔

1. مرکز میں دو ایوانی مقننہ رائج کی گئی۔ ایوان بالا کونسل آف سٹیٹ اور ایوان زیریں کو سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کا نام دیا گیا۔ ایوان بالا 60 اراکین پر مشتمل تھا۔ جب کہ ایوان زیریں 145 اراکین پر مشتمل تھا۔
2. ایوان بالا کی معیاد 5 سال ہوگی اور ایوان زیریں کی معیاد 3 سال ہوگی۔
3. مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا اصول برقرار رکھا گیا۔
4. ہندوستان میں بتدریج ذمہ دار حکومت قائم کی جائے گی۔
5. سیکرٹری آف سٹیٹ کی تنخواہ ہندوستانی خزانے کے بجائے شاہی خزانے سے ادا کی جائے گی۔
6. صوبائی سطح پر دوعملی (Dyarchy) کا نظام رائج کیا گیا جس کی رو سے صوبائی امور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جنہیں "محفوظ شعبے" اور "منتقل شعبے" کا نام دیا گیا۔ محفوظ شعبے انگریزوں کے پاس ہوتے تھے جو انگریز گورنر کو براہ راست جواب دہ ہوتے تھے۔ منتقل شعبوں کو ہندستانی وزیروں کے سپرد کر دیا گیا۔ محفوظ شعبوں میں محکمہ انصاف، پولیس، آب پاشی اور جنگلات کے شعبے تھے۔ جب کہ منتقل شعبوں میں تعلیم، صحت اور صنعت کے محکمے شامل تھے۔ دوعملی کے نظام کے تحت گورنر جنرل صوبائی معاملات میں مداخلت کر سکتا تھا جسے ہر سطح پر ناپسند کیا گیا۔
7. محکموں کو صوبوں اور مرکز کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ مرکزی امور میں دفاع، خارجہ امور، کرنسی، ریلوے اور ٹیلی فون کے محکمے شامل تھے۔ جب کہ صوبوں کو تعلیم، صحت، آب پاشی اور لوکل گورنمنٹ کے محکمے دیئے گئے۔

اصلاحات نافذ کرتے وقت حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ دس سال بعد ایک کمشن ہندوستان آئے گا جو ان اصلاحات کے نتائج کا جائزہ لے گا اور اس کے بعد مزید اصلاحات کے نفاذ کی سفارشات کرے گا۔

1919ء کے آئین کو ہندوستان کی سیاسی جماعتوں نے قبول نہ کیا۔ کانگریس ان اصلاحات پر دو حصوں پر تقسیم ہوگئی۔ ایک گروپ اصلاحات کو منظور کرنے کے حق میں تھا۔ جب کہ دوسرا انہیں مسترد کرنے کا حامی تھا۔ مسلم لیگ بھی ان اصلاحات سے خوش نہ تھی کیونکہ حکومت خود اختیاری کے بارے میں کوئی ٹھوس تجاویز ان اصلاحات میں شامل نہ تھیں۔

جس وقت 1919ء کی اصلاحات نافذ ہوئیں اس وقت ملک انتہائی نامساعد حالات سے دو چار تھا۔ بین الاقوامی حالات بھی ملکی صورت حال پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ ملک میں خلافت کی تحریک جاری تھی اور جلیانوالہ باغ کے افسوسناک واقعہ کی بناء پر عوام کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے۔ ملک کے بہت سے شہروں میں مارشل لاء لگ چکا تھا اور عوام پر بے جا سختی کی جا رہی تھی۔ گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک کا آغاز کیا ہوا تھا۔

پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور اتحادی ملک ترکی کو جو کہ جرمنی کا اتحادی تھا ختم کرنے پر بضد تھے۔ ترکی کا مسئلہ سلطنت عثمانیہ کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ حکومت کا ترکی کے ساتھ کوئی باعزت سمجھوتہ طے پا جائے تاکہ ترکی کی خلافت پر حرف نہ آنے پائے۔ ان حالات میں عوام نے 1919ء کی اصلاحات کو قابل توجہ نہ سمجھا اور یہ اصلاحات عوام کی رائے کو ہموار کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

ا تحریک خلافت

پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ترکی جرمنی کے اتحادی کے طور پر جنگ میں شریک ہوا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ خواہش تھی کہ ترکی جنگ میں شریک نہ ہو کیونکہ مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر جنگ میں جرمنی کو شکست ہوگئی تو اتحادی ممالک ترکی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کریں گے۔

ہندوستان کے مسلمان ترکی کی خلافت کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ترکی کی خلافت عالم اسلام کا مرکز تصور کی جاتی تھی۔ مسلمانوں کو اس بات کا خدشہ لاحق تھا کہ شکست کی صورت میں ترکی میں واقع مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی جائے گی۔ مسلمان خلیفہ کو اپنا مذہبی اور دینوی پیشوا تسلیم کرتے تھے اور ترکی پر حملے کو تمام عالم اسلام پر حملہ کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر ہندوستان کے مسلمانوں میں بے چینی و اضطراب قدرتی امر تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے حکومت کو اپنے جذبات سے آگاہ کیا اور حکومت کو یہ بتادیا کہ مسلمان کسی صورت میں بھی ترکی کے مقدس مقامات کے بے حرمتی برداشت نہ کریں گے۔ لہٰذا حکومت برطانیہ یہ ضمانت دے کہ جنگ میں فتح کی صورت میں حکومت ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ رکھے گی اور ترکی میں مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی نہ کی جائے گی۔

حکومت برطانیہ نے یہ وعدہ کر لیا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی قدر کی جائے گی۔ وزیراعظم لائیڈ جارج نے 15 جنوری 1918ء کو ایک اعلان جاری کیا اور کہا کہ ''ہم توسیع پسند نظریات کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں اور ترکی کو اس کے علاقوں سے محروم کرنا اس کا مقصد نہیں ہے۔''

جس وقت جنگ شروع ہوئی تو مولانا محمد علی جوہر کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے اخبار ''کامریڈ'' پر پابندی لگا دی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر نے لنڈن ٹائمز میں چھپنے والے ایک مضمون کے جواب میں کامریڈ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ آپ کے بھائی مولانا شوکت علی کو بھی نظر بند کر دیا۔

برطانوی حکومت مسلمانوں سے کئے ہوئے وعدے نہ نبھا سکی اور 6 نومبر 1917ء کو یہ اعلان کیا کہ برطانوی حکومت اسرائیلیوں کو فلسطین میں قومی وطن عطا کرے گی۔ اس اعلان نے مسلمانوں کے اندر سخت بے چینی پیدا کی۔ اسی اثناء میں انگریزوں نے شریف حسین آف مکہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور اس سے کہا کہ جنگ ختم ہوتے ہی عربوں کو خود مختاری دے دی جائے گی۔ شریف حسین آف مکہ نے اس یقین دہانی پر ترکی کے خلاف بغاوت کر دی۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوئی اور جنگ 11 نومبر 1918ء کو ختم ہوگئی۔ 3 نومبر 1918ء کو اتحادیوں اور ترکی کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوا۔ معاہدے کی شقیں ترکی کے لئے انتہائی حقیر تھیں اور ترکی کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ترکی کی حکومت کو اپنی فوجیں ختم کرنے کے لئے کہا گیا۔ ترکی کے تمام جہاز قبضہ میں لے لئے گئے تھے۔ ریلوے کی آمدنی اتحادیوں کے لئے وقف کر دی گئی۔ نئی سرحدوں کا تعین اتحادی ملک کریں گے اور داخلی طور پر نظم و نسق ترکی کے حوالے کیا گیا۔ اتحادیوں نے خلافت عثمانیہ اور مسلمانوں کے مذہبی مرکز کو نیست و نابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہ بالکل واضح تھا کہ انگریز مسلمانوں کو بری طرح کچل دینا چاہتے تھے۔ ترکی کے حصے بخرے کر دیئے گئے تھے اور انہیں اتحادی ممالک نے آپس میں بانٹ لیا تھا۔

دسمبر 1918ء میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ دہلی میں منعقد ہوا جس میں ترکی کے حالات پر تبادلہ خیالات کیا گیا۔ اس جلسے میں مسلمانوں کے راہنماؤں نے شرکت کی اور خلافت عثمانیہ کے سلسلے میں اپنی خواہشات کا اظہار کیا۔

1919ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ عہدہ خلافت کے تحفظ اور ترکیہ کیے گئے اقدامات کے خلاف جدوجہد کی جائے جس کے لئے ایک تنظیم کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ممبئی میں خلافت کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کا صدر دفتر ممبئی میں قائم کیا گیا۔ مولانا شوکت علی جب رہا ہوئے تو انہیں خلافت کمیٹی کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس 23 نومبر 1919ء کو دہلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولوی فضل الحق نے کی۔ اس اجلاس میں ہندو بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ فتح کے جشن کا بائیکاٹ کیا جائے اور ولائتی مال کا مقاطعہ کیا جائے۔ بعد میں مسلمانوں کے کئی اجلاس منعقد ہوئے۔ ان میں چند اجلاسوں کی صدارت گاندھی نے بھی کی۔ 9 دسمبر 1919ء کو خلافت کمیٹی، کانگریس اور جمعیت العلمائے ہند کا مشترکہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا جس میں علامہ اقبال نے بھی شرکت کی۔

19 جنوری 1920ء کو ڈاکٹر انصاری کی زیر قیادت مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مشترکہ وفد وائسرائے سے ملا، وفد نے وائسرائے ہند پر یہ بات واضح کی کہ ترکی کی سلطنت عثمانیہ اور عہدہ خلافت کی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مذہبی اہمیت ہے اور مسلمان سلطنت عثمانیہ کی اس حیثیت میں کسی کی کو برداشت نہیں کریں گے۔ وائسرائے ہند پر یہ بات پوری طرح عیاں کر دی گئی کہ اگر حکومت نے مسلمانوں سے کیے گئے اپنے وعدوں کو پورا نہ کیا تو مسلمان آئندہ حکومت کی کسی بات پر یقین نہ کریں گے اور حکومت کی حیثیت کو دھچکا لگے گا۔ 20 جنوری 1920ء کو گاندھی نے تحریک خلافت میں بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور تحریک خلافت کی کامیابی کے لئے تحریک عدم تعاون اور ستیہ گرہ کی تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ گاندھی نے خطابات کی واپسی، سرکاری نوکریوں سے استعفے، پولیس اور فوج کی نوکری سے استعفے اور تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

خلافت وفد کمیٹی کے اجلاس میں یہ طے پایا کہ 20 جنوری 1920ء کو مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان بھیجا جائے جو برطانوی حکومت کو خلافت اور ترکی میں کیے گئے اقدامات کے متعلق ہندوستانی عوام کے جذبات سے آگاہ کرے۔ وفد میں مولانا محمد علی جوہر، سید حسین، سید سلیمان ندوی، مبشر حسین قدوائی، اور مولوی قاسم شامل تھے۔ حسین محمد حیات کو وفد کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ محمد شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن پہلے سے انگلستان میں موجود تھے انہیں بھی وفد میں شامل کر لیا گیا۔

خلافت وفد مارچ 1920ء کے آغاز میں انگلستان پہنچا۔ وفد نے برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج سے ملاقات کی۔ مولانا محمد علی جوہر نے بے باکی سے مسلمانوں کا نقطہ نظر پیش کیا۔ لائیڈ جارج ایک انتہائی متعصب شخص تھا اس نے خلافت کے موقف کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ

"ہاں آسٹریا سے انصاف ہو چکا ہے۔ جرمنی سے بھی ہو چکا ہے۔ کیا خوب اور خوفناک انصاف۔ اب ترکیہ اس سے کیوں بچے۔"

خلافت وفد اپنی تمام کوشش کے باوجود اپنے مقاصد میں ناکام رہا اور برطانوی حکومت نے ہٹ دھرمی کے ساتھ وفد کے مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وفد اکتوبر 1920ء میں ناکام ہندوستان واپس لوٹا۔

تحریک عدم تعاون

19 مئی 1920ء کو اتحادی ممالک اور ترکی کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جسے (Treaty of Severs) کہا جاتا ہے۔ معاہدے کی شرائط نہایت ہتک آمیز تھیں اور اس معاہدے کی رو سے ترکی کے حصے بخرے کر دیئے گئے تھے۔ یہ بھی طے پایا تھا کہ اتحادی جب چاہیں گے ترکی کے کسی بھی حصے پر قبضہ کر سکیں گے۔ آرمینیا کی نئی ریاست معرض وجود میں آئے گی۔ شام، فرانس، عراق اور اردن ترکی سے علیحدہ ہو جائیں گے اور ان کی حیثیت خودمختارانہ ہوگی۔ مغربی اناطولیہ اور سمرنا یونان کو دے دیئے گئے۔

معاہدہ سیورز کی شرائط پر ہندوستان میں بے چینی پھیلی اور عوام نے بہت غم وغصہ کا اظہار کیا۔ جون 1920ء میں مسلمانوں کے راہنماؤں نے وائسرائے ہند لارڈ چمسفورڈ سے ملاقات کی اور معاہدہ سیورز کی شرائط کو واپس لینے کے لئے کہا۔ ان راہنماؤں نے وائسرائے پر بات واضح کر دی تھی کہ اگر برطانوی حکومت نے معاہدے کی شرائط کو تبدیل نہ کیا تو ہندوستان میں تحریک عدم تعاون شروع کر دی جائے گی۔ وائسرائے نے مسلمانوں کے اس احتجاج پر کوئی توجہ نہ دی۔

خلافت کمیٹی نے سارے ہندوستان میں اپنی شاخیں قائم کر لی تھیں اور خلافت کے مسئلہ پر عوام کی رائے کو ہموار کرنے میں کافی کام کیا تھا۔ ہندوستان کا ہر شخص حکومت کے اس اقدام پر سخت پریشان تھا اور لوگوں میں خلافت کے تحفظ کے لئے بے پناہ جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی نے اپنی جوشیلی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے تحریک خلافت کو جلا بخشی تھی۔

گاندھی نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر مسلمانوں کے مطالبات کو نہ مانا گیا تو ہندوستان میں تحریک عدم تعاون شروع کر دی جائے گی۔ کانگریس کے اجلاس منعقدہ 30 مئی 1920ء جو کہ بنارس میں ہوا طے پایا کہ گاندھی کے تحریک عدم تعاون کے پروگرام پر غور کرنے کے لئے لکھنؤ میں کانگریس کا ایک اجلاس بلایا جائے۔ گاندھی جو کہ ایک کایاں سیاست دان تھے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی طرف دست تعاون بڑھانے کے پیچھے دراصل ان کا یہ خیال تھا کہ اس موقع پر مسلمانوں کے تعاون سے انگریز کو ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری دینے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تحریک خلافت میں مسلمانوں کے مطالبات کی حمایت کوئی مسلمانوں سے ہمدردی کی بناء پر نہ تھی۔ دراصل گاندھی ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو اپنے ڈھب کے مطالبات حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں برطانوی حکومت سے سودا بازی کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی غیر مشروط امداد مسلمانوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کی جھولی میں ڈال دی تھی۔

یکم اگست 1920ء کو خلافت کمیٹی کی درخواست پر پورے ہندوستان میں ہڑتالیں کی گئیں اور بائیکاٹ کا آغاز ہوا۔ تحریک خلافت کو موثر بنانے کے لئے ترک موالات کا طریق کار اپنایا گیا۔ علمائے کرام نے فتوے جاری کئے اور حکومت سے عدم تعاون کی اپیل کی گئی۔ اس اپیل پر ہزاروں لوگوں نے اپنے خطابات واپس کر دیئے اور حکومت کے زیر اثر تعلیمی اداروں سے اپنے بچوں کو اٹھا لیا۔ حکومت کی نوکری سے استعفے دے دیئے گئے۔ گاندھی نے اس موقع پر تحریک عدم تعاون میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا گیا اور سوتی کپڑے کو ولایتی کپڑوں پر ترجیح دی گئی۔ گاندھی نے چرخہ کات کر عوام کو سوتی کپڑے استعمال کرنے کی اپیل کی۔

کانگریس کے بعض رہنما تحریک عدم تعاون کے حق میں نہ تھے اور انہوں نے گاندھی کے تحریک میں شمولیت کے فیصلے پر تنقید کی تھی۔ قائداعظم بھی تحریک عدم تعاون کے حق میں نہ تھے کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ یہ تحریک جلد ہی غیر ذمہ دارانہ اور جذباتی لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے گی اور تشدد کا راستہ اختیار کرے گی۔ گاندھی نے تحریک کے حق میں دلائل دیئے اور تحریک جاری رکھنے پر زور دیا۔ قائداعظم اس اختلاف کی بناء پر کانگریس کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ گاندھی کے نزدیک تحریک خلافت میں مسلمانوں کی کامیابی کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اس کے نزدیک اہمیت ان عوامل کی تھی جنہیں حاصل کر لینے کے لئے تحریک خلافت کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا گاندھی نے مسلمانوں کے مطالبات کی پوری حمایت کی۔ ہندوستان میں انتخابات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ کلکتہ میں تین ہزار طلباء نے کالج چھوڑ دیا اور حکومت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

3۔ تحریک ہجرت

اسی دور میں مولانا عبدالباری اور مولانا ابو الکلام آزاد نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ ہندوستان ''دارالحرب'' ہے جہاں مسلمانوں کا دین محفوظ نہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہجرت کر کے کسی ایسی جگہ چلے جانا چاہئے جہاں وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتے ہوں اور اسلام کے اصولوں پر کاربند ہو سکیں۔ مولانا عبدالباری نے ایک اعلان کے ذریعے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی ایسے ملک میں چلے جائیں جہاں ان کے لئے اسلام کی خدمت کرنا اور اسلامی قوانین پر عمل پیرا ہونا ممکن ہو۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ہندوستان کے ہزاروں مسلمان اپنے تمام اثاثے بیچ کر ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان روانہ ہوئے۔ مسلمان سفر کی صعوبتیں اٹھا کر افغانستان پہنچے۔ افغانستان کی حکومت نے شروع میں تو ان مفلوک الحال لوگوں کو خوش آمدید کہا لیکن جب یہ سلسلہ بڑھتا گیا تو انہوں نے مزید لوگوں کو افغانستان میں داخل ہونے سے روک دیا۔ یہ لوگ دوبارہ وطن واپس لوٹے جس کی وجہ سے بے شمار مسلمان راستے ہی میں مر گئے۔ جو تھوڑے بہت واپس پہنچے وہ بالکل مفلوک الحال ہو چکے تھے۔ یہ لوگ ہندوستان سے ہجرت کرتے وقت اپنا سب کچھ اونے پونے فروخت کر گئے تھے۔ جب یہ واپس آئے تو ہندوستان میں ان کے لئے سر چھپانے کو کوئی جگہ نہ تھی جس کی وجہ سے بے شمار خاندان تباہ ہو گئے۔

4۔ موپلا بغاوت

مالا بار کے ساحل پر کچھ عربی النسل قبائل آباد تھے جنہیں موپلا کہا جاتا تھا۔ ان قبائل نے تحریک خلافت میں بڑے پر جوش طریقے سے حصہ لیا تھا۔ حکومت چاہتی تھی کہ موپلے تحریک خلافت سے علیحدہ رہیں اس لئے حکومت نے جلسوں پر پابندی لگا دی تھی۔ حکومت نے موپلوں کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا گیا۔ موپلوں کے کچھ راہنماؤں نے کیرالہ جانا چاہا جنہیں حکومت نے جانے کی اجازت نہ دی اور ان لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ حکومت کے اس فیصلے سے موپلوں میں اشتعال پیدا ہو اور انہوں نے اپنے لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ پولیس نے مداخلت کی اور گولی چلائی جس سے موقع پر تقریباً 400 افراد ہلاک ہو گئے۔ اس واقعہ سے ملک میں بے چینی پھیلی اور ہندو مسلم تعلقات پر بھی برا اثر پڑا۔ موپلوں نے بڑے پیمانے پر حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور کئی افسروں کو قتل کر دیا۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دیں اور جیلیں توڑ کر ساتھیوں کو رہا کرا لیا۔ چھ ماہ تک حکومت سے گوریلا جنگ لڑتے رہے لیکن حکومت نے بغاوت پر قابو پا لیا بغاوت کے بعد حکومت نے موپلوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا۔ ہزارہا افراد کو گرفتار کر کے کالے پانی بھیج دیا گیا۔ ایک دفعہ موپلوں کو مال گاڑی میں بند کر کے لے جایا جا رہا تھا جس سے دم گھٹنے سے 66 افراد راستے میں مر گئے۔

5۔ چورا چوری کا سانحہ

تحریک خلافت کے متعدد راہنما جن میں علی برادران شامل تھے، جیل جا چکے تھے۔ جس کی وجہ سے تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ آ چکی تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ گاندھی دراصل تحریک خلافت کو ''سوراج'' حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اسی مقصد کے لئے تحریک خلافت میں مسلمانوں سے تعاون کیا تھا۔ انہیں خلافت کے تحفظ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔

1922ء کے اوائل میں گاندھی تحریک سول نافرمانی شروع کرنے والے تھے۔ جس کا آغاز ضلع فرخ آباد کے ایک گاؤں چورا چوری سے کیا جانا تھا۔ تحریک سول نافرمانی کے تحت حکومت کے لگان اور ٹیکس کی ادائیگی سے انکار کیا جانا تھا۔ 5 فروری 1922ء کو چورا چوری کے عوام نے ایک جلوس نکالا اور حکومت کو زمین کا لگان اور دوسرے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ مظاہرہ کے دوران جلوس

کا سامنا پولیس سے ہوا جس کی وجہ سے عوام مشتعل ہوگئے اور انہوں نے پولیس چوکی کو آگ لگا دی جس سے 21 پولیس والے زندہ جل کر ہلاک ہو گئے۔ تشدد کے اس واقعہ سے گاندھی خاصے پریشان ہو گئے۔ اس واقعہ سے قائداعظم کے خدشات صحیح ثابت ہوئے اور تحریک نے تشدد کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ گاندھی کو اس واقعہ سے سخت دکھ پہنچا اور اس نے تحریک عدم تعاون کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ گاندھی نے تحریک کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے یہ کہا کہ

"ابھی تک ہندوستان میں وہ پر امن اور صداقت پرستانہ ماحول اور فضا پیدا نہیں ہوئی جو عام نافرمانی کا جواز پیش کر سکتی ہو"

ب۔ تحریک خلافت کا خاتمہ

چونکہ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون ایک ہی جدوجہد کے دو رخ تھے اس لئے تحریک عدم تعاون کے خاتمے سے تحریک خلافت کو بہت نقصان پہنچا۔ تحریک خلافت کے مسلمان رہنماؤں کو گاندھی کے اعلان سے سخت افسوس ہوا۔ کیونکہ گاندھی نے تحریک عدم تعاون کو ختم کرنے کا اعلان یک طرفہ طور پر کیا تھا۔ مسلمانوں میں اس اعلان سے سخت مایوسی پیدا ہوئی۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چورا چوری کا واقعہ کوئی اتنا بڑا واقعہ نہ تھا کہ پوری تحریک کو ختم کر دیا جاتا۔ لوگوں کے خیال کے مطابق اگر چورا چوری کے واقعہ کے باوجود تحریک جاری رکھی جاتی تو حکومت کو جھکنا پڑتا اور مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کر لئے جاتے۔ گاندھی کے اس اعلان سے عوام میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ انہیں ان کی منزل کے قریب لا کر پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔

گاندھی اور کئی دوسرے قائدین گرفتار کر لئے گئے۔ گاندھی کو عوام کو بغاوت پر اکسانے پر چھ سال قید کی سزا دی گئی۔ تحریک عدم تعاون کے ختم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ترکی میں اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا کی حکومت قائم ہوئی۔

23 اکتوبر 1923ء کو گرینڈ نیشنل اسمبلی نے مصطفیٰ کمال پاشا کو جمہوریہ ترکی کا سربراہ مقرر کر دیا۔ 24 نومبر 1923ء کو لندن سے سر آغا خان اور سید امیر علی نے ترک حکومت کو تار کے ذریعے خلافت کے تحفظ کی درخواست کی۔ 1923ء میں خلافت کمیٹی اور جمیعت العلمائے ہند نے اپنی قرار دادوں کے ذریعے حکومت ترکیہ پر یہ زور دیا کہ خلافت کے مسئلے کا مناسب حل تلاش کیا جائے لیکن ترک حکومت نے ان قرار دادوں کو مسترد کر دیا اور گرینڈ نیشنل اسمبلی نے مصطفیٰ کمال کی سرکردگی میں 3 مارچ 1923ء کو عہدہ خلافت ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

عہدہ خلافت کے خاتمے سے تحریک خلافت کو جاری رکھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہ گیا تھا۔ ترک حکومت نے بغاوت کے متعلق سرد مہری کا ثبوت دیا تھا اور کہا کہ اب ترک حکومت خلافت کا مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔

خلافت کمیٹی نے تحریک کو جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا لیکن عہدہ خلافت کے خاتمے سے تحریک خلافت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔

ج۔ تحریک خلافت کے نتائج

تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی سیاست ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد ختم ہو چکا تھا اور ایک دفعہ پھر دونوں قومیں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء تھیں۔ ہندوستان میں انتہا پسند تحریکیں جنم لے چکی تھیں جن میں شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں قابل ذکر ہیں۔

تحریک خلافت اپنے بنیادی مقصد یعنی خلافت کے تحفظ میں ناکام رہی۔ لیکن اس تحریک نے ہندوستان کی سیاست پر دوررس نتائج مرتب کئے۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کیا اور انہیں حکومت سے مطالبات منوانے کا ڈھنگ سکھایا۔ بہر حال

اپنی ناکامی کے باوجود تحریک خلافت مسلمانوں کی ایک عظیم جدوجہد تھی۔ جس کے افادی پہلوؤں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تحریک خلافت کے نتائج و اثرات مندرجہ ذیل ہیں۔

1- تحریک خلافت ہندوستان کے مسلمانوں کی عظیم مذہبی و سیاسی تحریک تھی۔ جس نے مسلمانوں کو منظم قیادت مہیا کی اور مستقبل کی تحریک آزادی کو موثر خطوط پر چلانے کے لئے بنیاد فراہم کی۔

2- یہ تحریک ہندو مسلم اتحاد پر قائم ہوئی تھی۔ لیکن یہی ہندو مسلم اتحاد تحریک کی ناکامی کا سبب بن گیا۔ کیونکہ گاندھی نے عین اس وقت تحریک کے خاتمے کا یک طرفہ طور پر اعلان کر دیا جب کہ تحریک اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی اور حکومت عوامی مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیکنے والی تھی۔ گاندھی کا یہ اقدام مسلمانوں پر یہ بات واضح کر گیا کہ کسی بھی قومی مقصد کے حصول کے لئے ہندو کی ذات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا گاندھی کے اقدام نے ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ کر دیا جو کہ قائداعظم کی مخلصانہ مساعی سے قیام پذیر ہوا تھا۔

3- تحریک خلافت کی قیادت گاندھی کے ہاتھ آجانے سے تحریک کا رنگ خالصتاً سیاسی ہو گیا۔ گاندھی تحریک خلافت کو سوراج حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک خلافت کی کوئی اہمیت نہ تھی اور نہ ہی اسے مسلمانوں کے مطالبات سے کوئی ہمدردی تھی۔

4- تحریک خلافت نے انگریز حکومت پر مسلمانوں کے دینی جذبے کو اجاگر کیا اور انگریز کو ہندوستان سے اپنا اقتدار ختم ہوتا نظر آیا۔ تحریک خلافت کے دوران انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ اب ہندوستان میں ان کے دن گنے چنے رہ گئے اور انہوں نے ہندوستان کو آزادی دینے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔

5- دراصل اندر سے گاندھی ہندو مسلم اتحاد کے حامی نہ تھے اور وہ میثاق لکھنؤ کو پسند نہ کرتے تھے کیونکہ میثاق لکھنؤ کے ذریعے مسلمانوں کی علیحدہ قومی و ملی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ تحریک خلافت کو عین عروج پر پہنچنے کے بعد اچانک ختم کر دینے کے پیچھے گاندھی کی ایسی سوچ کارفرما تھی۔ تحریک خلافت اگر کامیاب ہو جاتی تو سیاسی اعتبار سے مسلمان انتہائی فائدے میں رہتے اور ہندوؤں کے سیاسی مسلک کو اس کا نقصان پہنچتا جو کہ گاندھی کو کسی صورت بھی قابل قبول نہ تھا۔

6- تحریک خلافت کی بدولت علماء کرام نے ایک متحد جماعت کی طرح کام کیا اور قوم کی رہبری کی۔ مسلمانوں نے چونکہ ہندوؤں اور انگریزوں کے وعدوں کو بخوبی جانچ لیا تھا اس لئے تحریک خلافت کے بعد اپنے آپ پر انحصار کرنے کا احساس ہوا۔

7- تحریک خلافت چونکہ ایک مکمل دینی و سیاسی تحریک تھی اس لئے اس نے دین اور سیاست کے بارے میں غیر اسلامی تصورات کی بیخ کنی کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

8- تحریک خلافت سے پہلے ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ راہنمائی کے لئے دوسرے ممالک کی طرف دیکھتے تھے اور دوسرے مسلمان ممالک میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں زیادہ پریشان ہوا کرتے تھے۔ تحریک خلافت نے مسلمانوں کے اندر اپنے ملکی حالات کے بارے میں سوچ کو بیدار کیا اور ان میں اپنے مستقبل کے لئے دلچسپی پیدا ہوئی۔

9- تحریک خلافت نے مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کے احساس کو برملا جلا بخشی جو بعد میں قیام پاکستان کی بنیاد بنا۔

10- تحریک خلافت نے مسلمانوں میں سیاسی نظم و ضبط پیدا کیا اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ تحریک خلافت کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو پہلی بار کسی سیاسی و دینی جدوجہد میں شریک ہونے کا موقع فراہم کیا تھا جس سے ان کے اندر ایک منفرد سیاسی شعور اجاگر ہوا۔

8 جداگانہ انتخابات

انتخابات جمہوری نظام کا لازمی حصہ ہیں۔ جمہوری نظام کی کامیابی بھی انتخابات کی مرہون منت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مغربی ممالک نے انتخابات کو اپنایا اور اپنے سیاسی نظام کو انتخابی اصولوں کے مطابق استوار کیا۔ انسانی معاشرے اور سیاسی نظام کی ترقی کے ساتھ جوں جوں لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا ان کے اندر انتخابات کی اہمیت اجاگر ہوئی اور لوگوں نے انتخابات کو سیاسی نظام کے لئے لازمی سمجھنا شروع کیا۔

ہندوستان میں مقامی اداروں کا قیام 1861ء کے قانون کی رو سے عمل میں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کے دوران ملک میں عوامی اداروں کا اجراء ہوا تھا۔ انگریزی حکومت نے ہندوستان میں جمہوریت کو فروغ دینے کے لئے ان مقامی اداروں کا اجراء کیا تھا جن کا نظام عوام کے نمائندوں کے ذریعے چلایا جاتا تھا۔ لیکن یہ ادارے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے کیونکہ ان اداروں کے انتخابات ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول کی بناء پر کئے جاتے تھے۔ سرسید احمد خان نے سختی سے ان اداروں کی مخالفت کی اور یہ کہا کہ ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر کئے گئے انتخابات اکثریتی حکومت کو قائم کر دیتے ہیں جو ہندوستان جیسے ملک جہاں پر بے شمار قومیں آباد ہوں کے لئے موزوں نہیں۔

1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ کانگریس نے اپنے مطالبات میں ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت کے قیام کا مطالبہ کیا جس کی بنیاد ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول پر تھی۔ سرسید احمد خان نے کانگریس کے اس مطالبے کی سختی سے مخالفت کی اور کہا کہ مغربی طرز کی جمہوریت ہندوستان کے لئے کسی صورت بھی قابل عمل نہیں۔ آپ نے کہا کہ مغربی طرز کی جمہوریت قائم ہونے سے مسلمان جو ہندوستان میں اقلیت میں ہیں کسی طرح بھی اپنے مفادات کا تحفظ نہ کر سکیں گے۔ آپ نے مسلمانوں کو کانگریس کے اس مطالبے کے نقصانات سے آگاہ کیا اور مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کی۔

16 جنوری 1888ء کو سرسید احمد خان نے میرٹھ میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔ آپ نے کہا:

> ''وائسرائے کی کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد متعین ہونی چاہئے۔ ہندو نمائندوں کو ہندو منتخب کریں اور مسلمان ممبروں کو مسلمان''

9 شملہ وفد اور جداگانہ انتخابات

مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد 1906ء میں شملہ میں وائسرائے ہند سے ملا اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات وائسرائے کو پیش کئے۔ شملہ وفد کے مطالبات میں جداگانہ انتخابات کا مطالبہ بھی تھا جسے 1909ء کی آئینی اصلاحات میں قانونی شکل دی گئی۔

کانگریس نے جداگانہ انتخابات کو ماننے سے انکار کر دیا اور اسی کی بناء پر 1909ء کی اصلاحات کی مخالفت کی۔ ان اصلاحات میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ انتخابی فہرستیں اور رجسٹر تیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس طرح انہیں ایک علیحدہ قوم تسلیم کر لیا گیا۔

10 میثاق لکھنؤ اور جداگانہ انتخابات

1916ء میں میثاق لکھنؤ طے پایا۔ یہ معاہدہ مسلم لیگ اور کانگریس میں طے پایا۔ اس معاہدہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک مشترکہ قرارداد منظور کی جسے میثاق لکھنؤ کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے کی رو سے ہندوؤں نے پہلی بار مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو مان لیا اور اس طرح انہیں علیحدہ قوم تسلیم کر لیا۔

1919ء کی اصلاحات اور جدا گانہ انتخابات

1919ء کی اصلاحات کی بنیاد میثاق لکھنؤ پر رکھی گئی تھی۔ ان آئینی اصلاحات میں مسلمانوں کے مطالبۂ جداگانہ انتخابات کو برقرار رکھا گیا۔ 1919ء کی اصلاحات بھی ہندو مسلم تضاد کا شکار ہو گئیں۔

تجاویز دہلی اور جدا گانہ انتخابات

قائداعظم نے 20مارچ 1927ء کو دہلی میں مسلمان قائدین کی کانفرنس طلب کی اور اس میں باہمی مشورے کے ساتھ چند تجاویز مرتب کیں جنہیں تجاویز دہلی کہا جاتا ہے۔ قائداعظم چونکہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اس لئے آپ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں مٰیں اتحاد ہو جائے۔ آپ نے یہ تجاویز کانگریس کے سامنے پیش کیں اور کہا کہ اگر کانگریس یہ تجاویز تسلیم کرے تو مسلمان اپنے مطالبہ جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو جائیں گے۔

نہرو رپورٹ اور جدا گانہ انتخابات

1919ء کی اصلاحات کے نفاذ کے موقع پر حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ دس سال بعد ایک کمیشن ہندوستان آئے گا جو ان اصلاحات کا جائزہ لینے کے بعد مزید آئینی اصلاحات کی سفارش کرے گا۔ 1928ء میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا جس نے آئینی اصلاحات کے لئے ہندوستان کے لیڈروں سے گفت وشنید کا سلسلہ شروع کیا۔ سائمن کمیشن کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ نے عدم تعاون کا اظہار کیا اور اس کی بنائی ہوئی سفارشات کو رد کر دیا۔ سائمن کمیشن کے ساتھ بائیکاٹ کرنے اور اس کی دی ہوئی سفارشات کو رد کر دینے پر برطانوی حکومت نے بہت برا منایا اور کہا کہ ہندوستانی نہ تو خود کوئی آئینی منصوبہ بنا سکتے ہیں اور نہ ہی حکومت کا دیا ہوا آئینی پروگرام قبول کرنے پر تیار ہیں۔

اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ہندوستانی لیڈروں نے دستوری خاکہ مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جسے نہرو کمیٹی کہتے ہیں۔ نہرو کمیٹی نے اپنی تجاویز میں جداگانہ انتخاب کو ختم کر دینے کی سفارش کی۔ نہرو کمیٹی کی سفارشات کو مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود منظور کر لیا گیا۔

قائداعظم کے چودہ نکات اور جدا گانہ انتخاب

نہرو کمیٹی کی سفارشات آل انڈیا پارٹیز کانفرنس میں منظوری کے لئے پیش کی گئیں قائداعظم نے آل پارٹیز کانفرنس میں اپنی تجاویز دہلی میں پیش کیں جنہیں نامنظور کر دیا گیا۔ جس کی بناء پر مسلم لیگ نے آل پارٹیز کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا۔ آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو کمیٹی کی سفارشات کو منظور کر لیا گیا تھا۔ جس پر مسلم لیگ نے احتجاج کیا تھا اور نہرو رپورٹ کو ہندو ذہن سے تعبیر کیا۔ قائداعظم نے نہرو رپورٹ کے جواب میں اپنے مشہور چودہ نکات پر مشتمل آئینی سفارشات پیش کیں جن میں مسلمانوں کے لئے جدا گانہ انتخاب کا اعادہ کیا گیا اور اسے جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔

گول میز کانفرنس اورجدا گانہ انتخاب

1930ء میں گول میز کانفرنسوں کا انعقاد شروع ہوا۔ یہ کانفرنسیں ہندوستان کے آئینی مسائل کے حل کے لئے ہندوستان کے راہنماؤں کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے لئے منعقد کی گئیں تھیں۔ ان تینوں کانفرنسوں میں مسلمانوں نے جدا گانہ انتخابات کے مطالبے پر اصرار کیا۔

17۔ کمیونل ایوارڈ اور جداگانہ انتخابات

1932ء میں برطانوی حکومت نے ہندو اور مسلمانوں کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے ایک فارمولے کا اعلان کیا جسے کمیونل ایوارڈ کہتے ہیں۔ اس ایوارڈ میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کو جاری رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی دوسری اقلیتوں جن میں سکھ، عیسائی اور اچھوت شامل تھے جداگانہ انتخابات کا حق دیا گیا۔

باب نمبر3

تحریک پاکستان

(دوقومی نظریہ کا ارتقاء)

دوقومی نظریہ

دوقومی نظریہ سے مراد برصغیر میں رہنے والی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں میں پایا جانے والا مذہبی، ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی اختلاف ہے جس نے دو جداگانہ سیاسی نظریات کو جنم دیا اور جس کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا تا کہ مسلمان اپنے علیحدہ قومی تشخص کا تحفظ کر سکیں۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمان اور ہندو بظاہر اکٹھے زندگی بسر کرنے کے باوجود اپنی انفرادیت اور تشخص کو قائم و دائم رکھے ہوئے تھے اور آپس میں کبھی بھی مشترکہ قومیت کے جذبے کو تشکیل نہ دے سکے۔ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی بھی قدر مشترک نہ تھی جو انہیں آزادی کے حصول کے لئے مشترکہ قومیت میں منسلک کئے رکھتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمان اسلام کے پیروکار تھے اور توحید خداوندی پر یقین رکھتے تھے اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے تھے۔ مسلمان انسانی برابری اور اخوت کے قائل تھے۔ اس کے برعکس ہندو مذہب میں بے شمار خداؤں کا تصور موجود ہے۔ ہندو کی نظر میں نعوذ باللہ سمندر بھی خدا ہے اور بادل، پانی اور آگ بھی خدا ہیں۔ بے شمار خداؤں کو پوجنے والی قوم اپنے اندر بھلا کس طرح واحدانیت اور یگانگت پیدا کر سکتی تھی۔

دونوں قوموں کے بنیادی عقائد میں بھی نمایاں فرق اور بعد پایا جاتا ہے۔ اسلام ایک عالمگیر پیغام ہے جس کے اصول نہایت واضح اور سادہ ہیں۔ جب کہ ہندو مت کے اصول غیر واضح اور مبہم ہیں۔ اسلام مساوات، اخوت اور عدل و انصاف کا درس دیتا ہے اور ہر سطح پر انسان کو برابر سمجھتا ہے۔ اسلام میں کسی کے معاشرتی مقام و مرتبے کا تعین اس کی پیدائش، رنگ و نسل اور ذات سے نہیں کیا جاتا۔ اسلام میں کوئی حاکم اور محکوم نہیں جب کہ دوسری طرف ہندو معاشرہ ذات پات کے فرسودہ اور گھٹیا نظام کی وجہ سے ادنیٰ اور اعلیٰ طبقوں میں منقسم ہے۔ ہندو معاشرے میں کسی بھی شخص کے مقام کا اندازہ اس کی ادنیٰ اور اعلیٰ ذات کی بناء پر کیا جاتا ہے اور ادنیٰ و اعلیٰ ہونے کا تعین انسان کے پہلے جنم کے کردار و عمل پر ہوتا ہے۔ ذات پات کے نظام نے انسان کو انسان کے درجے سے گرا دیا ہے اور اعلیٰ ذات کے لوگ ادنیٰ ذات کے لوگوں سے میل جول رکھنا گناہ سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتے ہیں ہندو معاشرے میں غیر ہندو کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور ہندو سماج کے دائرے سے باہر پیدا ہونے والا شخص اچھوت کہلاتا ہے۔ جس کے سائے سے ہر چیز بھرشٹ ہو جاتی ہے۔

اسلام کسی نسل، لسانی اور جغرافیائی حدود کا قائل نہیں۔ اس دین میں شامل ہونے والے لوگ عالمگیر برادری تشکیل دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندو مت کے اصول مقامی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے طرز بود و باش، رسومات، تہذیب و ثقافت اور معاشرتی اقدار میں بھی نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ مسلمان جب مرتا ہے تو اسے دفن کیا جاتا ہے۔ مسلمان گائے کے گوشت کو حلال سمجھتا ہے اور ہندو گائے کو متبرک جانور سمجھتا ہے اور اس کی پوجا کرتا ہے۔ گویا ہندو اور مسلمان کے تصورات زندگی میں زبردست فرق پایا جاتا ہے۔

اس قدر شدید اختلافات کی موجودگی میں بھلا یہ دونوں قومیں کیسے مل کر زندگی بسر کر سکتیں تھیں اور کس طرح مشترکہ قومیت کے جذبے کو پروان چڑھا سکتیں تھیں۔ ان کے درمیان ہر لحاظ سے امتیازات کی طویل و عریض خلیج حائل تھی جسے پاٹنا ممکن نہ تھا۔ دونوں قوموں کے درمیان روحانی اور جسمانی پستیاں اور بلندیاں موجود تھیں جو باہمی اشتراک کی راہ میں سدراہ تھیں۔ ہندو اور مسلمان ایک معاشرہ میں تو ضرور رہے لیکن وہ متحدہ قومیت کے احساس کو تشکیل نہ دے سکے۔ ایک سرسری نگاہ بھی دونوں قوموں کے افراد میں تمیز کر سکتی تھی۔ وہ بیگانوں کی طرح یکجا رہے اور دریا کے دو ایسے کنارے تھے جو کسی جگہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی وجود پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''ہندوستان میں مختلف اقوام و مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ مذہبی تصورات کی سختی نے لوگوں کو ایک دوسرے سے یوں علیحدہ رکھا کہ ملتے وقت ہاتھ ملانے کے بعد ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ ہندوستان ایک براعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام و مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ ایسے ملک میں لوکل بورڈوں کے لئے انتخابات کے سادہ اصول جاری کرنے سے خرابیاں پیدا ہونے کا امکان ہے اور اس طرح بڑی قوم چھوٹی قوم کے مفادات پر غالب آجائے گی۔''

علامہ اقبال نے مسلمانوں کے جداگانہ قومی وجود پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''میں کسی ایسی طرز حکومت کو قبول نہیں کر سکتا جو مسلمانوں کو سیاسی وحدت کے طور پر تسلیم نہ کرتی ہو۔''

قائداعظم نے کہا:

''ہندو اور مسلمان ہر چیز میں مختلف ہیں۔ اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنے کلچر، اپنی تاریخ، اپنی زبان، اپنے کھانے پینے اور اپنی سوسائٹی غرض کہ ہر اعتبار سے مختلف ہیں تو پھر انتخابات میں کیسے ایک ہو سکتے ہیں۔''

ہندوؤں اور مسلمانوں میں پایا جانے والا یہی تہذیبی، ثقافتی، مذہبی، تمدنی اور معاشرتی اختلاف اور دونوں قوموں میں اس کا احساس ہی دو قومی نظریہ ہے۔ یہی نظریہ قیام پاکستان کی اساس بنا جسے بنیاد بنا کر مسلمان نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔ مطالبہ پاکستان کا واحد محرک دراصل اسی جداگانہ قومی تشخص کا احیاء اور اس کی بقاء کا جذبہ تھا۔ اسی نظریئے کے تحفظ کی خاطر ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریز اور ہندو کے اس استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے متحد ہو کر جدو جہد کی اور کانگریس کی متحدہ قومیت کے پرچار کو باطل کیا۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام

ہندوستان میں اسلام کو ہر دل عزیز بنانے میں عرب تاجروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ظہور اسلام سے قبل عرب تجارت میں بڑا اہم مقام رکھتے تھے اور ظہور اسلام کے بعد عرب تاجروں نے اسلام قبول کیا اور تجارت میں اسلامی اصولوں کو اپنایا۔ عربوں کی تمام تجارت سمندر کے راستے ہوتی تھی۔ جب عرب تاجر اور ملاح اپنی تجارت کے لئے جاتے تو وہ ہندوستان کے ساحل پر بھی اپنا مال لے کر آتے تھے اور یہاں کئی کئی روز قیام کرتے تھے۔ ہندوستان کے لوگ عرب تاجروں کے حسن سلوک اور ایمان داری سے متاثر ہوئے۔ عرب تاجر جہاں بھی جاتے تھے اپنے تجارتی کاموں کے علاوہ اسلام کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے مقامی لوگوں میں اسلام کو روشناس کرانے میں بہت مدد ملی۔ مسلمان تاجروں کی حق گوئی، اعلیٰ تجارتی اصول اور ایمان دارانہ لین دین نے ہندوستان کے

باشندوں کو بہت متاثر کیا اور بہت بڑی تعداد میں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

مسلمانوں نے ہندوستان کی سرزمین پر پہلی صدی ہجری میں قدم رکھا اور یہاں پر اپنی بستیاں قائم کیں۔ عرب تاجروں کی کوششوں سے اسلام کے ابتدائی دور میں جنوبی ہندوستان میں مسلمان آباد ہونا شروع ہو گئے۔ مسلمانوں نے اپنی بستیوں میں مساجد تعمیر کرلیں جہاں پر پانچ وقت نماز ادا کی جاتی تھی۔

ہندوستان میں اسلام کو ہر دلعزیز بنانے اور اسے ایک سیاسی قوت بنانے میں محمد بن قاسم کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جس کے شاندار حسن سلوک اور عادلانہ رویے نے ہندوستان کے باشندوں کے دلوں میں گھر کرلیا۔

محمد بن قاسم نے دیبل فتح کرنے کے بعد وہاں پر مسلمانوں کو آباد کیا۔ مسجدیں بنوائیں محمد بن قاسم کے حسن سیرت سے متاثر ہو کر سندھ میں مقامی آبادی نے بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا۔ محمد بن قاسم نے ہندوستان میں چھ سال تک قیام کیا اور اس عرصہ کے دوران اسلام کی تبلیغ کے لئے گراں قدر کام کیا۔

محمد بن قاسم کے بعد دوسرے مسلمان حکمرانوں نے بھی ہندوستان میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں قابل قدر کام کیا اور ہندوستان کے ہندو حکمرانوں کو جنگوں میں شکستیں دے کر اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط کیں۔ ان میں سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، قطب الدین ایبک، علاؤ الدین خلجی، تغلق اور لودھی خاندانوں کی اشاعت اسلام کے لئے مساعی قابل قدر ہیں۔

مغلیہ دور میں شہنشاہ اورنگ زیب نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں بے پایاں کام کیا اور اپنی ذاتی سادگی اور اسلامی طرز زندگی کے باعث اشاعت اسلام کے سلسلے میں قابل قدر کام کیا۔

برصغیر میں اسلام کو مقبول بنانے اور اسے عوام میں پھیلانے میں صوفیائے کرام اور مشائخ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جنہوں نے اپنی شبانہ روز کوششوں سے اسلام کو ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلایا۔ ان اصحاب نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کئے اور صداقت کی روشنی پھیلانے کی کوشش میں لاتعداد مشکلات اور خطرات کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ ان صوفیائے کرام میں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بہاؤ الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، سید عبداللہ حسینی رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے مقدس بزرگ شامل ہیں۔

دو قومی نظریہ کا ارتقاء

تاریخی حقائق کا اجمالی خاکہ

ہندوستان میں مسلم قومیت کے ارتقاء کے ساتھ ہی اسلام ایک عالمگیر ضابطہ حیات کے طور پر متعارف ہوا اور اپنے سادہ اور سنہرے اصولوں کی بدولت ہندوستان کے بہت سے طبقوں کو متاثر کیا۔ اسلام نے ہندوستان میں ذات پات کے فرسودہ نظام میں جکڑے ہوئے بے بس انسانوں کو نئی زندگی کا پیغام دیا اور انہیں زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ اسلام کی بنیاد چونکہ توحید خداوندی پر قائم ہے اور یہ اخوت، مساوات عدل و انصاف اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے اس لئے اسلام کی آمد سے ہندومت کے اصولوں کو سخت دھچکا لگا۔

ہندوؤں کے قبول اسلام سے ہندوستان کی آبادی میں ایک تدریجی تبدیلی رونما ہوئی اور ہندوستان کی کل آبادی میں مسلمانوں کا تناسب 25% ہو گیا۔ برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ مسلمان چونکہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے جلد ہی وہ معاشرے پر غالب آ گئے۔ مسلم تہذیب وتمدن نے معاشرے کے ہر شعبے پر اپنا اثر ونفوذ چھوڑا اور مسلم اقتدار کے قیام کے ساتھ ہی مسلمان ہندوستان کی اعلیٰ قوم بن گئے۔

مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً 700 سال تک حکومت کی۔ اس عرصے میں مسلمانوں کا تہذیب وتمدن محفوظ رہا اور انہیں بھی یہ کہنے یا سوچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں۔ اس عرصے میں ہندو اور مسلمان اکٹھے رہے مسلمانوں کے اقتدار کے باوجود معاشرے کے ہر شعبے میں ہندوؤں کو بھی نمائندگی حاصل تھی۔

لیکن اس کے باوجود دونوں قوموں میں کشمکش اور تصادم کے بنیادی اسباب ختم نہ ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوؤں نے اپنی ذات پات اور چھوت چھات کی پابندیوں کو اور بھی سخت کر دیا تھا تاکہ مسلمانوں سے ان کے تعلق کا دائرہ کم سے کم تر ہو جائے۔ کھانے پینے کی جس چیز کو مسلمان کا ہاتھ چھو جاتا وہ بھرشٹ ہو جاتی تھی دونوں قوموں میں باہمی میل جول اور بیاہ شادی کا دربار اکبری کے ایک بہت مختصر دور کے سوا کوئی رواج نہ تھا۔ البیرونی اپنی مشہور کتاب ''کتاب الہند'' میں لکھتا ہے:

''ہندوستان کے ہندو غیر ہندو کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے اور انہیں ملیچھ سمجھتے ہیں۔''

ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کا ربط وضبط ختم کر لیا تھا۔ ذات پات کا نظام ایک آہنی پردہ تھا جس نے دونوں قوموں کو ہمیشہ منقسم اور علیحدہ کئے رکھا۔

اسلام کی مقبولیت کے پیش نظر ہندوستان میں کئی تحریکیں ابھریں جن کا واحد مقصد ہندوستان سے اسلام کی انفرادیت کو ختم کر کے متحدہ قومیت کا تصور جگانا تھا۔ ان تحریکوں نے مذہبی رواداری اور بھائی چارے کا پرچار کیا اور محبت اور انسانی ہمدردی کو سب سے بڑا مذہب قرار دیا۔ دونوں قوموں کو قریب لانے اور اسلام کی منفرد حیثیت کو ختم کرنے کی ایک کوشش اکبر کے دور میں کی گئی جب کہ اکبر نے اپنے خاص سیاسی اور خاندانی مقاصد کے پیش نظر دین الٰہی پیش کیا۔ اس دینی فلسفے میں ہندومت اور اسلام کے چیدہ چیدہ اصولوں کو یکجا کر کے دونوں قوموں کے لئے قابل قبول بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس دین کا مقصد اسلامی اصولوں کو مسخ کرنا تھا۔ لیکن اس کوشش پر بدبختی کا سایہ تھا اور اکبر کی موت کے ساتھ ہی دین الٰہی اپنی موت آپ مر گیا۔

مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی موت کے بعد مغل سلطنت کی عظیم الشان عمارت شکستہ ہو کر زمین بوس ہونے لگی۔ اورنگ زیب کے بعد آنے والے مغل فرمانروا اہل ثابت نہ ہوئے مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار میں دراڑ پڑ گئی۔ جس کا انگریز تاجروں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس بے اطمینان اور مایوسی کے دور میں انگریزوں نے ہندوؤں سے سمجھوتہ کر لیا اور ہندو اپنے سابقہ مالکان کی سلطنت کے خاتمے کے خواب دیکھنے لگے۔

1857ء کی جنگ آزادی کا حشر ناکامی و بربادی پر ہوا۔ سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا اور سارے برصغیر پر برطانوی راج مسلط ہو گیا۔ مسلمانوں کے اعلیٰ اور متوسط طبقے تباہ حال ہو گئے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائی کی اور ظلم وستم کی انتہا کر دی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنے اقتدار کے لئے مسلسل خطرہ سمجھتے ہوئے صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی ٹھان لی۔ اب مسلمان ہندوستان کی غلام آبادی میں قلیل عددی حیثیت رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی سماجی اور معاشی حیثیت یکسر ختم ہو گئی۔ جلد ہی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ انگریزی حکومت کے تحت ان کے اعلیٰ حسب ونسب کے مطابق معاشرے میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

مسلمانوں کے برعکس ہندو ہر میدان میں ترقی کر رہے تھے۔ انہیں انگریز حکمرانوں کی پوری اعانت حاصل تھی۔ ہندوؤں نے چونکہ انگریزی تعلیم بڑے ذوق وشوق سے حاصل کی تھی اس لئے وہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور معاشرے میں ان کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی۔

مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے اس تاریک ترین دور میں سر سید احمد خان جیسے عظیم المرتبت قومی راہنما کو پیدا کیا جنہوں نے خداداد بصیرت سے یہ بھانپ لیا کہ مسلمان کس قدر پستی میں گر چکے ہیں اور انہیں اپنی سابقہ حیثیت کو بحال کرنے کے لئے کتنے کٹھن سفر کی ضرورت ہے۔ سر سید احمد خان وہ پہلے راہنما تھے جنہوں نے مسلمانوں کی بحالی اور بقاء کے لئے ان کے لئے لفظ قوم استعمال کیا اور اعلان کیا کہ ہندوستان میں مسلمان اور ہندو دو قومیں آباد ہیں۔ آپ کے بعد سید امیر علی، سر آغا خان اور دوسرے مسلمان راہنماؤں نے سر سید کے دیئے ہوئے دو قومی نظریئے کی حمایت کی۔ قائداعظم نے اس نظریئے کو آگے بڑھایا اور اسی نظریئے کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا۔

ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اور مسلمان

برصغیر کی آزادی میں مسلمانوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسلمان برصغیر کی آبادی کا بہت بڑا حصہ تھے جو کبھی ہندوستان پر حکمران تھی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کے تہذیب و ثقافت نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر اپنا گہرا اثر چھوڑا تھا۔

1857ء کی جنگ آزادی جو ناکامی اور بربادی پر ختم ہوئی نے ہندوستان سے مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کر کے سارے برصغیر پر برطانوی راج مسلط کر دیا تھا۔ مسلمانوں کا 700 سالہ شاندار دور حکومت ختم ہو گیا تھا اور انگریز کی حکمرانی قائم ہو گئی تھی۔ جنگ آزادی کے بعد انگریز ہندوستان میں ایسا نظام حکومت قائم کرنے کا خواہش مند تھا جو برطانوی اقتدار کو ہندوستان میں مضبوط بنیادوں پر استوار کرے۔

انگریز ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تصادم سے بخوبی واقف تھے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندو اکثریت میں ہونے کی وجہ سے زیادہ سیاسی اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی تائید و حمایت انگریزی اقتدار کے لئے سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا اس طرح وہ مسلمانوں سے کسی حمایت کی توقع نہ رکھتے تھے۔

انگریز حکمرانوں نے ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انہیں بے پناہ مراعات سے نوازا اور ہندوؤں کی جنگ آزادی میں شرکت کو بھول کر انہیں حکومت کے اہم عہدوں پر فائز کیا۔ ہندو جو اس سے پہلے مسلمانوں کے محکوم رہ چکے تھے اس تبدیلی پر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے انگریز حکمرانوں کی طرف اپنا دست تعاون فوری طور پر بڑھایا۔ حکومت کی اس تبدیلی نے ہندوؤں کو سنہرا موقعہ فراہم کیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ محکومیت کا بدلہ چکا سکیں۔

انگریزوں نے ہندوؤں کی ملی بھگت سے مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شرکت کی سزا دینے کے لئے انتہائی ظالمانہ پالیسی اختیار کی۔ مسلمانوں کی جاگیریں چھین لی گئیں انہیں ملازمت سے بے دخل کر دیا گیا اور ہر قسم کے باعزت روزگار کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے گئے مسلمان پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گئے اور ان کی معاشی اور معاشرتی حالت تباہ ہو گئی وہ قوم جو کبھی ہندوستان کی سب سے اعلیٰ اور حکمران قوم تھی روٹی کو محتاج ہو گئی۔

مسلمانوں کو معاشی طور پر تباہ کرنے کے بعد ان کے سیاسی مستقبل کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ انڈین نیشنل کانگریس ایک انگریز سول سرونٹ اے۔ او ہیوم کے ایماء پر مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو تباہ کرنے کے لئے ہندوستان میں مغربی جمہوریت کے لئے

وجود میں آئی اور مغربی طرز انتخاب جاری کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ مغربی طرز انتخاب کی بنیاد اکثریت کے اصول پر رکھی گئی ہے اگر اس نظام کو ہندوستان میں رائج کر دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی حکومت ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے ہاتھ میں آجاتی اور مسلمان ان کے محکوم ہو کر رہ جاتے۔

مسلمانوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز سرسید احمد خان کی قیادت میں کیا۔ سرسید احمد خان نے تحریک علی گڑھ کے ذریعے مسلمانوں کی بحالی کا بیڑا اٹھایا۔ ہندوؤں کے رویے کے پیش نظر سرسید احمد خان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہنا ممکن نہیں۔ لہٰذا اپنے سیاسی حقوق کی بازیابی کے لئے مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کر دیا۔

مسلمانوں نے حکومت سے اپنے لئے ملازمت میں حصہ مقرر کرنے اور حکومت کے مختلف اداروں میں نمائندگی کا مطالبہ کر دیا۔ 1906ء میں جب مسلم لیگ قیام پذیر ہوئی تو اس نے جداگانہ انتخابات کے حصول کو اپنے مقاصد میں شامل کر لیا۔ 1905ء میں شملہ وفد نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ 1909ء کی آئینی اصلاحات میں مسلمانوں کے اس مطالبہ کو قانونی شکل دی گئی۔ 1916ء میں میثاق لکھنؤ میں کانگریس نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو مان لیا۔ 1935ء کے ایکٹ میں بھی جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو تسلیم کر لیا گیا۔

37-1936ء میں 1935ء کے آئین کے تحت عام انتخابات ہوئے جس میں کانگریس نے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کر لی۔ ان چھ صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی کانگریس کی حکومت کے ڈھائی سال ان صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے قیامت کے دن تھے۔ کانگریس نے اپنے دور حکومت میں مسلمانوں کے مذہب، ثقافت اور تہذیب وتمدن کو پامال کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دی گئی اور ان کی عزت و ناموس کو لوٹا گیا۔ کانگریس حکومت کے رویئے نے مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا کہ متحدہ ہندوستان میں ان کا کوئی مستقبل نہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے جداگانہ انتخاب کو ناکافی سمجھتے ہوئے تقسیم ہند کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

اس موقعہ پر کانگریس نے متحدہ قومیت کا پرچار شروع کیا۔ کانگریس مسلمانوں کے جداگانہ وجود کو تسلیم نہیں کرتی تھی اور اس کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان کی آزادی سے تمام مسائل ختم ہو جائیں گے۔

گاندھی کا خیال تھا کہ اسلام کی آمد سے پہلے ہندوستان کے تمام باشندے ایک تھے اور ایک ہی قوم کے فرد تھے۔ اس لئے مذہب کی تبدیلی سے قومیت بدل نہیں جاتی۔ دراصل کانگریس اس بات کی خواہش مند تھی کہ اسے جلد از جلد ہندوستان کا اقتدار مل جائے اور وہ مسلمانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ دوسری طرف مسلمان بھی ہندوؤں اور کانگریس کے عزائم سے واقف تھے اور اپنے لیے مکمل تحفظ چاہتے تھے۔

کانگریس اور ہندوؤں کے رویہ نے مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ کانگریس اور ہندو کسی صورت میں بھی مسلمان کو قبول نہ کریں گے اور یہ دونوں قومیں کبھی بھی مل کر نہ رہ سکیں گی۔ سرسید احمد خان جو کبھی ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے کانگریس کے رویہ کو دیکھتے ہوئے اپنے خیالات بدلنے پر مجبور ہو گئے اور مسلمانوں کے قومی، مذہبی، سیاسی اور معاشی حقوق کے تحفظ کے لئے دو قومی نظریہ متعارف کروایا اور اعلان کیا کہ ہندوستان میں دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان آباد ہیں جو مذہبی، ثقافتی، اور تاریخی لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ دراصل ہندوؤں اور کانگریس کے رویئے کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں اور ان کے راہنماؤں کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے تو وہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کی غلامی میں آجائیں گے جس سے ان کا مذہبی و قومی تشخص تباہ ہو جائے گا۔ سرسید احمد خان کو بھی یہی فکر لاحق تھی اور اسی لئے انہوں نے مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے دو قومی نظریہ

کے تحت مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ سرسید احمد خان نے ہندوستان میں جمہوریت کے اجراء کی مخالفت بھی اسی لئے کی تھی کہ مغربی جمہوریت کا اجراء ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کے منافی تھا۔

دراصل مسلمان 1857ء سے ہی ہندوستان کی آزادی کے متمنی تھے اور چاہتے تھے کہ برصغیر کو انگریزوں سے نجات دلائی جائے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہندوؤں کے غلبہ سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اور اپنے سیاسی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ چاہتے تھے۔ مسلمانوں نے برصغیر کی تاریخ کے ہر موڑ پر برصغیر کی آزادی کی خواہش کی اور اس مقصد کے لئے کئی تحریکیں منظم کیں۔ مسلمانوں کی تحریک آزادی کے سب سے عظیم راہنما قائداعظم نے جب 1913ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تو مسلم لیگ کے مقاصد میں ہندوستان کے لئے خودمختاری کے حصول کو شامل کیا۔ اس کے بعد آپ ہوم رول لیگ سے منسلک ہو گئے جس کا مقصد ہندوستان کے لئے خودمختاری حاصل کرنا تھا۔

مسلمانوں نے بہ حیثیت ایک قوم کے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں نمایاں کام سرانجام دیا ہے۔ تحریک خلافت مسلمانوں کی عظیم تحریک تھی۔ جس نے ہندوؤں کی تحریک سول نافرمانی کے ساتھ مل کر ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی داغ بیل ڈالی۔ اس تحریک نے برطانوی حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کو صحیح خطوط پر منظم کیا۔

علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد 1930ء

علامہ اقبال ایک عظیم فلسفی شاعر تھے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی اور انہیں ان کے شاندار ماضی سے روشناس کرایا۔ آپ نے اسلام کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اسلام کی تعلیمات سے آپ بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ اسلام کے مطالعہ کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمان دنیا کی ہر قوم سے علیحدہ اور منفرد قوم ہیں اور ہندوؤں کے ساتھ ان کا مل کر رہنا ممکن نہیں کیونکہ اپنے دینی تقاضوں کے پیش نظر مسلمان کسی بھی غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی بسر نہیں کر سکتے۔

آپ نے مسلمانوں کے اندر ایک شاندار مستقبل کے لئے جوش و جذبہ پیدا کیا۔ اور اپنی شاعری اور تحریروں کے ذریعے اسلامی مملکت کے خدوخال پیش کئے۔ آپ نے دوقومی نظریئے کا اعادہ کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے جداگانہ قومی وجود کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے آپ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ برصغیر میں ہندو اور مسلمان کبھی بھی اکٹھے مل کر زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔

دسمبر 1930ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا علامہ اقبال اس وقت ہندوستان میں ایک فلسفی اور شاعر کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کر چکے تھے اور ملک کے سیاسی حلقوں میں بھی آپ کو عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ اس موقعہ پر جو آپ نے اپنی صدارتی تقریر کی وہ اسلام کے فلسفہ حیات پر ایک مستند اور بہترین دستاویز کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور ان کی قومی تاریخ میں ایک عظیم سرمایہ ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی اسی صدارتی تقریر میں ہندوستان کے مسلمانوں کی منزل کی نشان دہی کی اور انہیں احساس دلایا کہ ان کے مسائل کا حل صرف اسلامی مملکت کے قیام میں ہے۔

خطبہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے برصغیر کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا۔ آپ نے مذہب پر بڑی مدلل بحث کی اور کہا کہ

"اگر مذہب کو پوری دنیا کا ایک الگ سلسلہ تصور کر لیا جائے تو پھر یورپ میں عیسائیت کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔"

آپ نے کہا کہ
"یورپ کے باشندے مذہب کو ذاتی اور انفرادی مسئلہ سمجھتے ہیں۔لیکن اسلام میں نظریات خدا اور کائنات، مادہ اور روح، کلیسا اور مملکت کو ایک دوسرے کے لئے لازمی جزو کی حیثیت حاصل رہی ہے۔"

آپ نے فرمایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے جس شخص کو چنا گیا ہے وہ اسلام سے قطعی طور پر مایوس نہیں ہوا اور اسلام کو ایک زندہ طاقت سمجھتا ہے وہ طاقت جو انسان کے ذہن کو وطن اور نسل کے تصور سے آزاد کر دیتی ہے۔ اسلام وہ طاقت ہے جو اس کے دائرہ میں داخل ہونے والے ہر انسان کے فکر و نظر کو لسانی، ثقافتی، جغرافیائی اور نسلی حدود و قیود سے آزاد کر دیتی ہے۔ اسلام میرے نزدیک بذات خود مقدر کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ اس کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور کوئی دوسرا اس تقدیر کا رخ پلٹ نہیں سکتا۔

علامہ اقبال نے اسلام کو مکمل ضابطہ حیات قرار دیا اور کہا کہ اسلام انسان کی زندگی کے ہر پہلو کی مکمل راہنمائی کرتا ہے۔آپ نے اسی خطبے کے دوران یہ کہا کہ
"میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کو ایک ریاست کی شکل میں قائم کر دیا جائے۔ جسے برطانیہ کی سلطنت کے اندر یا اس کے باہر حکومت خود اختیاری حاصل ہو اور میرے خیال کے مطابق شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ اسلامی ریاست لازماً قائم کرنا پڑے گی"۔

آپ نے کہا کہ
"انگریزوں یا ہندوؤں کو اس خیال سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہندوستان اس وقت دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی و ثقافتی قوت کے ذریعے زندہ رہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزی حیثیت کو قائم کرے اور یہ وہ حصہ ہے جہاں کے مسلمانوں نے انگریزوں کے لئے فوج اور پولیس میں بے بہا خدمات سرانجام دی ہیں"۔

آپ نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت نہایت نازک موڑ پر کھڑے ہیں اور ان میں اتحاد کی اشد ضرورت ہے۔

آپ نے خطبہ میں مسلمانوں کو تلقین کی۔
"فرقہ وارانہ مفادات اور ذاتی مقاصد سے بالاتر ہو جائیں۔ مادے سے روح کی طرف آ جائیں"۔

آپ نے کہا کہ:
"مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے یہ سبق سیکھا ہے کہ ہماری تاریخ کے نازک ترین حالات میں اسلام نے مسلمانوں کی خدمت کی ہے۔ اگر آپ اسلام کو اپنی خواہشات کا مرکز بنالیں تو اس سے آپ کو اپنی منتشر قوت کو یکجا کرنے میں مدد ملے گی۔ آپ کی کھوئی ہوئی عظمت و شوکت بحال ہو جائے گی اور آپ مکمل تباہی سے بچ جائیں گے"۔

خطبہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کا مطالبہ پیش کیا۔ جس پر ہندوستان کے ہندو بہت سٹپٹائے اور ہندو پریس نے اس مطالبے پر شدید تنقید کی یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ایک علیحدہ اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا گیا۔ اس خطبے نے مسلم سیاست میں سوچ و فکر کی نئی راہوں کو کھول دیا۔ اس خطبے کو آئندہ دس سالوں میں ایک مضبوط مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی جو قیام پاکستان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کی بنیاد علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد میں رکھی گئی تھی۔

چودھری رحمت علی اور پاکستان نیشنل موومنٹ

چودھری رحمت علی کا نام ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں تصور پاکستان کے خالق کی حیثیت سے مشہور ہے آپ 1893ء میں ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد 1914ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ بی اے کرنے کے بعد ''اخبار کشمیر'' میں ملازمت اختیار کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایچی سن کالج لاہور میں بطور لیکچرار مقرر ہوئے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ 1927ء میں آپ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے جہاں سے کیمرج یونیورسٹی سے ایم اے اور ڈبلن یونیورسٹی سے بار ایٹ لاء کیا۔

چودھری رحمت علی ایک بلند پایہ خطیب تھے۔ آپ شروع ہی سے قومی و ملی جذبات سے سرشار تھے۔ آپ مسلمانوں کو ایک علیحدہ اور جدا گانہ قوم سمجھتے تھے اور مسلمانوں کیلئے علیحدہ وطن کے زبردست حامی تھے۔ 1915ء میں بزم شبلی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا:

''ہندوستان کا شمالی حصہ مسلم اکثریت پر مبنی ہے۔ ہم اسے ایک آزاد مسلم ریاست بنائیں گے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم متحدہ قومیت سے علیحدہ ہو جائیں اور ہندوستان سے قطع تعلق کر لیں''۔

انگلستان میں اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران جنوری 1933ء میں چودھری رحمت علی اور آپ کے تین دوسرے دوستوں نے ''اب ورنہ کبھی نہیں'' "Now or Never" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس مضمون میں آپ نے مسلمانوں کے ان راہنماؤں کو تنقید کا نشانہ بنایا جو ہندوستان کو ایک وفاق کے طور پر منظور کرنے کے حق میں تھے۔ آپ نے کہا کہ ہندوستان بطور ایک وفاق کے کسی طرح بھی مسلمانوں کے حق میں نہیں۔ آپ نے کہا کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں جن کی اپنی تاریخ تہذیب و تمدن اور ثقافت ہے جو ہندوؤں سے بالکل مختلف ہے۔ آپ نے کہا کہ دو مختلف اور متضاد قوموں کو ایک وفاق میں منسلک کرنے سے بے چینی پھیلے گی۔ آپ نے کہا کہ اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ برصغیر کو تقسیم کر دیا جائے اور پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک علیحدہ مسلمان مملکت قیام میں لائی جائے۔ آپ نے اس مسلم مملکت کا نام ''پاکستان'' تجویز کیا۔ جس کے حروف پ (پنجاب) ا (افغانیہ) ک (کشمیر) س (سندھ) اور تان (بلوچستان) سے لئے گئے تھے۔

1933ء میں چودھری رحمت علی نے انگلستان میں پاکستان نیشنل موومنٹ کی بنیاد ڈالی۔ اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے قیام پاکستان کیلئے تحریک چلائی گئی۔ پاکستان نیشنل موومنٹ وفاق ہندوستان کی سخت مخالف تھی اور مسلمانوں کے ہندوستان کے ساتھ کسی قسم کے تعلق کے خلاف تھی۔ پاکستان نیشنل موومنٹ کے پلیٹ فارم سے دو قومی نظریئے کی وضاحت کی گئی۔ اس تحریک کے کارکن یورپ، ایشیا اور امریکہ میں اپنے مقاصد اور آزادی کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ اس تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بہ حیثیت ایک قوم متحد کرنے کے لئے کام کیا اور ان کے اندر اپنے ملی اور قومی وجود کی بحالی کیلئے بیداری پیدا کی۔

چودھری رحمت علی نے پاکستان نیشنل موومنٹ کے پلیٹ فارم سے ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا:

''پاکستان نیشنل موومنٹ کیا چاہتی ہے''۔

اس مضمون میں پاکستان نیشنل موومنٹ کے اغراض و مقاصد بیان کئے گئے اور برصغیر کے لئے جنوبی ایشیاء کا نام تجویز کیا۔ 1973ء میں چودھری رحمت علی نے بنگال اور آسام پر مشتمل مسلم ریاست کا مطالبہ کیا جس کا نام ''بانگ اسلام'' تجویز کیا۔ اسی طرح حیدر آباد کی مسلمان مملکت کے لئے ''عثمانستان'' کا نام تجویز کیا۔

چودھری رحمت علی، پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے عظیم محسن تھے۔ آپ نے نہ صرف پاکستان کا نام تجویز کیا بلکہ اس کے حصول کیلئے ایک تحریک بھی چلائی ۔ آپ کے افکار ہندوستان کے نوجوان طبقہ میں بہت مقبول ہوئے اور پاکستان کا نام مملکت کے قیام سے پہلے بہت مشہور ہو گیا۔ آپ نے اپنی اعلیٰ بصیرت کی بناء پر قیام پاکستان سے 34 برس پہلے مسلمانوں کی منزل کی نشان دہی کی۔

1937ء کے انتخابات اور کانگریسی وزارتیں

گول میز کانفرنسوں کی ناکامی کے بعد حکومت نے ہندوستان میں آئینی اصلاحات نافذ کرنے کیلئے 2 اگست 1935ء کو نئے قانون کا اعلان کیا۔ جسے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کہا جاتا ہے۔ اس قانون کی رو سے صوبوں کو مکمل خودمختاری دی گئی تھی۔ اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے گورنروں کو خصوصی اختیارات تفویض کئے گئے تھے۔ مسلم لیگ نے اس قانون پر سخت تنقید کی اور خاص طور پر اس کے مرکزی حصے کو ہندوستان کے لئے ناقابل عمل قرار دیا۔

حکومت نے سب سے پہلے 1935ء کے آئین کے صوبائی حصے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا اور 37-1936ء میں صوبائی اسمبلیوں کی 1771 نشستوں کے انتخابات کرانے کا اعلان کیا مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے ہی 1935ء کے قانون کو ہدف تنقید بنایا تھا۔ لیکن انتخابات میں دونوں جماعتوں نے حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ دونوں جماعتوں کے انتخاباتی پروگرام یکساں نوعیت کے تھے اور یہ توقع کی جاتی تھی کہ صوبوں میں دونوں جماعتیں تعاون اور اشتراک عمل کی راہ اختیار کریں گی۔

انتخابات کے نتائج مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لئے حوصلہ شکن ثابت ہوئے۔ کانگریس نے انتخابات میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی اور اسے پانچ صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ مسلم لیگ کو مسلم اکثریت صوبوں میں ناکامی ہوئی۔ البتہ مسلم اقلیت صوبوں میں نسبتاً زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ کانگریس کو مدراس، اڑیسہ، بہار، یوپی، سی پی میں اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ بمبئی میں اگرچہ کانگریس واضح اکثریت حاصل نہ کر سکی تھی لیکن اسمبلی میں چند آزاد گروپوں کی حمایت سے حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔

یوپی میں مسلمانوں کو کل 238 نشستوں میں سے 64 نشستیں حاصل ہوئی تھیں۔ یوپی کی مسلمان نشستوں میں کانگریس صرف ایک نشست حاصل کر سکی تھی۔ لہٰذا اصولی طور پر کانگریس کو یوپی میں مسلم لیگ کے تعاون سے حکومت بنانی چاہیے تھی۔ اسی طرح یہ توقع بھی کی جا رہی تھی کہ ان علاقوں میں جہاں مسلم لیگ کو اکثریت حاصل ہوئی ہے کانگریس مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرے گی۔ لیکن کانگریس جو کامیابی کے نشے میں بدمست ہو چکی تھی مسلم لیگ کو اس کا جائز حصہ دینے سے گریزاں تھی۔ صوبہ یوپی میں مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرنے کیلئے جب کانگریس اور مسلم لیگ میں افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع ہوا تو کانگریس کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرنے کیلئے نہایت ہتک آمیز شرائط عائد کر دیں جو کہ مندرجہ ذیل تھیں:

1- یوپی کا مسلم لیگ کا صوبائی پارلیمانی گروپ ختم کر دیا جائے۔
2- صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ کے ممبر کانگریس کی رکنیت اختیار کر لیں۔
3- یوپی کا مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ ختم کر دیا جائے اور ضمنی انتخابات میں کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا جائے۔
4- اگر کانگریس وزارت مستعفی ہو جائے تو یہ ارکان بھی اس فیصلے کی پابندی کرتے ہوئے مستعفی ہو جائیں۔

مسلم لیگ نے یہ ذلت آمیز شرائط ماننے سے انکار کر دیا اور اپوزیشن میں رہنے کو ترجیح دی۔

جن صوبوں میں کانگریس اقلیت میں تھی وہاں مختلف ہتھکنڈوں سے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈال کر ایسی مخلوط وزارتیں بنانے کی کوشش کی جن کی بھاگ ڈور کانگریس کے حامی عناصر کے ہاتھوں میں ہو۔ کانگریس کے ان حربوں کی وجہ سے آسام میں سعداللہ

وزارت ختم ہوگئی اور سندھ میں ہندوؤں کی حمایت سے وزارت قائم ہوئی۔ سندھ اور صوبہ سرحد میں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن کانگریس میں ایسے حربے استعمال کئے کہ مسلم لیگ ان صوبوں میں کامیاب نہ ہوسکی۔ پنجاب میں یونینسٹ کامیاب ہو گئے جن کے سربراہ سر سکندر حیات خان تھے۔ سرحد میں افراتفری اور بے یقینی کا عالم تھا جس سے فائدہ اٹھا کر کانگریس نے خان عبد الغفار خان کو اپنے ساتھ ملا لیا اور سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں کانگریس وزارت قائم ہوئی۔

کانگریس حکومتوں کا رویہ

انتخابات جیتنے کے بعد کانگریس نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ پنڈت نہرو نے مارچ 1937ء میں اعلان کیا:

''آج ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں۔ برطانوی سامراج اور انڈین نیشنلزم جس کی نمائندگی کانگریس کرتی ہے''۔

اس کے جواب میں قائداعظم نے کہا:

''کہ ایک تیسرا فریق بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ ہیں مسلمان''۔

کانگریس نے پانچ صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل کی تھی اور دو صوبوں میں آزاد گروپ کی حمایت سے کانگریس کی وزارت بنی تھی اس طرح کانگریس کو کل سات صوبوں میں اکثریت حاصل ہوگئی تھی اور ان سات صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہوسکتی تھی۔ 1935ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی گورنروں کو اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے خصوصی اختیارات تفویض کئے گئے تھے۔ کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ وہ صرف اسی صورت میں وزارت قائم کرے گی اگر گورنر اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال نہ کرنے کی یقین دہانی کرا دیں۔ چنانچہ وائسرائے کی یقین دہانی کے بعد کانگریس نے 7 جولائی 1937ء کو وزارتیں بنانے کا اعلان کیا۔

کانگریس نے اپنے انداز حکومت میں جو رویہ اپنایا تھا وہ بالکل غیر آئینی تھا۔ کانگریس وزارتیں 1935ء کے تحت قائم ہوئی تھیں جس کی بنیادی خصوصیت اس کا پارلیمانی کردار تھا کانگریس نے اس اصول کو بالکل پس پشت ڈال دیا تھا۔ کانگریس کے وزراء پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہونے کی بجائے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے جواب دہ تھے۔ وزراء کا تقرر کانگریس کی ہائی کمان کرتی تھی اور وہی انہیں برطرف بھی کر سکتی تھی۔ کسی بھی صوبے کی کابینہ کو یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ کانگریس کی ہائی کمان کی مرضی کے خلاف کوئی پالیسی مرتب کرے۔ صوبائی وزراء کو کانگریس کی ہائی کمان سے ہدایت جاری کی جاتی تھیں۔ کانگریس نے تین ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل کی تھی جسے وزراء کے بارے میں حتمی اختیارات حاصل تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے سپرد صوبہ پنجاب، یوپی اور بنگال تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو آسام اور اڑیسہ کے صوبے دیئے گئے تھے اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کو بمبئی، سندھ اور مدارس کے صوبے دیئے گئے تھے۔

کانگریسی حکومتوں کے مسلمانوں کے ساتھ ظلم وستم

ہندو ہمیشہ سے مسلمانوں سے ناروا امتیازی سلوک کرنے کے عادی تھے۔ اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد ان کا مسلمانوں کے ساتھ ناروا اور ہتک آمیز سلوک بہت کھلم کھلا اور شدید ہوگیا تھا۔ کانگریسی حکومتوں کے آغاز کے ساتھ ہی مسلمانوں کو مساوی مواقع دینے سے انکار کر دیا گیا اور انتظامیہ میں انہیں ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیا گیا۔

مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو ختم کرنے کیلئے ہندوستان میں یونین جیک کے ساتھ ترنگا جھنڈا لہرانے کے احکامات جاری کئے گئے جس کا واضح مقصد یہ تاثر دینا تھا کہ ہندوستان میں صرف کانگریس اور انگریز ہی دو طاقتیں ہیں۔ جن صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئی تھیں وہاں ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر جاری کیا گیا۔

کانگریس نے اپنے دور حکومت کے دوران گائے ذبح کرنے کی ممانعت کر دی۔ گائے کے ذبیحہ کو فوجداری جرم قرار دیا گیا اور اس کیلئے سزائے موت تک تجویز کی گئی۔

اردو سکولوں کو یا تو ختم کر دیا یا انہیں ہندی اسکولوں میں ضم کر دیا گیا۔ سکولوں میں روزانہ پڑھائی کا آغاز کانگریس کے جھنڈے کو سلامی دینے اور مسلمان دشمن گیت "بندے ماترم" گانے سے ہوتا تھا۔ بندے ماترم کانگریس کا قومی ترانہ تھا۔ اس ترانے میں دھرتی ماتا کی پوجا کا درس دیا گیا تھا۔ اور مسلمانوں کو دھرتی ماتا کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا گیا تھا اس ترانے میں مسلمانوں کو لٹیرے اور غاصب کہا گیا تھا اور انہیں ہندوستان سے مار بھگانے کا سبق دیا گیا تھا۔ سکولوں میں بچوں کو صرف ہندو اوتاروں کی تعلیم دی جاتی تھی اور پوجا پاٹ کا درس دیا جاتا تھا سکولوں میں روزانہ صبح گاندھی کی مورتی کی پوجا کی جاتی تھی۔

مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص اور ان کی ثقافتی اور تہذیبی انفرادیت کو ختم کرنے کیلئے کانگریس نے ایک تعلیمی پالیسی مرتب کی جس کے خالق گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ اس تعلیمی پالیسی کو واردھا سکیم کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ودیا مندر سکیم کا اجراء کیا گیا۔ واردھا اور ودیا مندر سکیموں کا مقصد بچوں میں متحدہ قومیت کا تصور اجاگر کرنا تھا اور بالخصوص مسلمان بچوں کو ان کے مذہب سے بیگانہ کرنا تھا۔ واردھا تعلیمی سکیم کی رو سے موسیقی اور مخلوط تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔

کانگریسی حکومتوں کے تحت صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے ہندوؤں نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہ تھی۔ عین نماز کے اوقات میں ہندو مسجدوں کے سامنے ڈھول اور بینڈ باجے بجانا شروع کر دیتے تھے۔ محرم کے جلوسوں کو بدامنی کے ذریعے درہم برہم کیا جاتا تھا۔ مساجد میں سور کا گوشت پھینک دیا جاتا تھا اور سوروں کے ریوڑ ہانک کر مساجد میں چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو نماز کیلئے اذانیں دینے کی اجازت نہیں تھی۔ مسلمان کی عزت و آبرو پر حملے کئے جاتے تھے اور دادرسی کے لئے جانے والے مسلمانوں کو الٹا مجرم گردانا جاتا تھا۔

کانگریس وزارتوں والے صوبوں میں لوٹ مار، تشدد اور فرقہ وارانہ فسادات عام ہو چکے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات میں سرکاری مشینری ہندوؤں کا ساتھ دیتی تھی اور مسلمانوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا دی جاتی تھی۔ مسلمانوں کی املاک لوٹ لی جاتی تھیں اور انہیں سرعام تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ سرکاری ملازمتوں کے لئے مسلمانوں کو نااہل قرار دے دیا گیا تھا اور جو مسلمان سرکاری عہدوں پر فائز تھے انہیں ملازمت سے بے دخل کر دیا گیا۔ چونکہ ہندوؤں کو پہلی بار اقتدار نصیب ہوا تھا لہٰذا انہوں نے مسلمانوں سے گن گن کر بدلے لئے۔

کانگریسی وزارتوں کے دوران مسلمان انتہائی تلخ تجربات سے دوچار ہوئے تھے۔ مسلمان ہندوؤں کی اصلیت اور ذہنیت سے بخوبی آگاہ ہو گئے تھے اور انہیں یہ سمجھ آ گئی تھی کہ متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت میں رہنا ان کے لئے کتنا بڑا عذاب ہو گا۔

کانگریس کے دور حکومت میں مسلم لیگ پوری طرح سرگرم عمل رہی تھی۔ کانگریس اقتدار کے آغاز کے ساتھ ہی مسلم لیگ نے باآواز بلند مسلمانوں کے تحفظ کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مسلم لیگ نے راجہ محمود مہدی آف پیر پور کی قیادت میں ایک کمیٹی قائم کی جس نے کانگریسی دور حکومت میں مسلمانوں پر کئے گئے مظالم کی چھان بین کی اور مسلم لیگ کو رپورٹ پیش کی جسے پیر پور رپورٹ کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صوبہ بہار میں مسلم لیگ کی شاخ نے مسلمانوں پر کئے گئے مظالم کا جائزہ لیا اور ایک رپورٹ پیش کی جسے شریف رپورٹ کہا جاتا ہے۔ مولوی فضل الحق نے "کانگریسی راج میں مسلمانوں پر مظالم" حکیم اسرار احمد نے "کانگریسی راج" اور آل انڈیا مسلم لیگ نے "پھر ایسا کبھی نہ ہو گا" کے عنوانات سے مختلف مضامین لکھے جن میں کانگریس کے لرزہ خیز مظالم کی داستانیں بیان کی گئی تھیں۔

کانگریس کے مظالم کے خلاف مسلم لیگ کی مہم نے مسلم لیگ کو ہندوستان کی مقبول جماعت بنا دیا اور بڑی تعداد میں لوگ مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔ اکتوبر 1937ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان، مولوی فضل الحق وزیر اعلیٰ بنگال اور سر سعد اللہ خاں وزیر اعلیٰ آسام نے یہ اعلان کیا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کریں گے اور محمد علی جناح کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ مسلم لیگ جلد ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی اور ہندوستان کے تمام شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔

مسلم لیگ کی مقبولیت سے خائف ہو کر کانگریس نے مسلمانوں سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کیلئے ایک مہم کا آغاز کیا جسے "Muslim Mass Contact" کا نام دیا گیا۔ اس مہم کا مقصد مسلمانوں کو مسلم لیگ سے بدظن کر کے مسلم لیگ کی مقبولیت کو ختم کرنا تھا تاکہ مسلم لیگ کو ایک منظم جماعت کی حیثیت سے منتشر کیا جا سکے۔ اس مقصد کیلئے مسلمانوں کو بہت سے لالچ دیئے گئے کرائے کے مولوی حاصل کئے گئے جو مسلمانوں کو مسلم لیگ سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے تھے ان تمام حربوں کے باوجود بھی کانگریس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ جوں جوں کانگریس نے مسلم لیگ کو نقصان پہنچانے کیلئے کوششیں تیز کیں اتنا ہی مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مسلم لیگ نے کانگریس وزارتوں کے خلاف اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔

دوسری جنگ عظیم اور کانگریس راج کا خاتمہ

یکم ستمبر 1939ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا جس سے دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ 3 ستمبر 1939ء کو فرانس اور برطانیہ بھی جنگ میں شامل ہو گئے۔ دوسری جنگ تقریباً 6 سال تک جاری رہی۔ جس وقت برطانیہ جنگ میں شریک ہوا تو ہندوستان میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کا اجراء کر دیا گیا اور ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں سے جنگ میں تعاون کی اپیل کی گئی۔ حکومت کی طرف سے جنگ میں تعاون کی اپیل پر کانگریس نے 14 ستمبر 1939ء کو اپنی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا اور یہ اعلان کیا کہ امن اور جنگ کے مسائل عوام کی مرضی اور سوچ کے مطابق ہونے چاہئیں۔ مسلم لیگ نے بھی اس موقع پر حکومت کے سامنے چند مطالبات پیش کئے اور اعلان کیا کہ صوبائی خود مختاری کے اصول کی بنیاد پر آزاد ہندوستان کیلئے آئین بنایا جائے جس میں اکثریت اقلیت پر غالب نہ آ سکے۔ مسلم لیگ نے جنگ میں تعاون کے لئے حکومت کے سامنے دو شرائط رکھیں۔

1- کانگریس وزارتوں کے صوبوں میں مسلمانوں پر مظالم بند کرائے جائیں اور ان کے حقوق بحال کئے جائیں۔

2- مستقبل میں ہندوستان کے لئے کوئی ایسا دستور نہ بنایا جائے جسے مسلمانوں کی منظوری حاصل نہ ہو۔

وائسرائے ہند نے 11 ستمبر 1939ء کو شاہ برطانیہ کا ایک پیغام مرکزی اسمبلی میں پڑھ کر سنایا جس میں اس امید کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہندوستان اپنے پورے وسائل کے ساتھ جنگ میں حکومت برطانیہ سے تعاون کرے گا۔

18 اکتوبر 1939ء کو وائسرائے ہند نے یہ اعلان کیا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو ایک نو آبادی بنا دیا جائے گا اور آئین سازی کے لئے ہندوستان کی تمام جماعتوں اور نمائندوں سے صلاح مشورے کئے جائیں گے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے 22 اکتوبر 1939ء کو وائسرائے ہند کے اس اعلان کو غیر تسلی بخش قرار دیا اور حکومت سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ دراصل کانگریس جنگی صورتحال کے پیش نظر حکومت کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور جنگ میں تعاون کے لئے کئی مطالبات پیش کر دیئے۔ حکومت پر دباؤ ڈالنے کیلئے یہ تجویز کیا گیا کہ کانگریس وزارتیں بطور احتجاج مستعفی ہو جائیں۔ کانگریس وزارتیں ہائی کمان کے حکم کی تعمیل میں نومبر 1939ء میں مستعفی ہو گئیں۔

یوم نجات

نومبر 1939ء میں جب کانگریس وزارتیں مستعفی ہوئیں تو مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ کے ساتھ ہی مسلمانوں کو ڈھائی سال کے انتہائی اذیت ناک دور سے نجات مل گئی۔ کانگریس حکومت کے یہ ڈھائی سال مسلمانوں کے لئے قیامت کے دن تھے۔ قائداعظم نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ جس دن کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دیا اس دن کو یوم نجات کے طور پر منائیں۔ اس سلسلے میں آپ نے 22 دسمبر 1939ء کو جشن منانے کا اعلان کیا اور قوم سے اپیل کی کہ اس دن شکرانے کے نفل ادا کریں اور خدا کے حضور سجدہ شکر بجا لائیں جس نے انہیں کانگریس کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی۔

مسلمانوں نے 22 دسمبر 1939ء کا دن بڑے جوش و خروش سے منایا۔ سارے ملک میں جلسے کئے گئے اور جلوس نکالے گئے۔ لوگوں نے شکرانے کے نفل ادا کئے۔ تقریریں ہوئیں جن میں کانگریس کے ظلم و ستم کی داستانیں دہرائی گئیں اور دعائے شکرانہ ادا کی گئیں۔

کانگریس کے ظالمانہ دور حکومت نے مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر کوئی متعصب اور تنگ نظر حکومت اقتدار پر قابض ہو جائے تو آئینی تحفظات عملاً بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اب انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں کانگریس کے متعصبانہ اور تنگ نظر اقتدار کے تحت ان کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مسلمانوں کے اندر اب اس احساس نے پختہ یقین کی صورت اختیار کر لی تھی کہ ان کا مستقبل صرف اور صرف علیحدہ وطن حاصل کر کے ہی محفوظ رہ سکتا ہے۔

کانگریس کے ظالمانہ دور حکومت نے مسلمانوں کو متحد اور منظم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مسلمانوں نے اپنے ذاتی اختلافات کو پس پشت ڈال دیا اور مسلم لیگ کے پرچم تلے اکٹھے ہو گئے۔ مسلمانوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب صرف مسلم لیگ ہی ان کے حقوق کا تحفظ کر سکتی ہے اور وہ مسلم لیگ کو اپنا نجات دہندہ تصور کرنے لگے۔ کانگریس کے دور نے ہندوستان میں متحدہ قومیت کے پردے کو چاک کر کے رکھ دیا اور کانگریس جو متحدہ قومیت کے تصور کی سب سے بڑی حامی تھی کا پول کھل گیا۔ مسلم لیگ ایک طاقت ور اور عوامی جماعت بن گئی اور مسلمانوں میں جداگانہ قومیت کا تصور اجاگر ہوا جس نے پاکستان کی منزل کو قریب کر دیا۔

قرارداد پاکستان

قرارداد پاکستان وہ تاریخی قرارداد ہے جس نے مسلمانان ہند کی منزل کی ''نشان دہی'' کی اور مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا رخ متعین کیا۔ اس قرارداد کے ذریعے مسلمانوں نے بالآخر اپنے آخری مقصد کا اظہار کیا اور اپنے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔

1937ء سے ہندوستان کے سیاسی حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ مسلمان راہنماؤں نے ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ دو قومی نظریہ کے تحت بھی ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ 1937ء میں قائم ہونے والی کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں کے دلوں میں پائے جانے والے شکوک و شبہات کو تقویت پہنچائی تھی اور مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ انگریز کے ہوتے ہوئے ہندوؤں نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی تو انگریز کے جانے کے بعد ہندوؤں کا رویہ کیا ہو گا۔

مسلم لیگ کی جدوجہد کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندوؤں کی مسلمان دشمنی کی وجہ سے آئینی تحفظات بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ کانگریس وزارتوں کے دور میں یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ آئینی تحفظات ناکافی اور عملاً بے معنی ہو جاتے ہیں جب کہ اکثریت اقلیت کے درپے ہو جائے۔ ان حالات میں متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کا قومی مستقبل محفوظ نہ تھا اور مسلمان اپنے مستقبل کی حفاظت کے لئے انقلابی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں مختلف اوقات میں کئی تجاویز سامنے آ چکی تھیں۔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے ہندوستان کی تقسیم کا ایک خاکہ پیش کیا تھا جس میں مسلمانوں کے لئے چار خطے تجویز کئے گئے تھے۔

چوہدری رحمت علی نے آسام، بنگال، پنجاب، سرحد، بلوچستان، حیدر آباد دکن اور کشمیر پر مشتمل علیحدہ وطن کی تجویز پیش کی تھی جس کا نام آپ نے پاکستان تجویز کیا تھا۔

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 26 مارچ 1939ء کو اپنے اجلاس منعقدہ میرٹھ میں ایک سب کمیٹی مقرر کی جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ تقسیم کے متعلق تمام تجاویز کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کرے اس کمیٹی میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح (صدر) خواجہ ناظم الدین، لیاقت علی خاں (کنوینر) عبد المتین چوہدری، سر سکندر حیات خان، نواب محمد اسماعیل، سید عبد العزیز، سردار عبد اللہ ہارون اور سردار اورنگ زیب خان۔

اسی دوران سندھ اور یو پی سے مسلم لیگ کی برانچوں نے اپنی قراردادوں میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا جائے۔ مسلم لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ نے ان قراردادوں کی روشنی میں اپنے آئندہ لائحہ عمل کا جائزہ لینا شروع کیا۔

مسلم لیگ کا تاریخی جلسہ 21 مارچ 1940ء کو لاہور میں منعقد ہوا جس کی صدارت قائداعظم نے کی۔ یہ جلسہ لاہور کے تاریخی میدان منٹو پارک جسے آج کل اقبال پارک کہا جاتا ہے میں منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے طول و عرض سے آئے ہوئے لاکھوں افراد نے شرکت کی۔

23 مارچ 1940ء کو قائداعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ
''کانگریس حکومت کے ڈھائی سال ہمارے لئے ایک نہایت تلخ تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ سال ہمارے لئے ایک بڑا سبق ہیں۔ لہٰذا ہمارا ہندوؤں سے خوفزدہ ہونا قدرتی امر ہے۔ درحقیقت یہ بات غلط فہمی پر مبنی ہے کہ مسلمان اقلیت ہیں۔ مسلمان اقلیت نہیں ہیں بلکہ وہ بہر تعریف ایک علیحدہ قوم ہیں''۔

اسی طرح آپ نے فرمایا
''ہندوؤں اور مسلمانوں کا دو مختلف مذہبی فلسفوں، علیحدہ رسوم و رواجات اور جداگانہ ادبیات سے تعلق ہے۔ وہ ایک دوسرے سے نہ تو شادی کر سکتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں اور ان کا دو مختلف تہذیبوں سے تعلق ہے۔ ان تہذیبوں کی بنیاد متصادم اور متحارب نظریات و تصورات پر قائم ہے۔ زندگی کے بارے میں ہندوؤں کے نظریات قطعی طور پر مختلف ہیں اور مسلمانوں کے یکسر علیحدہ حتیٰ کہ ان کی شجاعت و جرات کی داستانیں مختلف ہیں۔ ایک قوم کے ہیرو کو دوسری قوم اپنا دشمن تصور کرتی ہے۔ ایسی دو قوموں کو ایک ہی مملکت میں اکٹھے جوت دینا بے اطمینانی اور بے چینی میں اضافہ کرے گا۔ مسلمان ہر اعتبار سے ایک قوم ہیں۔ ان کا اپنا وطن اپنا علاقہ اور اپنا ملک ہونا چاہیے''۔

23 مارچ 1940ء کو شیر بنگال مولوی فضل الحق نے وہ تاریخی قرارداد پیش کی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی منزل کی نشاندہی کی۔ اس قرارداد کے حق میں نواب محمد اسماعیل خان، قاضی محمد عیسیٰ، آئی آئی چندریگر اور دوسرے مسلمان راہنماؤں نے تقاریر کیں۔ چودھری خلیق الزماں نے اس قرارداد کی تائید کی۔

اس قرارداد کو اکثریت سے منظور کر لیا گیا۔ اس اجلاس میں حاضر لاکھوں افراد نے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے اس قرارداد کو منظور کیا۔ اس قرارداد کے الفاظ یہ تھے:

''ہندوستان میں کوئی بھی آئینی منصوبہ اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگا جب تک کہ اسے حسب ذیل بنیادی اصولوں پر تیار نہیں کیا جاتا یعنی جغرافیائی لحاظ سے متصل اکائیوں کو ایسے خطوں کی صورت میں حد بندی کی جائے اور یہ خطے ضرورت کے مطابق علاقائی ردوبدل کرکے اس طرح قائم کئے جائیں کہ جن علاقوں میں مسلمان آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ہیں۔ انہیں آپس میں اس طرح ملا دیا جائے کہ وہ آزاد اور خودمختار مملکتیں بن جائیں''۔

اس قرارداد میں پاکستان کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ صرف بیگم محمد علی جوہر نے اپنی تقریر میں اس قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے اسے قرارداد پاکستان کہا۔ بعد ازاں یہ قرارداد ''قرارداد پاکستان'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس قرارداد کے منظور ہوتے ہی ہندوستان میں ہل چل مچ گئی اور ہندوؤں نے اس پر بہت واویلا مچایا۔ یہ قرارداد مسلم لیگ کا نصب العین بن گئی اور لوگ لاکھوں کی تعداد میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور قائداعظم کو لوگوں نے اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔

قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے بعد مسلم لیگ پہلے سے زیادہ فعال جماعت بن گئی مسلم لیگ کے سامنے اب صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا اور وہ تھا پاکستان کا حصول مسلمانان ہند اس مطالبے کے حصول کیلئے مسلم لیگ میں شامل ہو رہے تھے۔ قائداعظم نے اپنی اکثر تقاریر میں مطالبہ پاکستان کا اعادہ کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور مسلمان ایک علیحدہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کرپس مشن

1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی منزل اب صرف قیام پاکستان تھی۔ جس کے حصول کے لئے تمام مسلمانان ہند مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہو گئے تھے۔

دوسری جنگ عظیم اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی اور اتحادی فوجیں کامیابی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ حکومت برطانیہ جنگ جیتنے کیلئے ہندوستان کے عوام اور سیاسی جماعتوں کے تعاون کی طلب گار تھی۔ اس مقصد کیلئے حکومت نے سر سٹیفورڈ کرپس کی قیادت میں ایک مشن ہندوستان بھیجا جس کا مقصد ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے بات چیت کرکے آئینی اصلاحات کی سفارش کرنا تھا۔ تاکہ جنگ میں ہندوستانی عوام کا تعاون حاصل کیا جائے۔ کرپس مشن مارچ 1942ء کو ہندوستان پہنچا اور کانگریس اور مسلم لیگ سے گفت و شنید کے بعد اپنی سفارشات پیش کیں۔

کرپس مشن نے اپنی تجاویز میں یہ کہا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کو نوآبادی کا درجہ دے دیا جائے گا اور صوبوں کو یونین سے علیحدہ ہو کر اپنا آئین بنانے کی آزادی ہوگی۔ کرپس تجاویز کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے رد کر دیا تھا۔ کانگریس نے یہ تجاویز اس لئے رد کیں کہ صوبوں کو یونین سے علیحدہ ہونے کا اختیار دے کر ہندوستان کو تقسیم کرنے کا اختیار دے دیا تھا اور مسلم لیگ نے ان تجاویز کو اس لئے مسترد کر دیا تھا کہ ان تجاویز میں پاکستان کے قیام کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا جو کہ مسلم لیگ اور مسلمانان ہند کا دیرینہ مطالبہ تھی۔ گاندھی نے ان تجاویز کو مسترد کرتے ہوئے یہ کہا کہ ''یہ ایک ایسے بنک کا چیک ہے جو کہ دیوالیہ ہو چکا ہے''۔ دراصل کانگریس یہ سمجھتی تھی کہ انگریز جنگ ہار جائیں گے اس لئے ان سے کسی قسم کا معاہدہ کرنا بے سود ہے۔

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد کانگریس نے انگریزوں کے خلاف ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک چلائی جسے حکومت نے سختی سے دبا دیا۔

شملہ کانفرنس

جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول نے سیاسی سمجھوتے کے لئے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کی ایک کانفرنس شملہ میں طلب کی۔ اس کانفرنس کا مقصد ویول پلان پر بحث کرنا تھا تاکہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کیا جا سکے۔ ویول پلان کے مطابق ہندوستان میں ایک وزارتی کونسل کی تشکیل ہونا تھی جس میں مسلمانوں کو اونچی ذات کے ہندوؤں کے برابر وزارتوں میں حصہ دینے کی پیشکش کی گئی تھی۔

شملہ کانفرنس 25 جون 1945ء کو منعقد ہوئی جس میں مسلم لیگ کی نمائندگی قائداعظم نے کی اور کانگریس کی نمائندگی مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ کانگریس ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی اور چاہتی تھی کہ مسلمانوں کی مخصوص نشستوں کیلئے امیدواروں کا تقرر کرے جب کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی اور مسلمانوں کیلئے مخصوص نشستوں پر نمائندوں کا تقرر کرنے میں حق بجانب تھی۔ اس اختلاف کی بناء پر شملہ کانفرنس ناکام ہوئی۔

انتخابات 1946ء

شملہ کانفرنس کے دوران مسلم لیگ کی حیثیت متنازعہ رہی تھی۔ برطانوی حکومت اور کانگریس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم نہ کرتے تھے۔ جب کہ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ تھا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق رکھتی ہے۔

حکومت نے بالاخر انتخابات کا اعلان کیا تاکہ ہر سیاسی جماعت کی حیثیت کا فیصلہ ہو سکے۔ مسلم لیگ نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کیلئے مسلم لیگ نے منظم طور پر انتخابی مہم چلائی۔

قائداعظم نے بذات خود ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو مسلم لیگ کو کامیاب کرانے کی اپیل کی۔ آپ نے مسلمانوں سے چندے کی بھی اپیل کی جس پر لوگوں نے دل کھول کر عطیات دیئے۔ کانگریس نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی مدد سے مسلم لیگ کی انتخابی مہم کو ناکام بنانے کی کوشش کی لیکن اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔

مرکزی اسمبلی کے لئے انتخابات دسمبر 1945ء میں اور صوبائی اسمبلیوں کیلئے انتخابات فروری 1946ء میں منعقد ہوئے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے مخصوص تمام نشستیں مسلم لیگ نے جیت لیں۔ صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لیے 495 نشستیں مسلمانوں کیلئے مختص تھیں جن میں سے 428 مسلم لیگ نے جیت لیں۔

انتخابات کے نتائج نے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو ثابت کر دیا تھا اور کانگریس اور دوسری جماعتوں کے مطالبات کو ٹھکرا دیا تھا۔ ان انتخابات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

کابینہ مشن

1945ء میں انگلستان میں لیبر وزارت بنی اور لارڈ ایٹلی وزیراعظم نے ہندوستان کے سیاسی مسائل کے حل کے بارے میں پارلیمنٹ میں ایک بیان دیا اور کہا کہ وہ ہندوستان کی مخدوش سیاسی حالت سے باخبر ہیں انہوں نے مزید کہا کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق سے پوری طرح آگاہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کسی اقلیت کو اکثریت کی راہ میں روڑے اٹکانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

وزیر اعظم برطانیہ کے اس بیان سے مسلمانوں میں شدید بے چینی پھیل گئی۔ قائد اعظم نے اس بیان کا فوری جواب دیا اور کہ ہم صرف اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں جس کیلئے پاکستان کا قیام ناگزیر ہے۔

لارڈ ایٹلی نے یہ اعلان بھی کیا کہ عنقریب ایک وفد ہندوستان جائے گا جو وہاں کے مسائل کے حل کیلئے اپنی سفارشات دے گا۔ اس موقع پر قائد اعظم نے فرمایا کہ

"ہندوستان کی ہندو اکثریت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور انہیں حق خود ارادیت لازمی طور پر حاصل ہوگا"۔

یہ وفد 24 مارچ 1946ء کو ہندوستان پہنچا۔ اس وفد میں سر سٹیفورڈ کرپس، لارڈ الیگزنڈر اور وزیر ہند پیتھک لارنس شامل تھے۔ چونکہ اس وفد میں برطانیہ کی کابینہ کے اراکین شامل تھے اس لئے اسے کابینہ مشن کہا جاتا ہے۔

کابینہ مشن جس وقت ہندوستان آیا تو ملک ابتری کا شکار تھا۔ ملک میں سیاسی اور معاشی بحران عروج پر تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد ملک میں بے روزگاری تھی جس کی وجہ سے معاشی بدحالی پھیل چکی تھی۔ کابینہ مشن نے آتے ہی اپنے مذاکرات شروع کر دیئے اور ایک ہفتہ تک وائسرائے اور صوبائی گورنروں سے صلاح مشورے کرتے رہے۔

وائسرائے اور گورنروں سے بات چیت کے بعد کابینہ مشن نے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے اپنی گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا۔ کانگریس کی نمائندگی مولانا ابوالکلام آزاد نے کی اور مسلم لیگ کی نمائندگی قائد اعظم نے کی۔ قائد اعظم نے کابینہ مشن کے سامنے واضح کر دی تھی کہ مسلمان اکثریت والے علاقے کو خود مختار اور آزاد پاکستان کی صورت دے دی جائے۔ آپ نے کابینہ مشن کو یہ بتایا کہ

"تقسیم ملک کی مخالفت کرنے والے شاید یہ نہیں جانتے کہ ہندوستان تاریخ کے کسی موڑ پر بھی ہندو مسلم تہذیب و تمدن کے اتحاد کا مظہر نہیں رہا۔ لہٰذا برطانوی حکومت کہاں یہ اتحاد پیدا کر سکتی ہے۔ ہندو اور مسلمان کی تہذیب اور انداز فکر ایک دوسرے سے مختلف ہے ان کے معاشرتی اقدار و نظریات بھی قطعی طور پر مختلف ہیں۔ اس لئے سوائے تقسیم ہند کے اور کوئی علاج نہیں"۔

کابینہ مشن نے ہندوستان کے سیاسی قائدین سے صلاح مشورے کئے۔ مسلم لیگ مطالبہ پاکستان پر سختی سے قائم تھی جب کہ کانگریس اپنے انتہا پسند رویئے سے ہٹنے کیلئے تیار نہ تھی۔ کابینہ مشن نے دونوں جماعتوں کے نقطہ نظر کو سننے کے بعد 16 مئی 1946ء کو اپنی تجاویز پیش کیں جسے "کابینہ مشن پلان" کہا جاتا ہے۔ کابینہ مشن کی تجاویز مندرجہ ذیل تھیں:

1- ہندوستان کی ایک یونین بنائی جائے گی جس میں برطانوی ہند اور ریاستیں شامل ہوں گی۔
2- ایک مرکزی حکومت بنائی جائیگی جس میں صوبوں کو بھی نمائندگی دی جائے گی۔ امور خارجہ، دفاع، مواصلات اور مالیاتی اختیار مرکز کو حاصل ہوں گے۔ فرقہ وارانہ معاملات کو سلجھانے کیلئے ہندو مسلم رائے دہندگان کی اکثریت طے کرے گی۔
3- مرکزی امور کے علاوہ تمام اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے۔
4- صوبوں کے تین گروپ ہوں گے۔ الف گروپ میں ہندو اکثریت کے چھ صوبے شامل ہوں گے۔ ب گروپ میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد شامل ہوں گے ج گروپ میں بنگال اور آسام ہوں گے۔
5- ہندوستان کی یونین میں شامل ہر صوبے اور صوبوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اگر چاہیں تو دس سال کے عرصے میں ہندوستان کی یونین سے الگ ہو جائیں اور اپنا آئین مرتب کریں۔
6- ہر صوبے کی اسمبلی میں مختلف سیاسی جماعتوں کے تناسب کو مدنظر رکھا جائے گا اور ہر ریاست سے اس کی آبادی کی مناسبت

سے نمائندوں کا انتخاب کیا جائے گا۔

7۔ ہر صوبے کی اپنی الگ حکومت اور مجلس قانون ساز ہوگی جب کہ مختلف صوبوں پر مشتمل ہر گروپ کا اپنا انتظامی ڈھانچہ ہوگا۔

8۔ عبوری وقت کیلئے ایسی نمائندہ حکومت بنائی جائے گی جس میں بڑی جماعتوں کے علاوہ اقلیتوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔

9۔ ان تجاویز کو یا تو مکمل طور پر منظور کر لیا جائے یا مکمل طور پر رد کر دیا جائے۔ جزوی منظوری کو نامنظور قرار دیا جائے گا۔

مسلم لیگ اور کانگریس نے کابینہ مشن کی تجاویز کا بغور جائزہ لیا۔ کانگریس نے پہلے تو ان تجاویز کو بہت اہم قرار دیا لیکن اس کے ساتھ ہی گاندھی نے اسے یہ کہہ کر بے معنی بنا دیا کہ کابینہ مشن کی تجاویز صرف اپیل کا درجہ رکھتی ہیں۔ کانگریس نے تجاویز کا یہ حصہ یعنی دستور سازی والا حصہ تو منظور کر لیا لیکن عبوری حکومت میں شمولیت سے انکار کر دیا۔

مسلم لیگ کی طرف سے قائد اعظم نے پاکستان کا مطالبہ تسلیم نہ کیے جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ پاکستان کا حصول ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین ہے اور وہ یہ مقصد حاصل کرنے کیلئے ہر قسم کی قربانی دے دیں گے۔ مسلم لیگ نے کابینہ مشن میں گروپ سسٹم کی وجہ سے پاکستان کے قیام کو ممکن سمجھتے ہوئے کابینہ مشن کے دونوں حصوں کی منظوری دے دی اور عبوری حکومت میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

کابینہ مشن کی تجاویز کا اعلان کرتے ہوئے لارڈ ویول وائسرائے ہند نے یہ کہا تھا کہ اگر مسلم لیگ یا کانگریس میں سے کسی ایک نے ان تجاویز کو نہ مانا تو عبوری حکومت صرف اس جماعت کے تعاون سے قائم کر لی جائے گی جو ان تجاویز کو مان لے گی۔ اب وائسرائے کے بیان کے مطابق حکومت کا یہ فرض تھا کہ وہ مسلم لیگ کے تعاون سے حکومت بناتی اور مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دیتی۔ لیکن انگریز حکومت کانگریس کے دباؤ کی وجہ سے اپنے وعدے سے منحرف ہو گئی اور عبوری حکومت کے قیام کو ملتوی کر دیا گیا۔

عبوری حکومت کے قیام میں اس وجہ سے تعطل پیدا ہو گیا کہ کانگریس مسلم لیگ کو وزارتوں میں برابر حصہ دینے کے خلاف تھی اور مسلم لیگ کی پانچ نشستوں پر ایک کانگریسی مسلمان کا تقرر کرنا چاہتی تھی۔ وائسرائے نے قائد اعظم کو وزارتوں کی تقسیم کے بارے میں اپنا فارمولا بتا دیا تھا جس کے مطابق بارہ وزارتوں میں سے پانچ کانگریس، پانچ مسلم لیگ اور ایک سکھ اور ایک عیسائی وزیر کا تقرر ہونا تھا۔ لیکن کانگریس نے یہ تقسیم ماننے سے انکار کر دیا اور حکومت پر مزید دباؤ ڈالنے کیلئے عبوری حکومت میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔

حکومت کی وعدہ خلافی کے پیش نظر مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ 29 جولائی 1946ء میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت کی ہٹ دھرمی اور وعدہ خلافی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کابینہ مشن کی منظوری کو واپس لے لیا اور پاکستان کے حصول کیلئے راست اقدام کرنے کا اعلان کیا۔ مسلمانوں سے یہ اپیل کی گئی کہ وہ 16 اگست 1946ء کو راست اقدام کے طور پر منائیں۔ یہ تحریک بہت کارگر ثابت ہوئی۔

مسلم لیگ نے جب کابینہ مشن کی منظوری کو واپس لے لیا تو کانگریس نے عبوری حکومت میں شرکت کا فیصلہ کیا اور حکومت سے عبوری حکومت میں شرکت کیلئے گفت وشنید کا آغاز کیا۔ 6 اگست 1946ء کو وائسرائے نے پنڈت نہرو کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔

مسلم لیگ کے راست اقدام کی وجہ سے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ حالات کو مزید خراب ہونے سے بچانے کیلئے وائسرائے نے مسلم لیگ سے حکومت میں شامل ہونے کی درخواست کی جسے مسلم لیگ نے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کیلئے ضروری سمجھتے ہوئے قبول کر لیا۔ 26 جون 1946ء کو مسلم لیگ کے پانچ وزراء عبوری حکومت میں شامل ہوئے جن کے نام درج ذیل تھے:

لیاقت علی خان (خزانہ)، آئی آئی چندریگر (تجارت) راجہ غضنفر علی خاں (صحت)، سردار عبدالرب نشتر (تجارت) اور جوگندر ناتھ منڈل (قانون سازی)

عبوری حکومت مسلم لیگ اور کانگریس کی محاذ آرائی کی وجہ سے کوئی قابل ذکر کام سرانجام نہ دے سکی۔ وزراء میں اتحاد و تعاون مفقود تھا جس کی وجہ سے کوئی ترقیاتی کام نہ ہو سکا۔ دونوں جماعتوں کے وزیر اپنے اپنے اجلاس علیحدہ طلب کرتے تھے۔

عبوری حکومت کے قیام کے بعد کانگریس کی یہ خواہش تھی کہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس فوراً بلایا جائے۔ کانگریس کا یہ مطالبہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی کو کابینہ مشن کی تجاویز میں ردوبدل کا اختیار ہوگا جب کہ قائداعظم یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ دستور ساز اسمبلی کو کابینہ مشن کی تجاویز میں رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ آپ نے وائسرائے کو یہ مشورہ دیا کہ جب تک اس اصول کا فیصلہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک دستور ساز اسمبلی کا اجلاس نہ بلایا جائے۔ لیکن وائسرائے نے کانگریس کے دباؤ میں آ کر 9 دسمبر 1946ء کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔ مسلم لیگ نے اجلاس کا مقاطعہ کیا اور مطالبہ کیا کہ ہندوستان اور پاکستان کیلئے دو علیحدہ علیحدہ دستور ساز اسمبلیاں ہونی چاہئیں۔

3 جون کا منصوبہ

برطانیہ کے وزیراعظم لارڈ اٹیلی نے 20 فروری 1947ء کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ ہر حالت میں ہندوستان کو جون 1948ء تک اقتدار دے کر آزاد کر دے گی۔ اس مقصد کے لئے لارڈ ویول کی جگہ لارڈ مونٹ بیٹن کو نیا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ جن کے ذمے یہ اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے کام کو جلد از جلد مکمل کریں۔

لارڈ مونٹ بیٹن 23 فروری 1947ء کو ہندوستان پہنچا۔ لارڈ مونٹ بیٹن اپنی مسلمان دشمنی کی وجہ سے کافی مشہور تھا۔ اس کے کانگریس کے راہنماؤں اور نہرو خاندان سے ذاتی مراسم تھے۔

مونٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچتے ہی یہاں کے سرکردہ سیاسی راہنماؤں سے گفت وشنید کا سلسلہ جاری کیا۔ مونٹ بیٹن کو ہندوستان کے راہنماؤں سے بات چیت کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ اب ہندوستان کو تقسیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں لہٰذا اس نے ہندوستان کی آزادی سے متعلق ایک منصوبہ بنایا اور مئی 1947ء میں اس منصوبے کی منظوری کے لئے لندن روانہ ہوا۔ حکومت برطانیہ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد مونٹ بیٹن نے ہندوستان واپس آ کر یہ منصوبہ ہندوستان کے سرکردہ سیاسی راہنماؤں کے سامنے رکھا جن میں قائداعظم، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، سردار پٹیل، پنڈت جواہر لعل نہرو اور سردار بلدیو سنگھ ہیں۔ ان راہنماؤں کی منظوری کے بعد مونٹ بیٹن نے 3 جون 1947ء کو اس منصوبے کا اعلان کیا۔ 3 جون کے منصوبے کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

-1 پنجاب اور بنگال کی اسمبلیاں صوبوں کی تقسیم کا فیصلہ کریں گی۔
-2 ہندوستان کا دستور خود ہندوستانی باشندے تیار کریں گے۔ لیکن یہ دستور ان علاقوں پر نافذ العمل نہ ہوگا جو اسے نامنظور کر دیں گے۔
-3 صوبہ سرحد اور ضلع سلہٹ کا فیصلہ استصواب رائے سے کیا جائے گا۔
-4 صوبہ بلوچستان کسی مخصوص طریقے سے اپنا فیصلہ کرے گا۔
-5 ریاستیں خود مختار ہوں گی اور کسی ایک مملکت سے ملنے یا نہ ملنے میں آزاد ہوں گی۔
-6 تقسیم کے بعد سرحدی کمیشن مقرر کیا جائے گا جو دونوں ملکوں کی سرحدوں کا تعین کرے گا۔
-7 دونوں ریاستوں کا اپنا اپنا گورنر جنرل ہوگا اور ان کو اپنے ملک کی سربراہی کے تمام اختیارات حاصل ہوں گے۔
-8 تقسیم کے بعد افواج دونوں ملکوں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔

3 جون کا منصوبہ ہندوستان کے مسلمانوں اور مسلم لیگ کی جان گسل جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ اس منصوبے سے قیام پاکستان کے مطالبے کو اصولی طور پر مان لیا گیا تھا۔ 15 جون 1947ء کو کانگریس نے بھی اس منصوبے کو مان لیا اور اس طرح ہندوستان کی تقسیم اور مطالبہ پاکستان کو تسلیم کر لیا تھا۔

آزادی ہند کا قانون جولائی 1947ء

4 جولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان وائسرائے نے کیا۔ یہ اعلان ریڈیو پر کیا گیا جس کی رو سے ہندوستان کو دو خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور 15 اگست 1947ء کو ہندوستان پر برطانیہ کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ریاستوں کو اپنی مجالس قانون ساز اور انتظامی اداروں کی تخلیق کی اجازت ہوگی اور انہیں اپنا آئین بنانے کی مکمل خود مختاری ہوگی۔ ہندوستان کی تمام ریاستیں جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کر سکتی ہیں۔ جب تک دونوں مملکتیں اپنا اپنا آئین نہیں بنا لیتی اس وقت تک 1935ء کا ایکٹ ضروری ترامیم کے ساتھ دونوں ملکوں میں نافذ العمل رہے گا۔ دونوں ملکوں کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ چاہیں تو برطانوی دولت مشترکہ میں شمولیت اختیار کر سکتے ہیں۔

برطانیہ اور ہندوستان کی شاہی ریاستوں کے مابین تمام سابقہ معاہدات ختم کر دیئے گئے۔ 18 جولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کر لیا اور 14 اگست 1947ء کو پاکستان دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا۔

تقسیم کا مرحلہ

3 جون کے منصوبے میں یہ شق رکھی گئی تھی کہ مختلف صوبوں کی اسمبلیاں تقسیم کے حق یا خلاف فیصلہ کریں گی۔ صوبہ پنجاب اور بنگال نے تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ پنجاب کی اسمبلی کے اجلاس میں 77 کے مقابلے میں 91 ووٹوں کے ساتھ پاکستان میں شامل ہونے کی رائے دی۔ غیر مسلم اکثریت کے اضلاع نے صوبوں کو تقسیم کرانے کے حق میں رائے دی۔

بنگال کی اسمبلی نے بھی 90 کے مقابلے میں 126 ووٹوں سے پاکستان کے ساتھ شمولیت کے حق میں رائے دی اور غیر مسلم اکثریت صوبے کو تقسیم کرنے کے حق میں تھی۔

بلوچستان میں کوئی اسمبلی نہ تھی اس لئے شاہی جرگے کے اراکین اور میونسپلٹی کے ممبران نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ سرحد میں عبد الغفار خان کی مخالفت کے باوجود مسلم لیگ نے ریفرنڈم جیت لیا۔ اسی طرح آسام کے ضلع سلہٹ نے بھی پاکستان میں شمولیت کے حق میں فیصلہ دیا۔

ریڈکلف ایوارڈ

چونکہ پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں نے تقسیم کے حق میں ووٹ دیا تھا اس لئے 30 جون 1947ء کو سرحدی کمیشن مقرر کیے گئے جن کا سربراہ ریڈکلف تھا۔ پنجاب کے لئے باؤنڈری کمیشن میں جسٹس دین محمد، جسٹس محمد منیر جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ شامل تھے۔ بنگال کے لئے باؤنڈری کمیشن میں جسٹس بی کے مکر جی جسٹس سی سی بسواس، جسٹس محمد اکرم اور جسٹس ایس اے رحمان شامل تھے۔ ان دونوں کمیشنوں کے ہندو اور مسلمان اراکین میں اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ جس پر ریڈکلف نے 17 اگست 1947ء کو یکطرفہ طور پر اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ ریڈکلف کا فیصلہ مسلمانوں کے لئے انتہائی غیر متوقع تھا۔ ریڈکلف نے مسلمان اکثریت کے کئی علاقے ہندوستان کو دے دیئے۔ پنجاب میں فیروز پور، گورداسپور اور جالندھر جو کہ مسلم اکثریت کے علاقے تھے ہندوستان کو دے دیئے گئے۔ یہ سب مونٹ بیٹن کے ایماء پر ہوا جو اپنی مسلمان دشمنی کی وجہ سے پاکستان کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔

انتقال اقتدار

لارڈ مونٹ بیٹن کے 3 جون کے منصوبے کے مطابق 15 اگست 1947ء کو ہندوستان میں دو آزاد اور خود مختار ریاستیں معرض وجود میں آ چکی تھی۔ لارڈ مونٹ بیٹن کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان اور پاکستان اسے اپنا مشترکہ گورنر جنرل مان لیں۔ کانگریس نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا تھا کیونکہ اسے یہ مکمل یقین تھا کہ مونٹ بیٹن اس کی خواہش کے مطابق کام کرے گا اور بعد ازاں اس نے اثاثوں کی تقسیم، صوبوں کی حد بندی اور دیگر امور میں کانگریس کے موقف کی حمایت کر کے بد دیانتی کا ثبوت دے دیا تھا۔

قائد اعظم لارڈ مونٹ بیٹن کی کانگریس اور ہندو نوازی سے آگاہ تھے۔ اس کے علاوہ آپ کی خواہش تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کی علیحدگی بہت واضح انداز میں عمل میں آنی چاہیے۔ آپ نے مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ مسلم لیگ نے بھی اس تجویز کو رد کرتے ہوئے قائد اعظم کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بنانے کا فیصلہ کیا۔

7 اگست 1947ء کو قائد اعظم کراچی تشریف لائے جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ 16 اگست 1947ء کو لارڈ مونٹ بیٹن نے دستور ساز اسمبلی کی عمارت میں حکومت پاکستان کے قیام کا اعلان کیا اور ایک پر وقار اور تاریخی تقریب میں قائد اعظم نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور اس طرح ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور مسلمانوں کی سب سے بڑی مملکت پاکستان معرض وجود میں آئی۔

باب نمبر 4

قیام پاکستان

ابتدائی مشکلات واہم واقعات

پاکستان کی تخلیق ایک نظریئے کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ پاکستان کسی جغرافیائی نسلی لسانی یا عصبیتی اسباب کی بناء پر معرض وجود میں نہیں آیا بلکہ اس مملکت کی بنیاد ایک دینی اور ملی فلسفے پر رکھی گئی جو کہ دین اسلام کا فلسفہ تھا اور جس نے بین الاقوامی سیاست میں اس مفروضے کو جھٹلا دیا کہ قوموں کی بنیاد صرف سیاسی اور معاشی محرکات پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔

ابتدائی مشکلات

پاکستان کسی فوجی لشکر کشی یا جنگی کارروائی کے نتیجے میں معرض وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ ایک سمجھوتے کی شکل میں قیام پذیر ہوا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندوں کے مابین باہمی گفت وشنید کے بعد طے پایا تھا۔ ہندوؤں کے نمائندوں نے آخر وقت تک یہ کوشش کی کہ پاکستان نہ بننے پائے لیکن یہ صرف قائداعظم کی لافانی قیادت اور تدبر کا نتیجہ تھا کہ تمام تر مخالفت کے باوجود پاکستان بن کر رہا۔

کانگریس چونکہ قیام پاکستان کے خلاف تھی اس لئے جب پاکستان بن گیا تو اس نے اسے بامر مجبوری قبول تو کر لیا لیکن دلی طور پر وہ پاکستان کے سخت مخالف رہی اور قیام پاکستان کے بعد اس کے رہنماؤں نے پاکستان کیلئے بے پناہ مشکلات اور مسائل پیدا کر دیئے تاکہ یہ نوزائیدہ ملک پنپنے نہ پائے۔ پنڈت نہرو نے تقسیم ہند پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "جناح کو پاکستان لے لینے دو لیکن اقتصادی طور پر پاکستان کے لئے اتنی مشکلات پیدا کر دی جائیں گی کہ پاکستان دوبارہ ہندوستان میں شمولیت کیلئے مجبور ہو جائے گا۔ لیکن قائداعظم نے فرمایا کہ پاکستان زندہ اور قائم رہنے کیلئے معرض وجود میں آیا ہے اور انشاء اللہ یہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا"۔

قیام پاکستان کے وقت برطانوی حکومت نے بھی کانگریس کو خوش کرنے کیلئے پاکستان کیلئے بے شمار مسائل پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ کانگریس اور برطانوی حکومت کی اس پالیسی کی وجہ سے پاکستان کیلئے بے شمار مسائل پیدا ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

ریڈکلف ایوارڈ

آئینی طور پر تو پاکستان بن چکا تھا لیکن ابھی اس کی سرحدوں کا تعین باقی تھا جو کہ نہایت سنگین مسئلہ تھا۔ سب سے زیادہ مشکلات بنگال اور پنجاب کی سرحدوں کے تعین کے سلسلے میں پیش آ رہی تھیں۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم بے شمار انسانوں، نہری نظام، برقابی نظام اور ریلوے کے نظام اور سڑکوں کے نظام کو متاثر کر سکتی تھی کیونکہ خط تقسیم نے ان تمام شعبوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا تھا۔ اس لئے اغلب تھا کہ بے توجہی اور بے احتیاطی سے کھینچا ہوا خط تقسیم مزید مسائل پیدا کر دے گا۔ اس لئے سرحدوں کے تعین کے کام کو احتیاط اور اطمینان سے کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ کانگریس دو ماہ کے اندر انتقال اقتدار پر مصر تھی لہٰذا یہ کام بہر صورت اس مدت کے اندر مکمل ہونا تھا۔

3 جون کے منصوبے میں یہ شق رکھی گئی تھی:

''جونہی کسی ایک صوبہ ''پنجاب اور بنگال'' کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ ہو جائے گا تو گورنر جنرل ایک بونڈری کمیشن مقرر کرے گا جس کی رکنیت اور شرائط کار کو متعلقہ لوگوں کے مشورے سے طے کیا جائے گا۔ اس کمیشن کو مسلموں اور غیر مسلموں کی اکثریت کے متصلہ علاقوں کی اساس پر پنجاب کے دونوں حصوں کی سرحدوں کا تعین کرنے کی ہدایت کی جائیگی۔ ایسی ہی ہدایات بنگال باؤنڈری کمیشن کو بھی دی جائے گی۔ جب تک کسی باؤنڈری کمیشن کی رپورٹ پر عمل درآمد نہیں ہو گا ان عارضی سرحدوں ہی سے کام چلایا جائے گا۔ جن کی نشاندہی ضمیمے میں کر دی گئی ہے''۔ (ظہور پاکستان، چوہدری محمد علی صفحہ 251)

اس منصوبے کی رو سے وائسرائے ایک باؤنڈری کمیشن قائم کرنے کا مجاز تھا جو دونوں ملکوں کی سرحدوں کا تعین کرے گا۔ قائد اعظم یہ چاہتے تھے کہ باؤنڈری کمیشن میں انگلستان کے تین لارڈز کو شامل کیا جائے لیکن ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے گرم موسم کا بہانہ لے کر ان کی شمولیت کو رد کر دیا۔ پھر قائد اعظم نے سرحدوں کے تعین کے سلسلے میں اقوام متحدہ سے مدد لینے کی تجویز پیش کی جسے پنڈت نہرو نے منظور نہ کیا۔ چونکہ انتقال اقتدار دو ماہ میں مکمل ہونا تھا اس لئے قائد اعظم اپنی تجاویز پر اصرار نہ کر سکتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظم سے اس تجویز پر اتفاق کروا لیا کہ پنجاب اور بنگال کیلئے دو علیحدہ باؤنڈری کمیشن مقرر کئے جائیں جن کا سربراہ ریڈ کلف ہو اور جو اسی صورت میں اپنا فیصلہ دے گا جب کہ دونوں کمیشنوں میں اتفاق رائے نہ ہو سکے۔ دونوں کمیشنوں میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے شامل ہوں جو سرحدوں کا تعین کریں گے۔ ریڈ کلف کا فیصلہ دونوں حکومت کیلئے قابل قبول ہو گا۔ ریڈ کلف کی تقرری کو تقسیم کونسل نے منظور کر لیا تھا۔

پنجاب باؤنڈری کمیشن میں پاکستان کی نمائندگی جسٹس محمد منیر اور جسٹس دین محمد نے کی جبکہ ہندوستان کی طرف سے جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ نمائندے مقرر ہوئے بنگال باؤنڈری کمیشن میں جسٹس محمد اکرم اور جسٹس ایس اے رحمٰن پاکستان کی طرف سے اور سی سی بسواس اور بی کے مکر جی ہندوستان کی طرف سے نمائندے مقرر ہوئے۔

ریڈ کلف 8 جولائی 1947ء کو ہندوستان پہنچا اور اپنے بیان میں سرحدوں کے تعین کے سلسلے میں انصاف کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن بعد ازاں اس کے رویہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ اپنے بیان میں مخلص نہ تھا اور اس نے سرحدوں کے تعین میں پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

دونوں کمیشنوں کی کارروائی شروع ہوئی تو دونوں ملکوں کے وکلاء نے اپنے دلائل پیش کئے اور نقشوں کی مدد سے اپنے موقف کو ثابت کرنا چاہا۔ ریڈ کلف نے کمیشنوں کے اجلاس میں شرکت نہ کی بلکہ خفیہ طریقے سے اراکین سے ملاقاتیں جاری رکھیں اور ساتھ ہی ساتھ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ملتا رہا اور اس طرح پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف عمل رہا۔ جیسا کہ توقع تھی دونوں کمیشنوں سے اتفاق رائے نہ ہو سکا اور اس طرح بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے بارے میں ریڈ کلف نے اپنا فیصلہ سنایا جسے ریڈ کلف ایوارڈ کہتے ہیں ریڈ کلف ایوارڈ کے مندرجات سے قائد اعظم کو بہت مایوسی ہوئی اور آپ نے اسے پاکستان کے ساتھ صریحاً ناانصافی قرار دیا۔ ریڈ کلف ایوارڈ ناانصافیوں کا پلندہ تھا۔ یہ فیصلہ دراصل وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے صلاح مشورے سے تیار کیا تھا جو پاکستان کے گورنر جنرل نہ بنائے جانے پر قائد اعظم اور پاکستان سے سخت ناراض تھے۔ ریڈ کلف ایوارڈ میں پاکستان کے ساتھ کافی زیادتیاں کی گئیں۔ ان زیادتیوں کا ذکر سید ریاض حسین نے اس طرح کیا ہے:

''پنجاب میں عارضی تقسیم بھی غیر منصفانہ تھی لیکن آخری فیصلہ تو اس حد سے بھی آگے بڑھ گیا اور اس نے ہمارے بعض نہایت زرخیز قطعات زمین بھی کاٹ کر ڈال دیئے۔ سب سے زیادہ شدید ضرب ضلع گورداسپور پر پڑی جس کی دو تحصیلیں گرداسپور اور بٹالہ جن میں مسلمان 52.1 فیصد تھے پٹھان کوٹ کی تحصیل کے ساتھ ہی ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے اور پاکستان سے بٹالہ جیسا بہترین مسلم صنعتی شہر چھین لیا گیا۔ ریڈکلف نے یہاں تو دیہات وار سرحدی خط کھینچنے کی تکلیف گوارا کر لی لیکن امرتسر کی تحصیل اجنالہ کو بھول گیا جس میں 60 فیصد مسلم اکثریت تھی اور اس کا علاقہ بھی ضلع لاہور سے ملحق تھا۔ زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں جن میں صرف مسلم اکثریت تھی سلسلہ رسل و رسائل میں خلل کے بہانے سے الگ کر دی گئیں'' (سید ریاض حسین، پاکستان ناگزیر تھا۔ صفحہ 526، 527)

ان ناانصافیوں کے علاوہ ریڈکلف ایوارڈ میں پاکستان کے ساتھ جو زیادتیاں کی گئیں ان میں کلکتہ کا ہندوستان میں شامل کیا جانا بھی شامل ہے۔ کلکتہ میں ہندو آبادی میں اچھوتوں کی اکثریت تھی جو ہندوستان میں اپنا مستقبل محفوظ نہ سمجھتے تھے ان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ کلکتہ کو پاکستان میں شامل کیا جائے۔ مسلم لیگ نے کلکتہ میں رائے شماری کرانے کا مطالبہ کیا جسے نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ مرشد آباد کے ضلع کو مسلم اکثریت والا ضلع ہونے کے باوجود ہندوستان میں شامل کر دیا گیا اور اس طرح سلہٹ کے بعض علاقے بھی جہاں پر مسلمان اکثریت میں تھے ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے۔

پنجاب میں گورداسپور کا ضلع مسلمان اکثریت کا ضلع تھا لیکن اسے بھی ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ کشمیر کو جانے والی سڑک گورداسپور سے ہو کر گزرتی تھی۔ اسی طرح ضلع امرتسر اور جالندھر کی بعض تحصیلیں بھی ہندوستان کو دے دی گئیں۔

چونکہ یہ بات پہلے طے پا چکی تھی کہ ریڈکلف ایوارڈ دونوں ملکوں کے لئے قابل قبول ہوگا۔ اس لئے پاکستان نے وعدہ کی پابندی کرتے ہوئے اس غیر منصفانہ فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ تاہم قائداعظم نے ریڈکلف ایوارڈ منظور کرتے ہوئے اس کی ناانصافیوں کی جانب یوں اشارہ کیا:

> ''ہندوستان کی تقسیم اب قطعی اور حتمی طور پر ہو چکی ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس عظیم خود مختار مسلم مملکت کی تشکیل کے وقت ناانصافیاں کی گئیں ہیں۔ جہاں تک ممکن تھا ہمیں دبایا گیا ہے اور ہمارے رقبے کو کم کیا گیا۔ ہم پر جو آخری ضرب لگائی گئی وہ باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ تھا۔ یہ ایک غیر منصفانہ، ناقابل فہم اور قابل نفرت فیصلہ ہے۔ لیکن یہ غلط ہو، غیر منصفانہ ہو، قابل مذمت ہو، عادلانہ کی بجائے سیاسی فیصلہ ہو، ہم ہر حال میں اس کی پابندی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ ہمیں ایک آبرومند قوم کی طرح اس فیصلے کو قبول کر لینا چاہیے''۔

مہاجرین کا مسئلہ

برصغیر کی تقسیم کا سب سے المناک اور غم انگیز پہلو مہاجرین اور تارکین وطن کا مسئلہ ہے جو اپنا وطن، گھر بار، جائیداد اور عزیز و اقارب کو چھوڑ کر اپنی نئی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ پاکستان پہنچنے تک جن مصائب سے مہاجرین کو گزرنا پڑا ان کو یاد کر کے ہر آنکھ پرنم ہو جاتی ہے اور ہر دل خون کے آنسو روتا ہے۔

3 جون کے منصوبے کا اعلان ہوتے ہی ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ نہایت منظم طریقے سے تیار کیا گیا اور اس کیلئے تربیت یافتہ ہندو اور سکھوں کی جتھہ بندی کی گئی۔ اس منصوبے کے مطابق ہندوستان سے نقل مکانی کرنے والے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جانا تھا اور انہیں بزور شمشیر پاکستان میں دھکیلنا تھا تاکہ نئے ملک کیلئے بے شمار اقتصادی مسائل پیدا کر دیئے جائیں اور اسے بھوکے اور ننگے انسانوں کے ہجوم تلے دبا دیا جائے۔

قتل و غارت گری کے اس منصوبے کا پہلا مرحلہ مسلمانوں کو نہتا کرنا تھا۔ اس کے لئے تمام مسلمانوں سے جبراً ہتھیار واپس لے لئے گئے اور بالخصوص مسلمان پولیس اہل کاروں اور فوجیوں سے یا اس کے بعد سکھوں اور ہندوؤں کی منظم جتھہ بندی تھی جنہوں نے بڑے منظم طریقے سے مسلمانوں کے دیہاتوں پر حملہ آور ہونا تھا اور انہیں ہر ممکن طریقے سے ختم کرنا تھا۔

وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن اور کانگریس کے درمیان انتقال اقتدار کی خفیہ سودا بازی ہو چکی تھی جس کی رو سے آزادی اور انتقال اقتدار کی تاریخ کو یکم جون 1947ء سے بڑھا کر 14 اگست 1947ء کر دیا گیا تھا۔ تاریخ بدلنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو اپنی انتظامی مشینری کو منظم کرنے کا موقع نہ مل سکے اور اس پر ایک دم بے شمار مسائل کا بوجھ آن پڑے جس سے ملک تباہ ہو جائے۔ 15 اگست 1947ء تک مشرقی اور مغربی پنجاب کی حکومتیں اپنی از سر نو تنظیم نہ کر سکیں تھیں اس لئے وہ کسی شکل میں بھی کسی مسئلے سے موثر طریقے سے نبرد آزما ہونے کی حیثیت میں نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قتل و غارت اور فرقہ وارانہ فسادات سب سے زیادہ مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب میں ہوئے۔ سکھوں نے فوجی خطوط پر مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنایا۔ مشرقی پنجاب میں امرتسر، جالندھر، فیروز پور، ہوشیار پور، گورداسپور کے علاقے فسادات کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس سلسلے میں ہندوؤں کی جماعت راشٹریہ سیوک سنگھ سب سے زیادہ خطرناک تھی اس جماعت نے دہلی میں بے دریغ مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اگر انتقال اقتدار کی تاریخ کو نہ بدلا جاتا تو پھر مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کی حکومتوں کو خاطر خواہ وقت مل جاتا کہ وہ انتظامی مسائل سے نبٹ سکتیں اور امن و امان پر قابو پا سکتیں۔ پنجاب کے ایک انگریز گورنر کے فسادات کے بارے میں یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''یہ فسادات بھی مونٹ بیٹن کی اس غیر دانشمندی کا نتیجہ تھے جو اس نے یک لخت تقسیم کی تاریخ کو بہت آگے بڑھانے میں کی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر پنجاب کے ہندو اور مسلمان ملازمین کی مناسب طور پر تقسیم اور تنظیم کیلئے آٹھ یا نو ماہ کی مہلت مل جاتی تو پھر اگست، ستمبر اکتوبر میں جو ہولناک قتل عام ہوا وہ ہرگز اس حالت کے قریب بھی نہ پہنچتا''
>
> (چودھری محمد علی ''ظہور پاکستان'' صفحہ 305)

مسلمانوں سے ہر قسم کے ہتھیار چھیننے کے بعد ان کا منظم قتل عام شروع ہوا۔ مسلمانوں کے مکانوں کو نشانات لگا دیئے جاتے تھے اور پھر سکھوں کے جتھے منظم طریقے سے مسلمانوں کے دیہاتوں اور گھروں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ ایک جتھہ پہلے بندوقوں اور رائفلوں سے فائرنگ کرتا تھا تا کہ چھتوں پر چڑھے ہوئے مسلمانوں کو نیچے اترنے پر مجبور کیا جائے اس کے بعد کرپانوں اور تلواروں سے مسلح جتھہ مکانوں میں گھس جاتا تھا اور پھر بے دریغ قتل عام شروع ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد تیسرا جتھہ مشعل بردار ہوتا تھا جو کہ آگ لگانے میں ماہر ہوتا تھا اور جو مکانوں کو نذر آتش کر دیتا تھا۔ گھروں کے باہر گھوڑوں پر سوار سکھ کرپانیں لے کر موجود ہوتے تھے جو آگ سے بچ کر نکلنے والوں کے ٹکڑے کر دیتے تھے۔ بچوں، بوڑھوں اور مردوں کو ہلاک کر دیا جاتا تھا اور جوان عورتوں کو اغواء کر لیا جاتا اور بعض کو زندہ جلا دیا جاتا۔ باؤنڈری فورس کے ایک انگریز افسر نے اپنی رپورٹ میں لکھا:

> ''کہ ایک بھی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا کہ کسی ہندو یا سکھ پولیس والے نے مسلمان کے سوا کسی اور پر گولی چلائی ہو''۔
>
> (Sir Frances Tuker, While Memory Serves pp 445-49)

اوپر دیئے گئے اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بے گناہ مسلمانوں کے قتل عام میں ہندوستان کی حکومت کے اہل کار بھی شامل تھے۔ ریاستوں کے ہندو اور سکھ حکمرانوں نے بھی مسلمانوں کے قتل عام میں گھناؤنا کردار ادا کیا اور سکھوں اور ہندوؤں کو مسلمان کے قتل عام میں ہر ممکن اعانت کی اور انہیں محفوظ پناہ گاہیں مہیا کیں جہاں سے وہ قتل و غارت گری کے لئے روانہ ہوتے تھے ان ریاستوں کی فوجوں نے بھی ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے قتل عام میں حصہ لیا۔

مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے بارے میں کئی انگریز افسروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ جو کچھ مشرقی پنجاب میں ہوا وہ جنگ کی ہولناکیوں سے بھی کئی گنا بدتر ہے۔ مشرقی پنجاب میں جس طریقے سے معصوم بچوں کو قتل کیا جاتا تھا اسے ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ معصوم بچوں کو ماؤں کے سامنے کرپانوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا تھا اور باپ کے سامنے اس کی بیٹی کی عصمت دری کی جاتی تھی۔ 15 اگست 1947ء کو ہندوں اور سکھوں نے اپنا یوم آزادی منایا اس موقع پر امرتسر میں برہنہ مسلمان عورتوں کا جلوس شہر میں پھرایا گیا اور اس کے بعد شہر کی سڑکوں پر لٹا کر مسلمان عورتوں کی آبروریزی کی گئی۔ اس کے بعد باری باری عورتوں کو قتل کیا گیا اور بعض کو زندہ آگ میں ڈال دیا گیا۔

مسلمانوں کے پاس اپنی حفاظت کے لئے کوئی ہتھیار نہ تھا۔ ان کے پاس عام طور پر چھڑیاں اور لاٹھیاں ہوتی تھیں۔ جن سے وہ اپنا دفاع کرتے تھے۔ لیکن ایک طرف بندوقیں، گرنیڈ اور برچھیاں و کرپانیں تھیں تو دوسری طرف بھلا لاٹھیاں اور چھڑیاں کیا مقابلہ کر سکتیں تھیں۔

مسلمانوں کے قتل عام کا سلسلہ صرف شہروں اور دیہاتوں تک محدود نہ تھا بلکہ نقل مکانی کرنے والے مسلمانوں کے قافلوں پر بھی منظم حملے کئے جاتے اور راستے ہی میں بے شمار مسلمانوں کو قتل کر دیا جاتا۔ ہندوستان سے آنے والی گاڑیاں جو مہاجرین کو لے کر پاکستان آتی تھیں کاٹ دی جاتی تھیں اور ریلوے کی پٹریاں اکھاڑ دی جاتیں تھیں۔ جب گاڑی رک جاتی تھی تو پھر اس پر بلہ بول دیا جاتا تھا اور ہر شخص کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے لٹے پٹے قافلے جب پاکستان پہنچتے تو قیامت کا سماں ہوتا تھا ہر طرف زخموں سے نڈھال ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے انسانوں کا جم غفیر ہوتا جو کانگریس اور ہندوستان کے ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و ستم کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

مشرقی پنجاب سے مسلمان ہجرت کر کے جب لاہور پہنچے تو انہوں نے اپنی کہانی سنائی جس کی وجہ سے پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف جوابی کارروائی ہوئی۔

''ان بے گھر، زخموں سے نڈھال اور دست و پا بریدہ انسانوں کو دیکھ کر لوگوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہوئے کہ قائداعظم اور دوسرے لیڈروں نے لوگوں سے تحمل سے کام لینے اور انتقامی کارروائی سے احتراز کی جو اپیلیں کی وہ وقتی طور پر کارگر نہ ہوئیں (چودھری محمد علی ''ظہور پاکستان'' صفحہ 307)

یہ قدرتی ردعمل تھا۔ جب پاکستان کے لوگوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کی داستیں سنیں تو ان کے جذبات بھڑک اٹھے اور انہوں نے پاکستان سے جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ لیکن یہ تشدد مشرقی پنجاب میں کئے جانے والے ظلم و ستم کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا اور نہ ہی یہ منظم خطوط پر کیا گیا۔

قائداعظم اس صورتحال سے سخت پریشان تھے۔ آپ ان حالات سے سخت مایوس ہو چکے تھے۔ ایک موقع پر جب مہاجرین کے قتل عام کی تفاصیل قائداعظم کو بتائی گئیں تو آپ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے اور کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان کی حکومت پاکستان کو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ کر مار دینا چاہتی ہے۔ لیکن پھر بھی قائداعظم نے صبر و تحمل کا دامن نہ چھوڑا اور قوم کی اس مشکل وقت میں رہبری کی۔

ہندوستان کی حکومت پاکستان آنے والے سرکاری ملازمین کی نقل مکانی کی راہ میں بھی مشکلات پیدا کر رہی تھی تاکہ پاکستان کیلئے انتظامی مسائل پیدا کئے جائیں اور پاکستان شروع ہی سے کمزور ہو جائے۔ مہاجرین کی نقل مکانی میں بھی بیشمار رکاوٹیں کھڑی کی گئیں اور پاکستان آنے والے قافلوں پر سکھوں کے حملے تارکین وطن کی نقل مکانی میں سد راہ بنے ہوئے سکھوں کا لیڈر ماسٹر تارا سنگھ اپنے بیانات سے سکھوں کو بھڑکا رہا تھا اور کہہ رہا تھا ''کہ یہ جنگ ہے جنگ'' (چودھری محمد علی ''ظہور پاکستان'' صفحہ 311)

حکومت پاکستان ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ سرکاری ملازمین کے انخلاء کے لئے بی او اے کی سے ایک معاہدہ کیا گیا جس کے ذریعے سرکاری ملازمین کو پاکستان لایا گیا تا کہ انتظامی مسائل پر قابو پا لیا جائے۔ مہاجرین کی پر امن منتقلی کیلئے حکومت ہندوستان سے مل کر کوشش کی گئی۔ فوج نے بھی مہاجرین کے انخلا میں قابل تحسین کام سرانجام دیئے۔

پاکستان میں رہنے والے باشندوں نے بھی مہاجرین کی بحالی کیلئے حکومت کے اقدامات میں بھرپور تعاون کیا۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کے لئے کپڑے اور خوراک کا انتظام کیا اور اپنے مہاجر بھائیوں کو سینے سے لگا لیا۔ حکومت پاکستان نے مہاجرین کی بحالی کیلئے وزارت بحالیات قائم کی اور وزیر اعظم نے اپنا دفتر لاہور منتقل کر لیا تا کہ مہاجرین کی بحالی کے کام کی ذاتی طور پر نگرانی کی جا سکے۔ 10 دسمبر 1947ء تک تقریباً 46 لاکھ 80 ہزار مہاجرین مغربی پنجاب میں پہنچ چکے تھے۔ آخر اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں ایک کروڑ کے لگ بھگ مہاجرین آئے جب کہ پاکستان سے 60 لاکھ افراد ہندوستان گئے۔

شاہی ریاستوں کا مسئلہ

ہندوستان کی شاہی ریاستوں کا مسئلہ برصغیر کیلئے جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ تقسیم سے قبل ہندوستان میں ایسی شاہی ریاستوں کی تعداد کم و بیش 560 تھی۔ یہ ریاستیں ایک معاہدے کی رو سے براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت تھیں اور انکا برطانوی ہند کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ معاہدہ 1908ء میں طے پایا تھا جس کی رو سے تمام ریاستیں اندرونی طور پر آزاد خود مختار تھیں لیکن فوج نہیں رکھ سکتی تھیں۔

تقسیم کے وقت وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جولائی 1947ء میں والیان ریاست کی ایک کانفرنس بلائی اور انہیں بتایا کہ 14 اگست 1947ء کے بعد حکومت برطانیہ اور ریاستوں کے درمیان جو معاہدہ تھا وہ ختم ہو جائے گا اور برطانوی حکومت اس تاریخ کے بعد اس کی حفاظت کی ذمہ دار نہ ہوگی۔ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں یہ بتادیا کہ وہ آزادی کے بعد اپنی ریاست کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اگر وہ آزاد رہنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں بصورت دیگر وہ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کر سکتے ہیں۔

اس اعلان کے بعد والیان ریاست اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے اور تقریباً سب نے 15 اگست 1947ء تک ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ اپنے اپنے الحاق کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن تین ریاستیں جونا گڑھ، کشمیر اور حیدر آبا تذبذب کا شکار تھیں اور کوئی فیصلہ نہ کر سکیں جس سے ہندوستان نے فائدہ اٹھاتے ہوئے تینوں ریاستوں کو ان کا الحاق کرنے کا حق استعمال کرنے کی اجازت نہ دی۔ ان تینوں ریاستوں کا احوال درج ذیل ہے:

جونا گڑھ

کراچی اور بمبئی وسط میں کاٹھیا واڑ کے ساحل پر جونا گڑھ کی ریاست واقع ہے جو کراچی سے تقریباً 300 میل دور جنوب میں واقع ہے اس کا رقبہ 3377 مربع میل اور آبادی تقریباً 7 لاکھ تھی۔ آبادی کی اکثریت ہندو تھی لیکن اس کا حکمران نواب آف جونا گڑھ مسلمان تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ ریاست پاکستان کے نزدیک واقع تھی اور بحری راستے سے بھی اس کا تعلق پاکستان سے قائم ہو سکتا تھا۔

آزادی کے وقت یہ کہا گیا تھا کہ ہندوستان کی ریاستیں جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کر سکتی ہیں۔ مگر الحاق کرتے وقت آبادی اور رجحان اور جغرافیائی حالات کو مدنظر رکھا جائے گا۔ لہٰذا نواب آف جونا گڑھ نے ریاست کی جغرافیائی حیثیت کے پیش نظر پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی جونا گڑھ کے اردگرد کی ریاستوں مناوادر اور منگرول نے بھی پاکستان کے ساتھ

الحاق کا فیصلہ کیا۔ قائد اعظم نے ریاست جونا گڑھ اور پاکستان کے الحاق کو منظور کر لیا اور 5 ستمبر 1947ء کو اس الحاق کی باضابطہ طور پر منظوری دے کر حکومت ہندوستان کو بھی آگاہ کر دیا گیا۔

حکومت ہندوستان نے اس الحاق پر شدید احتجاج کیا اور اسے ہندوستان کی سالمیت کے خلاف قرار دیا۔ ہندوستان کا اصرار تھا کہ ریاست جونا گڑھ کے الحاق کا فیصلہ عوام کی رائے شماری سے کرایا جائے جو ہندوستان اور ریاست جونا گڑھ کی حکومتوں کی مشترکہ نگرانی میں ہو۔

اس احتجاج کے ساتھ ہی حکومت ہندوستان نے ریاست جونا گڑھ پر فوجی چڑھائی کا منصوبہ بنایا تاکہ نواب آف جونا گڑھ کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا مزہ چکھایا جا سکے۔ ریاست، کاٹھیاواڑ کی کچھ ریاستیں جو کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کر چکیں تھیں نے جونا گڑھ کا اقتصادی مقاطعہ بھی کر دیا گیا۔ ہندوستان کے ساتھ ریلوے اور مواصلات کے دوسرے ذرائع کو منقطع کر دیا گیا جس کے نتیجے میں ریاست کی آمدنی پر برا اثر پڑا اور ریاست کی معاشی صورتحال ابتر ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی بمبئی میں جونا گڑھ کی عبوری حکومت قائم کر دی گئی جس نے رضا کار بھرتی کر کے جونا گڑھ میں بدامنی پھیلا دی۔

ریاست جونا گڑھ کے مسئلے پر حکومت ہندوستان اور حکومت پاکستان کے مابین گفتگو کا آغاز ہوا۔ حکومت پاکستان ان علاقوں میں رائے شماری کرانے پر رضا مند تھی جو ہندوستان کے علاقوں کے قریب واقع تھے۔ لیکن ہندوستان کی حکومت پاکستان کی کمزوری کو سمجھتے ہوئے ریاست جونا گڑھ کا فیصلہ بزور شمشیر کرنا چاہتی تھی اس لئے کوئی بھی تجویز ماننے کو تیار نہ تھی۔

ریاست میں بدامنی پھیل رہی تھی۔ فوجی محاصرے نے ریاست کی معاشرتی صورتحال اور امن و امان پر برا اثر ڈالا تھا۔ نواب آف جونا گڑھ حالات پر قابو نہ پاسکا اور بڑی مشکل سے اہل خانہ سمیت جان بچا کر پاکستان آ گیا۔

یکم نومبر 1947ء کو ہندوستانی فوج نے منگرول اور مناوادر کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا تھا اور 7 نومبر 1947ء کو ہندوستان کی بیس ہزار فوج جو جدید اسلحہ سے لیس تھی ریاست جونا گڑھ میں داخل ہوگئی۔

ریاست پر قبضہ کرنے کے بعد حکومت ہندوستان نے حکومت پاکستان کو یہ اطلاع دی کہ ریاست کے دیوان کی درخواست پر ہندوستانی فوج عوام کی حفاظت کے لئے ریاست میں داخل ہوئی ہے پاکستان نے اس کو مضحکہ خیز بہانہ قرار دیا اور کہا کہ چونکہ ریاست جونا گڑھ کا الحاق پاکستان سے ہو چکا ہے اس لئے ہندوستان کی فوجوں کا ریاست میں داخل ہونا پاکستانی علاقے میں مداخلت ہے پاکستان نے ریاست سے جلد ہی ہندوستانی فوجوں کے انخلا کا مطالبہ کیا۔

جونا گڑھ پر قبضہ کے بعد ہندوستان نے اپنی نگرانی میں ریاست میں رائے شماری کروائی جس کے نتائج کا سب کو علم تھا۔ اس رائے شماری کی رو سے ریاست کے عوام نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ ریاست جونا گڑھ پر غاصبانہ قبضہ آج بھی قائم ہے۔ پاکستان نے اس دھاندلی اور بین الاقوامی روایات کی خلاف ورزی پر ہندوستان کے خلاف اقوام متحدہ میں درخواست دی جو تا حال زیر غور ہے۔

حیدر آباد

برطانوی دور حکومت میں ہندوستان میں حیدر آباد کو اپنے وسائل کی وجہ سے ہمیشہ ایک منفرد اور اعلیٰ مقام حاصل رہا ہے۔ حیدر آباد کی ریاست ہندوستان کی اہم ریاستوں میں شمار ہوتی تھی۔ حیدر آباد کا رقبہ 82 ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ 60 لاکھ تھی آبادی کی اکثریت ہندو تھی جب کہ حکمران نظام آف حیدر آباد مسلمان تھا۔ نظام آف حیدر آباد ریاست کی تمام آبادی میں بہت زیادہ

مقبول تھا اور عوام میں بہت زیادہ عزت و تکریم کا حامل تھا۔ اسے "His Exalted Highness" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔
(چودھری محمد علی "ظہور پاکستان" صفحہ 334)

حیدر آباد کی ریاست اپنے معاشی وسائل اور آبادی کی وجہ سے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ اس کی اپنی علیحدہ کرنسی اور ڈاک کا نظام تھا۔ ریاست کی سالانہ آمدنی 26 کروڑ روپے تھی جس سے ریاست کی مضبوط معاشی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ ریاست کے عوام خوشحال تھے اور ہندو اور مسلمان مل جل کر زندگی گزارتے تھے۔

تقسیم کے بعد جب الحاق کا وقت آیا تو نظام آف حیدر آباد اپنی ریاست کی مالی حیثیت رقبہ آبادی کو دیکھتے ہوئے ریاست کی آزاد حیثیت برقرار رکھنے کا خواہش مند تھا۔

درحقیقت ریاست حیدر آباد اپنے وسائل کی بدولت اپنی علیحدہ اور خودمختار حیثیت برقرار رکھ سکتی تھی۔ اس لئے نظام آف حیدر آباد ریاست کے لئے ڈومینین کا درجہ حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ لیکن ریاست کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ یہ چاروں طرف سے ہندوستانی علاقے میں گھری ہوئی تھی اور پاکستان کے ساتھ اس کا کوئی جغرافیائی رابطہ نہ تھا۔ ان حالات کے پیش نظر نظام آف حیدر آباد نے پاکستان اور ہندوستان دونوں کیساتھ الحاق نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور وائسرے لارڈ مونٹ بیٹن کے پاس ایک وفد بھیجا کہ ریاست کو ڈومینن کا درجہ دیا جائے۔

مونٹ بیٹن نے موئنین کا درجہ دینے کی حامی نہ بھری اور نظام آف حیدر آباد کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے کی ترغیب دی۔ یہ بات نظام آف حیدر آباد کو قبول نہ تھی۔ دوسری طرف عوام میں الحاق کی صورت میں پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر زور دیا جاتا رہا۔ مونٹ بیٹن نے ہر ممکن طریقے سے نظام آف حیدر آباد کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے پر رضا مند کرنا چاہا اور الحاق نہ کرنے کی صورت میں خطرناک نتائج سے ڈرایا۔

ریاست کے الحاق کے بارے میں حکومت ہندوستان اور نظام آف حیدر آباد میں گفت و شنید شروع ہوئی جس میں نظام پر ہندوستان کے ساتھ الحاق پر زور دیا جاتا رہا لیکن نظام کسی صورت میں بھی یہ ماننے کیلئے تیار نہ تھا۔

29 نومبر 1947ء کو ریاست حیدر آباد اور ہندوستان کے درمیان ایک اقرار نامہ طے پایا جس کی رو سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ریاست اور ہندوستان کے موجودہ تعلقات کو برقرار رکھا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی نظام نے "خفیہ طور پر مونٹ بیٹن سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ پاکستان سے الحاق نہیں کرے گا" (چودھری محمد علی "ظہور پاکستان" صفحہ 335)

اس اقرار نامہ کی رو سے کے ایم منشی کو حیدر آباد میں ہندوستان کا ایجنٹ مقرر کیا گیا۔ کے ایم منشی نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔

اس مقصد کیلئے ریاست کی ہندو رعایا کو بھڑکایا گیا اور ریاست میں فسادات شروع کرا دیئے۔ ساتھ ہی نظام پر اقرار نامہ کی خلاف ورزی کے الزامات لگا دیئے گئے ان اقدامات کا مطلب ریاست کی امن و امان کی صورتحال کو خراب کر کے فوجی کارروائی کیلئے راستہ ہموار کرنا تھا۔ نظام پر دباؤ زیادہ کرنے کیلئے جنگی کارروائی کی دھمکی دی جا رہی تھی۔ پنڈت نہرو نے بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ اگر ریاست کے عوام کی زندگی اور جان و مال کو خطرہ ہوا تو ہندوستان مداخلت کرنے پر مجبور ہو گا۔ ریاست پر اقتصادی پابندیاں لگا دی گئیں اور ساتھ ہی جنگی کارروائی کی تیاری ہونے لگی۔

24 اگست 1948ء کو ریاست حیدر آباد کی طرف سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو درخواست دی گئی کہ ریاست میں ہندوستان کی فوجی کارروائی کو روکنے کے لئے کوشش کی جائے اور ہندوستان کی جنگی کارروائی سے ریاست کو تحفظ دلایا جائے۔ ابھی اس شکایت کی سلامتی کونسل میں شنوائی بھی نہ ہوئی تھی کہ ہندوستان نے 13 ستمبر 1948ء کو حیدر آباد پر بھر پور حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ ریاست کی فوج اور اتحاد المسلمین کے رضا کاروں نے مزاحمت کی لیکن یہ ایک بڑی فوجی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے اور نظام کی ہدایت پر ہتھیار ڈال دیئے۔ پاکستانی قوم اس وقت قائداعظم کی وفات کے المیے سے گزر رہی تھی۔ مونٹ بیٹن اور ہندوستانی حکومت خاص طور پر اس موقعہ پر فوجی کارروائی کی جب کہ حکومت پاکستان قائداعظم کی وفات کی وجہ سے کوئی کارروائی کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔

نہری پانی کا تنازعہ

قیام پاکستان کے بعد جن مسائل نے پاکستان کی مشکلات میں اضافہ کیا ان میں نہری پانی کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان نے پاکستان میں آنے والے دریاؤں کا پانی روک کر پاکستانی معیشت کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ اس تنازع کی تفاصیل ذیل میں دی جا رہی ہیں۔

تقسیم ہند سے پہلے تقریباً 3 کروڑ 70 لاکھ ایکڑ رقبہ دریائے سندھ کے دریائی سلسلے سے سیراب کیا جاتا تھا۔ اس رقبے میں 3 کروڑ 10 لاکھ ایکڑ رقبہ وہ شامل ہے جو آزادی کے بعد پاکستان کے حصے میں آیا۔ جس میں زیادہ علاقہ مغربی پاکستان کے صوبہ مغربی پنجاب میں واقع ہے اس لحاظ سے پاکستان کے بیشتر علاقے کی آب پاشی کا دارو مدار دریائے سندھ کے دریائی سلسلے پر ہے۔

مغربی پاکستان ایک خشک علاقہ ہے جہاں بارش ناکافی ہے اور آب پاشی کا دارومدار نہری وسائل پر ہے۔ پاکستان میں آنے والی تمام نہریں دریائے سندھ سے نکالی گئی ہیں۔ تین مغربی دریا سندھ، جہلم اور چناب ریاست جموں وکشمیر سے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں جب کہ تین مشرقی دریا راوی، بیاس اور ستلج ہندوستان کے صوبہ مشرقی پنجاب سے ہو کر پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ پاکستان کی تمام زراعت کا انحصار دریاؤں کے پانی پر ہے جو کہ پاکستان کے لئے آب حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کی آب پاشی کی تمام ضرورتیں ان دریاؤں سے پوری کی جاتی تھیں اور اگر ان دریاؤں کا پانی بند کر دیا جاتا تو پاکستان کی معیشت مفلوج ہو کر رہ جاتی اور پاکستانی کاشتکار بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے۔ ایک امریکی باشندے ڈیوڈ یلین تھال جس نے ہندوستان اور پاکستان کا 1951ء میں دورہ کیا تھا اپنی رپورٹ میں نہری پانی کے تنازعہ کو خالص ڈائنا مائیٹ پنجاب کا بارود دان قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جب تک یہ آتش گیر مادہ موجود ہے برصغیر میں امن نہیں ہو سکتا۔ وہ لکھتا ہے:

> ''آب پاشی کے لئے پانی نہ ملنے سے مغربی پاکستان ریگستان بن جائے گا۔ 2 کروڑ ایکڑ اراضی ایک ہفتے کے اندر خشک ہو جائے گی اور کروڑوں انسان فاقوں مر جائیں گے۔ جن نہروں سے پاکستان کے لوگ اور کھیت زندگیاں پاتے ہیں اگر ہندوستان ان کے سرچشمے مستقل طور پر بند کر دے تو فقط اس ترکیب سے پاکستان کی سرزمین اس طرح تباہ ہو جائے گی کہ کوئی فوج بموں اور توپوں کی گولہ باری سے بھی اتنی مکمل غارتگری نہیں کر سکتی''۔ (چوھدری محمد علی ''ظہور پاکستان'' صفحہ 385)

پنجاب کی تقسیم کے وقت ریڈ کلف نے کئی مسلم اکثریتی علاقے ہندوستان کی تحویل میں دے دیئے تھے اس کے علاوہ جو خط تقسیم کھینچا تھا اس نے پنجاب کے آبی وسائل کو اس طرح کاٹ دیا تھا کہ ہندوستان بالائی علاقہ بن گیا تھا اور پاکستان زیریں علاقہ رہ گیا اس تقسیم کی وجہ سے دریائے راوی کا مادھو پور ہیڈ ورکس اور دریائے ستلج پر فیروز پور ہیڈ ورکس ہندوستانی علاقے میں رہ گئے تھے۔ یہ تقسیم کرتے وقت ریڈ کلف نے یہ امید کی تھی کہ بالائی حصہ والا ملک زیریں حصہ والے ملک کی آبی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے اس کے آبی وسائل میں کمی نہ کرے گا۔

مغربی پنجاب کی حکومت مشرقی پنجاب کی حکومت کے بیانات کی روشنی میں خوش فہمی میں مبتلا رہی اور یہ سمجھتی رہی کہ ہندوستان بین الاقوامی قانون کی پابندی کرتے ہوئے پاکستان کا پانی بند نہ کرے گا۔ مغربی پنجاب کی حکومت کے سنہرے خواب اس دن ٹوٹ گئے۔

جب یکم اپریل 1948ء کو مشرقی پنجاب کی حکومت نے پاکستان میں آنے والی ہر نہر کا پانی روک لیا اور اس طرح پاکستان کو ایک شدید بحران سے دوچار کر دیا۔ ان نہروں سے مغربی پاکستان کا تقریبا ساڑھے 16 لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب کیا جاتا تھا۔ مشرقی پنجاب کی حکومت نے پانی بند کرنے کا جواز یہ دیا کہ پاکستان ان نہری پانی کا حق دار نہیں ہے اور اگر پاکستان کو پانی درکار ہے تو اس کی قیمت ادا کرے۔ پانی بند ہونے سے فصلوں اور مویشیوں کیلئے پانی کی شدید قلت پیدا ہوگئی اور پاکستان کی زراعت کو خطرناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان نے اس صورتحال کے پیش نظر ہندوستان سے بات چیت کیلئے ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ یہ وفد اپریل 1948ء میں وزیر خزانہ غلام محمد کی قیادت میں دہلی گیا۔ 4 مئی 1948ء کو پاکستانی وفد کو ایک بیان پر دستخط کیلئے کہا گیا جس کی رو سے یہ کہا گیا کہ مشرقی پنجاب کی حکومت آہستہ آہستہ نہروں کا پانی بند کرے گی تاکہ پاکستان کو آب پاشی کے متبادل انتظام کیلئے مہلت مل جائے۔ اس دوران جو پانی پاکستان کو دیا جائے گا پاکستان کو اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی جس کا تعین وزیر اعظم ہندوستان کرے گا۔ پاکستان کو یہ سمجھوتہ بہ امر مجبوری ماننا پڑا۔

مارچ 1950ء میں ہندوستانی اور پاکستانی نمائندوں کی کراچی میں کانفرنس منعقد ہوئی۔ پاکستان کے وفد کے قائد چوہدری محمد علی تھے جنہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ دونوں ملک اپنی آبی ضروریات کو موجودہ وسائل سے پورا کریں اور مزید ضرورت کے لئے دریائے راوی، ستلج اور بیاس پر بند بنائے جائیں۔ ہندوستانی وفد نے ستلج کا سارا پانی ہندوستان کو دینے کی تجویز پیش کی اور بیاس، راوی اور چناب کے پانی کو پاکستان کو دینے کی تجویز دی۔ مزید تفصیلات کیلئے یہ طے پایا کہ مئی 1950ء میں دہلی میں ایک اور کانفرنس کی جائے۔

دہلی کانفرنس میں ہندوستان اپنی کراچی کانفرنس والی تجاویز سے یکسر بدل گیا اور تمام دریاؤں کے پانی پر اپنا حق جتلایا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان پاکستان کو تباہ کر دینا چاہتا ہے۔ ہندوستان کسی بھی مفاہمت پر رضامند نہ ہوتا تھا۔ جس کی بناء پر مذاکرات ناکام ہو گئے۔

دونوں ملکوں کے درمیان اس طویل تنازعہ کے حل کیلئے عالمی بینک نے خدمات پیش کرنا چاہیں اور بینک کے صدر یوجین بلیک نے دونوں حکومتوں کو یہ مشورہ دیا کہ عالمی بینک کے تعاون سے سندھ کے آبی وسائل کو انجینئرنگ کی بنیاد پر ترقی دی جائے اور اس سلسلے میں جو نئی تعمیرات کرنا پڑیں گی ان کے اخراجات کے لئے عالمی بینک تعاون کرے گا۔ دونوں حکومتوں نے صدر یوجین بلیک کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ جب تک عالمی بینک اس کام میں شریک رہے گا دونوں ممالک کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گے جس سے دوسرے فریق کے استعمال کیلئے پانی میں کمی ہو۔ اس سمجھوتے کے باوجود ہندوستان وقتاً فوقتاً پاکستان کا پانی روکتا رہا اور اس میں کمی کرتا رہا۔

5 فروری 1954ء کو بینک نے سندھ طاس کے آبی وسائل کے بارے میں نئی تجویز پیش کی جو پہلی تجویز سے بالکل مختلف تھی اور جس میں ہندوستان کے مفاد کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ بینک کی تجویز یہ تھی کہ مغربی دریاؤں سندھ، جہلم اور چناب کا سارا پانی پاکستان کو دے دیا جائے اور جہلم کا تھوڑا سا پانی ہندوستان کے تصرف میں رہنے دیا جائے جو کشمیر میں استعمال ہوتا تھا۔ مشرقی دریاؤں ستلج،

بیاس اور راوی کا سارا پانی ہندوستان کو دے دیا جائے۔ ہندوستان ایک خاص مدت تک پاکستان کو ان دریاؤں سے اتنا پانی دیتا رہے جتنا پاکستان پہلے لیتا رہا ہے عبوری مدت کے دوران پاکستان اپنی ضرورت کے لئے رابطہ نہریں تعمیر کرے۔ اس منصوبے میں مشرقی دریاؤں پر بند باندھنے کی کوئی تجویز نہ تھی اور دریاؤں کی اس تقسیم کیلئے پانی کی بنیاد بھی نہیں رکھی گئی تھی۔ ہندوستان نے اس تجویز کو فوراً مان لیا۔

بینک کے اس منصوبے نے پاکستان کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ پاکستان کے اصرار پر ایک امریکی انجینئر آئے جنہوں نے بینک کی تجویز کا جائزہ لیا اور اسے بین الاقوامی قانون کے مطابق ناجائز قرار دیا۔ آخر کار بینک اپنی تجویز میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو گیا اور کہا کہ ترمیم ایسی ہو جس سے پاکستان کو پانی کی کمی سے بچایا جا سکے۔

نئی ترمیم کی رو سے بینک نے یہ تجویز کیا کہ مغربی دریاؤں پر پانی کے ذخیرہ کے لئے بند تعمیر کئے جائیں جن کے تعمیری اخراجات کے لئے سرمایہ ہندوستان فراہم کرے گا اور ذخیرہ آب کے لئے پاکستان میں آنے والے پانی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ 30 جولائی 1956ء کو بینک نے یہ رائے دی کہ دونوں ملک بینک کی 1954ء اور 1956ء والی تجاویز کی روشنی میں بینک کے ساتھ تعمیری منصوبہ کے لئے تعاون کریں۔ جسے دونوں حکومتوں نے منظور کر لیا۔ اس کے باوجود سمجھوتہ مکمل ہونے میں 4 سال کا عرصہ لگا اور بالآخر 19 ستمبر 1960ء کو کراچی میں سمجھوتہ پر دستخط ہوئے۔

سمجھوتہ پر ہندوستان، پاکستان اور عالمی بینک کے نمائندوں نے دستخط کئے۔ اس معاہدہ کی رو سے ایک بین الاقوامی مالیاتی فنڈ قائم کیا گیا جس کے مطابق پاکستان میں آب پاشی کی تعمیرات کیلئے 90 کروڑ ڈالر کا سندھ طاس تعمیراتی فنڈ قائم کیا گیا۔ اس فنڈ میں کینیڈا، برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا اور مغربی جرمنی نے مجموعی طور پر 64 کروڑ ڈالر کے عطیات دیئے۔ ہندوستان نے 7 کروڑ 40 لاکھ ڈالر ادا کئے اور عالمی بینک نے 8 کروڑ ڈالر کی امداد دی۔

اس پروگرام کے مطابق پاکستان میں 8 رابطہ نہریں شامل تھیں جو مغربی دریاؤں کے پانی کو ان علاقوں تک لے جائیں گی۔ جو پہلے مشرقی دریاؤں کے پانی سے سیراب ہوتے تھے۔ دریائے جہلم اور سندھ پر دو بند تعمیر کئے جانے تھے۔ اس کے علاوہ کئی بجلی گھر اور ٹیوب ویلوں کی تعمیر بھی اس منصوبہ میں شامل تھی۔ ان تمام تعمیرات کے لئے 10 سال کا عرصہ رکھا گیا جس میں 3 سال توسیع ہو سکتی تھی۔ 10 سال کی عبوری مدت کے دوران ہندوستان پاکستان کو مشرقی دریاؤں سے پانی بہم پہنچانے کا پابند تھا۔

انتظامی مسائل

کسی بھی نئی مملکت کے معرض وجود میں آنے کے بعد جو مسئلہ فوری توجہ کا طلب گار ہوتا ہے وہ ملکی نظم ونسق کو چلانے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ شروع کے پر ابتلا دنوں میں ملکی انتظامیہ ہی حالات پر قابو رکھتی ہے اور قوم کو مایوسی اور بے بسی کے دور سے نکال لیتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کو بھی ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑا اور ملک معرض وجود میں آنے کے کئی سال بعد تک انتظامی مسائل سے دوچار رہا۔ لیکن اللہ کے فضل سے قوم نے ان برے لمحات میں قائداعظم کی قیادت میں اپنی پریشانیوں پر قابو پا لیا۔

آزادی ہند سے پہلے ملک کا نظم ونسق چلانے کے لئے انڈین سول سروس قائم تھی جو کہ ملکی انتظامیہ کیلئے دل کا درجہ رکھتی تھی اس سروس میں اکثریت ہندو افسروں کی تھی کیونکہ آزادی سے پہلے انگریز اور ہندو کسی صورت بھی مسلمانوں کو انڈین سول سروس میں کسی بڑے عہدے پر فائز نہ ہونے دیتے تھے۔ جو تھوڑے بہت مسلمان اپنی استعداد کی وجہ سے اس سروس میں شمولیت کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے تھے وہ بھی پوری ترقی نہ کر پاتے تھے۔

پاکستان بنا تو ہندوستان کی یہ خواہش تھی کہ پاکستان کسی صورت بھی ترقی کرنے کے قابل نہ رہے جس کیلئے حکومت ہندوستان پاکستان کے لئے انتظامی مسائل پیدا کرنا چاہتی تھی۔ اس کیلئے حکومت ہندوستان نے پاکستان جانے والے انتظامی عملے اور افسران کی منتقلی میں رکاوٹیں اور مشکلات پیدا کیں اور انتظامی افسران کو پاکستان جانے سے روکے رکھا اور ہر حربہ آزمایا جس سے پاکستان کے مسائل میں اضافہ ہو۔

ہندوستان کے ان حربوں سے حکومت پاکستان بے پایاں انتظامی مسائل سے دوچار ہوئی۔ حالت یہ تھی کہ دفتروں کے لئے عمارتیں ناپید تھیں اور دفتری کام چلانے کیلئے سٹیشنری، فرنیچر اور قلم دوات تک میسر نہ تھے ان نامساعد حالات میں قائداعظم نے قوم کی رہبری کی اور انہیں مایوس کن حالات سے نکالا۔ عوام اور خاص طور پر سرکاری عملہ نے قائداعظم کی قیادت میں ہر مشکل کا مردانہ وار سامنا کیا اور ہندوستان کی ہر چال کو ناکام بنا دیا۔ سرکاری افسران نے انتہائی نامساعد حالات میں ملکی نظم ونسق کو سنبھالا اور دفتری کام کو جاری رکھا۔

قائداعظم نے 11 اکتوبر 1947ء کو انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمارے وجود کو چیلنج ہے اگر ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے اور پاکستان کے خواب کو حقیقت کی شکل دینا ہے تو ہمیں درپیش مسائل سے پوری قوت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ ہمارے عوام آج منظم نہیں ہیں اور ان مسائل سے پریشان ہیں جو انہیں درپیش ہیں۔ ان کا حوصلہ بلند کرنے کی ضرورت ہے اور انہیں مایوسی کے گڑھے سے نکالنے کیلئے ہمیں بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ ان نامساعد حالات نے انتظامیہ کے کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے اور عوام رہنمائی کیلئے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں''۔

انتظامی مسائل پر قابو پانے کیلئے حکومت پاکستان نے قائداعظم کی قیادت میں متعدد اقدامات کئے اور اپنے محدود وسائل کے باوجود بہت حد تک ان مسائل کو دور کر لیا۔ انڈین سول سروس کی جگہ سول سروس آف پاکستان کا اجراء کیا گیا اور سول افسران کی تربیت کیلئے سول سروس اکادمی قائم کی گئی۔ تمام سول ملازمین اور افسران کے لئے اردو اور بنگالی زبان لازمی قرار دی گئی اور ہر افسر کیلئے یہ لازمی قرار پایا کہ وہ اپنی ملازمت کے پہلے دس سال مساوی طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان میں گزارے۔ اس اقدام سے دونوں صوبوں کے معاشرتی حالات میں یک رنگی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی قابل تحسین کوشش کی گئی۔

ہندوستان سے سرکاری ملازمین اور افسران کو پاکستان لانے کیلئے ٹاٹا ہوائی کمپنی سے معاہدہ کیا گیا۔ لیکن جب حکومت ہندوستان نے ٹاٹا ہوائی کمپنی کا لائسنس منسوخ کر دیا تو پھر برطانیہ کی ہوائی کمپنی بی او اے سی سے یہ معاہدہ کیا گیا جس کے ذریعے ہندوستان سے سرکاری ملازمین کو پاکستان پہنچایا گیا۔

انتظامیہ کی تنظیم نو کے لئے سیکرٹری جنرل کا عہدہ قائم کیا گیا اور چودھری محمد علی کو پاکستان کا پہلا سیکرٹری جنرل نامزد کیا گیا جنہوں نے ملک اور قوم کے اس مشکل اور کٹھن وقت میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ سروسز کی تنظیم نو کے لئے چودھری محمد علی کا فارمولا منظور کر لیا گیا جس کے تحت متعدد اقدامات کئے گئے۔

ملک میں پہلی مرتبہ ملازمتوں کے قوانین کا اجراء ہوا اور پاکستان سیکرٹریٹ کا قیام عمل میں لایا گیا چودھری محمد علی کے فارمولے کے مطابق ملک کی تمام اکاؤنٹس سروسز اور ریلوے اکادمی سروس کو پاکستان اکاؤنٹس سروس میں مدغم کر دیا گیا۔ فروری 1948ء میں جسٹس محمد منیر کی صدارت میں پہلا تنخواہ کمیشن قائم ہوا جس کے ذمے ملازمین کی تنخواہوں، الاؤنسوں اور دوسری مراعات کے بارے میں رپورٹ مرتب کرنا تھی تاکہ ملازمتوں کے نظام میں یکسانیت پیدا کی جا سکے۔

پاکستان فارن سروس قائم کی گئی جس نے قائد اعظم کے اصولوں کی روشنی میں ملک کے لئے آزاد خارجہ حکمت عملی کی بنیاد رکھی۔ عالم اسلام سے روابط کو خاص اہمیت دی گئی اور پاکستان نے بین الاقوامی برادری میں اپنا تشخص قائم کیا۔ پاکستان فعال اور آزادانہ خارجہ پالیسی کی بدولت 1948ء میں اقوام متحدہ کا رکن بنا۔

بری، بحری اور ہوائی فوجوں کے ہیڈ کوارٹر قائم کئے گئے اور واہ کے مقام پر ملک کی پہلی اسلحہ ساز فیکٹری قائم کی گئی۔

یہ تھے وہ اقدامات جو قوم نے قائد اعظم کی قیادت میں اپنے انتظامی مسائل کو حل کرنے کیلئے کئے اور جن کی بدولت پاکستان اپنے ابتدائی کٹھن دور سے آسانی سے گزر گیا۔

اقتصادی مسائل

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کانگریس اور ہندوستانی حکومت کی یہ دلی خواہش تھی کہ پاکستان آزادی کے بعد پنپنے نہ پائے لہٰذا انہوں نے ہر ممکن یہ کوشش کی کہ پاکستان کے بے شمار مسائل پیدا کر دیئے جائیں۔ مہاجرین کا قتل عام، جونا گڑھ، حیدر آباد اور کشمیر پر بزور شمشیر قبضہ اور انتظامیہ مشکلات جن کا گزشتہ صفحات میں جائزہ لیا جا چکا ہے۔ ہندوستان کی پاکستان کو تباہ و برباد کرنے کی خواہش کے سلسلے میں کڑیاں تھیں لیکن پاکستان خدائے برتر کی مدد اور قائد اعظم کی لازوال قیادت کی بدولت ان تمام امتحانوں سے سرخرو ہو کر نکلا۔

اسی ضمن میں جو دوسرے مسائل آتے ہیں ان میں پاکستان کے اقتصادی مسائل بھی سر فہرست ہیں۔ ہندوستان نے ہر ممکن کوشش کی کہ پاکستان اقتصادی طور پر تباہ ہو جائے۔ اس کیلئے انہوں نے پاکستان کے حصے کا روپیہ اور دوسرے اثاثہ جات دینے سے انکار کر دیا جن سے پاکستان کی اقتصادی حالت کے بارے میں شک وشبہات پھیلانے شروع کر دیئے تھے اور اس ضمن میں بڑا موثر پروپیگنڈہ کیا تھا کہ پاکستان آزادی کے دو سال بعد ہی اقتصادی طور پر تباہ ہو جائے گا۔ اس پروپیگنڈے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور لوگ واقعی پاکستان کی اقتصادی صورتحال کے بارے میں مشکوک ہو گئے۔ دسمبر 1943ء میں ایک انگریز صحافی بیورلے نکولس نے قائد اعظم سے پاکستان کی اقتصادی صورتحال کے بارے میں تبادلہ خیال کیا اور اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ جس کے جواب میں قائد اعظم نے فرمایا:

> ''مسلمان ایک سخت جان قوم ہیں، دبلے پتلے اور جفاکش، اگر پاکستان کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انہیں کچھ اور سخت محنت کرنا پڑے گی تو وہ اس پر کوئی شکایت نہیں کریں گے لیکن اس کا نتیجہ یہ کیوں لیا جائے یہ خیال کرنے کی آخر کیا معقول وجہ ہے کہ قومی آزادی کا صلہ معاشی بدحالی ہوگا''۔ (Beverly Nichols, Verdict on India pp 189-91)

انگریزی حکومت میں ہندوستان کی معاشی تعمیر و ترقی کی طرف کوئی خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی تھی اور حکومت نے معاشی ترقی کیلئے کبھی کوئی جامعہ منصوبہ بندی نہ کی تھی۔ ہندوستان میں قدرتی وسائل کی کمی نہ تھی جن سے حکومت نے بھرپور استفادہ کرنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی انگریزی حکومت اپنی تمام تر توجہ دفاع اور اندرونی امن و امان کی ضروریات پر مرکوز کئے تھی۔ اس لئے انگریزی دور میں جتنی بندرگاہیں تعمیر ہوئیں ان کی غرض و غایت دفاعی ہوا کرتی تھی۔ بہر حال انگریزی دور حکومت میں جو بھی تھوڑی بہت معاشی شعبہ میں ترقی ہوئی وہ ان علاقوں میں ہوئی جو آزادی کے بعد ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ آزادی سے قبل ہندوستان میں کپڑا بنانے کے کل 394 کارخانے تھے۔ جن میں سے 380 کارخانے ہندوستان میں رہ گئے اور صرف 14 کارخانے پاکستان کے حصے میں آئے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی سے قبل معاشی ترقی صرف ان علاقوں تک محدود رہی جو اب ہندوستان میں شامل ہیں اور پاکستان کے حصے میں وہ علاقے آئے جہاں ترقی کا کوئی کام نہ ہوا تھا۔

حکومت کی اس پالیسی کی وجہ سے ملک کے بیشتر حصوں میں صنعتی ترقی نہ ہوئی اور وہ تمام علاقے جہاں پر صنعتیں نہ ہونے کے برابر تھیں پاکستان میں شامل کیے گئے۔ پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کی زیادہ تعداد ہندوستان کے کارخانوں کے لئے خام مال مہیا کرتی تھی کیونکہ ان علاقوں میں کوئی کارخانہ نہ تھا۔ حتیٰ کہ آزادی کے بعد کئی سال تک پاکستان کو اپنی کپاس احمد آباد اور بمبئی بھیجنی پڑتی تھی جہاں سے کپڑا بن کر پاکستان آتا تھا۔

پاکستان کی جغرافیائی حالت بھی پاکستان کے لئے معاشی مسائل کا باعث بنی۔ پاکستان دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ جن کے درمیان غیر ملکی علاقہ تھا۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھے جن کے درمیان کوئی جغرافیائی رابطہ موجود نہ تھا۔

آزادی سے قبل چونکہ تجارت وصنعت پر ہندو اور انگریز کا قبضہ تھا اس لئے تمام سرمایہ انہیں دو قوموں کے قبضے میں تھا۔ تمام بینک اور مالی ادارے ان علاقوں میں قائم تھے جہاں کارخانے اور صنعتیں قائم تھیں اور جو ہندوستان میں واقع تھے۔ اس کے علاوہ فنی ماہر اور کاریگر تمام ہندو تھے جو کارخانوں اور صنعتوں کو چلاتے تھے۔ کانگریس اپنی طاقت کے زعم میں ان حقائق اور اعداد و شمار کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھتی تھی کہ پاکستان کی اقتصادی حالت کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ سردار پٹیل کہتا تھا ''ہندوستان معاشی طور پر اس قدر مضبوط ہوگا کہ باقی ماندہ حصے بھی اس سے آملیں گے'' (Pyrelal Mathama Ghandhi, The Last Phase pp-3)

کلکتہ ہندوستان کو دیئے جانے سے پاکستان کو بہت نقصان ہوا۔ مشرقی پاکستان کی سب سے قیمتی فصل پٹ سن ہے۔ لیکن پٹ سن کی مصنوعات بنانے کے تمام کارخانے کلکتہ میں تھے۔ مشرقی پاکستان کی واحد بندگاہ چٹاگانگ اس قابل نہ تھی کہ وہاں سے پٹ سن باہر کے ملکوں کو بھیجی جاسکتی اس لئے پاکستان کو مجبوراً اپنی پٹ سن کلکتہ کے راستے باہر بھیجنا پڑتی تھی یا اونے پونے داموں ہندوستان کو بیچنا پڑتی تھی۔ مشرقی بنگال کے تمام صنعتی ادارے، بینک بیمہ کمپنیاں، بجلی گھر یہ سب کلکتہ میں واقع تھے۔

آزادی کے بعد پاکستان کو مواصلاتی مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑا جس کا برا اثر معاشی ترقی پر پڑا۔ ذرائع رسل و رسائل کی حالت مخدوش تھی۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان کا ریلوے نظام اور دریائی مواصلات ناگفتہ بہ حالت میں تھے۔ مشرقی پاکستان میں سڑکوں کی حالت بھی اچھی نہ تھی اور ان کی تعمیر اور مرمت کا کام بہت مشکل تھا۔ مغربی پاکستان میں مواصلاتی نظام نسبتاً بہتر تھا۔ سڑکوں اور ریلوے کی حالت بہتر تھی۔ پاکستان کے دونوں صوبوں میں بجلی اور قوت کے وسائل بھی نہ ہونے کے برابر تھے اور ملکی ضروریات کیلئے بالکل ناکافی تھے۔

ان نامساعد حالات کے باوجود حکومت پاکستان نے اقتصادی مسائل پر قابو پانے کا تہیہ کیا ہوا تھا اور ان مشکل حالات کے باوجود تعمیر و ترقی کا کام شروع کیا۔ 1948ء میں صنعتی ترقیاتی بورڈ قائم کیا گیا جس کا کام صنعتی ترقی کیلئے منصوبہ بندی کرنا اور حکومت کو مشورہ دینا تھا۔ یکم جولائی 1948ء کو تین کروڑ روپے کے سرمایہ سے سٹیٹ بینک قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا افتتاح قائداعظم نے خود اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ پاکستان فنڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جب قائداعظم کو یہ محسوس ہوا کہ بھارتی حکومت پاکستان کے حصے کا سرمایہ روک کر ملک کے لئے معاشی مسائل پیدا کرنا چاہتی ہے تو آپ نے پاکستان فنڈ قائم کرنے کا اعلان کیا جس میں متمول تاجروں نے عطیات دیئے جس کی وجہ سے حکومت پاکستان متوقع معاشی مسائل کا سامنا کر سکی۔

اپریل 1948ء میں ملکی صنعت کی ترقی کی پالیسی وضع کی گئی اور ملکی خام مال سے موضوعات تیار کرنے پر زور دیا گیا۔ اسلحہ، گولہ بارود، بجلی، ٹیلی فون، تار اور وائرلیس کا سامان تیار کرنے والی صنعتیں حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیں۔ مزدوروں کے اوقات کار اور معاوضہ کے اصول بنائے گئے۔ لوہا، فولاد، بھاری مشینری، سیمنٹ، معدنیات، معدنی تیل، چینی اور تمباکو کی صنعتوں کی منصوبہ بندی حکومت نے اپنے ذمہ لے لی۔ صنعتی ترقی کیلئے حکومت نے ٹیکسوں اور محصولات میں رعایت دی اور آسان شرطوں پر قرضے دینے کا اعلان کیا۔

حکومت نے زرعی شعبہ میں ترقی کیلئے بھی کئی اقدامات کئے۔ پاکستان میں چونکہ صنعتیں زرعی شعبے سے منسلک ہیں اور کئی صنعتوں کے لئے خام مال زراعتی شعبے میں مہیا کیا جاتا ہے۔ اس لئے زراعت کی ترقی بھی ضروری تھی۔ زراعت کی ترقی کیلئے قرضے اور دوسری سہولتیں دینے کا اعلان کیا گیا۔ سیم اور تھور کے سدباب کے لئے اقدامات کئے گئے۔ زرعی ترقیاتی کارپوریشن قائم کی گئی۔

1948-49ء میں حکومت نے اپنا پہلا بجٹ پیش کیا۔ یہ ایک انتہائی متوازن بجٹ تھا۔ کئی ٹیکسوں میں چھوٹ دی گئی۔ بجٹ نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان کے پاس تعمیر و ترقی، انتظامی اور دفاعی وسائل موجود ہیں اور پاکستان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔

دسمبر 1949ء میں ملک کو زبردست معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑا جب برطانیہ نے پونڈ کی قیمت میں کمی کر دی تھی ہندوستان اور پاکستان چونکہ دونوں پونڈ سے وابستہ تھے لہٰذا ہندوستان نے فوراً اپنے روپے میں کمی کر دی۔ لیکن پاکستان نے اپنے روپے میں کمی کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں ہندوستان نے پاکستان سے پٹ سن خریدنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک حکومت پاکستان اپنے روپے میں کمی نہ کرے گی۔ ہندوستان پٹ سن نہ خریدے گا۔ ہندوستان پٹ سن کی بہت بڑی منڈی تھا۔ اس صورتحال سے پاکستان کی پٹ سن کی بربادی کے امکانات پیدا ہوئے لیکن حکومت کے بروقت اقدامات سے پٹ سن کی صنعت تباہی سے بچ گئی۔ 1951ء میں بالآخر ہندوستان کو جھکنا پڑا اور پاکستانی روپیہ کی شرح منظور کرتے ہوئے دوبارہ پٹ سن خریدنے پر آمادہ ہوا۔

فوجی اثاثوں کی تقسیم کا مسئلہ

برطانوی دور میں ہندوستان کی فوج اپنی عسکری تربیت اور پیشہ وارانہ مہارت کی وجہ سے دنیا کی بہترین افواج میں شمار ہوتی تھی۔ تقسیم ہند کے وقت برطانوی حکومت یہ چاہتی تھی کہ فوج کو تقسیم نہ کیا جائے اور کوئی ایسا نظام تخلیق کیا جائے جس سے دونوں ملکوں کی افواج اور دفاع کو مشترک رکھا جا سکے۔ لیکن مسلم لیگ کانگریس کے معاندانہ رویہ کو دیکھتے ہوئے فوج کی تقسیم پر مصر تھی اور اس کے علاوہ فوج کے بغیر آزادی کا تصور بالکل بے معنی تھا۔ لہٰذا مسلم لیگ نے یہ مطالبہ کیا کہ فوج اور فوجی اثاثوں کو تقسیم کر دیا جائے۔ جولائی 1947ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ تقسیم کے ساتھ ہی فوج اور فوجی اثاثوں کو بھی تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس مقصد کیلئے فیلڈ مارشل آکن لیک کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی میں تینوں افواج کے سربراہ، مسلمان اور ہندو افسر ایک ہندوستانی نمائندہ اور ایک پاکستانی شامل تھے۔ ہندوستان کی طرف سے جی ایس بھالجا شریک ہوئے اور پاکستان کی نمائندگی چودھری محمد علی نے کی۔ اس کمیٹی کے علاوہ مونٹ بیٹن کی سرکردگی میں ایک مشترکہ دفاعی کونسل بنائی گئی۔ اس کونسل میں ہندوستان کے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ اور پاکستان کی طرف سے لیاقت علی خاں شامل ہوئے۔ یہ دفاعی کونسل تقسیم افواج کے سلسلے میں حتمی اختیارات رکھتی تھی اور فیلڈ مارشل آکن لیک کو دفاع کونسل کے فیصلوں کا پابند کیا گیا تھا۔

پاکستان اور بھارت میں بالترتیب 36% اور 64% سے حساب سے فوجی اثاثوں کو تقسیم کیا جانا تھا اور یہ کام یکم اپریل 1948ء تک مکمل ہونا تھا۔ جو ایک نہایت مشکل بات تھی۔ اس ضمن میں پروگرام طے کیا گیا اور یہ طے پایا کہ 15 اگست 1947ء تک دونوں ملکوں کی فوجیں اپنے اپنے ملک میں پہنچ جائیں۔ یہ بھی طے ہے کہ مسلمان فوجی دستے پاکستان کو اور غیر مسلم اکثریتی دستے ہندوستان کو منتقل کئے جائیں گے۔ اس کیلئے بنیادی اصول یہ وضع کیا گیا کہ پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں کے غیر مسلم فوجی پاکستانی فوج میں شامل نہیں ہو سکتے اور اسی طرح ہندوستان میں شامل ہونے والے علاقوں کے مسلمان فوجی ہندوستان کی فوج میں شامل نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی طے پایا کہ تقسیم سے پہلے فوجی جوانوں اور افسروں کو یہ پوچھا جائے گا کہ وہ کس ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور انہیں ان کی خواہش کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک ملک میں جانے کی اجازت ہوگی۔

جہاں تک فوجی جوانوں اور افسروں کی تقسیم کا تعلق تھا یہ کام تو خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ لیکن جب فوجی اثاثوں کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو ہندوستان نے لیت ولعل سے کام لینا شروع کیا اور فوجی اثاثوں کی پاکستان منتقلی میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ فیلڈ مارشل آکن لیک ایک دیانت دار فوجی ہونے کی وجہ سے اپنا کام مخلصانہ طور پر کرنا چاہتے تھے اور پاکستان کے حصے کے فوجی اثاثے پاکستان کو منتقل کرنا چاہتے تھے۔ فیلڈ مارشل آکن لیک کی کوششوں سے شروع میں تھوڑے بہت فوجی اثاثے پاکستان منتقل ہوئے لیکن اس کے بعد کانگریس اور ہندوستانی حکومت نے فیلڈ مارشل آکن لیک پر پاکستان کی بے جا حمایت کا الزام لگانا شروع کیا۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے ہندوستانی حکومت کی یہ ہرممکن کوشش تھی کہ پاکستان ہر لحاظ سے کمزور رہ جائے گا۔ اس مقصد کے لئے مونٹ بیٹن نے اپنا گھناؤنا کردار ادا کیا اور فیلڈ مارشل آکن لیک ان ہتھکنڈوں سے تنگ آ گیا۔ بدقسمتی سے تمام اسلحہ ساز فیکٹریاں ہندوستانی علاقے میں رہ گئیں تھیں اس لئے بھی ہندوستانی حکومت کا رویہ فوجی اثاثوں کی تقسیم کے بارے میں سخت تھا۔ فیلڈ مارشل آکن لیک بالآخر ہندوستانی حکومت کے الزامات اور رکاوٹوں سے تنگ آ کر اپنا کام ختم کیے بغیر انگلستان چلے گئے وہاں جا کر انہوں نے حکومت کو اپنے کام کے بارے میں رپورٹ پیش کی اور لکھا:

"ہندوستان کی موجودہ حکومت تہیہ کر چکی ہے کہ جہاں تک اس کا بس چلے گا وہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے سے روکنے کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھے گی بھارت کے لیڈروں، وزیروں اور سول افسروں نے افواج کی تقسیم کے کام میں روڑے اٹکانے کی مسلسل کوشش کی ہے" (عبدالقادر خاں "مطالعہ پاکستان" صفحہ 61-160)

آکن لیک کے جانے کے بعد ہندوستان نے فوجی اثاثوں کی تقسیم میں من مانی کی کارروائی کی۔ پاکستان کو بالکل ناکارہ اور تباہ شدہ ہتھیار دیئے گئے۔ بحری اور ہوائی جہازوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی اور اس طرح پاکستان اس ضمن میں بھی ہندوستان کی ازلی پاکستان دشمنی کا شکار ہوا۔

بھارت کا پاکستان کے حصے کا نقد روپیہ دینے سے انکار

آزادی کے بعد پاکستان کو اپنی معیشت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے نقد روپے کی فوری ضرورت تھی۔ لیکن بھارت نے پاکستان کو چونکہ معاشی طور پر تباہ کرنے کا ارادہ کیا ہوا تھا لہٰذا ہندوستان پاکستان کے حصے کا روپیہ دینے سے انکار کرتا رہا۔ آزادی سے پہلے ہندوستان کا کل سرمایہ ریزرو بینک میں پڑا ہوا تھا جسے تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں تقسیم ہونا تھا۔

روپیہ کی تقسیم کے سلسلے میں دسمبر 1947ء کو دونوں حکومتوں کے درمیان سمجھوتہ ہوا اور یہ طے پایا کہ پاکستان کو 750 ملین روپے ادا ہوں گے۔ اس روپیہ میں دو ملین کی پہلی قسط تو پاکستان کو ادا ہو گئی لیکن باقی روپیہ ہندوستان نے روک لیا۔ سردار پٹیل نے یہ کہہ کر ادائیگی روک لی کہ پاکستان اس روپیہ سے بھارت کے خلاف کشمیر میں جنگی کارروائی کرے گا اور دھمکی دی کہ اگر پاکستان نے کشمیر میں جھگڑا کیا تو باقی روپیہ کی ادائیگی روک لی جائے گی۔

اس موقع پر گاندھی نے مرن برت کی دھمکی دی اور حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ وہ پاکستان کے حصے کا بقیہ روپیہ فوراً ادا کرے۔ گاندھی کی اس دھمکی کے پیچھے بد نیتی شامل تھی دراصل گاندھی کو یہ خیال تھا کہ پاکستان اپنے حصے کا روپیہ نہ ملنے پر بین الاقوامی سطح پر احتجاج کرے گا جس سے ممکن تھا کہ بین الاقوامی برادری میں ہندوستان کی ساکھ پر حرف آتا اور پاکستان معاشی اور سیاسی فائدے حاصل کر لیتا۔ گاندھی نے دراصل ہندوستان کی حکومت پر زور اسی لئے دیا تھا کہ پاکستان دوسرے ممالک سے کسی قسم کی معاشی امداد حاصل نہ کر سکے۔ گاندھی کے اصرار پر بھارتی حکومت پاکستان کو اس کا بقیہ روپیہ دینے پر رضا مند ہوئی لیکن بقیہ 55 کروڑ روپیہ تا حال ادا نہیں ہو سکا۔

لسانی فسادات اور سیاسی مسائل

تقسیم ہند سے پہلے برصغیر کے مسلمانوں کی زبان اردو تھی اور ان کی خواہشوں اور تمناؤں کا مظہر تھی۔ تحریک آزادی میں مطالبہ پاکستان کے سلسلے میں اردو نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کی حیثیت اور کردار کو دیکھتے ہوئے برصغیر کے مسلمانوں کو یہ پکا یقین تھا کہ آزادی کے بعد اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہو گی۔

اردو کو تقسیم ہند سے پہلے مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہ کسی ایک علاقے یا خطے کی زبان نہ سمجھی جاتی تھی بلکہ برصغیر کے تمام مسلمانوں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ برصغیر کے مسلمان اظہار خیال کے لئے اردو ہی کا سہارا لیتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد قائد اعظم بار ہا یہ اعلان کر چکے تھے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہو گی آپ نے اپنے اعلان میں کہا کہ صوبائی سطح پر صوبائی نمائندے کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے لئے جس زبان کو چاہیں اپنالیں لیکن قومی سطح پر تمام قوم کے آپس میں باہمی میل جول کیلئے اردو ہی پاکستان کی زبان ہو گی۔ مشرقی پاکستان میں چونکہ علیحدگی پسند شروع دن ہی سے سرگرم عمل رہے ہیں اس لئے آپ کے اس فیصلے پر تنقید ہوئی لیکن آپ کے دبدبے کی وجہ سے کسی کو برملا مخالفت کی ہمت نہ ہوئی۔

مشرقی پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنائے جانے پر لسانی فسادات پھوٹ پڑے۔ یہ فسادات دراصل چند سیاست دانوں کی ناعاقبت اندیش پالیسی کیوجہ سے شروع ہوئے۔ رفتہ رفتہ طالب علم ان فسادات میں ملوث ہو گئے اور چند طالب علم پولیس کی فائرنگ سے ہلاک ہو گئے۔

اردو کے بارے میں یہ فسادات بالکل بے معنی تھے اور دراصل خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کیلئے پیدا کئے گئے تھے۔ ایک قوم ہونے کی حیثیت سے آخر پاکستان کی ایک زبان ہونا چاہیے تھی جس کی مرکزی حیثیت مسلمہ رہ چکی ہو۔ وہ زبان اردو ہی ہو سکتی تھی جو کہ تقسیم سے پہلے برصغیر کے تمام مسلمانوں کی زبان تھی۔ بنگالی یا کوئی اور زبان صوبائی حیثیت کی حامل تھیں۔ اس لئے کسی شکل میں بھی یہ زبانیں قومی زبان کا مقام حاصل نہ کر سکتیں تھیں۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے لئے بے شمار سیاسی مسائل پیدا ہوئے ان سیاسی مسائل میں سے پاکستان کو جس مسئلے نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا وہ صوبہ پرستی کا مسئلہ تھا جس نے پاکستان بنتے ہی سر اٹھایا۔ لسانی فسادات بھی دراصل صوبہ پرستی کے خطرناک رجحان کی وجہ سے پھوٹ پڑے جس کے پیچھے بنگالی عصبیت کا خوفناک بھوت ناچ رہا تھا۔

مشرقی پاکستان جغرافیائی لحاظ سے برصغیر کے پرلے سرے پر واقع ہے اس لئے ذہنی طور پر یہ ہمیشہ باقی برصغیر سے الگ تھلگ رہا ہے اور دوسرے علاقوں کے معاشرتی تمدن کا اس علاقہ میں گزر نہیں ہو سکا۔ اسی لئے مشرقی پاکستان میں آنے والے ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد چونکہ دارالحکومت مغربی پاکستان میں واقع تھا اس لئے مشرقی پاکستان والوں کے اندر احساس محرومی نے جنم لیا اور وہ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے اس لئے مرکزی حکومت کے مختلف شعبوں میں بھی مغربی پاکستان کے لوگوں کی اکثریت رہی ہے جس نے مشرقی پاکستان کے عوام کے اس احساس کو اور تقویت دی کہ مغربی پاکستان والے ان کے حقوق کے غاصب ہیں۔ صوبہ پرستی کے اس خطرناک رجحان کو محسوس کرتے ہوئے قائد اعظم نے اس کا تدارک کرنے کیلئے اپنی علالت کے باوجود مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ آپ نے ڈھاکہ میں 21 مارچ 1948ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں واضح ترین الفاظ میں آپ کو ان خطرات سے بار بار خبردار کر دینا چاہتا ہوں جو ابھی پاکستان کو اور بالخصوص آپ کے صوبے کو درپیش ہیں قیام پاکستان کو روکنے میں ناکام ہونے کے بعد اپنی ناکامی سے سٹ پٹا کر پاکستان کے دشمن اب پاکستان کے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ بازی سے مملکت کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کوششوں نے خاص طور پر

صوبہ پرستی کی حوصلہ افزائی کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ جب تک آپ اپنی مملکت کو اس زہر سے صاف نہیں کریں گے اس وقت تک آپ کبھی اپنے آپ کو ایک حقیقی قوم کے سانچے میں ڈھالنے اور اسے مستحکم کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ اسلام نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ آپ خواہ کچھ بھی ہوں آپ بہر حال مسلمان ہیں اب آپ سب ایک قوم ہیں آپ نے ایک وسیع علاقہ حاصل کر لیا ہے۔ یہ آپ کا ہے اس کا مالک کوئی پنجابی یا کوئی سندھی یا بنگالی نہیں ہے۔ یہ سب آپ کا ہے آپ کی مرکزی حکومت قائم ہوگئی ہے جہاں مختلف حصوں کو نمائندگی حاصل ہے اس لئے اگر آپ اپنے آپ کو بحیثیت قوم تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو برائے خدا اس صوبہ پرستی کو چھوڑ دیجئے۔"
(Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah Speeches as Governor General p-84)

مشرقی پاکستان کے علاقہ میں پائے جانے والے صوبہ پرستی کے ان رجحانات کا نتیجہ لسانی فسادات تھے جو آگے چل کر 1971ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط اور بنگلہ دیش کے قیام کی شکل میں منتج ہوا ہے۔

تحریک ختم نبوت

پاکستان کی بنیاد نظریہ اسلامی تھا جس کا مقصد برصغیر کے لئے علیحدہ وطن حاصل کر کے وہاں پر اسلامی اصولوں کا اجراء اور پابندی تھا۔ لہٰذا پاکستان کے عوام کسی ایسے عقیدے اور اصول کو پاکستان میں دیکھنے کیلئے تیار نہ تھے جس میں اسلامی اصولوں سے انحراف ہو۔

مسلمانوں کے تمام فرقوں میں اتفاق پایا جاتا ہے کہ قادیانی دائرہ اسلام سے خارج ہیں کیونکہ اسلام کے بنیادی رکن ختم نبوت پر ان کا ایمان نہیں ہے۔ پاکستان میں وقتاً فوقتاً یہ مطالبہ کیا جاتا رہا کہ قادیانیوں کو آئین میں اقلیت قرار دیا جائے۔

قادیانی جماعت کا مرکز قادیان ضلع گورداسپور میں تھا۔ تقسیم کے بعد یہ مرکز پاکستان منتقل ہوا۔ جہاں آج کل یہ سرگودھا کے قریب ربوہ میں واقع ہے۔ قادیانی رسول اللہ ﷺ کو نبی تو مانتے ہیں لیکن انہیں آخری نبی نہیں مانتے۔ سر ظفر اللہ خان اس جماعت کے سرکردہ قائدین میں سے ہیں۔ آپ پاکستان کے وزیر خارجہ رہ چکے ہیں اور اس کے بعد بین الاقوامی عدالت انصاف میں جج کے فرائض ادا کر چکے ہیں۔

1952ء میں تحریک ختم نبوت کا اجراءہوا جس کا بنیادی مقصد ختم نبوت کی وضاحت کرنا اور قادیانی تنظیم کا محاسبہ کرنا تھا اسی دوران سر ظفر اللہ خان کی ایک تقریر سے حالات زیادہ خراب ہوئے۔ عوام نے ظفر اللہ خان کی وزارت سے برطرفی کا مطالبہ کیا۔ 1954ء میں ایک دفعہ قادیانیوں نے سر ابھارا جس پر پنجاب میں احتجاج ہوا۔ امن قائم کرنے کیلئے ملک میں پہلا مارشل لاء لگا جو لاہور میں لگایا گیا۔ جس کے ایڈمنسٹریٹر جنرل اعظم خان مقرر ہوئے۔

تحریک ختم نبوت کے قائدین مولانا مودودی اور مولانا عبدالستار نیازی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور فوجی عدالت سے سزائے موت کا حکم ہوا۔ یہ حکم عوامی مطالبے کے پیش نظر منسوخ کرنا پڑا۔ قادیانیوں کی تحریک وقتاً فوقتاً جاری رہی جب کہ 1974ء میں ایک دفعہ پھر قادیانیوں کے مسئلے نے ملک کی پر امن فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ملک میں جانی اور مالی نقصان ہوا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ اس وقت کی حکومت کو عوامی مطالبے کے آگے جھکنا پڑا اور 1973ء کے آئین میں ترمیم کر کے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر اقلیت قرار دیدیا گیا۔

پاکستان معرض وجود میں آتے ہی بے پناہ مشکلات اور مسائل سے دوچار ہوا جن کا جائزہ گزشتہ صفحات میں لیا جا چکا ہے۔ پاکستان کے عوام نے قائد اعظم کی ولولہ انگیز اور لازوال قیادت میں ان مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور قائد اعظم کی قیادت میں ہر امتحان سے سرخرو ہو کر نکلے۔ وہ ملک جس کا قائم رہنا مشکل نظر آتا تھا اپنے محبوب قائد کی انتھک کوششوں سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔

قائد اعظم نے ملک کی بہترین کیلئے ان تھک محنت کی اور مایوس اور غیر منظم قوم کو جینے اور ترقی کی راہ دکھائی۔ آپ نے اپنی صحت کی پرواہ کئے بغیر فوراً قوم کی آواز پر لبیک کہا اور ہر مشکل اور کڑے وقت میں قوم کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ بے مثال لگن اور محنت نے آپ کی صحت پر جو پہلے ہی خراب تھی بہت برا اثر ڈالا اور آپ بالآخر 11 ستمبر 1948ء کو قوم کی خدمت کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

قائد اعظم کی وفات قوم اور پاکستان جیسے نوزائیدہ ملک کے لئے عظیم سانحہ تھی۔ جسے یہ قوم ابھی برداشت کرنے کے قابل نہ ہوئی تھی۔ ابھی قائد اعظم کی ملک اور قوم کو اشد ضرورت تھی لیکن قدرت کے حکم کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ قوم اس عظیم سانحہ کو برداشت کر گئی۔ اس موقع پر قوم کی رہبری کیلئے لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین اور چوہدری محمد علی جیسے کارکن آگے آئے اور انہوں نے ملک کو اس مشکل وقت میں سنبھالا اور پاکستان کو مضبوط اور مستحکم کرنے کیلئے قائد اعظم کے چھوڑے ہوئے اصولوں کی روشنی میں دن رات کام کیا۔

باب نمبر 5

پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کی کوشش

پاکستان رمضان المبارک کی ستائیسویں تاریخ کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا۔ یعنی کہ اس دن جب قرآن پاک انسان کی فلاح و بہبود اور بہتری کا پیغام لے کر نازل ہوا۔ پاکستان اس دن معرض وجود میں آیا جس دن رب کریم اپنی مخلوق پر رحمتوں کی بارشیں کرتے ہیں اور گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

پاکستان اور اسلام ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں کیونکہ مطالبہ پاکستان کا اصل محرک ہی اسلامی ضابطہ حیات کا احیاء تھا جو کہ متحدہ ہندوستان میں کسی صورت بھی ممکن نہ تھا۔ قائداعظم کی قیادت میں پاکستان کا مطالبہ کرتے وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بخوبی علم تھا کہ اس منزل کو پانے کیلئے عظیم قربانیاں دینا پڑیں گی اور نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا ہوگا۔ یہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی انہوں نے پاکستان کے لئے قائداعظم کے جھنڈے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ آخر کس لئے صرف اس لئے کہ وہ نئے ملک پاکستان میں اپنی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کیلئے تیار تھے۔

پاکستان میں نظام حیات کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمیوں کو دور کرنے کیلئے قائداعظم نے بار بار یہ فرمایا کہ پاکستان میں شریعت کا نظام رائج کیا جائے گا اور پاکستان میں بننے والے تمام قوانین اسلامی اصولوں کے مطابق بنائے جائیں گے۔ آپ نے دسمبر 1943ء میں فرمایا:

''آخر وہ کیا چیز تھی جس نے مسلمانوں کو تن واحد کی طرح متحد کر دیا۔ یہ وہ لنگر تھا جس نے اس سفینے کو غرق ہونے سے بچا لیا اور وہ تھا اسلام اور اس کی عظیم الشان کتاب قرآن حکیم۔''

ایک اور موقعہ پر 6 ستمبر 1945ء کو آپ نے کہا کہ

''ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن حکیم مسلمانوں کا مکمل ضابطہ حیات ہے مسلمانوں کے تمام مذہبی اور دوسرے مسائل کا حل اس آئین میں موجود ہے''۔

پاکستان کی بنیاد کے ضمن میں قائداعظم نے فرمایا کہ:

''پاکستان اسلام کا ایک مضبوط قلعہ ہوگا اور اس ملک میں صرف وہی قوانین نافذ العمل ہوں گے جن کی بنیاد اسلام کے سنہری اصولوں پر استوار ہوگی''۔

16 فروری 1947ء کو قائداعظم نے فرمایا کہ:

''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوہ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنیوالے پیغمبر اسلام نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی اصولوں اور تصورات پر رکھیں''۔

قیام پاکستان کے بعد 13 جنوری 1948ء کو قائداعظم نے فرمایا کہ

''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک قطعہ زمین حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسا ملک چاہتے تھے جہاں پر ہم اپنی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال سکیں''۔

قائد اعظم کے ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ قائد اعظم پاکستان میں کس قسم کا نظام چاہتے تھے۔ بلاشبہ قائد اعظم پاکستان میں جو نظام لانا چاہتے تھے اس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر استوار کی جاتی اور جو بھی آئین بنتا وہ ان ہی اصولوں کی روشنی میں تیار کیا جاتا لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور قائد اعظم اپنی نگرانی میں ملک کے لئے دستور تیار نہ کر سکے اور اپنے مقصد کو پورا کرنے سے پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔

قیام پاکستان کے بعد ملکی ضروریات کے پیش نظر 1935ء کے قانون کو چند ضروری ترامیم کے بعد پاکستان میں آئین کے طور پر نافذ کر دیا گیا تھا۔ یہ انتظام صرف اس وقت تک رہنا تھا جب تک پاکستان کی دستور ساز اسمبلی ملک کے لئے نیا آئین نہیں بنا لیتی۔ آئین بنانے کے لئے دستور ساز کمیٹی تشکیل دی گئی۔ لیکن بدقسمتی سے نئی دستوریہ میں کچھ ایسے افراد بھی شامل ہو گئے تھے جو پاکستان کو ایک Secular ریاست بنانا چاہتے تھے۔ ان حضرات کی وجہ سے ملک میں آئین سازی کے کام کو بے پناہ نقصان پہنچا۔ بہر حال ان لوگوں کی کوششیں قائد اعظم کی عظیم قیادت کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکیں۔ ملک کے مستقبل کے آئین کے متعلق قائد اعظم نے 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں ان لوگوں کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں جو جان بوجھ کر اور شرارت سے یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول کا اطلاق آج بھی عملی زندگی پر اسی طرح ہوسکتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوا تھا۔ اسلام سے ہم نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے"۔

قائد اعظم کی وفات کے ساتھ ہی آئین سازی میں مشکلات پیدا ہوتی گئیں اور جو کام ہمیں ایک آزاد قوم ہونے کے ناطے سے آزادی کے فورا بعد کر لینا چاہیے تھا وہ آزادی کے پورے 9 سال بعد یعنی 1956ء کو پایہ تکمیل کو پہنچا جب کہ ملک کا پہلا آئین مکمل ہوا۔ دستور سازی کے ضمن میں جو پہلا قدم اٹھایا گیا وہ قرارداد مقاصد کا منظور کیا جانا تھا جس میں پاکستان کے آئین کے لئے اساسی اصول مرتب کئے گئے تھے۔

قرارداد مقاصد

دستور سازی کے کام کو آگے بڑھانے کیلئے دستور ساز اسمبلی میں لیاقت علی خان کی صدارت میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی قائم کی گئی جس کا مقصد ان بنیادی اصولوں کا تعین کرنا تھا جن کی بنیاد پر پاکستان کا دستور بنایا جانا تھا۔ ایک قرارداد تیار کی گئی جسے لیاقت علی خان نے اسمبلی کے سامنے 12 مارچ 1949ء کو پیش کیا اور جسے دستور اسمبلی نے اتفاق رائے سے پاکستان کے مستقبل کے آئین کی بنیاد کے طور پر منظور کر لیا۔ اس قرارداد کو قرارداد مقاصد کہتے ہیں۔

قرارداد مقاصد پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ میں بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ مستقبل میں جتنے بھی ملک میں آئین مرتب کئے گئے ہیں ان کی بنیاد اسی قرارداد مقاصد کو بنایا گیا اس قرارداد میں وہ تمام اصول شامل کئے گئے تھے جن کا اظہار قائد اعظم نے اپنی بیشتر تقاریر میں کر دیا تھا اور پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الا اللہ کی روشنی میں اس قرارداد کے مقاصد کو متعین کیا گیا تھا۔ قرارداد میں جن بنیادی اصولوں کا ذکر کیا گیا وہ ذیل میں درج ہیں:

1- کل کائنات کا مالک حقیقی اور مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور پاکستان کے عوام کو جو اختیارات تفویض کئے گئے ہیں وہ ان کیلئے مقدس فریضے کی حیثیت رکھتے ہیں۔
2- پاکستان کے آئین کے مطابق عوام کے منتخب نمائندوں کو حکمرانی کا حق حاصل ہوگا۔
3- اقلیتوں کے حقوق کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور انہیں اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔

4- پاکستان کے عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔
5- عدلیہ مکمل طور پر آزاد ہوگی اور اسے انتظامیہ سے علیحدہ رکھا جائے گا۔
6- پاکستان میں وفاقی نظام حکومت قائم کیا جائے گا۔
7- مجلس قانون ساز دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔مجلس کی مدت پانچ سال ہوگی لیکن وزیر اعظم کی ہدایت پر اسے قبل از وقت بھی توڑا جا سکے گا۔
8- ریاست اپنے اختیارات کا استعمال عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے کرے گی۔
9- صوبے کا سربراہ گورنر ہوگا۔ جس کا تقرر صدر کرے گا۔
10- اسلامی اصولوں کی روشنی میں پاکستان میں ''جمہوریت آزادی اور مساوات'' کو قائم کیا جائے گا۔
11- ملک کے سربراہ کا انتخاب وفاقی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں کیا جائے گا اور وہ پانچ سال تک سربراہ مملکت رہ سکتا ہے۔
12- ایک سپریم کورٹ ہوگی جس کے ججوں کا تقرر صدر مملکت کرے گا۔
13- زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل اسلامی تعلیمات کی روشنی اور احکام خداوندی کے مطابق حل کیے جائیں گے۔
14- غیر ترقی یافتہ اور پسماندہ علاقوں کی ترقی کی طرف خصوصی توجہ دی جائے گی۔

مجموعی طور پر قرارداد مقاصد کو پسند کیا گیا لیکن چند حضرات نے اس پر تنقید بھی کی اور قرارداد میں معاشی انصاف اور دولت کی متناسب تقسیم کے بارے میں کوئی وضاحت نہ تھی جس کی بناء پر اس پر تنقید کی گئی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ قرارداد مقاصد ایک اہم دستاویز تھی اس میں ان بنیادی اصولوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن کی بنیاد پر پاکستان کا آئین بنایا جانا تھا۔قرارداد میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا پاکستان میں تمام قوانین اسلام کی روشنی میں بنائے جائیں گے ۔قرارداد میں اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی تھی اور غیر ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی کیلئے ہر ممکن اقدامات کا اعادہ کیا گیا تھا۔

1956ء کا آئین اور اسلامی دفعات

(آئین سازی کی مختصر روئیداد)

قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد بنیادی اصولوں کی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ یہ کمیٹی 12 مارچ 1949ء کو تشکیل دی گئی اور اس کے ذمے ان بنیادی اصولوں کا تعین کرنا تھا جن کی بنیاد پر ملک کا آئین بنایا جانا تھا۔کمیٹی نے لیاقت علی خاں کی صدارت میں غور و خوض شروع کیا اور اپنی رپورٹ 28 ستمبر 1950ء کو اسمبلی کے سامنے پیش کی۔ اس رپورٹ کی تجاویز میں ملک کے لئے دو ایوانی مجلس قانون ساز تجویز کی گئی اور دونوں ایوانوں کیلئے یکساں اختیارات تجویز کیے گئے صدر مملکت کا انتخاب دونوں ایوان کریں گے۔

اس رپورٹ پر شدید نکتہ چینی کی گئی جس پر لیاقت علی خان نے دوسری رپورٹ کی تیاری کے لئے کام شروع کر دیا۔ لیکن اس رپورٹ کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا۔ لیاقت علی خان کے بعد یہ کام خواجہ ناظم الدین کے کاندھوں پر آن پڑا۔ خواجہ صاحب نے دوسری رپورٹ چند ترامیم کے بعد پیش کی لیکن اس پر بھی تنقید ہوئی اور خواجہ صاحب کی جگہ محمد علی بوگرہ کو ملک کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ جنہوں نے ایک مصالحتی منصوبہ پیش کیا جس میں تجویز کیا:

مجلس قانون ساز دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ ایوان بالا میں 50 نشستیں اور ایوان زیریں میں 300 نشستیں ہوں گی۔

1- ان ممبران کا انتخاب عوام براہ راست کریں گے۔
2- دونوں ایوانوں کے اختیارات یکساں ہوں گے۔
3- صدر وزراء کے مشورے سے اسمبلی برخاست کر سکے گا۔
4- ملکی سالمیت اور استحکام پر زور دیا جائے گا اور صوبائی تعصب کا خاتمہ کیا جائے گا۔
5- علماء بورڈ کے اختیارات سپریم کورٹ استعمال کرے گا۔
6-

ان تجاویز کو نومبر 1958ء میں اسمبلی میں غور کیلئے پیش کیا گیا 30 اپریل 1953ء کو اسمبلی نے بنگالی اور اردو کو قومی زبانیں قرار دیا۔

اس کے بعد ملک میں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہی اور گورنر جنرل غلام محمد جمہوریت کی دھجیاں اڑاتا رہا ملک میں نئے انتخابات کرائے گئے جن میں مسلم لیگ کو اکثریت حاصل ہوئی لیکن مسلم لیگ مشرقی پاکستان میں صرف ایک نشست حاصل کر سکی۔ محمد علی بوگرہ کی جگہ چودھری محمد علی پاکستان کے وزیر اعظم بنے چودھری محمد علی نے وزارت عظمیٰ سنبھالتے ہی آئین سازی پر خصوصی توجہ دی اور ان کی کوششوں سے ملک کے پہلے آئین کا مسودہ تیار ہوا۔ 9 جنوری 1956ء کو یہ مسودہ اسمبلی کے سامنے پیش کیا گیا جس نے اس کو 29 جنوری 1956ء کو منظور کر لیا۔ 2 مارچ 1956ء کو گورنر جنرل کی منظوری حاصل کی گئی اور 23 مارچ 1956ء کو ملک کا پہلا آئین نافذ ہوا۔

1956ء کے آئین کی اسلامی دفعات

1956ء کے آئین کی اسلامی دفعات مندرجہ ذیل تھیں:

1- پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ رکھا گیا۔
2- آئین کے افتتاحی کلمات میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو بیان کیا گیا۔
3- آئین کے مطابق سربراہ ریاست کیلئے مسلمان ہونا ضروری قرار دیا گیا۔
4- اسلامی مشاورتی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا جو عوام کو اسلامی طرز زندگی اپنانے کیلئے راہنمائی کرے گی۔
5- اسلام کی روح کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔
6- ملک کا سربراہ ایک کمیشن مقرر کرے گا جو موجودہ قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق ہم آہنگ کرنے کیلئے سفارشات کرے گا۔
7- مسلمانوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے سہولتیں میسر کی جائیں گی۔

اس آئین کی بعض دفعات پر نکتہ چینی کی گئی اور یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمان ہونے کی شرط صرف صدر کیلئے رکھی گئی ہے۔ یہ شرط باقی عہدے داروں کیلئے بھی ہونا چاہیے تھی یہ آئین 23 مارچ 1956ء سے لے کر 8 اکتوبر 1958ء تک نافذ العمل رہا۔ یہ آئین ملک میں سیاسی استحکام قائم کرنے میں ناکام رہا اور ملک سیاسی طور پر دیوالیہ ہو گیا۔ 8 اکتوبر 1958ء کو آئین کو منسوخ کر دیا گیا اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔

1962ء کے آئین کی اسلامی دفعات

1956ء کے آئین کو 8 اکتوبر 1958ء کو منسوخ کر دیا گیا اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ گورنر جنرل سکندر مرزا کو معزول کرنے کے بعد ایوب خان نے ملک کی عنان حکومت خود سنبھال لی۔ ملک کا اقتدار سنبھالتے وقت ایوب خان نے ان حالات کا ذکر کیا جو مارشل لاء لگانے کا باعث بنے اور ساتھ ہی قوم سے یہ وعدہ بھی کیا کہ جلد ہی جمہوریت کو بحال کر دیا جائے گا۔

ملک کے لئے آئین بنانے کیلئے ایوب خان نے 1960ء میں جسٹس شہاب الدین کی صدارت میں ایک آئینی کمیشن مقرر کیا جس کے ذمے ملک کے آئین کا مسودہ تیار کرنے کا کام تھا۔ کمیشن نے آئین بنانے کیلئے رپورٹ تیار کی جسے صدر ایوب کی منظوری کیلئے پیش کیا گیا۔ صدر ایوب نے اپنی حکومت کو دوام بخشنے کیلئے اس رپورٹ میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کیں اور ایک آئین بنا دیا گیا جسے 1962ء میں نافذ کر دیا گیا۔

یہ آئین عوام کے نمائندوں کا بنایا ہوا نہ تھا بلکہ یہ شخصی دستور تھا جسے فرد واحد نے اپنی سہولت کے مطابق بنایا تھا اس لئے یہ آئین بھی عوام کی خواہشات اور ضروریات کی عکاسی نہ کرتا تھا بلکہ یہ ایک شخص کے اقتدار کو تقویت دیتا تھا۔ اس کے باوجود بھی اس آئین میں اسلامی روح کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تھی جس کا مظاہرہ قرار داد مقاصد اور آئین 1956ء میں کیا گیا تھا۔ ایوب خان پاکستان کے عوام کے اسلامی جذبے سے واقف تھا اس لئے اس نے اس آئین میں اسلامی دفعات کو شامل کیا۔ 1962ء کے آئین کی اسلامی دفعات مندرجہ ذیل ہیں:

1- ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔ جب آئین نافذ ہوا تو اس میں اسلامی کا لفظ موجود نہ تھا۔ لیکن عوامی ردعمل کو دیکھتے ہوئے اسلامی کا لفظ شامل کر دیا گیا اور اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کا پورا نام آئین میں لکھا گیا۔
2- آئین کی رو سے یہ طے پایا کہ ایک اسلامی مشاورتی کونسل کی تشکیل کی جائے گی جو علماء کرام پر مشتمل ہوگی یہ کونسل ملکی قوانین کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کے لئے صدر کو مشورے دے گی۔
3- ملک کا صدر مسلمان ہوگا۔
4- آئین کے ابتدائیہ میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر یقین کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ عوام کے پاس جو اختیارات ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کی مقدس امانت متصور ہوں گے۔
5- آئین میں طے پایا کہ ایک اسلامی تحقیقاتی ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے گا جو جدید حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی معاملات کے بارے میں رائے دے گا۔
6- آئین میں پاکستان میں رہنے والی تمام اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک کا اعادہ کیا گیا۔

یہ آئین 1962ء سے لے کر 25 مارچ 1969ء تک ملک میں نافذ رہا جب کہ جنرل یحییٰ خان نے ملک میں دوسرا آئین نافذ کر دیا۔ 1962ء آئین بھی مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ چونکہ آئین میں دی گئی اسلامی دفعات ناکافی تھیں اس لئے ملک میں حقیقی معنوں میں اسلامی نظام رائج نہ ہو سکا۔ 1969ء سے 1971ء تک ملک میں مارشل لاء نافذ رہا۔ اسی دوران مشرقی پاکستان میں بھارت کے ایماء پر علیحدگی کی تحریک اٹھی جس کا بہانہ بنا کر دسمبر 1971ء میں ہندوستان نے پاکستان پر فوج کشی کی جس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوا اور مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش کی شکل میں نمودار ہوا۔ پاکستان میں جنرل یحییٰ خان کی حکومت ختم ہوئی اور ذوالفقار علی بھٹو جو 1970ء کے عام انتخابات میں مغربی پاکستان میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے برسر اقتدار آ گئے۔ مسٹر بھٹو نے حکومت سنبھالتے ہی آئین سازی کی طرف توجہ دی۔

14 اگست 1972ء کو اسمبلی کا اجلاس ہوا جس میں ملک کے مستقبل کے آئین کے لئے غور کیا گیا۔ آئین کی تیاری اور منظوری تک ملک میں مارشل لاء برقرار رکھا گیا اور مسٹر بھٹو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ اسمبلی میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس کی رو سے ایک آئینی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا سربراہ محمود علی قصوری کو بنایا گیا۔ محمود علی قصوری نے آئین سازی کا کام شروع کیا لیکن جلد ہی مسٹر بھٹو سے اختلافات کی بناء پر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔

محمود علی قصوری کے مستعفی ہونے کے بعد عبد الحفیظ پیرزادہ کو کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا۔ کمیٹی نے غور و خوض کے بعد آئین کا مسودہ تیار کیا جسے منظوری کے لئے 2 فروری 1973ء کو اسمبلی کے سامنے پیش کیا گیا۔ 22 مارچ 1973ء تک مسودے پر بحث ہوئی اور بالا خر آئین کا مسودہ 11 اپریل 1973ء کو منظور کیا گیا اور صدر مملکت کی منظوری کے بعد 14 اگست 1973ء کو نافذ ہوا۔

1973ء کے آئین کی اسلامی دفعات

1973ء کے آئین میں پہلی دفعہ اسلامی دفعات پر زیادہ زور دیا گیا اور پہلے دساتیر کی نسبت اس آئین کو زیادہ اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ 1973ء کے آئین میں 1956ء اور 1962ء کے دساتیر کی نسبت زیادہ اسلامی شقیں رکھی گئی ہیں۔

یہ دستور اس لحاظ سے دوسرے دساتیر کی نسبت بہتر ہے کیونکہ اسے عوامی نمائندوں کی تائید حاصل ہے اور اسے عوام کے منتخب نمائندوں نے سیر حاصل بحث کے بعد منظور کیا تھا۔ 1973ء کے آئین کی اسلامی دفعات درج ذیل ہیں:

1- 1973ء کے آئین کے مطابق پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا۔ جسے حکومتی سطح پر تسلیم کیا جائے گا۔
2- آئین کے ابتدائیہ میں یہ اقرار کیا گیا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور عوام کے منتخب نمائندے اختیارات کو ایک مقدس امانت کے طور پر استعمال کریں گے۔
3- وزیر اعظم اور سربراہ مملکت کے لئے مسلمان ہونا ضروری قرار دیا گیا اور دونوں کیلئے نظریہ پاکستان اور ختم نبوت پر یقین بھی لازمی قرار دیا گیا۔
4- ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا اور آئین کو آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دیا گیا۔
5- مسلمان کی باقاعدہ تعریف و توضیع آئین میں بیان کی گئی۔
6- یہ طے پایا کہ ملک کے تمام قوانین اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالے جائیں گے اور ہر شہری کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔
7- صدر اور وزیر اعظم اپنے عہدوں کا حلف اٹھائیں گے اور اپنے حلف میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، قرآن پاک اور ختم نبوت پر اطمینان کا اظہار کریں گے۔
8- اسلامی نظریہ کی کونسل قائم کی گئی جس کا کام قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنا تھا اور اس کیلئے سربراہ ریاست کو مفید مشورے دینا تھا۔
9- آئین میں ملک سے سود کی لعنت کو ختم کرنے کیلئے کوشش کا اظہار کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اس لعنت کو ملک سے جلد از جلد ختم کر دیا جائے گا۔
10- حکومت قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کو رائج کرنے کے سلسلے میں ضروری اقدامات کرے گی اور قرآن پاک کی اغلاط سے پاک طباعت اور اشاعت کا بندوبست کرے گی۔
11- زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی دیکھ بھال اور تنظیم کیلئے مناسب اقدامات کئے جائیں گے۔

12- اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اور حکومت کی ملازمتوں میں مناسب نمائندگی دی جائے گی۔
13- مسلم ممالک کے ساتھ روابط کو اہمیت اور ترجیح دی جائے گی اور ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات استوار کئے جائیں گے۔

یہ آئین 1973ء میں نافذ کیا گیا اور تقریباً 6 سال تک نافذ العمل رہا۔ 1977ء میں تحریک نظام مصطفیٰ نے بھٹو حکومت کو ہلا ڈالا اور ملک میں 6 جولائی 1977ء کو ایک دفعہ پھر جنرل محمد ضیاء الحق کی سرکردگی میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔

پاکستان میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی کوششوں کا تنقیدی جائزہ

پاکستان کا قیام اسلام کے نظریہ کی بنیاد پر عمل میں آیا برصغیر کے مسلمان صرف اسلام کی وجہ سے ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے تسلیم کئے گئے اور بالآخر یہ بات ہندوستان کے ہندوؤں اور انگریز حکومت کے اہل کاروں کو تسلیم کرنا پڑی کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ مطالبہ پاکستان کا محرک صرف یہی اسلامی جذبہ تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان قائد اعظم کی قیادت میں متحد ہو کر پاکستان کی منزل پا لینے میں کامیاب ہوئے۔

قیام پاکستان کے وقت اور بعد میں سب کا یہی خیال تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام حیات اپنایا جائے گا۔ کیونکہ صرف اسی نظام کو رائج کرنے کیلئے برصغیر کے مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دی تھیں۔ قائد اعظم نے بھی بار ہا مرتبہ یہی فرمایا تھا کہ پاکستان میں اسلام کے سوا کوئی اور نظام قابل قبول نہیں ہوگا اور پاکستان کے مسلمانوں کو اسلامی طرز حیات اپنانے کیلئے پورا موقع دیا جائے گا۔ قائد اعظم کے ان ارشادات کی روشنی میں اور عوامی دباؤ کے پیش نظر پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی جس میں ان اسلامی اصولوں کا ذکر کر دیا گیا تھا جن کی بنیاد پر ملک کے مستقبل کا آئین استوار کیا جانا تھا۔

یہ انتہائی بدقسمتی تھی کہ تقسیم کے بعد پاکستان میں سوائے قائد اعظم اور ان کے چند دیرینہ ساتھیوں کے کوئی بھی شخص اسلامی نظام کو رائج نہ کرنا چاہتا تھا۔ دستور ساز اسمبلی میں ایسے افراد کی بھر مار تھی جو پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنانا چاہتے تھے اور آئین میں اسلام کا ذکر نہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن قائد اعظم کی کوششوں اور عوام کے دباؤ کے پیش نظر ان لوگوں کو کامیابی حاصل نہ ہوئی اور جب ملک کا پہلا آئین 1956ء میں منظور ہوا تو اس میں پاکستان کے نام کے ساتھ اسلامی جمہوریہ کے الفاظ لکھے گئے۔

قیام پاکستان کے بعد جس چیز نے ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور اسلامی نظام کے اجراء میں مشکلات پیدا کیں وہ آئین سازی میں تاخیر تھا۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد ملک میں آئین سازی کا کام بہت متاثر ہوا۔ قرارداد مقاصد میں ملک کے صدر پر یہ زور دیا گیا تھا کہ وہ آئین سازی کے سلسلے میں مناسب اقدام کریں گے اور آئین سازی کا کام ایک سال کے اندر مکمل کر لیں گے۔ لیکن آئینی کمیشن کے تقرر میں لیت ولعل سے کام لیا گیا اور ہر ممکن طریقے سے آئین سازی کے کام میں روڑے اٹکائے گئے۔ اس سلسلے میں گورنر جنرل غلام محمد اور میجر جنرل سکندر مرزا نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور آئین سازی کو سات سال تک روکے رکھا۔ بہر حال 1956ء میں آئین منظور ہوا لیکن صرف دو ہی سال میں اس آئین کو ختم کر دیا گیا اور 1958ء میں صدر ایوب خان کی سرکردگی میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔

صدر ایوب خان نے بھی ملک کے لئے آئین کی فوری ضرورت محسوس نہ کی اور 1960ء میں پورے دو سال کے بعد آئینی کمیشن کا تقرر کیا گیا۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ 1962ء میں پیش کی جس میں صدر ایوب خان نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کیلئے اپنی مرضی سے تبدیلیاں کیں اور ایک آئین بنا کر قوم کے حوالے کر دیا۔ عوامی ردعمل کے پیش نظر آئین میں اسلام کا سرسری ذکر کیا گیا لیکن اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے لئے کوئی قابل ذکر شق شامل نہ کی گئی۔ اسلامی مشاورتی کونسل کا قیام تو عمل میں لایا گیا لیکن اس کے اختیارات بالکل نہ ہونے کے برابر تھے اور اسلامی مشاورتی کونسل صدر کے مشوروں کے مطابق اپنے مشورے دیتی تھی۔

1969ء میں صدر ایوب جب اقتدار سے علیحدہ ہوئے تو ملک میں ایک دفعہ پھر مارشل لاء لگا دیا گیا اور یحیٰی خان برسر اقتدار آئے۔ اس دور میں تو کسی نے اسلام کے متعلق سوچنے کی بھی زحمت نہ کی۔ اسی دور میں ملک اپنی تاریخ کے بدترین سیاسی بحران کا شکار ہوا۔ 1970ء میں عام انتخابات کروائے گئے تو دونوں صوبوں میں دو مختلف سیاسی پارٹیاں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئیں۔ جس کی وجہ سے ملک میں بے یقینی کی فضا پیدا ہوئی اور دونوں پارٹیوں میں حصول اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ قومی اسمبلی میں اپنی بھاری اکثریت کے بل بوتے پر آئین سازی میں مکمل اختیارات چاہتی تھی۔ جبکہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی بھی اپنی قوت کے بل پر آئین میں تحفظ چاہتی تھی اور اقتدار میں حصہ حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ جنرل یحیٰی خان نے مسٹر بھٹو کے ایماء پر قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا جس پر عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک چلائی شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری سے صورتحال زیادہ خراب ہوئی اور ہندوستان نے مشرقی پاکستان کی صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ بھارتی جارحیت سے مشرقی پاکستان ملک سے علیحدہ ہوا۔ باقی ماندہ پاکستان میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی جس نے 1973ء میں ملک کا تیسرا آئین منظور کیا۔

1973ء کے آئین میں پہلے دساتیر کی نسبت اسلام کی سمت مثبت اقدامات اٹھائے تھے اور ان اصولوں کو نافذ کرنے کیلئے عملی اقدامات پر زور دیا گیا تھا۔ 1977ء میں مسٹر بھٹو کی حکومت کے خلاف تحریک نظام مصطفیٰ نے جنم لیا جس نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو ختم کر ڈالا اور جولائی 1977ء میں جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت برسر اقتدار آئی۔

پاکستان کے تینوں دساتیر کو غیر اسلامی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن بد قسمتی سے پہلے ان دساتیر میں اسلامی نظام کا ذکر محض دکھاوے کی حد تک تھا اور صرف عوامی دباؤ کے پیش نظر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اسلام کا ذکر ان دساتیر کے ابتدائیہ میں ہوتا تھا۔ جس کی حیثیت صرف اخلاقی ہوا کرتی ہے اور جو نفاذ کے زمرے میں نہیں آتے۔ 1973ء کے آئین میں بلا شبہ اسلام کی جانب بہتر اقدامات کئے گئے ہیں۔ لیکن اس دور کی حکومت کے اہل کاروں کے غیر اسلامی شعار کی وجہ سے یہ آئین بھی اسلامی نظام کی طرف کوئی قابل ذکر پیش رفت نہ کر سکا۔

ہماری منزل...... مکمل اسلامی معاشرہ کا قیام

اسلام دین حیات ہے اور اس کے اندر زندگی کے تمام شعبوں کو سمو لینے کی اہلیت موجود ہے۔ اسلام معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کا اپنا ایک جامع اور ٹھوس معاشی نظام ہے جو بہترین معاشی زندگی کے حصول کی ضمانت دیتا ہے۔

پاکستان کا قیام اسی اعلیٰ و ارفع نظام کیلئے معرض وجود میں آیا تھا۔ متحدہ ہندوستان سے علیحدہ ہو کر الگ وطن کا مقصد دراصل یہی نظام حیات تھا جسے مسلمان اپنی زندگی میں اپنانا چاہتے تھے اور چونکہ یہ متحدہ ہندوستان میں ہندو کی اکثریت میں ممکن نہ تھا اس لئے یہ نظام مطالبہ پاکستان کا محرک بنا۔ اسی نظام حیات کے لئے مجدد الف ثانیؒ، ولی اللہؒ شاہ اسماعیل شہیدؒ، سید احمد بریلویؒ اور سر سید احمد خان نے جدو جہد کی اور ہندوستان میں احیائے اسلام کی بیشتر تحاریک کی قیادت کی۔ قائداعظم نے بھی ان ہی اصولوں کو اپنانے کیلئے ہندوستان کے مسلمانوں کو پکارا اور مسلمان فوراً اس پکار پر لبیک کہہ کر قائداعظم کے جھنڈ تلے جمع ہو گئے۔

آخر یہ سب جدوجہد کیوں کی گئی۔ قائداعظم نے برصغیر کی دو عظیم قوتوں انگریز اور ہندو سے ٹکر لی اور اپنے مقصد کے حصول کیلئے اپنی جان اور صحت کی بھی پروا نہ کی۔ کیونکہ برصغیر کے ایک ایک مسلمان نے پاکستان کے نام پر ووٹ دیئے اور پاکستان پہنچنے کیلئے بے پناہ مصائب کا سامنا کیا۔ ان سب باتوں کا جواب صرف یہی ہے کہ برصغیر کے مسلمان وہ نظام حیات اپنانا چاہتے تھے جو وہ ہندوستان میں رہ کر نہیں اپنا سکتے تھے۔ قائداعظم ایسا نظام لانے کیلئے ایک علیحدہ ملک چاہتے تھے جہاں وہ عملی طور پر اسلامی اصولوں کو جاری کر سکیں اور جس کیلئے قوم کو غیر اسلامی قوتوں کی مزاحمت نہ برداشت کرنی پڑے۔ چنانچہ قائداعظم نے فرمایا:

''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک خطہ زمین حاصل کرنے کیلئے نہیں بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے سنہری اصولوں کو آزما سکیں اور پھر اپنی زندگیوں کو ان کے مطابق استوار کر سکیں''۔

قائدِ اعظم کے اس ارشاد کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان کا مقصد صرف قومی آزادی نہ تھا یا صرف سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ نہ تھا بلکہ اس کا مقصد خدا اور رسول کے احکامات کا نفاذ اور ان کی مکمل تابعداری اور اطاعت تھی۔

بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد آزادی کے پہلے چند سالوں کے دوران ملک میں ایسے عناصر اور قوتوں کی بھر مار رہی ہے جو پاکستان کو ایک اسلامی معاشرہ کے طور پر دیکھانا نہ چاہتے تھے بدقسمتی کی انتہا یہ تھی یہ عناصر ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے گھناؤنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کی۔ قائد اعظم کی وفات نے ان لوگوں کو تقویت دی لیکن عوامی دباؤ اور دستور ساز اسمبلی میں چند حضرات کی موجودگی سے یہ عناصر اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور ملک کے پہلے آئین میں اسلامی نظام رائج کرنے کی کوشش کا اظہار کیا گیا۔ لیکن ان لوگوں کی کوششوں سے ملک میں اسلامی نظام لانے کا کام بہت متاثر ہو۔ آج آزادی کے 52 سال گزرنے کے بعد بھی ہم ابھی تک اپنی منزل سے دور ہیں۔

جنرل ضیاء کی فوجی حکومت 1977ء میں برسر اقتدار آئی تھی۔ اس حکومت نے ملک کے اصلی مقصد کو سمجھتے ہوئے صحیح سمت قدم بڑھایا اور مکمل اسلامی نظام کے قیام کیلئے قابل قدر مساعی کی ہے صدر ضیاء الحق کی حکومت اپنے اس اقدام پر مبارک کی مستحق ہے کہ اس نے ملک میں اسلامی نظام لانے کیلئے ٹھوس اقدامات کئے ہیں اور اسلام کا نام صرف زبانی طور پر استعمال نہیں کیا جیسے کہ پہلی حکومتیں کرتی رہی ہیں۔

باب نمبر 6

ارض پاکستان...... جغرافیائی وحدت

پاکستان 14 اگست 1947ء کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت میں معرض وجود میں آیا۔ 1947ء سے لے کر 1971ء تک پاکستان دو حصوں پر مشتمل تھا جنہیں مشرقی اور مغربی پاکستان کہا جاتا تھا۔ لیکن 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں پاکستان کو اپنے مشرقی حصے سے محروم ہونا پڑا اور آزاد بنگلہ دیش معرض وجود میں آیا۔

تقسیم ہند سے پہلے موجودہ پاکستان کا علاقہ متحدہ ہندوستان میں شامل تھا لیکن برصغیر کے جغرافیائی اور معاشرتی حالات کے تاریخی معالعہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ موجودہ پاکستان کا علاقہ ہمیشہ برصغیر سے الگ تھلگ رہا ہے اور کسی بھی دور میں بقیہ ہندوستان کے ساتھ اس کے روابط نظر نہیں آتے۔ برصغیر ایک ایسا خطہ رہا ہے جہاں پر بے شمار قومیں آباد تھیں جن کی خصوصیات اور معاشرتی رہن سہن ہمیشہ ایک دوسرے سے جداگانہ رہا ہے۔ برصغیر کو دو دریائی نظام سیراب کرتے ہیں۔ جنہیں دریائے سندھ کا دریائی نظام اور گنگا جمنا کا دریائی نظام کہتے ہیں۔ ان دریائی نظاموں نے برصغیر کو دو مختلف خطوں میں تقسیم کر دیا تھا جن کی تہذیب وتمدن اور معاشرتی زندگی ایک دوسرے سے ہمیشہ مختلف رہی۔

پاکستان کا موجودہ علاقہ آج سے ہزاروں سال پہلے ایک منفرد معاشرتی تہذیب کا مسکن رہا ہے جسے وادی سندھ کی تہذیب کہا جاتا تھا۔ اس تہذیب کا سراغ پنجاب میں ہڑپہ اور سندھ میں موہنجو داڑو کے مقامات پر کھدائی سے ملا ہے۔ دونوں علاقوں کی تہذیب و تمدن اور معاشرتی زندگی میں مماثلت پائی گئی ہے اور سندھی ثقافت اور پنجاب کی معاشرتی زندگی میں کئی مشترک خصوصیات منظر عام پر آئی ہیں۔ دونوں علاقوں کی زبانوں، تاریخ اور ثقافت میں گہری مشابہت پائی گئی ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ دونوں علاقے ہمیشہ سے ایک جغرافیائی وحدت رہے ہیں۔

اس کے برعکس گنگا اور جمنا کے پار ملنے والے آثار قدیمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو معاشرتی زندگی دریائے سندھ کے میدانی علاقوں میں پائی جاتی تھی اس کا سلسلہ گنگا جمنا کے میدانوں سے منقطع رہا ہے اور گنگا جمنا کے پار ملنے والی تہذیب وتمدن اور سندھ کے علاقوں کی تہذیب اور معاشرتی زندگی میں فرق محسوس ہوتا ہے۔

پاکستان کی جغرافیائی حالت دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقہ قدرتی اور طبی لحاظ سے بھی ایک وحدت رہا ہے۔ یہاں سے متعدد پہاڑی سلسلے اور دریا نکلتے ہیں۔ دریا زمین کو سیراب کرتے ہوئے پنجند کے مقام پر دریائے سندھ میں جا گرتے ہیں۔ اقتصادی طور پر بھی پاکستان کو ایک وحدت کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں پر کراچی کی بندرگاہ بیرونی تجارت کیلئے ایک اہم گذرگاہ ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے تمام صوبوں کو سمندر کے پانی تک باآسانی رسائی حاصل ہے۔

محل وقوع

پاکستان براعظم ایشیاء کا ساتواں بڑا ملک ہے۔ اس کا موجودہ رقبہ 310,403 مربع فی میل اور 796095 مربع کلومیٹر ہے۔ پاکستان 24 اور 37 عرض بلد شمالی اور 61 اور 75.5 طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔

آبادی

پاکستان ایک کثیر آبادی کا ملک ہے۔ 1990ء تک پاکستان کی آبادی بڑھنے کی شرح 3.1 فیصد سالانہ تھی۔ اس وقت پاکستان کی آبادی 381 افراد فی مربع میل ہے جو کہ بہت زیادہ ہے۔ اس وقت پاکستان کی آبادی تقریباً 135.135.195 ہے اور فی مربع کلومیٹر 163.1 افراد ہے۔

پاکستان میں پیدائش اور اموات کی شرح بہت اونچی ہے۔ 1978ء میں شرح پیدائش 36 اور اموات کی شرح 11 تھی۔ اس وقت شرح پیدائش 34.38 فی ہزار اور شرح اموات 10.69 فی ہزار ہے۔

سرحدیں

مشرقی جانب سے پاکستان کے ساتھ ہندوستان کی سرحدیں ملتی ہیں۔ یہ سرحد سب سے لمبی سرحد ہے اور اس میں مشرقی پنجاب کا صوبہ اور راجستھان کے صحرا شامل ہیں۔ پاکستان کی مغربی سرحدوں کے ساتھ ایران اور افغانستان کی سرحدیں ملتی ہیں۔ جنوب میں بحیرہ عرب اور شمال میں کوہ ہمالیہ اور چین کی سرحدیں ہیں۔ واخان کا علاقہ روس کو مل جانے کی وجہ سے اب روس کی سرحد بھی پاکستان کے ساتھ مل گئی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ایک ہزار میل لمبی سرحد ہے۔ افغانستان کے ساتھ پاکستانی سرحد 1450 میل لمبی ہے۔ ایران کے ساتھ 530 میل اور چین کے ساتھ 320 میل لمبی سرحدیں واقع ہیں۔

پاکستان کے شمال میں کوہ قراقرم کا سلسلہ بھی واقع ہے جس سے چین کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اس پہاڑی سلسلہ پر ایک عظیم خشکی کا راستہ بنا کر چین اور پاکستان کو آپس میں ملا دیا گیا ہے اس شاہراہ کو شاہراہ ریشم کا نام دیا گیا ہے۔ یہ عظیم شاہراہ دونوں ملکوں کے باہمی اشتراک و تعاون سے بنائی گئی ہے اور پاکستان اور چین کے درمیان دوستی بھائی چارے اور یگانگت کی جیتی جاگتی مثال ہے یہ پاکستانی اور چینی انجینئروں اور ماہرین کی مہارت پیشہ وارانہ عظمت اور عظیم قربانیوں کا بے مثل نمونہ ہے جو تجارتی اور فوجی لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔

جغرافیائی اہمیت

پاکستان دنیا کے سب سے بڑے براعظم ایشیاء میں واقع ہے۔ پاکستان کے شمال کی جانب عوامی جمہوریہ چین واقع ہے جو دنیا میں بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چین اور پاکستان کے درمیان گہرے روابط قائم ہیں اور دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات قائم ہیں۔ روس بھی پاکستان کے ہمسایوں میں شامل ہے۔ یہ دنیا کی عظیم طاقت ہے اور بحیرہ عرب کے گرم پانی تک رسائی کا خواہش مند ہے۔ بحیرہ عرب تک پہنچنے کیلئے پاکستان سے ہو کر جانا پڑتا ہے اس لحاظ سے پاکستان کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور خاص طور پر جب کہ چین اور روس ایک دوسرے کے خلاف ہیں اور دونوں پاکستان میں اپنا اثر ونفوذ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان بھی پاکستان کے بڑے ہمسایوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کی سب سے لمبی سرحد پاکستان سے ملتی ہے۔ ہندوستان میں داخل ہونے کیلئے پاکستان کے راستے سے جانا پڑتا ہے۔ ہندوستان روس کا سب سے بڑا حلیف ہے لیکن دونوں ممالک کے درمیان پاکستان واقع ہے۔ افغانستان بھی روس کا دوست ہے۔ افغانستان کی سرحد بھی پاکستان سے ملتی ہے۔ شروع دن سے افغانستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کشیدہ رہے ہیں۔

ان عوامل نے پاکستان کی دفاعی اور تجارتی اہمیت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ روس کی توسیع پسندی کے پیش نظر مغربی ممالک پاکستان کو بہت اہمیت دے رہے ہیں کیونکہ اگر روس پاکستان سے گذر کر گرم پانی اور تیل کے میدانوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو

اس طرح مغربی ممالک اور امریکہ کو تیل کی فراہمی میں رکاوٹ پڑنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے امریکہ اور مغربی ممالک پاکستان کو ایک مضبوط ملک دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ پاکستان ہی صرف روسی اشتراکیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اسلامی دنیا سے رابطہ

محل وقوع کے لحاظ سے پاکستان کی پوزیشن ایسی ہے جس سے پاکستان اسلامی دنیا کے عین وسط میں واقع ہے اس کے مشرق میں بنگلہ دیش، ملائیشیا، انڈونیشیا اور فلپائن کے جزائر واقع ہیں۔ مغرب میں افغانستان اور ایران واقع ہیں اس کے علاوہ سعودی عرب خلیج فارس کی ریاستیں عراق، اردن، شام، ترکی، تیونس، مصر، لیبیا اور مراکش کے ممالک کا سلسلہ بھی پاکستان سے ملتا ہے۔ اسی لئے پاکستان کو عالم اسلام کا دل کہتے ہیں۔ پاکستان عالم اسلام کے بڑے دشمن ہندوستان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان اسلام کا ایک مضبوط قلعہ ہے۔

عالمی سیاست میں دنیائے اسلام کی قیادت کا سہرا بھی پاکستان کے سر ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پوری دنیا کے مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے پاکستان کا انتخاب کیا گیا اور 1980ء میں صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے جنرل اسمبلی کو خطاب کیا جو پاکستان کیلئے ایک بہت بڑا اعزاز ہے اسی طرح 1979ء کی ہوانا کانفرنس میں بھی عالم اسلام کی قیادت پاکستان کے حصے میں آئی۔ اسلامی کانفرنس کے چیئرمین کی حیثیت سے پاکستان کا انتخاب بہت بڑا اعزاز ہے۔ پاکستان سات سال تک اس عہدے پر فائز رہا ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان راہبری اور قیادت کیلئے ہمیشہ پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں۔

پاکستان کی دفاعی حیثیت

پاکستان اپنے موجودہ محل وقوع کی وجہ سے قدرتی طور پر ایک مضبوط قلعے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے چاروں طرف اونچے پہاڑی سلسلے ہیں جن کی وجہ سے دشمن کیلئے داخل ہونا مشکل ہے۔

پاکستان کے شمال میں قراقرم کا پہاڑی سلسلہ ہے جس کی وجہ سے شمال کی طرف سے پاکستان کا دفاع مضبوط ہے مغرب کی طرف بھی پہاڑی علاقے ہیں جن میں کئی درے ہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان برصغیر میں داخل ہونے کیلئے دروازے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جنوب کی طرف سمندر ہے جس کی وجہ سے پاکستان ہر طرف سے مضبوط دفاعی حیثیت میں ہے۔

عظیم طاقتوں کا ہمسایہ

پاکستان کے چاروں طرف بڑے بڑے ملک واقع ہیں جس کی وجہ سے پاکستان کی جغرافیائی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان کے ایک طرف روس ہے جو ایک سپر طاقت ہے دوسری طرف چین ہے جو کہ پاکستان کا قابل اعتماد دوست ہے۔ بھارت پاکستان کا نزدیکی ہمسایہ ہے جسے برصغیر ایشیاء میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان کے جغرافیائی محل وقوع اور سیاسی حالات کی وجہ سے امریکہ پاکستان سے دوستی کا خواہش مند ہے۔

اسلامی دنیا کا لیڈر

پاکستان کو اسلامی دنیا میں منفرد مقام حاصل ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا مقصد علیحدہ وطن حاصل کر کے اپنی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق استوار کرنا تھا۔

آزادی کے بعد قائد اعظم نے اسلامی ممالک سے گہرے روابط قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ پاکستان نے ہمیشہ اسلامی دنیا کو درپیش مسائل کو حل کرنے کیلئے ہر ممکن امداد دی ہے۔ بالخصوص فلسطین کا مسئلہ، چیچنیا، بوسنیا اور دوسرے مسلم ممالک کو درپیش مسائل میں پاکستان ہمیشہ اپنے مسلمان بھائیوں کے شانہ بشانہ رہا ہے تمام مسلم ممالک پاکستان کی اسلامی حیثیت کی وجہ سے ہر مشکل وقت میں پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں اور راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ 1974ء میں غیر جانبدار ممالک کی ہوانا کانفرنس اور 1980ء میں اقوام متحدہ میں صدر پاکستان کو عالم اسلام کی طرف سے متفقہ قائد بنانا پوری امت مسلمہ کا قائد بنانا ہے۔

خلیجی ریاستوں کی بقاء

روس ایک توسیع پسند سپر پاور ہے۔ روس خلیجی ریاستوں کی تیل کی دولت کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے اس مقصد کیلئے روس نے افغانستان کے ساتھ ساز باز کی اور افغانستان پر فوجی قبضہ کر لیا پاکستان نے افغانستان پر روسی قبضہ کا بہادری سے مقابلہ کیا اور روس کو افغانستان میں روک کر اپنے دفاع عالم اسلام کی بقاء اور خلیجی ریاستوں کے بچاؤ کیلئے کئی سال جنگ لڑی اور بالاخر روس کو افغانستان سے پسپا ہونا پڑا جس کا سہرا پاکستان کے سر پر ہے۔

باب نمبر 7

تحریک آزادی میں طلباء، خواتین
علماء کرام اور مشائخ کا کردار

برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی کی تاریخ مسلم معاشرہ کے مختلف طبقات کی بے مثال جدوجہد کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو جب یہ یقین ہوگیا کہ متحدہ ہندوستان میں ان کا مستقبل خطرے میں ہوگا اور ہندوؤں کے ساتھ باعزت زندگی کا حصول ناممکن ہوگا، تو انہوں نے ہندوستان کی ہندو آبادی سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کیا اور اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔ علیحدہ وطن کا مطالبہ مارچ 1940ء میں لاہور میں ایک قرار داد منظور کر کے کیا گیا۔ قرار داد لاہور کے منظور ہونے کے بعد مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں کی تحریک آزادی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ برصغیر کے مسلمان قائداعظم کی انقلابی قیادت میں اپنے لیے نئے وطن کے حصول کے لیے شانہ بشانہ سرگرم ہوگئے۔

قرار داد لاہور کی کامیابی جو کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے مطالبہ کی صورت میں اجاگر ہوئی دراصل مسلمانوں کے مختلف طبقات کی بے مثال اور بے خوف جدوجہد کا نتیجہ تھی جو کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے محبوب قائداعظم کی بے مثال قیادت میں کی۔ بالآخر ہندوستان کے مسلمان اپنی منزل پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے جہاں پر انہوں نے اسلامی اصولوں کی روشنی میں نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں قابل احترام علماء کرام اور مشائخ کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ علماء کرام اور مشائخ نے اپنی مثالی قیادت اور مذہبی جوش و جذبے سے تحریک آزادی میں نئی روح پھونکی اور مسلمانوں کے اندر یک جہتی اور جوش پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

تحریک آزادی میں طلباء کا کردار بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان کے مسلمان طلباء نے تحریک آزادی کے لیے بے پناہ جدوجہد کی اور تحریک کے لیے نوجوان قیادت مہیا کی۔ طلباء قائداعظم اور مسلم لیگ کے بے خوف اور بے غرض کارکن ثابت ہوئے جنہوں نے اپنی طاقت، جوش اور ولولے سے قائداعظم کے ہاتھ مضبوط کیے۔ طلباء نے آزادی کا پیغام ملک کے کونے کونے تک پھیلایا اور عوام کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے میں بے مثال کردار ادا کیا۔

مسلمان خواتین بھی تحریک آزادی میں کسی سے پیچھے نہ تھیں۔ خواتین نے تحریک آزادی کے لیے قابل تعریف اور بے لوث خدمات سرانجام دیں اور مسلمانوں کے اندر قائداعظم اور مسلم لیگ کے لیے حمایت حاصل کی۔ مسلمان خواتین نے حصول آزادی کے لیے ہندوؤں اور انگریزوں کے سامنے بے خوف مزاحمت پیدا کی جس کی وجہ سے تحریک آزادی کے لیے تمام برصغیر میں والہانہ جوش و جذبہ پیدا ہوا۔ خواتین نے دن رات اپنی ان تھک کوششوں سے مسلم لیگ کے شعبہ خواتین کو منظم کیا اور قائداعظم اور مسلم لیگ کے لیے ملک سے بھرپور تائید حاصل کی۔ ذیل میں علماء کرام، مشائخ اور طلباء کے تحریک آزادی میں کردار پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

علماء کرام اور مشائخ:

حصول پاکستان کے لیے علماء اور مشائخ کی خدمات تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔ قابل احترام علماء اور مشائخ کرام نے آزادی کا پیغام پھیلانے کے لیے بے پناہ مشکلات اور تکالیف کا مردانہ وار سامنا کیا۔ علماء اور مشائخ نے اپنی شعلہ بیاں تقاریر کے ذریعے عوام میں آزادی کی روح پھونکی۔ ان حضرات نے عوام کو ذاتی طور پر مل کر آزادی کے لیے مسلم لیگ اور قائداعظم کی حمایت پر ذہنی طور پر تیار کیا جس کے لیے علماء کرام اور مشائخ نے بے پناہ مشکلات کا سامنا کیا۔ علماء کرام اور مشائخ مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کرنے اور عوام کو آزادی کے لیے ہر قربانی دینے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کی کاوشوں سے مسلم لیگ اور قائداعظم کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔ علماء اور مشائخ نے 1940ء میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے منعقدہ لاہور میں بھرپور شرکت کی اور قرارداد لاہور کو کامیاب کروانے میں بھرپور حصہ لیا۔ قرارداد لاہور پاس ہونے کے بعد ان حضرات نے آزادی کے لیے پہلے سے زیادہ کام کیا اور قیام پاکستان کی راہ ہموار کی۔ علماء کرام اور مشائخ میں علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف تھانوی، مولانا حمید بدایونی، پیر سید جماعت علی شاہ، پیر صاحب زکوڑی شریف اور بہت سارے دوسرے علماء کرام اور مشائخ کے نام نامی شامل ہیں۔

یہ قابل احترام ہستیاں 1936 اور 1946ء کے انتخابات کے دوران مسلم لیگ اور قائداعظم کے ساتھ رہیں۔ ان حضرات نے انتخابی مہم کو موثر طریقے سے منظم کرنے کے لیے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا اور اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کو ہندوؤں اور انگریز کے عزائم سے خبردار کیا۔ علماء کرام اور مشائخ کی کوششوں کی بدولت مسلمانوں نے اپنا سست رویہ ترک کردیا اور پورے جوش و خروش سے مسلم لیگ کی جدوجہد آزادی میں شرکت کی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی:

علامہ شبیر احمد عثمانی ایک عظیم مذہبی فلاسفر اور بلند پایہ صوفی تھے۔ آپ کا شمار دیوبند کے پہلے فارغ التحصیل علماء کرام میں سے ہوتا ہے جنہوں نے مسلم لیگ اور قائداعظم کے لیے سب سے پہلے اپنی گرانقدر خدمات پیش کیں۔ آپ نے قائداعظم کو دوسرے علماء کے مقابلے میں حمایت دی اور قائداعظم کو مخالف علماء کے پروپیگنڈے سے بچایا۔ آپ قائداعظم کی سیاسی، علمی اور مذہبی بصیرت کے معترف تھے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو تلقین کی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر قائداعظم کی حمایت کریں اور قیام پاکستان کی جدوجہد کو مضبوط بنیاد فراہم کریں۔ آپ نے اپنے ساتھیوں اور دوسرے مسلمانوں کو کانگریس اور انگریزوں کے ہتھکنڈوں سے خبردار کیا اور انہیں یہ تلقین کی کہ وہ کانگریس اور برطانوی حکومت کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں۔ آپ نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ مسلم لیگ کو ووٹ دیں اور انہیں باخبر کیا کہ اگر کسی نے مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں کو ووٹ دیا تو وہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

مولانا اشرف علی تھانوی:

مولانا اشرف علی تھانوی دیوبند سکول کے فارغ التحصیل تھے۔ آپ نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ نے علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مل کر قائداعظم کے قابل اعتماد ساتھی کی حیثیت سے مسلم لیگ کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ اپنے مذہبی اور تصوف کے علم کی وجہ سے آپ پورے ہندوستان میں انتہائی قابل عزت اور بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ نے زندگی بھر مذہبی تعلیم دینے میں گزاری۔ جب آپ نے دیکھا کہ کانگریس اور برطانوی حکمران مسلمانوں کے لیے جارحانہ عزائم رکھتے ہیں تو آپ نے قائداعظم کے قریبی سیاسی ساتھی کی حیثیت سے سیاست میں حصہ لیا۔

پیر سید جماعت علی شاہ:

پیر سید جماعت علی شاہ ایک چھوٹے سے قصبے علی پور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مذہبی تعلیم حاصل کی اور قرآن پاک حفظ کیا۔ آپ نے مزید تعلیم مولانا غلام قادر بریلوی، مولانا فیاض الحسن شرقپوری اور مفتی محمد عبداللہ سے لاہور میں حاصل کی۔ آپ نے مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے حج کی سعادت حاصل کی۔ آپ رسالت مآب محمد الرسول اللہ ﷺ کے پیروکار تھے اور نبی کریم ﷺ سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

پیر جماعت علی شاہ نے آزادی کی تحریک میں بے مثال خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے مسلم لیگ کے لیے مدد حاصل کرنے کے لیے ملک کے طول وعرض کا دورہ کیا۔ آپ نے 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدواروں کے لیے انتخابی مہم منظم کی۔ آپ نے مسجد شہید گنج تحریک میں بے مثال کردار ادا کیا جس کے لیے آپ کو امیر ملت کا قابل فخر خطاب دیا گیا۔

پیر صاحب مانکی شریف:

پیر صاحب مانکی شریف ضلع پشاور کے ایک گاؤں مانکی شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ تحریک آزادی کے نڈر اور بے باک سپاہی تھے۔ آپ نے آزادی کے حصول کے لیے گرانقدر خدمات سرانجام دیں اور مسلم لیگ کے لیے بہت کام کیا۔ آپ نے خان عبدالغفار خان کی مسلم لیگ کی مخالفت کا سامنا کیا اور 1945ء میں مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر صوبہ سرحد میں مسلم لیگ منظم کی۔ آپ نے بنارس میں سنی کانفرنس میں شرکت کی اور کئی گھنٹے مسلم لیگ اور جدوجہد آزادی کے حق میں شعلہء بیان تقریر کی۔ آپ کو صوبہ سرحد کی حکومت نے گرفتار کرلیا لیکن آپ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ آپ قائداعظم کے قریبی اور معتمد ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔

مولانا عبدالحمید بدایونی:

آپ 1898ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بدایون میں مذہبی تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ آپ نے اپنے سیاسی کریئر کا آغاز ہندوؤں کی چلائی ہوئی تحریک شدھی کی مخالفت سے کیا۔ شدھی کی تحریک مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ آپ نے اس تحریک کے مضر اثرات کو واضح کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس تحریک سے دور رہیں۔ آپ نے تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔

مولانا عبدالحمید دوقومی نظریہ میں گہرا یقین رکھتے تھے اور مسلمانوں کو علیحدہ قوم تصور کرتے تھے۔ آپ نے نہرو رپورٹ پر سخت نکتہ چینی کی اور اس کی مخالفت میں ملک کے طول وعرض کے دورے کیے۔ آپ مشائخ کے نمائندہ کی حیثیت سے لاہور میں مسلم لیگ کے 1940ء کے سالانہ جلسے میں شریک ہوئے اور پاکستان کی حمایت میں تقریر کی۔

مولانا عبدالحمید مسلم لیگ کے بااعتماد اور بے لوث کارکن تھے آپ نے صوبہ سرحد میں تحریک آزادی کو منظم کیا اور اس سلسلے میں صوبے کا دورہ کیا۔ آپ قائداعظم کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے اور جہاں کہیں بھی قائداعظم گئے آپ ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ آپ نے احرار تنظیم کے اثر کو زائل کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ نے قائداعظم اور نظام حیدر آباد دکن کے درمیان ملاقات کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ کی کوششوں کی بدولت لوگوں کی بہت بڑی تعداد مسلم لیگ میں شامل ہوئی۔

صوبوں میں تحریک آزادی کے دوران علماء و مشائخ کا کردار

NWFP (صوبہ سرحد):

آزادی سے پہلے صوبہ سرحد انتہائی اہمیت کا حامل صوبہ تھا کیونکہ یہاں کی سیاسی زندگی میں کانگریس کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ 1927ء میں مسلم لیگ نے یہ مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات نافذ کیں جائیں۔ 1946ء میں کانگریس نے چند مقامی لوگوں اور علماء کی مدد سے صوبے میں کانگریس وزارت قائم کرنے کی سازش تیار کی۔ مسلم لیگ کی کوشش کے باوجود صوبے میں کانگریس کی وزارت قائم ہوگئی۔ یہ دور مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لیے انتہائی نازک تھا جس کا جدوجہد آزادی پر برا اثر پڑا۔ حکومت نے آزادی کے کارکنوں پر بہت ظلم ڈھائے اور انہیں جھوٹے مقدمات میں ملوث کرکے جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔ کانگریس نے اپنے مسلمان اراکین کی مدد سے آزادی کی مہم کو ہر ممکن دبانے کی کوشش کی۔

اس نازک وقت میں مذہبی راہنما، علماء کرام اور مشائخ نے صوبہ سرحد سے آزادی کے پروانوں کی راہنمائی کا بیڑہ اٹھایا ان بے لوث راہنماؤں میں پیر صاحب مانکی شریف نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے دوسرے علماء کرام سے مل کر صوبہ کے تمام علاقوں کا دورہ کیا اور کانگریس کے زہریلے پروپیگنڈے کا سدباب کیا۔ آپ نے اپنی ان تھک کوششوں کے ذریعے صوبہ سرحد کے عوام کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے منظم کیا۔

سندھ:

صوبہ سندھ مسلمانوں کی تاریخ میں انتہائی اہم حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسلام صوبہ سندھ کے راستے ہی برصغیر میں داخل ہوا اسی وجہ سے صوبہ سندھ کو باب الاسلام بھی کہا جاتا ہے۔ سندھ اس وجہ سے بھی مشہور ہے کہ یہاں بہت مشہور اور بلند پایہ صوفی شاعر اور مذہبی رہنما پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام کی ترقی اور پھیلاؤ کے لیے بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔

سندھ کے علماء کرام اور مشائخ نے جدوجہد آزادی کے فروغ کے لیے ان تھک کوششیں کی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے پیروکار خاندان سرہند نے سندھ میں آزادی کی تحریک کو زندہ رکھنے اور مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس خاندان نے آزادی کی جدوجہد میں قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا۔ حضرت غلام مجدد سرہندی بہت عظیم مذہبی رہنما تھے جنہوں نے آزادی کے حصول کے لیے بے پایاں خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے تحریک خلافت میں سرگرم حصہ لیا اور علی برادران اور دوسرے خلافت رہنماؤں کے ساتھ مل کر گرفتاری پیش کی۔ آپ کی کوشش سے سندھ میں جمعیت المشائخ قائم کی گئی جو مسلم لیگ کی کوششوں میں انتہائی موثر مددگار ثابت ہوئی۔ جمعیت المشائخ نے قائداعظم کی بھرپور حمایت کی۔

شیخ عبدالمجید سندھی صوبہ سندھ کے ایک اور عظیم مذہبی رہنما تھے جن کی آزادی کی مہم میں کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ شیخ عبدالمجید ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اسلام کے سنہری اصولوں سے متاثر ہوکر ابتدائی عمر میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے مسلمانوں کی بہتری کے لیے بہت کوششیں کی۔ آپ ایک قابل مصنف تھے اور آپ نے اپنی قابلیت کو ہندوؤں اور برطانوی حکمرانوں کے خلاف استعمال کیا۔

پنجاب:

آزادی سے پیشتر صوبہ پنجاب اپنی ترقی اور کثیر آبادی کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ صوبہ پنجاب کے تمام طبقوں نے آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ پنجاب کے علماء و مشائخ اور مذہبی رہنماؤں نے عوام کے اندر آزادی کی شمع روشن کی اور انہیں

آزادی کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار کیا۔ پنجاب کے عوام نے ان علماء و مشائخ کی تبلیغ و تلقین کی وجہ سے آزادی کا پیغام ملک کے ہر حصے میں پہنچایا۔

پنجاب کے علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد فاتح بادشاہوں کے ساتھ پنجاب میں آباد ہوگئی اور اسلام کی روشنی پھیلانے لگ گئے۔ ان قابل احترام علماء و مشائخ نے اپنی تمام زندگی پنجاب میں گزار دی اور یہیں مدفون ہوئے۔ ان حضرات نے عوام کے اندر سیاسی بصیرت پیدا کی اور ساتھ ہی مذہبی تعلیم بھی پھیلاتے رہے۔

پنجاب کے علماء اور مشائخ نے بالخصوص مسلم لیگ کے لیے حمایت حاصل کرنے کے لیے انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد انصاری نے ملک کے دور دراز علاقوں کا دورہ کیا اور لوگوں کے اندر مسلم لیگ کے لیے حمایت و تعاون پیدا کیا۔ صوبہ سرحد اور سلہٹ میں رائے شماری کو کامیاب بنانے میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد انصاری کا بہت زیادہ حصہ ہے۔

تحریک آزادی میں طلبا کا کردار:

پاکستان کی تحریک آزادی میں طلباء کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ برصغیر کے طلباء نے آزادی کے لیے بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ طلبا نے آزادی کے لیے نوجوان اور پرجوش قیادت مہیا کی۔ قائداعظم بجا طور پر طلبا کو ہندوستان کے مسلمانوں کا اسلحہ خانہ کہتے تھے۔ طلباء قائداعظم کے انتہائی معتمد اور جاں نثار ساتھی تھے۔

سب سے پہلے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے سیاست کا آغاز کیا۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبا دوسرے اداروں کے طلباء سے ہر لحاظ سے مختلف تھے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کا نظریہ روایتی اداروں کے فارغ التحصیل طلباء سے مختلف ہوتا تھا۔ علی گڑھ کے طلبا اپنی منفرد صلاحیتوں کی بنا پر مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

علی گڑھ کے طلبا نے اپنے منفرد اعلیٰ اور شائستہ طرز عمل کی وجہ سے ایک بے لوث طلبا کا گروپ پیدا کیا جنہوں نے آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر آزادی کی تڑپ پیدا کی اور ان کی منزل کی نشان دہی کی۔ علی گڑھ سے بہت سے علماء اور آزادی کے کارکنان پیدا ہوئے جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں میں نظم و ضبط پیدا کیا اور انہیں ایک عظیم قوم بننے کی راہ دکھائی۔ ان عظیم علماء، سیاسی لیڈروں اور ماہرین تعلیم میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان اور چودھری عبدالحمید جالندھری کا شمار ہوتا ہے۔ ان قابل احترام شخصیات نے ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر قومی تشخص اور بیداری پیدا کی جو آگے چل کر قیام پاکستان کی تحریک کے لیے سیڑھی ثابت ہوئی۔ ان رہنماؤں نے برصغیر کے مسلمانوں میں سیاسی صحافت کی بنیاد ڈالی جس نے برطانوی سامراج کے پنجے اکھاڑ کر رکھ دیئے۔ مولانا حسرت موہانی نے ''اردو معلٰی'' شائع کیا جس نے ہندوستان میں بے باک صحافت کی بنیاد ڈالی۔ مولانا محمد علی جوہر نے ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' شائع کیے جو بہت جلد مسلمانوں میں مقبول ہوئے۔ مولانا ظفر علی خان اور چودھری عبدالحمید جالندھری باقاعدگی سے ان اخبارات اور دوسرے علمی جرائد میں آزادی کے بارے میں مضامین لکھتے رہے اور مسلمانوں کو ان کی نشاۃ ثانیہ کی طرف راہنمائی کرتے رہے۔

علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلباء اپنے بعد آنے والے طلبا کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کے لکھے ہوئے مضامین مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرتے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنا سست رویہ ترک کرنے میں بہت مدد ملی۔ علی گڑھ کے طلبا انتہائی حساس لوگ تھے جن کے اندر مسلمانوں کی آزادی کی لو بہت پہلے سے روشن تھی۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے علی گڑھ کے طلبا کے اندر گہرا احساس یگانگت اور قومی جذبہ جاگزیں ہو چکا تھا۔ جب یہ طلبا یونیورسٹی سے فارغ ہوکر باہر نکلتے تو ان کے اندر

اپنے پیسے ہوئے، بے یارومددگار بھائیوں کی حالت بہتر بنانے کا عزم موجزن ہوتا تھا۔ علی گڑھ کے طلبا نے تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

علی گڑھ کے علاوہ دوسرے اداروں کے مسلمان طلبا بھی آزادی کی جدوجہد میں برابر کے شریک رہے۔ قائداعظم کے دل میں طلبا کے لیے بہت عزت اور محبت تھی اور انہوں نے ہمیشہ مسلمان طلبا پر بھرپور اعتماد کیا۔ طلبا نے مسلم لیگ کے لیے حمایت حاصل کرنے کے لیے دن رات کام کیا۔ انہوں نے آزادی کا پیغام ملک کے کونے کونے تک پہنچایا اور اس کے لیے انہوں نے بے شمار تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ دوسرے ممالک میں رہنے والے مسلمان طلبا نے بھی قیام پاکستان کے لیے بھرپور کوشش کی اور نظریہ پاکستان کو مختلف ممالک میں متعارف کروایا۔ ان طلبا نے بڑی مہارت اور جانفشانی سے قومی سفیر کا کردار نبھایا اور دوسرے ممالک میں پاکستان کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے میں بے پایاں کام کیا۔

مسلمان طلبا قائداعظم کے ذاتی محافظ ہوا کرتے تھے اور قائداعظم کی جانب بڑھنے والی ہر مصیبت کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہوجاتے تھے۔ 1940ء میں لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کے دوران مسلم لیگ اور خاکساروں کے درمیان لڑائی ہوئی یہ خدشہ تھا کہ خاکسار اراکین قائداعظم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ اس خطرے کے پیش نظر مسلمان طلبا نے جن میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے طلبا کی تعداد زیادہ تھی قائداعظم کے گرد گھیرا ڈال لیا اور انہیں جلسہ گاہ تک پہنچایا۔ مسلمان طلبا نے دن رات قائداعظم کی حفاظت کی اور جہاں کہیں بھی وہ گئے طلبا ان کے ساتھ رہے۔

باب نمبر 8

پاکستان کی سیاست میں فوجی مداخلت

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا دور حکومت

آزادی کے بعد پاکستان میں فوجی حکومت کا دورانیہ تقریباً 32 سال کا ہے۔ پہلا مارشل لاء 1958ء میں لگایا گیا اس کے بعد 1969ء، 1977ء اور پھر 1999ء میں مارشل لاء لگائے گئے۔ مارشل لاء لگنے کی اصل وجوہات میں پاکستان کا سیاسی نظام ہے۔ جس میں جمہوری اقدار شروع ہی سے مفقود رہی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی فوج میں ایک طاقتور اور اثر ورسوخ والا طبقہ موجود ہے جو اپنے آپ کو ملکی مفاد کا محافظ سمجھتا ہے۔ جب بھی ملک میں کوئی سیاسی بدامنی پھیلتی ہے یا حکومتی نظام گر جانے کے دہانے پر ہوتا ہے تو فوج کا یہ طبقہ ملکی معاملات میں مداخلت کو ضروری سمجھتے ہوئے اقتدار سنبھال لیتا ہے۔

جس وقت 1958ء میں پہلا مارشل لاء لگا تو اس وقت ملکی حالات انتہائی نازک دور سے گزر رہے تھے۔ سیاسی اور سماجی معاملات ناقابل برداشت ہو چکے تھے۔ مرکز میں ری پبلکن پارٹی کی حکومت تھی جو سازشوں اور سیاسی جوڑ توڑ کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھی۔ ری پبلکن پارٹی کی نمائندہ حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کی حکومت 1956ء کے آئین کی خلاف ورزی کر کے قائم کی گئی تھی۔ یہ پارٹی ایوان صدر میں سیاسی جوڑ توڑ کر کے قائم کی گئی تھی جس کے پیچھے صدر سکندر مرزا کا ہاتھ تھا۔ سکندر مرزا کی سازشی سیاست کی وجہ سے مسلم لیگ جو ایک اکثریتی جماعت تھی اپنی حکومت نہ بنا سکی تھی۔

مشرقی پاکستان میں حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ وہاں کی دو بڑی جماعتیں عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹی ایک دوسرے کے خلاف صف آراء تھیں۔ سیاسی گروہ بندی نے صوبے کے سیاسی حالات کو بری طرح متاثر کیا ہوا تھا۔ سیاسی دشمنی اور صف بندی کا یہ عالم تھا کہ مشرقی پاکستان اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر کو اسمبلی اجلاس کے دوران بری طرح مارا پیٹا گیا جس کی وجہ سے وہ جاں بحق ہو گئے۔ دونوں متحارب سیاسی پارٹیوں کے بیشتر اراکین اس لڑائی میں زخمی ہوئے۔ قومی جھنڈے کی توہین روزمرہ کا معمول تھی۔ مغربی پاکستان کی ایک شاہی ریاست نے مرکزی حکومت کے اختیار کو ماننے سے انکار کر دیا اور قومی جھنڈے کو سرکاری عمارتوں سے ہٹا دیا گیا۔ ملک میں ذخیرہ اندوز اور بدعنوان عوامل کا قبضہ تھا۔ منافع خوری اور تخریب کاری عروج پر تھی۔

اکتوبر 1957ء میں صدر سکندر مرزا نے سہروردی کی وزارت برخاست کر کے آئی آئی چندریگر کو وزیراعظم نامزد کر دیا۔ چندریگر وزارت صرف تین ماہ قائم رہ سکی اور اس کی جگہ ملک فیروز خان نون کی وزارت قائم کی گئی۔

1956ء کے آئین کے تحت پاکستان کے پہلے عام انتخابات مارچ 1959ء میں ہونے تھے۔ سکندر مرزا ان انتخابات کی وجہ سے سخت پریشان تھا کیونکہ انتخابات کے نتیجے میں نئی آنے والی قیادت سکندر مرزا کی سیاسی اجارہ داری کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ نئے انتخابات کی صورت میں حسین شہید سہروردی کی قیادت میں عوامی لیگ کی حکومت قائم ہو سکتی تھی جو کہ سکندر مرزا کے اقتدار کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔ دونوں صورتوں میں سکندر مرزا کی سیاسی اجارہ داری اور حکومت پر قبضہ سخت خطرے میں تھا۔

پہلا مارشل لاء

ان حالات کو دیکھتے ہوئے اور اپنے غیر آئینی اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے سکندر مرزا نے یہ فیصلہ کیا کہ عام انتخابات نہیں ہونے چاہئیں۔ سکندر مرزا نے اس وقت کے فوج کے سربراہ جنرل محمد ایوب خان کو کہا کہ چونکہ ملکی حالات بہت خراب ہو چکے ہیں لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے کارروائی کی جائے۔ یہ سن کر ایوب خان نے ظاہری طور پر تو افسوس کا اظہار کیا لیکن دلی طور پر وہ اس پر بہت خوش تھے کہ انہیں حکومت میں آنے کا موقع مل رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے سکندر مرزا کو اجازت دے دی کہ وہ جو چاہیں کریں۔

7 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا نے 1956ء کا آئین منسوخ کر کے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو برطرف کر دیا اور صوبائی اور مرکزی اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ مارشل لاء لگا دیا اور جنرل محمد ایوب خان کو CMLA مقرر کر دیا گیا۔ عوام سیاست دانوں کی بدعنوانی اور ریشہ دوانیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ ایوب خان خود بھی ملک کو صحیح راستے پر لانا چاہتے تھے لہٰذا عوام نے مارشل لاء کو خوش آمدید کہا اور ایوب خان کی حکومت سے تعاون کیا۔

1951ء میں جب وہ C-IN-C بنے تو اس وقت سے وہ ملک کی بگڑتی ہوئی حالت اور سیاسی انحطاط پر افسوس کیا کرتے تھے اور ایک محب وطن سپاہی ہوتے ہوئے ان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ ملک کو صحیح خطوط پر چلایا جائے۔ آپ ملکی حالت پر سخت پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ موجودہ صورت حال کو روکا جا سکے۔ بنیادی طور پر ایوب خان ایک عظیم منتظم اور باعمل انسان تھے اور ان کے لیے ملک کی تباہی اور بربادی پر خاموش بیٹھے رہنا ممکن نہ تھا۔ ایوب خان کے ذہن میں اپنے ملک کا ایک خاکہ بن چکا تھا جسے وہ خامیوں کو دور کر کے حقیقت کا روپ دینا چاہتے تھے تاکہ ملک میں معاشی ترقی اور خوشحالی لائی جا سکے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایوب خان بتداء سے ہی اقتدار کے خواہش مند تھے۔

1958ء کے مارشل لاء کی اصلاحات

CMLA بننے کے بعد سب سے پہلے ایوب خان نے سکندر مرزا کو صدارت سے ہٹایا اور اسے انگلستان جلاوطن کر دیا گیا جہاں وہ گمنامی کی زندگی گزارتے ہوئے دنیا سے کوچ کر گئے۔

اقتدار پر پوری طرح قبضہ جمانے کے بعد ایوب خان نے ملکی معاملات کی طرف دھیان دیا کیونکہ اس وقت بے شمار مسائل ملک کو گھیرے ہوئے تھے۔ ملک میں کوئی آئین نہ تھا جس کے ذریعے ملکی معاملات کو خوش اسلوبی سے چلایا جا سکتا۔ ملک میں بالخصوص پنجاب میں پیداوار بڑھانے کی سخت ضرورت تھی جس کے لیے زرعی اصلاحات ضروری تھیں تاکہ جاگیرداروں اور وڈیروں کی اجارہ داری ختم کی جا سکے۔ آزادی کے بعد پاکستان ہجرت کرنے والے مہاجرین انتہائی کسمپرسی اور بے کسی کی حالت میں کراچی میں رہ رہے تھے جن کے لیے معقول رہائش اور روزگار مہیا کرنا اشد ضروری تھا۔ ملک کے تعلیمی اور عدالتی نظام کو مضبوط بنیادوں پر دوبارہ بحال کرنا تھا اور ملک کے لیے نیا دارالخلافہ تعمیر کرنا ایوب خان کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔

ایوب خان نے خارجہ پالیسی کے بارے چند اقدامات اختیار کیے اور پاکستان کو امریکہ کے تسلط سے نکالنے کے لیے اس میں تبدیلیاں کیں۔ ایوب خان فرانس کے صدر جنرل ڈی گال سے بہت متاثر تھے۔ اپنی خارجہ پالیسی اور سفارتی اقدامات کی بدولت وہ مغربی ممالک میں ''ایشین یا مسلم ڈی گال'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

ملکی انتظامیہ کا مکمل کنٹرول سنبھالنے کے بعد ایوب خان نے متعدد کمیٹیاں اور کمیشن قائم کیے جن کے ذمے ملکی حالات کا جائزہ لے کر انتظامی، سیاسی، معاشی اور آئینی اصلاحات کے لیے سفارشات مرتب کرنا تھا۔ پولیس اور بیوروکریسی سے بدعنوان افسران کو نکالنے کے لیے مشینری قائم کی گئی۔ سمگلروں اور ذخیرہ اندوزوں کو پکڑ لیا گیا۔ ایسے کاروباری لوگ جنھوں نے اپنی دولت دوسرے ممالک کو منتقل کردی تھی کو سختی سے اپنا روپیہ پیسہ واپس لانے کے لیے کہا گیا۔ ٹیکس چوروں کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی اور انھیں سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں رکھا ہوا کالا دھن واپس لانے کے لیے مدت دی گئی۔

EBDO ایبڈو

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے ایوب خان ملک کی سیاسی صورت حال کا بغور جائزہ لیتے رہے اور سمجھتے تھے کہ ملک کی موجودہ ابتر حالت کے ذمہ دار بدعنوان سیاست دان ہیں۔ ایوب خان کا یہ خیال تھا کہ اگر بدعنوان سیاست دانوں کو نہ روکا گیا تو مارشل لاء حکومت کے لیے ملکی ترقی کا ہدف حاصل کرنے میں سخت مشکل پیش آئے گی لہٰذا قومی خوش حالی اور ترقی کے لیے یہ ضروری تھا کہ بدعنوان سیاست دانوں کو ملکی سیاست میں حصہ لینے سے کچھ عرصہ کے لیے روک دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دو آرڈیننس جاری کیے جن کے ذریعے بدعنوان سیاست دانوں پر پابندی لگا دی گئی۔

پہلا قانون Public Office Qualification Order

دوسرا قانون Elective Bodies Disqualification Order

ان قوانین کے ذریعے بدعنوان سیاست دانوں کو یہ حق دیا گیا کہ یا تو وہ اپنی بدعنوانیوں کے لیے اس قانون کے تحت عدالت کا سامنا کریں یا پھر چھ سال کے لیے سیاست سے دستبردار ہوجائیں۔ بدعنوان سیاست دانوں کی بڑی تعداد جن میں حسین شہید سہروردی، ممتاز دولتانہ، مخدوم زادہ حسن محمود، ایوب کھوڑو شامل تھے سیاست سے کنارہ کش ہوگئے اور عدالت کے سامنے پیش نہ ہوئے۔ اسی طرح رشوت خور پولیس افسران اور بیوروکریٹس کو نوکریوں سے بے دخل کردیا گیا۔ بدعنوان سیاست دانوں اور افسروں سے نمٹنے کے بعد ایوب خان نے ملک کے دوسرے شعبوں میں اصلاحات نافذ کرنے کے لیے کام شروع کیا۔

معاشی ترقی:

جس وقت مارشل لاء لگایا گیا اس وقت ملک کی معاشی حالت بہت مخدوش تھی۔ بے روزگاری، افراط زر اور ذخیرہ اندوزی جیسے مسائل نے ملک کی معاشی حالت کو تباہ کردیا تھا۔ ایوب خان نے ملک کا انتظام سنبھالتے ہی ملک کی معاشی حالت بہتر بنانے کی طرف توجہ دی۔ اُن کا دورِ حکومت معاشی پالیسیوں اور پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایوب خان نے سب سے زیادہ توجہ صنعت و حرفت کی ترقی پر دی، ملک میں زیادہ سے زیادہ کارخانے لگانے پر زور دیا گیا کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان صنعتی شعبے میں سب سے پیچھے ہے۔ اسی لیے ان کی سیاسی، سماجی اور معاشی پالیسیوں کا محور صنعت و حرفت کا فروغ تھا۔

معاشی اور صنعتی ترقی کی راہ میں بہت ساری رکاوٹیں حائل تھیں جن میں قومی یک جہتی کا نہ ہونا اور مذہب پر بحیثیت مشترکہ طرزِ عمل شامل تھیں۔ ان رکاوٹوں کی وجہ سے سنجیدہ اور مخلص کوششوں کے باوجود معاشی ترقی کا عمل مشکلات کا شکار رہا۔ البتہ ایوب کی معاشی پالیسی کی وجہ سے قومی یکجہتی کا عمل متاثر ہوا اور ملک کے مشرقی حصے کے عوام میں بے چینی پھیلنے کا موجب بنی۔

ان مشکلات کے باوجود ایوب خان اپنی قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے معاشی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو عبور کرنے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے اپنی معاشی پالیسی کے خلاف عوامی ردعمل کی پرواہ نہ کی کیونکہ ان کی حکومت عوامی حمایت یا انتخابی کامیابی کی بنا پر قائم نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا ایوب خان اپنے پکے ارادے اور ملک کی ترقی کی دیرینہ خواہش کی وجہ سے اپنی معاشی پالیسیوں کو نافذ کرنے میں کامیاب رہے اور ملک میں صنعت و حرفت کا وہ نظام قائم کردیا جو شاید ایک جمہوری حکومت جس کی باگ ڈور بڑے زمینداروں یا وڈیروں کے ہاتھ ہوتی نافذ نہ کرسکتی۔

ایوب خان کا دور معاشی خوشحالی کا وقت تھا جو کہ 1950ء کی دہائی کے جامد نظام سے مختلف تھا۔ اس دوران فی کس آمدنی میں خاطر خواہ ترقی ہوئی جو کہ 1950ء کی دہائی میں مفقود تھی۔ زرعی اور صنعتی شعبوں میں خاطر خواہ اور متاثر کن ترقی دیکھنے میں آئی اور GNP کے بڑھنے کی رفتار خاصی تیز تھی۔ پنج سالہ منصوبوں کو بڑی مہارت اور چابکدستی سے تیار کیا جاتا تھا جس سے معاشی ترقی میں تیزی آئی۔ پنج سالہ منصوبوں کی وجہ سے معاشی شعبے میں نظم و ضبط پیدا ہوا اور معاشی شعبے کا انتظام چلانے میں آسانی پیدا ہوئی۔ اکثر پنج سالہ منصوبے مقررہ مدت میں اپنا ہدف حاصل کرلیتے تھے جو معاشی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے میں مددگار ہوتے۔ مالیاتی نظم و ضبط اور بجٹ خسارے پر سخت کنٹرول کی وجہ سے ملک کی معاشی صورتحال میں استحکام پیدا ہوا۔

زرعی اصلاحات:

ایوب خان نے زرعی شعبے کی حالت سدھارنے کے لیے انقلابی اقدامات کیے۔ آزادی کے بعد چند بڑے زمیندار گھرانوں نے اپنی جاگیروں کے بل بوتے پر ملکی سیاست میں اپنا گہرا اثر و رسوخ قائم کرلیا تھا۔ بالخصوص مغربی پاکستان میں بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں نے سیاست میں اپنی اجارہ داری قائم کرلی تھی اور دوسرے سیاست دانوں کے لیے ان گھرانوں کے سیاسی اثر و رسوخ کو ختم کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ زمیندار طبقہ بہت طاقت ور اور بارسوخ ہوگیا تھا اور ملکی سیاست ان کے گرد گھومتی تھی۔ ایک طرف بڑے زمیندار تھے جو ہزاروں ایکڑ اراضی کے مالک تھے اور دوسری طرف غریب کسان تھے جو بڑے زمینداروں کی اراضی پر ہل چلاتے جن کے پاس اپنی معمولی سی اراضی ہوتی تھی۔ چھوٹے کسان بڑے زمینداروں کی زمینوں پر کاشتکاری کرتے تھے جو کہ پیداوار میں حصے داری کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ زمیندار زمین پر ہل نہیں چلاتا تھا اور بڑی شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ زمیندار فصل کی پیداوار کا بڑا حصہ خود لے جاتا تھا۔ جس میں سے اس کے گھریلو اخراجات کے بعد ایک بڑا حصہ بچ جاتا جو وہ اپنی عیاشی اور سیاست کے فضول کاموں پر خرچ کرتا زمیندار کبھی اپنی زمین پر نہ جاتا تھا اور نہ ہی وہ زمین کی پیداوار بڑھانے میں دلچسپی لیتا تھا۔ اسے کاشتکاری کے جدید طریقوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس کا کام علاقے کی سیاست میں اجارہ داری قائم کرنا اور حکومتی اہلکاروں کیساتھ شباب و کباب کی محفلیں سجانا ہوتا تھا۔ اس قسم کے زمینداروں کو Absentee Landlords کہا جاتا تھا جو کہ پاکستان کے سیاسی نظام کے لیے ایک لعنت سمجھے جاتے تھے۔

زمینداروں کی دوسری قسم کرائے دار کاشتکار ہوتے تھے (Tenant Cultivators) ان کے پاس معمولی اراضی ہوتی تھی جس کی پیداوار سے ان کے گھریلو اخراجات بھی پورے نہ ہوتے تھے۔ وہ انتہائی محنت کے باوجود بھی پیداوار بڑھانے کے قابل نہ تھے کیونکہ وہ کاشتکاری کے جدید طریقوں سے ناواقف تھے تیسری قسم ان کاشتکاروں کی تھی جو مزارع (Tenant Cultivators) کہلاتے تھے اور کاشتکاری کے جدید آلات حاصل نہ کرسکتے تھے۔ لہٰذا ان کی حالت قابل رحم تھی جو کہ بڑے زمینداروں کے ظلم و ستم میں پسے ہوئے تھے۔ زمیندار اپنی مرضی سے کسی بھی وقت ان کو زمین سے بے دخل کرسکتا تھا اور کسی دوسرے مزارعے کے حوالے کرسکتا تھا۔

وراثتی تقسیم کی وجہ سے زمین کا چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہونا ہمارے زرعی شعبے کی ایک اور بیماری تھی جو زمین کی پیداواری صلاحیت کو تباہ کر دیتی تھی۔

ایوب خان نے بڑے زمینداروں اور بالخصوص غیر حاضر زمینداروں (Absentee Landlords) کے اثر و رسوخ کو سیاست سے ختم کرنا تھا تاکہ کسانوں اور عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے اکتوبر 1958ء میں گورنر مغربی پاکستان اختر حسین کی سربراہی میں لینڈ کمیشن مقرر کیا۔ لینڈ کمیشن کو یہ ہدایت کی گئی کہ زمین کی ملکیت اور دوسرے معاملات کے متعلق مسائل کا جائزہ لیکر زرعی اصلاحات کے لیے اپنی سفارشات پیش کرے تاکہ زمین کی پیداوار میں حائل رکاوٹوں کو دور کر کے پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔ کمیشن نے تین مہینے کے اندر اپنی رپورٹ صدر کو پیش کر دی۔ ایوب خان نے کمیشن کی رپورٹ ملنے کے بعد تین ہفتے کے اندر مغربی پاکستان کے لیے زرعی اصلاحات کا اعلان کر دیا۔ اصلاحات کی چیدہ چیدہ سفارشات مندرجہ ذیل تھیں۔

-1 کوئی بھی شخص 500 ایکڑ نہری یا 1000 ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ کا مالک نہیں ہوگا۔ موجودہ مالکان پھلوں کی کاشت کے لیے 150 ایکڑ زمین اپنے پاس رکھ سکیں گے اور اپنے عزیز و اقارب کو کچھ زمین بطور تحفہ دے سکیں گے۔ ہر حالت میں کوئی بھی شخص 36000 یونٹ سے زیادہ قابل کاشت یونٹ اپنے پاس نہ رکھ سکے گا۔

-2 وہ زمین جو مالکانہ حقوق سے زیادہ ہوگی اسے حکومت ادائیگی کر کے حاصل کر لے گی۔ زمین کی قیمت بانڈز کی صورت میں ادا کی جائیگی جو 25 سال میں بھنائے جا سکیں گے۔

-3 حاصل کردہ زمین موجودہ مزارعوں (Tenant Cultivators) کو فروخت کی جائے گی۔ اگر وہ زمین نہیں خرید سکتے تو پھر وہ زمین عوام کو فروخت کی جائے گی۔ موجودہ مزارعے زمین کی قیمت آسان اقساط میں ادا کر سکیں گے۔

-4 وہ کاشتکار جن کے پاس زمین کا قبضہ ہوگا زمین کے مالک تصور کیے جائیں گے۔

-5 کاشتکاروں کو مکمل تحفظ مہیا کیا جائے گا اور انہیں زمیندار زمین سے بے دخل نہ کر سکے گا۔

ایوب خان کی زرعی اصلاحات دراصل کاشتکار مزارعوں کو مکمل تحفظ دینے اور ان کی حالت بہتر بنانے کے لیے نافذ کی گئیں۔ ان اصلاحات کے ذریعے حکومت نے ان کو معاشرہ میں بلند مقام دینے کی کوشش کی اور انہیں زمینداروں کے ظالمانہ استحصال سے بچایا تھا۔ اب کوئی زمیندار کسی بھی کاشتکار کو ادائیگی کے بغیر زمین سے بے دخل نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی موجودہ قواعد و ضوابط میں تبدیلی کر سکتا تھا۔

زرعی اصلاحات کے ذریعے زمین کے چھوٹے چھوٹے حصوں کو آپس میں ملانے کی پالیسی اختیار کی گئی جو ایوب حکومت کی زرعی اصلاحات کا سب سے اعلیٰ اور احسن اقدام تھا۔ اس پالیسی کا مقصد زمین کے بکھرے اور ٹوٹے ہوئے حصوں کو آپس میں ملانا تھا تاکہ زمین کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔ اس قانون کی وجہ سے کاشتکار اپنی زمین کے چھوٹے چھوٹے اور بکھرے ہوئے حصوں کو اس زمین سے بدل سکتے تھے جو ان کی زمین سے جڑی ہوئی تھی۔

ایوب خان کی حکومت نے پاکستان کے آبپاشی نظام کو بہتر کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں آبپاشی کے نظام کو نئے سرے سے تشکیل دیا جس کے لیے لمبی مدت کے لیے سرمایہ کاری کا پروگرام نافذ کیا گیا۔ 1959ء میں بھارت کے ساتھ مشہور سندھ طاس کا منصوبہ طے پایا جس کی رو سے بھارت نے 10 سال تک پاکستان کے لیے بغیر کسی رکاوٹ کے پانی کی مسلسل ترسیل کی یقین دہانی کرائی۔ بھارت نے پاکستان کو اپنا آبپاشی نظام تعمیر کرنے کے لیے Compensation Money ادا کی۔ اس عرصے کے دوران پاکستان نے عالمی بنک کے تعاون اور بھارت سے ملنے والی رقم سے اپنے ڈیم تعمیر کرنے شروع کیے۔ پاکستان نے اپنے دوست ممالک کے تعاون اور عالمی بنک کی مدد سے تین بڑے ڈیم، منگلا ڈیم، وارسک ڈیم اور تربیلا ڈیم تعمیر کیے جن کی وجہ سے آبپاشی کے نظام کو مضبوط اور بہتر بنانے میں بہت مدد ملی۔

پانی کی سپلائی کو بڑھانے اور کمی کو دور کرنے کے لیے حکومت نے ٹیوب ویل لگانے کا منصوبہ مرتب کیا۔ اس مقصد کے لیے حکومت نے زرعی علاقوں میں بجلی مہیا کی اور کسانوں کو ٹیوب ویل لگانے کے لیے آسان شرائط پر قرضے دیے گئے۔

پاکستان میں قابل کاشت زمین کا بہت بڑا حصہ سیم وتھور کی وجہ سے ناکارہ ہو جاتا تھا۔ سیم وتھور کو زمین کے کینسر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ بیماری زمین کی پیداوار کے لیے بہت بڑا خطرہ تھی۔ اس بیماری کو ختم کرنے اور زمین کو قابل کاشت بنانے کے لیے حکومت نے سیم وتھور کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک پروگرام مرتب کیا جسے SCARP کہا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے ذریعے سیم و تھور زدہ زمین پر ٹیوب ویل لگائے گئے جو زمین کے اندر ٹھہرے ہوئے پانی کو باہر کھینچ لیتے تھے۔

زرعی شعبے کی ترقی کے لیے ایوب حکومت نے جو بہت ضروری اور اہم کام کیا وہ کاشتکاری کے لیے جدید آلات اور فنی علم کا حصول تھا۔ زمین پر ہل چلانے کے لیے انجن سے چلنے والی مشینری متعارف کی گئی، ہل چلانے کے لیے جانور یا بیل کی جگہ ٹریکٹر نے لے لی۔ کسانوں کو کاشتکاری سے متعلق جدید تعلیم سے آراستہ کیا گیا اور انہیں کاشتکاری کے جدید اصولوں اور تقاضوں سے روشناس کرایا گیا۔ کاشتکاری کے لیے جدید آلات خریدنے کے لیے کسانوں کو آسان اقساط پر قرضے دیئے گئے۔ حکومت نے قرضوں کے حصول اور دیہات میں کاشتکاری کے لیے مالی معاونت کے لیے مالی ادارے قائم کیے جن میں زرعی ترقیاتی کارپوریشن اور زرعی بنک شامل ہیں۔ ان دونوں اداروں کو بعد میں زرعی ترقیاتی بنک میں مدغم کر دیا گیا۔

سبز انقلاب:

ایوب خان کی زرعی اصلاحات اور زرعی شعبے کی ترقی کے لیے کیے گئے اقدامات کی وجہ سے زرعی شعبے میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ آبپاشی کے نظام میں ترقی، کاشتکاری کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا حصول، سیم وتھور پر کنٹرول اور ٹیوب ویلوں کی تنصیب کی بدولت زمین کی پیداواری صلاحیت دوگنا ہوگئی۔ زرعی پیداوار کی وجہ سے ملک کی معاشی حالت بہتر ہوئی اور معاشی ترقی میں اضافہ ہوا۔ ایوب کی زرعی اصلاحات اور متعدد دوسرے اقدامات کی وجہ سے زرعی شعبہ میں جو تبدیلی آئی اور پیداوار میں اضافہ ہوا اسے سبز انقلاب Green Revolution کہا جاتا ہے۔

صنعتی انقلاب:

صنعتی ترقی کا دارومدار چند عوامل پر ہوتا ہے جن میں افرادی قوت، معقول حد تک سرمایہ کاری، خام مال اور خوراک، مضبوط زرعی شعبہ، صنعتی پیداوار کا حصول اور اسے پھیلانے کے لیے وسیع منڈی، سکول و کالج، ہسپتال اور ایک ہموار اور رواں نقل وحمل کا نظام شامل ہیں۔ یہ تمام سہولتیں ان علاقوں میں موجود ہونی چاہیں جہاں صنعت وحرفت کا نظام قائم کیا جانا ہو۔ اس کے علاوہ مستعد انتظامی شعبہ، تاجروں اور پرچون فروشوں کی بڑی تعداد میں موجودگی ضروری ہے جو فوری طور پر صنعتی پیداوار کو اٹھا کر تقسیم کرنے کے اہل ہوں۔ ان تمام سہولتوں کے علاوہ ایک مضبوط سیاسی نظام کا ہونا بہت ضروری ہے جو عوامی سرمایہ کار کو صنعت میں روپیہ لگانے پر مائل کر سکے۔

تقسیم کے وقت پاکستان کے موجودہ علاقے برطانوی حکومت کی پالیسی کی وجہ سے معاشی ترقی میں پسماندہ تھے۔ تمام کارخانے اور فیکٹریاں ہندوستانی علاقوں میں قائم کی گئیں تھیں۔ ذرائع رسل و رسائل انتہائی ناقص تھے اور سڑکیں ناہموار تھیں۔ زرعی شعبہ مالی مشکلات کی وجہ سے غیر ترقی پذیر تھا۔ ان خامیوں کی وجہ سے پاکستان کا صنعتی شعبہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

ان رکاوٹوں کو دور کرنے اور صنعتی شعبے کی ترقی کو تیز کرنے کے لیے ایوب حکومت نے کئی معیشت سے متعلق پابندیاں ہٹائیں۔ مارکیٹ کی طرف رخ کرنے کی وجہ سے قیمتوں کے کنٹرول کو اٹھانے میں مدد ملی۔ صنعتی اشیاء کی قیمتوں میں پالیسی کے تحت استحکام پیدا کیا گیا جس کی وجہ سے صنعت میں سرمایہ کاری کو فروغ حاصل ہوا۔ حکومت نے سرمایہ پر تمام پابندیاں جو 1950ء کی دہائی کے دوران لگائی گئی تھیں ختم کر دیں جس کی وجہ سے تاجروں، صنعتکاروں اور زمینداروں میں سرمایہ کاری کا رجحان ہوا۔ ان اقدامات کی وجہ سے 1958-63ء کے دوران پاکستان کی صنعتی پیداوار انتہائی متاثر کن رہی۔

سرمایہ کاری کا طریق کار آسان اور سادہ بنایا گیا اور درآمد و برآمد پر عائد پابندیاں نرم کر دی گئیں۔ بہت ساری اشیاء کو فری لسٹ میں شامل کیا گیا جن کی درآمد کے لیے کسی لائسنس کی ضرورت نہ تھی۔ ان اقدامات کا مقصد زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ کمانا تھا۔ 10 جنوری 1959ء کو برآمدات کے فروغ کے لیے بونس واؤچر سکیم کا اجرا کیا گیا۔ اس سکیم کے تحت ان تاجروں کو درآمدی لائسنس دیے جاتے تھے جو خام مال اور تیارشدہ اشیاء کو برآمد کرتے تھے۔ یہ بونس واؤچر منافع پر فروخت بھی کیے جاسکتے تھے اور باہر سے اشیاء منگوانے کے لیے بھی استعمال ہو سکتے تھے۔

اسی عرصے کے دوران صنعتی شعبے میں سرمایہ کاری کے فروغ کے لیے اقدامات کیے گئے۔ نئی صنعتوں کو ٹیکس میں چھوٹ دی گئی۔ 1951ء میں PIDC قائم کی گئی جو صنعتی ترقی کے لیے راہنمائی کرتی تھی۔ بچت سکیموں کا اجرا کیا گیا۔

مقامی مارکیٹ کو اکٹھا کر دیا گیا تاکہ تیار شدہ اشیاء آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکیں۔ شاہی ریاستوں کو توڑ دیا گیا اور حکومت کے زیر اثر کر دیا گیا۔ پاکستان، ایران اور ترکی کے درمیان RCD کا معاہدہ کیا گیا جو علاقائی معاشی ترقی کے لیے معرض وجود میں لایا گیا۔

حکومت نے بھاری صنعت کے قیام اور فروغ میں بہت دلچسپی لی اور لوہے کے کارخانے، کاریں بنانے کے کارخانے، مشینی پرزے اور پیٹروکیمیکل بنانے کے لیے کارخانے قائم کیے۔

آئینی و سیاسی اصلاحات:

جب ایوب خان نے اقتدار سنبھالا تو ملک میں سیاسی ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ سیاستدان اقتدار کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے۔ ان حالات کی وجہ سے ایوب خان اس بات کے قائل تھے کہ ملکی سیاسی نظام کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ اور ان کے فوجی رفقاء کار یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے لیے پارلیمانی نظام ناموزوں ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ پارلیمانی نظام بدعنوان اور نااہل سیاست دانوں کو اقتدار پر بٹھا دیتا ہے جس سے ملکی حالات خراب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایوب خان نے اپنی ایک ریڈیو تقریر میں پارلیمانی نظام پر سخت تنقید کی اور اسے پاکستان کے لیے بالکل ناموزوں قرار دیا۔ ایوب خان کے مطابق پارلیمانی نظام یورپ کے ٹھنڈے ممالک کے لیے زیادہ موزوں تھا جہاں پر لوگوں کا مزاج ٹھنڈا اور دھیما ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پارلیمانی نظام صرف برطانیہ اور سکینڈے نیوین ممالک میں کامیابی سے چل سکا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کسی اور ملک میں قدم نہیں جما سکا۔ ان کے مطابق ہمیں پارلیمانی نظام سے جڑے نہیں رہنا چاہیے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا نظام آزمانا چاہیے۔

ایوب خان درحقیقت کوئی ایسا نظام رائج کرنا چاہتے تھے جو سادہ اور آسان ہو اور پاکستان کے عوام کی سمجھ بوجھ کے مطابق ہو۔ وہ اور ان کے فوجی رفقاء اس بات کے قائل تھے کہ معاشی ترقی کے لیے سیاسی ڈھانچے کو مکمل طور پر بدلنا ضروری ہے۔ ان کے خیال میں اگر کوئی معاشرہ غریب اور امیر طبقوں میں بٹا ہو تو وہاں پر معاشی ترقی کا حصول ناممکن ہوتا ہے۔

ایوب خان نے پاکستان کے سیاسی نظام کے بارے اپنے خیالات و تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ''محدود جمہوریت'' (Controlled Democracy) کا نظام متعارف کروایا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ نظام عوام کی سمجھ اور سوچ کے مطابق بڑی خوش اسلوبی سے چلے گا۔ پہلے مرحلے میں ایوب خان نے 1959ء میں بنیادی جمہوریت کا قانون نافذ کیا۔ بنیادی جمہوریتیں چار درجات میں منقسم تھیں اور انہیں ملک کے مخصوص حالات کے پیش نظر وضع کیا گیا تھا تاکہ انتظامی عمل کو نتیجہ خیز بنا کے جڑ سے جمہوریت نافذ کی جاسکے۔

بنیادی جمہوریت:

بنیادی جمہوریت ایک انوکھا نظام تھا جسے ایوب خان نے اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے وضع کیا تھا۔ بنیادی جمہوریت کا نظام جسے بی ڈی سسٹم (BD System) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، بنیادی جمہوریت آرڈیننس 1959ء کے ذریعے نافذ کیا گیا۔ اس نظام کے تحت عوام کو فیصلہ سازی کے مختلف مراحل میں شامل کیا گیا۔

ایوب خان نے مقامی حکومت کے نظام کو نچلی سطح سے قائم کرنے کے لیے بنیادی جمہوریت (Basic Democracy) کا نظام متعارف کروایا۔ اس نظام کا بنیادی مقصد اور خیال عوام کو ان منصوبوں میں شامل کرنا تھا جو حکومت عوام کی سہولت اور فائدہ کے لیے وقتاً فوقتاً شروع کرتی رہتی ہے۔ اس کا مقصد جماعتی سیاست سے پاک سیاسی نظام قائم کرنا بھی تھا تاکہ حکومت اور عوام مل کر بنیادی سطح سے عوام کی ترقی و خوشحالی کے لیے کام کرسکیں۔ بنیادی جمہوریت کا نظام عوام کو اپنی خوشحالی اور ترقی کے لیے کام کرنے کے مواقع فراہم کرتا تھا۔

بنیادی جمہوریت کا ڈھانچہ:

بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے مقامی حکومت کا پانچ درجاتی مخروط نما ڈھانچہ قائم کیا گیا جو کہ یوں تھا۔

(1) یونین کونسلز (2) تھانہ کونسلز

(3) ڈسٹرکٹ کونسلز (4) ڈویژنل کونسلز

(5) مشاورتی کونسلز

بنیادی سطح پر سب سے اہم یونین کونسلز اور ٹاؤن کمیٹی کا مرحلہ تھا جو کہ مختلف گاؤں کے گروپ جن کی آبادی 10,000 تھی کے لیے تھا۔ ہر یونین کونسل میں 10 براہ راست منتخب اور پانچ نامزد اراکین ہوتے تھے جنہیں بی ڈی ممبرز (Basic Democrats) کہا جاتا تھا۔ یونین کونسلز کا کام زراعت کی ترقی، عوامی فلاح و بہبود اور امن وامان بحال رکھنا تھا۔ یونین کونسلز مقامی سطح پر مختلف منصوبوں کے لیے نئے ٹیکس لگا سکتیں تھی۔ یونین کونسلز ڈپٹی کمشنر کے ماتحت کام کرتی تھیں۔

اس سے اگلا مرحلہ تحصیل یا تھانہ کونسل تھا جو تحصیل کے انتظامی امور میں نظم وضبط پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس سے اوپر ضلع کونسل جو ڈپٹی کمشنر کی سرکردگی میں کام کرتی تھی۔ ضلع کونسلز میں نامزد اراکین اور غیر سرکاری اہل کار شامل ہوتے تھے جن میں یونین کونسلز کے صدر بھی شامل ہوتے تھے۔ ضلع کونسلز کے ذمہ ضروری اور اختیاری کام ہوتے تھے جن میں تعلیم، مقامی کلچر، حفظان صحت اور سماجی بہبود کا فروغ شامل ہوتا تھا۔ ان کے اوپر تحصیل مشاورتی کونسلز تھیں جو حکومت کے نمائندوں سے مل کر بنیادی اداروں کے کاموں میں نظم وضبط رکھتی تھیں۔ سب سے اوپر مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے علیحدہ علیحدہ ترقیاتی مشاورتی کونسلز ہوتی تھیں جو صوبائی گورنر

کی صدارت میں کام کرتی تھیں جسے صدر مقرر کرتا تھا۔ شہری علاقوں میں بھی اسی طرح کا ڈھانچہ کام کرتا تھا جس کے تحت چھوٹی یونین کونسلز کو ایک گروپ میں مدغم کر دیا گیا تھا جنہیں میونسپل کمیٹی کہا جاتا تھا۔

بنیادی جمہوریتوں کے فرائض

انتظامی فرائض:

انتظامی لحاظ سے بنیادی جمہوریتوں کا مقصد عوام اور حکومت کے اہل کاروں کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون پیدا کرنا، انتظامی شعبوں میں مرکزیت کو ختم کر کے جوابدہی اور احتساب کا نظام پیدا کرنا اور حکومت کے مختلف محکموں اور مراحل میں رابطہ و ضبط پیدا کرنا تھا۔

ترقیاتی فرائض:

بنیادی جمہوریتوں کا مقصد ترقیاتی منصوبہ بندی میں مرکزیت کو ختم کر کے ترقیاتی کاموں پر عمل درآمد کرنا تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کا بنیادی تعلق حکومت کی مختلف ترقیاتی سکیموں کی منصوبہ بندی کر کے ان پر عمل درآمد کرنا ہوتا تھا۔ تمام محکموں کی نئی سکیموں پر ڈسٹرکٹ کونسل اور ڈویژنل کونسلز میں مکمل بحث کی جاتی تھی۔

مقامی حکومت کے فرائض:

ان فرائض کے تحت بنیادی جمہوریتیں عوام کے مقامی سطح پر پیدا ہونے والے مسائل کا ازالہ کرتیں تھیں اور مقامی سطح پر عوام کے لیے بنیادی سہولتوں کے حصول کو ممکن بناتی تھیں۔

آئینی فرائض:

بنیادی جمہوریتوں کا ایک اہم فرض صدر اور صوبائی و قومی اسمبلی کے ارکان کا انتخاب کرنا ہوتا تھا یونین کونسلز کمیٹی کے اراکین جنہیں Basic Democrats کہا جاتا تھا صدر اور اسمبلیوں کے انتخابات کے لیے "انتخابی ادارہ" (Electoral College) کا کام کرتے تھے۔

آئینی تبدیلی/اصلاحات

1962ء کا آئین:

17 اکتوبر 1960ء کو ایوب خان نے جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن قائم کیا جس کے ذمے ملک کے لیے نیا آئین تیار کرنا تھا۔ کمیشن نے 6 مئی 1961ء کو اپنی رپورٹ ایوب خان کو پیش کی۔ کمیشن کی رپورٹ کو مزید چھان بین کے لیے ایک کمیٹی کے حوالے کیا گیا۔ کمیٹی نے آئین کے مسودے کی منظوری دی جسے ایوب خان نے یکم مارچ 1962ء کو نافذ کر دیا۔

1962ء کا آئین ایوب خان کی پاکستان کے سیاسی، معاشی اور سماجی ڈھانچے سے متعلق ذاتی سوچ پر مبنی تھا۔ ایوب خان کا کہنا تھا کہ میں پاکستان کے بارے اپنے تجربے اور تجزیے کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستان کو ایک ایسی مضبوط اور مستحکم حکومت کی ضرورت ہے جو بے شک عوام میں مقبول نہ ہو لیکن ملک کی ترقی سالمیت اور یک جہتی کو فروغ دینے کی اہلیت رکھتی ہو۔ ایوب خان نے کہا کہ ہم کسی ایسے نظام کے متحمل نہیں ہو سکتے جسے پریشر گروپس آسانی سے دبا سکیں۔ 8 جون 1962ء کو ایوب خان نے

قومی اسمبلی کا افتتاح کرتے ہو کہا ''آج جو آئین نافذ العمل ہورہا ہے وہ میری سیاسی سوچ اور ملک کے موجودہ حالات کے مطابق ہے۔ جسے کام کرنے کا ایک موقع ملنا چاہیے۔''

1962ء کے آئین کی رو سے ملک میں صدارتی نظام قائم کیا گیا تھا اس آئین کے ذریعے انتظامی اور قانون سازی کے شعبوں میں صدر کو بے پناہ اختیارات حاصل ہوگئے۔ صدر آسانی سے پارلیمنٹ پر اثر انداز ہوسکتا تھا اور اسے غالب حیثیت حاصل تھی۔ صوبائی اسمبلیاں اور حکومتیں صدر کی ذاتی غلام تھیں۔ قومی اسمبلی کے پاس قانون سازی اور مالی اختیارات محدود تھے۔ 1962ء کے آئین کے ذریعے صدر اور اسمبلیوں کے انتخابات بالواسطہ ہوتے جن پر آسانی سے اثر انداز ہوا جاسکتا تھا۔

سماجی اصلاحات:

اقتدار سنبھالتے وقت ایوب خان نے یہ تہیہ کیا تھا کہ وہ پاکستان میں معاشی اور سماجی انقلاب لائیں گے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سماجی، سیاسی اور معاشی اصلاحات کا پروگرام ترتیب دیا تھا تاکہ پاکستان کو ہر شعبے میں خودکفیل بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکے۔ ایوب خان کھلے دل و دماغ کے آدمی تھے اور پرانے خیالات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی خوبی کی بنا پر ایوب خان پاکستان میں سماجی تبدیلی کے پروگرام کو نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہوئے۔

پاکستان میں خواتین کو برابر کے مواقع نہیں ملتے تھے اور ان کو ملازمت کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ کافی سے زیادہ افرادی قوت ضائع ہوجاتی تھی جس کا پاکستان جیسا پسماندہ ملک متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ خواتین کو کم تر حیثیت سمجھا جاتا تھا جس کی وجہ سے خواتین کی سماجی حیثیت میں کمی آتی تھی۔ ایوب خان خواتین کے ساتھ کیے جانے والے امتیازی سلوک کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے قوانین نافذ کیے۔

ایوب خان نے اس مقصد کے لیے فیملی قوانین نافذ کیے جن کے پاکستانی معاشرے پر گہرے اثرات مرتسم ہوئے۔ ایوب خان نے 1961ء میں فیملی لاء آرڈی ننس جاری کیا جس کی رو سے طلاق اور شادیوں کی تعداد کا طریقہ وضع کیا گیا۔ کثرت ازدواج پر پابندی لگا دی گئی اور صرف مخصوص حالات کے تحت اس کی اجازت تھی۔ اس قانون کی رو سے دوسری شادی کرنے کے لیے مرد کو پہلی بیوی سے تحریری اجازت لینا پڑتی تھی۔

فیملی لاز کی رو سے شادی کے لیے مرد اور عورت کے لیے کم از کم عمر کا تعین کردیا گیا۔ طلاق یافتہ عورت اور اس کے بچوں کے لیے مرد کو مالی امداد دینے کا پابند بنایا گیا۔ اس قانون کے بعد تمام شادیاں حکومت کے کاغذات میں درج کی جاتیں تھیں۔ طلاق کے قوانین کو سخت تر کردیا گیا۔ جو مرد اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے گا اسے اس سے پہلے یونین کونسل کے صلح کے لیے وضع کردہ عمل سے گزرنا پڑے گا۔ فیملی قوانین کا مقصد عورت کو تحفظ دینا اور مرد کی برتر حیثیت کم کرنا تھا۔

جیسا کہ توقع تھی ایوب کے فیملی لاز کے خلاف راسخ العقیدہ مذہبی افراد اور تنظیموں نے سخت واویلا مچایا۔ ان کے مطابق ایوب کے فیملی لاز اسلام کی روح کے منافی تھے۔ جماعت اسلامی ان قوانین کی مخالفت میں سب سے آگے تھی۔

فیملی لاز نے قانون وراثت کو بدل دیا۔ قانون وراثت کی رو سے پوتا اپنے دادا کی جائیداد کا حق دار نہیں سمجھا جاتا تھا اگر اس کا والد اپنے والد کی زندگی کے دوران فوت ہوجاتا تھا۔ ایوب کی اصلاحات نے ان بچوں کو دادا کی جائیداد میں برابر کے حقوق دیئے جن کے والد اپنے والد کے زندہ رہتے ہوئے فوت ہوگئے تھے۔

قانونی اصلاحات:

ایوب خان کی مارشل لاء حکومت نے دسمبر 1959ء میں قانونی کمیشن قائم کیا جس کا مقصد برطانوی دور کے قوانین میں بہتری کے لیے سفارشات دینا تھا۔ کمیشن نے پاکستان کے قانونی ڈھانچہ کو دوبارہ سے تیار کرنے کے لیے بہت ساری سفارشات پیش کیں۔ ان سفارشات کا مقصد عوام کے لیے فوری اور سستے انصاف کا حصول تھا۔ دس عدد آرڈی ننس جاری کیے گئے جن کا مقصد ملک کے قانونی ڈھانچہ میں جدت پیدا کرنا تھا۔ سی پی سی میں ضروری ترامیم کی گئیں۔ تفتیش کے طریقہ کو سادہ بنایا گیا۔ مقامی سطح پر پیدا ہونے والے جھگڑے یونین کونسلز کے حوالے کیے جاتے تھے جو ان کا باہمی رضامندی سے تصفیہ کراتے تھے۔ ایسے جھگڑے جن میں کوئی گواہی نہ ہوتی تھی تصفیہ کے لیے جرگہ کے سپرد کردیئے جاتے تھے۔ ایسے جھگڑے جن میں ملزم کی دماغی حالت درست نہ ہوتی یا جو پہلی دفعہ مقدمے میں ملوث ہوتے انہیں وقتی طور پر موخر کردیا جاتا۔

خاندانی منصوبہ بندی:

ایوب خان کی حکومت نے پاکستان کی بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لیے ایک پروگرام تشکیل دیا جسے ''خاندانی منصوبہ بندی'' کہا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے لیے امریکہ نے مالی امداد دی۔

خاندانی منصوبہ بندی دراصل معاشی ترقی کا پروگرام تھا جس کا مقصد معیشت سے آبادی کا دباؤ کم کرنے کے لیے بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا تھا۔ یہ سکیم دراصل اس خیال پر قائم کی گئی کہ چونکہ عوام کی زیادہ تعداد اپنی لاعلمی کی وجہ سے ایک بڑے خاندان کی معاشی مشکلات سے ناواقف ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے معاشی وسائل کے مطابق ایک مثالی خاندان کی منصوبہ بندی نہیں کرسکتے۔ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے بنانے والے اس بات سے واقف تھے کہ عوام پیدائش کی منصوبہ بندی کرنے اور اسے روکنے کے طریقوں سے ناواقف تھے۔ خاندانی منصوبہ بندی سکیم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عوام کو ان طریقوں سے روشناس کرایا جائے جن کے ذریعے پیدائش کے عمل کو تیز ہونے سے روکا جاسکے اور خاندان کو معاشی وسائل کے مطابق رکھا جاسکے۔

اس مقصد کے لیے حکومت نے جدید معلومات سے پورا فائدہ اٹھایا اور عوام کو بہ تفصیل معلومات فراہم کی گئیں۔ خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق اشتہارات، ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے عوام کو معلومات دی جاتی تھیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے مراکز قائم کیے گئے جہاں ہر وقت ڈاکٹر اور ادویات میسر ہوتی تھیں۔ یہ مراکز میاں اور بیوی کو پیدائش پر کنٹرول کرنے کے طریقوں اور ادویات کے استعمال سے متعلق معلومات دیتے تھے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا محکمہ قائم کیا گیا جو اس سے متعلق تمام کاموں پر نظر رکھتا تھا۔

ایوب خان کے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو معاشرے کے مختلف طبقوں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ بالخصوص راسخ العقیدہ مسلمان اور مذہبی طبقے اس پروگرام کے شدید مخالف تھے۔

خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام اپنے مقاصد میں ناکام رہا۔ یہ پروگرام تشکیل دینے والے عوام کے رجحانات سمجھنے سے قاصر رہے تھے۔ انہوں نے معاشی ترقی کے لیے خاندان کے سائز کو عوام کے خیالات سے یکسر مختلف سمجھا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کی بدولت عوام میں پیدائش کو کنٹرول کرنے کے بارے میں نئی تجاویز اور طریقوں سے آگاہی ہوئی۔ چونکہ یہ پروگرام پاکستان کے مذہبی و سماجی اقدار کے مطابق نہیں تھا اس لیے یہ اپنے مقررکردہ اہداف حاصل نہ کرسکا۔

پناہ گزینوں کی بحالی:

آزادی کے بعد ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی بہت بڑی تعداد آباد نہ ہوسکی تھی۔ حکومت نے پناہ گزینوں کی بحالی کے لیے متعدد اقدامات کیے تھے لیکن آزادی کے گیارہ سال بعد بھی پناہ گزینوں کی بہت بڑی تعداد کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہی تھی۔

ایوب خان نے جنرل محمد اعظم خان کو وزیر بحالیات مقرر کیا جن کے ذمے پناہ گزینوں کی بحالی کا کام تھا۔ جنرل اعظم اعلیٰ درجے کے منتظم تھے جنہوں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور ایک سپاہی کی طرح پناہ گزینوں کی بحالی کے مشکل کام کو احسن طریقے سے بخوبی تکمیل کیا۔

نیا دارالخلافہ:

ایوب خان کراچی کی آب و ہوا اور لوگوں کے رویہ کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کو کسی دوسری جگہ سے کنٹرول کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ایوب خان اپنی حکومت کے تحفظ کی خاطر فوجی مرکز کے قریب تر رہنا چاہتے تھے۔ انہیں ہر وقت یہ احساس رہتا تھا کہ جس طرح انہوں نے فوجی سربراہ ہوتے ہوئے خود زبردستی اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا اسی طرح کوئی دوسرا سینئر فوجی سربراہ بھی قبضہ کرسکتا تھا۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ وہ راولپنڈی میں جی ایچ کیو کے قریب تر رہیں تاکہ وہ کسی دوسرے فوجی جرنیل کو حکومت پر قبضہ کرنے سے روک سکیں۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ پاکستان کے لیے نیا دارالخلافہ تعمیر کیا جانا چاہیے۔ دارالخلافہ کے لیے وفاقی کمیشن نے بھی یہ رائے دی کہ ملک کا دارالخلافہ کراچی سے دور ہونا چاہیے اور اس کے لیے راولپنڈی کے قریب سطح مرتفع پوٹھوہار کا علاقہ تجویز کیا گیا۔ یہ تجویز ایوب خان کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ لہٰذا انہوں نے یہ حکم دیا کہ حکومت کے محکمے فوری طور پر راولپنڈی منتقل ہوجائیں۔ اس کے لیے انہوں نے دارالخلافہ کی تعمیر کا بھی انتظار نہ کیا۔

جون 1959ء میں حکومت کے محکمے راولپنڈی منتقل ہونا شروع ہوگئے کیونکہ راولپنڈی کو عارضی دارالخلافہ بنا دیا گیا تھا۔ فروری 1960ء میں اسلام آباد کے نام سے پاکستان کے نئے دارالخلافہ کی تعمیر شروع ہوئی۔

تعلیمی اصلاحات:

فوجی حکومت نے دسمبر 1958ء میں قومی تعلیمی پالیسی وضع کرنے کے لیے کمیشن قائم کیا۔ اس کے ذمے برطانوی حکمرانوں کے وضع کردہ تعلیمی نظام پر نظرثانی کرکے نئی اصلاحات کے لیے تجاویز دینا تھا۔

تعلیمی کمیشن نے تمام سطحوں پر نصاب کی نئے سرے سے تشکیل کا مشورہ دیا اور آٹھویں جماعت تک مفت اور لازمی تعلیم کی سفارش کی۔ کمیشن نے یہ مشورہ بھی دیا کہ انٹرمیڈیٹ کلاسز کو کالج ایجوکیشن سے علیحدہ کردیا جائے اور اسے سیکنڈری ایجوکیشن سے ملا دیا جائے۔ کمیشن نے 3 سالہ ڈگری کورس کی سفارش کی اور فنی اور مذہبی تعلیم پر زور دیا۔ کمیشن نے انگریزی کی جگہ اردو کو ذریعہء تعلیم بنانے کی سفارش کی۔

ان تجاویز کو فوری طور پر نافذ کردیا گیا۔ ماہانہ امتحان کے ساتھ تین سالہ ڈگری کورس متعارف کروایا گیا۔ ایوب کی تعلیمی اصلاحات تباہی پر منتج ہوئیں اور ایوب کے زوال کا ذریعہ بنیں۔ طلبا نے تین سالہ ڈگری کورس پر شدید احتجاج کیا جس کی بنا پر حکومت نے یہ تجویز واپس لے لی۔

پاک بھارت جنگ 1965ء:

پاکستان اور بھارت کے درمیان لڑی جانے والی 1965 کی جنگ ایوب خان کے دور حکومت کا سب سے اہم واقعہ ہے۔

1963-65ء کے درمیان کشمیر کے حالات بدتر ہو گئے تھے اور ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں پر فوجی جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ ہندوستان نے مغربی ممالک سے چین سے جنگ ہارنے کے بعد بھاری اسلحہ حاصل کر لیا تھا جس کی وجہ سے علاقے میں طاقت کا توازن بہت حد تک بھارت کے حق میں ہو گیا تھا۔ پاکستان نے مغربی اسلحہ کی وجہ سے طاقت کے توازن بگڑنے پر احتجاج کیا تھا اور اسے علاقے کے امن کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا تھا۔ اسی دوران 27 دسمبر 1963ء کو حضرت بل کی درگاہ سے رسالت مآب ﷺ کا موئے مبارک چرا لیا گیا جس کی وجہ سے کشمیر کے مسلمانوں کے اندر سخت بے چینی پیدا ہوئی۔

4 اپریل 1965ء کو ہندوستانی فوج نے ڈنگ میں پاکستانی چوکی پر قبضہ کر لیا۔ یہ چوکی رن آف کچھ کے علاقے میں واقع تھی جو دونوں ممالک کے درمیان واقع ہے۔ پاکستان نے اپنی چوکی خالی کرانے کے لیے اپنی فوجوں کو بھیجا۔ جولائی 1965ء میں رن آف کچھ کے علاقے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان شدید جنگ لڑی گئی جس میں پاکستان نے ہندوستانی فوجوں سے اپنی چوکی خالی کرالی۔ دونوں ممالک کے درمیان سیز فائر کے ذریعے جنگ بندی ہوگئی۔

رن آف کچھ کی فائر بندی سے دونوں ممالک کے درمیان تناؤ میں کمی نہ ہوئی اور کشمیر میں فائر بندی کی حدود کی کھلے عام خلاف ورزی ہوتی رہی۔ کشمیری مجاہدین کی بڑی تعداد سرحد پار کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوگئی جس کی وجہ سے کھچاؤ میں شدید اضافہ ہو گیا۔ خفیہ طور پر داخل ہونے والوں نے ریاست کشمیر میں توڑ پھوڑ کی اور ہندوستانی فوج کو بھاری نقصان پہنچایا۔ اس کام میں انہیں ریاست کشمیر کے عوام کی مدد بھی حاصل تھی جس کی وجہ سے ریاست کا امن و سکون بری طرح متاثر ہوا۔ ہندوستانی فوجیں جوابی کارروائی کرتے ہوئے فائر بندی کی حد کو پار کر کے پاکستانی علاقے میں داخل ہوگئیں اور کارگل کی دو چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ اگست 1965ء میں ہندوستانی فوجوں نے حاجی پیر اور ٹیٹوال پر قبضہ کر لیا جو کہ انتہائی حساس علاقے میں واقع تھے۔ اس قبضے کے بعد ہندوستانی فوج اکھنور، چھمب سیکٹر میں پیش قدمی کرتی ہوئی پاکستانی علاقوں پر حملہ آور ہوئی۔

پاکستانی فوجوں نے بڑی بہادری سے ہندوستانی فوجوں کا مقابلہ کیا اور تیزی سے ہندوستانی علاقے کی طرف پیش قدمی کی۔ پاکستانی فوجوں کی برق رفتار پیش قدمی کو روکنے کے لیے ہندوستان نے 6 ستمبر 1965ء کو تین اطراف سے پنجاب پر ایک بڑا حملہ کیا۔ ہندوستانی حملے کا زور شہر لاہور پر بہت زیادہ تھا۔ لاہور، واہگہ سرحد پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان شدید جنگ ہوئی جو سترہ دن تک جاری رہی۔ بالآخر 23 ستمبر 1965ء کو جنگ ختم ہوگئی جب ہندوستان اور پاکستان نے 20 ستمبر 1965ء کو سیکورٹی کونسل کی منظور کردہ قرارداد کے مطابق فائر بندی منظور کر لی۔

معاہدہ تاشقند:

جنوری 1966ء میں صدر ایوب خان اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری، روسی وزیراعظم کوسیجن کی دعوت پر تاشقند گئے ایک ہفتے کی گفت و شنید کے بعد جس میں کوسیجن نے بھی حصہ لیا ایوب خان اور لال بہادر شاستری کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ کوسیجن نے بڑی سختی سے معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے ایوب خان پر دباؤ ڈالا۔ ایوب خان اور لال بہادر شاستری نے وعدہ کیا کہ وہ جنگ سے گریز کریں گے اور اپنے مسائل اور جھگڑے پرامن گفت و شنید سے حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاشقند معاہدے کی رو سے دونوں ممالک اپنی فوجوں کو 5 اگست 1965ء والی جگہ پر لانے پر متفق ہو گئے۔

ایوب خان کا زوال:

جس تیزی سے ایوب خان اقتدار پر قابض ہوئے اسی طرح ان کا زوال بھی سرعت سے ہوا اور وہ اپنی اعلیٰ حیثیت سے یک دم پستی میں گر گئے۔ ایوب خان کی آمرانہ پالیسیوں کے خلاف عوامی تحریک پیدا ہوئی جس نے ایوب خان کی کرسی اقتدار کو ہلا کے رکھ دیا اور انہیں بالآخر اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑا۔

ایوب خان کے زوال کے کئی اسباب تھے۔ ان کے زوال کو زیادہ تر ان کی معاشی حکمت عملی سے تعبیر کیا جاتا ہے جس نے ایک طرف تو ملک میں معاشی ترقی کو تیز کیا لیکن دوسری جانب ملک کے دونوں حصوں کے درمیان موجودہ خلیج کو زیادہ وسیع کیا۔ ایوب خان کی معاشی حکمت عملی میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اس نے پاکستان میں علاقائی اور جماعتی کشمکش کو فروغ دیا جس کی وجہ سے عوام میں بد دلی پیدا ہوئی۔ ایوب خان کی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے وسائل مغربی پاکستان میں منتقل ہو گئے جس نے بنگالی عوام کو باقیماندہ ملک سے دور کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

بظاہر کا ملکی اقتدار پر ایوب کا کنٹرول مضبوط نظر آتا تھا لیکن درحقیقت اندر سے کھوکھلا تھا۔ سیاسی نظام کی بنیاد عوام کی مرضی اور خواہشات پر نہ تھی۔ 1962ء کے آئین کی رو سے جو سیاسی نظام متعارف کروایا گیا اس میں مشرقی پاکستان کے عوام کے مفادات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا سیاسی اقتدار سے محرومی نے مشرقی پاکستان کے بنگالی عوام میں مایوسی اور بد دلی پیدا کی جنہوں نے ایوب خان کی معاشی پالیسی کو بنگالیوں پر مغربی پاکستان کی برتری قائم کرنے اور ان کو ہمیشہ کے لیے محکوم بنانے کی مغربی پاکستان کی دیرینہ خواہش اور کوشش سمجھا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان بڑھتی ہوئی عدم مساوات نے بنگالیوں کے غم و غصہ کو ہوا دی جس نے ملک توڑنے والے عناصر کو تقویت بخشی۔ بین الاقوامی اداروں مثلاً ورلڈ بنک کی مغربی پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں میں ترجیح کی پالیسی نے بنگالیوں کے جذبات کو بھڑکایا۔

ایوب خان کی معاشی ترقی کے لیے حکمت عملی نے ایک مخصوص اور برتر طبقے کو جنم دیا جس نے طبقاتی جنگ اور کشمکش کو پروان چڑھایا۔ ایوب کی پالیسی کی وجہ سے ملک میں بائیس امیر ترین گھرانے پیدا ہوئے جنہوں نے تمام اداروں یعنی بنک، انشورنس اور صنعت و حرفت پر قبضہ کر لیا۔ ان بائیس گھرانوں نے اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے جی بھر کے ملکی دولت کو لوٹا۔ عوام کو جب یہ علم ہوا کہ ملک کی دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو گئی ہے تو انہوں نے زیادہ شدت سے وسائل کی مساوی بانٹ کا مطالبہ شروع کیا۔

ایوب خان کی تعلیمی اصلاحات کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ تعلیم پر بے پناہ پیسہ خرچ کرنے کے باوجود پاکستان کا تعلیمی معیار بہتر نہ ہو سکا۔ حکومت نے صحت کے شعبہ پر خاص توجہ نہ دی۔ آبادی میں تیزی سے ہونے والے اضافہ نے ملکی وسائل پر منفی اثرات مرتب کیے اور لوگوں کی معاشی حالت پہلے سے بھی خراب ہو گئی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے مارشل لاء کے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔ سیاسی جماعتوں نے غیر یقینی حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایوب خان کے خلاف عوامی جذبات کو بھڑکایا اور جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔

خاندانی منصوبہ بندی پروگرام پر سخت تنقید کی گئی اور اسے اسلامی اصولوں کے خلاف قرار دیا گیا۔ بنیاد پرست علماء نے اس پروگرام کے خلاف بھرپور احتجاج کیا جس نے ایوب کے خلاف جذبات کو ہوا دی۔

مشرقی پاکستان کی جماعت عوامی لیگ نے اگرتلہ میں پاکستان توڑنے کی سازش تیار کی۔ شیخ مجیب الرحمان اس سازش کے مرکزی کردار تھے۔ مجیب الرحمٰن کو پاکستان کے خلاف سازش کرنے اور باغی تقاریر کرنے پر جنوری 1966ء میں گرفتار کیا گیا۔ انہیں ہندوستان سے مل کر حکومت پاکستان کو گرانے کی سازش کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ متحدہ مخالف جماعتوں کے دباؤ پر انہیں رہا کر دیا گیا اور ایوب خان کی بلائی ہوئی گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔

حکومت نے حالات پر قابو پانے کی بہت کوشش کی۔ انہوں نے اپوزیشن کے بیشتر مطالبات تسلیم کر لیے لیکن متحدہ اپوزیشن کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ایوب خان مستعفی ہو جائیں۔

نومبر 1968 تک ایوب خان کے خلاف عوامی نفرت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ شدید مخالفت نے مارشل لا ءحکومت کو بدل کر دیا تھا جو کوشش کے باوجود عوام کی نفرت اور غم و غصہ کو کم نہ کر سکی تھی۔ ایوب کے نزدیکی اہلکاروں اور سیاست دانوں نے مشورہ دیا کہ بڑھتے ہوئے عوامی غصے اور نفرت کا رخ موڑنے کے لیے "عشرۂ ترقی" منایا جائے۔ "عشرۂ ترقی" (Decade of Development) منانے کا مقصد عوام کو یہ بتانا تھا کہ ایوب خان کے دور میں پاکستان میں بے پناہ ترقی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایوب کی حکومت کے عرصہ کو "عشرۂ ترقی" کے نام سے پکارا جائے گا۔ حکومت کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا اور ایوب خان کے "عشرۂ ترقی" کا نتیجہ الٹا نکلا اور عوام کے اندر ایوب حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔

ایوب حکومت کے خلاف تحریک چلانے میں طلبا اور مزدوروں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ مارچ 1969ء میں مزدوروں کی ہڑتال نے کراچی میں عام زندگی کو بری طرح متاثر کیا۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی طلبا اور مزدوروں کی تنظیموں نے ہڑتالیں کیں اور امن عامہ کی صورت حال پیدا کی۔ سیاسی جماعتوں نے جمہوریت کی بحالی اور صحافیانہ سرگرمیوں پر سے پابندیاں ہٹانے کا مطالبہ کیا۔

معاہدۂ تاشقند نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ایوب خان کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ معاہدۂ تاشقند جس پر روسی وزیراعظم کوسیجن کے دباؤ پر دستخط کیے گئے تھے دراصل بھارت کو بہت زیادہ مراعات دینے کیلئے کیا گیا تھا۔

سیاست دانوں پر ایبڈو کی پابندیاں 31 دسمبر 1966ء کو ختم ہوگئیں تھیں۔ وہ سیاست دان جو ایبڈو کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتے تھے پابندیاں ختم ہونے کے بعد سیاست میں آگئے اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر ایوب خان کے خلاف تحریک میں حصہ لیا۔ سیاسی جماعتوں میں ایبڈو زدہ سیاست دانوں کے آجانے سے تقویت پیدا ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دوبارہ سرگرم عمل ہوگئیں تھیں۔ مغربی پاکستان کے بڑے شہروں میں حکومت کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ پی ڈی ایم نے جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا اور ایمرجنسی ہٹانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالا۔

ایوب خان کے خاندان کے افراد نے بے تحاشا ملکی دولت لوٹی جس کی وجہ سے اُن کی حیثیت کو شدید جھٹکا لگا۔ ایوب خان کے دو بیٹوں نے فوج کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر تجارت سنبھال لی۔ انہوں نے صنعتی کارخانے قائم کیے اور بے تحاشا ملکی دولت اکٹھی کی۔ گوہر ایوب فوجی ملازمت چھوڑنے کے بعد کچھ ہی دنوں میں ایک بہت بڑے صنعت کار بن گئے۔ انہوں نے اپنے سسر جنرل حبیب اللہ کے ساتھ مل کر بہت بڑا صنعتی گروپ قائم کیا۔ ہر کسی کا یہ خیال تھا کہ گوہر ایوب نے اپنے والد کی وجہ سے صنعت میں اس تیزی سے ترقی کی ہے۔ عوام میں یہ خیال جاگزیں ہوا کہ ایوب خان نے اپنے خاندان والوں کی لوٹ مار کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں اور انہیں ملکی دولت لوٹنے کے لیے کھلی چھٹی دے دی تھی۔

ایوب خان نے مظاہروں اور ہڑتالوں کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ انہوں نے سیاسی رہنماؤں کی گول میز کانفرنس کی جس میں انہوں نے سیاست دانوں کے بیشتر مطالبات کو تسلیم کر لیا۔ انہوں نے پارلیمانی نظام قائم کرنے اور بالواسطہ انتخابات کو منسوخ کرنے کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ لیکن سیاسی رہنما متفق نہ ہوئے اور ایوب کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جو کبھی ایوب خان کے قریبی ساتھی تھے حکومت سے الگ ہو کر اپنی سیاسی جماعت نومبر 1967ء کو قائم کی۔ بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے اپنی سیاسی جماعت قائم اور ایوب حکومت کے لیے رائے عامہ منظم کرنے کے لیے ملک بھر کا دورہ کیا۔ بھٹو اور ایوب کے درمیان کشمیر اور تاشقند معاہدہ کی وجہ سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ انہوں نے تیزی سے رائے عامہ ہموار کر لی اور کہا کہ وہ معاہدہ تاشقند کے راز سے پردہ ہٹائیں گے۔

باب نمبر 9

دوسرا مارشل لاء

جنرل آغا محمد یحیٰ خان (71-1969)

ملک گیر مظاہروں کی وجہ سے ایوب خان نے اقتدار چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے 25 مارچ 1969ء کو ریڈیو پر قوم سے خطاب کیا اور اعلان کیا کہ وہ اقتدار سے علیحدہ ہورہے ہیں۔ انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔ انہوں نے ملک کا نظم ونسق فوج کے سربراہ جنرل اے ایم یحیٰ خان کے سپرد کردیا۔

چونکہ سیاست دانوں نے ایوب خان کو بری طرح سے زچ کیا تھا لہٰذا انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اقتدار بدعنوان، نااہل اور ہوس اقتدار کے خواہش مند سیاست دانوں کے حوالے نہیں کریں گے۔ انہوں نے اقتدار دوسرے فوجی آمر کے حوالے کیا جس نے اپنے ناعاقبت اندیش رویہ کی وجہ سے ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا۔ اس طرح ایوب خان اپنی عوام اور سیاست دانوں سے بدلہ لینا چاہتے تھے جنہوں نے ان کی بہت زیادہ مخالفت کی تھی۔

یحیٰ خان نے اقتدار سنبھالتے ہی 1962ء کا آئین منسوخ کردیا اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ صوبائی و مرکزی حکومتیں ختم کردی گئیں اور صوبائی و قومی اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ یحیٰ خان ملک کے صدر بن گئے اور 31 مارچ 1969ء کو مسلح افواج کے سربراہ اعلیٰ کا عہدہ سنبھال لیا۔ اقتدار سنبھالتے وقت انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ان کا مقصد ملک میں امن و امان قائم کرنا اور شہریوں کے جان و مال کا تحفظ کرکے ملک کو دوبارہ معمول کے مطابق چلانا ہے۔

یحیٰ خان نے جب اقتدار سنبھالا ملکی حالات سخت ابتری کا شکار تھے۔ ملک میں امن و امان کی صورت حال مخدوش تھی اور قومی ادارے بدنظمی کا شکار تھے۔ اقتدار سنبھالتے وقت یحیٰ خان نے یہ اعلان کیا کہ وہ اقتدار سول حکومت کو سونپ دیں گے۔

لیگل فریم ورک آرڈر (LFO)

یحیٰ خان نے اقتدار سنبھالتے وقت وعدہ کیا کہ وہ اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کردیں گے۔ اقتدار کی منتقلی کا وعدہ نبھانے کے لیے انہوں نے 30 مارچ 1970ء کو لیگل فریم ورک آرڈر (LFO) جاری کیا۔ لیگل فریم ورک آرڈر کے ذریعے قومی اسمبلی کا ڈھانچہ جس میں 313 نشستیں تھیں قائم کیا گیا۔ 300 نشستیں عام انتخابات کے ذریعے پر کی جانی تھیں جبکہ بقیہ 13 نشستیں خواتین کے لیے مختص کی گئیں۔

اس کے بعد 28 جولائی 1970ء کو چیف الیکشن کمشنر کی تقرری کی گئی جس کے ذمے عام انتخابات کروانے تھے۔ سوات، دیر اور چترال کی شاہی ریاستوں کو مغربی پاکستان میں ضم کردیا گیا اور ون یونٹ سکیم کو توڑ دیا گیا۔ صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو نئے سرے سے تشکیل دیا گیا۔ عام انتخابات کے لیے ایک آدمی ایک ووٹ کا اصول تسلیم کرلیا گیا جس کا مقصد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان برابری کے اصول کو قائم کرکے آبادی کی بنیاد پر نمائندگی دینا تھا اور مشرقی پاکستان کی عددی برتری کو تسلیم کرنا تھا۔ لیگل فریم

ورک آرڈر کی رو سے معرض وجود میں آنے والی اسمبلی کو آئین تیار کرنے کے لیے 120 دن کی معیاد دی گئی۔ اگر قومی اسمبلی اس عرصے میں آئین مرتب نہیں کر پاتی تو وہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔

عام انتخابات 1970:

لیگل فریم ورک آرڈر (LFO) پر خدشات کے باوجود ملک کی سیاسی جماعتوں نے فوجی حکومت کے عام انتخابات کروانے کے فیصلے کو سراہا۔ سیاسی جماعتیں اپنے اپنے منشور کے ساتھ انتخابات لڑنے کے لیے میدان میں اتر پڑیں۔ سیاسی جماعتوں کے سرکردہ رہنماؤں نے انتخابی مہم چلانے کے لیے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا اور اپنی اپنی جماعت کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے تگ و دو کی۔

مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ نے شیخ مجیب الرحمان کی قیادت میں چھ نکاتی منشور پیش کیا۔ شیخ مجیب الرحمان کی سیاسی سوچ پر مبنی چھ نکات وفاقی حکومت کے اختیارات کو واضح طور پر کم کرنے اور مشرقی پاکستان کے لیے مکمل صوبائی خود مختاری اور اختیارات کی تقسیم میں مشرقی پاکستان کے حصہ کے حق میں بنائے گئے تھے۔ مجیب الرحمان کے چھ نکات پاکستان کو ایک غیر موثر ریاستی اتحاد (Confederation) میں منتقل کرنے کے لیے وضع کیے گئے تھے جس کا مقصد پاکستان کی مرکزی برتری کو ختم کرنا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے انتخابات لڑنے کے لیے عوام کی معاشی حالت کو اچھالا اور کہا کہ وہ انتخابات جیتنے کے بعد عوام کی معاشی بدحالی کو ختم کر دیں گے۔ بھٹو نے اپنے وعدے میں کشش پیدا کرنے کے لیے عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان کے ناقابل عمل پروگرام کا جھانسہ دیا۔

مجیب الرحمان اور بھٹو نے اپنی اپنی انتخابی مہم کو تیز کرنے کے لیے اشتعال انگیز حربے استعمال کیے۔ انہوں نے اپنے مخالف سیاست دانوں کی کردار کشی کی اور مخالف سیاسی جماعتوں کے جلسوں کو طاقت کے ذریعے درہم برہم کیا۔ بالخصوص عوامی لیگ نے پاکستان کی حامی سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کے بارے میں بہت زیادہ مخالفانہ رویہ اختیار کیا۔ عوامی لیگ کے کارکن اپنی مخالف جماعتوں کے جلسوں کو درہم برہم کرتے تھے اور ان کے کارکنان کو بری طرح مارتے پیٹتے تھے۔ عوامی لیگ کی غنڈہ گردی اور دہشت گردی نے دوسری جماعتوں کے لیے پرامن طور پر انتخاب لڑنا ناممکن بنا دیا تھا۔

مغربی پاکستان میں بھٹو نے عوام کی معاشی بدحالی کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ پیپلز پارٹی کے روٹی کپڑا اور مکان کے غیر حقیقی نعرے نے غریب اور بدحال عوام کے دلوں کو موہ لیا جس کی وجہ سے بھٹو پسے ہوئے عوام کے نجات دہندہ کے طور پر سیاست کے آسمان پر چھا گئے۔ بھٹو نے تاشقند معاہدے کو فوج کے خلاف استعمال کیا اور عوام کے دلوں میں فوج کے لیے پہلے سے موجود نفرت کو اور ابھارا۔

مجیب نے اپنی انتخابی مہم کی بنیاد مشرقی پاکستان کے عوام کے حقوق پر استوار کی تھی۔ عوامی لیگ نے چھ نکات کی بنیاد پر انتخاب لڑا جو صرف مشرقی پاکستان تک محدود تھا۔ مجیب نے بنگالیوں کی ناراضگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں میں مغربی پاکستان اور فوج کے خلاف جی بھر کے زہر اگلا۔ مجیب الرحمان ہمیشہ سے علیحدگی پسند اور کٹر بنگالی قوم پرست تھے۔ انتخابات میں بنگالیوں کے حقوق کی بھرپور وکالت کی بنا پر مجیب بنگالی عوام کے ہیرو بن گئے اور انہیں بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ انہوں نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے مشرقی پاکستان کے عوام کے زخموں پر نمک چھڑکا۔ انہوں نے عوام کو بتایا کہ مغربی پاکستان نے بنگالیوں کے حقوق غصب کیے ہیں اس لیے اب سوائے چھ نکات کو ووٹ دینے کے دوسرا کوئی راستہ نہیں جس سے مغربی پاکستان کے تسلط اور ظلم سے چھٹکارہ پایا جا سکے۔

انتخابات کے انعقاد تک مشرقی پاکستان کے عوام چھ نکات کے حق میں ووٹ دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اسی دوران مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند سیاست دان مولانا بھاشانی، تاج الدین احمد اور ڈاکٹر کمال نے اپنی جوشیلی تقریروں کے ذریعے بنگالیوں کو بھڑکا کر مغربی پاکستان کے خلاف ان کی نفرت کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا تھا جہاں سے ان کی واپسی ناممکن تھی۔ مشرقی پاکستان کے دوسرے رہنماؤں نے عوامی لیگ کے حق میں انتخابات سے علیحدگی اختیار کر لی اور عوامی لیگ کو بغیر کسی رکاوٹ کے انتخابات لڑنے کے لیے کھلا میدان چھوڑ دیا۔ جیسا کہ اندازہ تھا عوامی لیگ سوائے دو نشستوں کے باقیماندہ تمام نشستوں پر انتخاب جیت گئی۔ یہ دو نشستیں بدھ رہنما راجہ تری دیو رائے اور نور الامین نے جیت لی تھیں۔

مغربی پاکستان میں بھٹو کی کرشماتی شخصیت اور لچھے دار تقریر کے فن نے عوام کی بڑی تعداد کو پیپلز پارٹی کا گرویدہ بنا لیا۔ پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں 82 نشستوں کے ساتھ سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری جس کی وجہ سے بھٹو سودے بازی کی پوزیشن میں آ گئے۔

انتخابات کے نتائج پرانے سیاست دانوں کے لیے حیران کن تھے بالخصوص جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کے لیے انتخابات کے نتائج ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تھے جس کی وجہ سے ان جماعتوں اور پرانے سیاست دانوں کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔

اقتدار کے حصول کے لیے یحییٰ، مجیب اور بھٹو کے درمیان تکرار:

لیگل فریم ورک آرڈر (LFO) کی رو سے قومی اسمبلی کو 120 دن کے اندر آئین بنانا تھا۔ انتخابات کے بعد تین طاقتیں ابھر کر سامنے آئیں جن کے پاس اقتدار کی منتقلی کا اختیار تھا۔ انتخابات کے نتائج نے ملک کا مستقبل ان تین قوتوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ جنہوں نے اپنی ہوس اقتدار اور ناعاقبت اندیشی کی بنا پر ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا اور بالآخر ملک ٹوٹ گیا۔ یہ تین قوتیں فوج، پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ تھیں جو اقتدار کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوگئیں۔ یہ اب مجیب اور بھٹو کے اختیار میں تھا کہ وہ منتقلی اقتدار کے لیے کوئی ایسا نظام وضع کریں جو یحییٰ خان کو قابل قبول ہو۔ یحییٰ، مجیب اور بھٹو کی اقتدار کی خواہش کے پیش نظر پاکستان کا سیاسی منظر انتہائی گھناؤنا اور شدید پارٹی بازی کا شکار ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے انتخابات میں کل 169 نشستوں میں سے 167 نشستیں جیت کر بھاری اکثریت حاصل کر لی تھی۔ انتخابات میں فیصلہ کن اور بھاری اکثریت حاصل کرنے کے بعد مجیب کے رویہ میں سختی آ گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ مشرقی پاکستان کے عوام نے عوامی لیگ کے چھ نکاتی پروگرام کے حق میں ووٹ دیا ہے لہٰذا کوئی بھی چھ نکات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ہمیں چھ نکات کی بنیاد پر آئین بنانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

مجیب الرحمان دراصل دوغلی حکمت عملی پر عمل پیرا تھے۔ ان کے سخت رویے کا دوہرا مطلب تھا۔ ایک طرف تو وہ چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں جاری باغیانہ تحریک چلتی رہے تو دوسری طرف وہ مغربی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں اور فوجی حکمرانوں پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ عوامی لیگ کا بنایا ہوا آئین خاموشی سے منظور کر لیں۔ مجیب کی ضد اور غیر مصلح کن رویہ نے شدید غیر یقینی سیاسی صورت حال پیدا کر دی تھی۔

مغربی پاکستان کی صورت حال بھی کوئی زیادہ بہتر نہ تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کے انتظامی ڈھانچہ میں اپنی جماعت کے انتخابات میں اکثریت کی بنا پر معقول حصے کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ نے یہ اعلان کیا کہ قومی سیاست میں صرف اکثریت ہی ضروری نہیں ہوتی بلکہ ملکی سیاست میں کام کرنے والے تمام عناصر کی مرضی بھی شامل ہونا چاہیے۔ انہوں نے بلند بانگ دعویٰ کیا کہ ان کی جماعت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بالخصوص بھٹو عوامی لیگ کے چھ نکات کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ بھٹو نے مجیب الرحمان کے چھ نکات کے بارے میں [illegible] پاکستان کی سیاسی صورت حال [illegible]

بھٹو نے مجیب کو منانے کے لیے ایک آخری کوشش کی اور وہ 28 جنوری 1971ء کو ڈھاکہ گئے۔ انھوں نے مجیب الرحمان اور عوامی لیگ کے دوسرے سرکردہ رہنماؤں سے بات چیت کی اور انھیں پاکستان کے مستقبل کے آئین پر اپنے نقطۂ نظر پر قائل کرنے کی کوشش کی مگر جیسا کہ اندازہ تھا عوامی لیگ نے چھ نکات پر کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا۔

یحییٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ 1971ء کو طلب کیا تھا۔ اسمبلی کا اجلاس منعقد ہو جانے کی صورت میں عوامی لیگ اسمبلی میں اپنی اکثریت کی بنا پر چھ نکات کی بنیاد پر نیا آئین بنا لیتی اور بھٹو کی پیپلز پارٹی اقتدار میں شامل نہ ہوتی۔ یہ صورت حال بھٹو کو کسی بھی صورت قبول نہ تھی کیونکہ اس طرح بھٹو پاکستان کی سیاست سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے۔ بھٹو کے لیے اسمبلی اجلاس کا انعقاد خطرے کی گھنٹی تھی۔ انھوں نے اسمبلی اجلاس مؤخر کروانے کے لیے نئی حکمت عملی اختیار کی۔

سب سے پہلے انھوں نے عوامی لیگ کے چھ نکات کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا اور انھیں پاکستان کی سالمیت کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔ انھوں نے مجیب کے خلاف الزامات لگائے اور انھیں بھارتی ایجنٹ قرار دیا۔ بھٹو نے 27 مارچ 1971ء کو ایک پریس کانفرنس میں مجیب کے بارے میں کہا کہ وہ مشرقی پاکستان میں نسلی اور لسانی اصولوں پر مبنی ایک آزاد ریاست کا قیام چاہتے ہیں اور وہ (مجیب) ملکی سالمیت اور یک جہتی میں یقین نہیں رکھتے۔

اس کے ساتھ ہی بھٹو نے اسمبلی اجلاس کو مؤخر کرنے کا مطالبہ کر دیا اور کہا کہ 120 دن کی معیاد آئین سازی کے لیے بہت تھوڑی ہے انھوں نے دھمکی آمیز لہجے میں یہ اعلان کیا کہ اگر اسمبلی کا اجلاس ان کی جماعت پیپلز پارٹی کے بغیر بلایا گیا تو وہ ملک گیر تحریک چلائیں گے۔ انھوں نے 14 دسمبر 1971ء کو یہ اعلان کیا کہ پیپلز پارٹی 3 مارچ والے اسمبلی اجلاس میں شرکت نہیں کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ اگر مغربی پاکستان یا پیپلز پارٹی میں سے کسی نے اسمبلی اجلاس میں شرکت کی تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر شیخ رشید نے متنبہ کیا کہ اگر مرکز میں پیپلز پارٹی کی شمولیت کے بغیر حکومت قائم کی گئی تو وہ بھی معاف

شامل تھے جنہیں قتل کرنے سے پہلے بری طرح سے بے عزت کیا گیا۔ وہ غیر بنگالی جو مشرقی پاکستان میں کاروبار یا ملازمت کے لیے سکونت اختیار کر گئے تھے انہیں جبری طور پر اپنی جائیداد روپیہ پیسہ اور جمع پونجی عوامی لیگ کے کارکنوں کے حوالے کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جنہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا انہیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور ان کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ مسلح افواج کو بے عزت کیا گیا۔ مجیب الرحمان نے متوازی حکومت قائم کر لی تھی اور مرکزی حکومت بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

یحییٰ خان 15 مارچ 1971ء کو مجیب سے گفتگو کرنے کے لیے ڈھاکہ پہنچے۔ جب وہ ڈھاکہ پہنچے تو مشرقی پاکستان مکمل طور پر علیحدگی پسندوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ بے گناہ لوگوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ مجیب الرحمان نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یحییٰ خان سے ملاقات کی۔ ان میں نذر الاسلام، خوندکر مشتاق احمد، تاج الدین احمد اور ڈاکٹر کمال حسین شامل تھے۔ یحییٰ خان نے مغربی پاکستان سے ذوالفقار علی بھٹو، ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات، مولانا شاہ احمد نورانی، عبدالولی خان اور میر غوث بخش بزنجو کو بلایا تھا۔

مجیب الرحمان نے یحییٰ خان کو یہ مشورہ دیا کہ پاکستان کو کنفیڈریشن بنا دیا جائے۔ عوامی لیگ نے مطالبہ کیا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان قومی اسمبلی کے منتخب نمائندے علیحدہ علیحدہ اپنے صوبوں میں آئین سازی کریں جس کے بعد کسی اور دن قومی اسمبلی مشرقی اور مغربی پاکستان کے بنائے آئین کو کنفیڈریشن میں مدغم کر دے۔ جیسا کہ ظاہر تھا بات چیت ناکام ہو گئی کیونکہ فوجی حکمران اور مغربی پاکستان کے سیاست دان اس قسم کی تجویز جس سے پاکستان کی سالمیت اور اتحاد پر ضرب لگتی ہو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

عوامی لیگ نے اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد 26 مارچ 1971ء کو مسلح بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ 25 اور 26 تاریخ کی رات کو مغربی پاکستان کے حامی افراد اور ان کے اہل خانہ کو ناقابل بیان ظلم اور وحشیانہ پن کا نشانہ بنایا گیا۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے EPR (East Pakistan Regiments) کے اہلکار اور ان کے اہل خانہ کو انتہائی ظالمانہ طریقے سے ذبح کر دیا گیا۔ مغربی پاکستان کے حامی افراد اور افسران کو ذبح کرنے کے بعد لاشوں کو جیپوں سے باندھ کر سڑکوں پر رگیدا گیا۔

مجیب الرحمان کے منتقلی اقتدار کے مطالبے کے جواب میں بھٹو نے دو اسمبلیوں کو اقتدار منتقل کرنے کا مطالبہ کر دیا جس میں ایک اسمبلی مغربی پاکستان کے نمائندوں اور دوسری مشرقی پاکستان کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔ بھٹو نے اعلان کیا کہ مجیب الرحمان مشرقی پاکستان کے وزیراعظم اور وہ خود مغربی پاکستان کے وزیراعظم ہوں گے۔

عوامی لیگ نے قانون کو ہاتھ میں لے لیا تھا اور مارشل لاء کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ عوامی لیگ نے 24 مارچ 1971ء کو بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ یحییٰ خان نے فوج کو عوام کے جان و مال کے تحفظ اور امن و امان قائم کرنے کے لیے مناسب قدم اٹھانے کا حکم دیا۔ عوامی لیگ پر پابندی لگا دی گئی اور مجیب الرحمان اور دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔

فوجی کارروائی شروع ہوتے ہی عوامی لیگ اور پاکستان کے حامی افراد کے درمیان جنگ شروع ہو گئی فوجی کارروائی کی وجہ سے تھوڑا امن و امان بحال ہوا اور حکومت کا اختیار قائم ہوا۔ باغی افراد ملک سے فرار ہو گئے اور سرحد عبور کر کے ہندوستانی علاقے میں داخل ہو گئے۔ مہاجرین کی بھاری تعداد ہندوستان میں داخل ہونے کی وجہ سے بھارت کو پاکستان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا بہانہ ہاتھ آ گیا بھارت نے اس معاملے کو بین الاقوامی سطح پر بہت اچھالا۔ بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے بہت واویلا مچایا اور کہا کہ بھارت میں بنگالیوں کے بھاری تعداد میں داخل ہونے سے بھارت کی معیشت شدید دباؤ میں آ گئی ہے۔ اندرا گاندھی نے مطالبہ کیا کہ بنگالی مہاجرین کو جلد از جلد اپنے گھروں کو واپس جانا چاہیے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ مہاجرین صرف اسی صورت واپس جا سکیں گے جب کہ بنگال میں ایسی حکومت قائم ہو جس پر وہ بھروسہ کر سکیں۔

صورت حال کو مزید خراب کرنے کے لیے اور مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان کے ساتھ رابطہ منقطع کرنے کے لیے بھارت نے ایک اور اوچھی چال چلی۔ 30 جنوری 1971ء کو دو بھارتی ایجنٹ کشمیری مجاہدین کے بھیس میں بھارتی طیارہ اغوا کر کے لاہور لے آئے۔ بھارت کو پاکستان کے خلاف کارروائی کا بہانہ مل گیا جس کی وجہ سے اس نے پاکستانی جہازوں کی ہندوستانی علاقے پر پرواز معطل کر دی۔ اس اقدام کی وجہ سے مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان سے رابطہ کٹ گیا۔

پاکستان پر دباؤ بڑھانے کے لیے بھارت نے 9 اگست 1971ء کو روس کے ساتھ دوستی اور امن کا معاہدہ کیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ بھارت کے خلاف ہر قسم کی مسلح کارروائی میں روس بھارت کے حق میں لڑے گا۔ اس معاہدے کے بعد 11 اگست 1971ء کو بھارت کے وزیر خارجہ نے پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا کہ اب کوئی بھی ملک بھارت کو مشرقی پاکستان میں اپنی مرضی کی کارروائی کرنے سے نہیں روک سکتا۔

نومبر 1971ء میں بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ بھارتی فوجوں نے مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کر لی اور مکتی باہنی کو پاکستان کی افواج پر بڑا حملہ کرنے کا اشارہ دیا۔ 21 نومبر 1971ء تک بھارتی فوج مشرقی پاکستان پر مکمل حملہ کر چکی تھی۔ 3 دسمبر 1971ء کو مغربی پاکستان کی سرحد اور کشمیر میں بھی جنگ چھڑ چکی تھی۔ پاکستان کی افواج بھارت کے اتنے بڑے حملے کی متحمل نہ ہو سکتی تھیں 16 دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان نے بھارتی جارحیت کی وجہ سے ہتھیار پھینک دیے۔

مغربی پاکستان میں بھی پاکستانی فوجوں کی کارکردگی مایوس کن تھی۔ مشرقی پاکستان میں جنگ ہارنے کے بعد فوجوں کا حوصلہ پست ہو چکا تھا۔ پاکستان کی فوج مشرقی پاکستان کی مکتی باہنی کے گوریلا حملوں کے سامنے بے بس تھی جو پاکستانی افواج کی جنگ ہارنے کی بڑی وجہ بنی۔ مشرقی پاکستان میں پاکستان کی شکست اور ملک ٹوٹ جانے کی وجہ سے پاکستانی افواج ذلیل ہو گئیں۔ فوجی حکومت دنیا کی نگاہوں میں گر گئی اور یحییٰ خان کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔

جس طرح کے سیاسی حالات ملک میں چل رہے تھے ان کے پیش نظر مشرقی پاکستان کا المیہ کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ فوجی حکمرانوں اور سیاست دانوں کی نااہلی، بدعنوانیوں اور ہوس اقتدار کی وجہ سے آدھا حصہ ملک سے کٹ گیا۔ انتخابات کے بعد ملک کی سیاسی صورتحال بھٹو، یحییٰ اور مجیب کے گرد گھوم رہی تھی اور یہ تینوں کلیدی کردار کے حامل تھے۔ ان تینوں نے اپنی ہوس اقتدار بحث و تکرار سے ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا۔ بالخصوص یحییٰ خان کے ناعاقبت اندیش طرز عمل نے صورت حال کو بدتر بنا دیا تھا۔ یحییٰ خان کے عجیب و غریب طرز عمل اور تیزی سے موقف بدلنے کی عادت نے بنگالیوں کو بدظن کر دیا تھا۔ وہ یحییٰ خان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور اسے ایک مثالی مغربی پاکستان کا فوجی سپہ سالار سمجھتے تھے جو بنگالیوں کو دبانے اور ان کو حقوق سے محروم کرنا چاہتا ہو۔

حالانکہ بھٹو کے عوامی لیگ کے چھ نکات بارے سخت طرز عمل کا مقصد مجیب کے ضدی رویے میں لچک پیدا کرنا تھا لیکن ان کے اقتدار میں حصہ مانگنے پر اصرار نے مجیب کے دل میں بھٹو کے بارے میں بدگمانی پیدا کر دی۔ مجیب الرحمان کو یہ شبہ تھا کہ یحییٰ کی لگام بھٹو کے ہاتھ میں تھی جس سے وہ یحییٰ خان سے اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق فیصلے کروا لیتے تھے۔ مجیب اور بھٹو بڑی شدت سے ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے اور کسی بھی لمحہ ایک دوسرے کی بات اور نقطہ نظر کو سمجھنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔

مجیب ایک جاہ طلب اور ہوس اقتدار کا مالک علیحدگی پسند انسان تھا جو آزاد بنگلہ دیش کا معمار بننا چاہتا تھا۔ اس نے انتہائی احمقانہ طور پر متحدہ پاکستان کی بجائے بنگلہ دیش کا وزیراعظم بننا چاہا۔ اپنی گھناؤنی خواہش کی تکمیل کے لیے مجیب نے اپنے بھارتی آقاؤں سے ہمیشہ مدد مانگی جنھوں نے پاکستان کو توڑنے کے لیے بڑی ہوشیاری سے اسے (مجیب) استعمال کیا۔ مجیب نے ہمیشہ

بھارتی ایجنٹوں کے اشارے پر عمل کیا اور ہمیشہ قومی یکجہتی اور قومی سالمیت پر ضرب لگانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مجیب الرحمان نے اپنی خواہش کا اظہار یوں کیا اور کہا کہ ہمیشہ سے میرا راستہ علیحدہ رہا ہے جس میں بنگالی عوام کو پاکستان سے علیحدہ ہونا ہوگا۔ انہوں نے 10 جنوری 1972ء کو کہا "میں 25 برس سے اس آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ آج میرے خوابوں کی تعبیر ہمارے سامنے ہے۔"

1970ء کے انتخابات کے بعد بھٹو کو اپنے لیے سیاسی عروج کا موقع نظر آیا جو شاید اتنی آسانی سے نہ ملتا۔ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا حتیٰ کہ ایک ملک میں دو وزرائے اعظم بنانے کی انوکھی اور ناقابل عمل تجویز پیش کر دی۔ ان کی دو علیحدہ اسمبلیوں، دو حکومتوں اور دو وزرائے اعظم کی تجویز نے ملک کے آئین سازی کے ماہرین اور پارلیمنٹ کے ارکان کی بڑی تعداد کو حیران کر دیا جنہوں نے بھٹو کی تجاویز کو ملک کی تباہی اور ٹوٹنے سے تعبیر کیا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر بھٹو اقتدار کے حصول کا تقاضا نہ کرتے اور پارلیمنٹ میں بحیثیت قائد حزب اختلاف حصہ لیتے تو وہ مجیب کے لیے بڑی مشکلات اور پریشانی پیدا کر سکتے تھے۔

باب نمبر 10

پاکستان پیپلز پارٹی کی سیاسی و سماجی اصلاحات

ذوالفقار علی بھٹو عوامی رہنما

1971ء کے انتخابات کے بعد مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی 88 نشستوں کے ساتھ سب سے زیادہ اکثریتی جماعت تھی۔ قدرتی طور پر ذوالفقار علی بھٹو پیپلز پارٹی کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے سب سے طاقتور سیاستدان بن کر ملکی سیاست میں ابھر ہوئے۔ انتخابات میں واضح اکثریت کی بنا پر پیپلز پارٹی نے اقتدار کی منتقلی کا مطالبہ کیا جو ایک آئینی مطالبہ تھا کیونکہ 1971ء میں پاکستان ایک پارلیمانی جمہوریہ تھا جس کے مشرقی اور مغربی پاکستان دو صوبے تھے۔ آئین کی رو سے کسی ایک صوبے کو اقتدار منتقل نہ کیا جا سکتا تھا۔ جب دسمبر 1971ء میں مشرقی صوبہ پاکستان سے علیحدہ ہو گیا تو اس کے بعد فوجی حکومت کے پاس کوئی راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ اقتدار پیپلز پارٹی کو دے دیا جائے۔ لہٰذا ذوالفقار علی بھٹو نے 20 دسمبر 1971ء کو جنرل یحییٰ خان کی جگہ بحیثیت سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اقتدار سنبھالا۔

پیپلز پارٹی کا دورِ حکومت عوامی دور سمجھا جاتا ہے۔ ایک عوامی حکومت وہ ہوتی ہے جو یا تو کسی ادارے کی پشت پناہی پر قائم ہوتی ہے یا پھر وہ کسی سیاسی تحریک کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ عوامی دور ایک ایسے ہر دلعزیز سیاسی رہنما کا دورِ حکومت ہوتا ہے جسے فوج جیسے منظم ادارے یا کسی ایسی سیاسی جماعت جو عوام کی سیاسی اور معاشی امنگوں کی مظہر ہو کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کا شروع ہی سے ایوانِ اقتدار سے نزدیکی تعلق رہا ہے۔ صدر سکندر مرزا ذوالفقار علی بھٹو کی لیاقت و ذہانت کی وجہ سے انہیں پسند کرتے تھے۔ 1958ء میں سکندر مرزا نے بھٹو کو اپنا وزیر تجارت و صنعت مقرر کیا۔ جب اسی سال ایوب خان نے صدر سکندر مرزا کو برطرف کر کے خود صدر کا عہدہ سنبھالا تو انہوں نے بھی بھٹو کو وزیر کی حیثیت سے اپنے ساتھ ملا لیا۔ چار سال کے مختصر عرصے میں ذوالفقار علی بھٹو اپنی ذہانت اور قابلیت کی بنا پر تیزی سے ترقی کرتے ہوئے وزیر اطلاعات، قومی تعمیر نو، وزیر قومی وسائل، طاقت و پٹرولیم بن گئے۔ اس کے علاوہ انہیں وزارت کشمیر کا اضافی چارج بھی دے دیا گیا۔

1963ء میں بھٹو وزیر خارجہ بنے۔ وزارت خارجہ کا چارج سنبھالنے کے بعد انہوں نے مغربی ملکوں پر انحصار کو کم کیا اور پاکستان کی غیر جانبدارانہ حیثیت کو اجاگر کیا۔ بھٹو چین کے ساتھ نزدیکی تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے جس میں وہ کامیاب رہے۔

1965ء کی جنگ کے بعد معاہدۂ تاشقند کی وجہ سے جس میں کشمیر کے مسئلے کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا، بھٹو کے ایوب کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے۔ بھٹو نے معاہدۂ تاشقند کو "حقیقی شکست" قرار دیا اور چند ہی ماہ کے اندر وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ایک منجھے ہوئے سیاست دان کی حیثیت سے بھٹو نے معاہدۂ تاشقند کو ایوب کے خلاف بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ اسی دوران یہ افواہ اڑی کہ ایوب خان امریکہ کی شہ پر بھٹو کو وزارت سے بے دخل کر رہے ہیں۔ اس افواہ کے اڑتے ہی بھٹو کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

ایک سیاست دان اور وزیر ہونے کی وجہ سے بھٹو کو ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی معاملات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ایوب خان کی معاشی پالیسیوں اور اس دور میں ہونے والی معاشی و سیاسی تبدیلیوں کو بھٹو نے بغور دیکھا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے تمام دوسرے ہم عصر سیاست دانوں اور سماجی کارکنوں کی نسبت ملکی حالات و معاملات کا بہتر ادراک و احساس رکھتے تھے۔ انہوں نے ایوب خان کے ''عشرۂ ترقی'' (Decade of Development) کو اپنے سامنے ''عشرۂ استحصال'' میں بدلتے اور ایوب خان کے زوال کا سبب بنتے دیکھا تھا۔ بھٹو نے نااہل اور بدعنوان سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کے پیدا کردہ سیاسی و فوجی بحران کا سامنا کیا تھا جس کی وجہ سے ملک تباہ ہوا اور بھارت سے فوجی شکست کا موجب بنا۔

جب بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو ملک ٹوٹنے اور فوجی شکست کی بنا پر ملک میں بے یقینی اور مایوسی کی فضا طاری تھی۔ فوج اور عوام کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور ہر کوئی اپنے مستقبل کے بارے بے یقینی اور خوف سے دوچار تھا۔ عوام حکومت سے بیزار ہو چکے تھے اور ایک دوراہے پر کھڑے تھے۔ مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ 1965ء کی جنگ کے بعد ان کی تنخواہ اور اجرت میں بے پناہ کمی آ چکی تھی جس کی وجہ سے ان کی معاشی حالت تباہ حالی کا شکار تھی دیہاتی علاقوں سے روزگار اور رہائش کے حصول کی خاطر شہروں کا رخ کرنے والے بے شمار عوام روزگار اور رہائشی سہولتیں نہ ملنے کی وجہ سے پریشان تھے۔ روزمرہ استعمال کی اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے غریب اور درمیانہ طبقہ کی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔ طلبا جو ہمیشہ سے ایوب خان کی جابرانہ پالیسی کا شکار رہے تھے غم و غصہ سے بھرپور تھے اور آنے والی حکومت کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان حالات کی موجودگی میں پاکستان کے پسے ہوئے طبقے امید اور آس لیے بھٹو کی طرف دیکھ رہے تھے جو انہیں اپنا مسیحا سمجھنے لگ گئے تھے۔

پیپلز پارٹی کے منشور میں پاکستان کے ناراض طبقوں کے لیے بہت کشش تھی جس میں پسے ہوئے عوام کے مطالبات اور خواہشات کو اجاگر کیا گیا تھا اور عوام کے مسائل کے حل کا وعدہ کیا گیا تھا۔ پیپلز پارٹی نے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں ترقی کے لیے ایک تحریک شروع کرنے کا دعویٰ کیا تھا جس میں ملک کی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے کر انہیں عوامی قبضہ میں دینے کا پروگرام وضع کیا گیا تھا۔ اپنے ترقی پسند پروگرام کی وجہ سے پیپلز پارٹی تیزی سے عوام میں مقبول ہوگئی۔ پیپلز پارٹی نے اپنی حریف سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو 1970ء کے انتخابات میں شکست دی جو اس کی عوام میں مقبولیت کا ثبوت ہے۔

ملکی حالات بہت خراب ہونے کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو نے بخوشی مسائل سے نبرد آزما ہونے کا تہیہ کر لیا اور ملکی عزت اور وقار کو بحال کرنے کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ آپ نے پاکستان کے پسے ہوئے اور مایوس عوام کے اندر حوصلہ اور اعتماد دوبارہ سے پیدا کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔

بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی فوری طور پر معاشی بحالی اور ترقی کی طرف توجہ دی۔ انہوں نے عوام کی معاشی بحالی کے لیے اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ اسلامی سوشلزم دراصل مساوات محمدی کا نعم البدل ہے جس کا مقصد غریب عوام کی معاشی بہتری ہے۔ اپنے وضع کردہ معاشی ترقی کے پروگرام پر عمل درآمد کے لیے بھٹو نے مختلف شعبوں میں اصلاحات نافذ کیں جن کا مقصد پاکستانی عوام کے لیے ترقی کی نئی راہیں کھولنا تھا۔

قومی تحویل کا پروگرام:

بھٹو نے معاشی شعبے میں بنیادی تبدیلی لانے کے لیے سب سے پہلے ملک کی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان کیا۔ قومی ملکیت پروگرام کا پہلا مرحلہ جنوری 1972ء میں شروع ہوا جب حکومت نے سب سے پہلے 31 صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ یہ کارخانے بنیادی صنعتوں کی 10 مختلف اقسام سے تعلق رکھتے تھے۔ وفاقی وزیر صنعت و پیداوار کی سربراہی میں قومی تحویل میں

لیے جانے والے کارخانوں کا انتظام چلانے کے لیے ایک انتظامی مجلس (Board of Management) قائم کی گئی۔ قومی تحویل میں لیے جانیوالی صنعتوں میں لوہا اور فولاد بنانے کے کارخانے، بنیادی دھاتیں، بھاری مشینری، بھاری بجلی کا سامان، موٹر کاریں، ٹریکٹر پلانٹس، بھاری اور کیمیاوی اشیا، پٹرول، سیمنٹ اور بجلی گیس اور تیل صاف کرنے کے کارخانے شامل تھے۔ ڈائریکٹرز کے بورڈ اور انتظامی ایجنسیوں کو توڑ دیا گیا۔ یہ قدم ان مٹھی بھر تاجروں کی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لیے اٹھایا گیا تھا جو تھوڑا سرمایہ لگا کر بہت زیادہ منافع کما رہے تھے۔ یہ لوگ معاشی شعبہ میں حکومت کی عدم دلچسپی اور ایوب خان کی معاشی ناانصافیوں کی حکمت عملی کی وجہ سے منافع کما رہے تھے۔

1972ء کا قومی ملکیت کا پروگرام وسیع بنیادوں پر استوار نہ تھا۔ قومی ملکیت میں لیے گئے زیادہ تر کارخانے عام استعمال کی اشیا کے شعبے میں تھے جن پر قومی ملکیت کے پروگرام کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ حکومت نے غیر سرکاری شعبے کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے مئی 1972ء میں قرضہ پالیسی کا اعلان کیا۔ قرضہ پالیسی کی بدولت ایسے تاجر اور کسان جن کے پاس اپنا تھوڑا سرمایہ تھا ان کو آسان شرائط پر بھاری قرضے کی سہولت دی گئی تھی۔ قرضہ پالیسی کی وجہ سے نجی شعبہ کے تحفظات دور ہوگئے کیونکہ قرضہ کی سہولت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قومی تحویل کا پروگرام نجی شعبہ کو دبانے کے لیے وضع نہیں کیا گیا تھا۔ پہلے مرحلے میں قومی تحویل پروگرام نے چھوٹے تاجروں کو سرمایہ کاری کی ترغیب دی جس کی وجہ سے مکسڈ معیشت (Mixed Economy) کو فروغ حاصل ہوا۔ حکومت نے اپنے آپ کو چھوٹے صنعتی کاروبار سے الگ کرلیا اور بھاری صنعت کے فروغ اور معاشی عدم مساوات کو دبانے پر دھیان دیا۔

بھٹو ہمیشہ اپنی تقاریر میں سرمایہ داری نظام کی سخت مخالفت کرتے رہے تھے اور اس کیساتھ ہی مکسڈ اکانومی (Mixed Economy) کے حق میں تھے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے سرکاری اور غیر سرکاری شعبے ساتھ ساتھ ترقی کر سکتے تھے۔ لیکن سرمایہ داری نظام کو یکسر ختم کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ غیر سرکاری شعبہ کسی حد تک نوکر شاہی کے کنٹرول اور سرمایہ داری نظام کا مجموعہ تھا۔ انتظامی بورڈز کے ختم ہوجانے کے باوجود حصہ داران صنعتی انتظامی بورڈز کے تحت قومیائی گئی صنعتوں میں روپیہ لگا رہے تھے۔ صنعتی انتظامی بورڈز نقصان کے باوجود حصہ داروں کو منافع دیتے رہے جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ صنعتی انتظامی بورڈز کے تحت چلنے والی صنعتوں کی کارکردگی تسلی بخش تھی۔

صنعتی شعبے کو قومی تحویل میں لینے کا دوسرا مرحلہ 1973ء میں شروع ہوا اور 1976ء تک چاول چھڑنے کے کارخانوں کو قومی تحویل میں لینے تک مکمل ہوا۔ اس کی وجہ سے پہلے مرحلے کے دوران سرکاری اور غیرسرکاری شعبے کے درمیان پیدا ہونے والے بہتر تعلقات کو کافی نقصان پہنچا۔ ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے حکومت کو کاٹن، چینی اور گھی کے کارخانوں کو بھی قومی ملکیت میں لینا پڑا۔ 1973ء کے تباہ کن سیلاب کی وجہ سے چینی اور بناسپتی گھی کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ اس کے علاوہ بناسپتی گھی اور چینی کی پیداوار پر چند صنعت کاروں کی اجارہ داری کی وجہ سے بھی قیمتوں پر گہرا اثر پڑا۔ قیمتوں کے بڑھ جانے سے سخت بے چینی پھیلی کیونکہ غریب اور درمیانہ طبقہ قیمتوں کے تیزی سے بڑھنے سے براہ راست متاثر ہوا تھا۔ حکومت کو بڑھتی ہوئی قیمتوں کے مضر اثرات کو زائل کرنے کے لیے تنخواہوں اور اجرت میں اضافہ کرنا پڑا جس کی وجہ سے افراط زر میں اضافہ نے معیشت پر دباؤ بڑھایا۔

حکومت کے چھوٹی صنعتوں کو قومیانے کے فیصلہ سے نجی شعبہ میں بے چینی پھیل گئی کیونکہ 1972ء میں صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیتے وقت حکومت نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مزید صنعتیں قومی تحویل میں نہیں لی جائیں گی۔ اس کے علاوہ پیپلز پارٹی کے بعض رہنماؤں نے مزید صنعتیں قومی تحویل میں لینے کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ بیانات دیئے جس سے نجی شعبہ میں سخت بے چینی پھیلی۔ نتیجتاً نجی سرمایہ کاری اپنے مقررہ ہدف سے ایک چوتھائی پر آ گئی۔

نجی بنکوں کو بھی قومی تحویل میں لے لیا گیا جس کا مقصد سرمایہ کو کنٹرول کرنا اور وسائل کی تقسیم کو درست خطوط پر استوار کرنا تھا۔ 1976ء میں حکومت نے آٹے کی ملوں، روئی کے کارخانوں اور چاول چھڑنے کے کارخانوں کو غیر متوقع اور آمرانہ انداز میں قومی تحویل میں لے لیا۔ اس فیصلے نے نجی شعبہ کو ہلا کر رکھ دیا اور اس کے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچائی۔

قومی تحویل کے پروگرام کی وجہ سے حکومت بڑے صنعتی خاندانوں کے اثر و رسوخ اور اجارہ داری کو کم کرنے میں کامیاب ہوگئی جو اس کا مقصد تھا۔ 1972ء کے قومی ملکیت کے پروگرام نے ایوب خان کے دور میں ملکی دولت لوٹنے والے بائیس خاندانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ بائیس صنعتی گھرانوں کے سہگل خاندان، حبیب اور داؤد بالخصوص قومی تحویل پروگرام کا نشانہ بنے تھے۔ قومی تحویل کے پروگرام کی وجہ سے سرکردہ صنعتی گھرانوں کی سماجی حیثیت پر کاری ضرب لگی تھی۔ داؤد اور حبیب اللہ جیسے مشہور صنعت کاروں کو گرفتار کرلیا گیا اور کھلے عام بے عزت کیا گیا۔

بھٹو کا قومی تحویل کا پروگرام اپنے مقصد معیشت کو مکمل اشتراکیت میں بدلنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ حقیقت میں اس پروگرام کا مقصد پاکستان کے معاشی ڈھانچہ کو اشتراکی بنیاد پر استوار کرنا نہ تھا۔ قومی تحویل کا پروگرام جیسا کہ انتخابی مہم کے دوران نعرہ لگایا گیا تھا، بڑھتی ہوئی قیمتوں اور افراط زر کو روکنے میں ناکامی کی بنا پر عوام کی معاشی حالت کو بہتر نہ بنا سکا۔

زرعی اصلاحات:

پیپلز پارٹی کی حکومت نے یکم مارچ 1972ء کو زرعی اصلاحات کا اعلان کیا۔ ان اصلاحات کا مقصد زمین کی کم سے کم حد مقرر کرنا، غیر حاضر زمیندارہ نظام (Absentee Landlordism) کو ختم کرنا اور مشترکہ کاشتکاری کے لیے کیے گئے وعدہ کو پورا کرنا تھا۔

پہلے مرحلے میں 1972ء زمین کی ملکیت 150 ایکڑ نہری اراضی مقرر کی گئی۔ بعد میں 1976ء اس حد کو اور کم کر دیا گیا اور 100 ایکڑ نہری اراضی ملکیت مقرر کی گئی۔ بنجر اراضی کی حد ملکیت 1972 میں 300 ایکڑ اور 1977 میں 200 ایکڑ مقرر کی گئی۔ 1977 کے بعد کل حد ملکیت 250 ایکڑ نہری اراضی اور 500 ایکڑ بنجر اراضی مقرر کی گئی۔

حکومت بڑے زمینداروں کے اثر و نفوذ کی وجہ سے زرعی اصلاحات پر سختی سے عمل درآمد نہ کرسکی جس کی وجہ سے بہت سارے زمیندار گھرانے اصلاحات کے اثر میں نہ آسکے اور ان کی حیثیت جوں کی توں رہی تھی۔ زرعی اصلاحات پر عمل درآمد کے راستے میں کئی مشکلات حائل تھیں جس کی وجہ سے اصلاحات کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکل سکا اور بڑے اور درمیانے درجے کے زمینداروں کا اثر ختم نہ کیا جاسکا۔ حد ملکیت خاندان کی بجائے انفرادی ملکیت کے حساب سے مقرر کی گئی تھی جس کی وجہ سے بہت سارے زمیندار گھرانوں نے اپنی اراضی رشتے داروں میں تقسیم کردی اور اس طرح وہ اصلاحات کے اثر سے بچ گئے تھے۔ بہت سارے زمینداروں نے پہلے ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ بھٹو زرعی اصلاحات نافذ کریں گے۔ لہٰذا انہوں نے اصلاحات کے اعلان سے پیشتر اپنی اراضی اپنے رشتے داروں کے نام منتقل کردی تھی جس کی وجہ سے ان کی اراضی خاندان میں ہی رہی۔ اس کے علاوہ ایسے بڑے زمیندار جن کے پاس وافر زمین بچ گئی تھی انہوں نے فالتو زمین اپنے با اعتماد ملازمین اور مزارعوں کے نام منتقل کردی اور جب اصلاحات مکمل ہوگئیں تو دوبارہ اپنے نام منتقل کرالی تھی۔

حق شفع زمین پر کاشتکاری کرنے والے کسانوں کو دے دیا گیا۔ اس کا مقصد کسانوں اور کاشتکاروں کے حقوق کا تحفظ کرنا تھا۔ اس قانون کی رو سے زمین کی فروخت کے وقت حاضر کاشت کار اور مزارع کو زمین خریدنے کا سب سے پہلے حق دیا گیا تھا۔

نومبر 1975ء میں ایسے چھوٹے زمیندار جن کے پاس 12 ایکڑ نہری اراضی اور 25 ایکڑ بنجر زمین کو لگان اور دوسرے تمام ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس طرح سے ہونے والے حکومتی نقصان کو دوسرے بڑے زمینداروں جن کے پاس 50 ایکڑ نہری اراضی اور 100 ایکڑ بنجر زمین تھی پر لگان اور ٹیکس سے پورا کیا گیا۔ زرعی آلات کی خرید پر تمام ٹیکس معاف کردیے تاکہ پیداوار بڑھائی جاسکے زمین کو قابل کاشت بنانے اور پیداوار بڑھانے کی ترغیب دینے کے لیے آسان اقساط پر قرضوں کا اجرا کیا گیا۔

19 مارچ 1972ء کو لائف انشورنس کا کاروبار قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ 43 انشورنس کمپنیوں جن میں 4 عدد غیر ملکی کمپنیوں کا انتظام و انصرام سنبھالنے کے لیے مہتمم مقرر کیے گئے۔ نومبر 1972ء میں حکومت نے انشورنس کا کاروبار چلانے کے لیے لائف انشورنس کارپوریشن قائم کی۔

تعلیمی اصلاحات:

ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے تعلیمی نظام کو حقیقی اور جدید بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے عوامی خواندگی کے ایک وسیع اور اعلیٰ پروگرام کا منصوبہ بنایا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے تعلیم کو لازمی قرار دیا اور اس کے لیے مفت تعلیم پر زور دیا۔ تعلیمی پالیسی کا اعلان 1972ء میں کیا گیا۔ مطلوبہ تعلیمی ہدف حاصل کرنے کے لیے دو مرحلوں کا اعلان کیا گیا۔

پہلے مرحلے کا آغاز اکتوبر 1972ء میں کیا گیا۔ اس مرحلے کے دوران آٹھویں جماعت تک تعلیم لازمی اور مفت قرار دی گئی۔ دوسرے مرحلے کا آغاز اکتوبر 1974ء میں ہوا جس کے دوران دسویں تک تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔ لازمی اور مفت تعلیم کا ہدف حاصل کرنے کے لیے نئے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ تمام نجی تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا اور اساتذہ کے لیے بہتر ملازمت کے مواقع پیدا کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ سیدو شریف، ملتان اور سکھر میں نئی یونیورسٹیاں کھولی گئیں اور گوجرانوالہ، راولپنڈی، بہاولپور، خیرپور میں تعلیمی بورڈز قائم کیے گئے۔ کراچی، جامشورو اور پشاور کے انجینئرنگ کالجز کو یونیورسٹی بنا دیا گیا۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن قائم کیا گیا۔ تمام تعلیمی اداروں میں NCC کی تربیت کا آغاز کیا گیا۔

صحت پالیسی:

پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار حکومت نے عوام کو علاج معالجے کی بہتر سہولیات بہم پہنچانے کا احساس کیا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے عوام کے لیے صحت پالیسی کا اعلان کیا اور یہ وعدہ کیا کہ اب علاج اور بہتر صحت کی سہولیات عام آدمی کی پہنچ میں ہوں گی۔ چیچک، ملیریا اور ہیضہ کی روک تھام کے لیے بھرپور کوششوں کا آغاز کیا گیا۔ یہ کوشش آزاد کشمیر، گلگت اور شمالی علاقہ جات میں بھی کی گئی۔

ہسپتال اور ڈسپنسریوں میں اہل ڈاکٹروں کی تعیناتی کی گئی۔ ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں وافر ادویات اور دوسرے آلات مہیا کیے گئے۔ نئے ہسپتال اور ڈسپنسریاں قائم کی گئیں۔ ادویات کی برآمد برانڈ ناموں کی بجائے ان کے اصلی ناموں سے شروع کی گئی۔

خارجہ پالیسی:

جب بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو بنگلہ دیش کی لڑائی میں ہندوستان سے شکست کی وجہ سے پاکستان کا وقار بری طرح مجروح ہو چکا تھا۔ بھٹو جنگ ہارنے کی وجہ سے جو رسوائی ہوئی اس سے پوری طرح واقف تھے اور ملکی ساکھ کو بحال کرنے کے لیے بے چین تھے۔ لہٰذا انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی سب سے پہلے برادر مسلمان ملکوں کے سربراہوں سے ملاقات کا ارادہ کیا تاکہ ان کے شکوک و شبہات کو دور کر کے پاکستان کی کھوئی ہوئی ساکھ کو بحال کیا جاسکے۔ بھٹو مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے دوست ممالک کے دورے پر روانہ

ہوئے جنہوں نے ہر مشکل میں پاکستان کا ساتھ نبھایا تھا اور بیرون دنیا پاکستان کی ساکھ بحال کرنے کے لیے جن کی حمایت کی اشد ضرورت تھی۔ بھٹو نے انتہائی برق رفتاری سے 21 ممالک کا تھکا دینے والا دورہ کیا۔ انہوں نے تمام ممالک میں جہاں وہ گئے اپنی خارجہ پالیسی کی وضاحت کی اور اعلان کیا کہ وہ تمام ممالک کے ساتھ دو طرفہ دوستانہ تعلقات چاہتے ہیں۔ بھٹو نے چین اور روس کا بھی دورہ کیا جو کہ بہت اہمیت کا حامل تھا۔ چین پاکستان کا دیرینہ دوست ملک رہا ہے اور ہر کڑے وقت میں پاکستان کی مدد کی ہے۔

روس بہت عرصے سے بھارت کا دوست رہا ہے اور اس کا جھکاؤ ہمیشہ بھارت کے حق میں رہا ہے۔ 1965ء کی جنگ کے دوران روس نے پاکستان اور بھارت دونوں کی فوجی امداد میں کمی کردی لیکن روس نے بھارت کو ہتھیاروں کی رسد جاری رکھی جس کی وجہ سے پاکستان کے لیے شدید مشکلات پیدا ہوئی۔ فوجی امداد کے باوجود روس نے سفارتی سطح پر بھی اقوام متحدہ میں بھارتی کوششوں کی حمایت کی اور مشرقی پاکستان میں فائر بندی کروانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ روس کی حمایت کی وجہ سے بھارت نے پاکستان کو دو لخت کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ روس اپنے ایشیائی تحفظ (Asian Security Scheme) کے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے بے چین تھا جس میں ایشیا کے وہ ممالک جہاں پر اس کا اثر ونفوذ تھا کو آپس میں ایک بلاک میں جوڑنا چاہتا تھا اس منصوبے کا مقصد پاکستان کو کمزور کر کے افغانستان کو طاقتور بنانا تھا۔

افغانستان میں روس کا کردار پاکستان کے لیے تشویش کا باعث تھا۔ روس افغانستان کو بھاری تعداد میں اسلحہ اور فوجی ساز وسامان بہت دیر سے فراہم کررہا تھا اور افغانستان کی اقتصادی ترقی کے لیے سرکردہ کردار ادا کررہا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر بھٹو روس کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنا چاہتے تھے۔ مارچ 1972ء میں بھٹو نے روس کے ساتھ پہلے سے قائم تعلقات کو مضبوط کرنے اور مزید دوستانہ مراسم قائم کرنے کے لیے روس کا دورہ کیا۔

1965ء کی جنگ کے بعد امریکہ سے دوستانہ تعلقات میں سرد مہری آ گئی تھی۔ امریکہ کی طرف سے ہتھیاروں کی سپلائی رک جانے کی وجہ سے بھارت کی نسبت پاکستان شدید دباؤ میں آ گیا تھا۔ بھٹو کی دو طرفہ تعلقات کی پالیسی اور اصلاحات نے امریکی رائے عامہ پر مثبت اثرات مرتب کیے تھے جس کے نتیجہ میں دونوں ممالک کے درمیان قائم تعلقات کو نئے سرے سے مستحکم بنیادوں پر استوار کیا گیا۔

بھارت نے بنگلہ دیش کی جنگ کے بعد پاکستان کے 93 ہزار فوجیوں کو قیدی بنالیا تھا۔ پاکستان نے اپنے فوجیوں کی واپسی کے لیے گفتگو کے لیے بھارت کو کہا جس کے جواب میں بھارت نے کہا کہ چونکہ پاکستانی قیدی بھارت اور بنگلہ دیش دونوں ممالک کی تحویل میں ہیں اس لیے قیدیوں کی واپسی کے لیے بات چیت سے پہلے پاکستان کو بنگلہ دیش کو آزاد مملکت کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہوگا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے فوجی قیدیوں کے مسئلے پر کسی قسم کا دباؤ قبول کرنے سے سختی سے انکار کردیا۔ بھٹو نے اپنی تقاریر اور بیانات کے ذریعے یہ واضح کردیا کہ پاکستان کسی صورت بھی قیدیوں کے مسئلے پر اپنی غیرت اور قومی خودداری کو قربان نہیں کریگا۔

پیپلز پارٹی کی حکومت نے مغربی ممالک بالخصوص مغربی یورپ اور امریکہ کو بھارت کی جنیوا کنونشن کی کھلے عام وحشیانہ خلاف ورزی اور قیدیوں کے مسئلے کو سیاسی دباؤ ڈالنے کی شرمناک کوشش سے آگاہ کرنے کے لیے بھرپور مہم کا آغاز کیا۔ پاکستان نے یک طرفہ طور پر اپنی تحویل میں بھارتی قیدیوں کو رہا کردیا۔ بھٹو نے تقریباً 30 ہزار بنگالی فوجیوں کو جو بنگلہ دیش کی جنگ سے پہلے مغربی پاکستان میں تعینات تھے واپس ان کے ملک بنگلہ دیش بھیجنے کی پیشکش کی۔

اسلامی کانفرنس کی دوسری سربراہ کانفرنس فروری 1974ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ سربراہ کانفرنس کا انعقاد دراصل پاکستان کی اسلامی دنیا کے اہم اور مضبوط رکن کے طور پر بحالی کو تسلیم کرتا تھا۔ جب سعودی عرب کے شاہ فیصل نے یہ مشورہ دیا کہ سربراہ

کانفرنس پاکستان میں منعقد ہونی چاہیے تو تمام مسلمان ممالک نے بخوشی اس تجویز کو مان لیا جو کہ پاکستان کی بیرونی دنیا میں مقبولیت کا ثبوت ہے۔

بھٹو کی سیاست میں اسلامی جھکاؤ رحجانات:

ذوالفقار علی بھٹو ایک ایسے نظر شناس مسلمان تھے جو کسی بھی نظریے کے عملی فوائد پر یقین رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی پارٹی اور حکمت عملی کے لیے عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اپنی تقاریر میں بھرپور انداز میں اسلامی رحجانات کا مظاہرہ کیا۔ اس طرح سے بھٹو پاکستان میں اسلامی احیاء کا موجب بنے۔ بھٹو ایک انتہائی ذہین اور شاطر انسان تھے وہ پہلے سیاست دان کی حیثیت سے ابھرے جس نے پاکستان میں اقتدار پانے کے لیے اسلام کو بڑی مہارت سے اپنی سیاسی مہم کا حصہ بنایا تھا۔ انہوں نے 1967ء میں اپنی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کا آغاز کیا جس کے لیے انہوں نے پارٹی منشور کے چیدہ چیدہ اصولوں کی نشان دہی کی۔ بھٹو نے دلوں کو موہ لینے والے نعرہ کا اعلان کیا اور کہا اسلام ہمارا دین، جمہوریت ہماری سیاست اور اسلامی سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ اس نعرہ سے بھٹو عوام کو اپنے سیاسی جال میں لانا چاہتے تھے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔

بھٹو نے اسلامی سوشلزم کے نام سے ایک انوکھے اور نادر نظریے کا اعلان کیا۔ بھٹو اسلامی سوشلزم کو اسلام کے اعلیٰ اصولوں انصاف، برابری، مساوات اور انسان کی برتری سے تعبیر کرتے تھے۔ 1969ء ہی سے بھٹو اسلامی نظریہ پر زور دیتے آئے تھے لیکن 1970ء کے انتخابات میں بھٹو کے اسلامی نظریات زیادہ کھل کر سامنے آئے۔ 26 جون 1969ء کو حیدرآباد میں ڈسٹرکٹ بار ایسوی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے کہا ''اسلام ہمارا مذہب ہے۔ پاکستان کا قیام اس لیے عمل میں آیا کیونکہ ہم مسلمان تھے۔ ہم اسلام کے لیے ہر قربانی دیں گے۔ اسلام کا مطلب مسلمانوں کی طاقت ہے۔ اگر آپ اسلام اور پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو عوام کو طاقتور بنائیں۔ اس طرح آپ اپنے خدا اور ملک کی خدمت کریں گے۔ بے شک مساوات اسلام کے سنہری اصولوں کا حصہ ہے۔ اسلام مساوات و برابری پر کسی بھی دوسری چیز کی بہ نسبت زیادہ زور دیتا ہے۔'' 17 جنوری 1970ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں بھٹو نے اعلان کیا ''ہم پہلے مسلمان اور بعد میں پاکستانی ہیں۔ ہم اسلام پسندوں کے برعکس اسلام سے محبت کرتے ہیں۔ ہمارا سب سے اولین اصول اسلام ہمارا مذہب ہے۔ اسلام میں سماجی و معاشی برابری یا مساوات سب سے پہلا اصول ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مساوات کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے لہٰذا ہم بھی مساوات لائیں گے۔''

بھٹو نے نظریہ اسلامی سوشلزم کا وعدہ پورا کیا اور 1973ء کے آئین جسے پیپلز پارٹی کی اسمبلی نے پاس کیا تھا میں بہت ساری اسلامی شقیں شامل کیں۔ باوجود اس کے کہ بھٹو سیکولر خیالات کے حامل تھے انہوں نے 1973ء کے آئین کو مکمل اسلامی رنگ میں ڈھال دیا تھا۔

لیکن کٹر اور راسخ العقیدہ مسلمان طبقوں نے اسلامی سوشلزم سے نفرت کا اظہار کیا اور برملا اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے اسلامی سوشلزم کو اسلام کے اصولوں کے خلاف قرار دیا۔ اسلام پسند جماعتوں اور بنیاد پرست طبقوں نے سچے اسلامی اصولوں سے انحراف ملک کے ٹوٹنے کو اللہ کے قہر و غضب سے تعبیر کیا۔

پیپلز پارٹی کا خالص اسلام کی طرف جھکاؤ جو کہ 74-1971ء میں ابھر کر سامنے آیا دراصل مذہبی اور پرانے خیالات کے حامی طبقوں کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ پیپلز پارٹی کے نظریات میں تبدیلی مولانا کوثر نیازی کے پارٹی میں اثر ونفوذ کی وجہ سے آئی۔ مولانا کوثر نیازی بھٹو کی کابینہ کے ایک اہم رکن اور بنیاد پرست جماعت اسلامی کے سابق سرکردہ رکن تھے۔ مولانا کوثر نیازی نے بھٹو پر دباؤ ڈالا کہ مذہبی طبقوں کو چند مراعات دے دی جائیں۔ بالآخر مولانا کوثر نیازی اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے علاوہ مذہبی

طبقوں نے مجموعی طور پر 1970ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی سے زیادہ ووٹ حاصل کیے تھے۔ لہٰذا بھٹو اسلامی حلقوں کی حمایت حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔

قادیانی فرقے کو غیر مسلم قرار دینا:

قادیانوں کو غیر مسلم قرار دینا بھٹو کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ پاکستان کی مذہبی جماعتوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لیے پیپلز پارٹی کی حکومت پر بہت دباؤ ڈالا۔ بھٹو کو بالآخر مذہبی جماعتوں کے مطالبے کے سامنے جھکنا پڑا اور 1974ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ بھٹو بذات خود بھی یہ سمجھتے تھے کہ قادیانی ختم نبوت سے منکر ہیں لہٰذا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

بھٹو کے اسلامی اقدامات:

قادیانی فرقے کو غیر مسلم قرار دینے کے علاوہ بھٹو نے متعدد دوسرے اسلامی اقدامات کیے جن کا مقصد مذہبی جماعتوں کی مخالفت کو ختم کرنا تھا۔ ان اقدامات کا مقصد پاکستانی معاشرے میں اسلامی رجحانات کو فروغ دینا تھا تاکہ مکمل اسلامی نظام کے قیام کا راستہ ہموار کیا جاسکے۔ ان اقدامات میں ریڈ کراس کا نام بدل کر ہلال احمر رکھ دیا گیا۔ پاکستان کے تمام ہوٹلوں کے کمروں میں قرآن پاک کی کاپیاں رکھی گئیں۔ ہفتہ وار تعطیل اتوار کے بجائے جمعہ کو قرار دی گئی۔ نائٹ کلب، جوا خانے اور شراب کی تیاری اور نقل وحمل پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ ریڈیو پاکستان سے باقاعدگی کے ساتھ عربی پروگرام نشر کرنے کا حکم دیا گیا۔ گھڑ دوڑ پر پابندی لگا دی گئی۔ شیعہ اور سنی طلباء کے لیے علیحدہ علیحدہ مذہبی تعلیم کا اجرا کیا گیا۔

باب نمبر 11

تیسرا مارشل لاء

جنرل محمد ضیاالحق، آئینی و سیاسی ارتقا

پیپلز پارٹی کا بنایا ہوا 1973ء کا آئین تمام متعلقہ سیاسی جماعتوں اور طبقوں کی آراء پر مبنی تھا اور اسے تمام صوبوں کی حمایت حاصل تھی۔ 14 اگست 1973ء کو آئین کے نفاذ کے ساتھ پاکستان میں جمہوریت اور سیاسی استحکام کا نیا باب شروع ہوا۔ اس کے باوجود 1973ء کا آئین عوام کی امیدوں اور خواہشات کو پورا کرنے میں ناکام رہا اور عوام ایک دفعہ پھر بے یقینی اور مایوسی کا شکار ہو گئے۔

بھٹو کی حکومت پر 1973ء کے آئین میں بے جا تبدیلیوں کا الزام لگایا گیا جس کی وجہ سے 1973ء کا آئین مسخ ہو گیا تھا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت پر صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کو 1973ء کے آئین کے مطابق صوبائی خودمختاری نہ دینے اور انہیں آزادی سے کام نہ کرنے کا الزام بھی لگایا گیا۔ دونوں صوبوں میں گورنر راج لگا دیا گیا۔ جس کی وجہ سے عوام میں سخت بے چینی اور مایوسی پھیل گئی۔ حزب اختلاف کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا اور انہیں پارلیمنٹ سے اٹھا کر باہر پھینکا گیا جس کی وجہ سے پارلیمنٹ کا تقدس مجروح ہوا۔

1973ء کے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات 1977ء میں ہوئے جن میں پیپلز پارٹی نے بھاری اکثریت حاصل کی جو پہلے کبھی کسی سیاسی جماعت نے حاصل نہیں کی تھی۔ ہارنے والی سیاسی جماعتوں نے پیپلز پارٹی کی حکومت پر انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا۔ احتجاجاً صوبائی انتخابات کا قطع تعلق کیا گیا۔ ہارنے والی سیاسی جماعتوں نے انتخابات کے نتائج کو ماننے سے انکار کر دیا اور انتخابات دوبارہ کروانے کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے سختی سے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس احتجاج کی وجہ سے ملک میں آئینی بحران پیدا ہوا جسے دبانے کے لیے حکومت نے جابرانہ اقدامات استعمال کیے جس سے بحران میں مزید اضافہ ہوا۔

سیاسی جماعتوں اور حکومت کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس بحران کی وجہ سے امن و امان کی صورت حال پیدا ہوئی جسے سنبھالنے کے لیے اس وقت کے فوجی سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق نے جولائی 1977ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کو ختم کر کے مارشل لاء لگا دیا اور ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے آئین کی خلاف ورزی پر سپریم کورٹ میں رٹ دائر کی جسے سپریم کورٹ نے ''قانونی ضرورت'' کے تحت نامنظور کر دیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے باعث جنرل ضیاء الحق کی حکومت کو حقیقی حکومت تسلیم کر لیا گیا اور جنرل ضیاء ملک کے سربراہ بن گئے۔

جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگاتے وقت یہ کہا کہ وہ تین مہینے کے اندر نئے انتخابات کروا کے اقتدار منتخب نمائندوں کو دے دیں گے لیکن درحقیقت ان کا مارشل لاء پاکستان کا سب سے طویل مارشل لاء ثابت ہوا اور وہ گیارہ سال تک اقتدار پر قابض رہے۔ اپنے دو پیشرووں فیلڈ مارشل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان کے برعکس جنرل ضیاء نے 1973ء کا آئین منسوخ نہ کیا بلکہ اسے معطل کر دیا۔ تمام بنیادی حقوق اور عدالتوں میں جاری کارروائی بھی معطل کر دی گئی۔ مارشل لاء کے لگتے ہی تمام انتظامی اختیارات چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو منتقل ہو گئے۔ جس کی رو سے وہ گورنر، وزراء اور عدالتوں کے جج مقرر کر سکتا تھا۔

ضیاء نے بھٹو کے بعد گیارہ سال تک حکومت کی۔ ان کی حکومت ملک کے مختلف طبقوں کے لیے سود مند تھی۔ وہ مغربی ممالک کے ساتھ بھرپور تعاون اور دوستی بڑھانے کے خواہش مند تھے۔ اس کے عوض وہ اپنے ملکی بحران پر قابو پانے کے لیے فوجی اور معاشی امداد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مغربی ممالک اندرونی طور پر خود معاشی مشکلات کا شکار تھے اور ان کے لیے دوسری قوموں کو مدد دینا ممکن نہ تھا۔ معاشی مراجعت (Economic Recession) نے مغربی ممالک کی معیشت پر زبردست دباؤ ڈالا ہوا تھا جس کی بنا پر تیسری دنیا کے فوجی پروگرام کی مالی معاونت کو کم کرنا پڑا تھا۔ لہٰذا مغربی قومیں اپنی معاشی مشکلات کی وجہ سے قرضے دینے کی حالت میں نہ تھیں۔

ضیاء الحق کو اقتدار سنبھالنے کے دو سال بعد تک ملک کے سیاسی حالات پر قابو پانے کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ اس عرصے کے دوران انہوں نے قوم کی توجہ بھٹو کے مقدمے پر لگائے رکھی۔ جس نے انہیں بھٹو کی طاقت اور ہر دلعزیزی کو جانچنے کا موقع دیا۔ ایک تھکا دینے والے مقدمے کے بعد بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد ضیاء الحق کو بیرونی امداد کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس ہوئی کیونکہ معاشی امداد کے بغیر پاکستان تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔

ضیاء الحق طویل عرصے تک برسر اقتدار رہے۔ انہوں نے 90 دن کے اندر انتخابات کروا کے اقتدار منتقل کرنے کے وعدے کے ساتھ اقتدار سنبھالا تھا۔ یہ انتخابات ان کی زندگی میں نہ ہو سکے۔ اپنے عرصہ حکومت کے دوران قوم سے کیے انتخابات کے وعدے کی وجہ سے ضیاء الحق سخت بے چین رہے۔ ان کا بار بار اپنے وعدے سے ہٹ جانا، مسلسل پالیسی کو تبدیل کرتے رہنا ان کے اندرونی خلفشار کو ظاہر کرتا تھا جو قوم کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو چکا تھا۔

مقدمہ قتل میں بھٹو کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ اس سے پہلے کبھی بھی کسی منتخب سربراہ مملکت کو تختہء دار پر نہ لٹکایا گیا تھا۔ بھٹو کے مقدمہء قتل کی اچھائیوں یا برائیوں کے باوجود ضیاء سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد بھی سزائے موت کو تبدیل کر سکتے تھے۔ ملک کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے ضیاء کو آئینی اختیار حاصل تھا کہ وہ بھٹو کو معاف کر دیتے لیکن انہوں نے اپنا یہ اختیار بھٹو کے مقدمے میں پس پشت ڈال دیا۔

ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے تحت عدالتی نظام کو مزید واضح کیا گیا جس کے لیے چیف مارشل لاء آرڈر نمبر 1، 1981ء جاری کیا گیا۔ پی سی او 1981ء کے تحت یہ واضح کیا گیا کہ CMLA نے شروع ہی سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جمہوریت اور نمائندہ اداروں کی اسلامی اصولوں کے مطابق بحالی کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ پی سی او 1981ء کے تحت عدلیہ کے اختیارات کو واضح کر دیا گیا۔

ملک میں سیاسی سرگرمیاں معطل کر دی گئیں۔ پی سی او میں یہ اعلان کیا گیا کہ صرف صدر کے حکم سے سیاسی سرگرمیاں جاری رکھی جا سکتیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ صرف ایسی سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت ہوگی جو الیکشن کمیشن کے ساتھ رجسٹرڈ ہوں گی اور جنہیں الیکشن کمیشن نے 11 اکتوبر 1979ء تک انتخابات میں حصہ لینے کا اہل قرار دیا ہوگا۔ اس کے علاوہ تمام دوسری جماعتیں کالعدم قرار دے دی گئیں اور ان کے اثاثہ جات ضبط کر لیے گئے۔ کوئی نئی سیاسی جماعت الیکشن کمیشن کی پیشگی اجازت کے بغیر قائم نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اگر صدر یہ سمجھیں کہ کوئی سیاسی جماعت اسلامی نظریہ اور اصولوں کے خلاف کام کر رہی ہے تو وہ اس جماعت کو منسوخ کر سکیں گے۔

24 دسمبر 1981ء کو پی سی او 15 جاری کیا گیا جس کی رو سے ایک مجلس شوریٰ قائم کی گئی۔ مجلس شوریٰ اسلامی نظام کے قیام کے لیے حکومت کی اعانت اور مدد کے لیے قائم کی گئی۔ مجلس شوریٰ 350 ارکان کے ساتھ 1982ء میں معرض وجود میں لائی گئی۔

وفاقی وزراء اور وزراء مملکت بلحاظ عہدہ مجلس شوریٰ کے اراکین تھے۔ صوبوں میں بھی مجلس شوریٰ قائم کی گئی۔ شروع میں مجلس شوریٰ ایک مشاورتی ادارہ تھی۔ لیکن بعد میں صدر نے اسے قانون ساز ادارہ میں منتقل کر دیا۔

12 اگست 1983ء کو ضیاء الحق نے مجلس شوریٰ سے خطاب کیا جس میں انہوں نے فوجی حکومت سے غیر فوجی حکومت کو انتقال اقتدار کے لیے اپنے سیاسی منصوبے کا اعلان کیا۔ اس منصوبے کے مطابق 1973ء کے آئین کے تحت جسے ضروری ترامیم کے بعد بحال کیا جانا تھا انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ ضیاء نے اپنے سیاسی منصوبے کو اسلامی نظام کے لیے مثبت لائحہ عمل قرار دیا۔ ضیاء نے اسلامی نظریاتی کونسل کو حکومت کی تشکیل اور ڈھانچے کے بارے اپنی تجاویز دینے کا حکم دیا۔ انہوں نے اپنی کابینہ کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے ذمے آئینی مسائل کی روشنی میں حکومت کے ڈھانچے کے لیے تجاویز دینے کا کام لگایا گیا۔ اسلام کے ایک مشہور سکالر مولانا ظفر احمد انصاری کی سربراہی میں ایک خصوصی کمیٹی قائم کی گئی جسے اسلام کے جمہوری نظام کے بارے میں تجاویز دینے کے لیے حکم دیا گیا۔ ان تمام کمیٹیوں کی تجاویز کا ضیاء اور ان کے رفقاء کار نے بغور جائزہ لیا۔ ان تجاویز کی روشنی میں 12 اگست 1983ء کے سیاسی منصوبے کو حتمی شکل دی گئی۔ سیاسی منصوبے پر عملدرآمد کے لیے 1973ء کے آئین میں چند بنیادی تبدیلیوں کی سفارش کی گئی۔ اس پس منظر میں جو آئینی مسائل زیر غور آئے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1- ملک کا نظام حکومت صدارتی ہوگا یا پارلیمانی۔
2- ریاست وفاقی ہوگی یا وحدانی۔
3- کیا 1973ء کے آئین کو اپنی اصلی ہیئت کے ساتھ بحال کر دیا جائے یا اس میں چند ترامیم ہونی چاہئیں یا پھر نیا آئین بنایا جائے۔
4- صدر اور وزیراعظم کے اختیارات کا تعین اور ان کے درمیان اختیارات کا توازن کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔
5- مسلح افواج کا آئینی کردار کیا ہونا چاہیے۔
6- کیا موجودہ صوبائی نظام کو برقرار رکھا جائے یا نئے صوبے تشکیل دیئے جائیں۔
7- انتخابات کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔ کیا انتخابات متناسب نمائندگی کے تحت ہونے چاہیں یا اکثریت رائے یا جداگانہ انتخابات کے ذریعے۔
8- معاشرے میں عورتوں کا کردار۔
9- اقلیتوں کے حقوق کیا ہونے چاہئیں اور ان کا تحفظ کیسے کیا جائے۔

متعدد آئینی مسائل کا بغور جائزہ لینے کے بعد ضیاء الحق نے 1973ء کے آئین کو ضروری ترامیم کے بعد بحالی آئین حکم نمبر 14، 1985 کے ذریعے بحال کر دیا۔ ضیاء نے بحالی جمہوریت کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کا اعلان کیا۔

1- آئین کو بحال رہنا چاہیے لیکن صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن رکھا جائے اور آئین کو اسلامی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے۔
2- مسلح افواج کا کوئی آئینی کردار نہ ہوگا۔
3- انتخابات بالغ رائے دہی کے اصول پر ہوں گے۔
4- وزیراعظم کا تقرر صدر کرے گا۔ جس شخص کو وزیراعظم مقرر کیا جائے گا اسے قومی اسمبلی میں صدر کے سامنے اپنی اکثریت ثابت کرنا ہوگی۔
5- جس وقت صدر کے خیال کے مطابق نئے انتخابات کی ضرورت ہوگی صدر اس وقت قومی اسمبلی کو برخاست کر سکے گا۔

6- صدر کو پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کو دوبارہ پرکھنے کے لیے پارلیمنٹ کو واپس بھجوانے کا اختیار ہوگا۔
7- صدر مسلح افواج کا سپہ سالار اعلیٰ ہوگا۔ وہ مسلح افواج کے سربراہ کا تقرر کرے گا اور ان کی تقرری کے قواعد وضوابط کا تعین کرے گا۔
8- صدر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے مشورے سے چیف الیکشن کمشنر اور الیکشن کمیشن کے ارکان کا تقرر کرے گا۔
9- صدر صوبائی گورنروں کا تقرر کرے گا۔
10- قومی سیکورٹی کونسل تشکیل دی جائے گی۔ حکومت وقت سیکورٹی کونسل کے مشورے کے بغیر ہنگامی حالت کا اعلان نہ کر سکے گی۔
11- معاشی ترقی کے لیے نجی شعبے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

انتخابات 1983ء:

اپنے سیاسی منصوبے میں جنرل ضیاء نے مختلف نمائندہ اداروں کے انتخابات کروانے کے لیے 18 ماہ کے دورانیہ کے منصوبے کا اعلان کیا تھا۔ ضیاء الحق موجودہ دور اور جمہوری نظام کے لیے انتخابات کی افادیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جمہوریت کی بحالی کے لیے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کروانے کے حق میں تھے۔ یہ انتخابات دو مرحلوں میں ہونے تھے۔ پہلے مرحلے میں مقامی اداروں کے انتخابات کروائے گئے جو کہ 1983ء میں ہوئے۔ 1983ء کے مقامی اداروں کے انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کروائے گئے۔ ضیاء مقامی اداروں کے کردار کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مقامی اداروں میں صرف وہی نمائندے آنے چاہئیں جو جماعتی سیاست میں ملوث نہ ہوں اور صرف عوام کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں۔ مقامی حکومتوں کا ڈھانچہ مکمل جمہوری بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا اور انہیں چار سال کے عرصے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ معاشرے کے مختلف طبقے یعنی کسان، مزدور، مذہبی اقلیتیں جو کہ مختلف ثقافتی اور معاشی وجوہات کی بنا پر مناسب نمائندگی حاصل کرنے سے قاصر تھیں انہیں مقامی حکومت کے ڈھانچے میں خصوصی نمائندگی دی گئی تھی۔

1983ء کے انتخابات کے نتیجہ میں 4100 یونینز کے 71 اراکین، 84 ضلعی ایجنسیاں، 129 میونسپل کارپوریشن، 285 ٹاؤن کمیٹیاں اور 39 چھاؤنی بورڈز منتخب کیے گئے۔ اس میں 3929 کسان، 472 مزدور، 7539 خواتین اور 3472 اقلیتوں کی نشستیں شامل تھیں۔

دوسرے مرحلے میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے انتخابات کروائے گئے۔ اپنے سیاسی منصوبے میں ضیاء نے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ مارچ 1985ء تک انتخابات مکمل ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا جب انتخابات مکمل ہو جائیں گے اور جمہوری عمل بحال ہو جائے گا تو مارشل لاء ہٹا دیا جائے گا لیکن ضیاء کے سیاسی منصوبے میں صدر کے انتخاب کا طریق کار موجود نہ تھا جو کہ ایک سنگین غلطی تھی جس کا آنے والے واقعات پر گہرا اثر پڑا۔

ضیاء کے مخالفین اور چند سیاسی جماعتوں نے ضیاء کے انتقال اقتدار کے لیے 18 ماہ کے طویل عرصے پر اعتراض کیا اور کہا کہ 18 ماہ انتقال اقتدار اور بحالی جمہوریت کے لیے بہت طویل عرصہ ہے۔ اس طویل عرصے کو ضیاء کے دور حکومت کو لمبا کرنے سے تعبیر کیا گیا۔ ضیاء نے ان عناصر کو جو ان کے 18 ماہ کے انتقال اقتدار کے منصوبے کو تباہ کر دینا چاہتے تھے متنبہ کیا اور چند سیاسی راہنما جو سول نافرمانی تحریک منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کو گرفتار کر لیا گیا۔

قومی استصواب رائے 1984:

ضیاء الحق 1977ء سے لیکر 1983ء تک تمام آئینی، انتظامی اور سیاسی اختیارات کے بلاشرکت غیرے مالک رہے۔ انہوں نے اختیارات پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی اور وہ نئے منتخب شدہ اداروں پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ ایک طاقتور سپہ سالار کی طرح سیاسی اور انتظامی معاملات پر سختی سے کنٹرول رکھنا چاہتے تھے اور کسی اور کی حیثیت ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اپنے خلاف بڑھتی ہوئی معاندانہ رائے عامہ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ضیاء نے 1983ء میں انتقال اقتدار اور مارشل لاء کے خاتمے کے لیے اپنے سیاسی منصوبے کا اعلان کیا۔ ضیاء کا سیاسی منصوبہ مختلف سیاسی طبقوں کو مطمئن کرنے میں ناکام رہا۔ ضیاء کے اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے ہتھکنڈے ناکام ہو گئے اور پاکستان کے ایک حساس صوبے سندھ میں بحالی جمہوریت (MRD) کی تحریک شروع ہوئی۔

باوجودیکہ بحالی جمہوریت کی تحریک ضیاء کی اعلیٰ اور غالب حیثیت کو کمزور کرنے میں ناکام رہی پھر بھی یہ ضیاء کے آمرانہ رویہ کے بارے میں عوام میں نفرت و حقارت پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ضیاء کے سیاسی منصوبے میں صدر کے اختیارات اور طریقہء انتخاب کا ذکر نہیں کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ضیاء کو اپنی حیثیت خطرے میں محسوس ہوئی۔ بالخصوص تحریک بحالی جمہوریت کے احتجاج کے بعد آمرانہ پالیسیوں کی وجہ سے ضیاء کو اپنی حکومت اور اقتدار جاتا ہوا لگ رہا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر نئی صورتحال کو ضیاء نے اپنے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھا اور حکومت پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ایک انوکھی چال چلی۔ ضیاء نے استصواب رائے کرانے کا اعلان کیا۔ استصواب رائے کرانے کا واحد مقصد ضیاء کے آمرانہ تسلط کو آئینی بنیاد فراہم کرنا اور مارشل لاء کے تحت کیے گئے اقدامات کے لیے عوامی حمایت حاصل کرنا تھا۔ استصواب رائے کے ذریعے ضیاء عوام سے اپنی قیادت میں اسلامی نظام نافذ کرنے کے لیے تائید حاصل کرنا چاہتے تھے۔ استصواب رائے میں عوام سے جو سوال پوچھا گیا وہ یہ تھا ''کیا پاکستان کے عوام صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے ملکی قوانین کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جاری کردہ عمل کی تائید کرتے ہیں اور نظریہ پاکستان کے تحفظ اور منتخب نمائندوں کو پرامن انتقال اقتدار کے لیے کیے گئے اقدامات کی حمایت کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب ہاں یا ناں میں دینا تھا۔ استصواب رائے 19 دسمبر 1984ء کو کروایا گیا۔

الیکشن کمیشن جس کے تحت استصواب کروایا گیا کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق 33,992,425 رائے دہندگان میں سے 21,253,757 رائے دہندگان نے پوچھے گئے سوال کے حق میں ووٹ دیا۔ منفی ووٹوں کی تعداد صرف 316,918 تھی جس کے مطابق حق میں دیئے گئے ووٹ 97.7 فی صد تھے۔ استصواب کے نتائج کے مطابق ضیاء کو پانچ سال کے لیے پاکستان کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔

الیکشن کمیشن کے جاری کردہ نتائج جس کے ذریعے ضیاء کو 97.7 ووٹ کے ساتھ کامیابی ملی تھی کو مخالف سیاسی جماعتوں اور بیرونی میڈیا نے چیلنج کیا اور استصواب کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس چیلنج کے ڈر کی وجہ سے ضیاء نے ملک کے دور دراز علاقوں کے دورے کیے تاکہ عوام میں اپنی مقبولیت ظاہر کی جا سکے۔

ضیاء اپنے اسلامی نظریات کی وجہ سے شہری آبادی سے حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اسلامی نظام متعارف کروانے کا عمل عوام کو ضیاء کے حق میں کرنے کے لیے ایک انتہائی اہم قدم تھا۔ درحقیقت ضیاء نے انتہائی چالاکی سے عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلا تھا۔ عوام کی اسلامی نظام کے لیے کمزوری کو سمجھتے ہوئے ضیاء نے اپنی ڈولتی ہوئی فوجی حکومت کو بچانے کے لیے عوام کے سامنے ایک ایسا سوال رکھا تھا جسے عوام نہ تو منظور کر سکتے تھے کیونکہ اس طرح ضیاء قانونی طور پر پانچ سال کے لیے صدر بن جاتے اور نہ ہی اسے رد کر سکتے تھے کہ اس طرح اسلامی نظام متعارف کروانے کا عمل موخر ہو سکتا تھا۔ اس طرح استصواب کے حکم نامے نے عوام

کو گہرے تذبذب کی حالت سے دوچار کردیا تھا۔ اس معمے کو حل کرنے کا بہترین طریقہ ووٹنگ سے غیر حاضر رہنا تھا۔ لہٰذا رائے دہندگان کی بہت بڑی تعداد ووٹنگ والے دن پولنگ سٹیشنوں سے غیر حاضر رہی۔ رائے دہندگان کی بڑی تعداد کی غیر حاضری نے استصواب کے نتائج کو بے معنی بنا کر رکھ دیا۔ الیکشن کمیشن نے حسب معمول ایک کٹھ پتلی کی طرح غلط اور توڑ مروڑ کر نتائج کا اعلان کیا تھا جسے عوام نے تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ استصواب کے اعلان کردہ نتائج صدر یا ان کے شروع کردہ پروگرام کی عوام میں مقبولیت کی بجائے انتظامیہ اور الیکشن کمیشن کی مہارت اور کارکردگی کو زیادہ موثر طریقے سے اجاگر کرتے تھے۔ اس کے باوجود استصواب کے نتائج نے ضیاء کو پیپلز پارٹی اور تحریک بحالی جمہوریت کے علاوہ دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ سودے بازی کرنے کے لیے مضبوط موقع اور بنیاد فراہم کردی تھی۔ پیپلز پارٹی اور تحریک بحالی جمہوریت ضیاء اور اس کے پروگرام کی مخالفت کرتی رہیں۔

ضیاء نے اپنے 12 اگست 1983ء کے سیاسی منصوبے کو درمیانی عرصہ کے لیے جب تک مرکزی اور صوبائی سطح پر منتخب حکومتیں بن نہیں جاتیں اپنی حکومت کا منشور قرار دیا۔ وہ مندرجہ ذیل معاملات پر اقدامات کرنا چاہتے تھے۔

1- اسلامی نظام کے عمل کو تیز کرنا۔
2- ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانا۔
3- امن عامہ کی صورت حال کو بہتر بنانا اور چادر اور چار دیواری کے تقدس کو قائم رکھنا۔
4- معاشرے کو بدعنوانی اور بدانتظامی سے پاک کرنا۔
5- سستا اور فوری انصاف مہیا کرنا۔
6- ریاست کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ عوام کو شریک کرنا۔
7- تعلیمی نظام کو مکمل طور پر اسلامی نظریات سے ہم آہنگ کرنا اور جہالت کا خاتمہ کرنا۔
8- ترقیاتی منصوبوں کو تیز کرنا تاکہ زیادہ سے زیادہ علاقوں کو زندگی کی سہولیات بہم پہنچائی جاسکیں۔
9- پاکستان کو حقیقی اسلامی مملکت بنانا جہاں پر غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کو مکمل تحفظ دیا جاسکے۔

انتخابات:

استصواب کے عمل سے اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے بعد ضیاء نے اپنے سیاسی منصوبے پر عمل درآمد کے لیے آخری اقدامات کا آغاز کیا۔ 12 جنوری 1985ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے صدر نے اعلان کیا کہ ملک میں عام انتخابات فروری 1985ء میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کرائے جائیں گے۔ ضیاء نے انتخابات کروانے کے لیے ایک جامع منصوبے کا اعلان کیا جس میں انتخابات لڑنے والے امیدواروں کے لیے قواعد وضوابط، اہلیت اور نااہلی سے متعلق قوانین بیان کیے گئے۔ انتخابات مندرجہ ذیل اصولوں کی بنیاد پر کروائے جانے تھے۔

1- عام انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں گے۔
2- مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے اصول پر انتخابات ہوں گے۔
3- صوبائی اور قومی اسمبلیاں تمام اختیارات کی حامل ہوں گی۔
4- مسلح افواج انتخابات کروانے میں الیکشن کمیشن اور سول انتظامیہ کی مدد کریں گی۔

ضیاء نے صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے ڈھانچہ میں تبدیلیاں کیں جو کہ مندرجہ ذیل تھیں:

قومی اسمبلی:

بلوچستان کی موجودہ 7 نشستوں کو بڑھا کر گیارہ کر دیا گیا۔

1- قومی اسمبلی میں صوبہ سندھ کی نمائندگی تین نشستیں مقرر کیں جن میں سے دو نشستیں سکھر کو دے دی گئیں۔

2- قومی اسمبلی میں خواتین نشستوں کی تعداد 10 سے بیس کر دی گئی۔

3- اقلیتوں کی نشستوں کی تعداد بڑھا دی گئی جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

4-

عیسائی ---------------- 4 نشستیں

ہندو ---------------- 4 نشستیں

قادیانی ---------------- 1 نشست

دوسری اقلیتیں ---------------- 1 نشست

اس طرح قومی اسمبلی کی نشستوں کی کل تعداد 237 مقرر کی گئی۔

سینٹ:

سینٹ کی موجودہ نشستوں کی تعداد 67 سے بڑھا کر 87 کردی گئی۔ اس طرح سینٹ کی موجودہ رکنیت کی تعداد میں 20 نشستوں کا اضافہ کردیا گیا۔ ان بیس نشستوں کو چاروں صوبوں میں برابر تقسیم کیا گیا۔ یہ اضافی نشستیں تمام صوبوں کے علماء، ٹیکنو کریٹس اور پیشروؤں کے لیے مختص کی گئیں۔

صوبائی اسمبلیاں:

صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں اور خواتین کی نشستوں میں اضافہ کردیا گیا۔ خواتین کی نشستیں 10 سے بڑھا کر 20 کردی گئیں۔ قومی اسمبلی کے لیے انتخابات 25 فروری 1985ء کو کروا لیے گئے۔ صوبائی اسمبلیوں کے لیے انتخابات 28 فروری 1985ء کو کروائے گئے۔ قومی اسمبلی میں ڈالے گئے ووٹوں کا فی صد تناسب 52.93 اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں 56.82 رہا۔

مخالف سیاسی جماعتوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے لیے عوام سے اپیل کی۔ پاکستان کے عوام نے اس اپیل کو رد کردیا لیکن اس کے ساتھ ہی ضیاء کی کابینہ کے 5 وزراء اور متعدد دوسرے امیدواروں کو جو ضیاء کی مارشل لاء حکومت میں شامل رہے تھے انتخابات میں رد کردیا۔ سینٹ کے انتخابات مارچ 1985ء میں منتخب صوبائی اسمبلیوں کے ذریعے کروائے گئے۔

انتخابات کے نتائج سے ضیاء کی غیر جانبداری اور ایمانداری ثابت ہوئی۔ کیونکہ ضیاء کی کابینہ کے چند نہایت اہم وزراء کو عوام نے رد کردیا تھا۔ ضیاء نے 25 فروری 1985ء کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وزراء انفرادی حیثیت میں انتخاب لڑ رہے ہیں۔ میں تمام وزراء کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں اگر اس کے باوجود کوئی وزیر ہار جاتا ہے تو یہ حکومت کی غیر جانبداری کا ثبوت ہوگا۔ اسلام آباد میں مقیم مغربی سفارت کاروں نے بھی شفاف اور غیر جانبدارانہ طور پر انتخابات کروانے پر ضیاء کی تعریف کی۔ اسلام آباد میں ایک مغربی سفارت کار نے کہا کہ عوام نے آزادانہ طور پر اپنے ووٹ کا استعمال کیا اور ان کے ووٹوں کی گنتی بالکل ایماندارانہ طریقے سے کی گئی۔ دوسرے معاملات میں ناکامیوں اور خامیوں کے باوجود ضیاء نے انتخابات میں دخل اندازی

نہ کر کے دنیا کو یہ باور کرایا کہ ان کے انتخابات کوئی دھوکا یا فریب نہ تھے اور یہ کہ پاکستان ان کے عارضی اور عبوری منصوبوں کو ایک موقع دینے کے لیے تیار ہے۔ اسلام آباد میں ٹھہرے ہوئے ایک سفارت کار نے کہا کہ ایماندارانہ اور شفاف انتخابات یقینی طور پر جمہوریت کی بحالی اور فراغ دلی کے جذبات کے لیے راستہ ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

انتخابات میں ووٹروں کی بھاری حاضری یعنی 52 فیصد نے امیدواروں، فوج اور حزب اختلاف کو سخت حیران کر دیا تھا۔ ایک ست اور غیر متاثر الیکشن مہم کے باوجود انتخابات میں رائے دہندگان کا بھاری تعداد میں ووٹ کا استعمال کرنے کی غالباً ایک وجہ ہو سکتی تھی کہ عوام یہ سمجھتے تھے کہ انتخابات فوجی حکومت سے سول حکومت کو انتقال اقتدار کو یقینی بنانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ ضیاء نے بھی ایک زیرک لیڈر کی طرح اس خیال کو تقویت پہنچائی اور عوام سے یہ وعدہ کیا کہ انتخابات کے بعد مارشل لاء ہٹا لیا جائے گا اور فوج مرحلہ وار سیاست سے کنارہ کش ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ انتخابات میں ووٹروں کی بھاری حاضری کی یہ وجہ بھی تھی کہ سیاسی جماعتوں کے اپنے اندر پھوٹ پڑ چکی تھی۔ دو سیاسی جماعتیں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی انتخابات کی کھلے عام حمایت کر رہی تھیں۔ چونکہ سیاسی جماعتوں پر انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی تھی لہٰذا انہوں نے اپنے امیدواروں کو انفرادی حیثیت میں انتخاب کے لیے پیش کیا لیکن اپنی جماعتی وفاداری کو بھی واضح رکھا۔ تحریک بحالی جمہوریت (MRD) کی رکن جماعتوں کے کارکنوں نے اپنی جماعتوں کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا اور انتخابات میں انفرادی طور پر حصہ لیا۔ تحریک بحالی جمہوریت کا یہ خیال تھا کہ انتخابات کے بائیکاٹ کی اپیل کی وجہ سے بہت کم رائے دہندگان انتخابات میں حصہ لیں گے جو اسمبلی کو نمائندگی کے دعوے سے محروم کر دے گا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا اور بڑے پیمانے پر پارٹی سیاست سے انحراف کا باعث بنا۔

انتخابات کے بعد ضیاء نے بہ حیثیت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر 17 مارچ 1985ء کو بحالی آئین کا حکمنامہ 1985ء جاری کیا۔ اس حکمنامے کے جاری ہونے کے ساتھ ہی 1973ء کے آئین میں چند ترامیم کی گئیں۔ یہ حکم منتخب اسمبلیوں کے اجلاس سے پیشتر جاری کیا گیا تھا۔ ضیاء کے اس یک طرفہ اور آمرانہ حکم نامے نے بحالی جمہوریت اور سول حکومت کو انتقال اقتدار کے بارے میں تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا جو انتخابات میں رائے دہندگان کی بھاری تعدا میں حاضری نے پیدا کر دیں تھیں۔ ضیاء کی آئینی ترامیم نے جو انہوں نے 1973ء کے آئین میں متعارف کروا دیں تمام اختیارات کو قانونی طور پر ضیاء کے ہاتھوں میں مرتکز کر دیا۔

ترمیم شدہ آئین میں صدر کے آمرانہ اختیارات کے استعمال کے لیے لائحہ عمل واضح کر دیا گیا۔ ترمیم شدہ آئین کی مختلف شقوں نے صدر کو قانونی ذمہ داری سے بری الذمہ کر دیا تھا اور یہ لکھا گیا کہ صدر کے آمرانہ اختیارات کے استعمال پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے گا اور نہ انہیں عدالت میں بلایا جا سکے گا۔ ان ترامیم کی بنا پر صدر کے احکامات چاہے وہ بنیادی حقوق کی خلاف ورزی بھی کرتے ہوں کو جائز سمجھا جائے گا۔ 1977ء سے کیے گئے تمام فوجی اقدامات کو آئینی قرار دے دیا گیا اور اسمبلی کو مارشل لاء کے کسی بھی اقدام کو ضیاء کی مرضی کے بغیر بدلنے یا منسوخ کرنے سے روک دیا گیا۔

اب ضیاء نے مرکزی اور صوبائی اسمبلی پر منتخب سول حکومتیں قائم کرنے کے لیے فیصلہ کن اقدامات کا آغاز کیا۔ چونکہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کرائے گئے تھے اس لیے جماعتی نظام نہ ہونے کی وجہ سے وزراء اعلیٰ اور وزیراعظم کے چناؤ میں مشکل پیش آئی اور یہ فیصلہ کرنا انتہائی مشکل تھا کہ صوبائی اور قومی اسمبلی میں اکثریت کس کے ساتھ ہے۔ ان حالات میں تھکا دینے والی پس پردہ ملاقاتوں اور بات چیت کا آغاز ہوا۔ پارلیمنٹ کے اراکین جو غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ہوئے تھے انہوں نے سیاسی جماعتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا شدہ خلا پر کرنے کے لیے آپس میں ڈھیلے ڈھالے اتحاد قائم کر لیے۔ ضیاء نے پارلیمنٹ کے اراکین کی سیاسی وابستگیاں پرکھنے کے لیے ذاتی طور پر اور گروپس کی شکل میں ملاقاتیں کیں۔

سیاسی ملاقاتوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ضیاء کی 1973ء کی آئین میں کی گئی پیشتر ترامیم قومی اسمبلی کے اراکین کو ناپسند تھیں۔ بلاشبہ آئین میں اسلامی نظام متعارف کروانے کے لیے کئے گئے اقدامات پر کسی کو اعتراض نہ تھا لیکن ترامیم کے ذریعے صدر کو بے پناہ اختیارات دینے پر سخت غصہ اور ناراضگی پیدا ہوئی اور پارلیمنٹ کے اراکین نے ان ترامیم پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں رد کردیا بالخصوص اراکین نے نیشنل سیکورٹی کونسل جس میں تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کو رکن بنایا گیا تھا پر اپنی شدید نفرت اور خفگی کا اظہار کیا۔ قومی سیکورٹی کونسل میں مسلح افواج کے سربراہوں کی شمولیت کو اراکین نے فوج کی ملک کے سیاسی نظام میں براہ راست مداخلت سے تعبیر کیا۔ گوکہ اراکین پارلیمنٹ غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ صدر کے ہاتھوں میں اختیارات کے ارتکاز اور پارلیمنٹ کے کٹھ پتلی بننے کے خلاف تھے۔

ضیاء کی متعارف کی ہوئی ترامیم میں بڑا حصہ صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن سے متعلق تھا۔ ضیاء کے نزدیک 1973ء میں صدر کا کردار مہمل اور مضحکہ خیز تھا، قدرتی طور پر وہ صدر کے کردار کو زیادہ اہم اور بااختیار دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی طرح ضیاء ترمیم شدہ آئین میں مسلح افواج کے لیے کردار کے خواہشمند تھے۔

قومی سیکورٹی کونسل کی تجویز سے اراکین قومی اسمبلی میں زبردست ہیجان اور ردعمل پیدا ہوا۔ اگرچہ کونسل کے 11 اراکین میں سے صرف 4 کا تعلق مسلح افواج سے تھا لیکن اس کے باوجود مسلح افواج کے کسی بھی شخص کا آئین کے کسی بھی حصے کے ساتھ معمولی سا تعلق بھی اراکین پارلیمنٹ کو قبول نہ تھا۔ لہٰذا ضیاء نے منتخب نمائندوں کے ساتھ محاذ سے بچنے کے لیے بڑے پروقار انداز میں نیشنل سیکورٹی کونسل کی تجویز واپس لے لی۔ اگرچہ ضیاء باضابطہ طور پر اسمبلی سے صدر کے اختیارات کے متعلق منظوری حاصل کرسکتے تھے لیکن وہ بے معنی اور بے سود آئینی تکرار میں نہ پڑنا چاہتے تھے۔ وہ آٹھویں ترمیم کے لیے مکمل اتفاق رائے سے منظوری کے خواہش مند تھے۔ پاکستان میں ہمیشہ آئینی مسائل پہ بے وجہ بحث و تمحیص ہوتی رہی ہے اور ضیاء اس آئینی جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتے تھے۔

محمد خان جونیجو بطور وزیراعظم:

قومی اسمبلی اور سینٹ کا مشترکہ اجلاس 23 مارچ 1985ء کو ہوا جس میں ضیاء نے 5 سال کے لیے بحیثیت صدر پاکستان حلف اٹھایا۔ صوبائی اور مرکزی سطح پر سویلین حکومتیں قائم کی گئیں۔ ضیاء نے ایک شائستہ اور منجھے ہوئے سیاست دان محمد خان جونیجو کو وزیراعظم مقرر کیا جنہوں نے اسی دن حلف اٹھایا۔ محمد خان جونیجو کے بطور وزیراعظم چناؤ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا تعلق صوبہ سندھ جیسے سیاسی طور پر حساس صوبے سے تھا اور انہیں سندھ کے روحانی پیشوا پیر پگاڑہ کی حمایت حاصل تھی۔ پیر پگاڑہ مسلم لیگ کے غیر متنازعہ لیڈر تھے اور ضیاء کو قومی اسمبلی میں ان کی مدد اور حمایت کی اشد ضرورت تھی۔

وزیراعظم بننے کے بعد محمد خان جونیجو 1973ء میں کی گئیں ترامیم کی قومی اسمبلی سے منظوری حاصل کرنے کے لیے سرگرم ہوگئے۔ سب سے زیادہ متنازعہ آٹھویں ترمیم کو 30 ستمبر 1985ء کو پیش کیا گیا۔ آٹھویں ترمیم کے ذریعے ضیاء کے صدارتی انتخاب ان کی بحالی آئین حکم کے ذریعے مارچ 1985ء میں کی گئیں آئینی ترامیم اور ان کے 5 جولائی 1977ء کو مارشل لاء لگانے اور تمام حکم نامے اور آرڈیننس کو درست قرار دیا گیا تھا۔ حکومت کی تمام کوشش کے باوجود آزاد پارلیمانی گروپ (IPG) نے آٹھویں ترمیم پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے بڑی جرات سے آٹھویں ترمیم پر نکتہ چینی کی اور اسے مارشل لاء کو سویلین حکومت کے بھیس میں جاری رکھنے کی کوشش قرار دیا۔

آٹھویں ترمیم کے پورے مسودے پر نکتہ چینی کی گئی جس کی وجہ سے سرکاری پارلیمانی گروپ (OPG) میں بھی غلط فہمی پیدا ہوئی۔

آٹھویں ترمیم کے ذریعے مارشل لاء کے اقدامات کو درست قرار دینا اور صدر کے اسمبلی توڑنے اور وزیراعظم مقرر کرنے کے اختیارات کے خلاف شدید ناراضگی ظاہر کی گئی۔ پارلیمنٹ کے اکثر اراکین کا یہ خیال تھا کہ آٹھویں ترمیم میں دی گئی شقوں کے ذریعے پارلیمنٹ کی برتر اور اعلیٰ حیثیت کو کم کردیا گیا ہے۔ شدید ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے قومی اسمبلی نے سپیکر کے عہدے کے لیے ضیاء کے نامزد کردہ اپنے قریبی ساتھی خواجہ محمد صفدر کو رد کردیا اور فخر امام کو اسمبلی کا سپیکر منتخب کرلیا۔ خواجہ محمد صفدر کے رد کیے جانے سے صدر اور اسمبلی کے اختلافات کھل کر سامنے آگئے۔ خواجہ محمد صفدر ایک طفیلی سیاست دان تھے جو ہر حکومت کے ساتھ مل جاتے تھے۔ پاکستان کی سیاست میں ان کا کوئی قابل ذکر کردار نہ تھا۔ سپیکر کے عہدے کے لیے خواجہ صفدر کا رد کیا جانا عوام کی ضیاء کے خلاف نفرت کا اظہار اور ان کے کیے گئے تمام اقدامات کی نفی کرتا تھا۔

مارشل لاء کا خاتمہ:

1985ء کے انتخابات نے عوام کو یہ موقع فراہم کیا تھا کہ وہ مارشل لاء ہٹانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالیں۔ مرکزی اور صوبائی سطح پر سویلین حکومتوں کے بن جانے کے باوجود پاکستان کو مارشل لاء کے ذریعے چلایا جارہا تھا۔ یہ ایک نازک اور مشکل صورت حال تھی اور سویلین وزیراعظم کے لیے مارشل لاء کی موجودگی میں حکومت کا کام چلانا مشکل تھا۔ عوام کی طرف سے مارشل لاء ہٹانے کے لیے لگاتار مطالبہ کیا جارہا تھا۔ 14 اگست 1985ء کو وزیراعظم نے قوم سے اپنے خطاب میں اعلان کیا کہ 30 دسمبر 1985ء کو مارشل لاء اٹھالیا جائے گا۔

بالآخر 30 دسمبر 1985ء کو پاکستان کا تیسرا اور سب سے لمبا مارشل لاء اٹھالیا گیا۔ ضیاء نے اس موقع پر پارلیمنٹ میں ایک لمبی تقریر کی۔ انہوں نے ان حالات و واقعات کا ذکر کیا جو مارشل لاء کا باعث بنے۔ ضیاء نے یہ دعویٰ کیا کہ ایشیاء میں پہلی مرتبہ جمہوریت نے مارشل لاء کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اپنے خطاب کے آخر میں ضیاء نے اراکین پارلیمنٹ کو نصیحت کی کہ وہ تاریخ سے سبق سیکھیں، جمہوری اداروں کو تقویت دیں، ماضی کی غلطیوں کو نہ دہرائیں اور محاذ آرائی سے بچیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے تجربے کی بنا پر آپ کو پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ مستقبل میں مارشل لاء سے بچنے کا صرف یہی راستہ ہے۔ مارشل لاء ہٹانے کے بعد ضیاء نے صوبوں میں گورنروں کا تقرر کیا۔

آٹھ سالہ مارشل لاء کا غیر جانبدارانہ جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ضیاء کے مارشل لاء نے جابرانہ نظام قائم نہیں کیا، گو مختلف مواقع پر بدامنی اور لاقانونیت کو روکنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا گیا۔ اس کے باوجود مارشل لاء نے جمہوری نظام کی بحالی کے لیے مخلص کوشش کی۔ حکومت نے فراخ دلی سے مخالف سیاسی جماعتوں کی نکتہ چینی برداشت کی جس کی بہترین مثال مارشل لاء کے خلاف تحریک برائے بحالی جمہوریت ہے۔ مارشل لاء نے سول انتظامیہ پر اجارہ داری قائم نہ کی اور فوجی حکام اس بات پر زور دیتے رہے کہ مسلح افواج مارشل لاء کے فرائض سرانجام دینے کے بعد اپنی بیرکوں میں واپس چلی جائیں گی۔ مسلح افواج نے پولیس کے فرائض پر قبضہ نہ کیا اور مارشل لاء حکام صرف پالیسی سے متعلق معاملات میں مشاورت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

مارشل لاء حکومت نے 1979ء اور 1983ء میں مقامی حکومتوں کے انتخابات اور 1985ء میں عام انتخابات کے ذریعے سیاسی اور جمہوری نظام کی بحالی کے لیے بھرپور اور مخلص کوشش کی باوجودیکہ ضیاء چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اپنے وعدوں کو پورا نہ کرسکے لیکن مارشل لاء ہٹا کر اور اقتدار منتخب سویلین نمائندوں کو دے کر انہوں نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔

30 دسمبر 1985ء کو مارشل لاء ختم ہونے کے بعد سیاسی جماعتوں سے پابندی ہٹادی گئی۔ جنوری 1986ء میں سیاسی جماعتوں نے اپنے بند کیے ہوئے دفاتر دوبارہ کھولے اور اپنی سیاسی طاقت کو نئے سرے سے آزمانے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ سیاسی جماعتوں

نے اپنی رجسٹریشن کے لیے حکام کو درخواستیں دیں جس سے یہ ثابت ہوا کہ مستقبل قریب میں سیاسی معرکہ آرائی ہونے والی ہے ملک میں جلسے اور پارٹی اجلاس شروع ہو گئے۔ اس کے باوجود نکتہ چینیوں نے یہ دعویٰ کیا کہ مارشل لاء حکومت نے اپنے ہم خیال سولین، بیورو کریٹس، ججوں اور سابقہ فوجیوں کی حمایت کے ذریعے ملکی معاملات میں اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھا ہوا تھا اور مارشل لاء ختم ہونے کے بعد بھی ضیاء حکومت کا ملک کے سیاسی اور جمہوری نظام پر تسلط قائم رہے گا۔

فوج نے آزادی کے بعد 22 سال تک ملک پر حکومت کی اور ضیاء کا مارشل لاء فوجی حکومت کا سب سے لمبا دور تھا۔ باوجود اس کے کہ مسلح افواج کا ترکی اور انڈونیشیا کی طرح کوئی آئینی کردار نہ تھا لیکن پاکستانی معاشرہ میں فوج کے اثر اور طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

نسلی بحران:

لسانی اور نسلی تفرقات پاکستان کی تاریخ کا بھیانک باب ہیں۔ اس کی وجہ سے 1971ء میں ملک کا آدھا حصہ باقیماندہ ملک سے کٹ گیا۔ اس وقت سے نسلی گروہ بندی ملک کے سیاسی اور معاشرتی نظام کے لیے ایک لعنت بن گئی ہے۔ حالانکہ نسلی جھگڑا پاکستان کے سیاسی نظام میں اسی دن سے قائم رہا ہے جس دن سے پاکستان اگست 1947ء کو ایک خود مختار ریاست کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا لیکن ضیاء کے مارشل لاء حکومت کے دوران لسانی تصادم پاکستان کے سیاسی نظام کے لیے بے حد خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔

بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد صوبہ سندھ میں امن و امان برقرار رکھنا ضیاء کے لیے مشکل ہو گیا۔ سندھی عوام ضیاء کو اپنا سب سے بڑا ایذا رساں سمجھنے لگے تھے۔ ان کی نظر میں ضیاء ایک ظالم جلاد کی شکل میں نمودار ہوئے جنہوں نے ایک ایسے انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو سندھیوں کی بحالی اور خوشحال زندگی کے لیے کوشاں تھا۔ بھٹو سندھی عوام کے لیے ایک مسیحا تھے جو ان کی معاشی بدحالی کو ختم کر کے انہیں ترقی کے راستے پر گامزن کرنا چاہتا تھے۔

پیپلز پارٹی نے ضیاء کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے مہم کا آغاز کیا۔ ضیاء نے پیپلز پارٹی اور اس کے کارکنوں کے خلاف سخت تادیبی اقدامات کیے لیکن اس کے باوجود وہ سندھ کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو نہ پا سکے۔ ضیاء کو یہ بات سمجھ آ گئی کہ سندھ کے حالات ان کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے ہیں۔ ضیاء نے پیپلز پارٹی کے اثر و رسوخ کو ختم کرنے اور سندھ کی صورت حال کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے صوبہ کے حکومتی ڈھانچہ میں چند تبدیلیاں کیں۔ سید غوث علی شاہ جو ضیاء کے پروردہ آدمی تھے کو صوبہ سندھ کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ سید غوث علی شاہ کو پیپلز پارٹی کو نکیل ڈالنے کا کام سونپا گیا۔ نئے وزیر اعلیٰ نے یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے مہاجروں کے رہنما الطاف حسین کو ایک سیاسی جماعت بنانے کے لیے اکسایا تاکہ مہاجروں کے مفادات جو کراچی اور حیدر آباد میں اکثریت میں تھے کا تحفظ کیا جا سکے۔ اس طرح مہاجر قومی موومنٹ معرض وجود میں آئی۔

مہاجر قومی موومنٹ کے بنانے کا واحد مقصد پیپلز پارٹی، جی ایم سید کی سندھو دیش اور کراچی کی دوسری سیاسی قوتیں جو ضیاء کے مارشل لاء کی مخالفت کر رہی تھیں کے سامنے متبادل سیاسی طاقت لانا تھا۔ مہاجر قومی موومنٹ تشکیل دیتے وقت یہ سمجھا گیا کہ مہاجروں کی تنظیم مارشل لاء حکومت کی دست راست ثابت ہو گی اور پیپلز پارٹی اور سندھو دیش کے اثر و رسوخ کی موثر طریقے سے روک تھام کر سکے گی۔ اس طرح سے ضیاء نے سندھ کے حالات کو کنٹرول کرنے اور پیپلز پارٹی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کا تہیہ کیا۔ مہاجر قومی موومنٹ تشکیل کے بعد بہت جلد ایک زبردست سیاسی قوت بن گئی۔ حتیٰ کہ ضیاء جو الطاف حسین اور مہاجر قومی موومنٹ کے مشیر خاص تھے کے لیے بھی مہاجر قومی موومنٹ کا دہشتناک طرز عمل انتہائی خطرناک اور قومی مفادات کے منافی ثابت ہوا۔

بد قسمتی سے الطاف حسین قومی سیاست کے دھارے میں آنے کے بعد اپنے نسلی اور لسانی تعصب کو دبا نہ سکے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی قوم کی طاقت اور عددی اکثریت کو مہاجروں کی بہتری کے لیے استعمال کرتے وہ پرامن سیاسی جدوجہد کے راستے سے ہٹ گئے۔ انہوں نے اپنی جماعت ایم کیو ایم کو حکومت سے سودے بازی اور کراچی میں دوسرے سیاسی طبقات کو دبانے اور دھمکانے کے لیے ایک فشاری گروہ (Pressur Group) کے طور پر استعمال کیا۔ انہوں نے اپنی جدوجہد کی بنیاد نسلی اور لسانی مفادات پر رکھی۔ مہاجروں کے لیے علیحدہ صوبے، اسمبلیوں میں علیحدہ نشستیں اور حکومت کے اداروں میں حصے کے لیے ایم کیو ایم کے پلیٹ فارم سے بلند بانگ دعوے کیے گئے۔

پیپلز پارٹی اور دوسری سیاسی جماعتوں نے ایم کیو ایم کی گروہی اور لسانی سیاست کی برملا مخالفت کی۔ بالخصوص جماعت اسلامی ایم کیو ایم کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان سیاست میں آئی اور ایم کیو ایم کی قیادت اور الطاف حسین کو متنبہ کیا کہ وہ گروہی اور نسلی سیاست کو پھیلانے سے گریز کریں۔ ایم کیو ایم کے سربراہ نے اس کا بھرپور جواب دیا اور پاکستان کی مخالفت اور قائداعظم پر نکتہ چینی کرنے پر جماعت اسلامی پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا۔ الطاف حسین نے جماعت اسلامی پر مارشل لاء کی حمایت کرنے کا الزام لگایا اور قوم پرست طبقوں کو حکومت کے گماشتے (Agents) قرار دیا۔ جماعت اسلامی اور ایم کیو ایم نے ایک دوسرے کے دفاتر پر حملے کیے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان متعدد خونریز تصادم ہوئے۔ ایم کیو ایم نے جماعت اسلامی کی ہڑتال کے لیے اپیل کو ناکام بنانے کے لیے کراچی میں جماعت اسلامی کے دفاتر پر حملے کیے۔ ڈاکٹر سلیم حیدر کی مہاجر اتحاد تحریک نے بھی ایم کیو ایم کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر حیدر نے قومی سلامتی اور اتحاد کی بھرپور حمایت کی اور الطاف حسین کے بھارت کیساتھ رابطے اور ان کے بھارتی حامی جی ایم سید کے سامنے جھکنے پر شدید نکتہ چینی کا نشانہ بنایا۔

ایم کیو ایم کے سخت اور جارحانہ رویہ کی وجہ سے لسانی نفرت اور دشمنی ضیاء کے مارشل لا دور میں عروج پر پہنچ گئی۔ ایم کیو ایم اور مارشل لاء کے حامیوں کے درمیان مسلسل خونریز تصادم ہوتے رہے۔ ایم کیو ایم کی اکثریت کی وجہ سے کراچی مہلک خونریزی کا مرکز بن گیا۔ کراچی کے علاوہ حیدرآباد اور صوبہ سندھ کے دوسرے علاقے بھی ایم کیو ایم کے تسلط میں آ گئے جس کی وجہ سے ان علاقوں میں بھی خونریز تصادم ہوئے۔

پٹھانوں کی اکثریت والے علاقے سہراب گوٹھ میں اقدام کے بعد کراچی شدید لسانی اور گروہی فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ سہراب گوٹھ کے رہائشی منشیات کے نفرت انگیز دھندے میں ملوث تھے۔ حکومت نے منشیات کے دھندے میں ملوث افراد کے خلاف اقدام کرنے کے لیے صفائی کا عمل کیا جس میں بہت سارے افراد مارے گئے۔ سہراب گوٹھ میں عمل صفائی کے بعد منشیات کے دھندے میں ملوث گروہوں نے بیرونی عناصر کی مدد سے نسلی جذبات کو کافی عرصے تک بھڑکائے رکھا۔ سہراب گوٹھ منشیات کے کاروبار کا گڑھ تھا جہاں پر ہتھیار اور منشیات بآسانی حاصل کیے جاسکتے تھے۔ حکومت نے منشیات کے کاروبار کو ختم اور ہتھیاروں کے خاتمے کے لیے اس علاقے پر دھاوا بولا۔

دسمبر 1986ء کے فسادات نے جن میں بھائی نے بھائی کو قتل کیا، مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ یکم جنوری 1987ء کو وزیراعظم نے کہا کہ صوبائی انتظامیہ میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں گی۔ اسی دن سندھ کی کابینہ نے وزیراعلیٰ سید غوث علی شاہ کو استعفیٰ دے دیا تاکہ وہ نئی کابینہ تشکیل دیں سکیں۔ سید غوث علی شاہ سہراب گوٹھ کے عمل صفائی کی وجہ سے بہت زیادہ متنازعہ شخصیت بن چکے تھے۔ وزیراعظم نے انہیں سندھ کابینہ کی تشکیل نو کے لیے بہت زیادہ اختیارات دے دیے۔ بجائے اس کے کہ نفرت و لسانی جذبات کو کم کرنے میں مدد ملتی وزیراعظم کے غوث علی شاہ کو تمام اختیارات دینے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

ایم کیو ایم کراچی اور حیدرآباد میں بڑے پیمانے پر مقبول ہوگئی تھی۔ الطاف حسین کی ذات مہاجروں کے لیے ایک نجات دہندہ تھی جو انہیں دوسرے گروہوں کے استیصال سے بچا سکتی تھی۔ دوسری سیاسی جماعتیں اور گروہ الطاف حسین اور ایم کیو ایم کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت کو روکنے میں ناکام رہے۔ نتیجتاً ایم کیو ایم کو ناقابل تسخیر حیثیت حاصل ہوگئی جس کی وجہ سے ایم کیو ایم نہ صرف حکومت بلکہ پورے ملک کو اپنی بات منوانے کی حالت میں آ گئی۔

اوجڑی کیمپ کا سانحہ:

اوجڑی کیمپ راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان واقعہ ایک اسلحہ خانہ تھا جسے برطانوی حکومت نے برطانوی فوج کے استعمال کے لیے بنایا تھا۔ اس وقت یہ اسلحہ خانہ رہائشی علاقے سے باہر واقع تھا اور اسلام آباد بھی موجود نہ تھا۔ آزادی کے بعد راولپنڈی کی شہری آبادی کے بڑھنے سے اوجڑی کیمپ اسلحہ خانہ آبادی میں گھر گیا۔

10 اپریل 1988ء کو اسلام آباد، راولپنڈی کے جڑواں شہروں پر یک دم جدید اسلحہ جس میں میزائل، راکٹ اور بم شامل تھے کی بوچھاڑ ہوئی جس سے تمام علاقہ ہل گیا۔ علاقہ کسی مفتوح میدان جنگ کی تصویر بن گیا جہاں پر کہ بہت سخت جنگ لڑی گئی ہو۔ دھماکے کی وجہ سے سخت خوف و ہراس پھیل گیا۔ میزائلوں کی بارش کی وجہ سے بہت سارا جانی نقصان ہوا۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ بھارت کیساتھ جنگ چھڑ گئی ہے اور پاکستان کے ایٹمی مرکز کہوٹہ پر حملہ ہوگیا ہے۔

وزیراعظم محمد خان جونیجو نے فوری طور پر انکوائری کا حکم دیا تاکہ اس حادثے کے ذمہ دار افراد کی نشاندہی کر کے انہیں سزا دی جاسکے۔ وزیراعظم نے انکوائری کمیٹی مقرر کی اور اسے دس دن کے اندر وزیراعظم کو رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا۔ کابینہ کی سب کمیٹی نے وفاقی وزیر اسلم خٹک کی سربراہی میں رپورٹ کا جائزہ لیا۔ کابینہ کمیٹی نے آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل اختر عبدالرحمٰن کو ساری تباہی اور جانی نقصان کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ رپورٹ کی وجہ سے کابینہ میں سخت اختلافات پیدا ہوئے لیکن پھر بھی اتفاق رائے حاصل ہونے کے بعد رپورٹ وزیراعظم کو پیش کردی گئی۔

کمیٹی کی رپورٹ کی وجہ سے وزیراعظم اور فوج کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہوگئی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ وزیراعظم ان فوجی جرنیلوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے جن پر کمیٹی نے اوجڑی کیمپ کی تباہ کاری کی ذمہ داری ڈالی تھی۔ جونیجو نے اپنے چین کے دورے کے دوران ضیاء کو بھی آرمی چیف کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ مئی کے وسط میں جونیجو نے کابینہ کے اجلاس میں اعلان کیا کہ اوجڑی کیمپ کے سانحے کی انکوائری مکمل ہوگئی ہے جسے وہ جلد ہی کابینہ کے سامنے پیش کردیں گے۔ رپورٹ میں آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل اختر عبدالرحمٰن اور موجودہ سربراہ جنرل حمید گل کو تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا کیونکہ انہوں نے اسلحہ خانے کو رہائشی علاقے میں رکھنے کی منظوری دی تھی۔ جونیجو اپنے جنوب مشرقی ممالک کے دورے کے بعد کابینہ کے سامنے اس معاملے کو رکھنا چاہتے تھے انہوں نے دونوں جرنیلوں سے مطالبہ کیا کہ وہ از خود اپنے عہدوں سے دستبردار ہوجائیں۔

جونیجو حکومت کا خاتمہ:

جنرل ضیاء نے جونیجو کے ارادے کو بھانپ لیا تھا کہ وہ جنرل اختر عبدالرحمٰن اور جنرل حمید گل جن پر اتنے بڑے اسلحہ خانہ کو آبادی والے علاقے میں رکھنے کا الزام تھا کو برطرف کرنا چاہتے تھے۔ یہ جان کر کہ جونیجو فوج کے دو سینئر جرنیلوں کے خلاف کارروائی کرنے والے ہیں ضیاء نے اپنے آئینی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے 29 مئی 1988ء کو جونیجو حکومت برطرف کردی۔

جونیجو حکومت کی فوجی برخاستگی کی ایک وجہ جنیوا معاہدے پر وقت سے پہلے دستخط کرنا بھی تھی۔ جنیوا معاہدے میں افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلاء کا طریق کار دیا گیا تھا جو ضیاء اور وزیراعظم کے درمیان جھگڑے کا باعث بنا۔ ضیاء چاہتے تھے کہ معاہدے پر اس وقت دستخط کیے جائیں جبکہ کابل میں مجاہدین کی عارضی حکومت بن جائے۔ ضیاء افغانستان سے متعلق جارحانہ پالیسی کے حق میں تھے اور کابل میں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے مجاہدین کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مجاہدین کی حکومت کے قیام کے بغیر جنیوا معاہدے پر دستخط ان کی افغان پالیسی جو وہ 1979ء سے روسی دہشت گردی کے باوجود ثابت قدمی سے جاری رکھے ہوئے تھے کے نتائج اور ثمرات کے لیے تباہ کن ثابت ہوں گے۔ دوسری طرف جونیجو جنیوا معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے بے چین تھے۔ کیونکہ وہ افغانستان کے بارے فیصلہ کن جنیوا معاہدے کا سیاسی فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ جونیجو روسی صدر گورباچوف کے ساتھ بالمشافہ بات چیت کرتے تھے۔ گورباچوف بھی ضیاء کے مقابلے میں جو پوری طرح سے امریکی اثر میں آچکے تھے جونیجو سے بات چیت کو ترجیح دیتے تھے۔ لہٰذا جونیجو نے ضیاء کی مرضی کے خلاف جنیوا معاہدے پر دستخط کردیئے۔ ضیاء اس پر سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ جنیوا معاہدے پر ہونے والی گفت وشنید کے دوران انہیں نظر انداز کردیا گیا ہے۔ خارجہ پالیسی سے متعلق کاغذات اور فائلیں اب ضیاء کو پیش نہیں کی جاتی تھیں کیونکہ جونیجو نے خارجہ پالیسی سے متعلق اپنے اختیارات کو اب موثر طریقے سے استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔

10 اپریل 1988ء کو اوجڑی کیمپ کا دھماکہ ضیا اور جونیجو کے درمیان ناچاقی کا ایک اور ذریعہ بنا۔ اوجڑی کیمپ میں رکھا ہوا اسلحہ مجاہدین کے لیے تھا۔ یہ اسلحہ آئی ایس آئی کی زیرنگرانی کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ دھماکے کی وجہ سے بہت بڑا جانی و مالی نقصان ہوا جس کی وجہ سے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ جونیجو آئی ایس آئی کے متعلقہ افسران کو دھماکے کا ذمہ دار ٹھہرانا چاہتے تھے۔ انکوائری کمیٹی نے جنرل اختر عبدالرحمن سابقہ سربراہ آئی ایس آئی اور جنرل حمید گل موجودہ سربراہ آئی ایس آئی کو دھماکے کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ جونیجو دونوں جرنیلوں کو برطرف کرنا چاہتے تھے۔ جونیجو ضیاء کو بھی فوجی عہدہ سے دستبردار کرنا چاہتے تھے۔

مارچ 1988ء میں جونیجو نے جنیوا معاہدے پر بات چیت کے لیے گول میز کانفرنس بلائی۔ تمام سیاسی جماعتوں کو دعوت نامے جاری کیے گئے۔ یہ اقدام ضیاء کے سیاسی منصوبے کے برعکس تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حکومت اور حزب اختلاف باہمی گفت وشنید میں حصہ لے رہے تھے۔ فوج 1985ء کے سول ملٹری معاہدے کی روح کی خلاف ورزی پر چونک گئی۔ بے نظیر بھٹو نے انتہائی چالاکی سے ضیا اور جونیجو کے درمیان غلط فہمی کو ہوا دی۔ انہوں نے مخالف سیاسی جماعتوں کو بات چیت میں شامل کرنے اور ضیاء اور ان کی پالیسیوں کو تحقیر کا نشانہ بنانے پر جونیجو کی تعریف کی۔ اس طرح سے گول میز کانفرنس کے انعقاد پر فوجی جرنیل سخت ناراض ہوئے۔ جونیجو کی ذات ان کے لیے ناقابل برداشت تھی جسے ہر قیمت پر ہٹایا جانا چاہیے تھا۔

اوپر دیئے گئے فوج اور سول حکومت کے درمیان جھگڑوں اور غلط فہمیوں کے باوجود پارلیمانی نظام روانی سے چل رہا تھا۔ اس نظام سے فوج نے بے شمار فائدے حاصل کیے۔ اقتدار پر فوج کا کنٹرول پوری طرح سے قائم اور محفوظ تھا۔ لہٰذا ایک وفادار اور ڈرپوک پارلیمنٹ کو برخاست کردینا ایک فاش سیاسی غلطی تھی جس نے فوج کے مفادات کو فائدے کی بجائے سخت نقصان پہنچایا۔ ضیاء کی موت تک ان کا دیا ہوا نظام تتر بتر ہوچکا تھا اور ان کی بنائی ہوئی پارلیمنٹ اپنا اختیار کھو چکی تھی۔

باب نمبر 12

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت

وزیراعظم بے نظیر بھٹو پہلی مدت (1988-90)

غلام اسحاق خان بحیثیت نگران صدر:

17 اگست 1988ء کو فوج کا C-130 طیارہ جس میں جنرل ضیاء اور فوج کے دوسرے سینئر آفیسر اور پاکستان میں امریکی سفیر آرنلڈ رافیل سوار تھے بہاولپور کے نزدیک گر کر تباہ ہو گیا اور اس میں سوار تمام افراد ہلاک ہو گئے۔ ضیاء کی موت سے جو خلا پیدا ہوا اسے پر کرنے کے لیے سینٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان نے نگران صدر کے طور پر ملک کا کنٹرول سنبھال لیا۔ سپریم کورٹ نے بے نظیر بھٹو کی درخواست پر اپنا فیصلہ سنایا اور سیاسی جماعتوں کو رجسٹریشن کے بغیر انتخابات لڑنے کا حق دے دیا۔ صدر غلام اسحاق خان نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کی روشنی میں پارٹی کی بنیاد پر عام انتخابات کروانے کا اعلان کیا۔ لہٰذا صوبائی و قومی اسمبلیوں کے لیے پارٹی کی بنیاد پر عام انتخابات 16 نومبر اور 19 نومبر 1988ء کو کروائے گئے۔

قومی اسمبلی کے انتخابات میں پیپلز پارٹی 93 نشستیں جیت کر واحد اکثریتی جماعت بن کر سامنے آئی۔ آئی جے آئی جسے پاکستان مسلم لیگ نے انتخابات کے وقت تشکیل دیا تھا 60 نشستیں حاصل کیں۔ آئی جے آئی میں آٹھ سرکردہ سیاسی جماعتیں شامل تھیں جنہوں نے انتخابات میں مشترکہ امیدوار کھڑے کیے۔

انتخابات کے نتائج حیران کن تھے کیونکہ اکثر سرکردہ سیاست دان ہار گئے جن میں غلام مصطفیٰ جتوئی، پروفیسر غفور احمد، جنرل ٹکا خان، ایئر مارشل اصغر خان، شیخ محمد رشید، مولانا شاہ احمد نورانی، سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو، پیر پگاڑا اور میر غوث بخش بزنجو شامل ہیں۔ یہ سیاست دان اپنے مدمقابل امیدوار جو سیاست کے میدان میں ناتجربہ کار اور بالکل نئے تھے سے ہار گئے۔

پیپلز پارٹی نے صوبہ سندھ کے دیہاتی علاقوں میں انتخاب جیتا جبکہ ایم کیو ایم شہری علاقوں میں کامیاب رہی۔ اس کی وجہ نسلی اور لسانی دشمنی تھی۔ آئی جے آئی نے پنجاب میں متاثر کن کامیابی حاصل کی۔ اس نے صوبائی انتخابات میں پیپلز پارٹی کے خلاف واضح اکثریت حاصل کی۔ بلوچستان میں کوئی جماعت قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ بی این اے اور جے یو آئی نے نئی سیاسی پارٹی کی حیثیت میں معمولی کامیابی حاصل کی۔

ان نشستوں کے لیے جن پر امیدواروں کی موت کی وجہ سے انتخابات نہ ہو سکے ضمنی انتخابات کروائے گئے۔ پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی نے ضمنی انتخابات میں بھرپور حصہ لیا۔ پیپلز پارٹی غلام مصطفیٰ جتوئی کو جو قومی اسمبلی کے عام انتخابات میں ہار گئے تھے قومی اسمبلی میں آنے سے روکنا چاہتی تھی۔ پھر بھی غلام مصطفیٰ جتوئی کوٹ ادو سے غلام مصطفیٰ کھر کی چھوڑی ہوئی نشست سے ضمنی انتخاب جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔

صوبہ سرحد میں کوئی سیاسی جماعت حتمی حیثیت حاصل نہ کر سکی۔ آئی جے آئی واحد سیاسی گروپ تھا جو صوبہ سرحد میں اکثریتی جماعت بن کر سامنے آیا، پیپلز پارٹی دوسری بڑی جماعت بن کر ابھری۔

بے نظیر بھٹو بطور وزیراعظم۔ پہلی مدت (90-1988):

پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو کا بطور پہلی خاتون وزیراعظم تقرر پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم اور نمایاں باب ہے۔ نگران صدر غلام اسحاق خان نے 1988ء کے پارٹی انتخابات جن میں پیپلز پارٹی واحد اکثریتی جماعت بن کر ابھری تھی کے نتائج کی بنا پر بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم نامزد کیا۔ 30 نومبر 1988ء کو اسمبلی اجلاس بلایا گیا اور بے نظیر بھٹو نے یکم دسمبر 1988ء کو وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ ضیاء الحق کے ہاتھوں سخت تکلیف اٹھانے اور کافی عرصہ تک سیاست سے باہر رہنے کے بعد بالآخر پیپلز پارٹی ایک دفعہ پھر حکومت میں آ گئی۔ حلف اٹھانے کے بعد بینظیر بھٹو نے جمہوریت کو فروغ اور تحفظ دینے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے اپنے المناک ماضی کو بھول کر ملک کے مستقبل کی ترقی پر توجہ دینے کا اعادہ کیا۔

صدارتی انتخابات:

مرکز اور صوبوں میں پارٹی حکومت کے قیام کے بعد ملک کے صدر کا چناؤ ہونا تھا۔ ضیاء الحق کی موت کے بعد سے غلام اسحاق نگران صدر کی حیثیت میں کام کرتے رہے تھے۔ 12 دسمبر 1988ء کو صدارتی انتخابات منعقد ہوئے۔ غلام اسحاق خان اور بزرگ سیاست دان نوابزادہ نصر اللہ خان نے صدارتی انتخاب لڑا۔ غلام اسحاق خان صدر منتخب ہوگئے دونوں بڑی جماعتوں آئی جے آئی اور پیپلز پارٹی نے غلام اسحاق خان کی حمایت کی جس سے وہ بھاری اکثریت میں کامیاب ہوئے۔ غلام اسحاق خان نے 348 ووٹ حاصل کیے جبکہ نوابزادہ نصر اللہ خان صرف 91 ووٹ حاصل کر سکے۔

بے نظیر بھٹو نے سیاسی اقتدار مقابلتاً مبہم حالات میں سنبھالا۔ ملک نے اپنی تاریخ کا سب سے لمبا مارشل لاء برداشت کیا تھا جس کی وجہ سے سیاسی حالات مسخ ہو چکے تھے۔ اقتدار میں آنے کے لیے بے نظیر بھٹو کو سخت محنت کرنا پڑی۔ انہوں نے مارشل لاء کا بڑی ہمت سے سامنا کیا اور پہلے ضیا اور بعد میں جونیجو کے ادوار حکومت میں بھرپور احتجاج کر کے اپنی سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کیا۔

بلوچستان اسمبلی کا خاتمہ:

بے نظیر بھٹو کی سیاسی اہلیت کو پرکھنے کا امتحان بلوچستان اسمبلی کا خاتمہ تھا۔ اسمبلی کے ختم ہوجانے سے بلوچستان میں سیاسی بحران پیدا ہوا کیونکہ کسی کو بھی اس صورت حال کا ادراک نہ تھا۔ جنرل موسیٰ گورنر بلوچستان نے حکومت کے قیام کے صرف دو ہفتوں کے بعد صوبائی اسمبلی تحلیل کردی۔ آئی جے آئی نے اسمبلی توڑے جانے پر حکومت پر شدید تنقید کی اور اسمبلی کی تحلیل کو بلوچستان میں آئی جے آئی کی حکومت پر حملے سے تعبیر کیا۔ پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت نے اسمبلی کے ٹوٹنے کی ذمہ داری قبول نہ کی اور اسمبلی بحال کرنے کے لیے مدد کی پیش کش کی۔ لیکن بلوچستان ہائی کورٹ نے اسمبلی توڑنے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اسمبلی بحال کردی۔

پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت آئی جے آئی کے رہنما نواز شریف اور پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو کے درمیان روایتی چپقلش کی بنا پر مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہوسکی۔ دونوں کے درمیان حادی خلیج دن بدن بڑھتی گئی کیونکہ پنجاب حکومت مختلف مسائل پر مرکزی حکومت سے متفق نہ تھی۔ پیپلز پارٹی اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ پنجاب میں چند آزاد ممبران کو اپنے ساتھ ملا کر پنجاب حکومت کو گرایا جاسکتا ہے۔ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پیپلز پارٹی کی حکومت نے ایک انوکھی چال چلی اور پنجاب اسمبلی کے آزاد اور کمزور ممبران کو حکومتی عہدے، بنک کے قرضے اور وزارتوں کا لالچ دیا۔ حکومت کی اس چال کو ''ہارس ٹریڈنگ'' کا نام دیا گیا جس کی وجہ سے حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان سخت غلط فہمی اور ٹکراؤ پیدا ہوا۔ پیپلز پارٹی کا ''آپریشن پنجاب'' کا منصوبہ ناکام ثابت ہوا اور نواز شریف صدر غلام اسحاق کی اعانت سے اپنی پوزیشن پر سختی سے جمے رہے اور کوئی دباؤ قبول کرنے سے انکار کردیا۔

مرکزی اور پنجاب کی حکومتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے مختلف چالیں چلتی رہیں۔ مرکزی اور پنجاب حکومت کے ایک دوسرے کو زیر کرنے کی پالیسی نے ملک کی سیاسی صورت حال کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ عوام بہت جلد اس جاری رسہ کشی سے تنگ آ گئے اور اس غیر یقینی اور افسوس ناک صورت حال کے خاتمے کا انتظار کرنے لگے۔

بے نظیر بھٹو کا زوال:

بالآخر بے نظیر بھٹو اپنے ناقص اور ناپختہ رویے کی وجہ سے حکومت کے بلند مقام سے گر گئیں۔ ان کا طریقہ کار انتہائی آمرانہ تھا۔ وہ کسی دوسرے کے نقطہء نظر کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں اور دوسروں کے ساتھ ان کا سلوک ایک وڈیرے جیسا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ آٹھویں ترمیم نے بھی ان کے زوال میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آٹھویں ترمیم کی وجہ سے صدر کی حیثیت وزیراعظم کے مقابلے میں بہت زیادہ موثر ہوگئی تھی۔

بے نظیر اقتدار میں آنے سے قبل ہی آٹھویں ترمیم سے سخت بیزار تھیں اقتدار سنبھالنے کے بعد آٹھویں ترمیم کی وجہ سے وہ حکومت کے کام بخوبی چلانے میں مشکل محسوس کر رہی تھیں لہٰذا انہوں نے آٹھویں ترمیم پر سخت نکتہ چینی شروع کر دی۔ چونکہ پیپلز پارٹی کے پاس آئین میں ترمیم کرنے کے لیے مطلوبہ دو تہائی اکثریت نہ تھی اس لیے بے نظیر نے پارلیمنٹ میں دوسرے گروہوں سے آٹھویں ترمیم کو ختم کرنے کے لیے مدد طلب کی جس کی وجہ سے حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کے درمیان چپقلش پیدا ہوئی۔

آٹھویں ترمیم پر بے نظیر کے حملوں نے صدر غلام اسحاق خان کو اپنے اختیارات کے ختم ہوجانے کے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ انہیں اپنی حیثیت کو کم کردینے کی بے نظیر کی خواہش پر بہت افسوس ہوا کیونکہ بے نظیر صدر کی 1995ء میں مدت ختم ہونے تک اخلاقی طور پر ان کی حمایت کرنے کی پابند تھیں۔ پیپلز پارٹی نے نوابزادہ نصر اللہ خان کے مقابلے میں صدارتی انتخاب میں غلام اسحاق خان کی حمایت کی تھی۔

وزیراعظم نے صدارتی احکامات کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ بے نظیر نے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چیئرمین چیف آف سٹاف کمیٹی افتخار سروہی کی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ اس پر صدر نے اپنے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا اور بیان جاری کیا کہ چیئرمین چیف آف سٹاف کمیٹی کو مقرر کرنا یا ریٹائر کرنا صدر کا آئینی اختیار ہے۔ بے نظیر نے ہتھیار پھینک دیئے لیکن صدر اور وزیراعظم کے تعلقات میں ناقابل اصلاح کشیدگی پیدا ہوگئی۔

بے نظیر بھٹو حکومت کی مشکلات ان کی اپنی پالیسیوں کی وجہ سے تھیں۔ ان کا طرز حکومت نہ تو موثر تھا اور نہ ہی ہموار۔ پیپلز پارٹی کا ایم کیو ایم کیساتھ معاہدہ قائم نہ رہ سکا۔ الطاف حسین کے خیالات اپنے ہم عصر سیاست دانوں سے قطعی طور پر ہم آہنگ نہ تھے۔ وہ ایک شعلہ بیان اور بے باک مقرر تھے جنہوں نے عوام کے اندر ایک انوکھی روح پھونک دی تھی۔

بے نظیر نے وزیروں اور مشیروں کی بڑی تعداد مقرر کی تھی جن میں اکثر بالکل نااہل اور بدعنوان تھے۔ یہ لوگ پیپلز پارٹی کی حکومت کے لیے ناقابل برداشت بوجھ بن گئے تھے۔ بے نظیر نے اپنی والدہ کو سینئر وزیر مقرر کیا اور اپنے لیے تین وزارتیں مختص کرلیں۔ ایم کیو ایم کے ساتھ معاہدے کی ناکامی کی وجہ سے سندھ میں امن عامہ کی صورتحال پیدا ہوگئی۔ ایم کیو ایم نے پیپلز پارٹی کی طرف سے معاہدہ سے انحراف کی وجہ سے دھوکا محسوس کرتے ہوئے سندھ میں دہشت گردی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ کراچی اور حیدرآباد خوفناک دہشت گردی کی زد میں آ گئے اور روزانہ بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ امن عامہ کی خراب صورت حال نے معاشی حالات کو سخت نقصان پہنچایا۔ بلوچستان اور پنجاب کی آئی جے آئی حکومتوں نے بھی حالات خراب کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اور جمہوریت کے فروغ کے لیے کام کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے سستا اور فوری انصاف مہیا کرنے اور معاشی ترقی کے لیے نجی شعبہ کو فروغ دینے کے عزم کا اعادہ کیا۔ خارجہ پالیسی کے حوالے سے وزیراعظم نے پسے ہوئے مسلم ممالک کی مدد جاری رکھنے کا اعلان کیا۔

آئی جے آئی کی معاشی حکمت عملی:

جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو اس وقت کئی معاملات اور مسائل ان کی فوری توجہ چاہتے تھے۔ سابقہ حکومت کی ناکامی کی وجہ سے ملک کے سیاسی اور معاشی حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ سیاسی محاذ آرائی اور مغربی ممالک بالخصوص امریکہ کی جانب سے امداد کم کر دینے سے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ پاکستان کے پرامن ایٹمی پروگرام کی مخالفت نے حکومت کے لیے بے شمار مشکلات پیدا کر دی تھیں۔

نواز شریف کا خیال تھا کہ سابقہ حکومت کی غلط پالیسی کی وجہ سے قوم کے لیے پیدا ہونے والی مشکلات پر قابو پانے کے لیے معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا پڑے گا۔ آئی جے آئی کی حکومت کا سب سے پہلا مقصد ملک کے معاشی حالات کی بحالی تھا۔ لہٰذا حکومت نے معاشی اصلاحات کا ایک جامع منصوبہ تشکیل دیا۔ حکومت نے حکمت عملی میں تبدیلیاں کیں جن کا مقصد معاشی ترقی اور معاشی شعبہ میں عدم مساوات کو ختم کرنا تھا۔

معاشی ترقی کے ہدف کے حصول کے لیے پرائیوٹائزیشن کا پروگرام شروع کیا گیا۔ اس پروگرام کے نمایاں پہلو پرائیوٹائزیشن، مرکزیت کا خاتمہ اور آزاد معاشی ماحول پیدا کرنا تھا۔ حکومت کی معاشی پالیسی دنیا کے دوسرے ممالک سے مماثلت رکھتی تھی۔ شروع میں 115 صنعتی اداروں کو نجی شعبہ میں دینے کے لیے چنا گیا۔ 92-1991ء میں 35 صنعتی ادارے نجی شعبہ کو دیئے گئے اور 93-1992ء میں مزید 28 اداروں کو نجی تحویل میں دے دیا گیا۔ ان میں دو کمرشل بنک یعنی مسلم کمرشل بنک اور الائیڈ بنک بھی شامل تھے۔

کچھ ایسے شعبے جن میں حکومتی شعبہ کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی کو نجی شعبہ کو دینے کے لیے کھولا گیا۔ ان میں بنک، توانائی کی پیداوار، مواصلات خبر رساں ادارے، جہاز سازی، سڑکوں کی تعمیر اور بندرگاہوں کا انتظام شامل تھے۔ بیرونی سرمایہ کاری پر کنٹرول ختم کر دیا گیا۔ بیرونی سرمایہ کے کھاتے اور بیرونی سرمایہ کی برآمد و درآمد کی اجازت دے دی گئی۔

وزیراعظم نے ''زرد گاڑی سکیم'' (Yellow Cab Scheme) شروع کی۔ اس سکیم کا دوہرا مقصد تھا یعنی ایک تو بے روزگاروں کو روزگار مہیا کیا جاسکے اور دوسری طرف عوامی ٹرانسپورٹ کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ وزیراعظم نے ایک موٹر وے بنانے کا اعلان بھی کیا جو کراچی کو پشاور سے ملاتا تھا۔ پہلے عرصے کے دوران اسلام آباد، لاہور والا حصہ تعمیر کیا جانا تھا۔ یہ 339 کلومیٹر طویل راستہ تھا جسے دسمبر 1997ء تک مکمل کیا جانا تھا۔

آئی جے آئی حکومت کا خاتمہ، وزیراعظم نواز شریف کی برطرفی:

اپنے خاندانی پس منظر کی روشنی میں نواز شریف کا ملک کے سب سے بڑے سیاسی مقام اور عہدے تک پہنچنا حیران کن تھا۔ ان کا تعلق کسی زمیندار یا وڈیرے خاندان سے نہ تھا جو ملک پر بلاشرکت غیرے حکومت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ آپ ایک صنعتی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس نے اپنی شبانہ روز محنت اور ایمانداری سے ایک عظیم صنعتی گھرانہ تشکیل دیا تھا۔

نواز شریف جنرل ضیاء کے دور میں سیاست سے وابستہ ہوئے۔ انہیں پنجاب کابینہ میں وزیر خزانہ بنایا گیا اور ترقی کرتے ہوئے وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے صوبہ پنجاب میں مختلف عہدوں پر فائز ہونے سے نواز شریف کو سیاست کے اسرار و رموز کا پتہ چلا۔ پنجاب کی سیاست سے نواز شریف کو جو سیاسی تجربہ حاصل ہوا اس سے انہیں 1990ء تک وزیر اعظم کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے میں بہت مدد ملی۔

1990ء میں انتخابی فتح سے نواز شریف میں بہت اعتماد پیدا ہوا اور وہ ایک بالکل مختلف سیاست دان بن گئے۔ ایک فرمانبردار صوبائی وزیر سے نواز شریف ایک ایسے قومی رہنما کی شکل میں ابھرے جو اپنے بدحال اور مظلوم عوام کو خوشحال زندگی کی نئی راہیں دکھانے کے لیے آیا ہو۔ اب انہیں ملک کے بااثر طبقوں یعنی تاجر اور شہری لوگوں کی حمایت حاصل تھی۔

سیاست میں آنے کے بعد نواز شریف کے صدر غلام اسحاق خان کے ساتھ تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے دوران نواز شریف نے ہمیشہ غلام اسحاق خان کی حمایت کی جس کی انہیں بے نظیر کی جارحانہ رویہ کی وجہ سے اشد ضرورت تھی۔

بدقسمتی سے آٹھویں ترمیم نے صدر اور وزیر اعظم کے تعلقات پر منفی اثرات ڈالنے شروع کردیئے تھے۔ وزیر اعظم اپنے اختیارات کو موثر طریقے سے استعمال کرنا چاہتے تھے جبکہ صدر اپنی غالب اور حاوی حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے نظام پر سخت دباؤ پڑا۔ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختیارات کی رسہ کشی جنرل آصف نواز جنجوعہ کی وفات کے بعد نئے COAS کی تقرری پر شروع ہوئی۔

حکومت کے دو اعلیٰ عہدے داروں کے درمیان اختیارات کی رسہ کشی شروع ہونے کے بعد نئے COAS کی تقرری صدر اور وزیر اعظم دونوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھی، ملک کے اختیاراتی نظام میں چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت نہایت نازک اور اہمیت کی حامل تھی لہٰذا نواز شریف اور غلام اسحاق خان اپنی مرضی کے آدمی کو COAS بنانا چاہتے تھے تاکہ اپنی حیثیت کو محفوظ کیا جاسکے اور دوسرے کو نیچا دکھایا جاسکے۔ لہٰذا صدر نے وزیر اعظم کے COAS کی تقرری کے صوابدیدی اختیارات کو نظر انداز کرتے ہوئے جنرل عبدالوحید کاکڑ کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کردیا۔

صدر کے ہاتھوں بری طرح سے نظر انداز کیے جانے پر وزیر اعظم نے جوابی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ نواز شریف صدارتی مداخلت پر سخت ناراض تھے اور انہوں نے آٹھویں ترمیم کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے یہ اعلان کیا کہ چونکہ آٹھویں ترمیم وزیر اعظم کے کردار ادا کرنے میں رکاوٹ ڈالتی ہے لہٰذا اسے ختم کردینا چاہیے تاکہ وزیر اعظم آزادی سے اپنا کردار ادا کرسکے۔ لیکن آٹھویں ترمیم کو ختم کرنے کے لیے نواز شریف کے پاس پارلیمنٹ میں مطلوبہ اکثریت نہ تھی۔ انہیں آٹھویں ترمیم کے تحت صدر کے اختیارات کو کم کرنے کے لیے حزب اختلاف کی حمایت کی ضرورت تھی۔

بے نظیر کو صدر اور وزیر اعظم کے درمیان جاری جنگ کا علم تھا انہوں نے انتہائی مہارت سے دونوں کے درمیان ٹکراؤ کو مزید ہوا دی۔ صدر اور وزیر اعظم دونوں کو بے نظیر کی حمایت کی ضرورت تھی۔ انہوں نے خفیہ طور پر صدر کو نواز شریف کے خلاف حمایت کا یقین دلایا اور اگلے صدارتی انتخابات کے لیے انہیں اپنا امیدوار مقرر کیا۔ اس کے بدلے میں انہوں نے نواز شریف کی حکومت کے خاتمے اور نئے انتخابات کا مطالبہ کیا۔

صدر اور وزیر اعظم کے درمیان کشمکش میں اس وقت انتہائی پیچیدہ اور ناگوار صورتحال پیدا ہوئی جب مرحوم سابق چیف آف سٹاف جنرل آصف نواز جنجوعہ کی بیوہ نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے شوہر کو زہر خورانی کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک سیاسی قتل تھا اور اس کا الزام انہوں نے اس وقت کی حکومت پر لگایا۔ اس بیان نے تمام ملک اور حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

نواز شریف نے صحیح طور پر یہ اندازہ لگایا کہ یہ چال صدارتی حلقوں میں ان کے خلاف چلی گئی تھی۔ اپنی برطرفی کو محسوس کرتے ہوئے نواز شریف نے 17 اپریل 1993ء کو قوم سے خطاب کیا۔ انہوں نے صدر پر الزام لگایا کہ وہ انہیں کمزور کرنے کے لیے ان کی حکومت کے خلاف سازش میں ملوث ہیں۔ انہوں نے تحکمانہ لب و لہجہ میں اعلان کیا کہ وہ کوئی دباؤ قبول نہیں کریں گے اور نہ ہی اسمبلیاں تحلیل کریں گے اور نہ استعفیٰ دیں گے۔

وزیراعظم کے جارحانہ طرز تخاطب نے صدر کو بے حد ناراض کر دیا۔ صدر نے اگلے ہی روز انتقامی کارروائی کرتے ہوئے وزیراعظم کو برطرف کر دیا۔ صدر نے وزیراعظم کو برطرف کرتے وقت نواز شریف پر بدعنوانی، مخالفین کو ہراساں کرنا اور غیر شفاف پرائیویٹائزیشن کے عمل کے الزامات لگائے۔ انہوں نے سابق چیف آف آرمی سٹاف کی موت کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرایا۔ صدر نے اعلان کیا کہ نئے انتخابات 14 جولائی 1993ء کو ہوں گے۔ میر بلخ شیر مزاری کو نگران وزیراعظم مقرر کیا گیا۔

نواز شریف نے اپنی حکومت کی برطرفی کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا۔ سپریم کورٹ نے تاریخی فیصلہ دیتے ہوئے حکومت کی برطرفی کو غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دیا اور حکومت کو بحال کر دیا۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ بہت اہم اور تاریخی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ عدالت نے ایک ضدی انتظامیہ کا بخوبی سامنا کیا تھا۔ فیصلہ کی وجہ سے آئین کی برتری قائم ہوئی۔

لیکن غلام اسحاق خان ہار ماننے والے نہیں تھے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے باوجود وہ باعزت طور پر علیحدہ نہ ہوئے۔ انہوں نے بحال کردہ حکومت کو بے بس کرنے کے لیے اختیارات کی جنگ شروع کی۔ انہوں نے پنجاب میں آئی جے آئی کے اندر نواز شریف کے خلاف بغاوت پیدا کی۔ آئی جے آئی کے چند وزراء کو استعفے دینے کے لیے لالچ دیے گئے جس کی وجہ سے مرکز میں آئی جے آئی کی حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ صدر نے حکومت کو مزید کمزور کرنے کے لیے صوبہ سرحد کی اسمبلی میں صوبائی حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کروائی۔

آخر کار وزیراعظم کو مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا۔ وزیراعظم نے اسمبلیاں بھی توڑ دیں۔ صدر کو بھی ایک معاہدے کی رو سے جو آرمی چیف کی نگرانی میں طے پایا استعفیٰ دینا پڑا۔ چیئرمین سینٹ وسیم سجاد نے صدر کا چارج سنبھالا۔ ورلڈ بنک کے نائب صدر معین قریشی کو اگلے انتخابات کروانے کے لیے نگران وزیراعظم مقرر کیا گیا۔

آئی جے آئی کی حکومت کا خاتمہ پاکستان کی تاریخ کا افسوس ناک لمحہ تھا۔ اس کی وجہ سے معاشی ترقی اور آزادی کا شروع کردہ عمل رک گیا۔ معاشی ترقی کی رفتار جو معاشی عمل کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی آئی جے آئی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی رک گئی۔

باہر سے وزیراعظم کی درآمد ہمارے سیاسی نظام کے دیوالیہ پن کو ظاہر کرتی تھی۔ معین قریشی نہ صرف پاکستان میں ایک اجنبی تھے بلکہ ملک کے سیاسی اور معاشی حالات سے مکمل طور پر بے بہرہ بھی تھے۔ ان کے پاس پاکستان کے غربت زدہ عوام کو دینے کے لیے کچھ نہ تھا اور وہ صرف IMF کے قرضوں کی وصولی کے لیے آئے تھے۔ انہیں ملک کو درپیش مسائل کا قطعی ادراک نہ تھا۔

جمہوری عمل جو آہستہ آہستہ پیدا ہو رہا تھا صدر اور وزیراعظم کی لڑائی کی وجہ سے رک گیا۔ سیاست کے نمایاں کردار طاقت کا کھیل کھیلتے رہے اور قوم کو اس کے نتائج بھگتنے پڑے۔ جمہوریت کو دوبارہ سے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی جس کی وجہ سے عوام میں مایوسی اور بددلی پھیل گئی۔

باب نمبر 14

پیپلز پارٹی کی واپسی

بے نظیر دوسری مدت کے لیے وزیراعظم (96-1993)

1993ء کے عام انتخابات نے پیپلز پارٹی کو دوسری مرتبہ حکومت پر فائز کیا۔ نوازشریف حکومت سازی کے لیے مطلوبہ اکثریت حاصل نہ کر سکے کیونکہ اس وقت کے حالات نوازشریف کے حق میں ناسازگار تھے۔ انتخابات سے پہلے نگران حکومت نے بنکوں کے نادہندہ افراد کی فہرست شائع کی اور اعلان کیا کہ نادہندگان کو انتخابات لڑنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ معیشت کی ڈگمگاتی حالت بھی عوام پر آشکار ہو چکی تھی۔ ان تمام اقدامات اور حالات کا نوازشریف اور ان کی جماعت کی حیثیت پر گہرا اور منفی اثر پڑا۔ نوازشریف کا شمار ملک کے سرکردہ بنک نادہندگان میں ہوتا تھا۔ آئی جے آئی کا اتحاد بھی ختم ہو چکا تھا جس نے پاکستان مسلم لیگ کے انتخابات جیتنے کے امکانات کو کم کر دیا تھا۔

قومی اسمبلی کے لیے عام انتخابات 6 اکتوبر 1993ء کو ہوئے جبکہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 9 اکتوبر 1993ء کو ہوئے۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی انتخابات میں بڑی جماعتوں کی شکل میں سامنے آئیں۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) نے 207 میں سے 86 نشستیں حاصل کیں۔ پیپلز پارٹی صرف 72 نشستیں حاصل کر سکی۔

مرکز میں پیپلز پارٹی نے مخلوط حکومت تشکیل دی۔ مخلوط حکومت میں پیپلز پارٹی کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ (ج) کچھ آزاد امیدوار اور اقلیتوں کے نمائندے شامل تھے۔ بے نظیر نے دوسری مرتبہ وزیراعظم کا حلف 9 اکتوبر 1993ء کو اٹھایا۔ صوبوں میں بھی پیپلز پارٹی نے اپنی اتحادی جماعتوں سے مل کر حکومتیں قائم کیں۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) نے اپنی اتحادی جماعتوں کی مدد سے بلوچستان اور صوبہ سرحد میں حکومت قائم کی۔

مرکز اور صوبوں میں حکومتوں کی تشکیل کے بعد صدارتی انتخابات ہوئے۔ پیپلز پارٹی کے امیدوار فاروق احمد لغاری اور مسلم لیگ کے نامزد امیدوار وسیم سجاد کے درمیان مقابلہ ہوا۔ غلام اسحاق نے اپنے کاغذات جمع نہ کروائے کیونکہ پیپلز پارٹی ان کی انتخابات میں حمایت کے وعدہ سے منحرف ہوگئی تھی فاروق احمد لغاری نے 274 ووٹ لے کر وسیم سجاد کو شکست دی۔

پیپلز پاٹی کی حکومت کی کارکردگی کا جائزہ:

دوسری مرتبہ وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد بے نظیر نے جمہوریت اور معیشت کو فروغ دینے کا وعدہ کیا۔ بے نظیر اب ایک تجربہ کار اور منجھی ہوئی سیاست دان بن چکی تھی۔ انہیں وزارت عظمیٰ کا تجربہ ہو چکا تھا جو انہوں نے اپنی بحیثیت وزیراعظم پہلی مدت (90-1988) کے دوران حاصل کیا تھا۔ اپنے نامزد کردہ فاروق احمد خان لغاری کے صدارتی عہدہ پر ہونے کی وجہ سے انہیں اب آٹھویں ترمیم کی لٹکتی تلوار کا کوئی خوف نہ تھا۔ درحقیقت فاروق لغاری نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ بے نظیر کی حکومت کے خلاف اپنے آئینی اختیارات استعمال نہیں کریں گے۔

لیکن جمہوریت کے فروغ اور معاشی بالیدگی (Economic Growth) کی پیپلز پارٹی سے وابستہ تمام امیدیں اس وقت بکھر گئیں جب پیپلز پارٹی کی حکومت نے کام کا آغاز کیا۔ شروع ہی سے پیپلز پارٹی کی حکومت ان مسائل سے دوچار ہو گئی جن کا عام طور پر مخلوط حکومتوں کو پارلیمانی نظام میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بے نظیر جمہوریت کے فروغ کا وعدہ نبھا نہ سکیں۔ وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) اور اس کے رہنما کے خلاف اپنے اندرونی جذبات کو بھی دبا نہ سکیں۔ ایک دفعہ پھر پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ کے درمیان مخالفانہ سیاست کا آغاز ہوا اس دفعہ پاکستان مسلم لیگ (ن) حکومت کے قہر و غضب کا شکار تھی۔ صوبہ سرحد میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی مخلوط حکومت کو صرف دو ماہ کے اندر گورنر راج کے ذریعہ سے ہٹا دیا گیا۔ نواز شریف اور ان کے اہل خانہ کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کیے گئے۔

بجٹ خسارے میں کمی کے باعث معیشت میں قدرے بہتری پیدا ہوئی۔ لیکن بے نظیر عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے وعدے کو پورا نہ کر سکیں۔ صنعتی اور زراعتی شعبے حکومت کی پالیسی اور ٹیکسوں کے بوجھ کی وجہ سے سخت دباؤ میں آ گئے جس کی وجہ سے ٹیکسٹائل کی صنعت کو بند کرنا پڑا۔ ٹیکسٹائل کی صنعت تمام برآمدات کا 50% مہیا کر رہی تھی۔

بدعنوانی:

پیپلز پارٹی کی حکومت کا طریقہ کار اعلیٰ انتظامی اصولوں سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ بے نظیر اپنے پارٹی کارکنوں پر کنٹرول نہ رکھ سکیں۔ پیپلز پارٹی کے کارکن بے تحاشا لوٹ مار اور سنگین قسم کی بدعنوانی میں ملوث تھے۔ کارکنوں کی بے تحاشا لوٹ مار کی وجہ سے ملک کی ڈگمگاتی معاشی حالت مزید خراب ہو گئی۔ 1993ء میں پیپلز پارٹی کے حکومت سنبھالتے ہی بری حکمت عملی اور کارکنوں کو کھلی چھٹی کی وجہ سے ملک کی سیاسی اور معاشی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ حکومتی اہلکاروں اور پارٹی کارکنوں کی لاقانونیت، حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کے متکبرانہ رویے اور کراچی میں حکومتی اداروں کے ایما پر قتل و غارت نے ملک کی بگڑتی ہوئی امن عامہ کی صورت حال کو مزید خراب کر دیا تھا۔ ملک کے تمام حصوں میں بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی بدعنوانی، بے روزگاری اور لامحدود جرائم نے حکومت کی کارکردگی کو بگاڑ دیا تھا۔ کینہ پروری، انتظامیہ میں قوانین کی خلاف ورزی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ حکومت کی باضابطہ کارکردگی تقریباً ناممکن ہو گئی تھی۔

کابینہ کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ سازی کا اختیار وزیراعظم سیکرٹریٹ کو منتقل کر دیا گیا تھا۔ مشیروں اور معاونین کی ایک فوج ظفر موج بھرتی کر لی گئی تھی جو حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کرتے تھے۔ تمام قوانین اور اہلیت کے اصولوں کو پس پشت ڈال کر پیپلز پارٹی کے حکومتی اہلکاروں کے نزدیکی رشتہ داروں اور دوستوں کو بھاری معاوضوں پر مختلف ملازمتیں دی جاتی تھیں۔ قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ممبران بڑے پیمانے پر ملازمین کی بھرتی اور ملازمتوں پر تعیناتی میں دخل اندازی کرتے تھے۔ وزیراعظم اور حکومت کے اعلیٰ اہلکار پارٹی کے ایم این اے اور ایم پی اے ممبران کی غیر قانونی اور غیر آئینی کارروائیوں پر دھیان دینے سے قاصر تھے۔

وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے نزدیک رشتہ داروں پر ملکی دولت لوٹنے کے سنگین الزامات لگائے گئے۔ وزیراعظم کے شوہر آصف علی زرداری جو ممبر پارلیمنٹ اور کابینہ کے وزیر تھے پر ملکی دولت لوٹنے کے الزامات لگائے گئے اور انہیں کڑی نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اربوں روپیہ لوٹا اور حکومتی منصوبوں پر بھاری کمیشن حاصل کی۔ حکومتی جماعتوں کے لیے "ہارس ٹریڈنگ" کے ذریعے ممبران پارلیمنٹ کی وفاداریاں خریدی گئیں جنہیں ملکی دولت لوٹنے کے لیے کھلی چھٹی دی جاتی تھی۔

امن عامہ کی خراب صورت حال:

بے نظیر کے دور حکومت میں امن عامہ کی صورت حال تیزی سے خراب ہوگئی۔ امن عامہ کی خطرناک صورت حال نے ملک کی انتظامیہ کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ کراچی نسلی اور لسانی فسادات کی وجہ سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ نسلی فسادات ملک کے دوسرے حصوں میں پھیل گئے۔ ملک کے شمالی حصے مالاکنڈ میں وقت کے بدترین نسلی فسادات ہوئے جن میں سینکڑوں افراد مارے گئے۔ سندھ کا صوبہ نسلی اور فرقہ وارانہ جنگ و جدل کا مرکز بن گیا تھا۔ حکومت کو امن عامہ بحال کرنے کے لیے سخت اقدامات کرنے پڑے۔

ججز کا معاملہ:

سپریم کورٹ کے ججوں کے بارے بے نظیر کا کھلے عام نفرت و حقارت کا مظاہرہ بھی حکومت کے خاتمے کی وجہ بنا۔ سپریم کورٹ نے ججوں کی تعیناتی کے معاملے میں اپنا مشہور فیصلہ دیا تھا۔ وزیراعظم نے قومی اسمبلی میں تقریر کے دوران اس فیصلے کو تضحیک و تمسخر کا نشانہ بنایا۔ حکومت نے مسلسل فیصلے پر عمل درآمد میں رکاوٹ ڈالے رکھی جس نے ملک کے عدالتی اور انتظامی اداروں کو سپریم کورٹ کے حق میں کردار ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔

صورت حال دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی کیونکہ عدالت اور انتظامیہ اپنا اختیار کھو چکی تھیں۔ دونوں ادارے بگڑتی ہوئی صورت حال کو روکنے کی حالت میں نہ تھے۔ ان حالات کی وجہ سے صدر فاروق لغاری پر پارلیمنٹ توڑنے کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ جماعت اسلامی نے قومی اسمبلی کے سامنے دھرنا دیا اور حکومت سے اپنے حلف کو پورا نہ کر سکنے پر استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔

فاروق احمد خان لغاری کے ہاتھوں بے نظیر حکومت کا خاتمہ:

بالآخر صدر نے قوم کی تیزی سے ختم ہوتی ہوئی دولت کو بچانے کے لیے قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ صدر نے آئین کی شق 58(2b) کے تحت حاصل اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے قومی اسمبلی تحلیل کر دی اور بے نظیر حکومت کو 5 نومبر 1996ء کو برطرف کر دیا۔ صدر فاروق احمد خان لغاری نے اعلان کیا کہ نئے انتخابات 2 فروری 1997ء کو ہوں گے۔ ملک معراج خالد کو نگران وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ بے نظیر نے سپریم کورٹ میں اسمبلی توڑنے کے حکم کو چیلنج کیا۔ سپریم کورٹ نے صدر کے فیصلے کو منظور کرتے ہوئے اسمبلی بحال نہ کی۔

باب نمبر 15

پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حکومت

نواز شریف دوسری بار وزیراعظم (1997-1999):

قومی اسمبلی اور بے نظیر حکومت کو ختم کرنے کے صدر فاروق لغاری کے فیصلے کی ملک کے طول و عرض میں تعریف کی گئی۔ اسمبلی کی تحلیل کے حکم نامے میں بے نظیر حکومت کے خلاف الزامات کی ایک لمبی فہرست دی گئی تھی جن کی وجہ سے ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہوجانے پر عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ بے نظیر کا دوسرا دور حکومت ان کے پہلے دور سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ ان کے ملک کے مفادات کے خلاف آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے سامنے ہتھیار ڈال دینے سے ترقی کرتی ہوئی معیشت سر کے بل گر گئی۔

ملک معراج خالد کی قیادت میں نگران حکومت قائم کی گئی۔ اسی طرح صوبوں میں نگران حکومتیں قائم کی گئیں۔ نگران حکومت اور صدر فاروق خان لغاری نے 90 دن کے اندر نئے انتخابات کروانے کا اعلان کیا۔

نگران حکومت کے حسب وعدہ عام انتخابات 2 فروری 1997ء کو کروائے گئے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے قومی و صوبائی اسمبلیوں کے لیے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ ان دو بڑی جماعتوں کے علاوہ متعدد دوسری جماعتوں اور آزاد امیدواروں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ کرکٹ کے سابق کھلاڑی عمران خان نے اپنی جماعت تحریک انصاف انتخابات سے چند ماہ پیشتر قائم کی تھی۔ ان کی جماعت نے انتخابات میں حصہ لیا اور قومی اسمبلی کے لیے 160 امیدوار میدان میں اتارے۔ تحریک انصاف نے صوبائی انتخابات کے لیے بھی امیدوار کھڑے کیے۔ عمران خان نے ایک ملک گیر اور پرجوش انتخابی مہم کے ذریعے اپنی جماعت کے امیدواروں کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

انتخابات کے نتائج نے ہر کسی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ نواز شریف کی قیادت میں مسلم لیگ (ن) انتخابات میں بھاری اکثریت حاصل کی اور قومی و صوبائی اسمبلیوں میں بھی بڑے پیمانے پر کامیابی حاصل کرلی صوبہ سرحد میں مسلم لیگ (ن) اور عوامی نیشنل پارٹی شانہ بشانہ تھیں۔ سندھ اسمبلی میں پیپلز پارٹی واحد اکثریتی جماعت تھی لیکن ووٹوں کی کم تعداد کی وجہ سے پیپلز پارٹی سندھ میں اپنی حکومت نہ بنا سکی۔ مسلم لیگ (ن) نے ایم کیو ایم سے مل کر سندھ میں حکومت قائم کی۔ بلوچستان میں نئی جماعت بلوچستان قومی تحریک نے اکثریت حاصل کی۔ پنجاب میں مسلم لیگ (ن) نے مطلوبہ اکثریت حاصل کر کے حکومت بنائی۔

مجموعی طور پر انتخابات میں ووٹروں کی حاضری قومی اسمبلی کے لیے 35.92 فیصد اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے 35.76 فی صد رہی۔ صوبائی اسمبلیوں میں حاضری کے حوالے سے صوبہ پنجاب میں قومی اسمبلی کے لیے حاضری سب سے زیادہ یعنی 40.39 فی صد تھی اور صوبائی انتخابات میں 40.27 فی صد رہی۔

سندھ میں قومی اسمبلی کے لیے ووٹروں کی حاضری 31.21 فی صد اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے 30.85 فی صد رہی۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں سخت سردی اور برف باری کی وجہ سے ووٹروں کی بڑی تعداد نے انتخابات میں حصہ نہ لیا۔

پہلی بار قومی وصوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ساتھ ساتھ ہوئے۔ یہ تجربہ کافی کامیاب رہا۔ اس کی وجہ سے دھاندلی اور جعلی ووٹ ڈالنے پر کافی حد تک قابو پالیا گیا۔

بے نظیر نے صدر پر انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا۔ انہوں نے کہا کہ انتخابات کے نتائج طے شدہ تھے لیکن وہ اپنے دعوے کے حق میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہ کر سکیں۔ پیپلز پارٹی نے صدر کے اسمبلیاں توڑنے کے اقدام پر سپریم کورٹ میں اعتراض کیا تھا جسے انتخابات والے دن مسترد کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی چند سالوں کے دوران عوام سے دور ہوگئی اور اس کے کارکن اور ووٹر سخت مایوسی کا شکار ہوگئے۔ عوام کی خواہشات اور مسائل سے یکسر بے اعتنائی اور سخت بدانتظامی اور برے طرز حکومت نے پیپلز پارٹی کو انتخابات میں سخت نقصان پہنچایا۔

انتخابات میں مسلم لیگ (ن) کی بھاری اکثریت نے ہر کسی کو حیران کر دیا تھا۔ کسی کو مسلم لیگ (ن) کی اتنی واضح اور بھاری اکثریت سے انتخابات جیتنے کی توقع نہ تھی۔ بین الاقوامی خبر رساں ادارے نواز شریف کی وسیع پیمانے پر جیت پر چکرا گئے تھے۔ وہ آٹھ سالوں کے دوران چوتھے عام انتخابات میں بے نظیر بھٹو کی شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بیرونی خبر رساں ادارے جن میں امریکن، برطانوی اور فرانسیسی اخبارات شامل تھے انتخابات میں کم حاضری کو ووٹروں کی عدم دلچسپی اور پاکستانی سیاستدانوں پر عوام کی بے اعتمادی سے تعبیر کر رہے تھے۔ کچھ نے ووٹروں کی عدم دلچسپی کی ساری ذمہ داری بے نظیر پر ڈال دی جن کے متکبرانہ رویہ کی وجہ سے ووٹر انتخابات سے بیزار ہوگئے تھے۔ امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے پاکستانی سیاست کے حوالے سے اپنے تبصرے میں لکھا ''عوام میں دور تک پھیلا ہوا یہ احساس کہ وزیراعظم اور دوسرے منتخب رہنماؤں نے اپنے آپ کو دولت مند بنایا ہے جمہوریت میں اعتماد کو گھٹانے اور مارشل لاء کے لیے پسندیدگی کو ابھارنے کا باعث بنا۔'' انتخابات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ نواز شریف مسلح افواج کے ساتھ قریبی تعلقات بنانے میں کامیاب رہے جو کبھی بھی بے نظیر پر اعتبار نہ کرتی تھی اور ہمیشہ نواز شریف کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھیں۔

نواز شریف نے 13 فروری 1997ء کو دوسری بار ملک کے وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ وہ 93-1990ء کے دوران پہلی بار ملک کے وزیراعظم بنے تھے۔ اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان نے ان کی حکومت برطرف کر دی تھی۔ حالانکہ سپریم کورٹ نے ان کی حکومت کو بحال کر دیا تھا۔ لیکن انہوں نے نئے سرے سے اختیار حاصل کرنے کے لیے عوام کے پاس جانے کا فیصلہ کیا اور 1993ء میں از خود اسمبلیاں توڑ دیں۔

پاکستان کے عوام نے مسلم لیگ (ن) کے منشور میں اپنے اعتماد کا اظہار کیا اور انتخابات میں مسلم لیگ (ن) کی بھرپور حمایت کی۔ فروری 1997ء کے انتخابات نے پیپلز پارٹی کی حیثیت کو بری طرح نقصان پہنچایا تھا۔ فروری 1997ء کے انتخابات پاکستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔ 1997ء کے انتخابات نے نواز شریف کی قیادت میں مسلم لیگ (ن) کو بے پناہ اختیارات سے نوازا تھا۔ نواز شریف دوسری مرتبہ بھاری اکثریت کے ساتھ وزیراعظم بنے جس کی پہلے کوئی مثال موجود نہ تھی۔

1997ء کے انتخابات نے جمہوریت کے فروغ کو بہت تقویت پہنچائی۔ انتخابات میں کسی قسم کی کوئی دھاندلی نہ ہوئی اور پورے ملک میں انتخابات بالکل پر امن ماحول میں ہوئے۔ عوام نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے پوری ذمہ داری سے اپنے حق رائے دہی استعمال کیا۔ عوام نے سیاسی حالات کے بھرپور شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتخابات میں صحیح فیصلے کیے۔ انتخابات میں چند نمایاں سیاست دان ہار گئے جن میں غلام مصطفیٰ کھر، نوابزادہ نصر اللہ خان، مولانا فضل الرحمٰن، فیصل صالح حیات، خالد کھرل، ڈاکٹر شیر افگن، قائم علیشاہ، میاں منظور احمد وٹو اور دوسرے شامل تھے جو اپنی ہار پر حیران رہ گئے تھے۔

نواز شریف جب وزیراعظم بنے تو فوری طور پر انہیں دو مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلا مسئلہ صدر کے ساتھ خوش اسلوبی سے کام کرنے کے لیے تعلقات کار استوار کرنا تھا۔ نواز شریف نے فہم وفراست اور سیاسی پختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مسئلے پر قابو پالیا اور صدر کے ساتھ نزدیکی تعلق قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے آٹھویں آئینی ترمیم کے حساس مسئلے کو چابکدستی سے حل کرلیا اور اسمبلی کے ذریعے آٹھویں ترمیم کو آئین سے ختم کروانے میں کامیاب ہوگئے۔ صدر نے فوری طور پر آٹھویں ترمیم کو حذف کرنے کے مسودے پر دستخط کردیئے۔ آٹھویں ترمیم کو ختم کروادینا نواز شریف کی بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس نے ملک کے سیاسی نظام کو بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ آٹھویں ترمیم ملک کی منتخب حکومتوں کی قبل از وقت موت کا باعث بنی جس نے ملک کی سیاست پر برا اثر ڈالا۔ اس کے علاوہ آٹھویں ترمیم کی وجہ سے ملک کے سیاسی اور انتظامی نظام کے دوستون صدر اور وزیراعظم کے درمیان سچے اور مخلص روابط قائم نہ ہوسکے۔

ملکی قرضہ اتارنے کا منصوبہ:

وزیراعظم کو درپیش دوسرا بڑا مسئلہ معاشی بحران کی صورت میں اجاگر ہوا۔ مسلم لیگ (ن) کی حکومت نے معاشی بحران ورثے میں اپنی پیش روحکومت سے حاصل کیا تھا۔ وزیراعظم نواز شریف ملک کی معاشی مشکلات سے بخوبی آگاہ تھے اور اس کے حل کے لیے انہوں نے ایک جامع منصوبہ تشکیل دیا۔

اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد نواز شریف نے ملک پر سے قرضوں کا بوجھ اتارنے کے لیے قرضہ اتار..نے کے منصوبے کا آغاز کیا۔ نواز شریف نے تمام پاکستانی باشندوں جن میں دوسرے ممالک میں رہنے والے پاکستانی بھی شامل تھے۔ سے اپیل کی کہ وہ آگے آئیں اور قومی تعمیر نو کی کوشش میں بھرپور حصہ لیں۔

پہلی حکومتوں کی خراب کارکردگی کی وجہ سے قومی قرضے بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مختلف حکومتیں بجٹ خسارے کو پورا کرنے کے لیے اندرونی اور بیرونی ذرائع سے قرضے لیتی رہی تھیں کیونکہ ٹیکسوں سے حاصل شدہ رقوم ملکی اور حکومتی اخراجات پورے کرنے کے قابل نہ تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ قرضوں کی رقوم بجٹ خسارے اور حکومتوں کی خراب پالیسیوں کی وجہ سے تیزی سے بڑھتی رہیں۔

جون 1987ء کے خاتمے تک پاکستان کا کل قرضہ 247.3 بلین روپے تھا جو 30 جون 1996ء تک بڑھ کر 908.9 بلین روپے ہوچکا تھا۔ 908.9 بلین روپے کے گھریلو قرضہ پر سود کی کل ادائیگی 96-1995ء تک 102.3 بلین روپے تھی۔ بیرونی قرضہ پر سود کی کل ادائیگی 96-1995 تک 809.9 بلین روپے ہوچکی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیرونی قرضہ اندرونی قرضے کی نسبت زیادہ مہنگا پڑتا تھا جو ملک کی معاشی حکمت عملی بنانے والوں کی خاص توجہ کا مستحق تھا۔

وزیراعظم نے کئی مواقع پر یہ کہا کہ بیرونی قرضوں کی بڑی رقوم بدعنوان اور بے ایمان حکومتی اہلکاروں کی جیب میں چلی گئی ہیں جنہوں نے بیرون ملک اپنے بنک کھاتوں میں لوٹا ہوا روپیہ جمع کروا دیا ہے۔ نواز شریف نے وعدہ کیا کہ وہ بدعنوان سیاست دانوں، بیوروکریٹس اور سابقہ حکمرانوں سے لوٹا ہوا پیسہ واپس لیں گے۔

اس پس منظر کی روشنی میں قوم نے وزیراعظم کی ''قرض اتارو ملک سنوارو'' کی اپیل پر لبیک کہا۔ وزیراعظم کی قرضہ اتارنے کی اپیل پر بے شمار لوگوں نے وسیع پیمانے پر اپنی ملکیتوں کو وزیراعظم کے قرض اتارنے کی سکیم میں جمع کروا دیا۔ عوام نے اپنے مستقبل کی ضروریات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنا سب کچھ قومی قرضہ اتارنے کے لیے وزیراعظم کی صوابدید پر رکھ دیا۔

احتساب:

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ پاکستان میں بدعنوانی حد سے زیادہ پھیل چکی تھی اور یہ ہماری قومی زندگی کے لیے ایک المیہ بن کر رہ گئی تھی۔ کنبہ پروری اور بدعنوانی تیزی سے پھیل رہی تھی جس کی وجہ سے قانون پر عمل کرنے والوں کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ عوام ملک کے نظام اور بدعنوان سیاست دانوں اور بیوروکریٹس سے تنگ آ گئے تھے اور اس موقع کی جستجو میں تھے جب بدعنوان سیاست دانوں اور بیوروکریٹس سے انہیں چھٹکارہ مل جائے گا۔

وزیراعظم نوازشریف نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ملک سے بدعنوانی ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ لوٹی ہوئی رقم کی پائی پائی چوروں اور ڈاکوؤں سے واپس لی جائے گی اور بیرون ملک بنکوں میں جمع کروائے گئے پیسے واپس لائے جائیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ بدعنوان سیاست دان اور بیوروکریٹس سے شفاف احتساب کے ذریعے پوچھ گچھ کی جائے گی اور انہیں اپنی بدعنوانیوں کا حساب دینا ہوگا۔

مسلم لیگ (ن) کو دیئے گئے بھاری مینڈیٹ کا مطلب احتساب تھا۔ عوام نے ان لوگوں کو انتخابات میں مسترد کردیا تھا جو ملک میں بڑھتی ہوئی بدعنوانی اور بدانتظامی کے ذمہ دار تھے جس کی وجہ سے ملک معاشی تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ انتخابات میں بھاری مینڈیٹ نے نوازشریف کو یہ پیغام دیا تھا کہ انہیں ملکی دولت لوٹنے والے لٹیروں اور چوروں کو پکڑنا ہے اور ان سے ملک کی لوٹی ہوئی دولت واپس وصول کرنی ہے۔

اپنی حکومت کے پہلے 100 دنوں میں وزیراعظم نے معاشی اقدامات اور آئی ایم ایف کے لگائے گئے ٹیکسوں کا جائزہ لیا۔ انہوں نے طاقت ور اور پیداوار میں رکاوٹ ڈالنے والے نوکر شاہی کے افسروں کو متنبہ کیا اور انہیں یہ باور کروایا کہ وہ کس طرح سے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے ساتھ نپٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اپنے کیے گئے وعدے کے مطابق نوازشریف نے سینٹر سیف الرحمان کی قیادت میں احتساب سیل قائم کیا۔ احتساب سیل کو بدعنوان افسروں اور سیاست دانوں سے حساب لینے کے لیے وسیع اختیارات دیے گئے۔

مسلم لیگ (ن) حکومت کی چلائی ہوئی احتساب مہم پر عوام نے ملے جلے ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ حکومت کی نیک نیتی کے باوجود معاشرے کے کچھ طبقوں نے احتساب کے مقاصد اور نوعیت کے بارے میں چند تحفظات ظاہر کیے۔ منظوری کے ساتھ ساتھ احتساب کے بارے میں کچھ اعتراضات لگائے گئے۔ کچھ سیاست دانوں اور صحافیوں نے حکومت کے احتسابی عمل پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ عوام بھی سست احتسابی عمل کی وجہ سے مایوسی کا شکار ہوئے جس کی بنا پر کوئی نمایاں نتائج حاصل نہ ہوئے۔ حتیٰ کہ 87 بیوروکریٹس کی برطرفی بھی احتسابی عمل کا کوئی موثر نتیجہ نہ دکھا سکی۔ یہ بات سامنے آئی کہ برطرف کردہ بیوروکریٹس کے خلاف کوئی ٹھوس شہادت موجود نہ تھی۔ بظاہر حکومت کے شروع کردہ احتسابی عمل کے خلاف تین بڑے اعتراضات پائے جاتے تھے۔

1- حکومت نے کسی بدعنوان سیاست دان کو احتساب کے شکنجے میں نہیں کھینچا، احتساب سیل نے بدعنوان سیاست دانوں کے خلاف کارروائی میں کوئی دلچسپی نہ دکھائی۔ ایسا لگتا ہے کہ وزیراعظم جو بذات خود ایک سیاست دان تھے دوسرے سیاست دانوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اس وقت سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا جب انہوں نے بے نظیر بھٹو کے بیان کہ سیاست دان بدعنوان نہیں اور انہیں غلط طور پر احتسابی کارروائی میں شامل کیا گیا کی حمایت کردی۔ یہ بات سب پر واضح ہے کہ بیوروکریٹس میں وسیع پیمانے پر پھیلی بدعنوانی دراصل سیاست دانوں کے بیوروکریٹس کے استحصال کی وجہ سے تھی۔

2- دوسرا اعتراض یہ تھا کہ احتسابی عمل دراصل چند لوگوں کے خلاف تھا اور یہ منصفانہ، شفاف اور ایمان دارانہ تھا جیسا کہ حکومت

نے دعویٰ کیا تھا۔ اس بات کی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی گئی کہ احتساب کا عمل مخالف سیاست دانوں کے خلاف یک طرفہ انتقامی کارروائی نہ ہوگا۔

3۔ احتساب کا عمل بہت سست ثابت ہوا اور اپنے مقصد سے ہٹ گیا تھا۔ سوائے الزامات اور چند برطرفیوں کے احتساب کا عمل کوئی خاطر خواہ نتائج نہ دکھا سکا۔ لوگ بدعنوان سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کے خلاف فوری کارروائی چاہتے تھے جو ست احتسابی عمل کی وجہ سے نہ ہو سکی۔

تیرہویں آئینی ترمیم:

جب فروری 1997ء میں نواز شریف نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا تو انہوں نے محسوس کیا کہ آٹھویں ترمیم صدارتی اختیارات کی بنا پر ملک کی معاشی حالت سدھارنے اور بدعنوان سیاست دانوں اور کرپٹ بیوروکریٹس کو کیفر کردار تک پہنچانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی۔ انہوں نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا کہ جب تک آٹھویں ترمیم حذف نہیں کی جاتی حکومت کے سر پر خطرے کی تلوار لٹکتی رہے گی اور عوام کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کو روکتی رہے گی۔ نواز شریف صدر کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہت ہوشیاری سے چلاتے رہے اور آٹھویں ترمیم کو ختم کرنے کے لیے خاموشی سے اپنے منصوبے پر کام کرتے رہے۔

آٹھویں ترمیم نے صدر کو حکومت اور اسمبلیاں توڑنے کے بے پناہ اختیارات تفویض کیے تھے۔ اس ترمیم کی رو سے صدر قومی اسمبلی کو اس کی مدت پوری ہونے سے قبل تحلیل کر سکتا تھا۔ اس اختیار کی وجہ سے چار مواقع پر ایک دہائی میں آئینی بحران پیدا ہوا۔ اس اختیار نے صدر اور وزیراعظم کے درمیان سخت اختلاف رائے پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

فروری 1997ء کے انتخابات میں مسلم لیگ (ن) کو وسیع پیمانے پر کامیابی حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ (ن) نے دو تہائی اکثریت حاصل کی جس کی بنا پر اسے آئین میں ترمیم کرنے کے اختیارات حاصل ہوگئے تھے۔ شروع میں نواز شریف نے محتاط رویہ اختیار کیا اور اعلان کیا کہ وہ آٹھویں ترمیم کی منسوخی کے معاملے کو بحث کے لیے پارلیمنٹ میں پیش کریں گے۔ لیکن 31 مارچ 1997ء کو وزیراعظم نے یک دم یہ اعلان کر دیا کہ ان کی جماعت نے آٹھویں ترمیم کے تحت اسمبلی توڑنے کے صدر کے صوابدیدی اختیارات کو ختم کرنے کا فیصلہ دے دیا ہے۔ نتیجتاً یکم اپریل 1997ء کو تیرہویں آئینی ترمیم کا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کر دیا گیا اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے ہنگامی طور پر اسے منظور کر لیا۔ اس ترمیم کی رو سے آئین کی دفعات (58(2b اور (112(2b آئین سے حذف کر دی گئیں اور صدر اور گورنروں کے اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات کو ختم کر دیا گیا۔ آئین کی شق 243 کو بھی تبدیل کر دیا گیا جس کی رو سے صدر کے مسلح افواج کے سربراہ مقرر کرنے کے اختیارات کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ صدر کا مسلح افواج پر تسلط جو کہ اسے مسلح افواج کے سربراہان کی تقرری کی وجہ سے حاصل تھا ختم ہوگیا۔ اس طرح ایک دہائی کے دوران بار بار آئینی بحران اور حکومتوں کی توڑ پھوڑ کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا اور صدر کے اوپر وزیراعظم کی برتری پھر سے قائم ہوگئی۔

صدر کے قومی اسمبلی کو توڑنے کے صوابدیدی اختیارات کے حامی ہمیشہ سے یہ کہتے آئے کہ مارشل لاء کو روکنے اور حکومتوں کے اختیارات کے ناجائز استعمال پر نظر رکھنے کے لیے بہترین ذریعہ تھے۔ اس سلسلے میں ذوالفقار علی بھٹو کے آمرانہ طرز حکومت اور پھر 1977ء میں سیاسی تعطل جو مارشل لاء کا باعث بنا کی مثال سامنے ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر 1977ء میں صدر کے پاس قومی اسمبلی کو توڑنے کے اختیارات ہوتے تو جولائی 1977ء میں پیدا ہونے والا سیاسی اور آئینی بحران جو مارشل لاء لگنے کا باعث بنا سے بچا جا سکتا تھا۔ پاکستان کی افسوس ناک اور تسلسل سے محروم تاریخ کی روشنی میں اس دلیل کو جھٹلایا جا سکتا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ صوابدیدی اختیارات کو صحیح اور دور اندیشی سے استعمال کیا جائے گا تو یہ اس دلیل کے ٹھیک ہونے کا ثبوت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ 1988ء سے مختلف حکومتوں کو صوابدیدی اختیارات کا صحیح شعور نہ تھا اور انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے طرزِ عمل میں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ حکومتی اختیارات جو قوم کا اپنی حکومت اور نمائندگان پر بھروسہ ہوتے ہیں اکثر اوقات ان کا استعمال ذاتی انا اور شان و شوکت کی بنا پر کیا جاتا رہا۔ عوامی قیادت عام طور پر مطلق العنان اور اختیارات کے ناجائز استعمال سے مشابہ رہی ہے۔ اکثر اوقات عوامی رہنماؤں نے اپنے آپ کو حکومت چلانے کے قواعد و ضوابط سے مبرا سمجھا اور ان پر عمل درآمد اپنی شان کے خلاف جانا۔ انہوں نے پرانے شہنشاہوں جیسا طرزِ عمل اپنایا اور عوام کے پیسے کو ذاتی جاگیر سمجھا۔

اس تجربے کی روشنی میں وزیرِاعظم اور کابینہ کے اختیارات کے غلط استعمال کی روک تھام اور آٹھویں ترمیم کے ذریعے حکومت کو قانون کے دائرہ کار میں رکھنے بشرطیکہ صدر یہ اختیارات استعمال کرتے وقت مثبت طرزِ عمل اپنائیں اور ذاتی سوچ کو اپنے فیصلے پر اثر انداز نہ ہونے دیں کا بہت فائدہ ہوسکتا ہے لیکن اس کے برعکس ہمارے آئینی تجربے سے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ صدر اکثر اوقات بڑی سختی سے وزیرِاعظم کے خلاف پارٹی بازی میں ملوث ہوجاتے تھے جس کی وجہ سے ملک میں سیاسی بحران پیدا ہوجاتا تھا۔ صدر نے کبھی بھی حکومت کی بدعنوانی اور اختیارات کے ناجائز استعمال کو روکنے کے لیے مداخلت نہ کی بلکہ صرف اس وقت اپنے اختیارات کا استعمال کیا جب وزیرِاعظم اور صدر کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے یا جب وزیرِاعظم نے اپنی حیثیت منوانے کی کوشش کی۔ حکومت کو توڑتے ہوئے صدر وزیرِاعظم پر ہر طرح کا الزام لگاتے تاکہ اپنے اقدام کو صحیح ثابت کیا جاسکے۔ آٹھویں ترمیم کے اختیارات کو کبھی بھی حکومت کے غیر قانونی طرزِ عمل کو روکنے کے لیے استعمال نہ کیا گیا بلکہ ذاتی نفرت اور دشمنی کی بنا پر یہ اختیارات حکومت کے خلاف استعمال کیے گئے۔

چودھویں آئینی ترمیم:

چودھویں آئینی ترمیم نواز شریف حکومت کا ایک اور کارنامہ ہے۔ اس ترمیم کی وجہ سے ''ہارس ٹریڈنگ'' اور ''فلور کراسنگ'' جیسے قابلِ نفرت سیاسی عمل کو ختم کرنے میں مدد ملی۔ ہارس ٹریڈنگ انتہائی گھٹیا سیاسی عمل تھا جس کے ذریعے پارلیمنٹ کے اراکین کو پرمٹوں ملازمتوں اور وزارتوں کا لالچ دے کر وفاداری تبدیل کرنے پر مجبور کردیا جاتا تھا۔ ہارس ٹریڈنگ کی وجہ سے ہمارا سیاسی نظام تباہ ہوچکا تھا کیونکہ منتخب اراکین پارلیمنٹ اپنی جماعتوں کو وفاداری بدلنے کی دھمکیوں سے ڈراتے تھے۔ بالخصوص وہ جماعت جس کی پارلیمنٹ میں نمائندگی کم ہوتی تھی وہ اپنے اراکین کی دھمکیوں نے سخت نالاں اور اس کا سدباب کرنے سے قاصر تھی۔ ایسی جماعتیں اکثر اپنے اراکین کے دباؤ کے سامنے بے بس ہوکر گھٹنے ٹیک دیتی تھیں اور پارلیمنٹ میں اپنی لڑکھڑاتی ہوئی پوزیشن کو بچانے کے لیے اراکین کے جائز و ناجائز مطالبات پورے کرتی تھیں۔

جب مسلم لیگ (ن) نے حکومت بنائی تو اس کے سرکردہ رہنماؤں نے فلور کراسنگ اور ہاس ٹریڈنگ کی لعنت سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے کوئی موثر طریقہ کار ایجاد کرنے کا ارادہ کیا۔ آخر کار نواز شریف کی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ اس برائی کو ختم کرنے کے لیے باقاعدہ اور موثر قانون سازی کی ضرورت ہے۔

فلور کراسنگ کے قانون سازی کے لیے مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا جسے 76 ووٹوں سے منظور کرلیا گیا۔ قانون کے خلاف کوئی ووٹ نہ آیا۔ اس قانون میں کئی ترامیم تجویز کی گئی جنہیں حزبِ اختلاف کے رہنما اعتزاز احسن نے تجویز کیا تھا۔ اس قانون کی رو سے فلور کراسنگ قانون کے تحت کیے گئے کسی بھی اقدام کے خلاف کارروائی سے عدالتوں کو روک دیا گیا۔ اس قانون میں وفاداری بدلنے کو اس طرح واضح کیا گیا کہ اگر کوئی رکن پارلیمنٹ جو کسی بھی سیاسی جماعت کے نامزد کردہ امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑتا ہے یا کسی انتخابی نشان کے تحت انتخاب لڑتا ہے اور جس کے انتخاب جیتنے کا نوٹیفکیشن اسی حیثیت میں ہوتا ہے اگر وہ انتخاب

جیتنے کے بعد اپنی جماعت کے ڈسپلن یا جماعت کی حکمت عملی کے خلاف اپنی جماعت کے پارلیمنٹری گروپ کی واضح ہدایات کے خلاف ووٹ دیتا ہے یا رائے شماری میں حصہ نہیں لیتا تو اسے پارلیمنٹ میں اپنی نشست چھوڑنا ہوگی اور نئے سرے سے مختلف انتخابی نشان کے ساتھ انتخاب لڑنا ہوگا۔

اس قانون کے تحت جس رکن کو وفاداری تبدیل کرنے کے دائرہ میں لایا جائے گا اسے کسی بھی عدالت میں اپیل کا حق نہ ہوگا۔ یہ شق اس قانون کی موثر کارکردگی کو بچانے کے لیے شامل کی گئی۔ حزب اختلاف نے جو ترامیم تجویز کیں انہیں بحث و تمحیص کے بعد قانون میں شامل کرلیا گیا۔ حزب اختلاف نے قانون میں ایک ترمیم شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس ترمیم کے مطابق کسی بھی رکن کے وفاداری بدلنے یا نہ بدلنے کا فیصلہ ایک انضباطی کمیٹی جماعت کے سربراہ کی شکایت پر کرے گی۔ انضباطی کمیٹی شکایت وصول ہونے کے 7 دن کے اندر متعلقہ رکن کو ذاتی شنوائی کا موقع دے گی۔ اگر فیصلہ متعلقہ رکن کے خلاف جاتا ہے تو وہ سات دن کے اندر اپنی جماعت کے سربراہ کو اپیل کر سکے گا۔ اس ضمن میں جماعت کے سربراہ کا فیصلہ آخری ہوگا۔ اس کے بعد جماعت کا سربراہ اپنے فیصلے سے سپیکر کو مطلع کرے گا جو اسے الیکشن کمیشن کے پاس بھیج دے گا۔ الیکشن کمیشن فیصلے کی منظوری کے بعد خالی کی گئی نشست کے لیے ضمنی انتخابات کا اعلان کرے گا۔

حزب اختلاف کے رہنما اعتزاز احسن نے جماعت کے سربراہ کو دیے گئے نااہلی کے اختیارات پر اعتراض کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ جمہوری اصولوں اور انصاف کے تقاضے کے خلاف ہے کہ ایک ہی شخص شکایت کنندہ بھی ہو اور منصف بھی ہو۔

وفاداری بدلنے کے خلاف قانون کی قومی اسمبلی اور سینٹ میں اتفاق رائے سے منظوری فلور کراسنگ کے وبال کو روکنے کے سلسلے میں انتہائی اہم قدم تھا۔ چودھویں آئینی ترمیم کے تحت نئے قانون کے تحت اگر صوبائی یا قومی اسمبلی کا کوئی رکن اپنی جماعتی وفاداری تبدیل کرتا ہے یا جماعت کے نظم وضبط کی خلاف ورزی کرتا ہے یا کسی آئینی مسودے پر اپنی جماعت کی حکمت عملی کے خلاف رائے دیتا ہے یا رائے شماری سے غیر حاضر رہتا ہے تو وہ جماعت کے سربراہ کی الیکشن کمیشن کو شکایت پر اسمبلی کی رکنیت سے نااہل قرار پائے گا۔ بہت سارے اراکین پارلیمنٹ کے معمولی بہانے پر وفاداریاں بدلنے کے رجحان کی روش پر ایسا قانون بہت پہلے بن جانا چاہیے تھا۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ نواز حکومت نے بہت عرصے تک معرض التوا میں رہنے والے معاملے پر قانون سازی کر کے ملکی سیاسی نظام کو صحیح راستے پر ڈالنے کی کوشش کی۔

جنرل پرویز مشرف

General Pervaiz Musharraf

A Mission for National Re-Construction

آئینی بحران پیدا کر کے وفاقی حکومت کو بے بس کر دیا۔ بالآخر چیف آف آرمی سٹاف جنرل وحید کاکڑ کی نگرانی میں نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے نواز شریف اور غلام اسحاق خان اپنے اپنے عہدوں سے دستبردار ہو گئے۔

اپنی دوسری مدت کے دوران نواز شریف آٹھویں آئینی ترمیم کو ختم کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ تیرھویں آئینی ترمیم کے ذریعے آٹھویں ترمیم کو ختم کر دیا گیا جس کی وجہ سے نواز شریف بہ حیثیت وزیر اعظم زیادہ طاقت ور ہو گئے۔ اس کے بعد چودھویں آئینی ترمیم کی گئی جس سے فلور کراسنگ پر پابندی لگا دی گئی۔ چودھویں ترمیم کی وجہ سے ہارس ٹریڈنگ جیسے قبیح فعل کو کنٹرول کرنے میں مدد ملی جس کا سیاسی حالات پر مثبت تاثر پڑا۔

ترھویں اور چودھویں ترامیم کے بعد نواز شریف بہت طاقت ور ہو گئے۔ ان ترامیم کی وجہ سے حکومت پر جو دباؤ ہوتا تھا، وہ ختم ہو گیا اور اب نواز شریف بلاشرکت غیرے تمام سیاسی و انتظامی اختیارات کے مالک بن گئے تھے۔

اس قدر وسیع اختیارات حاصل کرنے کے بعد نواز شریف اب اپنی مرضی سے بغیر کسی خوف کے حکومت کے معاملات چلا رہے تھے۔ نواز شریف نے اپنی بے پناہ طاقت کے بل بوتے پر فوج کے سربراہ جنرل جہانگیر کرامت کو انتہائی ہتک آمیز طریقے سے اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ جنرل جہانگیر کرامت نے ملکی سیاسی ڈھانچے پر تنقید کرتے ہوئے اصلاح کے لئے نیشنل سیکورٹی کونسل تشکیل دینے کا مشورہ دیا جس کا نواز شریف نے سخت برا منایا اور انہیں اپنے عہدے سے دستبردار ہونیکا حکم دیا۔ فوج کے سربراہ کیساتھ نواز شریف کے سلوک نے فوج میں سخت بے چینی پیدا کی اور اعلیٰ افسروں نے اسے فوج کے سربراہ کی توہین سمجھتے ہوئے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

ایک فوجی سربراہ کو بزور طاقت عہدے سے ہٹانے کے بعد نواز شریف کے انداز میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی۔ اسی دوران کارگل کی لڑائی کی وجہ سے نواز شریف اور نئے چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف کے درمیان سخت ٹکراؤ پیدا ہوا۔ نواز شریف کا کہنا تھا کہ کارگل کی کارروائی ان کی اجازت اور علم کے بغیر کی گئی۔ جبکہ جنرل پرویز مشرف اور دوسرے فوجی افسروں کا کہنا تھا کہ وزیر اعظم کو کارروائی سے باخبر رکھا گیا تھا۔ کارگل کی کارروائی سے دنیا میں پاکستان کو شرمندگی اٹھانا پڑی اور امریکی صدر بل کلنٹن کے اصرار پر پاکستان کو کارگل میں اپنی برتر حیثیت کے باوجود پسپا ہونا پڑا۔ اپنی پوزیشن چھوڑتے وقت پاکستان کو سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ فوج اپنی ہزیمت کی ذمہ داری نواز شریف پر رکھتی تھی اور انہیں اس پسپائی کا ذمہ دار ٹھہراتی تھی۔

کارگل کے واقعہ کے بعد نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کے خلاف کارروائی کا ارادہ کیا اور انہیں ان کے عہدے سے ہٹانا چاہا۔ جنرل پرویز مشرف نے وزیر اعظم کے ارادے کو بھانپ کر پسپا ہونے سے انکار کر دیا۔

ایک واقعہ جس نے نواز شریف کو سخت نقصان پہنچایا وہ مسلم لیگ (ن) کے کارکنوں کا سپریم کورٹ پر حملہ تھا۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ حکومت کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ جس کا مقصد وزیر اعظم کو ان کے آمرانہ اقدامات سے روکنا تھا۔ جسٹس سجاد علی شاہ کو ایسا کرنے سے باز رکھنے کے لیے مسلم لیگ (ن) کے کارکنوں نے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت پر دھاوا بول دیا۔ چیف جسٹس کی توہین کی گئی اور عدالت کی عمارت کو نقصان پہنچایا گیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے نواز شریف جنرل پرویز مشرف کو ان کے عہدے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے ایک منصوبہ تشکیل دیا گیا۔ جنرل پرویز مشرف سری لنکا کے سرکاری دورے سے واپس آ رہے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں نواز شریف نے جنرل ضیا الدین بٹ کو نیا آرمی چیف مقرر کر دیا تھا۔ پروگرام کے مطابق جنرل پرویز مشرف کے جہاز کو کراچی اترنے سے روک دیا

گیا تا کہ نئے مقرر کردہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیا الدین بٹ اپنے عہدے کا حلف لے سکیں لیکن چند جرنیلوں کی بروقت مداخلت سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور فوج نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے حکومت کا کنٹرول سنبھال لیا۔ نواز شریف کو ہائی جیکنگ کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

اس طرح سے نواز شریف اپنے مقام سے گر گئے۔ ان کے خلاف عدالت میں ہائی جیکنگ کا مقدمہ چلایا گیا۔ جس میں انہیں سزا ہوئی فوجی حکومت کے کیساتھ ایک معاہدے کے بعد نواز شریف اور ان کے اہل خانہ ملک چھوڑ کر سعودی عریبیہ چلے گئے۔

تقسیم اختیارات کا منصوبہ 2000ء DEVOLUTION PLAN

پس منظر:

اگست 1947 میں ایک آزاد اور خود مختار ریاست بننے کے بعد پاکستان ایک قابل عمل سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کے بغیر چل رہا تھا۔ آزادی کے 9 سال بعد تک ملکی آئین نہ بن سکا۔ ایک انتہائی لمبے عرصے تک آئین نہ بننے سے ہمارا سیاسی نظام بدعنوان اور ذاتی مفاد کے حصول میں لگے رہنے والے سیاست دانوں کے تعصب اور تلون مزاجی کا شکار ہو گیا۔ ٹھیکوں، پرمٹ، ٹیکس چوری اور وزارتی عہدے حاصل کرنے کی سیاست نے نوازائیدہ پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ آزادی کے بعد کے سالوں میں سیاست دانوں کی ہوس اقتدار اور دولت کی لوٹ کھسوٹ نے سیاسی نظام کو مزید کمزور کر دیا۔ سیاست دان سیاسی جماعتوں کو ذاتی جاگیر کی طرح چلاتے تھے۔ ایسا کرتے وقت جمہوری اقدار کو بری طرح کچل دیا جاتا تھا۔

سیاست میں نوجوانوں کے آجانے کی وجہ سے ملکی سیاست اختیارات اور طاقت کے حصول کے لیے بدترین لڑائی کا میدان بن گئی۔ نوجوان سیاست دان سیاسی اخلاق وضوابط اور ملک کی انتظامی ضروریات سے بالکل بے بہرہ تھے۔ نتیجتاً ملک کا انتظامی اور سیاسی ڈھانچہ تباہ ہو گیا اور اس کی جگہ بدعنوانی، کنبہ پروری اور سیاسی بدانتظامی اور بے راہ روی نے لے لی۔ ملک کا ٹیکسوں کا نظام، عدالتی ڈھانچہ اور پولیس کا محکمہ انتہا کی بدنظمی اور ابتری کا شکار ہو چکا تھا جس کی وجہ سے حکومت پر سے عوام کا اعتماد ختم ہو گیا تھا۔

''ہارس ٹریڈنگ'' جیسا قبیح طرز عمل معرض وجود میں آ چکا تھا۔ جس کا مقصد مخالف سیاسی جماعتوں کے اراکین پارلیمنٹ کو وزارتوں اور ملازمتوں کا لالچ دے کر ان کی وفاداریاں خریدنا تھا تا کہ وہ حکومتی جماعت کیساتھ مل کر ملکی دولت کی لوٹ کھسوٹ میں شریک ہو جائیں۔ نوکر شاہی مطلق العنان ہو چکی تھی اور انتہائی ظالمانہ طریقے سے عوام پر حکومت کر رہی تھی۔

چونکہ حکومت پاکستان 9 سال تک اپنا آئین اور سیاسی نظام مرتب نہ کر سکی تھی اس لئے 1935ء کا قانون چند تبدیلیوں کیساتھ ملکی آئین کے طور پر اپنا لیا گیا تھا۔ 1935ء کا قانون لاگو ہو جانے کے بعد مقامی حکومتوں کا وہی ڈھانچہ جو برصغیر میں موجود تھا پاکستان میں بھی عمل میں آ گیا۔ چونکہ آزادی سے پہلے کا مقامی حکومتوں کا نظام برطانوی سامراجی حکمرانوں نے اپنی ضروریات کے پیش نظر وضع کیا تھا لہٰذا یہ نظام آزاد پاکستان کے لیے موزوں نہ تھا۔ برطانوی حکمرانوں نے یہ نظام ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھنے اور عوام کو محکوم بنانے کے لیے بنایا تھا۔ اس لئے پاکستان کے مقامی حکومتوں کے ڈھانچہ میں بھی وہی سوچ اور طرز عمل جو کہ مطلق العنان غیر جمہوری اور جابرانہ تھا فروغ پا گیا تھا۔ ہمارے حکمران عوام کو اپنا زرخرید غلام سمجھ کر ان سے انتہائی ظالمانہ برتاؤ کرتے تھے۔ عوام کو ان کے حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اگر اس ظلم کے خلاف کوئی احتجاج کرتا تو اسے حکومتی اداروں کے ذریعے بے دردی سے کچل دیا جاتا تھا۔ ہمارے مقامی حکومتوں کے ڈھانچے میں بدعنوانی، کنبہ پروری اور بدانتظامی تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی۔

پاکستان کا مقامی حکومتوں کا نظام کئی وجوہات کی بنا پر ابتدائی ناقص تھا۔ یہ بہت سارے معاملات میں نامکمل تھا جس کی وجہ سے بدعنوانی اور بدانتظامی پروان چڑھ رہی تھی۔ صوبائی نوکر شاہی مقامی حکومتوں کو کنٹرول کرنے میں بااختیار تھی اور مقامی حکومتوں کے اداروں کو دبا کر رکھنے کی خواہش مند تھی۔ نوکر شاہی کے مطلق العنان رویے کی وجہ سے دیہات اور شہری علاقوں میں جھگڑا پیدا ہوتا تھا۔ صوبائی نوکر شاہی نظام نے حاکم اور محکوم کے سامراجی تعلق کو آگے بڑھایا اور شہری اور دیہاتی تقسیم کو تیز کیا۔

پاکستان کا غیر مربوط مقامی حکومتوں کا نظام جو کہ ضلع، تحصیل اور ڈویژنل سطح پر اداروں کے درمیان باہمی اختلاط سے عاری تھا بدعنوانی، بدانتظامی اور کنبہ پروری کو فروغ دینے کا ذمہ دار تھا جس کی وجہ سے بنیادی سطح سے طرز حکمرانی کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اختیارات ایک ہی سطح پر مرتکز تھے جو غلط استعمال کا موجب بنتے تھے۔ ڈپٹی کمشنر اپنی طاقت و حیثیت کی بناء پر اختیارات کے غلط استعمال کی زندہ مثال تھا۔

عوام نے مقامی حکومتوں کے نظام کے بارے میں سخت بے اطمینانی اور شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے۔ عوامی تشویش اور خوف کو دور کرنا ضروری تھا جو کہ صرف اسی صورت ممکن تھا کہ حکومتی شعبہ جات میں ایک شفاف اور کھلا نظام رائج کیا جائے۔ ایسا صرف ایک شراکت دار انتظامی ڈھانچہ رائج کرنے سے ہی ہو سکتا تھا۔ لہٰذا عوام میں بڑھتی ہوئی مایوسی اور احساس محرومی کو روکنے کے لیے ایک موثر سیاسی اور اصلاحی ادارہ جات کے جامع منصوبہ کی ضرورت تھی تاکہ ملک کو درپیش اداروں کا بحران روکا جا سکے۔

چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے حکومت سنبھالنے کے بعد انتظامی بے راہ روی جو کہ ہمارے سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے میں سرایت کر چکی تھی سے پاک کرنے کے لیے اصلاح کار کے ایک منصوبے کو رائج کرنیکا پروگرام مرتب کیا۔ جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت کا یہ مقصد تھا کہ پاکستانی معاشرے کو جو کہ سویلین حکومتوں کی کوتاہ اندیش حکمت عملی کی وجہ سے بٹ چکا تھا، دوبارہ سے تعمیر کیا جائے اور گاؤں اور محلہ کی سطح پر عوام کو حکومت میں شریک کیا جائے۔ حکومت نے اس مقصد کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا جو قومی وسائل تک عوام کی رسائی کی ضمانت دیتا تھا۔ یہ منصوبہ ایک ایسے سیاسی طرز عمل اور رہن سہن کی ضمانت دیتا تھا جو نفرت، محاذ آرائی اور گروہ بندی کی بجائے تعاون کے جذبات کو پروان چڑھائے گا۔ چیف ایگزیکٹو نے اپنے 7 نکاتی پروگرام کا اعلان کیا جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

1- قومی اعتماد اور اخلاق کی تعمیر نو
2- بین الاصوبائی عدم موافقت کو ختم کر کے وفاق کو مضبوط کرنا
3- سرمایہ کاروں کے اعتماد کو بحال کرنا
4- امن و امان بحال کرنا اور فوری انصاف کا حصول ممکن بنانا
5- حکومتی اداروں کو سیاسی محاذ آرائی سے پاک کرنا
6- جڑوں سے تقسیم اختیارات کا نظام رائج کرنا
7- فوری اور شفاف احتساب

منصوبے کی نمایاں خصوصیات

1- رائے دہندہ کی عمر کم از کم 18 سال ہو گی۔
2- مقامی حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کیا جائے گا اور مقامی حکومتوں کی مالی معاونت کے لیے آسان اور ہموار نظام استوار کیا جائے گا۔
3- مرد اور خواتین کو گاؤں اور یونین کونسلز میں نمائندگی دی جائے گی۔
4- ضلعی سطح پر پوری طرح بااختیار ضلعی حکومت قائم کی جائے گی جس میں ضلع ترقی کا زینہ ہوگا۔

۳۔ تحصیل کی سطح پر مکمل طور پر ہم آہنگ ڈھانچہ تعمیر کیا جائے گا جس کا مقصد دیہات اور شہروں کے درمیان محاذ آرائی کو ختم کرنا ہوگا۔
۴۔ ایک مربوط سیاسی انتظامی ڈھانچہ ترتیب دیا جائے گا تاکہ شہری انحطاط کو روکا جا سکے اور شہروں کو بڑے ضلعوں میں ڈھالا جا سکے۔

جنرل پرویز مشرف بحیثیت صدر

سال 2001ء کیساتھ ہی پاکستان میں چند انتہائی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سب سے پہلی اور اہم تبدیلی صدراتی شخصیات کی تبدیلی تھی۔ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے 20 جون 2001ء کو صدر پاکستان کا عہدہ سنبھالا۔ ایک آرڈیننس کے ذریعے موجودہ صدر رفیق تارڑ کو صدر کے عہدے سے فارغ کر دیا گیا۔ سینٹ' قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا۔ لہذا جنرل پرویز مشرف نے مکمل اور لامحدود اختیارات کیساتھ ملک کی عنان حکومت سنبھالی اور ملک کو برائیوں سے صاف کرنے کے لیے بڑے پراعتماد طریقے سے اپنے اقتدار کا آغاز کیا۔ جنرل پرویز مشرف بہ یک وقت چیف ایگزیکٹو' چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف اور چیف آف آرمی سٹاف کے عہدوں پر فائز رہے۔

جنرل پرویز مشرف اس وقت ملک کے صدر بنے جبکہ امریکی صدر جارج بش کیساتھ طالبان، ایٹمی پھیلاؤ' امریکہ کیساتھ تعلقات اور ہندوستان کیساتھ نزدیکی تعلقات کے حوالے سے گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ اس حوالے سے بھی زیادہ اہم تھی کیونکہ جنرل پرویز مشرف اور بھارتی وزیراعظم واجپائی کے درمیان کشمیر کے مسئلے پر بات چیت ہونیوالی تھی۔ جنرل پرویز مشرف نے صدر کا عہدہ سنبھال کر بھارتی رہنماؤں کو یہ پیغام دیا کہ دراصل ہندوستان پاکستان سے متعلق تمام مسائل پر ان کیساتھ معاملہ طے کر سکتا ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے IMF کیساتھ بھی غربت کے خاتمے اور معاشی ترقی کا معاملہ طے کرنے کے لیے مطلوبہ اختیار حاصل کر لیا تھا۔

ملک کے اعلیٰ ترین سیاسی اور انتظامی عہدہ پر فائز ہونے کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ جنرل پرویز مشرف اپنے لئے سیاسی کردار حاصل کرنا چاہتے ہیں انہوں نے سیاسی مخالفین جنہوں نے ان کے اقدامات کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا ذرہ بھر پرواہ نہ کی اور انہیں یہ تاثر دیا کہ وہ لمبے عرصے تک اقتدار میں رہنا چاہتے ہیں۔ اس عندیہ سے جنرل پرویز مشرف نے مخالف سیاسی جماعتوں اور بالخصوص مذہبی گروہوں کے اقتدار پر قبضہ جمانے کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اتحاد برائے بحالی جمہوریت ARD ان سیاست دانوں کا گٹھ جوڑ تھا جنہوں نے اپنے دور اقتدار کے دوران ملکی وسائل کو بے رحمی سے لوٹا تھا اس نے جنرل پرویز مشرف کے صدر بننے پر ناراضگی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مذہبی جماعتیں جن کے پاس ملکی ترقی کا کوئی پروگرام نہ تھا نئی سیاسی صورت حال سے خوش نہ تھیں۔ جماعت اسلامی نے صدر بننے پر جنرل پرویز مشرف پر سخت تنقید کی۔ حزب مخالف نے پرویز مشرف کے صدر بننے کو آئین کی خلاف ورزی اور وفاقی پارلیمانی نظام حکومت کے خلاف بغاوت سے تعبیر کیا۔

پرویز مشرف کے خلاف دشمنی کی بنیاد سیاست دانوں کے خودغرضانہ مقاصد کی وجہ سے تھی۔ جب پرویز مشرف نے بدعنوان سیاست دانوں کو اقتدار میں ساتھ ملانے سے انکار کر دیا تو انہوں نے اپنی توپوں کا رخ پرویز مشرف کی طرف موڑ دیا۔ صدر ARD نواب زادہ نصر اللہ خان نے شروع میں فوج کو خوش آمدید کہا۔ انہوں نے صدر پرویز مشرف کے ساتھ تعاون کا اشارہ بھی دیا۔ لیکن جب پرویز مشرف نے انہیں نظر انداز کیا اور جھڑک دیا تو انہوں نے پرویز مشرف کے خلاف مخالفانہ بیانات دینے شروع کر دیے اور حکومت کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کیا۔ عمران خان جو سیاست میں نووارد تھے انہوں نے پرویز مشرف کیساتھ بھرپور تعاون کا اظہار کیا۔ لیکن جب پرویز مشرف نے انہیں ان کے کم تر سیاسی تجربے اور اہلیت کی بنا پر وزیراعظم بنانے سے معذوری ظاہر کی تو وہ پرویز مشرف اور فوجی حکومت کے سخت مخالف ہو گئے۔ اسی طرح دوسرے سیاسی گروہ یعنی PPP ' جماعت اسلامی اور مسلم لیگ (ن) نے بھی نوابزادہ نصر اللہ خان اور عمران خان کیساتھ مل کر پرویز مشرف اور فوجی حکومت کو مطعون کرنے کے لیے گٹھ جوڑ کر لیا۔

آگرہ ملاقات

پاکستانی حکومتوں کی سنجیدہ اور پرخلوص کوششوں کے باوجود کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اس تعطل کی نمایاں وجہ بھارتی حکومت کا ضدی رویہ تھا جو کہ ہر دفعہ کشمیر میں استصواب رائے کروانے کے وعدے سے منحرف ہو جاتی تھی مسئلہ کشمیر کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے تعلقات کشیدہ رہے ہیں اور دونوں ممالک اس مسئلہ پر دو دفعہ یعنی 1965ء اور 1971ء میں مسلح جنگیں لڑ چکے ہیں۔

جب ہندوستان میں BJP بھارتی جنتا پارٹی اقتدار میں آئی تو وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے دونوں ممالک کے درمیان جاری تناؤ کو ختم کرنے اور پاکستان کیساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ واجپائی اس وقت کے پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف کی دعوت پر لاہور آئے۔ اپنے دورے کے دوران واجپائی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ دونوں ملک ماضی کو بھول کر ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے نئے سرے سے کوشش شروع کریں تاکہ دونوں ممالک کے عوام بہتر زندگی کے حصول کو ممکن بنا سکیں۔

واجپائی کے دورہ لاہور کے فوراً بعد کارگل کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ایک دفعہ پھر دونوں ممالک میں ٹکراؤ اور دشمنی انتہا کو پہنچ گئی۔

اکتوبر 1999ء میں نواز شریف کی حکومت کو گرا دیا گیا اور فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف نے بہ حیثیت چیف ایگزیکٹو ملک کا اقتدار سنبھال لیا۔ بھارتی وزیر اعظم نے ہندوستان و پاکستان سے متعلق تمام امور پر بات چیت کے لیے پرویز مشرف کو بھارت آنیکی دعوت دی۔ جمود کو توڑنے کے لیے یہ دعوت بھارتی حکومت کی طرف سے بہت بڑی پیش قدمی تھی۔ یہ پرویز مشرف کے لیے بڑا چیلنج تھا۔ اسی اثنا میں جنرل پرویز مشرف نے صدر پاکستان کا عہدہ سنبھال لیا تھا جس کی بنا پر پرویز مشرف کا سیاسی مقام بہت بڑھ گیا تھا۔ بھارتی حکومت نے فوری طور پر پرویز مشرف کی نئی حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا۔

صدر بننے کے بعد پرویز مشرف میں بہت زیادہ خود اعتمادی عود کر گئی تھی۔ انہوں نے اپنے ظاہری انداز اور طور طریقوں سے بھارتی حکمرانوں کو یہ باور کروایا کہ وہ مستقبل میں ان کیساتھ معاملات طے کرنے میں پاکستان کے سب سے طاقتور حکمران ہوں گے۔ انہوں نے بات چیت کے لیے بھارتی وزیر اعظم کی دعوت پر مثبت ردعمل کا اظہار کیا اور اعلان کیا وہ بھارتی راہنماؤں کو ملنے کے لیے ہندوستان جانیکے لیے تیار ہیں۔

جنرل پرویز مشرف چار روزہ دورے کے لیے 12 جولائی 2001ء کو بھارت پہنچے۔ ان کا سربراہ مملکت کی حیثیت میں موزوں استقبال کیا گیا۔ بھارتی حکومت نے دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ بات چیت میں پرخلوص ہیں اور پاکستانی وفد کو پورا پورا سفارتی پروٹول پیش کیا۔

جنرل پرویز مشرف نے بھارت پہنچنے کے بعد بڑے متاثر کن انداز میں اپنے دورے کا آغاز کیا۔ انہوں نے پریس کا بڑی خود اعتمادی سے سامنا کیا اور کہا کہ وہ کھلے ذہن کیساتھ بھارت آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کا اولین مقصد بھارتی حکمرانوں پر مسئلہ کشمیر کی حساس نوعیت واضح کرنا ہے۔ آپ نے واضح کیا کہ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کیساتھ ان کی بات چیت میں مرکزی اہمیت مسئلہ کشمیر کی ہوگی کیونکہ اس کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے ہیں۔

دوسری جانب بھارتی ذرائع ابلاغ نے بھارتی سفارت کاروں کے متضاد بیانات شائع کیئے۔ بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے اعلان کیا کہ مسئلہ کشمیر بات چیت کی بنیاد نہیں ہوگا۔ اس طرح جنرل پرویز مشرف کا دورہ شروع ہونے سے پہلے بھارتی وزیر اعظم نے

کہا کہ کشمیر ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔

ہندوستانی حکمرانوں کے بیانات نے پرویز مشرف کے دورہ شروع ہونے سے پہلے دوستی اور گرمجوشی کی فضا جو پاکستان کی حکومت نے اپنے صلح جویانہ طرز عمل سے ہموار کی تھی کو تقریباً تباہ کر کے رکھ دیا۔ صدر پرویز مشرف نے ہندوستانی وزیراعظم سے کہا کہ وہ بات چیت شروع ہونے سے بیشتر اس قسم کے بیانات دینے سے گریز کریں۔

صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے بات چیت کے لیے 14 جولائی 2001 کو آگرہ میں ملاقات کی۔ یہ ملاقات صدر پرویز مشرف اور واجپائی کے درمیان اکیلے میں ہوئی۔ بات چیت کے دوران صدر پرویز مشرف نے بھارتی وزیراعظم کو مسئلہ کشمیر کی پاکستان ہندوستان کے تعلقات کے حوالے سے اہمیت کے بارے میں قائل کرنے کی کوشش کی۔

بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے بے لچک رویہ اپنایا اور کشمیر کو متنازعہ مسئلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے صدر پاکستان کے نقطہ نظر سے اتفاق نہ کیا اور اس پر مصر رہے کہ کشمیر بھارت کا اندرونی معاملہ ہے اور بات چیت کے دائرہ میں نہیں آتا۔ پرویز مشرف نے اس پر زور دیا کہ کشمیر بات چیت کا مرکزی نقطہ ہے اور جب تک اسے حل نہیں کیا جاتا پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات معمول پر نہیں آسکتے۔ صدر پرویز مشرف نے بھارتی وزیراعظم پر مزید وضاحت کی کہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان جھگڑے کا باعث ہے جسے برصغیر میں امن کے قیام کے لیے پوری نیک نیتی سے سمجھنا اور حل کرنا ضروری ہے۔ بھارتی وزیراعظم اس پر متفق نہ ہوئے اور بات چیت تعطل کا شکار ہوگئی۔

بات چیت کا اگلا مرحلہ اس عزم سے شروع ہوا کہ کوئی نیا راستہ نکالنا ہے۔ دونوں راہنماؤں نے سیاسی، معاشی، معاشرتی، ویزا پابندیاں اور دوسرے معاملات جو دونوں ممالک سے تعلق رکھتے تھے پر پوری تفصیل سے بحث کی۔ صدر پرویز مشرف اور واجپائی بالآخر دونوں ممالک سے متعلق مختلف مسائل کے بارے ایک معاہدے پر متفق ہوگئے اور مشترکہ اعلامیہ تیار کر لیا گیا۔ عین اس وقت جب کہ مشترکہ اعلامیہ پر دستخط ہونے والے تھے تو آخری لمحات میں بھارتی جنتا پارٹی کے دو انتہائی سخت اور ضدی ممبران جسونت سنگھ اور کے ایل ایڈوانی نے بدنیتی سے مشترکہ اعلامیہ کے مضمون میں تبدیلی کر دی۔ انہوں نے اعلامیہ میں ایک شق کا اضافہ کر دیا جس کی رو سے کشمیری مجاہدین کی جدوجہد آزادی کو سرحد پار دہشت گردی قرار دے دیا گیا۔

پاکستان نے ہندوستان کے راہنماؤں کی بدنیتی کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ جنرل پرویز مشرف نے اس شق سے اتفاق نہ کیا اور کشمیری مجاہدین کی جدوجہد کو بھرپور انداز میں ''جدوجہد آزادی'' قرار دیا۔ واجپائی نے یہ اصرار کیا کہ کشمیری مجاہدین کو دہشت گرد قرار دیا جائے جبکہ پرویز مشرف انہیں مجاہدین آزادی کہتے رہے۔ پرویز مشرف کا یہ کہنا تھا کہ چونکہ کشمیری عوام کو ہندوستان نے اپنا غلام بنا کے رکھا ہوا ہے اور انہوں نے بھارتی فوج کے بے پناہ ظلم برداشت کئے ہیں اس لئے یہ ان کا حق ہے کہ وہ بھارتی تسلط سے آزاد ہونے کی کوشش کریں لہٰذا اس طرح ان کی کوشش جدوجہد آزادی کے زمرے میں آتی ہے۔

اس نقطے پر بات چیت ناکام ہوگئی۔ بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ اور وزیر داخلہ ایڈوانی کی وجہ سے مشترکہ اعلامیہ جاری نہ ہو سکا۔ پاکستان کی امن کے قیام کے لیے پرخلوص کوشش ایک دفعہ پھر ناکام ہوگئی جس کی وجہ بھارتی راہنماؤں کا ضدی پن اور اصل مسئلہ کو سمجھنے سے عاری رویہ تھا۔ بھارت نے ہمیشہ کی طرح بات چیت کی ناکامی کی ذمہ داری پاکستان پر ڈال دی۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ

گیارہ ستمبر 2001ء کو امریکہ اس وقت دہشت گرد کارروائیوں کی زد میں آ گیا جب امریکی ایئر لائن کے تین مسافر بردار اغوا شدہ طیارے اچانک ورلڈ ٹریڈ سنٹر (WTC) نیویارک اور پینٹا گون، واشنگٹن کی بلند و بالا عمارتوں سے ٹکرا گئے۔ ہزاروں معصوم جانیں ضائع ہوئیں اور کروڑوں کی املاک تباہ و برباد ہوگئیں۔ ایک اور جہاز جو امریکی صدر کے دفتر وائٹ ہاؤس کی طرف جا رہا تھا، میزائل کے ذریعے راستے میں ہی گرا لیا گیا۔

ان حملوں نے امریکی عوام کو نفسیاتی خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا۔ یہ خودکش حملے تھے جو امریکی انتظامیہ کی پالیسیوں کا ردعمل تھے۔ بش انتظامیہ کو ان حملوں کی پیشگی خبر نہ ہونے پر شدید تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ صدر بش نے حملے کے ذمہ دار لوگوں کے خلاف فوری اعلان جنگ کر دیا۔

ان حملوں نے عالمی طاقتوں کے نظریات اور دفاعی تدابیر کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ مغربی جمہوریت اور اس کی آزاد خیالی میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عالمی معیشت پر بھی اس واقعے کے اثرات مرتب ہوئے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر بڑی بڑی ہوائی کمپنیوں کے جہاز گراؤنڈ کر دیے گئے پروازیں معطل ہونے سے ایئر لائنز کا بزنس ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ صرف برطانیہ اور امریکہ میں ائر لائنز سے وابستہ تقریباً ایک لاکھ افراد بے روزگار ہو گئے۔

امریکی انتظامیہ نے اسامہ بن لادن کو جو کہ القاعدہ تحریک کے سربراہ ہیں، اس واقعہ کا سب سے بڑا ذمہ دار قرار دیا اور افغانستان کی طالبان حکومت سے مطالبہ کیا کہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کیا جائے۔ مزید برآں امریکہ نے اس امر کا بھی اعلان کیا جو کوئی ریاست دہشت گردوں کی پشت پناہی کرے گی، امریکہ اس کے خلاف ضروری کارروائی کرے گا۔

طالبان حکومت نے امریکہ کا یہ مطالبہ یکسر مسترد کر دیا اور اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ طالبان نے اس الزام کو بھی مسترد کر دیا کہ اسامہ بن لادن گیارہ ستمبر کے حملوں کے ذمہ دار ہیں۔ طالبان نے امریکی انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ حملوں میں اسامہ بن لادن کے ملوث ہونے کی مضبوط شہادت فراہم کی جائے جو کہ امریکہ کے لیے ایک مشکل امر تھا کیونکہ واقعہ کے ذمہ دار مبینہ دہشت گرد بھی ان حملوں میں ہلاک ہو چکے تھے۔

گیارہ ستمبر کے حملوں سے امریکہ کی خفیہ ایجنسیوں کی کمزوریاں بھی واضح ہوگئیں جنہیں چھپانے کے لیے طالبان اور اسامہ بن لادن کو اس واقعہ میں ملوث کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ امریکہ نے اسامہ بن لادن کی حوالگی سے متعلق طالبان کو ایک ڈیڈ لائن دی جسے فوری طور پر طالبان کی طرف سے مسترد کر دیا گیا۔

7 اکتوبر 2001ء کو امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے افغانستان پر بمباری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دونوں ممالک کا موقف تھا کہ وہ طاقت کے ذریعے طالبان کی قدامت پسند اور بنیاد پرست حکومت کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک میانہ رو حکومت قائم کریں گے کیونکہ ان کے خیال میں طالبان نے دہشت گردوں کو پناہ دے رکھی ہے۔

امریکہ نے چالیس ممالک کو دہشت گردی کے خلاف قائم کردہ اتحاد میں شامل کر لیا۔ دیگر ممالک نے بھی امریکی موقف کی حمایت کی مگر عملی طور پر اس میں شریک نہ ہوئے۔ اسلامی ممالک کے بلاک OIC نے بھی دہشت گردی کی مذمت کی اور امریکی موقف کو کسی قدر درست قرار دیا۔ تاہم عالمی دہشت گردی پر OIC میں اختلافات بھی سامنے آئے۔

امریکی قیادت میں قائم کردہ اتحاد نے شمالی اتحاد جو افغانستان میں طالبان حکومت کا سب سے بڑا دشمن تھا، کو بے پناہ فوجی امداد دی تاکہ طالبان حکومت کا خاتمہ کیا جا سکے۔ شمالی اتحاد نے سب سے پہلے مزار شریف کا کنٹرول سنبھالا اور بعد ازاں افغانستان کے دارالخلافہ کابل پر قابض ہو گئے۔

اس طرح طالبان جو اپنی ضد اور قدامت پسندی کی وجہ سے عالمی برادری کی حمایت کھو چکے تھے، پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ 13 نومبر 2001ء کو افغانستان پر طالبان حکومت ختم ہو گئی۔ طالبان کے بقول انہوں نے کابل سے انخلا جنگی حکمت عملی کے طور پر کیا تھا تاکہ حملہ آوروں کو گوریلا انداز میں شکست دی جائے۔

طالبان کی شکست نے افغانستان پر گہرے اثرات مرتب کیے پورا ملک ایک مرتبہ پھر خانہ جنگی کی حالت میں آ گیا۔ اگرچہ اس وقت افغانستان میں حامد کرزئی کی قیادت میں منتخب نمائندگی دی گئی ہے لیکن امن و امان کی صورت حال ابتر ہے۔ پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر افغانستان کی تبدیلی حکومت کا منفی اثر پڑا ہے۔ آئے روز جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں اور افغان حکومت پاکستان پر دراندازی کے الزامات لگاتی رہتی ہے۔ حالانکہ پاکستان نے انتہا پسندوں کے داخلے پر سختی سے پابندی عائد کر رکھی ہے اور شمال مغربی قبائلی علاقوں میں ملٹری آپریشن کے ذریعے انتہا پسندوں کی کارروائیوں کو کافی حد تک کنٹرول کیا ہے۔

دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ صرف افغانستان تک ہی محدود نہیں ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں القاعدہ کے خلاف امریکی آپریشن کا سلسلہ جاری ہے۔ خاص طور پر مشرق وسطیٰ اس وقت انتہائی نازک صورتحال سے دوچار ہے۔ عراق پر امریکی قبضے کے بعد وہاں مسلمانوں کو بیدردی سے قتل کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ فلسطینی مسلمانوں پر اسرائیلی جارحیت نے دہشت گردی کو مزید فروغ دیا ہے۔

عالمی دہشت گردی کے حوالے سے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دہشت گردی کی کارروائیوں اور آزادی کی تحریکوں میں خط امتیاز کے لیے کوئی طریق کار (Criteria) وضع نہیں کیا گیا۔ عالمی طاقتیں جسے چاہیں دہشت گرد کے لقب سے نواز دیں اور جسے چاہیں مجاہد (Freedom fighter) بنا دیں۔ اسرائیل پوری دنیا میں دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہے۔ لیکن امریکہ نہ صرف اس کی کارروائیوں کو نظر انداز کیے ہوئے ہے بلکہ اسے جدید ترین ٹیکنالوجی اور اقوام متحدہ میں سیاسی حمایت فراہم کرتا ہے۔ اس دوہرے معیار کا فطری ردعمل دہشت گردی ہے۔ افغانستان میں سوویت یونین کی مداخلت پر امریکہ اور مغربی دنیا نے اس کی شدید مخالفت کی۔ افغانستان کے جنگجوؤں کو اسلحہ کی فراہمی، تربیت اور سرمایہ وافر مقدار میں فراہم کیا اور عالمی سطح پر انہیں مجاہدین (Freedom Fighters) کے نام سے یاد کیا گیا، لیکن بعد میں بدلتی ہوئی صورتحال کے پیش نظر ان طاقتوں کے رویہ میں تبدیلی واقع ہوئی اور مجاہدین راتوں رات دہشت گرد بنا دیے گئے اور ہر سطح پر ان کا محاسبہ کیا گیا۔ یہی وہ پس منظر ہے جو عالمی افق پر دہشت گردی کو فروغ دے رہا ہے۔ اقوام متحدہ جیسے عالمی ادارے اس کا نوٹس لینے سے قاصر ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کا کردار

حکومت پاکستان دہشت گردی کے معاملے پر امریکی حمایت کے سوال پر بے حد نازک صورتحال سے دوچار ہو گئی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر (WTC) اور پینٹاگون پر حملے کے چند ہی گھنٹے بعد پوری دنیا کی نظریں اسلام آباد کے ردعمل پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ پاکستان کے حملے کے مبینہ ذمہ داروں سے کوئی تعلقات نہ تھے لیکن پھر بھی طالبان حکومت کی حمایت اور طالبان کی طرف سے اسامہ بن لادن کو پناہ دینے کے حوالے سے پاکستان کو بالواسطہ طور پر بے حد اہمیت حاصل ہو گئی۔

صدر پرویز مشرف نے صورتحال کی سنگینی اور ممکنہ مضمرات کا بغور جائزہ لینے کے بعد پیش کیے جانے والے تمام امریکی مطالبات فوراً تسلیم کر لیے۔ اب حکومت پاکستان کے سامنے سوال یہ تھا کہ آیا اسے طالبان کی حمایت کر کے امریکہ اور پوری دنیا خاص طور پر مغربی ممالک کی مخالفت مول لینی چاہیے یا طالبان کی حمایت ترک کر کے دہشت گردی کے خلاف عالمی محاذ کا حصہ بننا چاہیے۔ پاکستان نے مؤخر الذکر آپشن کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ مسلح افواج کے متعدد اہم ذمہ داروں کی رائے تھی کہ پاکستان کو طالبان کی امداد کرنی چاہیے اور جو بھی نتائج ہوں ان کا سامنا کیا جائے۔ لیکن صدر پرویز مشرف نے امریکی قیادت میں بین الاقوامی برادری کا دہشت گردی کے خلاف ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

حکومت پاکستان نے یہ فیصلہ ملک اور قوم کے بہترین مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے کیا۔ حکومت کا مؤقف تھا کہ وہ اس نازک ترین صورتحال میں امریکہ اور عالمی برادری کے خلاف پالیسی اختیار کرنا پاکستان کے قطعاً حق میں نہیں ہے۔ دوسری صورت میں پاکستان کو ایٹمی تنصیبات کی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کیونکہ اسامہ بن لادن کی تلاش کی آڑ میں اسرائیل اور امریکہ ہماری اہم اور حساس نیوکلیائی تنصیبات پر حملہ آور ہونے کی سازش کر سکتے تھے۔ یہ خطرہ حکومت مول لینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ پرویز مشرف کا مؤقف تھا کہ دہشت گردی میں عالمی برادری کا ساتھ دینے سے عالمی سطح پر پاکستان کا وقار بلند ہوگا اور اقتصادی ترقی کی نئی راہیں کھل جائیں گی۔ صدر مشرف نے مزید واضح کیا کہ امریکہ نے پاکستان سے تین سطحوں پر تعاون کی درخواست کی ہے۔

(ا) خفیہ دستاویزات تک رسائی جو طالبان اور اسامہ بن لادن سے متعلق تھیں۔ (Intelligence Sharing)

(ب) پاکستانی فضائی حدود اور سہولیات کا استعمال (Use of Air space and Facilities)

(ج) لاجسٹک سپورٹ (Logistic Support)

امریکہ نے تیزی سے اپنے ردعمل کا مظاہرہ کیا اور پاکستان پر لاگو تمام پابندیاں ہٹا لیں جن میں ایٹمی توانائی سے متعلق پابندیاں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ پریسلر، گلین اور سمینگٹن ترامیم کے تحت لگائی گئی پابندیاں بھی ہٹا لیں گئیں۔ پاکستان میں امریکی سفیر نے پاکستان کی معیشت کو مضبوط بنانے کے لیے مزید امداد کا یقین دلایا۔

صدر مشرف نے امریکہ کو اس کی طالبان کے خلاف فوجی کارروائی میں زیادہ سے زیادہ تعاون پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اور میری حکومت کو یہ یقین ہے کہ اسامہ بن لادن اور 11 ستمبر کے دہشت گرد حملے میں گہرا تعلق ہے۔ یہ پاکستان کی پہلی پالیسی سے ہٹ کر صورت حال تھی جبکہ پاکستان نے اس سے پہلے اسامہ بن لادن اور دہشت گرد حملے میں کسی قسم کے تعلق کو مسترد کر دیا تھا۔ یہ اس لحاظ سے بھی بہت اہم بیان تھا کیونکہ پاکستان نے افغانستان کی مطلق العنان طالبان حکومت کو ہٹانے کے لیے امریکہ سے تعاون کا وعدہ کر لیا تھا۔ صدر مشرف نے یہ اعلان کیا کہ طالبان حکومت کے دن گنے جا چکے ہیں۔ پاکستان نے طالبان حکومت کو شروع میں ہر قسم کی امداد دی تھی۔ پاکستان سعودی عرب اور عرب امارات کے بعد تیسرا ملک تھا جس نے طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ اس نے طالبان کو شمالی اتحاد کے خلاف جنگ میں بھی بھرپور مدد مہیا کی۔

11 ستمبر کے حملے کے بعد امریکہ نے پاکستان پر شدید دباؤ ڈالا۔ صدر بش نے صاف الفاظ میں صدر مشرف کو کہا کہ آپ یا ہمارے دوست ہیں یا دشمن۔ امریکہ کی طرف سے اس قسم کے اشارے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ اگر پاکستان نے امریکہ سے تعاون نہ کیا تو وہ بھارتی سرزمین کو طالبان کے خلاف استعمال کرے گا جس کا پاکستان کو بہت نقصان ہو سکتا تھا۔ اس پس منظر میں امریکہ کو دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنے سے روکنا انتہائی مہلک ہو سکتا تھا۔ بھارت نے افغانستان پر حملے کے لیے امریکہ کو ہر قسم کے تعاون کی پیش کش کر دی تھی جسے امریکہ نے مسترد کر دیا تھا۔ امریکہ کی طرف سے بھارتی تعاون کی پیش کش مسترد کئے جانے پر بھارتی رہنما امریکہ سے ناراض تھے۔ امریکہ کی طرف سے تعاون مسترد کئے جانے پر بھارت کی جو سبکی ہوئی اس کی ذمہ داری بھارت نے پاکستان

پر ڈال دی۔ اس کے علاوہ پاکستان کا صف اول کا ملک بن جانا اور امریکہ سے قریبی تعلقات بھارت کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔

لہٰذا مشرف کا امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ اس فیصلے کی وجہ سے پاکستان کے مفادات اور ایٹمی تنصیبات کو بچانے میں مدد ملی۔ مشرف کو بھارت کے جارحانہ رویے کو بھی کم کرنے میں بہت مدد ملی۔

پاکستان کی مذہبی جماعتوں نے طالبان کے خلاف امریکہ کی مدد پر حکومت پاکستان پر شدید تنقید کی۔ حکومت کے فیصلے کے خلاف ملک بھر میں سخت احتجاجی مظاہرے کئے۔ صدر مشرف اسلامی گروہوں کی مخالفت اور احتجاج کے باوجود اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔ آنے والے وقت نے یہ ثابت کیا کہ ان کا کیا ہوا فیصلہ ملکی مفاد میں تھا۔

صدر مشرف نے اپنی حیثیت کو مزید مضبوط کرنے کے لیے انتظامی فیصلے کرتے ہوئے فوج کے تین سینئر جرنیل جو مذہبی رجحان رکھتے تھے' کو تبدیل کر دیا اور ان کی جگہ اپنے وفادار آفیسرز کو تعینات کر دیا۔ اس فیصلے کی وجہ سے صدر مشرف کی حالات پر گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

گیارہ ستمبر کے واقعہ دہشت گردی کے پاکستانی معیشت پر اثرات

نائن الیون کے واقعہ کے بعد پوری دنیا کی معیشت پر گہری اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ پاکستان بھی ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ حکومت پاکستان کی بروقت اور دور اندیش حکمت عملی کی وجہ سے پاکستانی معیشت پر اچھے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ واقعہ کے شروع میں کافی نقصانات بھی برداشت کرنا پڑے مثلاً بجٹ کا خسارہ جو کہ قومی آمدنی کے 4.9 فیصد تک لگایا گیا تھا، بڑھ کر 7 فیصد تک پہنچ گیا۔

پاکستان کو 600 ملین ڈالر گرانٹ کی شکل میں ملے جن میں سے 300 ملین ڈالر امریکی فوجیوں کی دیکھ بھال کے عوض ملے اور 143 ملین ڈالر برآمدات کی شکل میں تھے۔ تقریباً 12 ارب ڈالر قرضوں کی چھوٹ (Debt Relief) دی گئی جس نے سالانہ بجٹ 03-2002ء پر مثبت اثرات مرتب کیے۔ لیکن امریکہ نے پاکستانی برآمدات کے لیے محصولات (Tariff) میں کمی نہ کی۔ یورپین یونین (E.U) نے پاکستانی برآمدات کا کوٹہ بڑھا کر 1.5 ملین ڈالر کر دیا جس سے پاکستانی معیشت کو قدرے سہارا ملا۔

ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے پاکستان پر جو فوجی اور اقتصادی پابندیاں عائد کی گئی تھیں، بحال کی گئیں۔ ایشین ڈویلپمنٹ بینک نے بھی اپنی سابقہ 950 ملین ڈالر کی امداد میں اضافہ کر دیا۔ ابوظہبی ڈویلپمنٹ فنڈ نے بھی 265 ملین ڈالر پر مشتمل رعایتی قرضہ جاری کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ جب جنرل پرویز مشرف نے 2001ء میں امریکہ کا دورہ کیا تو صدر بش نے ایک ارب ڈالر کا قرضہ معاف کرنے کا اعلان کیا۔ ناروے نے اپنے سالانہ امدادی پروگرام (Annual Assistance Programme) میں 33 ملین ڈالر کا اضافہ کر دیا۔ جاپان نے 300 ملین ڈالر کی امداد گرانٹ کی شکل میں دینے کا اعلان کیا۔ پاکستان کے تقریباً ساڑھے بارہ ارب ڈالر کے قرضوں کو اگلے 38 سال کے لیے ری شیڈول کر دیا گیا۔ معیشت میں 3.6 فیصد کے حساب سے اضافہ ہوا جبکہ سابقہ ہدف 3.3 فیصد تھا۔ تقابلی لحاظ سے پاکستان نے ملائشیا اور تھائی لینڈ سے بہتر ترقی کا گراف نمایاں کیا۔ ان ممالک نے بالترتیب 3 فیصد اور 2.7 فیصد کے حساب سے ترقی کی KSE کا گراف حملوں کے بعد تیزی سے گر گیا۔ مگر بعد میں 59 فیصد اضافہ ہوا جو دنیا کی سٹاک ایکسچینج مارکیٹوں کے لحاظ سے بہترین ریکارڈ تھا۔

قومی استصواب رائے اپریل 2002ء

صدر مشرف نے جب سے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے متعدد اصلاحات نافذ کیں جن کا مقصد بدعنوان سیاست دانوں کی پیدا کردہ برائیوں سے ملک کو پاک کرنا تھا۔ اپنے تیس ماہ کے اقتدار کے دوران صدر مشرف نے نیک نیتی سے ملک کی انتظامیہ کو پٹڑی پر چڑھانے کی کوشش کی۔ وہ کسی حد تک اپنے سات نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کروانے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے ''تقسیم اختیارات کا منصوبہ 2000ء'' متعارف کروایا جس کا مقصد عوام کو اختیارات کی تقسیم میں شریک کر کے مقامی حکومتوں کے ڈھانچے کی تطہیر تھا۔ ان کی حکومت نے بدعنوان سیاست دانوں اور سرکاری افسران کو پکڑ کر ان سے لوٹے ہوئے کڑوروں روپے واپس نکلوائے۔ صدر مشرف کی حکومت کے اقدامات سے کسی حد تک بگڑتی ہوئی معاشی صورتحال کو سنبھالا دینے میں مدد ملی۔

بہرحال یہ ممکن نہ تھا کہ تیس ماہ کی مختصر مدت میں مکمل طور پر سات نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کر لیا جاتا۔ ملک کو دوبارہ سے پٹڑی پر ڈالنے کے لیے اور مثبت نتائج مرتب کرنے کے لیے مسلسل بہتر حکمرانی کی ضرورت تھی۔

ان حالات نے صدر مشرف کو ایک مشکل صورت حال سے دوچار کر دیا تھا۔ انہیں اپنے سپاہیانہ زندگی سے سیاسی زندگی کی طرف جانے میں مشکل سے مشکل فیصلے کا سامنا تھا۔ ان کے صلاح کاروں نے یہ مشورہ دیا کہ اقتدار میں رہنے کے لیے انہیں عوام کے پاس جانا چاہیے۔ صدر مشرف خود بھی اپنے پروگرام پر عمل درآمد کی خاطر اقتدار میں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن اپنے اقتدار کو کس طرح طول دیا جا سکتا تھا' اس بات نے ایک مشکل اور معماتی صورت حال پیدا کر دی تھی جسے حل کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔

لہٰذا پرویز مشرف نے مزید پانچ سال حکومت میں رہنے کے لیے عوام کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے عوام سے اپنی اصلاحات کے حوالے سے یہ پوچھنے کے لیے کہ آیا وہ انہیں مزید پانچ سال حکومت جاری رکھنے کی اجازت دیتے ہیں' استصواب رائے کروانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے 6 اپریل 2002ء کو مینار پاکستان پر ایک بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اپنی ریفرنڈم مہم کا آغاز کیا۔ صدر مشرف نے دوسرے شہروں کے طوفانی دورے کیے اور عوام سے خطاب کیا۔ انہوں نے عوام کے سامنے تیس ماہ کے دوران کیے ہوئے کام کو رکھا اور انہیں کہا کہ وہ انہیں مزید پانچ سال حکومت کرنے کے لیے ووٹ دیں تاکہ وہ اصلاحات کا اپنا منصوبہ مکمل کر سکیں۔ استصواب رائے 30 اپریل 2002ء کو کروایا گیا جس کے لیے پورے ملک میں پولنگ سٹیشن قائم کیے گئے۔

ووٹروں کے پولنگ سٹیشنوں پر حاضری کے بارے حکومتی اداروں کی طرف سے متضاد اطلاعات دی گئیں۔ حقیقت میں حاضری بہت کم تھی۔ ووٹرز کی بڑی تعداد نے حق رائے دہی استعمال نہ کیا۔ ضلعی ناظمین نے ووٹرز کو گھروں سے نکالنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے جو کامیاب نہ ہو سکے۔

استصواب رائے کے بارے ملے جلے تاثرات سامنے آئے۔ اکثر سیاسی جماعتوں نے صدر کے انتخاب کے لیے استصواب رائے کروانے کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب آئین میں صدر کے انتخاب کا طریقہ موجود ہے تو پھر استصواب رائے کروانے کی ضرورت نہ تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال کہ جنہوں نے مشرف کو انتخابات کے بعد کے عرصے کے لیے خود کو استصواب رائے کے ذریعے صدر منتخب کروانے کا مشورہ دیا' وہ صدر مشرف کے خیرخواہ نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے دراصل مشرف کو غیر یقینی مستقبل کی طرف دھکیل دیا تھا۔

صدر مشرف دراصل ضیاء الحق والے راستے پر چل رہے تھے۔ 1984ء میں استصواب رائے کروانے کا ضیاء الحق کا مقصد بھی وہی تھا جو مشرف کا تھا۔ یعنی سات سال تک حکومت کرنے کے بعد ضیاء الحق مزید پانچ سال تک اقتدار میں رہنا چاہتے تھے اور یہی

مقصد مشرف کا بھی تھا جو تیس ماہ تک حکومت میں رہنے کے باوجود اقتدار سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتے تھے۔

تمام فوجی قیادت نے مشرف کے استصواب رائے کروانے کے عمل کی بھرپور حمایت و تائید کی۔ فوجی قیادت چاہتی تھی کہ صدر مشرف استصواب رائے کے ذریعے حاصل ہونے والے اختیار کو ملکی سیاست میں فوج کے لیے دائمی کردار حاصل کرنے میں استعمال کریں۔ ان سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ قومی سیکورٹی کونسل کے لیے ملکی معاملات میں حتمی اختیار حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ پر اثر انداز ہوں گے۔ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ استصواب رائے کے عمل کے پیچھے فوج کا قومی سیکورٹی کونسل کے بارے میں نظریہ ہی اصلی محرک تھا۔

چند بااثر سیاسی جماعتوں یعنی پی پی پی، جماعت اسلامی، مسلم لیگ (ن)، عوامی نیشنل پارٹی اور مہاجر قومی موومنٹ کی مخالفت کے باوجود استصواب رائے کروایا گیا۔ صدر مشرف نے ووٹروں کی کم حاضری کے باوجود مثبت ووٹ حاصل کیے۔ انہیں مزید پانچ سال حکومت کرنے کا اختیار مل گیا۔ کچھ سیاسی جماعتوں یعنی مسلم لیگ (قائداعظم)، عمران خان کی تحریک انصاف، طاہر القادری کی عوامی تحریک اور کچھ دوسرے سیاسی طبقوں نے صدر مشرف کی استصواب رائے میں حمایت کی۔

حالانکہ صدر مشرف برملا یہ کہتے آئے ہیں کہ وہ جنرل ضیاء الحق نہیں ہیں لیکن پھر بھی استصواب رائے کروا کے انہوں نے ضیاء الحق کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ 1984ء کے استصواب رائے میں ضیاء الحق نے بہ حیثیت صدر اور آرمی چیف اپنی مدت کو طول دینے کے لیے اسلام کا نام استعمال کیا۔ جنرل مشرف کے استصواب رائے کا بھی وہی مقصد ہے گو کہ الفاظ اور زبان مختلف ہے۔ مشرف نے اصلاحات اور جدت پسندی کا نعرہ لگایا لیکن محرکات بالکل ضیاء الحق جیسے ہی تھے۔ جنرل ضیاء الحق فیصلہ سازی میں فوج کے لیے آئینی کردار کے خواہش مند تھے اور پرویز مشرف کا بھی یہ ہی مقصد تھا۔

آئینی ترامیم

پرویز مشرف نے 12 اکتوبر 1999ء کو اقتدار سنبھالا تو انہوں نے بہتر حکمرانی ''Good Governance'' کا ایک منصوبہ تشکیل دیا۔ ان کا خیال تھا کہ بری حکمرانی ملک کے لیے ایک بیماری تھی جسے ختم کرنا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں پہلا قدم ''تقسیم اختیارات 2000'' کا منصوبہ تھا جس کا مقصد جمہوریت کو عوام کے دروازے تک پہنچانا تھا۔ فوجی حکومت نے بددیانت سیاست دانوں اور بدعنوان سرکاری افسران کو پکڑ کر ان سے لوٹے گئے کروڑوں روپے واپس اگلوائے۔

بہتر حکمرانی کے سلسلے میں دوسرا قدم آئین میں اس طرح ترامیم کرنا تھا جس سے بہتر حکمرانی کا راستہ بنایا جا سکے اور بدعنوان اور بددیانت سیاست دانوں کو دوبارہ اقتدار میں آنے سے روکا جا سکے۔ اس سلسلے میں ایک آرڈی ننس جاری کیا گیا جس کی رو سے اسمبلی کی رکنیت کے لیے بی۔اے تعلیمی اہلیت مقرر کی گئی۔

سات نکاتی پروگرام مکمل کرنے کے لیے حکومت نے 26 جون 2002ء کو آئینی ترامیم کا مسودہ جاری کیا۔ آئین میں ترامیم کے لیے حکومت نے پہلا ترمیمی مسودہ جاری کیا جس کا مقصد آرٹیکل 58(2b) کو دوبارہ زندہ کرنا اور صدر کو قومی اسمبلی، وزیراعظم اور کابینہ کو برطرف کرنے کے اختیارات دینا تھا۔

قومی تعمیر نو بیورو نے آئین کی 28 شقوں میں ترامیم تجویز کیں۔ پہلا آئینی ترمیم کا مسودہ جو کہ محفوظ وفاقی جمہوریت کو قائم کرنے کے بارے میں تھا، عوام کی رائے جاننے کے لیے جاری کیا گیا۔ ان آئینی ترامیم کی رو سے آرٹیکل 58(2b) کو بحال کر کے صدر کو زیادہ اختیارات دے دیئے گئے۔ وزیراعظم، وزیراعلیٰ، سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کی مدت 5 سال سے کم کر کے

4 سال کر دی گئی جبکہ صدر کی معیاد عہدہ 5 سال برقرار رکھی گئی۔

آئین کی شق 58 (قومی اسمبلی کی تحلیل) میں ایک اہم ترمیم تجویز کی گئی ہے۔ آئین کی موجودہ شق کی رو کے مطابق وزیراعظم صدر کی صوابدید کے مطابق اپنے عہدہ پر قائم رہے گا اور صدر اس وقت تک اس شق کے تحت اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال نہ کرے گا جب تک کہ صدر کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ وزیراعظم قومی اسمبلی کے اکثریتی اراکین کا اعتماد کھو چکا ہے۔ ایسی صورت حال میں صدر اسمبلی کا اجلاس بلائے گا اور وزیراعظم کو اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کا کہے گا۔

لیکن تجویز کردہ نئی شق کے مطابق اگر صدر کی رائے میں کابینہ بشمول وزیراعظم بطور سربراہ کے اختیارات کے شدید طور پر غلط استعمال یا بدعنوانی کو روکنے، آئین کی خلاف ورزی اور قومی تحفظ کے بارے سمجھوتہ کی مرتکب ہوتی ہے تو صدر اپنی صوابدید کے مطابق وزیراعظم اور کابینہ کو برطرف کر سکے گا اور اسمبلی کے کسی دوسرے رکن کو وزیراعظم اور دوسری کابینہ مقرر کر سکے گا۔ برطرف کردہ وزیراعظم اسمبلی کی بقیہ مدت کے لیے وزیراعظم مقرر نہ کیا جائے گا اور وہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر صدر کو استعفیٰ پیش کرے گا۔ شق 58 کی موجودہ شکل میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی جس کی رو سے اسمبلی کی تحلیل کے بارے وزیراعظم کی طرف سے اطلاع ملنے کے 48 گھنٹے بعد تک اگر صدر اسمبلی تحلیل نہیں کرتا تو اسمبلی از خود تحلیل تصور کی جائے گی۔

شق 58 میں ایک نئی شق شامل کی گئی ہے کہ صدر اگر یہ سمجھے کہ ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے جس کے تحت وفاقی حکومت آئین کے مطابق اپنے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی اور عوام کو اعتماد میں لینا ضروری ہوگیا ہے تو وہ اپنی صوابدید کے مطابق قومی اسمبلی کو برطرف کر سکے گا اور اسمبلی کے نئے انتخابات کروا سکے گا۔ اگر صدر اسمبلی کو برطرف کر دیتا ہے تو وہ اپنی صوابدید کے مطابق اسمبلی کی درمیانی مدت کے لیے نگران وزیراعظم اور کابینہ مقرر کر سکے گا اور ایسا وزیراعظم آنے والے عام انتخابات میں حصہ نہ لے سکے گا۔

اس تجویز کے تحت عیسائیوں، نچلی ذات کے ہندؤ، سکھ، بدھ مذہب کے پیروکار، پارسیوں اور دوسرے غیر مسلموں کے لیے اسمبلی میں مختص نشستیں ختم کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ قادیانیوں کے لاہوری گروپ اور احمدی فرقے کے لیے مختص نشستیں ختم کر دی گئی ہیں۔ سینٹ اور قومی وصوبائی اسمبلیوں میں نشستوں کی تعداد بڑھا دی گئی۔ قومی وصوبائی وسینٹ کی نشستوں کی تقسیم درج ذیل ہے:

قومی اسمبلی

نمبر شمار	نام صوبہ	نشستیں		کل تعداد
		جنرل	خواتین	
-1	پنجاب	148	35	183
-2	سندھ	61	14	75
-3	سرحد	35	8	43
-4	بلوچستان	14	3	17
-5	فاٹا	12	-	12
-6	مرکزی دارالحکومت	2	-	2
-7	اقلیتیں	-	-	10
	کل تعداد	272	60	342

سینٹ

نام صوبہ	جنرل نشستیں	مخصوص نشستیں		کل تعداد
		خواتین	علماء اور ٹیکنوکریٹس	
مرکزی دارالحکومت	2	1	1	4
پنجاب	14	4	4	22
سندھ	14	4	4	22
سرحد	14	4	4	22
فاٹا	8	-	-	8
بلوچستان	14	4	4	22
کل تعداد	66	17	17	100

صوبائی اسمبلیاں

نام صوبہ	نشستیں			کل تعداد
	جنرل	خواتین	اقلیتیں	
پنجاب	297	33	08	371
سندھ	130	29	9	168
سرحد	99	22	3	124
بلوچستان	51	11	3	65

ان آئینی ترامیم میں اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے لیے امیدوار کی اہلیت کی شرائط بھی بیان کی گئی ہیں۔ تاہم ایسا شخص جس نے کسی بنک یا مالیاتی ادارے سے اپنے نام یا بیوی / شوہر کے نام یا زیر کفالت کسی شخص کے نام بیس لاکھ یا اس سے زیادہ قرضہ حاصل کیا ہے اور وہ قرضہ واجب الادا تاریخ کے ایک سال بعد تک ادا نہیں کیا جاتا یا وہ قرضہ معاف کروا لیا جاتا ہے تو وہ خود یا اس کی بیوی / شوہر یا زیر کفالت فرد انتخاب میں حصہ نہ لے سکے گا۔ اگر کوئی شخص بجلی، گیس، ٹیلی فون اور پانی کے بل اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرتے وقت چھ ماہ سے زائد عرصہ کا نادہندہ ہے تو ایسا شخص بھی انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے گا۔

قومی تعمیر نو بیورو نے آئین کی شق 17 میں ایک ترمیم تجویز کی ہے جو حق جماعت سازی سے تعلق رکھتی ہے۔ موجودہ تجویز کے مطابق ہر ایک سیاسی جماعت کو قانون کے مطابق اپنے مالی اور دوسرے وسائل کا حساب دینا ہوتا ہے۔ بہر حال ایک نئی ترمیم آئین میں شامل کی گئی ہے جس کی رو سے کسی بھی سیاسی جماعت کو فرقہ وارانہ، لسانی، علاقائی اور صوبائی نفرت یا دشمنی کو فروغ کی اجازت نہ ہوگی اور نہ ہی کوئی سیاسی جماعت تشدد پسند تنظیم کے طور پر قائم کی جا سکے گی۔ اس کے علاوہ ہر سیاسی جماعت کو اپنے اندر جمہوری روایات کو فروغ دینا ہوگا اور پارٹی راہنماؤں اور عہدے داروں کے چناؤ کے لیے انتخابات کروانے ہوں گے۔

شق 47 میں ایک تجویز شامل کی گئی ہے جس کی رو سے صدر کی برطرفی کے لیے ہر رکن سینٹ کے ایک ووٹ کو دو کے برابر سمجھا جائے گا تاکہ ایوان بالا کو صدر کی برطرفی کے لیے زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جا سکیں۔ سینٹ کی نشستیں 87 سے بڑھا کر

100 کر دی گئی ہیں۔

نئی ترامیم کے مطابق ہر صوبے کے لیے مختص سینٹ کی نشستوں کو پر کرنے کے لیے انتخابات متناسب طریقہ نمائندگی کی رو سے واحد قابل انتقال ووٹ کے ذریعے کروائے جائیں گے۔

نیشنل سیکورٹی کونسل کے حوالے سے موجودہ آئین میں کوئی تجویز نہیں ہے۔ نئی ترمیم کے مطابق ایک نیشنل سیکورٹی کونسل ہوگی جو اقتدار اعلیٰ کے حوالے سے جنگی حکمت عملی، ریاست کے تحفظ اور اخلاقی بلندی، حکومتی ڈھانچے، وفاقی جمہوریت اور حکمرانی کے اصول، وفاقی اور صوبائی کابینہ کی برطرفی، قومی اسمبلی کی تحلیل اور ہنگامی حالت کے اطلاق پر مشاورتی ادارے کی حیثیت میں کام کرے گی۔ صدر نیشنل سیکورٹی کونسل کا چیئرمین ہوگا اور اس کے اراکین میں وزیراعظم تینوں مسلح افواج کے سربراہان اور چاروں صوبوں کے وزراء اعلیٰ شامل ہوں گے۔

سترہویں آئینی ترمیم

پس منظر

لیگل فریم ورک آرڈر مجریہ 21 اگست 2002ء کے مطابق آئین کی بہت سی شقوں میں اس طرح ردوبدل کیا گیا جو حزب اختلاف کے نقطہ نظر سے آئین کے منافی تھا۔ چنانچہ یہ مسلسل ہدف تنقید بنا رہا۔ تاہم مذہبی جماعتوں پر مشتمل متحدہ مجلس عمل (MMA) نے مفاہمانہ طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومت سے مذاکرات کا عمل جاری رکھا۔ ایم ایم اے کا مؤقف تھا کہ ہر قسم کی آئینی ترمیم کا اختیار صرف پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ بالآخر طویل مذاکرات کے بعد حکومت اور ایم ایم اے میں مفاہمت ہوگئی اور حکومت ایل ایف او کی بعض شقوں میں ردوبدل کرنے پر رضامند ہوگئی۔ تاہم پورے ایل ایف او کو حکومت پارلیمنٹ میں پیش کرنے پر رضامند نہ تھی۔

وسیع تر قومی مفاد اور سیاسی نظام کو درپیش معروضی حالات اور خطرات کے پیش نظر دونوں فریقین نے لچکدار رویہ کا مظاہرہ کیا۔ مفاہمت کے باعث 30 دسمبر 2003ء کو پارلیمنٹ میں سترہویں آئینی ترمیم منظور ہوگئی۔

17 ویں ترمیم کے تحت LFO کی بعض شقوں میں تو ردوبدل کیا گیا لیکن متعدد شقیں بغیر پارلیمنٹ کی منظوری آئین کا حصہ شمار کرلی گئیں۔ ایم ایم اے اور حکومت کے مابین معاہدہ کی رو سے یہ طے پا گیا تھا کہ 12 اکتوبر کے بعد جاری کیے گئے تمام احکامات، ضوابط اور اقدامات کو دستوری تحفظ حاصل ہونا تھا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ LFO کی بعض شقوں میں سترہویں ترمیم سے قبل ہی عملدرآمد ہو چکا تھا بلکہ عام انتخابات بھی منعقد ہو چکے تھے۔ LFO کے تحت الیکشن کمیشن میں ردوبدل ہو چکا تھا۔ ارکان اسمبلی کی شرائط رکنیت میں بھی اضافہ ہو چکا تھا نیز نااہلی سے متعلقہ شقوں میں اضافہ کرکے ان پر عملدرآمد بھی ہو چکا تھا۔

LFO کی بعض ایسی شقیں جو سترہویں ترمیم کے تحت متاثر نہ ہوئیں ان میں سے بعض کا تعلق سیاسی جماعتوں کے طرز عمل، بعض کا سروکار قانون سازی اور مالیاتی قانون سازی کے طریق کار اور بعض ججوں کی نااہلی کی صورت میں کارروائی سے متعلق تھیں۔ ایک شق کا تعلق نگران حکومت کے قیام سے تھا اس قسم کی تبدیلیاں بالعموم غیر متنازعہ تھیں۔ اس لیے وہ بدستور روبعمل رہیں تاہم جداگانہ طریق انتخاب کی جگہ مخلوط انتخاب کا رائج رہنا نظریہ پاکستان کے منافی خیال کیا جاتا ہے اور قابل اعتراض ہے۔

مختصراً سترہویں ترمیم کے ذریعے پرویز مشرف کی طرف سے جاری کردہ LFO کو بعض تبدیلیوں کے بعد پارلیمنٹ کی طرف سے قبول کرلیا گیا اور یہ اسی طرح ہوا جس طرح آٹھویں ترمیم کے تحت جنرل ضیاء الحق کے اقدامات اور Restoration of

Constitution order (RCO) مجریہ 1985ء وغیرہ کو پارلیمنٹ نے قبول کرلیا تھا۔

سترہویں ترمیم کی اہم خصوصیات

Major Characteristics of 17th Amendment

1- ایل ایف او کے تحت صدر پرویز مشرف آئندہ پانچ سال کے لیے بیک وقت صدارت اور آرمی چیف کا عہدہ اپنے پاس رکھ سکتے تھے لیکن 17 ویں ترمیم کے تحت 31 دسمبر 2004ء کو آئین کی ابتدائی دفعہ 63 پر عملدرآمد ہو سکے گا یعنی انہیں آرمی چیف کا عہدہ چھوڑنا ہوگا۔

2- سترہویں ترمیم کے تحت قومی اسمبلی توڑنے کے صدر کے صوابدیدی اختیار کو اس طرح مشروط کردیا گیا ہے کہ ایسا اقدام کرنے کے بعد صدر پر لازم ہے کہ وہ پندرہ یوم کے اندر یہ مسئلہ عدالت عظمیٰ میں لے جائے جو پندرہ دنوں کے اندر اندر مذکورہ اقدام کی آئینی حیثیت واضح کرے گی۔ اسی طرح صوبائی اسمبلیوں کی تحلیل کی صورت میں گورنر کے اختیار کو بھی اس طرح پابند کیا گیا ہے۔

3- ایل ایف او کے تحت نیشنل سیکورٹی کونسل (NSC) قائم کی گئی تھی لیکن سترہویں ترمیم کے تحت اس ادارہ کو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کے تحت قائم کیا جائے گا یعنی یہ کونسل ادارہ نہ ہوگا۔

4- اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر میں LFO کے تحت تین سال کی توسیع کی گئی تھی جسے سترہویں ترمیم کے تحت ختم کرکے آئین کی ابتدائی شقوں 62 اور 65 کے تحت کردیا گیا یعنی سپریم کورٹ کے جج حسب سابق 65 اور ہائی کورٹ کے جج 62 سال کی عمر میں ریٹائر ہوجائیں گے۔

5- LFO کے تحت چیئرمین جائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی اور تینوں مسلح افواج کے سربراہان کے تقرر کے ضمن میں وزیراعظم کا عمل دخل نہ تھا۔ سترہویں آئینی ترمیم کے تحت اس معاملہ میں اگرچہ حتمی اختیار تو صدر کا ہے لیکن اسے وزیراعظم سے صلاح مشورہ کرنے کا پابند کیا گیا ہے۔

6- آئین کی دفعہ 268 شق دو کے مطابق چھٹے شیڈول سے متعلقہ قوانین میں ترمیم و تنسیخ پر مبنی بل پیش کرنے کے لیے پیشگی صدارتی منظوری لازم تھی۔ جبکہ سترہویں ترمیم کے تحت مقامی حکومتوں کا حکم اور پولیس آرڈر مجریہ 2002ء چھ سال کے بعد اس شیڈول سے نکال دیا جائے گا یعنی اس مقصد کے لیے صدر کی طرف سے پیشگی منظوری ضروری ہوگی۔

7- حکومت اور ایم ایم اے کے مابین معاہدہ کے تحت سترہویں ترمیم کی منظوری کے بعد صدر کو 30 دنوں کے اندر پارلیمنٹ اور چاروں صوبائی اسمبلیوں سے اعتماد کا ووٹ لینے کا پابند کیا گیا تھا۔ صدر نے یکم جنوری 2004ء کو مطلوبہ اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا اور کل 1181 میں سے 658 ووٹ حاصل کیے۔

آئینی ترامیم کا تنقیدی جائزہ

قومی تعمیرِ نو بیورو کی جاری کردہ آئینی ترامیم پر شدید تنقید کی گئی۔ تمام سرکردہ سیاست دانوں نے ترامیم کو مسترد کردیا۔ نوابزادہ نصراللہ خان نے آئین میں ترامیم کرنے پر حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ آپ نے کہا کہ آئین میں ترمیم کرنا منتخب حکومت کا حق ہوتا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں وکلاء نے بھی ان ترامیم کی بنا پر حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔

تحریکِ انصاف کے چیئرمین عمران خان جو کبھی صدر مشرف کے زبردست حامی تھے انہوں نے بھی مجوزہ ترامیم کو جمہوریت کے خلاف اور آمریت کے حق میں قرار دیا۔ تحریکِ انصاف نے کہا کہ یہ ترامیم منتخب اداروں کو غیر منتخب افراد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گی۔

ممتاز قانونی ماہر اور سیاست دان اعتزاز احسن کے مطابق تجویز کردہ آئینی ترامیم کا مسودہ مکمل طور پر غیر آئینی تھا اور سپریم کورٹ کے ظفر علی شاہ کیس میں دیے گئے فیصلے کے خلاف تھا۔ سپریم کورٹ نے فوجی حکومت کو وفاقی ڈھانچہ تبدیل کرنے یا پارلیمنٹ کی برتری کو ختم کرنے کا اختیار نہیں دیا۔ صدر اور اُن کی حکومت کو وزیر اعظم اور اُس کی کابینہ کو برطرف یا آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ اعتزاز احسن نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ صوبائی گورنر مقرر کرنے کا صدارتی اختیار صوبائی معاملات میں فردِ واحد کی مداخلت کے مترادف ہوگا جو صوبائی خودمختاری اور وفاقی ڈھانچے کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔ اسی طرح قومی سلامتی کونسل کا قیام اور وزیر اعظم اور اُس کی کابینہ کو برطرف کرنے کا صدارتی اختیار پارلیمنٹ کی برتر حیثیت کو دبانے کا موجب بنے گا۔

مجوزہ آئینی تجاویز دراصل صدر کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھیں۔ تجویز کنندہ صدر کو تمام اختیارات تفویض کرنا چاہتے تھے تاکہ فوجی حکومت کو دوام بخشا جا سکے۔ ان آئینی ترامیم کا مقصد ملک کی اکتوبر 2002 کے بعد کی سیاسی صورتِ حال میں صدر کو سب سے زیادہ طاقت ور سیاسی قوت بنانا تھا۔ اگر یہ ترامیم منظور ہو جاتیں تو وزیراعظم کے آئینی و انتظامی اختیارات ختم ہو جاتے۔ ان آئینی ترامیم میں وزیر اعظم کے لیے کچھ نہیں تھا بلکہ Checks and Balance کے نام پر بہانے اُسے اس کے تمام اختیارات سے محروم کرتا تھا۔ ان آئینی ترامیم میں صدر کے لیے زیادہ سے زیادہ اختیارات تجویز کیے گئے تھے۔ صرف ایک چیز جو وزیر اعظم کے حق میں تھی کہ وزیر اعظم کے خلاف اگر پہلی تحریک عدم اعتماد ناکام ہو جاتی ہے تو دوسری تحریک کم از کم چھ ماہ تک نہیں لائی جا سکے گی۔ ترامیم میں صدر کے لیے بے حد صوابدیدی اختیارات تجویز کیے گئے تھے لیکن اس پر کسی قسم کی کوئی بندش نہیں تھی۔ اگر صدر وزیر اعظم کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیتا ہے تو وزیراعظم اسمبلی کی باقی مدت کے لیے دوبارہ منتخب نہیں ہو سکتا چاہے وہ قومی اسمبلی کے اراکین کے اعتماد پر پورا اترتا ہو۔ فوجی حکومت کے مصلح جنہوں نے پارلیمانی جمہوریت کو تقویت دینے کے نام پر ان ترامیم کو تیار کیا تھا وہ صدر کو قومی اسمبلی سے کسی بھی دوسرے رُکن کو وزیراعظم مقرر کرنے کا اختیار دینے کے حق میں تھے۔

58(2)B کے تحت دیے گئے بدنامِ زمانہ صدارتی صوابدیدی اختیارات جنہیں سابقہ پارلیمنٹ نے حذف کر دیا تھا اُنہیں دوبارہ آئین میں شامل کر لیا گیا۔ ان اختیارات کے تحت اگر صدر یہ سمجھتا ہے کہ حکومت اور وفاق کسی بھی بنا پر آئین کے مطابق نہیں چل سکتے اور عوام سے رائے لینا ناگزیر ہو گیا ہے تو وہ (صدر) اسمبلی کو برطرف کر کے نئے انتخابات کروا سکتا ہے۔ مستقبل کا وزیراعظم جو صدر کے مقابلے میں بالکل نہتا ہوگا اگر صدر کو اسمبلی برخاست کرنے کی تجویز دیتا ہے تو وہ اپنے عہدے پر قائم نہ رہ سکے گا۔ صدر فوری طور پر وزیراعظم کی طرف سے اسمبلی برخاست کرنے کی درخواست موصول ہوتے ہی وزیراعظم کو اُس کے عہدے سے ہٹا دے گا۔ صدر وزیراعظم کی اسمبلی کو برطرف کرنے کی درخواست منظور کرنے کے لیے اسمبلی کو قرارداد پیش کرنے کا کہے گا اور اگر قرارداد منظور ہو جاتی ہے تو اسمبلی برخاست ہو جائے گی۔ موجودہ آئین کے مطابق صدر کو وزیراعظم کی درخواست پر اسمبلی برخاست کرنا پڑے گی اور اگر صدر وزیراعظم کے مشورے پر عمل نہیں کرتا تو اسمبلی 48 گھنٹے کے بعد ازخود تحلیل ہو جائے گی۔

ان تمام حقائق کے علاوہ صدر جنرل پرویز مشرف اور آئینی ترامیمی تجاویز کے مطابق مستقبل کے سیاسی و انتظامی معاملات میں وزیراعظم ہی سب سے اہم اور بااختیار فرد ہوگا۔ صدر کو صوابدیدی اختیارات دینے کا مطلب صرف قومی نظام کو پٹڑی سے اُترنے سے روکنا ہے۔ اگر وزیراعظم اور اُس کی کابینہ نیک نیتی سے حکومتی نظام چلاتی ہے اور عوام کے مسائل کو حل کرنے میں سنجیدہ ہے تو صدر کے صوابدیدی اختیارات کو استعمال کرنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

صدر مشرف کی حکومت نے اپنے وعدے کے مطابق آئینی اصلاحات پر عمل درآمد کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے احکامات کی روشنی میں انتخابات کے پروگرام کا اعلان کیا۔ مجوزہ آئینی اصلاحات پر معاشرے کے تمام طبقوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان اصلاحات میں ایسی تجاویز شامل تھیں جو ملک کے سیاسی مستقبل پر حیرت انگیز اثرات ڈال سکتی تھیں۔ اکتوبر کے انتخابات کے حوالے سے مختلف

سیاسی جماعتوں نے عوام کو اپنے دام میں لانے کے لیے نئی سے نئی ترغیبات دیں۔ ماضی کے حکمران جو بھی ملک کے اعلیٰ عہدوں پر قابض رہے لیکن جب قربانیاں دینے کا وقت آیا تو ملک چھوڑ کر دوسرے ممالک کو بھاگ گئے وہ موجودہ آئینی اصلاحات کی تجاویز پر سخت فکرمند تھے کیونکہ انہیں ان آئینی تجاویز میں اپنے لیے کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔

جیسا کہ قومی اخبارات میں شائع اور الیکٹرانک میڈیا پر ہونے والی بحث سے ظاہر ہے پرویز مشرف حکومت نے تواتر اور بے نظیر حکومت کے مقابلے میں زیادہ وسیع القلبی اور جمہوری جذبے کا اظہار کیا ہے۔ حکومت نے کئی اہم معاملات پر کھلے دل سے عوامی رائے کا مشورہ قبول کیا ہے۔ جب کہ دوسری کئی نام نہاد جمہوری حکومتوں نے پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہونے والے اپنے مخالفین کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کیا اور ان کی آواز دبانے کے لیے انہیں جھوٹی عدالتی کارروائی میں الجھا دیا۔

1973 کا آئین کوئی مقدس دستاویز نہیں۔ ماضی میں چودہ مرتبہ اس میں ترمیم کی گئی۔ ہر دفعہ ترمیم کرتے وقت یہ کہا گیا کہ ترمیم کا مقصد آئین میں بہتری لانا اور حالات کے مطابق ڈھالنا ہے۔ بار بار اسمبلیوں کا پٹڑی سے اتر جانا اس بات کا متقاضی تھا کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جو نہ صرف اپنی تمام ضروریات پوری کرنے کا اہل ہو بلکہ قوم کی مستقبل کی ترقی و ترویج بھی کر سکتا ہو۔ ہمارے سامنے ترکی کی مثال موجود ہے جہاں حکومتیں تیزی سے بدلتی رہتی ہیں لیکن معاشی ترقی کے لیے وضع کردہ اصول و پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اِس کے برعکس پاکستان کی تاریخ حکمرانوں اور سیاست دانوں کی قومی مسائل کے بارے ذاتی سوچ اور ریشہ دوانیوں کی عکاسی کرتی ہے۔ اگر ملک کے پہلے آئین ۱۹۵۶ء کا حقیقی معنوں میں جائزہ لیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ منتخب حکومتوں کا اصل مقاصد سے ہٹ جانا اور بار بار ٹوٹنا دراصل فردِ واحد کی مطلق العنانیت کی خواہش، شخصی طریقِ حکومت، اراکین پارلیمنٹ کا ملکی قوانین کو پس پشت ڈالنا اور روک تھام و توازن، Checks and Balance کے نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے شروع ہوا۔

تمام مجوزہ آئینی تجاویز میں بڑی ہوشیاری اور دانش مندی سے تمام قومی مسائل پر توجہ دی گئی تا کہ آنے والے حالات میں جمہوری نظام کو جاری و ساری رکھا جا سکے۔ بظاہر توازنِ طاقت (Balance of Power) کے حوالے سے آئینی تجاویز کا جھکاؤ صدر کی طرف ہے لیکن دراصل بہت سارے معاملات میں صدر، سلامتی کونسل اور وزیرِ اعظم کا ایک دوسرے پر انحصار ہے اور وہ ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔

صدر پرویز مشرف داد و تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے پچھلی نصف صدی کے دوران فوجی و سول حکومتوں کے اکٹھے کیے ہوئے مسائل کے انبار کو ختم کرنے میں پہل کی اور خیالی و تصوراتی عزائم کو حقیقت میں ڈھالنے کی کوشش کی تا کہ پاکستان کو حقیقی معنوں میں ایک اسلامی اور جمہوری ریاست بنایا جا سکے۔ انہوں نے اقتدار کے لیے جوڑ توڑ کرنے والوں کو نظم و ضبط کے دائرے میں رکھنے کے لیے 'روک تھام و توازن' (Checks and Balance) کا مشکل راستہ اپنایا۔ بے شک یہ انتہائی مشکل کام ہے جو کہ مستقبل میں سیاسی استحکام پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 'روک تھام و توازن' (Cheks and Balance) کا نظام ماضی کی حکومتوں کو اپنانا چاہتا تھا۔

عوام کی بہت بڑی تعداد ملک میں مصنوعی جمہوریت کی بجائے اصل جمہوریت دیکھنا چاہتی ہے اگر یہ مستقبل میں جمہوریت کے تسلسل کی ضمانت دے سکے۔ مجوزہ آئینی تبدیلیوں کا مقصد فردِ واحد کے ہاتھ میں اختیارات کے ارتکاز کو روکنا اور ریاست کی ذمے داری کے ایک ایسے نظام کو جاری کرنا ہے جو حکومت کے ماتحت نہ ہو اور مفادات کے تصادم کو روک سکے، جو اختیارات کے ظالمانہ استعمال پر بندش لگا سکے اور قومی مفاد کے حامل امور یعنی جمہوریت، قومی تحفظ اور اعلیٰ طرزِ حکمرانی پر صلاح مشورے کے لیے قومی

سلامتی کونسل جیسا آئینی ادارہ تشکیل دے سکے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ ملک کا دانشور طبقہ مجوزہ آئینی اصلاحات کی مخالفت نہیں کرے گا۔

رائے دہندہ کی عمر کو گھٹا کر ۱۸ سال مقرر کیا گیا۔ عورتوں کے لیے مخصوص و عام نشستوں کی تعداد بڑھا دی گئی اور سینٹ کے انتخابات کے لیے نئے طریق کار کا اعلان کیا گیا۔ یہ تمام عوامل ملک میں جمہوریت اور اداروں کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ مستقبل میں سینٹ کا کردار چھوٹے وفاقی صوبوں کے خدشات کو دور کرنے میں مدد دے گا۔

صدارتی انتخابات اکتوبر 2007ء

صدر جنرل پرویز مشرف نے یہ اعلان کیا کہ وہ دوبارہ صدر منتخب ہونے کے لیے موجودہ اسمبلیوں سے اعتماد کا ووٹ لیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ وردی میں دوبارہ انتخاب لڑیں گے کیونکہ سترھویں آئینی ترمیم انہیں صدر اور چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے بہ یک وقت اپنے پاس رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔

اِن اعلانات کے ساتھ حزبِ مخالف میں بے چینی پیدا ہوئی اور مخالف سیاسی جماعتوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ مشرف کی بھرپور مخالفت کریں گی اور انہیں کسی بھی صورت موجودہ اسمبلیوں سے وردی میں رہتے ہوئے دوبارہ صدارتی انتخاب لڑنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ سیاسی جماعتوں نے یہ کہا کہ مشرف وردی یا وردی کے بغیر قابلِ قبول نہیں کیونکہ سویلین عہدے پر اُن کی موجودگی آئین اور جمہوری اصولوں کے منافی ہے۔

دوسری جانب حکمران جماعت پاکستان مسلم لیگ (ق) نے اس عزم کا اظہار کیا کہ مشرف وردی میں موجودہ اسمبلیوں کے ذریعے دوبارہ صدر منتخب کیے جائیں گے۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) نے یہ دعویٰ کیا کہ مشرف کو صدر منتخب کرنے کے لیے اُن کے پاس پارلیمنٹ میں ضروری اکثریت کی حمایت حاصل ہے جو مشرف کو وردی میں پانچ سال کے لیے دوبارہ صدر منتخب کرے گی۔

جنرل پرویز مشرف نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی جمع کرائے جنہیں الیکشن کمشن نے درست قرار دیتے ہوئے منظور کر لیا۔ حزبِ مخالف کی طرف سے جسٹس وجیہہ الدین صدارتی انتخاب لڑنے کے لیے میدان میں اُترے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے مخدوم امین فہیم کو نامزد کیا اور فریال تالپور کو اُن کا کورنگ امیدوار مقرر کیا گیا۔

متحدہ مجلسِ عمل کے صدر قاضی حسین احمد نے سپریم کورٹ میں رٹ پیش کی جس میں یہ کہا کہ جنرل پرویز مشرف کی صدر کے لیے نامزدگی کو غیر قانونی قرار دیا جائے اور اُن کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کر دیئے جائیں کیونکہ مشرف فوجی کمانڈر ہوتے ہوئے صدارتی انتخاب لڑنے کے اہل نہیں ہیں اور اُن کا فوجی کمانڈر ہوتے ہوئے صدارتی انتخاب لڑنا خلافِ آئین ہے۔ سپریم کورٹ نے قاضی حسین احمد کی درخواست کو مسترد کر دیا اور اپنے فیصلے میں یہ کہا کہ قاضی حسین احمد کا صدر مشرف کے صدارتی انتخاب لڑنے کے بارے اعتراض قابلِ غور نہیں کیونکہ سترھویں آئینی ترمیم مشرف کو بہ یک وقت دو عہدے اپنے پاس رکھنے کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف حزبِ مخالف کی سیاسی جماعتوں نے بہت واویلا مچایا۔ اُنہوں نے سپریم کورٹ پر شرم ناک الزامات لگائے اور فیصلے کو پاکستان کی تاریخ کا سیاہ باب قرار دیا۔ مشرف کے مخالفین نے فیصلے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے حسن اخلاق اور شائستگی کے تمام اصولوں کو پسِ پشت ڈال دیا اور مرضی کے خلاف فیصلہ آنے پر سپریم کورٹ کو تضحیک آمیز نکتہ چینی کا نشانہ بنایا۔ جب اسی سپریم کورٹ نے چیف جسٹس کو بحال کر دیا تھا تو مشرف مخالفین نے سپریم کورٹ کی تعریف میں زمین و آسمان کے

قلابے ملا دیے تھے اور سپریم کورٹ کی غیر جانب داری کو سراہا تھا۔ لیکن جب ان کی خواہش کے خلاف فیصلہ دیا تو مشرف مخالفین نے عدالت کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیا۔

مشرف کے خلاف اعتراضات کی روشنی میں الیکشن کمشن نے حکم نامہ جاری کیا جس کے ذریعے انتخاب لڑنے کے لیے حکومت کی ملازمت چھوڑنے کے دو سال بعد تک کی پابندی کو ختم کر دیا گیا اور پرویز مشرف کو صدارتی انتخاب لڑنے کے لیے اہل قرار دے دیا گیا۔ مشرف کے کاغذات نامزدگی منظور کر لیے گئے اور عدالت نے حکم دیا کہ انتخابات پہلے سے مقرر کردہ تاریخ 6 اکتوبر 2007ء کو ہوں گے۔ تاہم عدالت نے یہ حکم دیا کہ جب تک 17 اکتوبر 2007ء کے بعد مشرف کی اہلیت کا فیصلہ نہیں ہوتا انتخابات کے سرکاری نتائج کا اعلان نہ کیا جائے۔

صدارتی انتخابات بروز ہفتہ 6 اکتوبر 2007ء کو ہوئے۔ جنرل پرویز مشرف نے انتخابات میں واضح برتری حاصل کی اور اپنے تمام حریفوں کو حیران کن شکست دی۔ پرویز مشرف حزب مخالف کی جماعتوں کے بائیکاٹ و احتجاج کے باوجود پارلیمانی انتخابی ادارے کے ذریعے مزید پانچ سال کے لیے ملک کے صدر منتخب ہوئے۔

مشرف نے کل ڈالے گئے 685 میں سے 671 ووٹ حاصل کیے جو کہ 96% بنتا ہے اور مجموعی طور پر پارلیمنٹ اور چار صوبائی اسمبلیوں کے 1170 ووٹوں کا 57% حاصل کیا۔ وزیراعظم شوکت عزیز نے صدر مشرف کی حیران کن کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ انتخابات کے نتائج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے عوام موجودہ نظام اور حکومت کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے اراکینِ پارلیمنٹ نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا صدارتی انتخابات پارلیمنٹ کی عمارت اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں پرامن ماحول میں ہوئے اور کسی قسم کا کوئی ناخوش گوار واقع رونما نہ ہوا۔

انتخابات سے پہلے حزبِ اختلاف نے صدارتی انتخابات کو متنازع بنانے کی ناکام کوشش کی۔ حزب مخالف کی چند سیاسی جماعتوں نے قاضی حسین احمد کی سربراہی میں متحدہ مجلسِ عمل سے مل کر صوبہ سرحد کی صوبائی اسمبلی کو تڑوانے کی کوشش کی اور اس کے لیے انہوں نے وزیرِ اعلیٰ محمد اکرم خان درانی کو استعمال کیا۔ اگر سرحد اسمبلی صدارتی انتخاب سے پہلے تحلیل ہو جاتی تو صدارتی انتخاب مشکل میں پڑ جاتا کیونکہ انتخابی ادارے سے ایک وفاقی یونٹ کی کمی سے صدارتی انتخاب کی حیثیت خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ لیکن سرحد اسمبلی میں حکومتی اراکین نے متحدہ مجلسِ عمل کی بدنیتی کو بھانپ لیا اور فوری طور پر وزیرِ اعلیٰ اکرم خان درانی کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کر دی۔ تحریکِ عدم اعتماد پیش ہو جانے سے وزیرِ اعلیٰ بے اختیار ہو گئے وہ اب گورنر کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ تحریکِ عدم اعتماد پر رائے شماری کی تاریخ صدارتی انتخاب کے بعد مقرر کی گئی تاکہ صدارتی انتخاب کے وقت پوری سرحد اسمبلی موجود ہو۔ اس طریقے سے پرویز مشرف گروپ نے بڑے موثر طریقے اور ہوشیاری سے حزب مخالف کو بے اثر کر دیا اور صدارتی انتخاب پُرامن طور پر ہو گیا۔

1170 اراکین پر مشتمل انتخابی ادارہ جو کہ حزب مخالف کے استعفوں اور آخری لمحات میں مخالف سیاسی جماعتوں کے واک آؤٹ کی وجہ سے بہت چھوٹا ہو گیا تھا نے صدر مشرف کو آئندہ پانچ سالوں کے لیے واضح اکثریت کے ساتھ صدر منتخب کر لیا۔ 1170 اراکین پر مشتمل انتخابی ادارے کے قومی اسمبلی اور سینٹ کے 100 ووٹوں میں سے ڈالے گئے 257 ووٹوں میں صدر مشرف کو 252 ووٹ حاصل ہوئے۔ قاضی محمد فاروق چیف الیکشن کمشنر نے غیر سرکاری نتائج کا اعلان کیا۔ سپریم کورٹ کے 10 رکنی بنچ نے پہلے ہی مخدوم امین فہیم اور وجیہہ الدین کی انتخاب رکوانے کی درخواست کو مسترد کر دیا تھا۔ بقیہ ووٹ صوبائی اسمبلیوں کی طرف سے ڈالے گئے جن کی گنتی متناسب نمائندگی کے اصول کی بنا پر کی گئی۔

	ڈالے ووٹوں کی کل تعداد	مشرف	وجیہہ الدین	مسترد شدہ ووٹ
قومی اسمبلی سینٹ	257	252	2	3
پنجاب	257	253	3	1
بلوچستان	33	33	×	×
صوبہٗ سرحد	34	31	1	2
سندھ	104	102	2	×
ٹوٹل	685	671	8	6

پاکستان کی ساٹھ سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ فوج کا سپہ سالار ملک کا صدر منتخب ہوا۔ ملک کے پہلے فوجی حکمران جنرل ایوب خان ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی فیلڈ مارشل بن گئے لیکن 80,000 بی ڈی انتخابی ادارے کے ذریعے اپنے 1964ء کے صدارتی انتخاب سے قبل ہی انہوں نے فوج کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ جنرل محمد موسیٰ کے حوالے کر دیا۔ دوسرے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق نے ایک متنازعہ ریفرنڈم کے ذریعے اپنے آپ کو منتخب کروا لیا اور اسی طرح جنرل مشرف نے بھی 2002ء میں کیا۔

صدارتی انتخاب کے بعد سیاسی صورت حال

صدارتی انتخاب جیتنے پر مشرف کو وسیع پیمانے پر مبارکباد کے پیغامات موصول ہوئے۔ سب سے اہم مبارکباد امریکی وائٹ ہاؤس سے موصول ہوئی۔ امریکی حکومت کے اہل کاروں نے صدر مشرف کو صدارتی انتخاب جیتنے پر مبارکباد دی۔ تاہم مشرف کی فتح نے امریکہ کو مشکل صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ امریکہ چاہتا تھا کہ مشرف دوسری مدت کے لیے بھی صدر رہیں اور اسی لیے اُس نے مشرف اور بے نظیر بھٹو کے درمیان مفاہمتی معاہدہ کروایا لیکن پھر بھی امریکہ اس مسئلے کو عوام کے سامنے اُس وقت نہیں لانا چاہتا تھا جب تک کہ سپریم کورٹ مشرف کی نامزدگی کے بارے اپنا فیصلہ نہیں سنا دیتی۔

صدر مشرف نے عوام سے یہ اپیل کی کہ وہ حزبِ مخالف کی محاذ آرائی کی سیاست کو مسترد کر دیں اور ملک کی ترقی کی کوششوں میں حکومت کی مدد کریں۔ صدر نے عوام سے اپیل کی کہ وہ ایسے عناصر کے جھانسے میں نہ آئیں جو اُنہیں معاشرے میں بدامنی اور بے چینی پھیلانے کے لیے ہڑتالوں اور احتجاج پر اُکساتے ہیں۔ صدارتی انتخاب کو تاریخ ساز واقعہ قرار دیتے ہوئے صدر مشرف نے کہا کہ مفاہمت وقت کی اہم ضرورت ہے۔

صدر مشرف نے کئی مواقع پر صبر و تحمل اور سیاسی فہم و فراست کا مظاہرہ کیا ہے۔ جب سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ صدارتی انتخاب پروگرام کے مطابق ہونے چاہئیں تو صدر مشرف کی سیاسی حیثیت میں اضافہ ہوا۔ مشرف نے انتہائی ہوشیاری سے مفاہمتی آرڈیننس کے ذریعے بے نظیر بھٹو کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ایک زیرک سیاست دان کی مانند متحدہ مجلسِ عمل جو کہ انتہا پسند اور کٹر افراد کا گروہ ہے کے اتحاد میں پھوٹ ڈالی۔ جس سے متحدہ مجلسِ عمل انتشار کا شکار ہو کر تتر بتر ہو گئی۔ جمعیت علماء اسلام (ف) نے صوبہٗ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی جو اِس بات کا ثبوت ہے کہ متحدہ مجلسِ عمل کی دو بنیادی جماعتوں کے درمیان بے اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ مشرف نے ایک تیز فہم سیاست دان کی طرح حزبِ مخالف کے تمام بڑے محاذوں کو تقسیم کر دیا۔ اُنہوں پاکستان پیپلز پارٹی سے گفت و شنید شروع کر کے اے آر ڈی کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور خاموشی اور رازداری سے مولانا فضل الرحمٰن

سے مذاکرات شروع کر کے متحدہ مجلسِ عمل کو منتشر کیا۔ مولانا فضل الرحمن نے سرحد اسمبلی کی تحلیل رکوا کے قاضی حسین احمد کے ساتھ سیاسی کھیل کھیلا اور انہیں بے بس کر کے رکھ دیا۔

قومی مفاہمتی آرڈی ننس

مختلف افراد جن میں سیاست دان اور بیورو کریٹ شامل تھے کے خلاف ماضی میں کی ہوئی کارروائی کو ختم کرنے کے لیے صدر مشرف نے 5 اکتوبر 2007ء کو قومی مفاہمتی آرڈی ننس جاری کیا۔ اس قانون کے ذریعے حکومت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ 1 جنوری 1986ء سے 12 اکتوبر 1999ء کے دوران عوامی نمائندے/ افسران/ سیاست دان جنہیں ناجائز طور پر فوج داری مقدمات میں ملوث کیا گیا تھا کے خلاف جاری عدالتی کارروائی کو ختم کر سکتی ہے۔ عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ احتساب کا عمل سیاسی مخالفین کو مقدمات میں ملوث کرنا ہوتا ہے۔ عوام یہ سمجھتے تھے کہ ایک شفاف، منصفانہ اور مؤثر احتسابی عمل کی ضرورت تھی تاکہ سیاست دانوں کے ساتھ ماضی کی زیادتیوں کا ازالہ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ اس بات پر بھی سب متفق تھے کہ قومی سطح پر مفاہمت کی ضرورت ہے جو معاشرے کے تمام طبقات کو درپیش مسائل سے نجات دلانے کے لیے مل جل کر جدوجہد کا موقعہ فراہم کر سکے۔

قومی مفاہمتی قانون کا مقصد مخالف سیاسی قوتوں کی حمایت کرنا بھی ہے جن میں بےنظیر بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی شامل ہے۔ بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ مفاہمتی قانون آئین کی نفی کرتا ہے اور مخصوص افراد کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتا ہے جب کہ بہت سارے لوگ اس قانون کے تحت مساوی حقوق سے محروم ہیں۔

مفاہمتی قانون نے 109 سالہ پرانے قانون میں ترمیم کر دی ہے (فوجداری قانون 494 قانون 1898) قانون کے تفصیلی جائزے سے ظاہر ہوگا کہ اس قانون کے ذریعے مقدمات واپس نہیں لیے جا سکتے۔ یہ صرف حکومت کو مقدمات واپس لینے یا ختم کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ اس اختیار پر صرف اُسی صورت عمل درآمد ہو سکتا ہے جبکہ نظرِ ثانی بورڈ نے مقدمات کا جائزہ لیا ہو اور یہ نتیجہ نکلا ہو کہ الزامات جھوٹے تھے اور مقدمات کو ختم کرنے کی سفارش کی ہو۔

تاہم نظرِ ثانی بورڈ کے لیے الزامات کے سچے یا جھوٹے ہونے کا صحیح اندازہ لگانا اتنا آسان نہ ہوگا جتنا کہ سمجھا گیا ہے۔ نظرِ ثانی بورڈ کے سربراہ ایک ریٹائرڈ جج ہوں گے آسانی سے اثر انداز ہو سکیں گے۔ بورڈ کے دوسرے اراکین جن پر الزامات کی چھان بین کے لیے طے کردہ لائحہ عمل انتہائی مشکل اور پیچیدہ ہے جس سے الزامات کے صحیح یا جھوٹا ہونے کا اندازہ لگانا مشکل ہوگا۔ نظرِ ثانی بورڈ کے اراکین انتظامیہ کے نمائندے ہوں گے جن پر موافق فیصلہ دینے کے لیے دباؤ ڈالا جا سکے گا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حکومت موجودہ اور سابقہ بدعنوان سیاست دانوں اور بیورو کریٹس کے خلاف جاری مقدمات کو ختم کرنے یا واپس لینے میں سنجیدہ نہیں۔

ملکی سیاست میں باہمی اعتماد اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کے لیے حکومتی مفاہمتی آرڈی ننس کے مقاصد اُتنے ہی مشکوک ہیں جتنا کہ خود مفاہمتی قانون۔ ابھی تک یہ بات عیاں نہیں کہ دراصل مفاہمت کے اصل مقاصد و معنی کیا ہیں اور کن فریقین کے درمیان مفاہمت کروائی جائے گی۔ مفاہمتی قانون کو جنرل پرویز مشرف اور نیم فوجی طبقوں کی پوری حمایت حاصل ہے۔ صدر مشرف کا یہ کہنا ہے کہ مفاہمتی آرڈی ننس ایک سوچ اور نظریے کی بنا پر جاری کیا گیا ہے اور یہ تمام سیاست دانوں پر لاگو ہوگا، اس کا عظیم مقصد صاف، شفاف اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد ہے۔ صدر مشرف کے اعلان کی روشنی میں یہ امید کی جا رہی ہے کہ اگلے عام انتخابات کے بعد حکومت زیادہ جمہوری ہوگی اور صدر اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ تاہم جمہوری طرزِ حکومت کے لیے مفاہمت کا یہ مطلب نہیں کہ مختلف افراد اور معاشرے کے تمام طبقوں کے درمیاں اختلافِ رائے اور مخالفت کو یکسر ختم کر دیا جائے۔

لہٰذا جمہوری طرزِ حکومت کے حوالے سے مزاحمت کا مقصد مخالفین کے ساتھ برتاؤ میں غیر قانونی ہتھکنڈے، گالم گلوچ، ڈرانے دھمکانے اور تشدد کے استعمال سے گریز کرنا ہے۔ پاکستان میں حکومتی جماعتیں مخالفین کو بے جا دبانے اور ڈرانے دھمکانے میں ملوث رہی ہیں۔

مشرف، بے نظیر معاہدہ
Musharaf BeNazir Deal

جنرل پرویز مشرف نے بد انتظامی اور اختیارات کے ناجائز استعمال کی بنا پر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو معطل کر دیا۔ چیف جسٹس کو ملازمت سے برطرف کرنے کے لیے حکومت نے سپریم جوڈیشل کونسل سے رجوع کیا۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف متعدد الزامات لگائے گئے اور حکومت نے ان الزامات سے متعلق ٹھوس شواہد پیش کیے۔

چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس کی وجہ سے وکلاء کے اندر شدید اضطراب پیدا ہوا۔ تمام ملک کے وکلاء نے حکومت کے خلاف جارحانہ تحریک شروع کی اور مطالبہ کیا کہ چیف جسٹس کو بحال کیا جائے۔ وکلاء کی تحریک کی شدت نے حکومت کو ہلا کے رکھ دیا۔

وکلاء کے احتجاج کی شدت نے اقتدار پر پرویز مشرف کی گرفت کو کمزور کر دیا۔ سپریم جوڈیشل کونسل نے چیف جسٹس کو بحال کر دیا جس سے حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ درحقیقت چیف جسٹس کے خلاف اقدام کر کے پرویز مشرف نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا اور اپنی حکومت کے لیے مشکلات پیدا کر لیں تھیں۔ اِس صورتِ حال میں مشرف ایسی مدد کے متلاشی تھے جو انہیں اس مشکل اور ناگوار صورتِ حال سے چھٹکارہ دلا سکے۔

دوسری جانب پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن بے نظیر بھٹو بھی خودساختہ جلا وطنی سے باعزت طور پر نکلنے کے لیے موقعہ کی تلاش میں تھیں۔ وہ نیب NAB اور سویٹزر لینڈ کی عدالتوں میں اپنے خلاف جاری مقدمات کی وجہ سے سخت پریشان تھیں اور اُن کی یہ خواہش تھی کہ اِن مقدمات سے کسی طرح جان چھوٹ جائے۔ بے نظیر پرویز مشرف کے جارحانہ رویے کی وجہ سے بھی سخت نالاں تھیں۔

پرویز مشرف کی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے بے نظیر نے اپنے اصل دشمن نواز شریف کے ساتھ لندن میں میثاقِ جمہوریت پر دستخط کیے۔ میثاقِ جمہوریت کی رُو سے دونوں سزا یافتہ سابق وزرائے اعظم نے جمہوریت کو پروان چڑھانے اور سیاست سے فوج کے اثر و نفوذ کو ختم کرنے کے لیے مل کر کوشش کرنے کا اعلان کیا۔

تاہم میثاقِ جمہوریت طے کرتے وقت جو جذبہ کارفرما تھا وہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا کیونکہ بے نظیر نے اکیلے ہی پیش رفت کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنی بحالی کے لیے امریکہ کی طرف رجوع کیا اور دہشت گردی کے خلاف ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کروائی۔ امریکی مدد حاصل کرنے کے لیے بے نظیر اس حد تک چلی گئیں کہ انہوں نے اسامہ بن لادن جو کہ امریکہ کے مطابق پاکستان میں چھپے ہوئے تھے کو تلاش کرنے کے لیے امریکہ کو پاکستان پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی۔ اُنہوں نے اقوامِ متحدہ کے اہل کاروں کو ایٹمی پھیلاؤ کے بارے مشہور ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے سوالات کرنے کی اجازت دینے کا وعدہ بھی کیا۔

حالانکہ جنرل پرویز مشرف نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور اُنہیں جنگ سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی لیکن پھر بھی طالبان اور القاعدہ کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے پرویز مشرف کی طرف سے تعاون پر امریکہ مطمئن نہ تھا۔ لہٰذا امریکہ نے پرویز مشرف پر بے نظیر بھٹو کے ساتھ مذاکرات شروع کرنے کے لیے شدید دباؤ ڈالا۔

امریکی وزیر خارجہ کونڈا لیزا رائس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر آصف علی زرداری کے خلاف عدالتوں میں جاری بدعنوانی کے مقدمات واپس لے لیے جائیں اور بے نظیر کو وطن واپس آنے اور انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔

بے نظیر اور صدر مشرف کے درمیان دوبئی میں مذاکرات شروع ہوئے اور بالآخر صدر مشرف اور بے نظیر کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا۔ اس معاہدے کی رو سے قومی مفاہمتی آرڈی ننس جاری کیا گیا جس کے ذریعے بے نظیر بھٹو، آصف علی زرداری اور پیپلز پارٹی کے سرکردہ اراکین جو بدعنوانی اور لوٹ کھسوٹ کے مقدمات میں ملوث تھے کے خلاف جاری مقدمات کو واپس لے لیا گیا۔ صدر مشرف جنہوں نے اپنی سوانح حیات "In The Line of Fire" میں بے نظیر بھٹو کو ایک 'چورنی' کہا تھا نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے اور بے نظیر کو وطن واپس آنے کی اجازت دے دی۔

مشرف۔ بے نظیر سمجھوتے کے خلاف وسیع پیمانے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ بالخصوص پیپلز پارٹی کے حلقوں نے برملا اس سمجھوتے پر نکتہ چینی کی۔ میجر جنرل نصیراللہ خان بابر جو پیپلز پارٹی کے نمایاں رکن اور بے نظیر کے وفادار ساتھی تھے سمجھوتے کے خلاف احتجاجاً پیپلز پارٹی سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے علاوہ دوسرے اراکین جن میں اعتزاز احسن شامل تھے نے اس سمجھوتے پر مایوسی کا اظہار کیا۔ اس سمجھوتے کے خلاف یہ احساس پیدا ہوا کہ مشرف کے ساتھ سمجھوتہ کر کے بے نظیر نے اپنے مرحوم والد کے چھوڑے ہوئے سیاسی اثاثے کو نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن بے نظیر کے حامیوں نے اس موقف کو مسترد کر دیا اُن کا یہ خیال تھا کہ عملی سیاست میں مستقل اصول نہیں ہوتے اور حالات کے مطابق ان میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ ان کے خیال میں مفاہمتی آرڈی ننس ایک مثبت قدم ہے جس کے ذریعے تمام سیاسی حلقوں کو فائدہ ہوگا۔

اِس کے برعکس بعض معاشرتی حلقوں اور تجزیہ نگاروں کے نزدیک قومی مفاہمتی آرڈی ننس اقتدار کے بھوکے دو طبقوں کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس کے ذریعے اقتدار کی ہوس رکھنے والوں نے ایک دوسرے کے سیاہ کارناموں سے درگذر کر لیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قومی مفاہمتی آرڈی ننس دراصل بدعنوان اور اقتدار کے حصول کے بھوکے چند افراد کے درمیان تاش کے پتوں کے اُول بدل کا کھیل ہے۔ بے نظیر اور مشرف کے درمیان معاہدے کے بعد پیپلز پارٹی کا سیاسی چہرہ ہمیشہ کے لیے مسخ ہو گیا ہے۔ اب پیپلز پارٹی کو ماضی کے سیاسی شمار اور حکومت سے عوامی ٹکراؤ کی پالیسی کو چھوڑ کر عوام کے ساتھ اپنے تعلقات ایک شکست خوردہ سیاسی قوت کے طور پر استوار کرنا پڑیں گے۔

بے نظیر کی آمد کے بعد سیاسی تناظر

بے نظیر بھٹو 18 اکتوبر 2007ء کو پاکستان واپس آئیں۔ اُن کی جماعت نے ان کے استقبال کے لیے ایک بہت بڑے ہجوم کا بندوبست کیا یہ استقبالی مظاہرہ ایک خودکش حملے کی نذر ہو گیا جس میں 150 معصوم اور بے قصور جانیں ضائع ہو گئیں۔ اس واقعے سے یہ ثابت ہوا کہ ابھی تک معاشرے اور جمہوری عمل کو دہشت گردوں سے شدید خطرہ لاحق ہے۔

بے نظیر نے اس واقعہ کی ذمہ داری اپنے سیاسی حریفوں پر ڈال دی انہوں نے دھماکے کے حوالے سے انتہائی بیگانہ بیانات دیئے جس سے سیاسی فضا مزید مکدّر ہو گئی جس کے نتیجے میں مہلک خودکش حملوں اور دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوا جس نے ملک کو ہلا کے رکھ دیا۔ بہرحال بے نظیر کے والہانہ استقبال سے یہ ثابت ہوا کہ سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کے بارے صدر مشرف کے منفی اور جارحانہ رویے کے باوجود عوام ابھی تک قائدین کی حمایت کرتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے عوامی طاقت کے مظاہرے سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ معاشرتی و اقتصادی انصاف اور عوام سے کیے وعدے ہمیشہ مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سیاست میں فوج کا عمل دخل ۔۔۔ کتنا ہی دیرپا کیوں نہ ہو اسے ہمیشہ جائز حیثیت کے بحران کا سامنا رہتا ہے۔

بے نظیر نے دہشت گردوں اور انتہاپسندوں کا سامنا کرنے کا بلند بانگ دعویٰ کیا۔ اُنہوں نے دہشت گردی اور انتہاپسندی کو پاکستان کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا اور اُسے جڑ سے اُکھاڑنے کے عزم کا اظہار کیا۔ اگر نئے سیاسی کلچر کی بنیاد عوامی طاقت کے مظاہرے پر ہے تو پھر پیپلز پارٹی نے اپنے سیاسی حریفوں کو کھلا چیلنج دے دیا ہے جو کہ بالخصوص مذہبی سیاسی جماعتوں کے لیے فکر کا باعث ہے۔

پارلیمنٹ نے اپنی مدت 15 نومبر 2007ء کو مکمل کر لی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ قومی وصوبائی اسمبلیوں نے اپنی مدت پوری کی۔ مدت پوری کرنے کے ساتھ ہی اسمبلیاں خود بخود تحلیل ہوگئیں۔ سینٹ کے چیئرمین محمد میاں سومرو کی قیادت میں عبوری حکومت قائم کی گئی۔ صوبوں میں بھی عبوری حکومتیں قائم ہوگئیں۔ حزبِ مخالف کی جماعتوں نے عبوری حکومتوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور ان کی مخالفت کرنے کا اعلان کیا۔ اس پر صدر پرویز مشرف داد وتحسین کے حق دار ہیں جن کی حکومت کے تحت اسمبلیوں نے اپنی آئینی مدت پوری کی۔ اس سے قبل ضیاء الحق اور غلام اسحاق کی حکومتوں کے دوران چار دفعہ اسمبلیاں مدت پوری کرنے سے قبل توڑی گئیں۔ اسمبلیوں کا اپنی مدت پوری کرنے کا ملک کے سیاسی نظام پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے اور ایک صحت مند سیاسی روایت جنم لے گی۔

ہنگامی حالت کا اعلان

مہلک خودکش حملوں کے نتیجے میں ملک کی امنِ عامہ کی صورتِ حال ابتر ہوگئی۔ دوسری جانب مشرف کی صدارتی انتخاب لڑنے کی اہلیت کے سوال پر سپریم کورٹ کی طرف سے فیصلے میں تاخیر نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور صورتِ حال ہاتھ سے نکلتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اب صدر مشرف کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہ بچا سوائے اس کے ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا جائے۔ لہٰذا 3 نومبر 2007ء کو ملک میں ہنگامی حالت نافذ کی گئی اور آئین کو معطل کر دیا گیا۔ نیا پی سی او جاری کیا گیا اور جج صاحبان سے کہا گیا کہ وہ نئے پی سی او حکم کے تحت دوبارہ حلف اٹھائیں۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو برطرف کر دیا گیا۔

ہنگامی حالت کے نفاذ کے ساتھ ہی وکلاء تحریک کے بعد ظاہر ہونے والا سیاسی منظر یک دم تبدیل ہوگیا۔ اب ہر چیز صدر مشرف کے ہاتھ میں آگئی جو پُراعتماد نظر آتے تھے اور حکومت کے اختیار کو لاگو کرنے میں پرعزم تھے۔

سپریم کورٹ و ہائی کورٹس کے متعدد جج صاحبان نے پی سی او کے تحت حلف لینے سے انکار کر دیا۔ حکومتی اداروں نے ملک بھر میں امنِ عامہ کو سدھارنے کے لیے کاروائی کی۔ اس مرتبہ وکلاء کو حکومتی کاروائی کا نشانہ بنایا گیا۔ بہت سارے وکلاء کو گرفتار کر لیا گیا۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کے کارکنان کو بھی گرفتار کر لیا گیا جن ججوں نے PCO کے تحت حلف لینے سے انکار کیا انہیں گھروں کو بھیج دیا گیا۔

ہنگامی حالت کے نفاذ کی وجوہات

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ چند عوامل نے پرویز مشرف کو ایمرجنسی لگانے پر مجبور کیا جن میں وکلاء تحریک اور حزبِ مخالف کا صدر مشرف کے خلاف پرشور احتجاج شامل ہے۔ ان واقعات کی وجہ سے ملک میں امنِ عامہ کی صورتِ حال مخدوش ہوگئی جسے سنبھالنے کے صدر مشرف کو مجبوراً ایمرجنسی کا اعلان کرنا پڑا۔

فوری طور پر جن واقعات نے ہنگامی حالت کے نفاذ کی راہ ہموار کی اُن میں ریاستی ڈھانچے اور حفاظتی اداروں پر حملے اور خودکش دھماکے شامل ہیں جنہوں نے حکومت کی بنیادوں کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ ایمرجنسی کے نفاذ سے دو روز قبل ایک خودکش حملہ آور نے سرگودھا

میں پاکستان ایئر فورس سکول کی ایک بس کو اڑا دیا جس میں 13 معصوم بچے شہید ہو گئے۔ چھوٹے بچے علم کے حصول کے لیے اپنے مادر علمی کی طرف جا رہے تھے کہ ظالم حملہ آور نے انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ اس واقعے نے پورے ملک میں خوف و ہراس پھیلا دیا کیونکہ معصوم بچوں کی ہلاکت کسی بھی طرح کوئی مقصد حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ حکومتی عمارتوں پر لگاتار خودکش حملوں کا سلسلہ جاری رہا جس کے نتیجے میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کو نقصان پہنچا۔ ان واقعات کی وجہ سے معاشی ترقی کی رفتار بھی متاثر ہوئی۔

انتہاپسندی اور جنگ جوئی کا فروغ بھی ہنگامی حالت کے نفاذ کا باعث بنا۔ انتہاپسند عناصر نے کھلے عام حکومتی اختیار کو للکار کر ملک میں لاقانونیت اور طوائف الملوکی پھیلائی۔ لال مسجد/ جامع حفصہ اور سوات کے واقعات نے بری طرح سے حکومتی اختیار کی دھجیاں بکھیر دیں جس سے ملک کی سلامتی اور یکجہتی کے لیے خطرہ پیدا ہوا۔ جنگ جوؤں کی طرف سے مسلسل دخل اندازی کی وجہ سے حکومتی ادارے بے اثر ہو گئے تھے۔ جس وقت عدالت عالیہ نے دہشت گردوں کو رہا کر دیا تو اس سے انتہاپسند جنگ جو عناصر کے حوصلے بلند ہو گئے اور حکومت ایسے عناصر کو سزا دینے میں بے بس ہو گئی۔ عدالتی کاروائی سے پولیس اور خفیہ اداروں کے اہل کاروں کے حوصلے پست ہو گئے جن کے لیے سپریم کورٹ کے جارحانہ رویہ کی وجہ سے فرائض کی ادائیگی مشکل ہو گئی۔

چیف جسٹس کی بحالی کے بعد سپریم کورٹ کا رویہ حکومتی اداروں کی جانب بہت زیادہ جارحانہ اور معاندانہ ہو گیا تھا۔ بالخصوص حکومت کے اعلیٰ اہل کاروں کے ساتھ سپریم کورٹ کا رویہ انتہائی قابل اعتراض ہوتا تھا۔ عدالت میں پیش ہونے والے حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کو سپریم کورٹ کے جج مخاطب کرتے ہوئے توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے تھے۔ نتیجتاً حکومت کے افسران بددل ہو گئے اور اُن کے اندر سخت مایوسی اور بے چینی پیدا ہوئی۔ اعلیٰ عدالتی کونسل جس کا کام موجودہ ججوں کے خلاف بدعنوانی کے معاملات کی سماعت کرنا ہوتا ہے اُس وقت بے مقصد ہو کر رہ گئی جب کہ سپریم کورٹ نے جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف بدعنوانی کے معاملے کی ازخود سماعت کا فیصلہ کیا۔ پاکستان کی عدالتی تاریخ میں یہ سب سے عجیب واقعہ تھا جب کہ ایک اعلیٰ عدالتی ادارے کو خود عدالت نے غیر متعلق بنا کے رکھ دیا۔

ذرائع ابلاغ کا کردار بھی حالات کو خراب کرنے کا باعث بنا۔ حکومت کی طرف سے دی گئی بے جا آزادی جو پہلے کبھی نہ تھی میڈیا کو راس نہ آئی۔ بجائے عوام کو روشن خیال بنانے کے دی گئی لامحدود آزادی کو مسائل کا انبار لگانے کے لیے استعمال کیا۔ صحافیوں، اخبارات میں لکھنے والوں اور برقی ذرائع ابلاغ پر بیٹھ کر ملکی مسائل پر بحث کرنے والوں نے یہ سوچے بغیر کہ ملک انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے وہ سب کچھ کہہ دیا اور لکھ دیا جو اُن کے ذہن میں آیا۔ آزادیٔ تحریر وتقریر ذرائع ابلاغ کا حق ہے لیکن اس کا استعمال ذمہ داری، ضبط و تحمل اور خود پر قابو رکھتے ہوئے کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا ہمیں روکے ہمیں خود غیر ذمہ داری سے گریز کرنا چاہیے۔ یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ نے اپنی غیر ذمہ دارانہ رپورٹنگ کے ذریعے ایک معتدل فوجی حکمران کو انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

صدر پرویز مشرف نے 29 نومبر 2007ء کو بہ حیثیت سویلین صدر اپنی دوسری پانچ سالہ مدت کا حلف اٹھایا۔ اس سے ایک دن پہلے پرویز مشرف نے آرمی چیف کا عہدہ چھوڑ دیا۔ جسٹس عبدالحمید ڈوگر نے صدر سے حلف لیا۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی نئے آرمی چیف مقرر ہوئے۔ حلف اٹھانے کے بعد صدر مشرف نے حاضرین سے خطاب کیا اور وعدہ کیا کہ 8 جنوری 2008ء کو ہونے والے انتخابات شفاف اور غیر جانب دارانہ ہوں گے۔

عام انتخابات-2008

پاکستان کی ہنگامہ خیز انتخابی سیاست کی تاریخ

جمہوریت کے فروغ کے لیے انتخابات لازم وملزوم ہوتے ہیں۔ انتخابات عوام کو اپنے نمائندے چننے کا موقعہ فراہم کرتے ہیں۔ یہ ووٹر کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ موجودہ نمائندوں کا دوبارہ انتخاب کر لیں یا نئے نمائندے چن لیں۔ انتخابات کا مقصد قومی تعمیر نو ہوتا ہے یہ تعطل اور جمود کو ختم کر کے ترقی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

برِصغیر میں انتخابات کا نظام نو آبادیاتی دور میں متعارف کروایا گیا۔ نمائندہ اداروں کے قیام کے لیے قانونی اصلاحات کی گئیں۔ باوجودیکہ انتخابات کا نظام رائج ہو گیا برصغیر کے عوام کو ہمہ گیر رائے دہندگی (Universal Franchise) کے حقوق نہ دیئے گئے۔ 1909 کی منٹو مارلے اصلاحات، 1919 کی مانٹیگو چمسفورڈ قانونی اصلاحات اور 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا قانون نے برصغیر کے عوام کو محدود حقِ رائے دہی دیا۔ چند لوگ جو صاحب جائیداد اور ٹیکس گزار تھے اُن کو حق رائے دہی دیا گیا۔ ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کے بعد ہمہ گیر رائے دہندگی (Universal Franchise) کے اصول کو اپنایا گیا۔

چونکہ تقسیم کے بعد ایک لمبے عرصے تک پاکستان اپنا آئین نہ بنا سکا اس لیے 23 سال تک عام انتخابات نہ ہو سکے۔ محلاتی سازشوں، نوکر شاہی کے جوڑ توڑ اور مارشل لاء کی وجہ سے آئین بنانے میں رکاوٹ رہی جس کی وجہ سے پاکستان کے لوگ 23 سال تک اپنے نمائندے نہ چن سکے۔ متواتر عدالتی کاروائی کے ذریعے سیاسی و سول حکومتوں کی برطرفی نے بھی انتخابات کے انعقاد میں رکاوٹ ڈالے رکھی۔ اگرچہ ملک کا پہلا آئین 1956ء میں نافذ ہو گیا لیکن پھر بھی انتخابات کا انعقاد ممکن نہ ہو سکا کیونکہ 1956ء کے آئین کے تحت پارلیمانی نظام مضبوط بنیادوں پر اُستوار نہ کیا جا سکا۔ یہ صورتِ حال 1958 تک قائم رہی جب کہ ایوب خان نے پہلا مارشل لاء لگایا۔

پاکستان میں انتخابی اور جمہوری سیاست شانہ بہ شانہ چلتی رہی ہے۔ مسلسل فوجی مداخلت، جابرانہ کلچر اور قومی معاملات پر اتفاق رائے کا نہ ہونا وہ عوامل ہیں جنہوں نے جمہوری اقدار کے فروغ میں رکاوٹ ڈالے رکھی۔ یہ قوم کی بدنصیبی ہے کہ شروع ہی سے منصفانہ انتخابات کا انعقاد ممکن نہ ہو سکا۔ 1951 کے صوبائی انتخابات میں دھاندلی اور لفظ ''جھرلو'' متعارف ہوا۔ اس وقت سے شاید ہی کوئی انتخابات شفاف اور منصفانہ ہوئے ہوں جن میں دھاندلی کے الزامات نہ لگائے گئے ہوں۔ مشرقی پاکستان کے دوسرے انتخابات میں حکمران جماعت مسلم لیگ کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کے وزیرِ اعلیٰ نورالامین کو نیشنلسٹ جگتو فرنٹ کے ہاتھوں شکست سے دو چار ہونا پڑا۔

پاکستان کی انتخابی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے انتخابی نظام کی مخصوص خصوصیت یہ ہے کہ انتخابات کبھی بھی وقت پر اور جب ہونے چاہئیں تھے نہ ہوئے۔ انتخابی سیاست کا پہلا دور 58-1947 میں شروع ہوا۔ اس دوران پاکستان میں دو قانون ساز ادارے تھے جس میں سے ایک آزادی سے پہلے منتخب ہوا اور دوسرا آزادی کے بعد جب پاکستان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا۔ دو اسمبلیوں کو صوبائی اسمبلیوں کے اراکین نے بالواسطہ طریقے سے منتخب کیا۔ صوبائی اسمبلیوں کے اراکین بلاواسطہ طریقے سے بالغ رائے دہی کے اصول کی بنیاد پر آزادی کے بعد منتخب کیے گئے۔

دوسرے دور کے درمیان مقامی حکومتیں جنہیں بنیادی جمہوریت کہا جاتا ہے کے انتخابات کروائے گئے۔ یہ انتخابات 1962 اور 1965 میں ہوئے۔ ان کے بعد مشرقی ومغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 1962 اور 1965 میں کروائے گئے۔

انتخابات کا تیسرا دورانیہ 77-1970 میں ملک ٹوٹنے کے بعد شروع ہوا۔ 1970 کے انتخابات پہلے پارلیمانی انتخابات تھے جو جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے دوران کروائے گئے۔ 1970 کے انتخابات ملک کے اتحاد کے لیے بدشگون ثابت ہوئے اور بالاخر ملک کا مشرقی حصہ بقیہ ملک سے علیحدہ ہو گیا اور بنگلہ دیش کی آزاد اور خودمختار ریاست کی شکل میں دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔ 1970 کے انتخابات کے تحت بقیہ اراکین جو کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے پاکستان کی قومی اسمبلی بنے۔ اسمبلی پانچ سال کے لیے قائم کی گئی۔ اسی اسمبلی نے 1973 کا آئین منظور کیا جس کے بعد اسمبلی کی مدت شروع ہوئی۔

پاکستان کی انتخابی سیاست کا چوتھا دور 1985 میں غیر جماعتی انتخابات کے ساتھ شروع ہوا۔ غیر جماعتی انتخابات جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران کروائے گئے۔ یہ دور 1999 میں ختم ہوا جب جنرل پرویز مشرف نے چوتھا مارشل لاء لگایا۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران مقامی حکومتوں کے تین انتخابات 1979، 1983 اور 1987 میں کروائے گئے۔ چوتھے دورانیے کے دوران پانچ انتخابات قومی اسمبلی اور پانچ انتخابات صوبائی اسمبلیوں کے 1985، 1988، 1990، 1993 اور 1997 میں کروائے گئے۔

پانچواں اور آخری دور مارچ 2002 میں صدارتی ریفرنڈم کے ساتھ شروع ہوا۔ اسی سال قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بھی کروائے گئے۔ صدر مشرف ریفرنڈم کے ذریعے پانچ سال کے لیے صدر چن لیے گئے۔

عام انتخابات-1970

پاکستان میں 1970 تک عام انتخابات نہ ہو سکے کیونکہ پاکستان آزادی کے بعد لمبے عرصے تک اپنا آئین بنانے میں ناکام رہا۔ 1956 میں پہلا آئین نافذ ہوا لیکن ملک میں سیاسی افراتفری اور بدعنوانی موجود رہی۔ 1958 میں پہلا مارشل لاء لگا جس کی وجہ سے سیاسی عمل متاثر ہوا۔ 1956 کا آئین معطل کر دیا گیا۔ یہ تمام عوامل انتخابات کے التوا کا باعث بنے۔

جنرل یحییٰ خان نے آزادی کے 23 سال بعد 1970 میں پہلے عام انتخابات کروائے۔ یہ انتخابات عام بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر کروائے گئے۔ اکیس سال عمر کا مرد اور عورت ان انتخابات میں ووٹ ڈال سکتے تھے۔ انتخابات کروانے کے لیے جسٹس عبدالستار کی سربراہی میں الیکشن کمیشن قائم کیا گیا۔ انتخابات مارشل لاء حکومت کی زیر نگرانی کروائے گئے۔ حکومت نے انتخابات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی اور منصفانہ طور پر انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں رجسٹرڈ ووٹوں کی کل تعداد 56,941,500 تھی جس میں سے 54.8% مشرقی پاکستان اور 45.2% مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ چوبیس سیاسی جماعتوں نے ان انتخابات میں حصہ لیا۔ انتخابات میں حصہ لینے والی سیاسی جماعتوں میں سب سے پسندیدہ جماعتیں مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ اور مغربی پاکستان سے پاکستان پیپلز پارٹی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی مقبولیت شیخ مجیب الرحمن کے علیحدگی پسند 6 نکاتی پروگرام کی وجہ سے تھی جبکہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی بھٹو کے روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے کی وجہ سے پسندیدہ جماعت تھی۔ بنگالیوں نے شیخ مجیب کے چھ نکاتی پروگرام کی بنا پر عوامی لیگ کے حق میں اجتماعی طور پر ووٹ دیا جبکہ مغربی پاکستان میں عوام نے پیپلز پارٹی کے حق میں رائے دی۔

عوامی لیگ نے انتخابات میں واضح اکثریت حاصل کی۔ قومی اسمبلی کی 300 نشستوں میں سے 160 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں عوامی لیگ نے 300 میں سے 288 نشستیں حاصل کیں۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی سب سے بڑی جماعت بن کر سامنے آئی۔ اس نے مغربی پاکستان کے لیے مختص کردہ 138 نشستوں میں سے 81 نشستیں حاصل کیں۔

1970ء کے انتخابات پر دھاندلی کے الزامات نہیں لگے کیوں کہ اِن کے نتائج جنرل یحییٰ خان کے لیے حیران کن اور غیر متوقع تھے۔ جنرل یحییٰ خان کا یہ خیال تھا کہ تمام جماعتیں تھوڑی نشستیں جیت لیں گی جس کی وجہ سے کوئی ایک جماعت حکومت نہ بنا سکے گی۔ لہٰذا اُس نے انتخابات میں دخل اندازی نہ کی اور انتخابات کو بغیر کسی رکاوٹ کے ہونے دیا۔

چونکہ دونوں سیاسی جماعتیں جنہوں نے انتخابات جیتے اپنے اپنے علاقوں کی نمائندگی کرتی تھیں اس لیے ان کے درمیان اقتدار میں حصہ کے لیے شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ مارشل لاء حکومت اور پیپلز پارٹی نے انتخابات کے نتائج کو ماننے سے انکار کر دیا۔ باوجود یکہ عوامی لیگ نے انتخابات میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کر لی تھیں لیکن پھر بھی اُسے حکومت بنانے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس سے ملک میں وسیع پیمانے پر سیاسی بحران پیدا ہوا جو کہ خانہ جنگی کا باعث بنا۔ بنگالیوں نے فوج اور پیپلز پارٹی کی اُنہیں اقتدار سے پرے رکھنے کی کوششوں پر سخت ردِعمل کا اظہار کیا اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں فوج کو امن و امان بحال کرنے کے لیے قدم اٹھانا پڑا۔ فوج نے سخت اقدام کرتے ہوئے شرپسندوں کو گرفتار کر لیا۔ حکومت کی مشینری بے اثر ہوگئی۔ بالآخر ہندوستان نے اپنی سرحدوں کی حفاظت کا بہانہ بناتے ہوئے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور اس طرح 1971 میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس طرح ملک کے پہلے عام انتخابات ملک کے ٹوٹنے کا رستہ بنا کے ختم ہو گئے۔

عام انتخابات- 1977

ملک کے دوسرے عام انتخابات سال 1977 کے وسط میں کروانے کا پروگرام تھا۔ لیکن اُس وقت کے وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو نے انتخابات پہلے کروانے کا اعلان کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنی ملک گیر سیاسی حیثیت اور ہر دلعزیزی کی بنا پر اپنے سیاسی حریفوں کو حیران کرنا چاہتے تھے۔ دوسری سیاسی جماعتوں نے انتخابات کی تاریخ پہلے کرنے پر بہت واویلا مچایا اور کہا کہ اُنہیں اپنی انتخابی مہم کو مؤثر طریقے سے چلانے کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ انتخابات مارچ، اپریل 1977ء کو ہوئے۔ بھٹو نے اپنی انتخابی مہم میں نمایاں سیاست دانوں کو استعمال کیا۔ ان انتخابات کے دوران رجسٹرڈ ووٹوں کی تعداد 30,989,052 تھی۔

ملک کی نو بڑی جماعتوں نے پاکستان نیشنل الائنس کے نام سے سیاسی اتحاد قائم کیا۔ پاکستان نیشنل الائنس جس کے نمایاں راہنماؤں میں مولانا مفتی محمود، مولانا مودودی، اصغر خان اور عبدالولی خان شامل تھے کا کوئی معاشی پروگرام نہ تھا۔ ان کا واحد مقصد ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار سے الگ کرنا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے انتخابات میں صفایا کر دیا۔ اس نے قومی اسمبلی کی 200 میں سے 155 نشستیں جیت لیں۔ پاکستان نیشنل الائنس صرف 36 نشستیں جیت سکا۔

1977 کے انتخابات میں حکمران جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کے حق میں نتائج حاصل کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر دھاندلی کی گئی۔ دھاندلی کے خلاف ملک میں سخت احتجاج ہوا اور پی این اے نے حکومت کے خلاف جارحانہ تحریک شروع کی۔ پی این اے نے وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو پر پی این اے کی انتخابات میں جیت کو روکنے کے لیے دھاندلی میں ملوث ہونے کے الزامات لگائے۔ ملک گیر احتجاج کی وجہ سے حکومت مفلوج ہوگئی۔ پی این اے نے یہ دعویٰ کیا کہ اُن تمام پولنگ سٹیشنوں پر جہاں پی این اے مضبوط تھی پولنگ نہیں ہونے دی گئی۔ اس نے یہ بھی الزام لگایا کہ انتخابات کے نتائج براہِ راست وزیرِاعظم کے دفتر سے جاری کیے گئے۔

پی این اے کی تحریک کی وجہ سے ملک میں امن و امان کی صورتِ حال ابتر ہوگئی۔ بالآخر ملکی صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے فوج نے اقدام کا فیصلہ کیا۔ فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا تاکہ بگڑتی ہوئی امنِ عامہ کی صورتِ حال کو مزید

خراب ہونے سے روکا جا سکے۔ مارشل لاء 5 مئی 1977 کو لگایا گیا اور ذوالفقار علی بھٹو کو حفاظتی تحویل میں لے کر مری میں نظر بند کر دیا گیا۔

ضیاء کا یہ خیال تھا کہ انتخابات میں دھاندلی کی گئی تھی اور نتائج وزیر اعظم کے دفتر سے اُن کے مرضی کے مطابق جاری کیے گئے۔ تاہم بھٹو کے خلاف دھاندلی کے الزامات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی غیر جانبدارانہ تحقیقات نہ کروائی گئی۔ دو سال کے بعد بھٹو کو ایک کیس میں ملوث کر کے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ بھٹو کو راستے سے ہٹانے کے بعد ضیاء الحق نے گیارہ سال ملک پر حکومت کی۔ اس دوران 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات کروائے اور قوم سے شفاف، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ عام انتخابات کروانے کے کئی وعدے کیے لیکن یہ وعدے ایفا نہ ہو سکے اور ضیاء الحق 1988 میں بہاولپور کے نزدیک ایک ہوائی حادثے میں اپنے متعدد ہم سفر اعلیٰ فوجی افسروں اور امریکی سفیر کے ساتھ جاں بحق ہو گئے۔

عام انتخابات- 1988

مئی 1988 میں ایک الم ناک ہوائی حادثے میں ضیاء کی موت کے بعد غلام اسحاق خان ملک کے صدر بنے۔ صدارت سنبھالتے وقت غلام اسحاق خان نے یہ اعلان کیا کہ ملک میں منصفانہ اور قابلِ یقین انتخابات کروانا اُن کی پہلی ترجیح ہوگی۔ اپنے وعدے کے مطابق غلام اسحاق خان نے 16 نومبر 1988 کو اگلے عام انتخابات منعقد کروائے۔ ان انتخابات میں رجسٹرڈ ووٹرز کی تعداد 417، 194، 46 اور ڈالے گئے ووٹوں کی تعداد 19,902,706 تھی۔

اِن انتخابات میں دس نمایاں سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔ بے نظیر بھٹو نے جو انتخابات سے دو سال قبل ملک واپس آ گئی تھیں اپنی جماعت پیپلز پارٹی کے ساتھ انتخابات میں حصہ لیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے واضح اکثریت کے ساتھ انتخاب جیت لیا۔ نواز شریف کی زیر قیادت مذہبی اور اعتدال پسند سیاسی جماعتوں کے اتحاد اسلامی جمہوری الائنس کو واضح طور پر شکست ہوگئی۔ انتخابات کے نتائج غیر متوقع اور غیر یقینی تھے۔ حسبِ معمول ہارنے والی جماعتوں نے دھاندلی کے الزامات لگائے۔

پارلیمنٹ میں اکثریتی جماعت پیپلز پارٹی کی سربراہ بے نظیر بھٹو کسی بھی اسلامی ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم بنیں۔ بے نظیر بھٹو صرف دو سال تک حکومت کر سکیں۔ بے نظیر بھٹو اور صدر غلام اسحاق خان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کو غلام اسحاق خان نے آئین کی شق 58(2)B کو استعمال کرتے ہوئے 1990 میں بدعنوانی، اختیارات کے بے جا استعمال اور بدانتظامی کے الزامات کے تحت برطرف کر دیا۔

عام انتخابات- 1990

بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد اگلے عام انتخابات 29 اکتوبر 1990 کو ہوئے۔ ان انتخابات میں رجسٹرڈ ووٹروں کی تعداد 330، 47،065 تھی۔ اِن انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی اور اسلامی جمہوری اتحاد دو بڑی جماعتیں انتخابات میں حصہ لے رہی تھیں۔

بے نظیر بھٹو اور نواز شریف ایک دوسرے کے خلاف صف آراء تھے۔ بدعنوانی کے الزامات کی وجہ سے پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں کمی آ گئی تھی۔ جیسا کہ ظاہر تھا اسلامی جمہوری اتحاد انتخابات میں جیت گئی۔ پیپلز پارٹی کو صرف 62 نشستیں مل سکیں۔ نواز شریف ملک کے وزیر اعظم بنے۔ ہارنے والی جماعت پیپلز پارٹی نے اپنی ہار کو انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی سے منسوب کیا۔ بیرونی ذرائع ابلاغ نے بھی انتخابات میں دھاندلی کی نشان دہی کی۔ باوثوق ذرائع کے مطابق IJI کو انتخابات میں دھاندلی کرنے کے لیے 101

ملین پونڈ دیئے گئے۔

فوج اور IJI میں مفاہمت کی بنا پر انتخابات میں IJI کی جیت کو فوج کے ملوث ہونے سے منسوب کیا گیا۔ IJI کی حکومت تھوڑا عرصہ قائم رہی اور صدر غلام اسحاق خان نے ایک دفعہ پھر بدعنوانی کے الزامات لگاتے ہوئے IJI کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ اگرچہ نواز شریف کی حکومت کو چھ ہفتوں میں سپریم کورٹ نے بحال کر دیا لیکن پھر بھی نواز شریف نے رضاکارانہ طور پر حکومت چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور استعفیٰ دے دیا۔

عام انتخابات 1993

نواز شریف کی حکومت کی برطرفی کے بعد معین قریشی درمیانی مدت کے لیے وزیراعظم بنے۔ اگلے انتخابات اکتوبر 1993ء میں کروائے گئے۔ شرح پیدائش کے بڑھ جانے سے رجسٹرڈ ووٹروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پیپلز پارٹی ایک دفعہ پھر عوام میں بہت مقبول تھی اور انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کی حیثیت میں تھی۔ پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی کی 207 میں سے 89 نشستیں حاصل کیں۔

ایک دفعہ پھر دھاندلی کے الزامات لگائے گئے۔ چونکہ پیپلز پارٹی کی جیت متوقع تھی اس لیے دھاندلی کے الزامات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بے نظیر بھٹو دوبارہ مسندِ اقتدار پر فائز ہوئیں۔ لیکن پھر اُن کی حکومت کو بدعنوانی اور بدانتظامی کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس وقت کے صدر فاروق احمد خان لغاری نے آٹھویں ترمیم کے تحت دیئے گئے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتے ہوئے بے نظیر کی حکوت کو ختم کر دیا۔

عام انتخابات 1997

عام انتخابات 3 فروری 1997 کو کروائے گئے۔ اِن انتخابات میں رجسٹرڈ ووٹوں کی کل تعداد 538، 189، 54 تھی۔ نو سیاسی جماعتوں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ اِس دفعہ پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) سب سے نمایاں جماعتیں تھیں۔

پاکستان مسلم لیگ (ن) نے انتخابات میں بے مثال کامیابی حاصل کی۔ پیپلز پارٹی نے دھاندلی کے الزامات لگاتے ہوئے نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) نے 137 نشستیں حاصل کیں جبکہ پیپلز پارٹی صرف 18 نشستیں جیت سکی۔

نواز شریف کو 1997 کے انتخابات میں بھاری مینڈیٹ ملا جس کی پاکستان کی تاریخ میں پہلے کوئی مثال نہ تھی۔ ہارنے والی جماعتوں نے دعویٰ کیا کہ انتخابات میں دھاندلی کی گئی۔ بھاری مینڈیٹ کی وجہ سے نواز شریف ملک کے سماجی و اقتصادی شعبوں کو سدھارنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے سیاسی نظام کی بہتری کے لیے بھی اقدامات کیے۔ انہوں نے حکومت اور قومی اداروں کی شفاف اور متوازن کارکردگی کے لیے متعدد آئینی ترامیم متعارف کروائیں۔ سب سے پہلے نواز شریف بدنامِ زمانہ آٹھویں ترمیم کی شق 58(2)B کو حذف کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ نواز شریف یہ سمجھتے تھے کہ مذکورہ آئینی شق صدر اور وزیراعظم کے تعلقات کے درمیان بہت بڑی رکاوٹ ہے اور سیاسی نظام کی ترقی کو روکنے کا باعث ہے۔ آٹھویں ترمیم نے ''ترجیحی احتساب'' (Selective Accountability) کو متعارف کروایا تھا جس کی وجہ سے سیاسی نظام کے فروغ پر بہت زد پڑی تھی۔ اِس کے بعد نواز شریف نے چودھویں آئینی ترمیم منظور کروائی جس سے وفاداری تبدیل کرنے (Floor Crossing) پر پابندی لگا دی گئی۔

نواز شریف نے اقتصادی بہتری کے لیے پروگرام کا آغاز کیا۔ انہوں نے جنوبی ایشیا کی سب سے لمبی موٹروے تعمیر کروائی اُن کے دور میں پاکستان نے ایٹم بم کا دھماکا کیا۔ نواز شریف نے بیرونی قرضوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ''قرض اتارو ملک سنوارو'' پروگرام شروع کیا جس کا مقصد ملک کو بیرونی قرضوں سے چھٹکارہ حاصل کرنا تھا۔

بھاری مینڈیٹ اور 58(2)B کے ختم ہو جانے کے بعد نواز شریف سیاسی طور پر بہت مضبوط و مستحکم ہو گئے۔ ان کے ظاہری طور طریقوں میں حد سے زیادہ خود اعتمادی جھلکنے لگی اور انہوں نے اپنے طریقِ کار میں آمرانہ انداز اپنا لیا۔ اُنہوں نے مطلق العنان رویّہ اپنا لیا اور کئی اقدامات کیے جس سے اُن کا زوال شروع ہو گیا اُنہوں نے فوج کے سربراہ جنرل جہانگیر کرامت کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کیا اور اُنہیں جبری طور پر استعفیٰ دینے پر مجبور کیا۔ جنرل جہانگیر کرامت نے اپنے ایک بیان میں قومی سلامتی کونسل بنانے کا مشورہ دیا تھا جس کی وجہ سے نواز شریف سخت ناراض ہو گئے۔ اُنہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کو فوری طور پر آرمی چیف کا عہدہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے کارگل کاروائی کی بنا پر جنرل پرویز مشرف کو بھی آرمی چیف کے عہدے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ جب جنرل پرویز مشرف سری لنکا کے سرکاری دورے پر گئے ہوئے تھے تو اُن کی غیر حاضری میں دوسرے جنرل کو آرمی چیف مقرر کر دیا گیا۔ جس جہاز میں جنرل پرویز مشرف ملک واپس آ رہے تھے اُسے کسی بھی ہمسایہ ملک میں اُترنے کا حکم دیا گیا تا کہ نئے آرمی چیف کو اپنا عہدہ سنبھالنے کا وقت مل سکے لیکن پرویز مشرف کے فوجی رفقاء کی بروقت مداخلت سے یہ سانحہ ٹل گیا۔

نتیجتاً آرمی چیف جنرل پرویز مشرف نے 12 نومبر 1999 کو نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ اُنہوں نے چیف ایگزیکٹو کا عہدہ سنبھالا اور نواز شریف پر بدعنوانی اور بدانتظامی کے الزامات لگائے۔

اقتدار سنبھالنے کے بعد جنرل پرویز مشرف نے نئے انتخابات کروانے کا وعدہ کیا اُن کا خیال تھا کہ حقیقی جمہوریت لانے کے لیے قومی زندگی کے تمام پہلوؤں کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اُنہوں نے متنازعہ آئینی ترمیم 58(2)B کو دوبارہ زندہ کر کے اسمبلی کو بحال کرنے کے اختیارات حاصل کر لیے۔ اس کے لیے اُنہوں نے لیگل فریم ورک آرڈر جاری کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ اختیار اُن کو سپریم کورٹ نے عطا کیا جب اعلیٰ عدالت نے اُن کے اقتدار سنبھالنے کے اقدام کو جائز قرار دیا تھا۔

عام انتخابات-2002

جب نواز شریف کی حکومت کو برطرف کیا گیا تو جنرل پرویز مشرف نے طریقِ حکمرانی میں ضروری تبدیلیاں کر کے نئے انتخابات کروانے کا وعدہ کیا۔ اپنے وعدے کے مطابق جنرل پرویز مشرف نے اگلے انتخابات 10 اکتوبر 2002ء کو کروائے۔ تین سالہ فوجی حکومت کے بعد جمہوریت کی بحالی کا موقعہ آ گیا تھا جس سے پرویز مشرف اور حکومت کے دوسرے اراکین پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ 2002 کے انتخابات میں رجسٹرڈ ووٹروں کی تعداد 72 ملین تھی۔ ان انتخابات کے لیے رائے دہندہ کی عمر 18 سال مقرر کی گئی جس سے ووٹروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

2002 کے انتخابات اس لحاظ سے تمام انتخابات سے مختلف تھے کہ اس دفعہ تقریباً 70 سیاسی جماعتیں انتخابات میں حصہ لے رہی تھیں۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) پہلی مرتبہ انتخابات میں حصہ لے رہی تھی۔ دوسری نمایاں جماعتوں میں پی ایم ایل (ن) پیپلز پارٹی اور مذہبی جماعتوں کا اتحاد متحدہ مجلسِ عمل شامل تھیں۔

پاکستان مسلم لیگ (ق) نے قومی اسمبلی کی 126 نشستیں حاصل کیں۔ پی پی پی کو 81 نشستیں ملیں۔ متحدہ مجلسِ عمل 49 نشستوں کے ساتھ تیسری بڑی جماعت بن کر اُبھری۔

حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ انتخابات شفاف، آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں گے۔ پھر بھی ہارنے والی جماعتوں نے حکومت پر انتخابات میں دھاندلی کے الزامات لگائے۔

بلوچستان کے میر ظفر اللہ خان جمالی کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ بلوچستان جیسے پسماندہ صوبے کے ایک سیاست دان حکومت کے اعلیٰ عہدے تک پہنچے۔ لیکن بدقسمتی سے جمالی پارٹی سیاست اور سازشوں کا شکار ہوئے اور دو سال بعد ہی اُنہیں وزیر اعظم کے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔

عام انتخابات- 2008

2008 کے عام انتخابات 18 فروری 2008 کو منعقد ہوئے۔ اس سے پہلے انتخابات کی تاریخ 8 جنوری 2008 مقرر کی گئی لیکن پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو کے قتل کی وجہ سے انتخابات موخر کرنا پڑے۔

اِن انتخابات میں متعدد سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا جن میں پی پی پی، پی ایم ایل (ن)، پی ایم ایل (ق) ایم ایم اے، اے این پی اور پی ایم ایل (ف) شامل تھیں۔ اس دفعہ آزاد امیدواروں کی تعداد پہلے سے بہت زیادہ تھی۔ جماعتِ اسلامی، تحریکِ انصاف اور پختون خواہ ملی پارٹی نے پرویز مشرف کے انتخاب کے خلاف بطورِ احتجاج انتخابات کا مقاطعہ کیا۔ انتخابات کا بائیکاٹ کرنے والوں نے پرویز مشرف سے مستعفی ہونے اور بحالیِ جمہوریت کا مطالبہ کیا۔

ستمبر 2007 میں لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک سیاسی جلسے کے دوران پی پی پی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا۔ اس سانحے نے پوری قوم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ بے نظیر بھٹو کے قتل سے انتخابات سے پہلے ہی سیاسی خلاء پیدا ہو گیا جسے پُر کرنا انتہائی مشکل نظر آتا تھا۔ اس ظالمانہ اقدام پر ملک گیر احتجاج نے سماجی زندگی اور حکومت کی بنیاد کو ہلا کے رکھ دیا۔ بے نظیر کے قتل کے باوجود پی پی پی نے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا۔ پی پی پی نے فروغِ جمہوریت کے لیے فوجی آمریت کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔ پی ایم ایل (ن) کے قائد نواز شریف نے پی پی پی کی تقلید کرتے ہوئے انتخابات لڑنے کا اعلان کیا۔ نواز شریف نے پی ایم ایل (ق) کا مقابلہ کرنے اور انہیں شکست دینے کے لیے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔

انتخابات کے نتائج پی ایم ایل (ق) کے لیے غیر متوقع اور انتہائی حیران کن تھے۔ حکومتی جماعت پی ایم ایل (ق) کے تمام سرکردہ اور نمایاں امیدوار بری طرح شکست سے دو چار ہوئے۔ پاکستان کے عوام نے صاف اور آزادانہ انتخابات میں جنرل پرویز مشرف اور اُن کے رفقاء کے خلاف فیصلہ دیا اور پی ایم ایل (ن) اور پی پی پی کو دھوم دھام سے فتح سے ہمکنار کیا۔

پی ایم ایل (ق) کی شکستِ فاش ناقابلِ یقین تھی کیونکہ چودھری برادران یعنی چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی اپنے آبائی حلقوں سے اپنی نشستیں نہ جیت سکے۔ ان کے علاوہ پی ایم ایل (ق) کے دوسرے نمایاں امیدوار جو انتخابات نہ جیت سکے اُن میں چودھری امیر حسین، سابقہ سپیکر قومی اسمبلی، سابق سپیکر حامد ناصر چٹھہ، سابق وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری، ڈاکٹر شیر افگن نیازی، لیاقت جتوئی اور شیخ رشید شامل ہیں۔ مذہبی جماعتوں کو بھی اسلامی نظام متعارف کروانے میں ناکامی کی بنا پر انتخابات میں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ صوبۂ سرحد کی اہم جماعت عوامی نیشنل پارٹی قومی وصوبائی اسمبلی کی نشستیں جیت کر بہ بانگِ دہل دوبارہ سے ملک کے سیاسی نظام میں واپس آئی۔ عوامی نیشنل پارٹی نے مولانا فضل الرحمٰن کو واضح برتری سے شکست دی۔ متحدہ قومی موومنٹ واحد مشرف کی حامی جماعت تھی جو قومی وسندھ صوبائی اسمبلی میں نشستیں جیت سکی۔

پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کی اور پنجاب اسمبلی میں اس کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ سندھ صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد پیپلز پارٹی نے تمام مدِ مقابل جماعتوں کو شکست فاش دی۔

پی ایم ایل (ن) نے انتخابات میں اپنی حیران کن کامیابی سے ہر کسی کو چکرا کے رکھ دیا۔ اس نے مرکزی اور شمالی پنجاب اور بڑے شہروں میں انتخابات میں تقریباً جھاڑو پھیر دیا۔ پی پی، پی ایم ایل (ن) اور عوامی نیشنل پارٹی نے مل کر قومی اسمبلی کی مطلوبہ 2/3 اکثریت 171 نشستیں حاصل کر لیں۔

تمام ملک میں پولنگ پرامن رہی۔ 1970 کے عام انتخابات کے بعد 2008 کے انتخابات دھاندلی کے الزامات سے مبرا اور غیر جانبدارانہ اور شفاف ثابت ہوئے۔ بیرونی ذرائع ابلاغ نے بھی انتخابات کے شفاف اور غیر جانبدارانہ ہونے پر حکومت کی تعریف کی۔ کئی ممالک کے سفیروں نے راولپنڈی و اسلام آباد میں پولنگ کی کارروائی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ انہوں نے پولنگ سٹیشنوں پر تعینات عملے، رائے دہی کا عمل اور حفاظتی انتظامات کی تعریف کی۔ سفیروں نے اس امید کا اظہار کیا کہ آزادانہ اور شفاف انتخابات سے پاکستان میں نہ صرف خوشحالی کی لہر اُٹھے گی بلکہ جمہوریت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

الیکشن کمشن نے 18 فروری 2008 کے انتخابات کے نتائج کا باقاعدہ اعلان کیا۔ 41 قومی و صوبائی حلقوں کے نتائج تکنیکی وجوہات کی بنا پر روک لیے گئے۔ قومی اسمبلی کی 272 نشستوں میں سے 258 کے نتائج کا اعلان کیا گیا۔ صوبائی اسمبلی کی 27 نشستوں کے نتائج کا اعلان کیا گیا۔ ذیل میں دیئے گئے ٹیبل میں صوبائی و قومی حلقوں کے نتائج کی تفصیل دی جا رہی ہے۔

Table

Partywise NA Results

PPP	PML(N)	PML(Q)	MQM	MMA	ANP	PML(F)	Others	Independents	Total
87	66	38	19	3	10	4	4	27	258

Partywise Punjab PA Results

PPP	PML(N)	PML(Q)	MQM	MMA	ANP	PML(F)	Others	Independents	Total
78	101	66	0	2	0	3	0	35	285

Partywise NWFP PA Results

PPP	PML(N)	PML(Q)	MQM	MMA	ANP	PML(F)	Others	Independents	Total
17	5	6	0	9	31	0	5	18	91

Partywise Sindh PA Results

PPP	PML(N)	PML(Q)	MQM	MMA	ANP	PML(F)	Others	Independents	Total
65	0	9	38	0	2	3	7	1	125

Partywise Balochistan PA Results

PPP	PML(N)	PML(Q)	MQM	MMA	ANP	PML(F)	Others	Independents	Total
7	0	17	0	6	1	0	5	10	46

2008ء کے عام انتخابات کے بعد پاکستان کا سیاسی منظر نامہ

2008 کے عام انتخابات 18 فروری 2008 کو کروائے گئے۔ اس سے پہلے یہ انتخابات 8 جنوری 2008 کو ہونے تھے لیکن بے نظیر بھٹو کے قتل کی وجہ سے انتخابات ملتوی کرنا پڑے۔

ملک کی تقریباً تمام سیاسی جماعتوں نے اِن انتخابات میں حصہ لیا جن میں مسلم لیگ (ن) پی پی پی، پاکستان مسلم لیگ (ق) اے این پی جے یو آئی (ف) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے آزاد امیدواروں نے بھی انتخابات میں حصہ لیا۔ جماعت اسلامی، تحریکِ انصاف اور پختون خواہ ملی پارٹی نے پرویز مشرف کی وجہ سے احتجاجاً انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔

انتخابات کا اعلان ہوتے ہی ملک کا سیاسی منظر یک دم بدل گیا اور سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ حزبِ مخالف کی جماعتوں نے پرویز مشرف کے خلاف انتہائی سخت رویہ اختیار کیا اور ان سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ مشرف اپنی جماعت پاکستان مسلم لیگ (ق) کو جتوانے کے لیے انتخابات میں ضرور دھاندلی کریں گے اس لیے وہ انتخابات کا مقاطعہ کریں گے۔ حزبِ مخالف نے عدلیہ کی بحالی اور مشرف سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کیا۔

بے نظیر بھٹو کے قتل کی وجہ سے انتخابات سے قبل سیاسی خلاء پیدا ہو گیا۔ بے نظیر بھٹو کے قتل کے باوجود پیپلز پارٹی نے آمریت کو ختم اور جمہوریت کو فروغ دینے کے لیے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔

انتخابات سے قبل پی ایم ایل (ن) کے جلاوطن راہنما نواز شریف اور اُن کے بھائی شہباز شریف ملک واپس آ گئے۔ انہوں نے بھی فوجی آمریت کو جڑ سے اُکھاڑنے اور جمہوریت کو مضبوط کرنے کا اعلان کیا۔

نواز شریف اور شہباز شریف کے واپس آنے پر ملک میں سیاسی جذبات میں تیزی آئی جو پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ عوام نے مسلم لیگ (ن) کے راہنماؤں کا والہانہ استقبال کیا جنہوں نے نو سال کے لمبے عرصے تک پرویز مشرف کے ہاتھوں جلاوطنی اور سیاسی اقتدار سے محرومی برداشت کی۔

پاکستان میں قدم رکھتے ہی نواز شریف نے پرویز مشرف کے خلاف تحریک شروع کی۔ انہوں نے صدر پر نکتہ چینی اور لعنت ملامت کرنے کے لیے انتہائی سخت لب ولہجہ اختیار کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ یا تو اقتدار سے دستبردار ہو جائیں یا پھر نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔ اس سے قبل مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی نے 14 مئی 2006 کو لندن میں ''میثاقِ جمہوریت'' کے معاہدے پر دستخط کیے۔ میثاقِ جمہوریت کا معاہدہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان طے پایا تھا جس کا مقصد پرویز مشرف کو اقتدار سے علیحدہ کرنا تھا۔ بدقسمتی سے بے نظیر بھٹو 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک سیاسی جلسے میں قتل ہو گئیں جس کی وجہ سے ملک میں شدید سیاسی بحران پیدا ہوا۔

انتخابات کے نتائج غیر متوقع تھے۔ بالخصوص پاکستان مسلم لیگ (ق) کے لیے نتائج اِنتہائی ذلت آمیز تھے جس کے تمام سرکردہ امیدواروں کو خفت آمیز شکست سے دو چار ہونا پڑا۔ صوبۂ پنجاب میں مسلم لیگ (ن) نے اکثریت سے انتخاب جیت لیا۔ پیپلز پارٹی نے تین صوبوں یعنی پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں نشستیں حاصل کیں۔ صوبۂ سرحد میں اے این پی بڑی فاتح جماعت بن کر اُبھری۔ ایم کیو ایم نے سندھ میں نشستیں جیتیں۔ عوام نے پرویز مشرف اور ان کے قریبی ساتھیوں کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا۔ انہوں نے مشرف کی پالیسیوں کو مسترد کر دیا اور دوسری جماعتوں کے حق میں فیصلہ دیا۔

انتخابات جیتنے کے بعد نواز شریف نے زیادہ سخت رویہ اختیار کیا اور برملا یہ اعلان کیا کہ ان کی جماعت کسی بھی صورت میں پرویز مشرف کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ اُنہوں نے پرویز مشرف سے مطالبہ کیا کہ چونکہ وہ ایک غیر آئینی صدر ہیں اس لیے اقتدار سے دستبردار ہو جائیں۔ نواز شریف نے برطرف ججوں کی فوری بحالی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اتحاد میں شامل ہونے کے لیے ججز بحالی کی لازمی شرط عائد کی اور کہا کہ وہ اسی وقت اتحاد میں شامل ہوں گے جبکہ برطرف شدہ جج بحال ہوں گے۔ لیکن نواز شریف کی دھمکی آمیز تقاریر نے کوئی اثر نہ دکھایا۔ آصف علی زرداری نے ججوں کی بحالی کے راستے میں آئینی اور قانونی رکاوٹوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ صرف پارلیمنٹ ہی ججوں کی بحالی کر سکتی ہے۔ انہوں نے صاف طور پر یہ اعلان کیا کہ عوام نے ان کی پارٹی کے حق میں ججوں کی بحالی کے لیے ووٹ نہیں دیئے بلکہ اپنے مسائل کے حل کے لیے پیپلز پارٹی کے حق میں ووٹ دیئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اُن کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ عوام کے معاشی مسائل ہیں اور غربت زدہ لوگوں کی معاشی مشکلات کو دور کرنا اُن کی اولین کوشش ہوگی تاکہ بھوک اور بیماری سے غریب عوام کو چھٹکارا دلایا جا سکے۔

مرکز میں مخلوط حکومت قائم کی گئی جس میں مسلم لیگ (ن)، پیپلز پارٹی، اے این پی اور جے یو آئی (ف) شامل تھیں۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی نے پنجاب میں حکومت قائم کی۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم نے سندھ میں حکومت قائم کی۔ حکومتوں کے قیام کے موقعہ پر آصف علی زرداری نے ایک دفعہ پھر ججوں کی بحالی کا اعادہ کیا اور کہا کہ پارلیمنٹ کے ذریعے ججز کو بحال کر دیا جائے گا۔

زرداری کے ججوں سے متعلق بیان نے ملک کے سیاسی حلقوں میں اضطراب کی لہر دوڑا دی۔ زرداری کے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پرویز مشرف کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

لیکن عوام یہ چاہتے تھے کہ پرویز مشرف جلد از جلد دستبردار ہو جائیں۔ عدلیہ کے بارے زرداری کے بیان سے سب سے زیادہ نواز شریف کو مایوسی ہوئی کیونکہ نواز شریف نے اپنی سیاسی مہم کی بنیاد ججوں کی بحالی پر رکھی تھی اور زرداری کا ججوں کے معاملے پر اپنے عہد سے ہٹ جانے کا مطلب تھا کہ نواز شریف عدلیہ بحالی کی مہم میں اکیلے رہ گئے ہیں۔

پھر بھی نواز شریف نے حوصلہ نہ ہارا اور اپنے اتحادی ساتھی کو یہ باور کرواتے رہے کہ وہ ججز کی بحالی کے معاملے پر کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ کریں گے۔ درحقیقت نواز شریف نے ججوں کی بحالی کے بعد ان کے ذریعے پرویز مشرف کو علیحدہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جو زرداری کے بیان کی روشنی میں کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔ نواز شریف نے ایک دفعہ پھر ججز بحالی کے لیے آخری تاریخ مقرر کی جس پر حسبِ معمول عمل درآمد نہ ہو سکا۔ جس پر مسلم لیگ (ن) نے وفاقی کابینہ سے اپنے وزراء کو واپس بلا لیا اور اعلان کیا کہ زرداری کے ساتھ آخری مرتبہ معاملات سلجھانے کی کوشش کریں گے۔

نواز شریف اور آصف علی زرداری نے ججوں کی بحالی کا طریقۂ کار طے کرنے اور پرویز مشرف کے مواخذے کا فیصلہ کرنے کے لیے 7 اگست 2008ء کو ملاقات کی۔ اس انتہائی اہم ملاقات سے پیشتر نواز شریف نے اپنے اتحادی ساتھیوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ججز کی بحالی اور مشرف کے مواخذے سے متعلق مثبت اور واضح نکتہ نظر اختیار کریں۔

اتحادی حکومت نے آئین کے آرٹیکل 47 کے مطابق پرویز مشرف کے مواخذے کا اعلان کیا۔ حکومت نے یہ کہا کہ اگر پرویز مشرف پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ نہیں لیتے جس کا انہوں نے سپریم کورٹ کے روبرو وعدہ کیا تھا تو آئین کے مطابق اُن کا مواخذہ کیا جائے گا۔ حکومت نے یہ اعلان کیا کہ برطرف شدہ جج اعلانِ مری کے مطابق پرویز مشرف کے مواخذے کے بعد بحال کر دیئے جائیں گے۔

مواخذہ کرنے کے لیے حکومت نے صدر مشرف کو چارج شیٹ جاری کی جس میں پرویز مشرف پر اپنے دورِ حکومت کے دوران کیے گئے بیشتر اقدامات کے حوالے سے الزامات لگائے گئے تھے۔ بعض حلقوں کا یہ خیال تھا کہ لگائے گئے الزامات مواخذے کے لیے کافی نہیں تھے جس کی وجہ سے مواخذے کی کوشش کے کامیاب ہونے کے امکانات کم تھے کیونکہ تمام الزامات قانون و آئین کے دائرے میں نہیں آتے تھے۔ ایک دفعہ مواخذے کی کارروائی شروع ہو جاتی تو الزامات کو ثابت کرنا مشکل ہو سکتا تھا۔

پھر بھی عوام نے صدر کے مواخذے کے اعلان کا خیر مقدم کیا۔ عوام نے صدر کے مواخذے کے لیے حکومت کو مبارک باد دی۔ مواخذے کی کارروائی پر متفق ہونے کو مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کی حکومت میں آنے کے بعد سب سے بڑی کامیابی قرار دیا گیا۔

بہت سارے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ 3 نومبر سے پہلے کی عدلیہ اور 1973ء کے آئین کی بحالی کی راہ میں پرویز مشرف سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ اُن کا خیال تھا اگر پرویز مشرف ہٹ جاتے ہیں تو پھر ملک میں جاری بحران خود بخود ختم ہو جائے گا۔ لوگوں کا خیال تھا چونکہ پرویز مشرف امریکہ کے سب سے بڑے حامی تھے اس لیے ملک سماجی و اقتصادی بحران کی جانب جا رہا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ موجودہ اقتصادی ترقی میں کمی پرویز مشرف کی سربراہی میں چلنے والی سابقہ حکومت کی پالیسی کا نتیجہ تھی۔ عوام یہ سمجھتے تھے کہ سابقہ حکومت نے دہشت گردی اور خودکش حملوں کو ملک میں درآمد کیا جس کی وجہ سے بیرونی سرمایہ کاری رُک گئی۔

تاہم کچھ سماجی و سیاسی حلقوں نے صدر کے مواخذے کی کامیابی کے حوالے سے اپنے خدشات کا اظہار کیا جب کہ کچھ نے مواخذے کی مخالفت بھی کی۔ حزبِ مخالف نے اعلان اسلام آباد جس میں پرویز مشرف کے مواخذے کا اعلان کیا گیا تھا کو حکومت کی جانب سے دوبئی معاہدہ اور اعلان بھوربن کی ناکامی کے بعد محض ایک رسمی کارروائی اور ڈرامہ قرار دیا۔

حزبِ مخالف نے اعلان کیا کہ اتحادی حکومت کو پرویز مشرف کے مواخذے کے لیے مطلوبہ حمایت حاصل نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اتحادی حکومت برطرف شدہ ججوں کی بحالی اور پرویز مشرف کے مواخذے کے نام پر عوام کو گمراہ کر رہی ہے۔ حزبِ مخالف نے کہا کہ عوام کو مشکلات سے نجات دلانے میں بُری طرح ناکام ہونے کے بعد حکومت نے صدر کے مواخذے کا مسئلہ کھڑا کیا تا کہ عوام کی توجہ اُن کے مسائل سے ہٹائی جا سکے۔ حزبِ مخالف کے کچھ راہنماؤں نے یہ اعلان کیا کہ وہ مواخذے کی صورت میں صدر کی حمایت کریں گے۔

چاروں صوبائی اسمبلیوں نے مشرف کے مواخذے کی منظوری کے لیے قراردادیں منظور کیں۔ صوبائی اسمبلیوں کی متفقہ قراردادوں نے صدر کے مواخذے کے لیے حکومتی اقدام کو تقویت دی۔ اس وجہ سے مشرف کی مشکلات میں اضافہ ہوا اور دستبردار ہونے کے لیے ان پر شدید دباؤ پیدا ہوا۔ اب مشرف کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ یا تو وہ مستعفی ہو جائیں یا پھر مواخذے کا سامنا کریں۔ صوبائی اسمبلیوں کی قرارداد نے مشرف کو 58 (2) b کا استعمال کرکے پارلیمنٹ کو توڑنے سے باز رکھا اور انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ اسمبلی نہیں توڑیں گے۔ مواخذے کے حق میں صوبائی اسمبلیوں کی قراردادوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں اور دوسرے سیاسی حلقوں کے لیے پرویز مشرف بطور صدر قابلِ قبول نہیں رہے تھے۔

اتحادی حکومت نے صدر کو چارج شیٹ جاری کی۔ چارج شیٹ میں مشرف کے حکومت کے دوران طرزِ عمل کے حوالے سے سات الزامات عائد کیے گئے جن سے دونوں اتحادی جماعتوں کی پرویز مشرف کے خلاف شدید نفرت اور تعصب کا اظہار ہوتا تھا۔ الزامات مندرجہ ذیل تھے۔

1- 1999ء میں آئینی طور پر منتخب نواز شریف کی حکومت کے خلاف فوجی کارروائی۔
2- 9 مارچ 2007ء کو دو دفعہ آئین کی معطلی اور عدلیہ کے خلاف جارحانہ کارروائی۔

[illegible] پاکستان [illegible] کے بارے میں اتفاق۔

[illegible] کو خطاب [illegible] این ایف سی ایوارڈ کا اعلان۔

[illegible]

3۔ صوبوں کی [illegible]

4۔ بلوچستان میں فوجی کارروائی۔

5۔ [illegible] کے حوالے کرنا۔

6۔ [illegible]

7۔ [illegible]

[illegible]

پرویز مشرف مستعفی

اتحادی حکومت کی طرف سے مواخذے کے لیے شدید دباؤ ڈالے جانے کی وجہ سے صدر پرویز مشرف نے انتخابات کا سامنا کرنے اور نو سال تک جس طریقے سے حکومت چلانے پر اپنی جان بچانے اور معافی حاصل کرنے کے لیے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ شدید سیاسی دباؤ برداشت نہ کر سکے اور 18 اگست 2008ء کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ انہوں نے حکومت سے اپنے لیے محفوظ راستہ حاصل کر لیا جس کی رو سے وہ پاکستان میں بغیر مواخذے کا سامنا کیے رہ سکتے تھے۔ اس معاہدے کی رو سے ان پر ان کے نو سالہ دورِ حکومت کے حوالے سے کوئی مقدمہ نہیں چلایا جا سکے گا۔ صدر مشرف نے ٹی وی پر اپنے الوداعی خطاب میں یہ اعلان کیا کہ انہوں نے اپنے ملک اور عوام کے مفاد کے لیے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ مواخذے میں چاہے وہ جیتیں یا ہاریں نقصان پاکستان کا ہوتا جو وہ نہیں چاہتے تھے اس لیے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا۔

صدر پرویز مشرف نے مواخذے سے بچنے کے لیے آخری کوشش کی اور ہر راستہ اختیار کیا جو ان کی مدد کر سکتا تھا جس میں فوج، سپریم کورٹ اور امریکہ کی بش انتظامیہ شامل تھی۔ لیکن سب نے اس معاملے میں دخل دینے سے انکار کیا۔ امریکی وزیرِ خارجہ کونڈولیزا رائس نے یہ کہا کہ مشرف کا مواخذہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے۔ فوج کے سربراہ نے بھی سول معاملے میں دخل دینے سے معذوری کا اظہار کیا۔

تاہم ان سب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مشرف کی تضحیک اور ان کے خلاف مقدمے بازی نہ کی جائے اور انہیں عزت کے ساتھ رخصت ہونے دیا جائے۔ ایسی بُری صورتِ حال میں مشرف اپنے لیے موافق حالات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آرمی چیف کے ذریعے انہوں نے حکومت سے معافی کی یقین دہانی حاصل کر لی۔ انہیں ٹی وی پر عوام سے خطاب کرنے کی اجازت مل گئی جس میں انہوں نے عوام کو اپنے کارہائے نمایاں سے آگاہ کیا۔ ان کی خواہش کے مطابق ایوانِ صدر سے رخصت ہوتے ہوئے انہیں گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ وہ کچھ دیر کے بعد ملک چھوڑ دیں گے تاکہ یہ پتہ لگے کہ وہ اپنی مرضی سے جا رہے ہیں۔

اگر چہ مشرف اپنے اعلیٰ مقام سے گر گئے اور انہوں نے اپنی شکست بھی تسلیم کر لی لیکن پھر بھی انہوں نے پاکستان کی مستقبل کی سیاست اور جمہوریت کے لیے اعلیٰ مثال قائم کی۔ انہوں نے آئینی طریقے سے استعفیٰ دے کر اور پرامن انتقال اقتدار کے ذریعے سابقہ فوجی آمروں کی روایت کو توڑا ہے جو اقتدار سے چمٹے رہے جب تک کہ انہیں دستبردار ہونے پر مجبور نہ ہونا پڑا یا انہیں قتل کر دیا اور یا غیر آئینی طریقے سے حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

اگرچہ فروری 2008 کے عام انتخابات میں شکست اور صوبائی اسمبلیوں کی عدم اعتماد کی قراردادوں کے ساتھ ہی مشرف کا جانا ٹھہر گیا تھا لیکن پھر بھی اگر وہ چاہتے تو حالات خراب کر سکتے تھے۔ ایسا کرنے کے لیے ان کے پاس تمام اختیارات موجود تھے جیسا کہ انہوں نے اپنے خطاب میں بھی اس کا ذکر کیا۔ لیکن انہوں نے ملکی سلامتی اور یک جہتی کی خاطر خاموشی سے ہٹ جانے کو ترجیح دی جس کا ہمارے آنے والے سیاسی حالات اور جمہوریت پر مثبت اثر پڑے گا۔

مشرف کا زوال

صدر پرویز مشرف 18 اگست 2008 کو صدارتی عہدے سے الگ ہو گئے۔ انہیں مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کی ان کے مواخذے کے لیے چلائی گئی مہم کے نتیجے میں صدارت سے دستبردار ہونا پڑا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مشرف دباؤ برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وقت سے پہلے صدارت سے دستبردار ہونے کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

اپنی اعلیٰ حیثیت سے گر جانے کی ذمہ داری خود پرویز مشرف پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے نو سالہ دورِ حکومت میں متعدد ایسے کام کیے جن کی وجہ سے اُن کا زوال ہوا۔ اگر مشرف جمہوری طریقے اور قانون و روایت کے مطابق چلتے تو وہ تمام عمر حکومت کر سکتے تھے۔ انہوں نے سیاسی اور قانونی معاملات اس طرح سے مکمل کیے ہوئے تھے کہ ان کی حکومت کو بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ان کا فوری منصوبہ اگلے پانچ سال تک حکومت میں رہنے کا تھا لیکن مشرف نے چند فاش غلطیاں کیں جن کی وجہ سے وہ تیزی سے رو بہ زوال ہوئے۔

18 فروری 2008 کے عام انتخابات کے بعد مشرف نے اپنی پارٹی کے خلاف عوامی رائے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر انتخابات کے فوری بعد مشرف مستعفی ہو جاتے تو وہ باعزت طور پر واپس گھر جا سکتے تھے اور اس طرح تاریخ میں وہ ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق سے علیحدہ اور منفرد مقام حاصل کر سکتے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے پیشروؤں کی طرح اُس وقت تک اقتدار نہ چھوڑا جب تک کہ وہ پوری طرح سے بدنام نہ ہو گئے اور ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ بچا۔

مشرف نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ سیاسی حمایت کھو چکے ہیں جس کی وجہ سے انہیں دوبارہ صدر منتخب ہونے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کے گرد چاپلوسی کرنے والے جن میں سابقہ وزیراعظم شوکت عزیز اور پی ایم ایل (ق) کے نمایاں لیڈر شامل تھے نے دوبارہ صدر منتخب ہونے کے لیے آئینی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے غلط مشورے دیئے جس کی وجہ سے مشرف کے زوال میں تیزی آئی۔

مشرف نے ایوانِ صدر میں فوجی کمان کی مرکزیت کے اصول کی بنیاد پر جابرانہ سیاسی نظام قائم کیا ہوا تھا۔ اُنہوں نے اپنے جاری دورِ حکومت کو یقینی بنانے کے لیے کمال مہارت سے استصوابِ رائے کی نگرانی کی اور اپنی مرضی کے نتائج حاصل کیے۔

مشرف نے سرکاری و نیم سرکاری محکموں میں کلیدی آسامیوں پر بہت بڑی تعداد میں فوجی افسروں کو تعینات کیا۔ انہوں نے سویلین اداروں میں فوجی افسروں کو مقرر کیا۔ پاکستان کے 120 سفارت خانوں میں ایک وقت 80 فوجی آفیسر سفیر کے طور پر کام کر

رہے تھے۔ انہوں نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے فوج کو اپنا کاروبار اور تجارتی سرگرمیاں پھیلانے کے لیے غیر معمولی سہولتیں دیں۔ ان اقدامات کی وجہ سے پاکستانی معاشرہ کے ہر شعبہ میں فوج کی بھرمار ہوگئی اور سول اداروں اور افراد کے لیے کام کرنے کے مواقع بالکل ختم ہو گئے۔ سول اداروں میں فوج کے عمل دخل سے عوام میں بد دلی پیدا ہوئی اور فوج کا بہ حیثیت ایک فعال دارے کے تشخص بری طرح مجروح ہوا۔

صدر مشرف نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ باہمی صلاح مشورے اور بات چیت کے ذریعے بین الصوبائی جھگڑوں کو ختم کریں گے۔ لیکن قطع نظر اس کے انہوں نے مقامی نمایاں قیادت سے مشورہ کیے بغیر بلوچستان میں ترقیاتی منصوبے شروع کیے جس سے بلوچستان میں سیاسی کھچاؤ پیدا ہوا۔ اس پر ظفر اللہ خان جمالی جو ایک شریف سیاست دان اور بلوچستان سے پہلے وزیر اعظم تھے کے ساتھ ہونے والے توہین آمیز سلوک نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ فوجی کاروائی کے شروع ہونے اور نواب اکبر بگٹی کے قتل کے ساتھ ہی بلوچستان کے کچھ حصوں میں حالات بگڑ گئے اور صورتِ حال قابو سے باہر ہوگئی۔ بلوچستان کے حالات اور اکبر بگٹی کے قتل نے صدر مشرف کے زوال میں نمایاں کردار ادا کیا۔

صدر مشرف کا یہ خیال تھا کہ پاکستان کی فوج اُن کا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ اُنہیں اپنے سابقہ ادارے اور اپنے ہاتھ سے مقرر کیے ہوئے اپنے جانشین جنرل اشفاق پرویز کیانی سے بہت ساری اُمیدیں وابستہ تھیں لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ فوجی کمان ایسے صدر کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتی جو اپنا اعلیٰ مقام اور حیثیت کھو چکا اور اگر وہ ایسا کرتی ہے تو زیادہ متنازع بن سکتی ہے۔

آخری لمحے تک مشرف امریکی حمایت کی امید لگائے رہے۔ وہ پاکستان کی تاریخ میں امریکہ کے زبردست حلیف رہے اور پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انتہا تک جانے کے لیے تیار تھے کیونکہ اس سے اقتدار پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی تھی۔ تاہم مشرف یہ بھول گئے کہ آرمی چیف کا عہدہ چھوڑنے کے بعد امریکہ کے لیے ان کی افادیت ختم ہوگئی تھی۔ اب امریکہ کی نظریں نئے آرمی چیف پر تھیں جو زیادہ موثر انداز میں پاکستان میں امریکی مفادات کی نگرانی کر سکتا تھا۔

عدلیہ سے متعلق غیر معمولی اور جرات مندانہ اقدام نے مشرف کو بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ اُنہوں نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو بزور طاقت جھکانے کی کوشش کی جو انہیں مہنگی پڑی۔ افتخار محمد چودھری کے ساتھ کی جانے والی کاروائی نے وکلاء میں ہیجان پیدا کیا جنہوں نے حکومت کے خلاف بے مثال احتجاجی تحریک شروع کی۔ وکلاء کی تحریک نے حکومت کی جڑوں کو ہلا کے رکھ دیا۔ اور صدر مشرف بہت بری طرح سے مشکلات میں پھنس گئے۔ بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو قابو میں کرنے کے لیے صدر مشرف نے ہنگامی حالت نافذ کر دی اور اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا جس سے صورتِ حال مزید بگڑ گئی اور صدر مشرف کے زوال میں مزید تیزی آ گئی۔

صدر مشرف نے وزیر اعظم نواز شریف کی منتخب حکومت کو فوجی کاروائی کے ذریعے برطرف کر دیا۔ یہ اُن کی شدید غلطی تھی جس نے پاکستان کی مستقبل کی سیاست پر مذموم اثرات مرتب کیے۔ انہوں نے چیدہ چیدہ اور بدعنوان سیاست دانوں کے احتساب کا وعدہ کیا اور پھر اُنہیں بدعنوان سیاست دانوں کو اپنی فوجی حکومت کو سویلین رنگ دینے کے لیے اپنے ساتھ ملا لیا۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سابق صدر نے دو دفعہ آئین کو منسوخ کر کے غداری کا ارتکاب کیا اور کارگل مہم شروع کر کے پاکستان کے مفاد کو نقصان پہنچایا۔ انہوں نے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی جنگ میں شرکت کر کے ملک میں خون بہایا۔ یہ تمام وہ فاش

غلطیاں تھیں جنہوں نے مشرف کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

مشرف کی رخصتگی پر ملاجلا ردِعمل سامنے آیا۔ اکثریت نے ان کے استعفیٰ پر خوشی کا اظہار کیا جب کہ معاشرے کی خاصی تعداد نے مشرف کے بعد کے پاکستان بارے اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔

تاہم مشرف کی چھوڑی ہوئی یاد اُن قابلِ نفرت نہیں ہوگی جتنی کہ ہونی چاہیے۔ ہمارا مخصوص طبقہ کسی بھی دورِ حکومت کے اخلاقی اور قانونی جواز کی بجائے اُس کی کارکردگی سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت سارے لوگ بالخصوص اُمراء مشرف کے دورِ حکومت کی معاشی ترقی کی وجہ سے تعریف کریں گے۔ مشرف کو بہ حیثیت ایک جرات مند اور بلند حوصلہ انسان یاد رکھا جائے گا جو طاقت اور اقتدار کے دلدادہ تھے اور اسے حاصل کرنے اور اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔

اتحاد کا خاتمہ

فروری 2008ء کے عام انتخابات سے قبل پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے پاکستان سے فوجی آمریت کو ختم کرنے کے لیے اکٹھے مل کر جدوجہد کرنے کا عہد کیا۔ انہوں نے لندن میں 14 مئی 2006ء کو ''میثاقِ جمہوریت'' کا معاہدہ کیا اور وعدہ کیا کہ وہ جمہوریت کے فروغ کے لیے اپنی مہم کا آغاز کریں گے۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف نے جمہوریت میں اپنے اعتقاد کا اعادہ کیا اور اعلان کیا کہ وہ ماضی کو بھول کر نئے جذبے و حوصلے سے فوجی آمریت کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے آگے بڑھیں گے۔

بدقسمتی سے بے نظیر بھٹو 27 دسمبر 2007 کو لیاقت باغ راولپنڈی میں سیاسی جلسے سے خطاب کے دوران قتل ہوگئیں۔ بے نظیر بھٹو کے قتل کی وجہ سے پاکستان میں شدید سیاسی بحران پیدا ہوا۔ ایسا محسوس ہوا کہ ''میثاقِ جمہوریت'' پر دستخط کرتے وقت دوستی، بھائی چارے اور وسیع النظری کی جو فضا قائم ہوئی تھی وہ تحلیل ہوگئی ہے اور اُس کی جگہ ایک دفعہ پھر نفرت اور شک و شبہ جو کبھی مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کی سیاست کی خصوصیت تھی نے جگہ لے لی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے پیپلز پارٹی کی قیادت نے اپنی مقتول لیڈر کے وعدے کی پاسداری کرتے ہوئے فوجی آمریت سے سختی سے نمٹنے کے لیے نواز شریف کی طرف دستِ تعاون بڑھایا۔ پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف زرداری نے اعلان کیا کہ اُن کی جماعت پاکستان میں جمہوریت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے پی ایم ایل (ن) سے اتحاد کرے گی۔

فروری 2008ء کے انتخابات میں پی ایم ایل (ن) اور پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئیں۔ صدر مشرف کی جماعت پی ایم ایل (ق) کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ عوام نے مشرف کی پالیسیوں پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور اُن کی جماعت کو انتخابات میں ہرا کر اپنی بھڑاس نکالی۔

پی ایم ایل (ن) نے پنجاب میں انتخابات کا صفایا کر دیا۔ مرکز میں بھی پی ایم ایل (ن) نے کافی نشستیں حاصل کر لیں۔ اسی طرح پیپلز پارٹی نے مرکز میں واضح اکثریت حاصل کی اور پنجاب اسمبلی میں متاثر کن حمایت حاصل کی۔

پیپلز پارٹی اور پی ایم ایل (ن) کے قائدین آصف علی زرداری اور نواز شریف ملک کو درپیش مسائل کے حل کے لیے مل کر کام کرنے کے عہد کی تجدید کرنے کے لیے مری میں اکٹھے ہوئے۔ دونوں نے مرکز اور صوبے میں مل کر کام کرنے کا اعلان کیا۔ جن مسائل پر دونوں نے تعاون کا فیصلہ کیا ان میں ججز کی بحالی، مشرف کی علیحدگی اور عوام کو درپیش معاشی مسائل شامل تھے۔ نواز شریف نے پرزور الفاظ میں واضح کیا کہ ان کی جماعت صرف اُسی صورت میں اتحاد کا حصہ رہے گی جب کہ ججز کو مقررہ مدت کے اندر بحال کر دیا جائے گا۔ انہوں نے ججز بحالی کے لیے حد مقرر کی اور خبردار کیا کہ اگر مقررہ تاریخ تک جج بحال نہ ہوئے تو ان کی جماعت

پی ایم ایل پاکستان [illegible] اتحاد سے علیحدہ ہو جائے گی۔

مرکز اور صوبہ پنجاب میں پیپلز پارٹی اور پی ایم ایل (ن) کے وزراء پر مشتمل حکومتیں قائم کی گئیں۔ پی ایم ایل (ن) کو مرکز میں سات وزارتیں دی گئیں جبکہ صوبہ پنجاب میں پیپلز پارٹی کو کابینہ میں شامل کیا گیا۔ مرکزی اور صوبائی وزراء نے صدر مشرف سے احتجاج کرتے ہوئے حلف لیا۔

تاہم آصف علی زرداری انتظامیہ کے ذریعے ججوں کو بحال کرنے میں متامل تھے۔ ججوں کی بحالی کے بارے اُن کے کچھ خدشات تھے۔ اُنہوں نے مقررہ تاریخ تک ججوں کی بحالی میں قانونی مشکلات کا ذکر کیا۔

وہ ہر دفعہ یہ کہہ کر پارلیمنٹ ججز کو بحال کرے گی ججز کی بحالی کے معاملے کو ٹالتے رہے۔ اس سے نواز شریف سخت نالاں ہوئے کیونکہ اُنہوں نے اپنی سیاسی مہم کی بنیاد ججز بحالی پر اُستوار کی تھی۔ ججز بحالی میں تاخیر کی وجہ سے نواز شریف عوام کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہے تھے اور ان کا سیاسی تشخص خطرے میں تھا۔

جب نواز شریف کی طرف سے دی گئی دوسری تاریخ پر بھی عملدرآمد نہ ہو سکا تو انہوں نے وفاقی کابینہ سے اپنے وزراء کو واپس بلا لیا جس کی وجہ سے آصف علی زرداری دباؤ کا شکار ہو گئے۔ آصف علی زرداری پر اپنے وعدہ سے ہٹ جانے پر شدید نقطہ چینی ہو رہی تھی جس سے وہ پریشان تھے۔

پیپلز پارٹی کے اصرار پر پی ایم ایل (ن) کے چار وزراء نے دوبارہ سے وفاقی کابینہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ ایک دفعہ پھر پی ایم ایل (ن) کو ججز بحالی کی یقین دہانی کروائی گئی۔ آصف علی زرداری نواز شریف کی طرف سے ججوں کی بحالی کے مسلسل مطالبے کی وجہ سے پریشان تھے اور اس مشکل صورت حال سے نکلنا چاہتے تھے۔ نواز شریف کو خاموش کرنے کے لیے آصف علی زرداری کے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔

زرداری یہ جانتے تھے کہ نواز شریف پرویز مشرف کو صدارتی عہدے پر نہیں دیکھنا چاہتے اور ہر قیمت پر اُنہیں کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ وہ بدلے کی آگ میں سلگ رہے تھے اور موقع کی تلاش میں تھے کہ جب وہ مشرف کی تذلیل کر کے اپنا انتقام لے سکیں۔ جس دن نواز شریف پاکستان واپس آئے اُسی دن سے وہ مشرف کے مواخذے پر زور دے رہے تھے۔ زرداری نے نواز شریف کو ججز کے معاملے پر خاموش کرنے اور اُن کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اُن کی مشرف کمزوری کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

پرویز مشرف کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے نواز شریف اور زرداری کے درمیان پھر ملاقات ہوئی۔ ملاقات سے پہلے نواز شریف نے اعلان کیا کہ پیپلز پارٹی سے معاملات طے کرنے کا آخری لمحہ آن پہنچا ہے۔ بالآخر ملاقات میں دونوں اتحادی جماعتوں نے پرویز مشرف کے مواخذے پر اتفاق کر لیا۔ یہ پی ایم ایل (ن) کا بہت بڑا کارنامہ تھا کیونکہ پہلے کئی مواقع پر زرداری نے مشرف کے بارے نرم گوشے کا اظہار کیا تھا۔ مشرف کے مواخذے پر اتفاق کر کے زرداری نے نواز شریف کے بنیادی اور سب سے اہم مطالبے کو مان لیا تھا۔ مشرف کے مواخذے کے لیے زرداری کی حمایت حاصل کر لینے پر نواز شریف بہت خوش ہوئے وہ ججز بحالی کے اپنے اصولی موقف کو بھول گئے اور مواخذے سے پہلے ججز بحالی پر زور نہ دیا۔ یہ نواز شریف کی غلطی تھی جس کا بعد میں انہیں احساس ہوا۔

مشرف مواخذے پر مکمل حمایت دے کے زرداری مطمئن ہو گئے اور ججز بحالی کے معاملے کو ایک دفعہ پھر موخر کر دیا۔ اس سے نواز شریف سخت ناراض ہوئے جنہیں مشرف مواخذے/استعفیٰ سے پہلے ججز بحالی پر زور نہ دینے کی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آصف زرداری نے ٹھنڈے مزاج اور اپنی تیز سیاسی چالوں سے نواز شریف کو حیران کر دیا۔ جب نواز شریف کی مقرر کی ہوئی آخری تاریخ

تک جج بحال نہ ہوئے تو ان کے پاس سوائے اتحاد سے علیحدہ ہونے کے کوئی دوسرا راستہ نہ بچا۔ نواز شریف نے پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ کئی دفعہ ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی گئی اور اب اتحاد میں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔

مسلم لیگ (ن) کے فیصلے پر کسی کو حیرانی نہ ہوئی کیونکہ شروع ہی سے اتحاد شکستہ بنیادوں پر اُستوار تھا۔ دونوں اتحادی جماعتوں کے ماضی کے تعلقات کی روشنی میں ہر کوئی اتحاد کی ہموار کارکردگی کے متعلق شک وشبہات رکھتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مشکل سے چند ماہ قائم رہنے کے بعد ختم ہو جائے گا۔ جب 13 مئی 2008ء کو پی ایم ایل (ن) ملاقات کے دوران واک آؤٹ کر گئی تو اسی وقت اتحاد کے انجام کا پتہ لگ گیا تھا۔ اس کے بعد دونوں جماعتیں کھلے عام لڑتی جھگڑتی رہیں۔ لیکن اس وقت سب حیران ہو گئے جب جھگڑے کے باوجود اتحادی جماعتوں نے پرویز مشرف کو صدارت سے ہٹانے کا ہدف حاصل کر لیا۔

پی ایم ایل (ن) بجا طور پر اپنے بڑے اتحادی ساتھی پر بداعتمادی کا الزام لگا سکتی ہے۔ زرداری نے سب سے پہلے اعلانِ مری پر وعدہ خلافی کی، 12 مئی کی ڈیڈ لائن پر عمل درآمد نہ کیا اور پھر ججز کے متعلق اپنے وعدے کی خلاف ورزی کی۔ پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین کو یا تو کسی بھی خاص تاریخ پر متفق نہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو انہیں اپنے الفاظ پر قائم رہنا چاہیے تھا۔ بلاشبہ ججز اور پرویز مشرف کے متعلق پی ایم ایل (ن) کی سوچ اور پالیسی انتقام پر مبنی تھی۔

گوادر بندرگاہ کا منصوبہ

گوادر کا قصبہ بحیرۂ عرب کے ساحل کے ساتھ خلیج گوادر سے کوئی تیس میل مشرق کی طرف واقع ہے۔ یہ تقریباً بیس میل لمبا اور دس میل چوڑا علاقہ ہے۔ شمال مغرب کی طرف سے دریائے دشتیاری اس خلیج میں آ کر گرتا ہے اور شمال مشرق سے دریائے دشت آ کر مل جاتا ہے۔ گوادر کا موجودہ قصبہ تقریباً 500 ہیکٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی آبادی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق 43850 نفوس پر مشتمل ہے۔

گوادر پورٹ کے منصوبے کے پہلے مرحلے کی تکمیل پر لاگت کا اندازہ تقریباً 248 ملین ڈالر لگایا گیا ہے جبکہ دوسرے مرحلے پر لاگت کا تخمینہ تقریباً 600 ملین ڈالر ہے جو آئندہ 8 یا 9 سال میں پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔

حکومت پاکستان نے اگست 2001ء میں حکومت چین کے ساتھ منصوبے کے پہلے مرحلے کے ترقیاتی کاموں کے سلسلے میں ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ معاہدے کے مطابق چین پہلے مرحلے کے لیے 198 ملین ڈالر جبکہ پاکستان 50 ملین ڈالر خرچ کرے گا۔ اس پراجیکٹ پر 450 چینی افراد اور 512 پاکستانی افراد کام کر رہے ہیں جن میں انجینئرز بھی شامل ہیں۔

منصوبے کی افادیت

1- سٹریٹیجک سیکورٹی آف پاکستان

جنگ کی صورت میں بھارت کراچی کا رابطہ منقطع کر سکتا ہے کیونکہ بھارت کی بحری طاقت پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اس طرح پاکستان کو تیل اور دیگر اشیائے ضرورت کی سپلائی معطل ہو سکتی ہے۔ لیکن گوادر بندرگاہ ایک طرف بھارتی رسائی سے دور ہے تو دوسری طرف آئل سپلائی روٹ کو کمانڈ کرتی ہے۔ پاکستان کو عرب دنیا کی طرف سے آئل سپلائی گوادر کے ذریعے محفوظ ہو جائے گی۔

2- چینی اور امریکی مفادات

مستقبل میں تمام بڑی طاقتوں کی پالیسیوں اور اقتصادیات پر تیل کے عنصر کا اہم اثر واضح ہے۔ ان طاقتوں میں چین، یو ایس اے، یورپ اور روس وغیرہ شامل ہیں۔ گوادر کا محل وقوع اس لحاظ سے بڑی طاقتوں کے لیے اہمیت کا حامل ہے کیونکہ مشرق وسطی (Middle east) کا تیل آبنائے ہرمز (Strait of Hurmuz) کے ذریعے سپلائی کیا جاتا ہے اور گوادر آبنائے ہرمز کو کمانڈ کرتی ہے۔ اس لیے بڑی طاقتوں مثلاً چین اور امریکہ کے لیے پاکستان کی اہمیت زیادہ ہو جائے گی۔

مشرق وسطی سرد جنگ، ایران عراق جنگ، امریکہ کی افغانستان اور عراق میں مداخلت وغیرہ کی وجہ سے انتہائی اہمیت کا علاقہ ہے۔ نیز تیل کی سیاست نے اس علاقے کو اور بھی حساس (Sensitive) ہے۔ گوادر مشرق وسطی کے دہانے پر واقع ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ جیوسٹریٹجک اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

گوادر کا ماسٹر پلان

گوادر کے ماسٹر پلان کو حکومت بلوچستان نے NESPAK کے ذریعے منظور کرلیا ہے۔ اس کی اراضی تقریباً 18,600 ہیکٹر ہے۔ اس ماسٹر پلان میں بڑے بڑے زون درج ذیل ہیں:

1- ایکسپورٹ پروسیسنگ زون

2- سپیشل انڈسٹریل زون

3- آئل ریفائنری

4- رہائشی علاقہ

مکران ساحلی شاہراہ (Makran Coastal Highway)

اس کی لمبائی تقریباً 700 کلومیٹر ہے جو گوادر کو پسنی، اورماڑہ، سونمیانی اور کراچی سے ملاتی ہے۔ یہ بین الصوبائی شاہراہ اقتصادی اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

گوادر، کوئٹہ روڈ: یہ سڑک دونوں شہروں کا باہمی فاصلہ 1090 کلومیٹر سے کم کر کے 795 کلومیٹر کردے گی۔

این-25: گوادر سے افغانستان بذریعہ کوئٹہ

ایران سے رابطہ: مکران کوسٹل ہائی وے پاکستان کو ایران سے ملائے گی۔

گوادر، رتو ڈیرو موٹروے: یہ گوادر کو انڈس ہائی وے سے بذریعہ تربت اور خضدار ملائے گی۔

بڑی طاقتیں مثلاً یو ایس اے، چین اور ہندوستان اس علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی تگ و دو کریں گی۔ مزید برآں یو ایس اے چین کے گرد گھیرا تنگ کرنے کوشش کر رہا ہے۔ جس کی جواب میں بالآخر چین بھی وسعت پسندی کی پالیسی (Expansionist Policy) اختیار کرے گا تاکہ امریکی اثر و رسوخ کو کم کیا جاسکے۔ اس ضمن میں گوادر کی اہمیت مزید بڑھ جائے گی۔

گوادر پورٹ کی اقتصادی اہمیت

1- خلیج فارس کی بندرگاہوں کا متبادل

ایشیائی ترقیاتی بینک نے گوادر کی بندرگاہ کو تیل کی ترسیل، ٹرانزٹ ٹریڈ برائے وسطی ایشیائی ریاستیں (CARS) اور ٹرانس شپ منٹ ٹریڈ (Trans-shipment Trade) کے لیے خلیج فارس کی بندرگاہوں (Persioan Gulf Ports) کا بہترین متبادل قرار دیا ہے کیونکہ کراچی اور بن قاسم بندرگاہیں بہت دور واقع ہیں۔

2- افغانستان اور وسطی ایشیائی ریاستوں کی ترقی

گوادر افغانستان اور وسطی ایشیائی ریاستوں سے سمندر میں داخلے اور اخراج کا بہترین راستہ ہے کیونکہ یہ ممالک چاروں طرف خشکی سے گھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے راہداری کی تجارت (Transit Trade) کے لیے گوادر بہترین سمندری راستہ ہے کیونکہ یہ سب سے کم فاصلے پر واقع ہے۔ اسی طرح یہ ایران اور وسط ایشیا کے گیس کے ذخائر کے دوسرے ممالک تک رابطے کے لیے انتہائی موزوں ہے۔

3- قدرتی بندرگاہ (Natural Harbour)

تجارتی اور جہاز رانی کے نقطہء نظر سے کراچی اور بن قاسم دور دراز بندرگاہیں ہیں کیونکہ مال بردار اور تیل بردار جہازوں کو زیادہ سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ لیکن گوادر ایک قدرتی بندرگاہ ہے جو کہ ایک بڑے تجارتی راستے (Biggest Trade Route) پر واقع ہے۔

4- خلیجی ممالک کے ساتھ تجارتی ترقی

خلیج فارس کے دہانے پر واقع ہونے کی وجہ سے خلیجی ممالک سے گوادر بہت قریب ہے۔ ان ممالک سے تجارت میں بہتری ہوگی کیونکہ جہازوں کے کرائے اور وقت میں بچت ہوگی۔

5- بلوچستان کی سماجی اور اقتصادی ترقی

بڑھتی ہوئی تجارت، شپنگ، آئل سپلائی اور مواصلاتی نظام اور گوادر کی تیز ترین ترقی کا براہ راست اثر بلوچستان کی سماجی اور اقتصادی ترقی پر ہوگا۔

6- جہاز سازی کی صنعت کا قیام

سمندری تجارت کے فروغ، ٹرانس شپ منٹ اور بہتر انفراسٹرکچر دنیا کے سب سے بڑے سمندری تجارتی راستے سے قریب ہونے کی وجہ سے جہاز سازی کی صنعت کو فروغ ملے گا۔

7- اقتصادی سرگرمیوں میں اضافہ

پھیلتے ہوئے سڑکوں کے جال اور بہتر ذرائع آمدورفت کے علاوہ جدید مواصلاتی نظام کے قیام سے گوادر پورٹ پر ہونے والی کاروباری اور تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگا۔ ایکسپورٹ پراسیسنگ زون کے قیام سے بہت سی صنعتیں اور آئل ریفائنریز کی تنصیب

عمل میں آئے گی جو اقتصادی سرگرمیوں میں اضافہ کا موجب بنے گی۔

8- سرمایہ کاری کے مواقع

گوادر پورٹ سرمایہ کاری کے بہترین مواقع پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوگی مثلاً سروسز کی فراہمی، کولڈ سٹوریج، کارپوریٹ انفراسٹرکچر یعنی دفاتر، انڈسٹریل زون کی ترقی، ہوٹل، ہسپتال، سکول، سمندری جہازوں کی صنعت (Marine Industry) اور آئل ریفائنریز میں سرمایہ کاری کا ایک بڑا میدان فراہم ہوگا۔

مختصراً گوادر اپنی مجوزہ تکمیل کے بعد اومان کی بندرگاہ Salalah اور ایران کی بندرگاہ چاہ بہار پر فوقیت حاصل کر جائے گی۔ اس کے علاوہ خلیجی ریاستوں، وسطی ایشیا کی ریاستوں ایران، مشرقی افریقہ، بحیرۂ قلزم کے ساتھ واقع ممالک چین کے شمال مغربی حصوں کے لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پاکستان کی سٹریٹیجک اور اقتصادی افادیت کے لیے انتہائی موزوں انتخاب ہے۔ اس کی تکمیل سے سرمایہ کاری اور ملازمت کے مواقع پیدا ہوں گے جو مقامی آبادی اور ملک کے دیگر حصوں میں خوشحالی کا موجب بنیں گے۔

پرویز مشرف دورِ حکومت کی خارجہ پالیسی کا ایک جائزہ

اکتوبر 1999ء کے تقابلی حالات اور شدید نوعیت کے داخلی مسائل نے جہاں ہر شعبہ زندگی کو بری طرح متاثر کیا وہاں ملک سے باہر بھی پاکستان کی ساکھ کو نقصان پہنچا اور ہماری خارجہ پالیسی تقریباً مفلوج ہو کر رہ گئی۔ آج پاکستان قوموں کے درمیان اپنے صحیح مقام پر کھڑا ہے۔ آج سے عالمی افق پر بین الاقوامی امن کے فروغ اور تعاون کے ایک اہم اتحادی کے طور پر جانا جاتا ہے۔

صدر مشرف نے خارجہ پالیسی کے جن اہم اہداف کا تذکرہ 17 اکتوبر 1999ء کو قوم سے اپنے خطاب کے دوران کیا تھا اس کی روشنی میں بین الاقوامی کمیونٹی کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کا صاف اور شفاف طریقے سے مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کا دہشت گردی کے خلاف قائم عالمی اتحاد میں شمولیت کا جرأت مندانہ اور بروقت فیصلہ جو 11 ستمبر 2001ء میں امریکہ کے افسوس ناک واقعات کے بعد وجود میں آیا، وسیع تر قومی مفاد میں تھا۔ یہ ملکی سلامتی اور اپنے محل وقوع کو دیکھتے ہوئے درپیش حالات میں بہترین فیصلہ تھا۔ اس فیصلے کی بدولت جہاں پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا وہاں اس کے ذریعے ملک کو کئی اہم فوائد بھی حاصل ہوئے۔

انڈیا کے علاوہ دوسرے تمام پڑوسی ممالک سے ہمارے تعلقات دوستانہ بنیادوں پر بھرپور تعاون کے ساتھ استوار ہوئے۔ چین کے ساتھ ہماری قابل اعتماد دوستی مزید مستحکم ہوئی اور چین کے ساتھ ہمارے اقتصادی تعلقات وسیع تر تعاون کے ساتھ اور ہماری سلامتی اور ترقیاتی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بہتر ہوئے مسلم ممالک کے ساتھ ہماری روحانی وابستگی کو ہماری خارجہ پالیسی میں ہمیشہ اہم مقام حاصل رہا ہے۔ جس کا مقصد مسلم امہ کو درپیش مسائل کا ادراک عالمی سطح پر کروانا اور اس کے مفادات کو مدنظر رکھنا ہے۔

اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کے لیے جنوری 2003ء سے پاکستان کا منتخب ہونا جہاں حکومت کی کامیاب خارجہ پالیسی کا نقطہ عروج کہلاتا ہے وہیں اس کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر ملکی وقار میں نمایاں اضافہ بھی ہوا ہے۔ دہشت گردوں کے خلاف عالمی مہم میں ہمارے تعاون کی وجہ سے آج امریکہ کے ساتھ ہمارے تعلقات نئی بنیادوں پر استوار ہوئے ہیں، یورپی ممالک کے ساتھ پاکستان کے بنیادی تعلقات مضبوط ہوئے۔ ان ممالک کے ساتھ بامقصد تجارتی تعلقات قائم ہوئے اور پاکستان میں بیرونی سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا۔ یورپی ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات ستمبر 2001ء کے بعد ایک نئی سمت اختیار کر گئے ہیں۔ یورپی یونین سمیت یورپی ممالک انفرادی طور پر بھی پاکستان کے دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف پاکستان کے اصولی مؤقف اور جدوجہد کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بھارت کے تمام تر واویلے اور کشمیر کی جدوجہد آزادی کو 11 ستمبر کے بعد دہشت گردی قرار دلوانے کی کوششوں کو جس طرح پاکستان نے سبوتاژ کیا اور بھارتی مسلح افواج کی بربریت کا چہرہ دنیا کو دکھایا اس سے عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ پاکستان اپنے اس دیرینہ موقف پر ڈٹا رہا کہ تنازعہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی مسئلہ ہے۔ جسے صرف کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق اور سلامتی کونسل کی قرار دادوں کی بنیاد پر حل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

آج عالمی برادری جنوبی ایشیا میں دیرپا سلامتی کے قیام کے لیے تنازعہ کشمیر کے حل کی خاطر کی جانیوالی پاکستانی جدوجہد کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ جنوبی ایشیاء میں 1998ء میں ایٹمی دھماکوں کے وقت عالمی سطح پر جو شدید ردعمل ہوا تھا اس میں خاطر خواہ کمی ہوئی ہے۔ آج عالمی برادری ان دھماکوں کو خطے کی جغرافیائی صورتحال کے تناظر میں دیکھتی ہے۔ پاکستان نے اس صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کیا ہے۔ ہم ایٹمی ٹیکنالوجی پر اپنے موثر کنٹرول اور ملکی سلامتی و تحفظ کی صورتحال کو واضح کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

پاکستان جغرافیائی مقام کی اہمیت اور تمام مسائل سے پوری طرح آگاہ ہے جو ہماری قومی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں۔ ہم عالمی سطح پر اپنی ساکھ بہتر بنانے اور پاکستان کو عالمی برادری کا ایک باعزت اور ذمہ دار رکن کی حیثیت دلوانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

باب نمبر 17

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

آصف علی زرداری

سابق صدر جنرل پرویز مشرف 18 اگست 2008 کو مستعفی ہو گئے۔ جنرل مشرف کے استعفیٰ کے بعد پاکستان کی سیاست میں تیزی سے دُوررس تبدیلیاں رونما ہوئیں جو کہ لوگوں کی توقعات کے برعکس تھیں۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مشرف کے استعفے کے بعد سیاسی تبدیلیاں رونما ہوں گی لیکن کسی نے بھی یہ نہ سوچا تھا کہ ملک کا سیاسی منظر اتنی تیزی سے بدل جائے گا۔ صدر مشرف کے استعفے کی وجہ سے لوگوں کو جو خوشی ہوئی وہ زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی اور جلد ہی مایوسی اور بدولی چھا گئی۔ مشرف کے جانے کے ایک ہفتہ بعد ہی پی پی پی اور پی ایم ایل (ن) کے درمیان چھ ماہ پہلے کیا گیا اتحاد ٹوٹ گیا اور نئی سیاسی سوچ جس کی بنیاد ذاتی مفاد اور موقع پرستی پر تھی ظاہر ہوئی۔ جس کی وجہ سے ملک کے سیاسی ماحول میں مزید کشیدگی اور تناؤ پیدا ہوا۔

صدر مشرف کے اقتدار سے دستبردار ہوتے ہی صدارتی عہدے کے لیے سخت دوڑ شروع ہوئی۔ پیپلز پارٹی نے آصف علی زرداری کو 23 اگست 2008ء کو اپنا صدارتی امیدوار نامزد کر دیا۔ زرداری کی نامزدگی نے ہر کسی کو حیران کر کے رکھ دیا کیونکہ کچھ عرصہ پہلے انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ صدر بننا نہیں چاہتے۔ اسی طرح اُن کی ہمشیرہ فریال تالپور نے بھی صدر بننے سے معذوری کا اظہار کیا تھا لیکن دونوں نے ہی اپنے اپنے کاغذات نامزدگی جمع کروا دیے جس سے سیاست دانوں کے دوہرے معیار کا پتہ چلتا ہے۔

دونوں اتحادی جماعتوں یعنی پی پی پی اور پی ایم ایل (ن) کے درمیان بداعتمادی کی وجہ سے اتحاد قائم نہ رہ سکا اور اپنے ابتدائی مرحلے میں ہی 25 اگست 2008ء کو ٹوٹ گیا۔ ابتدائی دور میں اتحاد کے ٹوٹ جانے سے کئی شکوک وشبہات پیدا ہوئے اور دونوں جماعتوں کے درمیان محاذ آرائی کے خدشات پیدا ہوئے۔ پی ایم ایل (ن) جو صدارتی امیدوار کے چناؤ میں نظر انداز کئے جانے پر پی پی پی سے ناراض تھی نے صدارتی انتخاب کے لیے اپنا امیدوار میدان میں اتارا۔ جسٹس سعید الزمان صدیقی جو کہ سیاست میں نو وارد تھے میدان میں کود پڑے تاکہ آصف علی زرداری کے لیے کھلا میدان نہ چھوڑا جائے۔ پی ایم ایل (ن) کے امیدوار کے میدان میں آ جانے سے پی ایم ایل (ق) اور چھوٹی جماعتوں یعنی اے این پی، ایم کیو ایم اور جے یو آئی (ف) کی سودے بازی کی حیثیت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور پی پی پی اور پی ایم ایل (ن) کو پی ایم ایل (ق) کی حمایت حاصل کرنے کے لیے پی ایم ایل (ق) سے رابطے پر مجبور ہونا پڑا۔ کیونکہ پنجاب میں پی ایم ایل (ق) کی حمایت کے بغیر کوئی بھی جماعت حکومت نہیں بنا سکتی تھی۔ پی ایم ایل (ق) نے اپنی سودے بازے کو بڑھاوا دینے کے لیے مشاہد حسین سید کو اپنا صدارتی امیدوار نامزد کیا۔ پی ایم ایل (ق) کو اپنے فارورڈ بلاک جو کہ پی پی پی سے ملنے کے لیے پر تول رہا تھا سے سخت خطرہ تھا اور فارورڈ بلاک۔ پی پی پی اتحاد کی صورت میں اُسے مکمل طور پر اپنی سیاسی حیثیت ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

چونکہ پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) اتحاد ٹوٹنے کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال رہی تھیں اس لیے بہت سے مبصرین کا خیال تھا کہ 1980ء اور 1990ء والی محاذ آرائی پھر سے شروع ہونے والی ہے۔ تاہم پاکستان میں بڑی مدت کے بعد سیاسی عمل شروع ہوا تھا جس کی وجہ سے یہ امید کی جا رہی تھی کہ سیاسی ماحول میں تبدیلی آئے گی۔ گو کہ اتحاد کا ٹوٹنا بدقسمتی تھی اور اسے

کم از کم ایک سال تک قائم رہنا چاہیے تھا پھر بھی اس علیحدگی کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ اب سیاسی جماعتیں آزادانہ فیصلے کر رہی تھیں جس کا آنے والے وقت پر خوش آئند اثر پڑ سکتا تھا۔

آصف علی زرداری نے اعلان کیا کہ اگر وہ صدر منتخب ہو گئے تو وہ 59 (2)b کے تحت اپنے صوابدیدی اختیارات سے دستبردار ہو جائیں گے۔

صدارتی انتخاب 2008

صدارتی انتخاب 6 ستمبر 2008 کو کروایا گیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے امیدوار آصف علی زرداری نے جیل، جلا وطنی اور بیوی کے اندوہناک قتل کے باوجود انتخاب میں انتہائی متاثر کن کامیابی حاصل کی۔

آصف زرداری نے 281 ووٹ حاصل کر کے اپنے مدِمقابل تمام دوسرے امیدواروں کو شکست فاش دی۔ آصف علی زرداری ملک کے بارھویں صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے نواز شریف کے حمایتی جسٹس سعید الزماں صدیقی اور پی ایم ایل (ق) کے امیدوار مشاہد حسین سید کو شکست دی۔ آصف علی زرداری وہ پہلے صدر بنے جو سیاسی عمل سے گزر کر حکومت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوئے۔ انہوں نے باقاعدہ آئینی طریقے سے انتخاب لڑ کر عہدۂ صدارت حاصل کیا جس میں کسی قسم کی کوئی دھاندلی یا غیر آئینی وغیر سیاسی حربہ نہ استعمال کیا گیا۔ سعید الزماں صدیقی کو 153 ووٹ ملے جبکہ مشاہد حسین سید کو صرف 44 ووٹ ملے۔

زرداری نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اور چار صوبائی اسمبلیوں کے 1170 ووٹ کے انتخابی ادارے کے 702 ووٹ حاصل کیے جو کہ دو تہائی اکثریت سے معمولی سے زیادہ بنتے ہیں۔

آصف علی زرداری نے بڑی مہارت سے مقامی سطح پر اور بیرونی طور پر اپنے خلاف بدعنوانی، بے ایمانی اور عدلیہ کے ججز کو بحال کرنے کے وعدوں سے مکر جانے کے غیر ثابت شدہ الزامات کا سامنا کیا اور ان کے مخالفین نے جو طوفان کھڑا کیا تھا اسے دبا دیا جو کہ ان کی سیاسی بصیرت اور ٹھنڈے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ سیاسی مبصرین کا یہ خیال تھا کہ صدارتی عہدہ جو کہ ملک کا سب سے زیادہ طاقتور عہدہ تھا آصف علی زرداری جن کی شہرت کو ججز کی بحالی پر ناکامی سے بہت نقصان پہنچا تھا کے لیے انتہائی مشکل اور کٹھن ثابت ہوگا۔ بہت سارے سیاسی تجزیہ نگاروں کا یہ خیال تھا کہ صدر زرداری آسانی سے اپنے صوابدیدی اختیارات سے دستبردار نہ ہوں گے اور لندن میں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے درمیان طے شدہ میثاقِ جمہوریت، زرداری کو ڈراتا رہے گا کیونکہ میثاقِ جمہوریت پر عمل درآمد کا مطلب صدر کو اس کے اسمبلی توڑنے، وزیرِاعظم کو برخاست کرنے اور مسلح افواج کے سپریم کمانڈر اور چیف الیکشن کمشنر کو تعینات کرنے کے متنازعہ اختیارات سے دستبردار ہونا اور انہیں وزیرِاعظم کو واپس کرنا ہوگا۔ 1973 کے آئین کے مطابق یہ سب اختیارات وزیرِاعظم کے پاس ہوتے ہیں اور صدر کو یہ اختیارات 1973 کے آئین میں کی گئی آٹھویں ترمیم کے بعد تفویض کیے گئے تھے۔

صدارتی عہدہ سنبھالتے وقت زرداری کے سامنے جو کٹھن معاملات تھے ان میں دہشت گردی اور تیزی سے بگڑتی ہوئی معاشی صورتِ حال تھی۔ صدر زرداری کو ان معاملات کی طرف اپنی ذاتی توجہ مبذول کرنا تھی۔ امریکہ کا حلیف ہوتے ہوئے پاکستان کو اپنے دوست ملک امریکہ کی تسلی کے مطابق دہشت گردی کے معاملے کو نمٹانا تھا۔

صدارتی انتخاب پی ایم ایل (ق) کے لیے ہزیمت کا باعث بنا۔ جس کی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں عددی حیثیت کو سخت دھچکا لگا تھا جو کہ گھٹ کر تقریباً ایک تہائی رہ گئی تھی جس سے پی ایم ایل (ق) کی بہ حیثیت ایک سیاسی جماعت بقا خطرے میں پڑ گئی تھی۔

معاشرے کے مختلف طبقوں نے زرداری کی متاثر کن کامیابی پر انہیں خوش آمدید کہا۔ امریکہ نے بھی زرداری کو صدارتی انتخاب جیتنے پر مبارکباد کا پیغام دیا اور ان کے ساتھ کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ زرداری کے لیے فوج کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا نہایت ضروری تھا۔ انہیں فوج اور سیاسی حکومت کے درمیان ایک رابطے کے طور پر کام کرنا تھا جو کہ انتہائی مشکل اور نازک معاملہ تھا۔ اگر زرداری اپنے عہدہ کی مدت کے دوران پاکستان کے تھوڑے سے مسائل بھی حل کر لیتے ہیں تو ان کے ماضی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن اگر وہ ناکام ہو جاتے ہیں تو فوج میں موجود ان کے مخالفین ان کی حکومت کو ختم کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کا نظام ہے لیکن پرویز مشرف کے 9991 کے انتقاب کی وجہ سے صدر بہت طاقتور ہو گیا تھا اور سارے حکومت کو توڑنے اور حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں جن میں آرمی چیف، صوبائی گورنر اور چیف الیکشن کمشنر شامل ہیں کی تعیناتی کے اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔ زرداری کے مخالفین کہاں زرداری کے ہاتھ میں بے پناہ ارتکاز اختیارات کی وجہ سے پریشان تھے وہیں زرداری اپنے اختیارات کو ملک میں دہشت گردی کو ختم کرنے اور معاشی ترقی کے لیے استعمال کرنے کے لیے بہترین موقع سمجھتے تھے۔ بہت سارے لوگ اس وجہ سے پریشان تھے کہ اگر پاکستان کی سول حکومت ناکام ہو جاتی ہے یا اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے تو اسلام کے حامی حکومت کو گرا سکتے ہیں جو کہ ملک کے لیے انتہائی خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس طرح پہلی دفعہ بنیاد پرستوں کا ایٹمی ہتھیاروں پر قبضہ ہو سکتا تھا۔

	آصف علی زرداری	سعید الزماں صدیقی	مشاہد حسین سید	مسترد شدہ ووٹ
قومی اسمبلی وسینٹ	281	111	34	10
پنجاب	123	201	36	10
سندھ	162	0	0	1
خیبر پختونخواہ	107	10	3	4
بلوچستان	59	2	2	0
ٹوٹل	732	324	75	25
انتخابی ادارے کے ووٹ	481	153	44	0

اس کا انحصار اس بات پر تھا کہ زرداری اپنے اختیارات کیسے استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت پیپلز پارٹی واحد جماعت تھی جسے ملک کے چاروں ٹوبوں میں حمایت حاصل تھی لیکن پی پی پی کے فوج کے ساتھ پچھلے 40 سال سے تعلقات کشیدہ رہے ہیں کیونکہ یہ فوجی حکومت کی بجائے سویلین اقتدار کی حامی ہے اور اسلامی انتہا پسند جن کی فوج نے افغانستان میں حمایت کی تھی کی سخت مخالف ہے۔ جولائی 2008ء میں آصف علی زرداری نے فوج کے خفیہ ادارے ISI جو کہ سیاست میں دخل اندازی کرتا ہے کے اختیارات کو کم کرنے کی کوشش کی جو کہ ناکام ہو گئی۔ زرداری کو ISI اور فوج کو ان کی ماضی کی پالیسیوں سے علیحدہ کرنا ہو گا اور ISI سے محاذ آرائی سے اجتناب کرنا ہو گا۔ اس کے لیے انہیں آرمی چیف کے ساتھ تعلقات کا راستوار کرنا ہوں گے۔

آصف علی زرداری نے 9 ستمبر 2008ء کو اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ حلف برداری کے موقع پر آصف علی زرداری نے اپنے حامیوں اور ووٹرز کو خطاب کیا اور کہا کہ ان کا انتخاب وفاق کے لیے تقویت کا باعث ہو گا۔ آپ نے کہا کہ اب پارلیمنٹ سب سے برتر ہو گی اور صدر اس کے ماتحت ہو گا۔ انہوں نے اپنے انتخاب کو پاکستان کی سیاسی تاریخ کا سنگِ میل قرار دیا کیوں کہ یہ انتخاب آئین کے مطابق ہوا۔

پاک چین دوستی

پاک چین دوستی وقت کے ساتھ مضبوط ہوتی گئی۔ چین پاکستان کا قابل اعتماد حلیف ہے جس نے ہمیشہ کڑے وقت میں پاکستان کا ساتھ دیا ہے اور پاکستان کی فوجی و اقتصادی ضروریات کے لیے بے پناہ امداد دی ہے۔ جب صدر زرداری نے صدارت کا عہدہ سنبھالا تو انہیں چین کے ساتھ دوستی کی اہمیت و ضرورت کا پورا احساس تھا لہٰذا انہوں نے فوراً اس دوستی کو مزید مضبوط کرنے کے لیے کوشش شروع کی انہوں نے چین کے ساتھ تعلقات کو پہلی ترجیح دی اور تعلقات بڑھانے کے لیے اقدامات کا آغاز کیا۔

چین کی حکومت نے تجارت کے فروغ اور چین اور پاکستان کے درمیان معاشی تعلقات بڑھانے کے لیے صدر زرداری کو چین کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ چینی حکومت کی دعوت پر صدر زرداری نے چین کا دورہ کیا۔ آپ نے 20 فروری 2008ء سے 23 فروری 2008ء تک چین کے صوبہ ہوبی اور شنگھائی میں قیام کیا۔ اس دورے کے دوران صدر زرداری نے مالیات، بنکنگ، وسیع تعمیرات اور شنگھائی کی شہری ترقی میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ آپ نے کہا کہ ان کے دورے کا مقصد چین کے بجلی و توانائی پیدا کرنے اور زراعتی شعبے کی ترقی کا جائزہ لینا تھا۔ آپ نے چین اور پاکستان کے درمیان دوغلے بیج، جدید زراعت ٹیکنالوجی، پانی کا انتظام و انصرام، آب پاشی اور سورج کی شعاعوں کے ذریعے پانی نکالنے کے شعبوں میں تعاون کے لیے دلچسپی کا اظہار کیا۔ دونوں ممالک کے درمیان زراعت، توانائی، بینکنگ، مالیات، معاشرتی بنیادی ڈھانچہ اور دوطرفہ تجارت کے شعبوں کے حوالے سے متعدد معاہدے کیے گئے جو صدر زرداری کی سیاسی و سفارتی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

دوسرا لانگ مارچ

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے وکلا کا لانگ مارچ وقتی طور پر موخر کر دیا گیا تھا۔ وکلاء نے اعلان کیا تھا کہ لانگ مارچ کسی مناسب وقت پر دوبارہ شروع کیا جائے گا۔ وکلاء کے لیڈروں نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر چیف جسٹس کو بحال نہ کیا گیا تو وہ اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ کریں گے اور پارلیمنٹ کے سامنے دھرنا دیں گے جو کہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ تمام ججز بحال نہیں ہو جاتے۔

دوسرا لانگ مارچ 12 مارچ 2008ء کو کراچی سے شروع ہوا۔ لانگ مارچ کا اختتام اسلام آباد میں پارلیمنٹ کے سامنے دھرنے سے ہونا تھا اور اس وقت تک جاری رہنا تھا جب تک کہ جج بحال نہیں ہو جاتے۔

حکومت نے لانگ مارچ میں شامل افراد کو روکنے کے لیے رکاوٹیں کھڑی کی تھیں تاکہ شرکاء اسلام آباد نہ پہنچ سکیں۔ پولیس نے ہائی وے کو بند کر دیا۔ وکلاء کے سرد لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔

لانگ مارچ کے شرکاء نے پابندی کو توڑا اور اسلام آباد پہنچنے کے لیے دوسرے راستے اختیار کیے۔ شرکاء کی بڑی تعداد لاہور میں رکے بغیر اسلام آباد کی طرف روانہ ہوگئی۔ بہت سارے شرکاء ریل گاڑی کے ذریعے اسلام آباد پہنچے۔ لانگ مارچ کے لیڈروں نے یہ اعلان کیا کہ وکلاء ہر صورت میں 16 مارچ 2008ء کو اسلام آباد میں دھرنا دیں گے۔

حکومت نے لانگ مارچ کو کچلنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے۔ اڈیالہ جیل میں دو بیرک خالی کروا لیے گئے۔ نواز شریف تمام پابندیاں توڑ کر اور اپنے اوپر ممکن خودکش حملے کی وارننگ کے باوجود لانگ مارچ کی قیادت کرنے کے لیے اپنے گھر سے باہر آ گئے۔

تاہم اس سے پہلے کہ لانگ مارچ اسلام آباد پہنچتا حکومت نے چیف جسٹس اور دوسرے تمام ججز کو بحال کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی لانگ مارچ اور دھرنا ختم کر دیا گیا۔ اس نازک صورتحال کو سنبھالنے میں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی، آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی اور امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے صدر آصف علی زرداری نے تیزی سے بگڑتی ہوئی صورت حال کا اندازہ لگالیا اور ججز کو بحال کر دیا۔ ججوں کی بحالی کے بعد حکومت اور پی ایم ایل (ن) نے اعلان کیا کہ وہ عوام کی خوشحالی و بہتری کے لیے مل کر کام کریں گے۔

صدر کا پارلیمنٹ سے خطاب

صدر آصف علی زرداری نے 28 مارچ 2008ء کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا۔ اس سے پہلے صدر نے پنجاب سے گورنر راج ختم کیا جس کا مقصد ناراض پی ایم ایل (ن) کے صوبے میں حکومت سازی کے حق کو تسلیم کرنا تھا۔

پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے زرداری نے آئینی ترامیم کے کام کو تیزی سے مکمل کرنے پر زور دیا اور کہا کہ ان کے وہ اختیارات جو پرورز مشرف سے ورثے میں ملے تھے انہیں کم کر کے پارلیمنٹ کو مکمل طور پر بااختیار بنایا جائے۔ صوبہ پنجاب سے گورنر راج ختم کرتے ہوئے صدر زرداری نے واضح اشارہ دیا کہ پیپلز پارٹی صوبہ پنجاب میں پی ایم ایل (ن) کی حکومت بحال ہونے کے بعد حکومت میں شامل نہیں ہوگی۔ آپ نے کہا کہ ہم حزب اختلاف میں بیٹھیں گے اور قانون سازی کے کام میں پوری طرح سے شریک ہوں گے اور حکومتِ پنجاب کے لیے کسی قسم کی مشکل پیدا نہیں کریں گے تاکہ "ہارس ٹریڈنگ" کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کیا جا سکے۔ آپ نے فارورڈ بلاک کی سیاست کو ختم کرنے کا اشارہ دیا اور کہا کہ اب دوبارہ کوئی "چھانگا مانگا" سیاست میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ یہ اس طرف اشارہ تھا جبکہ 1990ء کی دہائی میں پیپلز پارٹی کے ساتھ محاذ آرائی کرتے ہوئے پی ایم ایل (ن) کی حکومت نے پیپلز پارٹی کے اراکین پارلیمنٹ کو چھانگا مانگا جنگل کے ریسٹ ہاؤس میں قید کر دیا تھا اور کسی کو ان کے ساتھ ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ صدر کی تقریر کے دوران پی ایم ایل (ق) نے ہاؤس ٹریڈنگ کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے اجلاس سے واک آؤٹ کیا۔

صدر زرداری نے ماضی کو بھول کر دوبارہ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے دوسری جماعتوں کو دعوت دی۔ آپ نے کہا کہ صوبۂ پنجاب میں ایم ایل (ن) کی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی دونوں جماعتیں پاکستان کی ترقی و خوشحالی کے لئے مل کر کام کر سکتی ہیں۔ تاہم پی ایم ایل (ن) نے خطاب کے وقت صدر زرداری کی خوش آمدید نہ کہا اور صدر کو خوش آمدید کہتے ہوئے ایوان کی ڈیسک بجانے کی کارروائی میں حصہ نہ لیا۔

اپنی تقریر کے دوران صدر نے حکومت کی کارکردگی کا ذکر کیا اور مختلف شعبوں میں حکومت کی کامیابیوں کو ایوان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے کہا کہ باوجودیکہ بیمار معیشت، دہشت گردی اور معاشی بحران جو کہ حکومت کو ورثے میں ملا مختلف شعبوں میں اہم ترقی ہوئی ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ ابھی جمہوریت کی بقا، دہشت گردی کو ختم کرنا اور معاشرتی ڈھانچے کی تعمیر و ترقی کے لئے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

اپنی تقریر کے دوران صدر زرداری نے امریکی صدر اوباما کی بہت تعریف کی جنہوں نے کانگریس کو پاکستان کے لیے ہر سال 1.5 بلین ڈالر کی امداد کا بل منظور کرنے کا کہا تھا۔ آپ نے کہا کہ امریکی صدر کی سوچ سے ایک مثبت تبدیلی آئی ہے۔

بلوچستان کے بارے میں بات کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ صوبہ بلوچستان کے گورنر، وزیر اعلیٰ اور ایم پی اے حضرات نے انہیں کہا ہے کہ تمام جماعتوں کے ممبران پارلیمنٹ پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو بلوچستان کے مسائل کے حل کے بارے تجاویز پیش کرے یہ کمیٹی پہلی پارلیمنٹری کمیٹی کے کئے ہوئے کام کی روشنی میں اپنی تجاویز مرتب کرے گی۔ آپ نے کہا کہ بلوچستان کے بے گھر عوام جنہیں اپنے گھر چھوڑنے پڑے کو واپس اپنے گھروں میں جانے کے لیے مواقع پیدا کئے جائیں گے۔ آپ نے کہا کہ سیاسی لوگ جو جلا وطن ہو گئے انہیں واپس لانے اور عام معافی دینے کے اقدامات کئے جائیں گے۔ صدر نے کہا کہ حکومت نے بلوچستان کی مالی مشکلات کے حل کے لیے اقدامات کئے ہیں اور بلوچستان کے لیے 47 بلین روپے کی امداد جاری کی ہے۔

صدر نے پاکستان کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے کہا کہ پاکستان ہندوستان کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کرنے چاہتا ہے۔ انہوں نے ممبئی حملوں کو خوش اسلوبی سے سنبھالنے کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کا اشارہ دیا۔ انہوں نے ممبئی حملوں کو خوش اسلوبی سے سنبھالنے پر حکومتِ پاکستان کی تعریف کی۔ آپ نے کہا ممبئی حملوں کے مجرموں کو پکڑنے اور قانون کے حوالے کرنے کے لیے پاکستان کے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔

ملک کے تمام سیاسی و معاشرتی حلقوں نے صدر کے خطاب کی تعریف کی اور کہا کہ صدر نے کمال مہارت سے ملک کو درپیش تمام مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ تاہم بعض حلقوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ ملک کو دوبارہ پٹڑی پر لانے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

مالاکنڈ ڈویژن میں فوجی آپریشن

سوات ایک پرسکون اور خوبصورت ریاست ہوا کرتی تھی۔ یہ ایک شاہی ریاست تھی جس کا اپنا کوئی قانونی ڈھانچہ نہ تھا۔ اس کے حکمران کا نام میاں عبدالحق جہانزیب تھا جو والی صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ والی صاحب نے اپنے عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دے رکھی تھیں۔ انہوں نے ریاست میں تعلیمی ادارے قائم کئے اور عوام کو صحت کی بہترین سہولتیں بہم پہنچا رکھی تھیں۔ سوات ایک بہترین صحت افزا پہاڑی مقام تھا جو سیاحوں کے لیے بہت زیادہ کشش رکھتا تھا۔ تمام ملک سے سیاح سوات کے پرفضا مقامات کی سیر کے لیے جوق در جوق آتے تھے جس سے ریاست کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا تھا۔ سوات 1917ء سے 1969ء تک شاہی ریاست رہی۔

ریاست سوات کے اضلاع بونیر، سوات شانگلا اور کوہستان کے کچھ حصوں پر مشتمل تھی۔ تقسیم ہند سے قبل ہی سوات میں بہترین تعلیمی اداروں کا سلسلہ قائم تھا۔ 1959ء میں سوات کا پاکستان کے ساتھ ادغام ہوا اور مٹہ اور داگار میں ڈگری کالجز قائم کئے گئے۔ وادیٔ سوات ایک مالدار ریاست تھی جہاں کے عوام خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں پر صحات، تعلیم اور رسل و رسائل کا بہت بڑا بنیادی ڈھانچہ موجود تھا۔ یہاں کی زمین زرخیز تھی جہاں خوبانی، آڑو، آلو بخارہ اور سیب بہ کثرت پیدا ہوتے تھے۔ کاشت کاری اور مالی سرگرمیوں کی وجہ سے ملازمت کے مواقع وافر تعداد میں موجود تھے۔ انتہا پسندی اور مذہبی فرقہ پرستی بالکل مفقود تھی۔ عوام صلح جو، مہمان نواز اور روادار تھے۔

پاکستان کے ساتھ ادغام کے بعد ریاست سوات کو ضلع کا درجہ حاصل ہوا جس کی وجہ سے چند انتظامی، عدالتی اور قانونی مسائل پیدا ہوئے۔ مقامی لوگوں نے اس امید کے ساتھ نئے نظام کو قبول کر لیا کہ وقت کے ساتھ مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

حکومت نے سیاسی مجبوری اور مصلحت کی بنا پر جب کہ عدالتی نظام کو کام کرتے ہوئے صرف ایک سال کا عرصہ گزرا تھا 1976ء میں عدالتوں کے اختیارات واپس لے لیے۔ اس کے بعد حکومت نے PATA یعنی Provincial Administrator Tribunal Areas اور Criminal Laws (Speceal Provision) قانون 1975ء اور PATA Civil Procedure 1975ء لاگو کر دیا۔ یہ قوانین 1994ء تک لاگو رہے جس کے بعد پشاور ہائی کورٹ نے ان قوانین کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ان قوانین کے کچھ حصے آئین کی دفعہ 26 سے متصادم ہیں۔ پشاور ہائی کورٹ کے اس حکم کی وجہ سے انتظامی اہل کار، اور مقامی خان، ملک اور دوسرے بااثر لوگ اپنے عدالتی اختیارات سے محروم ہو گئے۔ لہٰذا انہوں نے مذہبی لیڈروں کے ساتھ ساز باز کی اور انہیں شریعت کے نفاذ کے لیے تحریک چلانے پر اکسایا۔ جماعت اسلامی کے ایک کبیدہ خاطر رکن مولانا صوفی محمد کو اس تحریک کو چلانے کے لیے آمادہ کیا گیا اور ان کی خاطر خواہ سرپرستی کی گئی۔ وقت کے ساتھ مولانا صوفی محمد نہ صرف سوات بلکہ اس سے ملحقہ اضلاع دیر، شانگلا، کوہستان اور بونیر میں ہر دل عزیز ہو گئے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خفیہ اداروں نے سوات اور دوسرے ملحقہ علاقوں میں جہادی تنظیموں کو قائم کیا۔ جہادی گروہ 9/11 کے حملوں کے بعد متحرک ہوئے اور ہندوستان کی خوشنودگی کی خاطر امریکہ نے جہادی گروہوں کی سرپرستی کی۔

شروع میں مقامی لوگوں نے جہادی تنظیموں سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا لیکن مقامی خان اور سرکردہ ملکوں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے لوگوں کو بالآخر جہادی گروہوں کی سرگرمیوں میں ملوث ہونا پڑا۔ بالخصوص نچلے طبقے کے لوگ بڑی آسانی سے دہشت گردی کا شکار ہو گئے اور اس طرح پورا علاقہ دہشت گردی کی لپیٹ میں آ گیا۔ جنگ جو دہشت گردوں میں بیرونی لوگ، سمگلر، لکڑی چور منشیات کے سوداگر اور اغوا کنندگان برائے تاوان والے شامل تھے۔

اس دوران صوبۂ سرحد میں متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت تھی جو کہ چھ جماعتوں کا اتحاد تھا اور سوات کے تمام ممبران پارلیمنٹ کا تعلق متحدہ مجلسِ عمل سے تھا۔ MMA کی حکومت نے ضلعی انتظامیہ کو مولانا فضل اللہ کے خلاف کارروائی کرنے سے روک دیا اور کہا کہ مسئلے کو ایم ایم اے ممبرانِ پارلیمنٹ خود حل کریں گے۔ MMA کے خیال میں غیر قانونی FM ریڈیو کو بند کرنا قرآنِ پاک کی تبلیغ پر بندش لگانے کے مترادف تھا۔ MMA حکومت کی حمایت سے فضل اللہ کو تقویت ملی اور وہ غیر قانونی FM ریڈیو چلاتے رہے۔

جنگ جو دہشت گرد بالکل ان پڑھ تھے جنہوں نے کبھی کسی سکول کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ شریعت سے بے پرواہ اور نابلد تھے اور اسلام کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ جنگلات سے لکڑی کاٹتے تھے اور مارکیٹ میں بیچ دیتے یا دوسرے علاقوں کو سمگل کر دیتے تھے۔ جنگ جوئی کے پھیلاؤ کے دوران اغوا برائے تاوان کی سرگرمی بہت تیزی سے پھیل گئیں۔ جنگ جوؤں نے جرائم کا تمام ریکارڈ جلا کر تلف کر دیا تھا۔ جب ملٹری آپریشن شروع کیا گیا تو تقریباً 5000 دہشت گردوں میں جدید ہتھیار تقسیم کیے گئے۔

مولانا صوفی محمد نے جماعتِ اسلامی کو چھوڑ کر تنظیم نفاذ شریعتِ محمدی قائم کی جس کا مقصد اسلامی قوانین کو نافذ کرنا تھا۔ یہ ایک جنگ جُو وہابی تنظیم تھی جو مالاکنڈ ڈویژن اور باجوڑ ایجنسی میں ظہور پذیر ہوئی اور جلد ہی اس کا اثر سوات اور ملحقہ علاقوں میں پھیل گیا۔

مولانا صوفی محمد کے داماد مولانا فضل اللہ نے برقی ذرائع ابلاغ کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کیا اور لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے ٹی وی سیٹوں کو جلا دیں۔ انہوں نے DVDs اور CDs کی بہت مخالفت کی اور CDs کا کاروبار کرنے والی دکانوں کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی۔ مولانا فضل اللہ نے اپنا ریڈیو سٹیشن FM کے نام سے قائم کیا جہاں سے حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ نشر کیا جاتا تھا۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم اور پولیو کے ٹیکوں کی مخالفت کی۔ انہوں نے کھلم کھلا ریاست کے خلاف بولنا شروع کیا اور خوف و ہراس پھیلانے کی خاطر بے گناہ اور معصوم لوگوں کو قتل اور ذبح کرنا شروع کر دیا۔ خصوصاً ان کا نشانہ حکومتی اہل کار سکیورٹی فورسز اور

فرشتہ کا نشیلری ہوا کرتی تھیں۔ ان کا اگلا نشانہ صاحب حیثیت اور بااثر طبقے تھے جو ان کے خیال کے مطابق ان کے پروگرام کو ناکام بنا سکتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی شریعت نافذ کرنے کا مطالبہ نہ کیا کیوں کہ ان کا اصل مقصد اختیار حاصل کرنا تھا تاکہ وہ اپنی حکومت قائم کر سکیں۔

اسی دوران تحریک طالبان منظر عام پر نمودار ہوئی۔ یہ 12 دسمبر 2007ء کو قائم کی گئی۔ شمالی وزیرستان کے رہائشی بیت اللہ محسود کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس کا مقصد NATO کے خلاف لڑنا اور پاکستانی افواج جو کہ FATA اور خیبر پختونخوا میں ملٹری آپریشن کر رہی تھیں کے خلاف جہاد کرنا تھا۔ تحریک طالبان نے TNSM کے ساتھ اتحاد کر لیا تاکہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ تحریک طالبان نے وادئ سوات کے مختلف علاقوں سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور حکومت کے اختیار کو للکارا۔

تحریک طالبان کے جنگی کارروائیوں میں ملوث ہو جانے سے حکومت پر دباؤ بڑھ گیا لیکن حکومت نے از خود نرمی برتی اور TNSM کے راہنما صوفی محمد اور حکومت کے درمیان نظام عدل 2009ء معاہدہ طے پایا جس کی رو سے طے ہوا کہ مالاکنڈ ڈویژن اور باجوڑ ایجنسی میں شریعت نافذ کی جائے گی۔ حکومت نے نفاذ شریعت کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ پالیمنٹ نے نظام عدل قانون کی منظوری دے دی جس پر صدر آصف علی زرداری نے دستخط کر دیے۔ نظام عدل 2009ء کا معاہدہ طے پا جانے کے بعد مولانا صوفی محمد نے میدان میں ایک بڑے جلسۂ عام سے خطاب کیا اور نظام عدل معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ملک کے بقیہ حصوں اور تمام اداروں کو غیر اسلامی اور واجب القتل قرار دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی تحریک طالبان نے جارحیت اور جنگی راستہ اپنایا۔ انہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں، سڑکوں پر بارودی سرنگیں بچھا دیں اور خندقیں کھودنا شروع کر دیں۔ انہوں نے لڑکیوں کے سکولوں کو بموں سے اڑا دیا، بزرگان دین کے مزاروں کو تباہ کر دیا اور حکومتی عمارتوں اور تنصیبات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ کئی طالبان دہشت گردوں نے تھانوں کا گھیراؤ کر لیا۔ طالبان کے منظر عام پر آجانے سے تعلیم، صحت اور ذرائع رسل و رسائل کا بنیادی ڈھانچہ جو کہ سال ہا سال کی محنت سے تعمیر ہوا تھا چند مہینوں میں تباہ و برباد ہو گیا۔

ان تمام غیر قانونی کارروائیوں کے باوجود حکومت نے صبر کا دامن نہ چھوڑا اور باغیوں کو کہا کہ وہ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں۔ حکومت ٹکراؤ سے بچنا چاہتی تھی کیوں کہ اس سے بے گناہ لوگوں کا جانی نقصان ہونے کا اندیشہ تھا۔

لیکن طالبان نے حکومت کی بات پر کان نہ دھرا اور حکومت کے اختیار کو للکارتے رہے۔ سیکورٹی فورسز کی کارروائی کے باوجود سوات سے مسلح طالبان کا صفایا نہ کیا جا سکا جس کے بعد حکومت نے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی کا ارادہ کیا۔

آپریشن ''راہِ راست''

جب طالبان کی کارروائیاں ناقابل برداشت ہو گئیں تو آخر کار عوام چیخ اٹھے اور باغیوں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا۔ طالبان کی کارروائیوں کی وجہ سے عوام کے جان و مال کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا اور طالبان کی پیش قدمی کی وجہ سے پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں پر دباؤ بڑھ گیا۔ آخر کار حکومت نے کارروائی کا فیصلہ کیا صدر، وزیر اعظم اور آرمی چیف نے فوج کو حکومت کے اختیار کو بحال کرنے کے لیے فوج کو کارروائی کا حکم دیا۔

آپریشن ''راہ راست'' 28 اپریل 2009ء کو اس وقت شروع کیا گیا جب کہ طالبان نے فوج کے ایک دستے پر حملہ کیا۔ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے باقاعدہ طور پر 17 اپریل 2009ء کو فوج کو طالبان کو مکمل طور پر ختم کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم میں سول اور فوج کے اعلیٰ عہدے داروں کی مرضی شامل تھی۔

نظام عدل کے معاہدے کے بعد سوات کے گردونواح میں طالبان کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے ملک کے معاشرتی اور سیاسی حلقوں میں سخت اضطراب پایا جاتا تھا۔ یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ یہ کارروائیاں نہ صرف طالبان کو پنجاب اور خیبر پختونخوا کے دوسرے علاقوں میں کارروائی پر اکسائیں گی بلکہ اگر حکومت ناکام ہو جاتی ہے تو اس سے پنجاب میں طالبان کے حامیوں کو تقویت پہنچے گی۔

حکومت نے اپنی طرف سے امن قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ حکومت نے TNSM کا نظام عدل کا مطالبہ مان لیا اور پارلیمنٹ اور صدر نے اسے قبول کر لیا۔ یہ سب کچھ مسلح تصادم سے بچنے کے لیے کیا گیا تاکہ بے گناہ معصوم لوگوں کی زندگیوں کو بچایا جا سکے۔ حکومت نفاذ شریعت میں مخلص تھی اور TNSM نے خیبر پختونخوا حکومت اور صوفی محمد کے درمیان طے پائے گئے معاہدے کا غلط مطلب لیا۔ انہوں نے معاہدے کو حکومت کی کمزوری سمجھا اور بونیر اور شانگلہ میں حکومت کی تنصیبات اور علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

23 اپریل 2009ء کو طالبان نے فرنٹیئر کانسٹیبلری کے دستے پر حملہ کیا۔ 25 اپریل کو انہوں نے سیکورٹی فورسز کو علاقے میں داخل ہونے سے روکا۔ چونکہ طالبان ہر قیمت پر آگے بڑھنا چاہتے تھے اور صوفی محمد اتنی سوات معاہدے کی پابندی کرانے سے عاجز تھے یا وہ نہیں چاہتے تھے کہ طالبان معاہدے کی پابندی کریں لہٰذا سیکورٹی فورسز کو مجبوراً لوئر دیر میں بھی فوجی کارروائی کرنا پڑی جس میں اگلے چند دنوں کے دوران تیزی آ گئی اور سیکورٹی فورسز بونیر میں داخل ہو گئیں۔

حکومت نے سوات میں فوجی آپریشن پر سیاسی جماعتوں کی رائے جاننے کے لیے 18 مئی 2009ء کو کل جماعتی کانفرنس بلائی۔ فوجی ایکشن کے حق میں متفقہ قرارداد منظور کی گئی۔ کل جماعتی کانفرنس نے عمل کر طالبان پر جوابی کارروائی کی اور فوج کو کہا کہ طالبان کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔

سوات آپریشن پاکستان کی تاریخ میں اہم موڑ ثابت ہوا جس سے مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف کارروائی کا آغاز ہوا۔ پاکستان کی فوج نے ملک سے دہشت گردی کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے انتہائی بہادری سے کارروائی کی۔

فوجی آپریشن کے نتیجے میں عوام کی بہت بڑی تعداد کو فائرنگ سے بچنے کے لیے اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسری محفوظ جگہوں پر منتقل ہونا پڑا۔ بے گھر ہونے والے افراد کو صوبے کے دوسرے علاقوں میں کیمپوں میں ٹھہرایا گیا۔ سوات کے فوجی آپریشن کی وجہ سے تقریباً ایک لاکھ سے زائد افراد بے گھر ہوئے۔ ان بدنصیب افراد کے لیے بین الاقوامی امداد حاصل کی گئی۔

آپریشن ''راہ راست'' کے شروع ہوتے ہی پاکستان کے بڑے شہروں میں مہلک خودکش حملوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان حملوں میں اہم شخصیات جو بیت اللہ محسود کے مخالف تھے کو نشانہ بنایا گیا۔ 12 جون 2009ء کو لاہور میں مشہور مذہبی سکالر ڈاکٹر سرفراز نعیمی کو ان کے دفتر میں خودکش حملے میں ہلاک کر دیا گیا۔ مفتی سرفراز نعیمی نے بیت اللہ محسود کی مذمت کی اور خودکش حملوں کو اسلام میں حرام قرار دیا۔ انہوں نے فوجی آپریشن کی حمایت کی تھی اور پاکستان کی فوج کو طالبان کو مکمل طور پر ختم کرنے پر زور دیا تھا۔

لاہور میں ISI اور ریسکیو 15 کے دفاتر پر خودکش حملوں میں متعدد افراد ہلاک ہو گئے۔ قاری زین الدین جو کہ بیت اللہ محسود کے قریبی ساتھی تھے اپنے ہی سیکورٹی گارڈ کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ انہوں نے بیت اللہ محسود کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور خودکش حملوں کی مذمت کی تھی۔ پشاور کے پرل کانٹیننٹل ہوٹل پر خودکش حملہ ہوا جس میں کئی افراد ہلاک ہوئے جس کی ذمہ داری بیت اللہ محسود کی طالبان نے قبول کی۔

ڈاکٹر سرفراز نعیمی کے قتل پر ملک بھر میں احتجاجی مظاہرے ہوئے جس میں بیت اللہ محسود کی بھرپور مذمت کی گئی۔ ڈاکٹر سرفراز نعیمی کے قتل پر بیت اللہ محسود کے رہائشی علاقے جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشن شروع کیا گیا۔ سیکورٹی فورسز نے جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشن کو بیت اللہ محسود کے ڈاکٹر سرفراز نعیمی کو قتل کروانے کا ردعمل قرار دیا۔ جنوبی وزیرستان میں آپریشن ''راہِ نجات'' بیت اللہ محسود کو ختم کرنے اور فوج اور سول حکومت کی حوصلہ افزائی کے لیے شروع کیا گیا۔

اسی دوران عوام میں طالبان کے خلاف زبردست مخالفانہ جذبات پیدا ہوئے جس سے سیکورٹی فورسز کے اندر خود اعتمادی اور حوصلے میں اضافہ ہوا۔ عوام طالبان کی ظالمانہ سرگرمیوں سے نالاں ہو گئے اور انہوں نے پاکستانی فوج کے حق میں مظاہرے کئے۔

آپریشن راہِ نجات

سوات میں راہِ راست آپریشن کے بعد حکومت نے جنوبی وزیرستان سے طالبان کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے آپریشن راہِ نجات شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ جنوبی وزیرستان طالبان کے مرحوم امیر بیت اللہ محسود کا آبائی علاقہ تھا اور دہشت گردوں کی پناہ گاہ سمجھا جاتا تھا۔ طالبان کے نئے امیر حکیم اللہ محسود نے بیت اللہ محسود کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں خودکش حملوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔

تحریک طالبان نے اس دھمکی کے بعد لاہور، پشاور، اسلام آباد اور راولپنڈی میں خودکش حملے شروع کیے۔ انتہائی خطرناک اور پوری منصوبہ بندی کے بعد GHQ پر حملہ کیا گیا جس نے حکومت کو ہلا کے رکھ دیا۔ GHQ پر حملے کے بعد تحریک طالبان کے خلاف کاروائی کرنا لازمی ہو گیا۔

آخر کار فوج نے 17 اکتوبر 2009ء کو جنوبی وزیرستان میں طالبان کی محفوظ جائے پناہ پر تین اطراف سے حملہ کیا۔ اس حملے میں فوج کے کچھ جوان شہید ہوئے۔ اس حملے میں ایئر فورس کے جیٹ لڑاکا طیارے استعمال کیے گئے۔ اس کے علاوہ گن شپ ہیلی کاپٹرز اور ہزاروں کی تعداد میں سپاہیوں نے محسود قبیلے کی مرکزی جگہ ''مکین'' پر تین اطراف سے حملہ کیا۔

آپریشن راہِ نجات دہشت گردوں کے خلاف سب سے زیادہ مشکل ثابت ہوا جس کی وجہ علاقے کا دشوار گزار ہونا تھا۔ اس کے علاوہ خودکش حملوں (جن میں GHQ پر حملہ سب سے زیادہ خطرناک تھا) نے بھی آپریشن راہِ نجات کو مشکل ترین بنا دیا۔ سوات آپریشن کی طرح اس دفعہ بھی سیاسی جماعتوں نے فوجی ایکشن کی بھرپور حمایت کی۔ ذرائع ابلاغ نے بھی فوج کی حمایت کی اور آپریشن راہِ نجات کو حکومت کا صحیح قدم قرار دیا۔

اٹھارویں آئینی ترمیم

سیاسی منظر:

قائداعظم کے ذہن میں پاکستان کا تصور ایک پارلیمانی ریاست کا تھا جو کہ برطانوی طرز کے پارلیمانی نظام سے مشابہ تھا۔ اس طرح کے نظام میں پارلیمنٹ اعلیٰ قانون ساز ادارہ ہوتی ہے۔ گو انتظامی اختیارات صدر/بادشاہ کے پاس ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وزیراعظم اور اس کی کابینہ انتظامی معاملات کو چلاتی ہے۔ صدر ایک دکھاوے کا سربراہِ مملکت ہوتا ہے۔ وزیراعظم اور اس کی کابینہ اصل میں پارلیمنٹ کے سامنے اپنے ہر کام کے لیے جوابدہ ہوتی ہے۔

فوجی حکمرانوں کی سیاسی معاملات میں مداخلت نے پاکستان کے پارلیمانی نظام کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایوب خان نے 1956ء کے آئین کو منسوخ کر دیا اور چار سال کے مارشل لاء کے بعد 1962ء میں اپنا آئین نافذ کیا۔ 1962ء کے آئین سے ایوب خان نے وسیع انتظامی اختیارات حاصل کر لیے تھے جس کی وجہ سے ملک میں آمرانہ طرز کا صدارتی نظام رائج ہو گیا۔ 1962ء کے آئین کے نافذ کردہ صدارتی نظام کی وجہ سے سیاسی حلقوں میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے جو ملکی انتشار کا باعث بنے۔ آخر کار ایوب خان کو اقتدار یحییٰ خان کے حوالے کرنا پڑا۔ یحییٰ خان نے ایک مرتبہ پھر مارشل لاء نافذ کیا اور ملک کی تقسیم کی راہ ہموار کی اور یحییٰ خان کو آدھا ملک علیحدہ ہو جانے کے بعد اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑا۔

1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو اقتدار پر فائز ہوئے۔ ان کی جماعت پیپلز پارٹی نے 1970ء کا انتخاب واضح اکثریت سے جیتا تھا جس بنا پر انہوں نے اقتدار پر اپنا حق جتایا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ 1973ء کا آئین بنانا تھا جسے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل تھی۔ 1973ء کا آئین آج تک رائج ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ انہوں نے 1973ء کے آئین کو منسوخ نہ کیا بلکہ عارضی طور پر معطل کر دیا لیکن جنرل ضیاء الحق نے 1973ء کے آئین میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں کیں جن کی وجہ سے آئین کا مقصد اور اس کی روح بری طرح مجروح ہو گئے۔ ضیاء نے آئین میں آٹھویں ترمیم متعارف کروائی جس نے مکمل طور پر آئین کی شکل وصورت کو بگاڑ کے رکھ دیا۔

ضیاء الحق کے بعد ایک اور فوجی آمر جنرل پرویز مشرف نے مزید آئین کو مسخ کرنے میں اپنا کردار ادا کیا اور آئین میں متعدد ترامیم متعارف کروائیں۔ انہوں نے سترہویں ترمیم متعارف کروائی اور ملک پر حکومت کرنے کے لیے وسیع اختیارات کر لیے۔ انہوں نے اکتوبر 1999ء میں نواز شریف کی منتخب حکومت کو برطرف کر دیا اور حکومت کے تمام اختیارات حاصل کر لیے۔ مشرف نے پی سی او جاری کیا اور چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو برطرف کر دیا جس کی وجہ سے ملک بھر میں وکلاء احتجاج شروع ہوا۔ وکلاء کی تحریک نے پرویز مشرف کی حکومت کو بوکھلا کے رکھ دیا اور انہیں بالآخر اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑا۔

اوپر دیے گئے حقائق کی روشنی میں یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ بے شمار ترامیم کی وجہ سے 1973ء کا آئین اپنی افادیت اور مقصد کھو چکا ہے اور اس کو نئے سرے سے ٹھیک کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ حکومت نے آئینی اصلاحات کے لیے پارلیمانی کمیٹی قائم کی جس نے محنتِ شاقہ سے اٹھارویں ترمیم کا مسودہ تیار کیا۔ اس مسودے پر تمام سیاسی جماعتوں کی رائے لی گئی اور سب نے اس مسودے پر دستخط کر دیے۔ تاہم اتفاق رائے سے پہلے پی ایم ایل (ن) کے سربراہ نے قلابازی لگائی اور کہا کہ ان کی جماعت عدالتی کمشن بنانے کی تجویز سے متفق نہیں اور مطالبہ کیا کہ عدالتی کمشن پر سپریم کورٹ کے جج کی نامزدگی کے بارے میں چیف جسٹس سے رائے لی جائے۔ تاہم یہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل کر لیا گیا اور پارلیمانی کمیٹی برائے آئینی اصلاحات نے اتفاق رائے سے اٹھارویں ترمیم کا مسودہ پیش کر دیا۔ 30 مارچ 2010ء تک تمام متنازعہ معاملات جن میں صوبۂ سرحد کا نیا نام اور اعلیٰ عدالتوں میں ججوں کی نامزدگی شامل تھی پر اتفاق رائے ہو گیا تھا۔

اٹھارویں ترمیم کے نمایاں خدوخال

اٹھارویں ترمیم پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہم واقعہ تھا۔ اس ترمیم کی وجہ سے پارلیمنٹ کی ساکھ بحال ہوئی کیونکہ صدر کے اختیارات جو سترہویں ترمیم کی وجہ سے اسے حاصل ہو گئے تھے واپس وزیراعظم کے پاس چلے گئے۔ اٹھارویں ترمیم کے نمایاں خدوخال مندرجہ ذیل ہیں:

(1) 58(2)b کے تحت صدر کے اسمبلی برخاست کرنے کے اختیار کو ختم کر دیا گیا ہے۔

(2) صوبہ سرحد کے نام NWFP کو بدل کر نیا نام خیبر پختونخواہ رکھ دیا گیا ہے۔

(3) اعلیٰ عدالتوں میں ججز کی نامزدگی کے لیے مناسب طریقہ کار تجویز کیا جائے گا۔

(4) صوبوں کو مزید خودمختاری دی جائے گی اور مشترکہ لسٹ کو ختم کر دیا جائے گا۔

(5) چیف الیکشن کمشنر کی تعیناتی حزب اختلاف کے سربراہ کے مشورے پر کی جائے گی۔

(6) اسلام آباد ہائی کورٹ کو بحال کیا جائے گا۔

اٹھارویں ترمیم کا مسودہ 17 اپریل 2010ء کو قومی اسمبلی میں برائے بحث پیش کیا گیا۔ قومی اسمبلی نے بل پر بحث ایک دن میں مکمل کر کے 18 اپریل 2010ء کو مسودے کی منظوری دے دی۔ اس موقع پر قومی اسمبلی نے اتفاق رائے کا غیر معمولی مظاہرہ کیا جب کہ مسودے کے خلاف کوئی ووٹ نہ ڈالا گیا۔ سابق فوجی آمر جنرل ضیاء الحق کا نام آئینی تاریخ کے صفحات سے حذف کر دیا گیا اور سترھویں ترمیم کو آئین سے نکال دیا گیا۔

پاکستان مسلم لیگ (ق) نے صوبہ سرحد کے لیے نیا نام خیبر پختونخواہ کرنے اور مشترکہ لسٹ کو منسوخ کیے جانے کے خلاف ترمیمیں پیش کیں جو کہ رد کر دی گئیں۔ پی ایم ایل (ن) کے تین ممبران نے NWFP کا نام تبدیل کرنے پر اسمبلی سے واک آؤٹ کیا۔ یہ ان کی پارٹی کی پالیسی کی خلاف ورزی تھی کیونکہ پی ایم ایل (ن) نے ازخود اے این پی کے تجویز کردہ نام پختونخواہ پر رضامندی ظاہر کی تھی اور نیا نام خیبر پختونخواہ تجویز کیا تھا۔ تین اراکین جن میں مہتاب احمد خان، کیپٹن صفدر جن کا تعلق ہزارہ ڈویژن سے تھا اور پنجاب سے صاحبزادہ فضل کریم کے احتجاج سے پی ایم ایل (ن) کو خفت کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم بعد میں تینوں اراکین نے ترمیم کے حق میں ووٹ دیے۔

اسمبلی میں رائے دہی کے دوران پی ایم ایل (ن) اور پی ایم ایل (ق) کے کچھ اراکین نے شق 17(4) کو حذف کرنے کے لیے اپنی اپنی پارٹی کی پالیسی کے خلاف ووٹ دیا۔ شق 17(4) سابق فوجی آمر جنرل پرویز مشرف نے آئین میں شامل کی تھی۔ اس شق کے مطابق ہر سیاسی جماعت کے لیے باقاعدگی سے اپنے انتخابات کروانا لازمی قرار دیا گیا تھا۔

پی ایم ایل (ق) کی کشمالہ طارق نے شق 17(4) کو حذف کرنے پر احتجاج کیا اور کہا کہ اس شق کو ختم کر دینے سے وراثتی اور خاندانی سیاست کو تقویت ملے گی اور پارٹی سربراہوں کو زندگی بھر پارٹی عہدوں پر براجمان رہنے کا موقع ملے گا۔ پی ایم ایل (ن) کے مخدوم جاوید ہاشمی اور خواجہ سعد رفیق جنہیں پرویز مشرف نے پابندِ سلاسل کیا تھا نے بھی شق 17(4) کو بحال رکھنے پر زور دیا۔

ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پی پی پی اور پی ایم ایل (ن) کی قیادت آرٹیکل 17(4) کو آئین سے حذف کرنے بارے متفق تھی۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آرٹیکل 17(4) کے بحال رہنے کی صورت میں پارٹی پر ان کی اجارہ داری خطرے میں پڑ جائے گی۔ آصف علی زرداری اور نواز شریف یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا ان کی پارٹی پر گرفت کو للکارے اور پارٹی قیادت کے لیے ان کے مد مقابل کھڑا ہو جائے۔ یہ دونوں اپنی جماعتوں کو ذاتی جاگیر سمجھتے تھے اور کسی دوسرے کو سر اٹھانے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ آئینی اصلاحات کمیٹی کے سربراہ رضا ربانی نے آرٹیکل 17(4) کو حذف کرنے کی حمایت کی۔ آپ نے کشمالہ طارق کی آرٹیکل 17(4) کو بحال رکھنے کی تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ شق ایک ''بدترین فوجی ڈکٹیٹر'' نے آئین میں شامل کی تھی اور اس کو حذف کرنا ضروری ہے تاکہ فوجی ڈکٹیٹروں کی یاد کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

اٹھارویں ترمیم کے بل کو ملک گیر حمایت ہوئی۔ 8اپریل 2010ء کو ترمیم کا بل قومی اسمبلی میں بغیر کسی رکاوٹ کے منظور ہو گیا۔ قومی اسمبلی میں ووٹنگ کے دوران پی ایم ایل (ن) اور پی ایم ایل (ق) کے کچھ اراکین نے اپنی اپنی پارٹی کی پالیسی کے خلاف بل پر اعتراض کیے اور آرٹیکل 17(4) کو حذف کرنے کی مخالفت کی۔

صوبہ سرحد کے نام کو تبدیل کر کے خیبر پختونخواہ رکھنے پر اسمبلی کے اراکین میں اختلاف رائے ظاہر ہوا پی ایم ایل (ق) 20 اراکین اسمبلی نے آرٹیکل میں ترمیم کے خلاف ووٹ دیا جس کا تعلق صوبۂ سرحد کا نام تبدیل کر کے خیبر پختونخواہ رکھنے سے تھا۔ ہزارہ ڈویژن میں صوبہ سرحد کا نام تبدیل کرنے پر سخت احتجاج ہوا۔ ایبٹ آباد میں پولیس کے ساتھ جھڑپوں کے دوران سات افراد ہلاک ہو گئے۔ سابق وزیراعلیٰ پرویز الٰہی نے ہزارہ ڈویژن میں ہلاکتوں اور احتجاج پر نواز شریف کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ انہوں نے پریس کانفرنس میں یہ کہا کہ ہزارہ ڈویژن میں نواز شریف کی تنگ نظر سیاست اور خودغرض مفادات کی وجہ یہ صورت حال پیدا ہوئی۔ کیونکہ وہ تیسری بار وزیراعظم بننا چاہتے تھے۔ پرویز الٰہی کے مطابق نواز شریف نے صوبۂ سرحد کے نئے نام پر صرف اس صورت میں سمجھوتہ کیا جبکہ تیسری بار وزیراعظم بننے پر آئینی پابندی کو حذف کر دیا گیا۔

قومی اسمبلی سے منظور ہونے کے بعد اٹھارویں ترمیم کا بل 12 اپریل 2010 کو سینٹ میں پیش کیا گیا۔ صوبۂ سرحد کے نئے نام خیبر پختونواہ کرنے پر ہزارہ ڈویژن میں پیدا ہونے والی امن عامہ کی صورتحال کے پیش نظر حزب اختلاف نے ترمیم کے بل کو سینٹ میں پیش ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ تاہم حکومت نے حزب اختلاف کی مخالفت پر قابو پا لیا اور انقلابی ترمیم سینٹ میں بحث کے لئے متعارف ہوگئی۔ سینٹ میں پی ایم ایل (ق) کے متعدد اراکین نے صوبۂ سرحد کے نئے نام خیبر پختونخواہ پر نظرثانی کے لئے آواز بلند کی۔

اٹھارویں ترمیم میں سب سے اہم شق سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں ججوں کے طریقۂ نامزدگی سے متعلق تھی۔ اٹھارویں ترمیم کی رو سے ججوں کی تقرری کے بارے صدر کے لئے ضروری نہ تھا کہ وہ چیف جسٹس کے نامزد جج کی تقرری کریں۔ اس سے پہلے بھی آئین میں یہ ضروری نہ تھا کہ صدر چیف جسٹس کے نامزد کردہ جج کو ہی مقرر کریں۔ چیف جسٹس نے یہ اختیار ازخود 1996 کے ججز کیس میں دیئے گئے فیصلے کی بنا پر حاصل کر لیا تھا۔

اٹھارویں ترمیم کے بعد اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی تقرری کا اختیار ساتھ رکنی عدالتی کمشن کو دیا گیا ہے جس کے سربراہ چیف جسٹس ہوں گے۔ اس کمشن میں سپریم کورٹ کے دو سینئر جج، وفاقی وزیر قانون، اٹارنی جنرل، ایک ریٹائرڈ جج اور ایک نمائندہ کونسل بہ حیثیت اراکین شامل ہوں گے۔ اس کمشن کی سفارشات پر جائنٹ پارلیمانی کمیٹی نظرثانی کرے گی جو ایک مختصر مدت کے دوران اپنی سفارشات کو مکمل کر لے گی۔ اس کمیٹی میں حکومت اور حزب اختلاف کی برابر نمائندگی ہوگی۔

حکومت وقت کا تختہ الٹنے اور منتخب حکمران کو قتل کرنے کے خلاف اقدامات۔

اٹھارویں ترمیم کے تحت مشترکہ مفادات کی کونسل نے صوبوں اور وفاق اور صوبوں کے باہمی اختلافات کو ختم کرنے کے لئے زیادہ اختیارات اصل کیے ہیں۔ ان اختیارات اور کردار کی بنا پر ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں آسانی ہو جائے گی جنہیں فوجی حکمران یا کمزور سیاسی حکومتیں ختم کرنے سے قاصر تھیں۔ اب فوج کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ اپنے مفادات کے لئے ان جھگڑوں اور اختلافات کو حل کرنے میں کاہلی برتیں۔

اٹھارویں ترمیم کے ذریعے عوام نے برائے نام ذمہ داری کی بجائے حقیقی ذمہ داری پر زور دیا ہے اور 1973 اور 1999 کی طرح برائے نام ذمہ داری جو کہ فوجی مہم جوؤں نے اپنے ہی عوام کو غلام بنانے کے لئے ظاہر کی کو ٹھکرا دیا ہے۔ اب آرٹیکل 6 کے

تحت حکومت وقت کو غیر آئینی طریقے سے ہٹا دینا اور منتخب حکمران کو پھانسی دینے یا جلا وطن کر دینے پر نہ صرف انقلاب برپا کرنے والے کو سزا دی جائے گی بلکہ وہ تمام طبقے اور بالخصوص عدلیہ جو غیر قانونی طریقے سے حکومت ختم کرنے والے کا ساتھ دیں گے کو بھی سزا بھگتنا ہوگی۔ پاکستان کی باسٹھ سالہ زندگی کے دوران عدلیہ نے انسانی بنیادی حقوق کو پامال کرنے والوں کے اقدامات کو جائز قرار دیا اور اس آئین جس کے تحت انہوں نے حلف اٹھائے کے تقدس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی۔ اب پاکستان کو ایسے ججوں کی ضرورت نہیں جو فوجی انقلاب اور منتخب وزیراعظم کی پھانسی اور جلاوطنی کو جائز قرار دیں۔ اٹھارویں ترمیم میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے (آرٹیکل 243) اب مسلح افواج مکمل طور پر وفاقی حکومت کے کنٹرول میں ہوں گی۔

اٹھارویں ترمیم میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مستقبل میں ملک میں نہ تو صدارتی نظامِ حکومت ہوگا اور نہ ہی سیاسی طاقت کے مراکز کو کنٹرول کرنے کے لئے بالواسطہ طور پر اختیارات پر اجارہ داری قائم ہوگی۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد مسلح افواج کے سربراہ اور صوبائی گورنروں کی تعیناتی کا اختیار وزیراعظم کے پاس ہوگا۔ اس کے علاوہ چیف الیکشن کمشنر کا چناؤ بھی وزیراعظم کریں گے۔

اٹھارویں آئینی ترمیم کا بل اتفاق رائے سے سینٹ سے منظور ہوگیا۔ سینٹ کے 92 اراکین جو کہ دو تہائی اکثریت سے زیادہ ہے نے بغیر حیل و حجت کے بل کی منظوری دے دی۔ ایک دفعہ پھر صوبہ سرحد کا نام تبدیل کرنے پر بل کی منظوری میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی جو کہ ناکام ہوگئی۔ صدر آصف علی زرداری نے 19 اپریل 2010ء کو بل پر دستخط کر دیئے جس کے بعد بل قانون کا حصہ بن گیا۔ اس طرح صدر آصف علی زرداری پاکستان کے وہ پہلے صدر بنے جو جمہوریت کی بقا کے لیے اپنے اختیارات سے دستبردار ہوئے۔ آصف علی زرداری نے اٹھارویں ترمیم پر دستخط کر کے اور اختیارات سے دستبردار ہو کر اپنے ناقدین کے منہ بند کر دیئے جو یہ کہتے تھے کہ آصف علی زرداری کبھی بھی 58(2)b کے صوابدیدی اختیارات نہ چھوڑیں گے۔ آصف علی زرداری نے اٹھارویں ترمیم پر دستخط کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ صحیح معنوں میں جمہوریت کے حامی ہیں۔ اٹھارویں ترمیم پر دستخط کے بعد آصف علی زرداری پر وعدہ خلافی کا الزام بھی غلط ثابت ہوا اور انہوں نے صدارت کا عہدہ سنبھالتے وقت سترھویں ترمیم کو حذف کرنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دکھایا۔

باب نمبر 18

پاکستان کی خارجہ حکمت عملی

Foreign Policy of Pakistan

عام طور پر خارجہ حکمت عملی کو مختلف آزاد ممالک کے درمیان رابطے اور تعلقات کو کہا جاتا ہے۔ زیادہ وسیع معنوں کے مطابق خارجہ حکمت عملی آزاد اور خودمختار ریاستوں کی ان کوششوں کا نام ہے جو وہ ایک دوسرے کی انسانی جدوجہد کے مختلف شعبوں میں حاصل کردہ ترقی اور کارناموں سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ خارجہ حکمت عملی کو عام طور پر ان اصولوں سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے ذریعے کوئی ریاست بین الاقوامی حالات کے بارے اپنے ردعمل کا اظہار کرتی ہے۔

خارجہ حکمت عملی کسی بھی قوم کی خواہشات اور گھریلو سیاسی رجحانات کی عکاس ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ نظریاتی، تاریخی، معاشی، قومی مفادات اور جغرافیائی، سیاسی عوامل کے باہمی اختلاط کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ یہ عوامل ریاست کے دنیاوی معاملات سے متعلق نظریات کو طے کرتے ہیں۔ یہ کم و بیش کسی بھی ریاست کے دوسرے ممالک کے ساتھ روابط جو کہ روایتی معاہدات کے دائرہ میں نہیں آتے، کے متعلق ہم آہنگ نقطہ نظر کی نشان دہی کرتی ہے۔

پاکستان کے مخصوص جغرافیائی محل و وقوع، اس کے مغربی ممالک اور وسطی ایشیا کے ساتھ تعلق اور اس کی نظریاتی بنیادوں کی موجودگی میں بین الاقوامی سطح پر تعلقات قائم کرنا خاصا پیچیدہ کام ہے۔ اپنے دشمن ہمسایوں کے ساتھ جنگیں، ملک کے مشرقی حصے کی علیحدگی، امریکہ کے ساتھ دوستی اور چین اور اسلامی ممالک کے ساتھ نزدیکی تعلقات پاکستان کی خارجہ پالیسی کے نمایاں حصے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کا کمزور سیاسی نظام اور فوج کے تسلط کی وجہ سے خارجہ پالیسی وضع کرنے کا کام بہت مشکل رہا ہے۔

پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے رہنما اصول

پاکستان کی خارجہ پالیسی کے رہنما اصول ملک کے اسلامی نظریہ، ثقافتی ورثہ اور تاریخی پس منظر بالخصوص اس کی جدوجہد آزادی میں مضمر ہیں۔ ایک اسلامی اور غیر جانبدار ملک ہونے کی حیثیت سے پاکستان پوری دلجمعی سے اسلامی اصولوں کی حمایت کرتا ہے اور آزادی، اقتدار اعلیٰ اور تمام ممالک کی علاقائی سلیت کی حمایت کرتا ہے۔ پاکستان بین الاقوامی تعلقات اور ہمسایوں کے حقوق کے حوالے سے طاقت کے استعمال کو مسترد کرتا ہے اور باہمی تعلقات میں پرامن بقائے باہمی کے حق میں ہے۔

پاکستان اپنے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے دنیا کی نظروں میں اجاگر ہوا۔ بالخصوص آزادی کے بعد پاکستان کے اہم جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کے لیے عالمی طاقتوں کے درمیان سخت قسم کی سرد جنگ شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ بھارت کا مخاصمانہ رویہ اور عالمی طاقتوں کی اپنا اثر قائم کرنے کے لیے سرد جنگ نے پاکستان کو بہت زیادہ ضرر پذیر ملک بنادیا تھا۔ آزادی سے پہلے برصغیر کا سیاسی تہذیب و تمدن اور ثقافت بھی پاکستان کی خارجہ حکمت عملی طے کرنے میں موثر عنصر تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تحریک آزادی کے دوران دشمنی نے بھی پاکستان کے دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات بنانے میں موثر کردار ادا کیا۔

پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے عوامل Determinants of Pakistan Foreign Policy

کسی بھی ملک کی خارجہ حکمت عملی قوم کی مجموعی قومی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کی بنیاد دائمی طور پر نہ تو کسی ایک فرد کی آرزو مندانہ سوچ پر رکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی خاص طبقے کے غیر حقیقی تصورات پر مبنی ہو سکتی ہے۔ قومی مقاصد چاہے وہ حکمران طبقے کی سوچ سے ہم آہنگ نہ ہوں اصل مقاصد ہوتے ہیں جو خارجہ پالیسی بناتے وقت پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ دشمنوں اور دوستوں کا تعین تاریخ کے پس منظر میں کیا جاتا ہے کوئی بھی ملک چاہے معاشی طور پر کتنا ہی طاقت ور ہو دنیا کے دوسرے ممالک سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔

داخلہ پالیسی کے مقابلے میں کسی بھی ملک کی خارجہ حکمت عملی نہایت اہم ہوتی ہے کیونکہ خارجہ پالیسی کے حوالے سے تبدیلیاں ملک کے سیاسی و معاشی حالت پر دور رس نتائج مرتب کر سکتی ہیں۔ خارجہ پالیسی قومی مفادات کو تحفظ دیتی ہے جبکہ دوسرے ایکٹ عمل افراد کے خاص مفادات کو پورا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے خارجہ پالیسی کو بنانے والے وہ لوگ ہونے چاہئیں جو خارجہ پالیسی پر عمل درآمد کے حوالے سے دوسری سرگرمیوں کے مقابلے میں خارجہ پالیسی سے متعلق کارروائی میں زیادہ مہارت کے حامل ہوں۔ اس لئے خارجہ پالیسی بنانا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں بہت سارے عوامل کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ ذیل میں ان عوامل کا مشاہدہ پیش کیا جا رہا ہے جو خارجہ پالیسی بناتے وقت پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔

نظریاتی اصول Ideological Obligations

پاکستان کی خارجہ پالیسی بنانے میں اسلامی نظریہ انتہائی اہم عنصر ہے۔ پاکستان دو وجوہات کی بنا پر ایک اسلامی ملک ہے۔ 1۔ پاکستان کی کل آبادی کا 85 فی صد حصہ مسلمان ہے۔ 2۔ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی اپنے لئے علیحدہ وطن کے حصول کی زبردست دیرینہ خواہش جہاں وہ اپنے مذہب اسلام کے اصولوں کی روشنی میں اپنے تہذیب و تمدن اور تاریخ کے مطابق زندگی گزار سکیں کے لئے بنایا گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جدوجہد آزادی کے سرکردہ راہنماؤں کے خیالات اسلامی اصولوں سے گہری مطابقت رکھتے تھے۔ یہ راہنما جو برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق اور عقیدے کے سچے حامی تھے دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے مطالبات کی بھی ترجمانی کرتے تھے۔

روس ترکی جنگ 1877ء، برطانوی افغان جنگ 1878ء، یونان ترکی جنگ 1897ء لیبیا پر اٹلی کا حملہ 1911ء اور بلقان جنگ 1912ء مسلمانوں کے سیاسی اجتماعات میں باقاعدگی سے زیر بحث لائے جاتے تھے اور ان پر قرارداد مذمت منظور کی جاتیں تھیں۔ اسی جذبے کے تحت ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں جنگ بلقان کے دوران ترکوں کی مدد کے لیے ڈاکٹروں اور دوسرے عملہ صحت پر مشتمل وفد بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح کلکتہ میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ 1912ء میں ایرانی علاقے پر روسی قبضہ کی مذمت کی گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد تحریک خلافت برطانوی سامراج کے خلاف مسلمانوں کی جدوجہد تحریک آزادی کا شاندار باب ہے۔ 1925ء میں علی گڑھ کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ میں عراق میں برطانوی اقدام کی مذمت کی گئی۔ یہ تمام واقعات مسلمانوں کی کل اسلامی جمعیت کی تشکیل کی دیرینہ خواہش اور جدوجہد کو ظاہر کرتے ہیں۔ پاکستان کے بنتے ہی کل اسلامی اتحاد اور بھائی چارے کی امید ایشیا کی مسلم اقوام میں اجاگر ہوئی۔

تاریخی ورثہ (Historical Legacy)

کسی بھی قوم کی پہچان اس کا تاریخی پس منظر یا ورثہ ہوتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں سامراجی قوت برطانیہ کے زیر نگین رہے اور ایک ایسی انتظامیہ کا حصہ تھے جس کا مقصد علاقے میں دفاعی مقاصد کا حصول تھا۔ شروع ہی سے برصغیر شمالی اطراف

سے آنیوالے حملہ آوروں کے لیے خاص کشش کا حامل رہا ہے۔ ہندوستان کے شمال مغرب میں روس کی توسیع پسندی اور شمال مشرق میں چین کی موجودگی نے برطانوی حکمرانوں کو مجبور کیا کہ وہ شمالی حصے سے آنے والے حملہ آوروں کو روکنے کے لیے کوئی حکمت عملی وضع کریں۔ راولپنڈی میں شمالی علاقوں کے لیے چھاؤنی کا قیام کوئٹہ سٹاف ٹریننگ کالج ہندوستان ریلوے نظام کی چمن اور لنڈی کوتل تک توسیع، شمال مغرب کے قبائلی علاقوں میں فوجی قوت کا قیام اور پشاور میں ایک طاقتور جاسوسی اور نگران نظام کا قیام اس سلسلے کی چند کڑیاں ہیں۔ 1947ء کی تقسیم کے بعد برصغیر کے دونوں ممالک اسی صورت حال سے دوچار رہے۔ جنوب کی طرف روسی پیش قدمی نے بین الاقوامی اندیشوں کو ہوا دی جس سے پاکستان کی نئی ریاست روگردانی نہ کر سکی۔ انڈیا آفس لائبریری کی فائلوں سے پاکستان کو اسی طرح روسی خوف ورثے میں ملا جس طرح ہندوستان کو چین کی طرف سے اپنے وجود کو لاحق خطرہ ملا۔ پاکستان کے خارجہ حکمت عملی بنانیوالوں نے اپنے درپیش روسی خطرے کو روکنے کے لیے مغربی ممالک سے مدد مانگی۔

جغرافیائی محل وقوع (Geographical Location)

جغرافیائی محل وقوع کسی بھی ملک کے سیاسی حالات کو کنٹرول کرنے میں بہت مددگار ہوتا ہے اور زمینی علاقہ بین الاقوامی سیاست میں سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے لئے لفظ سیاسی جغرافیہ (Political Geograpy) بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ جب ہم پاکستان کے جغرافیائی محل وقوع کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ ضرب المثل بالکل حقیقی لگتی ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی اس کی سرحدوں سے شروع ہو کر سرحدوں پر ہی ختم ہو جاتی ہے بالخصوص بھارتی سرحدوں پر ہی شروع ہوتی ہے اور وہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ پاکستان کے بیشتر مسائل کا تعلق بھارت کے ساتھ تعلقات سے ہے۔ پاکستان کے نقشے پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ ظاہر ہوگا کہ پاکستان کا آدھا زمینی علاقہ بھارت کیساتھ جڑا ہوا ہے تقریباً 1/3 حصہ افغانستان کے ساتھ ملتا ہے 1/6 حصہ ایران کیساتھ اور ایک چھوٹی سی پٹی چین کو پاکستان سے ملاتی ہے۔ روس اپنی سابقہ ریاست تاجکستان کی وجہ سے پاکستان کے انتہائی قریب واقع ہے۔ پاکستان کے جنوب میں بحیرہ عرب واقع ہے جو کہ خلیج عدن اور خلیج عرب کے درمیان رابطہ ہے جو کہ بحیرہ عرب کو بحیرہ روم سے بحیرہ احمر اور سویز کنال جو کہ یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارتی راستہ کے ذریعے ملاتا ہے۔ یہ جغرافیائی ترتیب پاکستان کی خارجہ پالیسی پر متعدد طریقوں سے براہ راست اثر ڈالتی ہے۔ پاکستان کا آدھا علاقہ جو بھارت سے جڑا ہوا ہے بھارتی جارحیت کے خوف کے تسلط میں رہا ہے۔ پاکستان نے ماضی میں امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدوں میں صرف اپنے علاقوں کو بھارتی جارحیت سے بچانے کے لیے شرکت کی۔ حتیٰ کہ موجودہ دور میں پاکستان کی GNP کا زیادہ تر حصہ جو دفاعی اخراجات پر خرچ کیا جاتا ہے وہ اس لئے کہ پاکستان بھارت کو اپنے سرحدی علاقوں اور قومی آزادی کے ساتھ کھیلنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان 1200 میل کی مشترکہ سرحد کو پاکستان بننے کے بعد افغانستان کی متعدد حکومتوں نے بھارت اور روس کے ساتھ مل کر اس کی قانونی حیثیت کو ختم کرنے کی کئی بار کوشش کی ہے اور لسانی بنیاد پر پاکستان کے بڑے علاقے پر اپنا حق جتایا ہے اور پختونستان کے مسئلے کی کھل کر مالی اور سفارتی حمایت کی ہے۔ دسمبر 1979ء میں جب سابقہ سوویت یونین نے اپنی فوجیں افغانستان میں داخل کیں تو یہ سرحد انتہائی نازک صورت حال اختیار کر گئی تو پاکستان کو ایک بڑی طاقت کے مقابلے میں اپنے دفاع کو ناقابل تسخیر بنانے کے لیے مغربی ممالک اور امریکہ سے امداد طلب کرنا پڑی۔ 1989ء میں سوویت یونین کے انخلا کے بعد افغانستان طویل خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے اور وسطی ایشیا کی آزاد ریاستوں کے معرض وجود میں آنے کے بعد پاکستان نے نادر معاشی مواقع حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن افغانستان کی خانہ جنگی پاکستان اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کے معاشی اور تجارتی تعلقات استوار کرنے میں رکاوٹ بن گئی۔ وسطی ایشیا کی ریاستوں کو جانے والے تمام راستے افغانستان سے گزرتے ہیں جو صرف اسی صورت میں کارآمد ہوسکتے ہیں جبکہ وہاں امن ہو۔

پاکستان اور ایران کے درمیان تقریباً 590 میل لمبی سرحد واقع ہے 1947ء میں قیام پاکستان سے لے کر اب تک پاکستان اور ایران کے درمیان مثالی دوستانہ مراسم قائم رہے ہیں۔ ایران وہ سب سے پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کو تسلیم کیا تھا۔ کسی بھی ضرورت کے وقت ایران نے پاکستان کی ہر طرح سے مالی اور اخلاقی مدد کی ہے۔ دونوں دوست ممالک سیٹو اور سینٹو میں ایک دوسرے کیساتھ شریک رہے ہیں اور اب ECO میں دونوں ممالک شریک ہیں پاکستان کے فیصلہ ساز ایران کے ساتھ دوستانہ مراسم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

چین اور پاکستان کے درمیان 400 میل لمبی سرحد ہے۔ چین ایک عالمی طاقت ہے اور چین جیسے طاقت ور ملک کے ساتھ دوستانہ مراسم ہماری خارجہ پالیسی کا بنیادی عنصر ہیں۔ چین وہ واحد عالمی طاقت ہے جس نے آج تک کبھی بھی پاکستان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

پاکستان کے خلیجی ریاستوں اور خلیج عدن جو کہ مغرب کو تیل سپلائی کرنے والے بڑے وسائل ہیں کے ساتھ بھی قریبی تعلقات ہیں۔ بحیرہ عرب کے ساتھ ان کا محل وقوع امریکہ کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی بنانے والے اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں اور ملک کے فائدے کے لیے اس اہمیت کو استعمال کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔

جغرافیائی سیاست کے دوسرے عوامل یعنی حجم (Size) اور آبادی کا بھی پاکستان کی خارجہ پالیسی پر خاصا اثر ہے۔ مسلمان ممالک اور دوسرے ایشیائی ممالک میں سے چند ہی ملک اپنے حجم اور آبادی کے لحاظ سے پاکستان سے بڑے ممالک ہیں۔ اسی وجہ سے پاکستان بین الاقوامی تعلقات میں کم تر حیثیت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

بھارتی جارحیت کا خطرہ (Indian Threat)

آزادی کے دن سے لیکر اب تک پاکستان اپنی بقا کے لیے بھارت کیساتھ طویل کشمکش میں مصروف ہے۔ اس کی جنگی منصوبہ بندی زیادہ تر بھارت کی طرف سے اپنی سالمیت کو درپیش خطرات کے پیش نظر وضع کی گئی ہے۔ دونوں ممالک ماضی میں تین جنگیں (1948-1965ء اور 1971ء) لڑ چکے ہیں اور اس کے علاوہ بے شمار سرحدی جھڑپوں میں ملوث رہے ہیں۔ بھارتی خطرات سے نمٹنے کے لیے پاکستان کے دفاعی پالیسی بنانے والے ہمیشہ سے یہ کوشش میں رہے کہ کسی طرح ہندوستان کے ساتھ مساوی حیثیت قائم کی جائے۔ پاکستان کی تمام حکومتوں نے اپنی فوجی استعداد اور مشینری کو وسیع کرنے کی لگا تار کوشش کی تا کہ بھارت کیساتھ متوازی فوجی صلاحیت پیدا کی جا سکے۔

تقسیم کے فوری بعد کشمیر کے معاملے پر ہندوستان کے ساتھ جنگ کی وجہ سے پاکستان کے دفاعی اور بقا کے مسائل اور زیادہ شدید ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات، حیدر آباد اور جونا گڑھ پر بھارتی قبضے' پاکستان میں آنے والے دریاؤں کے پانی کی رکاوٹ نے ان مسائل کو اور زیادہ بڑھایا۔ ہندوستان اور پاکستان کی دشمنی کی جڑیں تاریخ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ دونوں تقسیم ہند کو عظیم غلطی تصور کرتے ہیں جس کے لیے دونوں ممالک اپنی اپنی توجیح پیش کرتے ہیں۔ ہندو اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب ہندوستان اکھنڈ بھارت کی حیثیت میں دوبارہ متحد ہو جائے گا۔ مسلمان تقسیم ہند کو انگریزوں کے ظلم کی وجہ سے اپنی سیاسی برتری کا کھو جانا اور ہندوؤں کی دھوکا دہی سے پسپا ہو جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک عام پاکستانی کی نظر میں ایک بھارتی اس کا جانی دشمن ہے جو ہر وقت اس کو ختم کرنے کی سازش میں مصروف ہے۔ ایک عام بھارتی کی نظر میں قیام پاکستان ایک غلطی تھی جو کہ ٹھیک کیا جانا ضروری ہے۔ آنے والے سالوں کے دوران بھارت کے جاحیانہ کردار نے پاکستانیوں کے ذہنوں میں جاگزیں شکوک وشبہات کو مزید تقویت پہنچائی۔

بھارت فوجی لحاظ سے پاکستان سے دس گنا زیادہ طاقت ور ہے۔ پاکستان کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ کسی طرح ہندوستان کی فوجی برتری کے اثر کو کم کیا جائے اور عالمی رائے عامہ کو متحرک کر کے بھارت کو کشمیر میں رائے شماری کروانے کے لیے دباؤ ڈالا جا سکے۔ اس لحاظ سے کشمیر پاکستان کی خارجہ پالیسی کا انتہائی حساس پہلو ہے اور پاکستان کشمیر کے مسئلے کو بین الاقوامی سطح پر استعمال کر کے اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنا چاہتا ہے۔ نتیجتاً پاکستان کی خارجہ پالیسی شروع دن ہی سے اپنی دفاعی ضروریات کے پس منظر میں بنائی گئی۔

معاشی مجبوریاں (Economic Compulsions)

1947 میں جب پاکستان آزاد ہوا تو یہ انتہائی غریب ملک تھا۔ ہندوستان کی مسلمان اقلیت شمالی مغربی پہاڑی اور مشرقی سرحدی علاقوں میں آباد تھی۔ صنعت کے لحاظ سے یہ علاقے بہت پسماندہ تھے اور برصغیر میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ آزادی سے پہلے صنعتی ترقی کلکتہ، مدراس اور بمبئی تک محدود تھی۔ اس کے برعکس ان علاقوں میں جو پاکستان کے حصے میں آئے صنعتی صورت حال کوئی قابل ذکر نہ تھی۔ لہذا پاکستان شروع سے ہی معاشی اور سیاسی مسائل کا شکار رہا اور اپنی معاشی و سیاسی بقا کے لیے بیرونی امداد اور قرضوں پر انحصار کرنا پڑا۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کا 1950ء کا دورہ امریکہ انہیں مجبوریوں کی بنا پر تھا۔

امریکی معاشی امداد 1951ء کے مالی سال میں آنی شروع ہوئی۔ جب پاکستان نے امریکہ کیساتھ 1954ء اور 1955ء میں سیٹو اور سینٹو کے دفاعی معاہدات میں شرکت کی تو امریکی امداد میں اضافہ ہوا۔ امریکی امداد پاکستان کی معاشی حالت کو سہارا دینے میں مددگار ثابت ہوئی اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل دینے میں مضبوط عنصر ہے۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی بنے ہوئے تقریباً اٹھاون سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اس دوران پالیسی کے ثمرات اور نقصانات سامنے آ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود پاکستان اسی پالیسی کو اپنائے ہوئے ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں معمولی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اوپر بیان کئے گئے تمام عناصر پاکستان کی خارجہ پالیسی کے ابھی تک بنیادی عناصر ہیں۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کے مختلف ادوار (Different Phases of Pakistan Foreign Policy)

1947ء سے 1967ء تک پاکستان کی خارجہ پالیسی کو تین مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ آزادی کے بعد شروع کے عرصے میں پاکستان کا جھکاؤ مغربی ممالک کی طرف تھا۔ دوسرے مرحلے کے دوران پاکستان امریکہ کا اتحادی بن گیا اور امریکہ سے فوجی اور معاشی امداد ملنا شروع ہو گئی۔ تیسرے مرحلے میں پاکستان نے اس امید کے ساتھ مغربی فوجی معاہدات سیٹو اور سینٹو میں شرکت اختیار کر لی کہ اس طرح اسے جارحیت کا سامنا کرنے اور اپنے دفاع کو مضبوط بنانے میں مدد ملے گی۔

شروع میں پاکستان کی اسلامی اتحاد کو آگے بڑھانے کی کوششیں ناکام ہو گئیں کیونکہ بین الاقوامی سیاسی حالات اور ملکی سفارت کاری کا انداز جو کہ یورپی ممالک کی طرز پر اپنایا گیا تھا مذہبی عناصر کو بین الاقوامی سطح پر نمایاں حیثیت نہ دینا چاہتے تھے۔ پاکستان کی اندرونی سیاست اور اس کے محرکات نے بھی اس صورت حال کو مزید تیز کیا۔ مسلم لیگ کی قیادت میں تبدیلی جس کا جھکاؤ امریکہ کی طرف تھا کی وجہ سے پاکستان کو اشتراکیت کے خلاف امریکہ کی جنگ میں مضبوط قلعہ بنا دیا۔ 1960ء میں پاکستان کے بیشتر راہنماؤں نے اس حکمت عملی کی مخالفت کی جب یہ ظاہر ہوا کہ مغربی ممالک ہندوستان کے ساتھ تعلقات کار میں پاکستان کی کوئی مدد نہیں کرنا چاہتے اور وہ صرف اشتراکیت کو روکنے کے لیے پاکستان کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان کے مغرب کی طرف جھکاؤ نے بلا شبہ اسے اپنے معاشی بحران پر قابو پانے میں بہت مدد دی۔ کوئی بھی امریکی امداد کے پاکستان کی معاشی و فوجی حالت پر مثبت اور خوش کن اثرات کو جھٹلا نہیں سکتا۔ اس کی وجہ سے بلا شبہ پاکستان کی معاشی ترقی میں تیزی

آئی۔ پاکستان کو اپنی مغرب موافق پالیسی کا جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ یہ تھا کہ پاکستان کو کشمیر کے مسئلے پر مغربی تائید حاصل ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی ممالک نے شروع میں اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کے موقف کی حمایت کی لیکن پاکستان مغربی معاہدات کا رکن بن گیا تو کشمیر پر مغربی تائید میں ہچکچاہٹ پیدا ہوئی اور بالاخر ختم ہوگئی۔ مغربی اتحادوں میں پاکستان کی شمولیت کا فیصلہ ہندوستان اور افغانستان کی طرف سے جارحیت کے پیش نظر کیا گیا۔ یہ بالکل واضح تھا کہ پاکستانی راہنما مغربی معاہدوں میں شرکت کر کے ہندوستان کے خلاف پاکستان کی دفاعی قوت بڑھانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمان ممالک کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی پاکستان میں شدید خواہش تھی۔ سینٹو کی شکل میں پاکستان کو اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے بہت مواقع میسر تھے۔

بہر حال اگر پاکستان نے اپنی مغرب موافق پالیسی کی وجہ سے فائدہ اٹھایا ہے تو ہمیں مغرب کے ساتھ دوستی کی بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔ اس پالیسی کا فوری اثر یہ ہوا کہ پاکستان اپنی آزادی کھو بیٹھا اور امریکی تسلط کا شکار ہو گیا۔ پاکستان کے غیر جانب دارانہ تاثر کو شدید زک پہنچی اور اب یہ پوری طرح ایک اتحادی ملک کے منظر عام پر آیا۔ مسئلہ کشمیر کو بھی شدید نقصان پہنچا کیونکہ سوویت یونین کا رویہ انتہائی سخت ہو گیا۔

چین اور پاکستان

مغربی اتحادی ممالک اور بالخصوص امریکہ کے رویوں میں تبدیلی نے پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ مغربی معاہدوں کے حوالے سے اپنے تعلقات کا از سر نو جائزہ لے اور اور نئے دوستوں کی تلاش کرے جو زیادہ قابل اعتبار ہوں۔ چین بڑی تیزی سے عالمی طاقت بن کر ابھر رہا تھا اور پاکستان کے لیے ایک طاقت ور ہمسایہ کو نظر انداز کرنا مناسب نہ تھا۔ جیسا کہ ایوب خان نے کہا کہ اگر ہم اپنے تینوں طاقت ور ہمسایوں سے دوستانہ ہم آہنگی قائم نہیں کر سکتے تو ہمیں دو کیساتھ ہم خیال تعلق قائم کر لینا چاہیے۔ اس بنا پر میں نے چین اور روس کے ساتھ اپنے تعلقات کو معمول پر لانیکا فیصلہ کیا۔

چین کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے کی خواہش نے امریکہ کو ناراض کر دیا۔ 1962ء تک پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں اتنی گرم جوشی نہ رہی جتنی کہ 1950ء میں پائی جاتی تھی۔ نتیجتاً امریکہ نے پاکستان کی معاشی امداد روک دی۔ بھارت کے ساتھ 1965ء کی جنگ کے دوران امریکہ نے پاکستان کی فوجی امداد پر پابندی لگا دی۔ یہ اقدام صرف دشمن ملک ہی کر سکتا تھا۔

چین کے ساتھ اپنے تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے پاکستان نے اقوام متحدہ میں چین کے داخلے کے لیے سرگرم مہم کا آغاز کیا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ جناب منظور قادر نے چین کے اقوام متحدہ میں داخلے کے خلاف امریکی پالیسی پر برملا تنقید کی اور چین کی اقوام متحدہ کی رکنیت کی حمایت کی۔ 1961ء میں ایوب خان نے صاف صاف چین کی اقوام متحدہ کی رکنیت کی حمایت کی۔ بالاخر پاکستان کی مدد سے چین اقوام متحدہ میں اپنی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

1962ء میں چین اور پاکستان کے درمیان سرحدوں کی حد بندی کا معاہدہ طے پایا۔ اس وقت کے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے پیکنگ گئے۔ اس معاہدے کی وجہ سے دونوں ممالک کے تعلقات مزید مضبوط ہوئے اور مستقبل میں بہتری کے لیے راستہ ہموار ہوا۔

ہوائی رابطہ قائم کرنے کے لیے چین اور پاکستان کے درمیان معاہدہ طے پایا۔ پاکستان کی ہوائی کمپنی PIA نے چینی حکومت سے براستہ چین جاپان جانے کے لیے اجازت مانگی تھی۔ پاکستان نے افریقی۔ ایشیا معاملات میں اپنی دلچسپی ظاہر کی جس کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات بہتر ہوئے۔ تجارتی اور ثقافتی وفود کے تبادلوں سے تجارتی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوا۔

دونوں ممالک کے درمیان تعلیمی رابطے قائم کرنے کے لیے تعلیمی سہولتوں کا تبادلہ کیا گیا۔ چین نے پاکستان کو اپنی برآمدی ضروریات کے لیے 60 ملین ڈالر کا قرضہ دیا۔

1964ء میں ایوب خان نے چین کا دورہ کیا جس کی وجہ سے تعلقات کو معمول پر لانے میں تیزی آئی۔ چین نے مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے موقف کی بھرپور تائید کی اور ہندوستان پر زور دیا کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں رائے شماری کروانے کا اپنا وعدہ پورا کرے۔ 1965ء کی پاک۔ بھارت جنگ کے دوران چین نے پاکستان کی ہر ممکن مدد کی۔

چین نے پاکستان کی صنعت کی ترقی کے لیے مالی اور ماہرانہ امداد دی۔ ٹیکسلا کے مقام پر بھاری صنعتی یونٹ لگایا گیا۔ قراقرم کی شاہراہ چین کے تعاون سے تعمیر کی گئی۔ پاکستان اور چین شاہراہ ریشم کے راستے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں جو کہ دونوں ممالک کی دوستی کی ایک زندہ مثال ہے۔

پاکستان اور چین کے درمیان دوستی اور شراکت داری پچاس سال سے زیادہ پرانی ہے جس کی بنیاد اعتماد اور باہمی عزت پر قائم ہے۔ شنگھائی میں پاکستان کے قونصل خانہ کھل جانے سے معاشی ترقی کو فروغ حاصل ہوا۔ پاکستان نے چین کے لیے مارکیٹ اکانومی سٹیٹس (MES) کا اعلان کیا ہے۔ چین سرمایہ کاری کے لیے پاکستان کو 500 ملین ڈالر کی امداد دے گا۔ دونوں ممالک میں علاقائی اور بین الاقوامی معاملات پر اشتراک رائے پایا جاتا ہے۔ چین نے شنگھائی کی تنظیم میں پاکستان کی رکنیت کی حمایت کی ہے جنگی حکمت عملی میں اشتراک نے دونوں ممالک کے درمیان معاشی' تجارتی اور ثقافتی رابطوں کو فروغ دیا ہے۔ پاکستان چین کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ چین شروع ہی سے پاکستان کی معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے بڑے بڑے منصوبوں پر عمل کر رہا ہے۔ مستقبل کی سرمایہ داری' مشترکہ منصوبے اور عوامی رابطے دونوں ممالک کی نفع بخش تعاون بڑھانے کی خواہش کا اظہار ہے جو کہ وزیر اعظم شوکت عزیز کے چین کے دورہ کے بعد ظاہر ہوئی اور جسے چینی صدر نے انتہائی کامیاب دورہ قرار دیا۔ عظیم ہال Great Hall میں گفتگو کے دوران دونوں ممالک نے تجارت' بنیادی ڈھانچہ' قدرتی وسائل کا استعمال' توانائی کی پیداوار صنعتی اور کاروباری منصوبوں پر باہمی تعاون بڑھانے پر اتفاق کیا۔

بیجنگ میں (Tsinghua) یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم شوکت عزیز نے کشمیر' فلسطین' افغانستان اور سیاسی و معاشی معاملات پر تفصیل سے تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے دہشت گردی اور غربت کے خاتمے کے حوالے سے پاکستان کے موقف کی وضاحت کی۔

اس وقت پاکستان اور چین کے تجارتی رابطے 4 ملین امریکی ڈالر ہیں۔ شوکت عزیز نے اپنے میزبانوں پر صاف الفاظ میں واضح کیا کہ پاکستان چین کے ساتھ اپنی دوستی کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور باہمی معاشی ترقی کے فروغ کے لیے اسے پوری طرح استعمال کر سکتا ہے۔ چین کی کمپنیاں ٹیکسٹائل' انفارمیشن ٹیکنالوجی' تعمیرات' توانائی' بجلی اور کھانے پینے کی اشیاء کی تیاری کے شعبوں میں سرمایہ کاری کر سکتی ہیں۔ پاکستان علاقائی سطح پر مصنوعات کی تیاری کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتا ہے اور چینی مصنوعات کی افغانستان' وسطی ایشیاء' جنوبی ایشیا اور مشرق وسطے کو درآمد کر سکتا ہے۔

شنگھائی کے نائب میئر ژوہویو نے وزیر اعظم شوکت عزیز کو یقین دلایا کہ چین پاکستان کو اپنا طاقتور اور قابل اعتماد ساتھی سمجھتا ہے اور معاشی سطح پر دوطرفہ شراکت کا خواہش مند ہے۔ چین نے ان شعبوں میں مدد پیش کی ہے جہاں پر دوسرے تعاون سے ہچکچاتے رہے۔ چین کے تعاون سے پاکستان نے گوادر کی بندرگاہ تعمیر کی ہے جو پاکستان کی معاشی ترقی کے لیے بہت مددگار ثابت ہوگی۔ چین کے تجارتی و صنعتی اداروں سے بات کرتے ہوئے شوکت عزیز نے انہیں بہتر منافع کا یقین دلایا۔ شوکت عزیز کے دورے کے دوران

پاکستان اور چین نے گوادر کی بندرگاہ کے کام کو تیز کرنے کے معاہدہ پر دستخط کیے۔ اس کے علاوہ پاکستان اور چین نے لاہور میں 1500 رہائشی یونٹ، تیل اور گیس کی تلاش، چین کے لیے فری صنعتی علاقہ، سینڈک کے فیز II کو بڑھانا، چشمہ ایٹمی پلانٹ کے فیز II کو بڑھانا کے بارے معاہدوں پر دستخط کیے۔

پاکستان۔روس تعلقات (Pak-USSR Relations)

1947ء میں جب پاکستان ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تو بڑی طاقتوں نے پاکستان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ بالخصوص دونوں سپر طاقتوں یعنی امریکہ اور روس نے پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ روس پاکستان کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے کا خواہش مند تھا کیونکہ پاکستان بحیرہ ہند کے گرم پانی تک پہنچنے کا راستہ فراہم کرتا تھا جو کہ روس کے تجارتی مقاصد کی روشنی میں بے پناہ اہمیت کا حامل تھا۔ بحیرہ ہند کا گرم پانی مشرق وسطیٰ کے تیل کے وسائل تک بھی رابطے کا کام دیتا تھا۔

ان حقائق کی روشنی کے پیش نظر روسی راہنما سٹالن نے فوری طور پر پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو 1949ء میں ماسکو کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اسی دوران امریکہ نے بھی وزیراعظم لیاقت علی خان کو واشنگٹن آنے کا دعوت نامہ دیا۔ پاکستان نے روسی دعوت کو ٹھکرا کر امریکہ کے دورہ کی دعوت قبول کر لی۔ لیاقت علی خان کے دورہ واشنگٹن نے پاکستان کے غیر جانب دار دعویٰ کا پول کھول دیا اور اس کے بعد پاکستان مکمل طور پر جانب دار ملک کی حیثیت سے سامنے آیا۔

1954ء اور 1955ء میں پاکستان نے سیٹو اور سینٹو میں شمولیت اختیار کی جس نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے مغرب موافق رجحانات کی تصدیق کر دی۔ اس نے پاکستان کے خلاف بداعتمادی جو کہ پاکستان کی طرف سے روسی دعوت کو ٹھکرانے سے پیدا ہوگئی تھی، کو مزید ہوا دی۔ پاکستان کی مغربی اتحاد میں شمولیت کو روس نے ایک ہمسایہ کی طرف سے غیر دوستانہ اقدام سمجھا۔ روس نے پاکستان کے اس گستاخانہ انداز کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے انتقاماً ہندوستان کو بھاری معاشی اور فوجی امداد دی تاکہ پاکستان کو اس کے خودسر رویہ کی سزا دی جا سکے۔

اس کے باوجود روس پاکستان کو اپنی دوستی کے حلقے میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ 1956ء میں روس نے پاکستان کو نزدیکی تعلقات کے فروغ کے لیے معاشی اور ٹیکنیکی امداد دی۔ روس نے پاکستان کو کراچی میں فولاد کی فیکٹری بنانے میں مدد کی۔ پاکستان کے ساتھ تعلقات بنانے میں اپنی نیک نیتی کا اظہار کرنے کے لیے 1956ء میں روس کے ڈپٹی وزیراعظم پاکستان آئے اور برملا اعلان کیا کہ کشمیر کا مسئلہ عوام کی مرضی کے مطابق طے ہونا چاہیے۔ لیکن پاکستان روس کی طرف سردمہری کا اظہار کرتا رہا اور پاکستان کی متعدد حکومتیں مغرب موافق حکمت عملی پر چلتی رہیں۔

پاکستان اور روس کے تعلقات پر اس وقت کاری ضرب لگی جب پاکستان نے امریکہ کو اپنا ہوائی اڈہ استعمال کرنے کی اجازت دی۔ دونوں ممالک کے درمیان اس وقت تناؤ شدت اختیار کر گیا جب پاکستان نے روس پر جاسوسی کرنے کے لیے امریکہ کو اپنے ہوائی اڈے استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ ایک امریکی طیارہ U-2 جو پشاور کے ہوائی اڈے سے اڑا تھا، سویت ریڈار کی زد میں آ گیا جسے مار گرایا گیا اور پائیلٹ کو گرفتار کر لیا گیا۔ روسی وزیراعظم خروشیف غصے سے پاگل ہوگئے اور پاکستان کے خلاف سخت کارروائی کا اعلان کر دیا۔

1961ء میں پاکستان اور روس کے درمیان دوستانہ تعلقات کی امید پیدا ہوئی جب روس نے پاکستان میں تیل کی تلاش میں مدد کا اعلان کیا جسے پاکستان نے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ہوائی رابطے، ثقافتی وفود کے تبادلے، کاشت کاری میں تعاون، توانائی کے

منصوبوں کی تعمیر اور سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ کے متعدد معاہدے طے پائے۔ روس نے پاکستان کے لیے 30 ملین ڈالر کے قرضے کا اعلان کیا۔ اس نے پاکستانی انجینئرز کو ٹریننگ دینے کا بھی اعلان کیا۔ 1964ء میں روس نے پاکستان کو بھاری مشینری خریدنے کے لیے 19 ملین ڈالر کے قرضے کا اعلان کیا۔

1965ء میں پاکستان نے اشتراکی ممالک کے ساتھ تعلقات بڑھانے چاہے۔ پاکستان نے پہلے چین کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے تھے اور اب وہ روس کے ساتھ بھی تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ نئے سرے سے مراسم استوار کرنے کے لیے صدر ایوب ماسکو گئے۔ انہوں نے مغربی اتحادوں میں شمولیت کے حوالے سے کوسیگن پر پاکستان کا نقطہ نظر واضح کیا اور انہیں یقین دلایا کہ مغربی اتحادوں میں پاکستان کی شمولیت ہمسایوں کے بارے میں دشمنی کی وجہ سے نہیں۔

روس نے پاکستان ۔ بھارت جنگ 1965ء کے دوران دونوں ممالک کے درمیان صلح کرانے کی پیش کش کی۔ کوسیگن نے صدر ایوب اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری کے درمیان تاشقند میں ملاقات کرانے کا انتظام کیا۔ کوسیگن کی کوششوں سے ایک معاہدہ طے پایا جس کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان لڑائی ختم ہوگئی۔ 1965ء کے بعد پاکستانی اور روسی راہنماؤں نے دورہ کا تبادلہ کیا جس کی وجہ سے مفاہمت پیدا کرنے میں مدد ملی۔ بھارت اور دوسرے ممالک کے احتجاج کے باوجود روس نے پاکستان کو فوجی امداد دی۔ ایوب خان نے ماسکو کا دوسرا دورہ کیا جس نے تعاون کے عمل کو تیز کیا۔

1965-70ء کے دوران پاکستان اور روس کے درمیان تجارت بڑھی۔ دونوں ممالک کے درمیان متعدد تجارتی معاہدے طے پائے۔ روس نے کئی تجارتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے پاکستان کی مدد کی۔

بہر حال روس پاکستان کی چین کے ساتھ دوستی اور مغربی اتحادوں میں شمولیت کو قبول نہ کر سکا۔ علاقے میں چین کے اثر و نفوذ کو کم کرنے کے لیے روس کسی قابل اعتماد ساتھی کی تلاش میں رہا۔ بالآخر بھارت کی شکل میں روس کو با اعتماد دوست مل گیا جس کی مدد سے علاقے میں چینی اثر و نفوذ کو روکنے میں مدد ملی۔ روس نے چین کے ساتھ جنگ کے دوران بھارت کو بھاری فوجی امداد دی۔

روس نے چین کی مخالفت میں ایشین تحفظ (Asian Security) کی سکیم تیار کی لیکن پاکستان نے چین کے خلاف اس سکیم میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ پاکستان کے انکار نے روس کو بہت ناراض کر دیا۔ اس کے علاوہ چین اور امریکہ کے درمیان رابطہ پر بھی روس نے پاکستان کے کردار پر بہت ناراضگی کا اظہار کیا۔

1971ء کی جنگ کے دوران روس نے کھلے طور پر بھارت کا ساتھ دیا۔ اس نے دوسرے ممالک کو بھی متنبہ کیا کہ وہ جنگ سے دور رہیں۔ پاکستان کے اتحادی بالخصوص امریکہ نے معمولی مدد کی۔ روس کی امداد نے بھارت کے حق میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اس نے سیکورٹی کونسل میں بھارت کی حمایت کی اور مشرقی پاکستان میں مداخلت کے حق میں بھارت کی سفارتی امداد کی۔ اس نے بھارت کو بھاری فوجی امداد دی جس کی وجہ سے بھارت نے آسانی سے مشرقی پاکستان پر قبضہ کر لیا۔ امریکہ کی جھوٹی تسلیاں اور ساتواں بحری بیڑہ بھیجنے کی بڑھکوں کا کوئی اثر نہ ہوا جبکہ روس کی بھارت کو پرخلوص امداد نے جنگ کے نتائج پر دور رس اثرات مرتب کئے اور پاکستان دولخت ہوگیا۔

1972ء کے دوران پاکستان اور روس کے تعلقات تقریباً ختم ہونے کے لگ بھگ تھے۔ روس کی دشمنی کے پیش نظر ذوالفقار علی بھٹو نے "مدافعتی سفارت کاری" (Preventive Diplomacy) کا آغاز کیا جس کا مقصد عالمی طاقتوں کی مداخلت کو روکنا تھا جس کی وجہ سے کمزور ممالک آسانی سے بڑی طاقت کے تسلط کا شکار ہو جاتے تھے۔ بھٹو مارچ 1972ء میں ماسکو گئے اور تعطل کو

توڑنے کی کوشش کی۔ روسی راہنما اپنے طرز عمل پر سختی سے قائم رہے اور روس کے ساتھ پاکستان کے طرز عمل پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ بھٹو کے دورے کی وجہ سے غلط فہمی دور کرنے میں مدد ملی اور تعلقات معمول پر آ گئے۔

روس کے ساتھ پاکستان کے تعلقات ایک دفعہ پھر انتہائی خراب ہوگئے جب روسی افواج نے افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ 26 دسمبر 1979ء کو روسی افواج کابل میں داخل ہوگئیں۔ 28 دسمبر کو روسی سفیر نے جنرل ضیاء کو اطلاع دی کہ روس کا مختصر فوجی دستہ افغانستان کی درخواست پر بیرونی مداخلت سے نپٹنے کے لیے افغانستان بھیجا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ دستہ اس وقت واپس بلا لیا جائے گا جب اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

ایک کمزور ہمسائے کو اچانک تاراج کر دینے سے روس نے تمام دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا اور علاقائی امن و سلامتی کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ کمزور افغانستان اور اس کی مغربی سرحدوں پر روسی افواج کی موجودگی پاکستان کے لیے سخت تشویش کا باعث تھی۔ اگر روسیوں کو افغانستان میں اپنے قبضے کو مضبوط کرنے کی اجازت دی جاتی تو پھر اس کا اگلا نشانہ پاکستان اور ایران ہوتا۔ پاکستان کو محکوم بنا کر روس بحیرہ عرب کے گرم پانی تک پہنچنے کی اپنی پرانی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔

ان حالات میں پاکستان نے اپنے قومی مفادات کی حفاظت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے افغانستان پر روسی فوجوں کی چڑھائی پر کھلے عام شدید نکتہ چینی کی کیونکہ یہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں دیئے گئے تمام اصولوں کے خلاف تھی۔

بہرحال افغانستان پر روسی فوجوں کے حملے نے پاکستان کی جغرافیائی سیاست پر دور رس نتائج مرتب کئے۔ پاکستان سرد جنگ میں صف اول (Frontline State) والا ملک بن گیا۔ تقریباً 30 لاکھ افغان پناہ گزین بھاگ کر پاکستان پہنچ گئے اور ملک روسی فوجوں کے ساتھ لڑنے والے مجاہدین کی آماجگاہ بن گیا۔

1989ء میں روسی فوجوں کے افغانستان سے انخلاء کے بعد کابل پر مجاہدین اور افغان کیمونسٹ حکومت کے درمیان لڑائی جاری رہی۔ آخر کار روس ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور وسطی ایشیاء کی مسلمان ریاستیں خود مختار ممالک کی حیثیت میں قائم ہوگئیں۔

سوویت یونین اور سرد جنگ کے خاتمے سے پاکستان کی خارجہ پالیسی نئے سرے سے وضع ہوئی۔ افغانوں کی مزاحمت کابل کی انتظامیہ کو ختم نہ کر سکی۔ افغان پناہ گزینوں کا بوجھ بدستور قائم رہا اور پاکستان نے سابقہ سوویت یونین کی وسطی ایشیاء کی ریاستوں سے تعلقات استوار کرنا چاہے۔

امریکہ، پاکستان تعلقات

1947ء میں پاکستان کا قیام برصغیر کی تاریخ کا اہم باب ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے بالاخر ہندوؤں سے علیحدہ اپنے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا اور پاکستان کی صورت میں اپنی منزل پالی۔ ہندو اور کانگریس تقسیم ہند پر خوش نہ تھے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے برصغیر کی مسلمان اقلیت ان کے جبڑوں سے بچ کر نکل گئی تھی۔ کانگریس کے سیاست دانوں نے تقسیم ہند کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور بالآخر چارو نا چار انہیں اس امید کیساتھ تقسیم ہند کو تسلیم کرنا پڑا کہ ایک دن حالات بدلنے سے تقسیم ہند خود بخود ختم ہو جائے گی۔

لہٰذا پاکستان کا قیام ایک بحران کی شکل میں ہوا۔ پاکستان کو پہلے دن ہی سے اپنے تحفظ اور دفاع کے لیے خطرات کا سامنا کرنا پڑا اور کانگریسی سیاست دان ہمیشہ پاکستان توڑنے کے لیے موقعہ کی تاک میں لگے رہے۔ ان حالات کی وجہ سے پاکستان شروع ہی سے اپنی بقا کے لیے بیرونی معاشی اور فوجی امداد کا طلب گار رہا۔ بھارت کی مسلسل دھمکیوں اور تسلط نے پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی سرزمین کی سالمیت کے لیے مناسب طریقے اختیار کرے۔

1950ء کے اوائل میں امریکہ نے ایک پروگرام تشکیل دیا جس کا نام "مارشل منصوبہ" (Marshal Plan) تھا جس کا مقصد یورپ کی بحالی اور ایشیا کے مختلف ممالک کی مدد کرنا تھا۔ اسی منصوبے کی روشنی میں تقسیم کے فوری بعد امریکہ نے پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو امریکہ کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اس سے پہلے روس بھی پاکستان کو ماسکو کا دورہ کرنے کی دعوت دے چکا تھا لیکن لیاقت علی خان نے واشنگٹن جانے کو ترجیح دی جس کی وجہ سے پاکستان کا مغرب کی طرف جھکاؤ ثابت ہو گیا۔

1950ء میں لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ اور 1951ء میں کوریا کے بحران نے پاکستان اور امریکہ کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا۔ 1953ء تک دونوں ممالک ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو بخوبی سمجھ چکے تھے۔ اور باہمی قریبی تعلقات کے فروغ کے لیے راہ ہموار ہو چکی تھی۔ لیاقت علی خان کے دورہ کے بعد پاکستان کو امریکہ کی طرف سے بھاری امداد ملی۔ نومبر 1953ء میں اس وقت کے گورنر جنرل پاکستان غلام محمد نے امریکہ کا دورہ کیا۔ دورے کے اختتام پر یہ اعلان کیا گیا کہ جلد ہی پاکستان اور امریکہ کے درمیان ایک فوجی معاہدہ طے پائے گا۔

19 مئی 1954ء کو پاکستان نے امریکہ کیساتھ "باہمی دفاعی تعاون معاہدہ" (Mutual Defence Assistance) پر دستخط کیے۔ اسی سال پاکستان نے سیٹو معاہدہ میں شمولیت اختیار کی۔ سیٹو کا اتحاد اشتراکیت کے اثر کو جو مغرب کے لیے ایک چیلنج بن کر تیزی سے ابھر رہا تھا روکنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ امریکہ نے اپنے اتحادی ممالک سے اشتراکیت کے اثر و نفوذ جو مغربی سرمایہ داری نظام کے لیے خطرہ بن گیا تھا کو روکنے کے لیے تعاون کرنے کی اپیل کی۔ سیٹو میں شمولیت کر کے پاکستان نے اشتراکیت کے خلاف جنگ کرنے کے امریکی مطالبات تسلیم کر لئے۔ سیٹو کی رکنیت نے مکمل طور پر پاکستان کو مغربی بلاک میں شامل کر دیا۔

ایک سال بعد 1955ء میں پاکستان نے بغداد پیکٹ میں شمولیت اختیار کر لی۔ اب پاکستان پوری طرح سے امریکی بلاک میں شامل ہو گیا اور امریکہ کے اشاروں پر ناچنے لگا۔ 1959ء میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان باہمی تعاون معاہدہ طے پایا۔ امریکہ نے پاکستان کو فوجی امداد دینے پر اتفاق کیا۔ 65-1954ء کے درمیان پاکستان نے امریکہ سے 1.5 بلین ڈالر کی فوجی امداد حاصل کی۔ P-480 کی صورت میں اور دوسرے قرضوں کی مد میں پاکستان نے 3 بلین ڈالر کی معاشی امداد وصول کی۔

1958ء تک پاکستان نے پورے خلوص سے امریکہ اور مغربی ممالک کے ساتھ تعاون کیا۔ دوسری طرف امریکہ نے اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمیشہ بھارت کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ 1962ء میں چین کی بھارت کے ساتھ جنگ کے دوران امریکہ نے بھارت کو بھاری فوجی امداد دی۔ جس طریقے سے امریکہ نے بھارت کو امداد دی اس سے پاکستان میں تشویش پیدا ہوئی۔ امریکہ سے بھارت کی طرف جھکاؤ سے پاکستان اور امریکہ کے تعلقات پر برے اثرات مرتب ہوئے۔

امریکی رویے نے پاکستان کو اپنی پالیسی دوبارہ سے پرکھنے کی ضرورت پر مجبور کر دیا۔ پاکستان میں یہ احساس وسیع پیمانے پر پیدا ہوا کہ اب امریکہ اپنے فوجی معاہدوں اور دوستوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے نتیجہ میں امریکی رویہ کی تبدیلی پر پاکستان کے پالیسی سازوں نے علاقے میں دیوانہ وار دوسرے دوستوں کی تلاش شروع کی جو موثر طریقے سے پاکستان کی دفاعی اور امن ضروریات پوری کر سکیں۔

1963ء میں پاکستان کی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے امریکہ نے بھارت کو مزید فوجی امداد دی۔ امریکہ نے بھارت کے اپنی فوجی طاقت کو بڑھانے پر احتجاج کی کوئی پرواہ نہ کی۔ جب بھارت نے 1965ء میں پاکستان پر حملہ کیا تو اس نے جنگ میں امریکی اسلحے کا بے پناہ استعمال کیا۔ صورت حال کو مزید خراب کرنے کے لیے امریکہ نے پاکستان اور بھارت دونوں کی فوجی امداد بند

کر دی۔ فوجی آلات کی بندش نے پاکستان کو سخت نقصان پہنچایا کیونکہ وہ مکمل طور پر امریکہ کی فوجی امداد پر انحصار کر رہا تھا۔ 1965ء کی جنگ میں امریکی کردار اور بھارت کو فوجی ہتھیاروں کی ترسیل کی وجہ سے پاکستان کی دفاعی قوت میں شدید کمی آئی جسکا مقصد پاکستان کے خلاف بھارتی جارحیت کی حمایت کرنا تھا۔

1965ء کی جنگ کے دوران امریکی کردار اور اس کی بھارت نواز حکمت عملی کی وجہ سے پاکستان میں سخت بے چینی پیدا ہوئی۔ عوام امریکہ سے سخت بدظن ہو گئے جس نے اپنے قابل اعتماد دوست کو مشکل میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا پاکستان نے چین جو کہ اب تک ایک طاقتور قوم بن چکا تھا کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ امریکہ نے پاکستان کے چین کی طرف جھکاؤ پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا لیکن امریکہ کی بدلتی ہوئی حکمت عملی کی وجہ سے پاکستان کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔

صدر نکسن کے دور صدارت کے دوران پاکستان اور امریکہ کے باہمی تعلقات میں بہتری آئی۔ امریکہ کو پاکستان کی جغرافیائی مجبوریوں کا شعور ہو گیا تھا۔ امریکہ کی طرف سے پاکستان کی ضروریات کے شعور کی وجہ سے پاکستان۔ امریکہ تعلقات میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ 1968ء تک امداد کے لیے متعدد معاہدات طے پا گئے۔

گو کہ امریکہ پاکستان کے چین کے ساتھ قریبی تعلقات پر خوش نہ تھا لیکن پھر بھی اس نے پاکستان سے صدر نکسن اور چینی راہنما ماوزے تنگ کے درمیان ملاقات کروانے کے لیے درخواست کی۔ امریکہ نے علاقے میں بڑھتے ہوئے چینی اثر نفوذ کا ادراک کر لیا تھا اور اپنے اور چین کے درمیان جاری تناؤ کو کم کرنا چاہتا تھا۔ پاکستان نے چین اور امریکہ کو قریب تر لانے میں حسب ضرورت مثبت کردار ادا کیا۔ چین، امریکہ ملاقات کروانے میں پاکستان کے مثبت کردار کے باوجود 1971ء کے بحران میں امریکی کردار نے پاکستان میں سخت مایوسی پھیلائی۔ امریکہ نے جنگ میں پاکستان کی خلوص دل سے حمایت نہ کی اور نہ ہی بھارتی جارحیت کی مذمت کی۔ امریکی کردار نے یہ ثابت کیا کہ پاکستان کو چین۔ امریکہ ملاقات کروانے سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ نکسن۔ ماؤ ملاقات کروانے کی وجہ سے روس پاکستان سے ناراض ہو گیا اور بھارت کے نزدیک ہو گیا جو کہ بھارت اور روس کے درمیان دفاعی معاہدہ طے کرنے کا باعث بنا۔

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات 77-1976ء میں ایک دفعہ پھر خراب ہو گئے جب پاکستان نے ایٹمی توانائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ امریکہ نے پاکستان کی برائے امن اور اندرونی استعمال کے لیے ایٹمی استعداد حاصل کرنے کی کوشش کی شدید مخالفت کی۔ امریکہ نے 1977ء میں ایٹمی منصوبے کی امداد اس وجہ سے روک دی کہ پاکستان نے فرانس کیساتھ ایٹمی پانی بنانے والا پلانٹ خریدنے کا معاہدہ کیا تھا۔ اس کے باوجود پاکستان نے جھکنے سے انکار کر دیا کیونکہ کارٹر انتظامیہ کے دوران پاکستان۔ امریکہ تعلقات سب سے نچلی سطح پر پہنچ چکے تھے۔ صدر کارٹر نے اپنے دورہ ایران اور بھارت کے دوران جان بوجھ کر پاکستان کا دورہ کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکہ نے پاکستان کی کمزور معاشی حالت کا شدید استعمال کیا اور پاکستان کو چشمہ پروسیسنگ منصوبہ ترک کر کے NPT پر دستخط کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔

1979ء میں افغانستان پر روسی چڑھائی نے امریکہ کے احساس برتری کو شدید دھچکا لگایا۔ کابل پر روسی قبضے نے امریکہ کی بین الاقوامی حیثیت کو للکارا تھا۔ اس نے امریکہ کے نقلی گھمنڈ کو جڑ سے ہلا کے رکھ دیا تھا۔ امریکہ تیزی سے خواب غفلت سے جاگا اور خطرناک صورت حال کا اندازہ لگایا۔ اپریل 1979ء میں امریکہ نے پاکستان کو اطلاع کی کہ امریکہ ڈیورنڈ لائن کو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کرتا ہے۔ اس نے دفاعی مسائل جو افغانستان پر روسی قبضہ سے پیدا ہو گئے تھے پر بات چیت کرنے کے لیے ایک وفد اسلام آباد بھیجنے کی پیش کش کی اس نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے باوجود پاکستان کی معاشی امداد پر سے پابندیاں اٹھانے کی بھی پیش کی۔

کارٹر انتظامیہ نے تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے جغرافیائی و جنگی حالات میں پاکستان کی اہمیت کا اندازہ لگایا تھا۔ 1980ء میں ڈاکٹر برزنسکی اور کرسٹوفر پر مشتمل ایک وفد اسلام آباد پہنچا۔ ڈاکٹر برزنسکی نے یہ زور دیا کہ افغانستان میں روس کو پاؤں جمانے کی اجازت نہ دی جائے اور روسی قبضے کی زیادہ سے زیادہ قیمت ہونی چاہیے۔ انہوں نے امریکہ اور پاکستان کے درمیان قریبی تعلقات پر بھی زور دیا۔

امریکہ نے 400 بلین ڈالر کی فوجی و معاشی امداد پیش کی۔ پاکستان کو یہ بتایا گیا کہ کسی ایسے ملک کو جس نے ایٹمی مہارت حاصل کر لی ہے امداد کی راہ میں سمنگٹن اور گلین ترامیم سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ امریکی حکام نے پاکستان کو بتایا کہ امریکی قانون میں پاکستان کو امداد دینے کے لیے ترمیم کر لی جائے گی۔ چونکہ امداد کی پیش کش اتنی معمولی تھی جس سے مونگ پھلی کے دانے بھی نہیں خریدے جا سکتے تھے لہٰذا پاکستان نے امداد کی پیش کش ٹھکرا دی۔

پاکستان کے جارحانہ اقدام کے باوجود امریکہ نے پاکستان کے ساتھ دوطرفہ تعلقات کو فروغ دینے میں دلچسپی ظاہر کی۔ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر نے اپنی حکومت کے جذبات پاکستان کو پہنچائے اور کہا کہ اگر پاکستان اپنا ایٹمی پروگرام بند کر دے تو امریکہ دوطرفہ تعلقات بڑھانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ پاکستان اس پیش کش سے متاثر نہ ہوا اور جھکنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کے غیر مصالحانہ رویے پر فوری ردعمل ہوا اور پاکستان کے تمام منصوبوں کے لیے امداد روک دی گئی۔ امریکہ کے زیر اثر آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور کنسورشیم ممالک نے معاشی دباؤ کے لیے مل کر دباؤ ڈالا۔ پاکستان کی قرضوں کے لیے تمام درخواستیں مسترد کر دی گئیں اور آئی ایم ایف کے حکام نے پاکستان کو امریکہ کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کا مشورہ دیا۔

1980ء میں رونالڈ ریگن صدارتی انتخاب جیت گئے۔ انتظامیہ میں تبدیلی کے ساتھ ہی امریکہ کی بین الاقوامی اور بالخصوص ایشیائی مسائل کے بارے سوچ میں واضح تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ افغانستان پر روسی قبضہ امریکہ کے لیے بنیادی مسئلہ بن گیا۔ اس حوالے سے پاکستان کلیدی ملک بن گیا جو کہ روسی جارحیت کو روکنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ روسی خطرے کے پیش نظر امریکہ کی نظروں میں زیادہ مضبوط پاکستان کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔

ریگن انتظامیہ نے پہلے سے زیادہ اور جرات مندانہ امداد کی پیش کش کی۔ اس نے اب پاکستان کے ساتھ دوطرفہ تعلقات کو نئے سرے سے استوار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ماضی کی امریکی بے وفائی کی روشنی میں پاکستان نے بڑی امداد کی پیش کش قبول کرنے میں تامل کا اظہار کیا اور اس پر کسی قسم کی خوشی یا جوش کا مظاہرہ نہ کیا۔ لیکن پھر بھی اپنی سرحدوں پر روسی فوجوں کی موجودگی کے پیش نظر پاکستان نے امریکی پیش کش کا مثبت طریقے سے جواب دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ پاکستان اکیلا روسی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔

شروع میں کابل پر روسی یلغار کی روشنی میں ریگن انتظامیہ پاکستان کی نازک صورت حال کو بخوبی سمجھتی تھی۔ وزیر خارجہ جنرل ہیگ پاکستان کے لیے ہمدردی رکھتے تھے اور سرحدوں پر غراتے ہوئے روس کی موجودگی میں پاکستان کی خطرناک صورت حال سے بخوبی آگاہ تھے۔ پاکستان نے اپنے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے اپنی حیثیت واضح کی اور کہا کہ وہ اپنے ایٹمی پروگرام پر کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جنرل ہیگ نے یہ یقین دہانی کروائی کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام امریکہ اور پاکستان کے دوطرفہ تعلقات میں رکاوٹ نہ بنے گا۔

پاکستان نے امریکہ کے ساتھ معاہدہ طے کرنے کے لیے اپنا ماہرانہ وفد واشنگٹن بھیجا۔ مذاکرات کے دوران F-16 طیارے پاکستان کے سپرد کرنے کے حوالے سے تعطل پیدا ہوگیا۔ پاکستان چاہتا تھا کہ طیاروں کی پہلی کھیپ ایک سال کے اندر دے دی

فروری 1995ء میں پاکستان اور امریکہ کے اہل کاروں نے اسلام آباد میں نیویارک ٹریڈ سنٹر پر بمباری کے سرغنہ کو پکڑ لیا اور فوری طور پر اسے امریکہ روانہ کر دیا۔ اسی طرح کی ایک اور کارروائی میں دو امریکی باشندوں کو جو کراچی قونصل خانہ میں اپنے کام پر جا رہے تھے، مارچ 1995ء کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ 12 نومبر 1997ء کو یونین ٹیکساس پٹرولیم کمپنی کے چار ملازمین اور ان کے ڈرائیور کو کراچی میں ایک دہشت گرد حملے میں ہلاک کر دیا گیا۔

کشمیر پر امریکی حکمت عملی

امریکہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قرار داد کی اب حمایت نہیں کرتا۔ وہ کشمیر کے مسئلے کے حل کے لیے شملہ معاہدہ 1972ء کی روشنی میں مذاکرات پر زور دیتا ہے۔ امریکہ کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے کسی خاص طریقہ کار کی حمایت نہیں کرتا۔ لیکن اگر دونوں ممالک چاہیں تو وہ اس مسئلے کے حل کے لیے مدد کرنے کو تیار ہے۔ امریکہ نے کشمیر میں بھارتی فوجوں کے ظلم و ستم پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ امریکہ مسئلہ کشمیر کے دائمی حل کے لیے کشمیری عوام کی خواہشات کا احترام نہیں کرتا کیونکہ پاکستان ۔ بھارت جھگڑے میں امریکہ کا کوئی مفاد خطرے میں نہیں۔ امریکہ سیکورٹی کونسل میں کشمیر کے مسئلے کو اٹھانے کے حق میں نہیں۔ پاکستان اب کشمیر کے معاملے میں امریکہ اور مغربی ممالک کی حمایت پر انحصار نہیں کر سکتا۔

پریسلر ترمیم

پریسلر ترمیم کی رو سے امریکہ نے پاکستان کی ہر قسم کی فوجی و معاشی امداد روک لی۔ اس ترمیم کے مطابق پاکستان کو کسی قسم کی معاشی و فوجی امداد دینے سے پہلے صدر امریکہ کو ایوان نمائندگان کے سپیکر کی تسلی کے لیے یہ سرٹیفکیٹ دینا ضروری ہوگا کہ پاکستان کسی بھی قسم کا ایٹمی توانائی کا پروگرام نہیں چلا رہا اور نہ ہی اس کے پاس ایٹمی ہتھیار و اسلحہ موجود ہے۔ یہ ترمیم امریکی بیرونی امداد کے قانون 1961ء میں کی گئی۔

پاکستان۔امریکہ تعلقات میں تبدیلی

9 ستمبر 2001ء کے حملہ کے بعد پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں تبدیلی رونما ہوئی۔ پاکستان کے حوالے سے امریکی حکمت عملی میں نئی اطراف کی روشنی میں تبدیلی کی گئی۔ صدر جارج ڈبلیو بش جو حملے کی شدت سے ہل کر رہ گئے تھے، انہوں نے 9/11 کے قاتل حملہ آوروں کے خلاف سخت قدم اٹھانے کا اعلان کیا۔ انہوں نے دہشت گردی کو جڑوں سے ختم کرنے کے عزم کا اعلان کیا اور دنیا سے اپیل کی کہ وہ ایسی لعنت کو ختم کرنے کے لیے امریکہ کا ساتھ دیں۔ شروع میں دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے چالیس اقوام کا اتحاد قائم کیا گیا۔ اپنے جنگی و جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے پاکستان کو دعوت دی گئی کہ وہ اتحاد میں شامل ہو۔

امریکہ نے دہشت گردی کو مٹانے کے لیے اپنی کوششوں کا آغاز طالبان کی زیر حکومت افغانستان پر حملوں سے کیا۔ امریکہ اسامہ بن لادن کو 9/11 حملے کا روح رواں سمجھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اسامہ افغانستان میں چھپا ہوا ہے لہٰذا افغانستان کو سبق ملنا چاہیے۔ ظالم اور قدامت پسند طالبان کی حکومت ختم کرنے کے بعد امریکہ نے دوسرے رکن ممالک کی مدد سے دہشت گردی کے خلاف وسیع پیمانے پر جنگ شروع کی۔ اس جنگ نے دہشت گردوں کا تعاقب شروع کیا جس کا مقصد ان پناہ گاہوں کو ڈھونڈنا تھا جہاں دہشت گرد چھپے ہوئے تھے۔ عراق کے خلاف جنگ بھی امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ کی کڑی تھی۔

امریکی حکومت نے اچانک اور غیر متوقع طور پر 9/11 کے حملے کے بعد پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات میں تبدیلی کی۔ اس تبدیلی کے حوالے سے ایک حقائق نامہ جاری کیا جس میں دہشت گردی کو کچلنے میں جنرل پرویز مشرف کی امداد کی تعریف کی۔ اس نے

پرویز مشرف کو امریکہ کا دوست کہا۔ حقائق نامے میں یہ کہا گیا کہ اگر صدر مشرف اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اپنے ملک کو جدید خطوط پر چلانا چاہتے ہیں تو امریکہ کو پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے صدر مشرف کی انتہا پسندوں کے خلاف جدوجہد میں بھرپور مدد کرنی چاہیے اور حکومت پاکستان کی موجودہ امداد کے باوجود فوجی و تعلیمی میدان میں مدد کرنی چاہیے۔

بش انتظامیہ نے پاکستان کے دفاع، معاشی ترقی اور معاشی ترقی کے منصوبوں کے لیے پانچ سالہ 3 بلین ڈالر امداد کا اعلان کیا ہوا تھا۔ پاکستان کے عوام کی خوشحالی کے لیے 06-2002ء کے دوران امریکی امداد 300 ملین ڈالر تک پہنچ جائے گی۔ پرائمری و سیکنڈری تعلیم کی بہتری، صحت کی سہولتوں بالخصوص خواتین کے لیے، کو جدید خطوط پر استوار کرنا، پاکستان کی چھوٹے و درمیانی درجے کی تجارت کو بین الاقوامی مارکیٹ میں مقابلے میں مدد کرنا وہ چند مخصوص و مشترک مقاصد ہیں جن میں امریکہ اور پاکستان مل کر کام کر رہے ہیں۔ اس سال 130 سکولوں کی مرمت کی جا رہی ہے۔ ماں اور بچے کی شرح اموات میں کمی اور طلباء جو پاکستان یونیورسٹیوں میں داخلے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، کے لیے وظائف کے پروگرام شروع کیے جا رہے ہیں۔

پاکستان اور بھارت تعلقات

تاریخی پس منظر

پاکستان 14 اگست 1947ء کو ایک لمبی اور تھکا دینے والی جدوجہد آزادی کے نتیجہ میں آزاد مملکت کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اس وقت اپنی جدوجہد آزادی کا آغاز کیا جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔

ہندوؤں اور کانگریس کے لیے پاکستان ایک ناقابل عمل ملک تھا کیونکہ اس کی بنیاد انتہائی نفرت پر قائم تھی۔ انہوں نے کبھی بھی پاکستان کو ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر تسلیم نہ کیا۔ لہٰذا 1947ء میں تقسیم ہند سے لے کر آج تک پاکستان اور بھارت کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے ہیں۔ پاکستان اور بھارت ایک دوسرے سے نظریے، قومیت اور سیاست کے حوالے سے بالکل مختلف اور علیحدہ مملکت ہیں۔ ان کے درمیان اختلافات، علاقائی جھگڑے کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ مخالف نظریات اور مقاصد کی بنا پر ہیں۔ ان اختلافات کی جڑیں برطانوی حکمرانوں کی برصغیر کی غلط تقسیم پر قائم ہیں جس نے دو ہمسایہ ممالک کے درمیان ٹکراؤ اور چپقلش پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ برطانوی حکمرانوں نے کئی معاملات بغیر حل کئے چھوڑ دیئے جو پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعات کا باعث بنے۔

تقسیم کے فوراً بعد ہندوستان نے پاکستان کو معاشی طور پر تباہ کرنے کے لیے اقدامات کئے۔ پاکستان کے زرعی شعبہ کو تباہ کرنے کے لیے پاکستان میں بہہ کر آنے والے دریاؤں کا پانی روک دیا۔ پاکستان کو اپنی فصلیں بچانے کے لیے بھارت سے پانی خریدنا پڑا۔ اس کے بعد ہندوستان نے اثاثہ جات میں سے پاکستان کا جائز حصہ دینے سے انکار کر دیا۔ ہندوستان نے فرخا بیراج بنا لیا، جونا گڑھ اور کشمیر پر قبضہ کر لیا اور روپے کی جنگ شروع کی جس نے آزادی کے شروع میں ہی پاکستان کو ناکارہ کر کے رکھ دیا۔

بھارت نے 1965ء اور 1971ء میں پاکستان کے لیے فوجی مداخلت کر کے دفاعی مسائل پیدا کئے۔ 1965ء اور 1971ء میں پاکستان بھارتی جارحیت کے نتیجہ میں شدید طور پر خطرے کی زد میں آ گیا۔ ان مسلح جھگڑوں کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات مزید خراب ہو گئے۔

میڈیا کے ذریعے ضرر رساں اور مبالغہ آمیز معلومات کی اشاعت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دوستانہ تعلقات کی راہ میں ناقابل تسخیر رکاوٹ ثابت ہوئی۔ بھارتی خبر رساں اداروں کے ذریعے پاکستان کے خلاف زہر آلود معلومات اگلنے کا مقصد پاکستان کو

بدنام کرنا اور پاکستان کی اندرونی صورت حال کو خراب کرنا تھا۔ معاہدہ تاشقند میں یہ اعلان کیا گیا کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف مخالفانہ مواد شائع نہیں کریں گے اور نہ ہی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ایک دوسرے کے خلاف مہم چلائی جائے گی لیکن بھارت نے اس معاہدے کا احترام نہ کیا اور پاکستان کے خلاف مخالفانہ اور منظم تشہیر جاری رکھی۔

سفارت کار اپنے اپنے ملک کے نمائندے ہوتے ہیں جو دونوں ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے بھارت اور پاکستان کے معاملے میں سفارت کار دونوں ممالک کے درمیان تناؤ اور چپقلش کی وجہ سے اپنا موثر کردار ادا کرنے میں ناکام رہے۔

کشمیر

تقسیم ہند کے منصوبے میں یہ بات صاف طور پر لکھی گئی تھی کہ شاہی ریاستوں یعنی کشمیر، حیدر آباد اور جونا گڑھ کے عوام کا مستقبل ان ریاستوں میں رہنے والے عوام کی مرضی کے مطابق طے کیا جائے گا۔ لیکن تمام اخلاقی اصول وضوابط کے برعکس ہندوستان تقسیم ہند کے منصوبے سے منحرف ہوگیا اور کشمیر کے خاصے حصے پر طاقت کے ذریعے قبضہ کرلیا جو کہ ابھی تک بھارتی حکومت کے تسلط میں ہے۔ پاکستان نے کشمیری عوام کو حق رائے دہی کے ذریعے کئی بار مسئلہ کے پرامن حل کی کوشش کی ہے لیکن بھارت تعاون پر آمادہ نہ ہوا۔ اقوام متحدہ کی کئی قرار دادیں بھارت کی وجہ سے ناکام ہوگئیں۔ اس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کشمیر کے مسئلے پر پاکستان اور بھارت کے درمیان تین جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کا عمل

(The Process of Normalization of Relations between India & Pakistan)

جنوبی ایشیا کی سیاست کا سب سے اہم اور حساس مسئلہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانا ہے۔ یہ نہ صرف دونوں ممالک کی خوشحالی اور ترقی کے لیے ضروری ہے بلکہ علاقے میں امن اور استحکام قائم کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ دونوں ممالک اپنے وسائل کا وسیع حصہ اپنے دفاع پر خرچ کر رہے ہیں جبکہ باقی ماندہ وسائل، غربت، جہالت، بیماری اور بے روزگاری سے نجات حاصل کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔

اعلان تاشقند (Tashkent Declaration)

1965ء میں بھارت اور پاکستان ایک شدید جنگ میں ملوث ہوگئے۔ پاکستان کی افواج نے بھارتی افواج کو شکست دی۔ پاکستان نے اپنی بہتر پوزیشن کے باوجود روس کی شروع کردہ امن کوشش کا مثبت جواب دیا۔ بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری اور پاکستانی صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کو مذاکرات کے لیے تاشقند آنے کی دعوت دی گئی۔ ملاقات 1966ء میں ہوئی اور پاکستان اور بھارت کے درمیان معاہدہ طے پایا جسے معاہدہ تاشقند کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں ملکوں کے درمیان لڑائی بند ہوگئی۔

اعلان تاشقند کی سب سے اہم شق باہمی تعاون و اعتماد کی بحالی تھی۔ یہ دونوں اطراف پر شکوک وشبہات ختم کرنے میں مدد دے سکتی تھی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا۔ جس کی غالباً وجہ دونوں کے درمیان سیاسی عدم استحکام تھا۔

شملہ معاہدہ

شملہ معاہدہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو معمول پر لانے کی ایک اور کوشش تھی۔ یہ معاہدہ صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو اور بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کے درمیان طے پایا۔

1990ء کی دہائی کے دور اور پاک۔ بھارت تعلقات

(India-Pakistan Relations during 1990)

1990ء کی دہائی شروع ہوتے ہی پاکستان اور بھارت کے تعلقات جو کہ پاکستان میں 1988ء میں جمہوریت کی واپسی کے ساتھ بہتر ہوگئے تھے' یکدم خراب ہوگئے۔ پاکستان کی اس وقت کی وزیراعظم بے نظیر بھٹو اور ان کے بھارتی ہم منصب راجیو گاندھی نے ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔ اس معاہدے سے دونوں ممالک کے درمیان سیاچن سے فوجیں ہٹانے کے لیے پاکستان اور بھارت کے درمیان اونچی سطح کے مذاکرات شروع ہوئے۔

تاہم 1988ء میں پایا جانے والا جوش وخروش مفقود تھا اور شدید نفرت کی صورت میں انحطاط پذیر ہوگیا جبکہ 1990ء کے اوائل میں وادی کشمیر میں بھارت کے ظالمانہ طرز حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد شروع ہوئی۔ پاکستان کو کشمیر میں ہونے والی بغاوت کی ہر ممکن مدد کرنا پڑی۔ ہندوستان نے کشمیر میں سرکشی کی پاکستانی حمایت کو جموں وکشمیر پر قبضہ کرنے کے منصوبے سے تعبیر کیا۔

جنوری 1990ء کے واقعات کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تناؤ میں اضافہ ہوا۔ پاکستان اور بھارت نے ایک دوسرے کے خلاف ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی دی۔ پاکستان نے بھارت کی ایٹمی طاقت کی روشنی میں اپنے سائنس دانوں کو ایٹمی ہتھیار بنانے کا حکم دیا۔

کسی حد تک پاکستان اور بھارت کے درمیان تناؤ میں کمی آئی۔ دونوں ممالک میں فوجی کمانڈروں کے درمیان مذاکرات کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ اپریل 1991ء میں فوجوں کی نقل وحرکت اور ہوائی حدود کی خلاف ورزی روکنے کے لیے دونوں ممالک میں ایک معاہدہ ہوا۔ حکومت پاکستان کو بھارتی جارحیت کو روکنے کے لیے ایٹمی ہتھیاروں کی اہمیت کا احساس ہوا۔ پاکستان نے کھلے عام یہ دعویٰ کیا کہ اس کے پاس کم ازکم ایک ایٹمی ہتھیار بنانے کے لیے مطلوبہ معلومات اور سامان موجود ہے۔ پاکستان کے ایٹمی صلاحیت کے اعتراف کے بعد بھارت نے پاکستان پر امریکی دباؤ بڑھانے کے لیے کہا اور ساتھ ہی بھارت کی جانب سے حفظ ماتقدم کے لیے زیادہ سخت اقدامات کا اعلان کیا۔ لہٰذا بھارت نے اگست 1992ء میں تھوڑے فاصلے پر مار کرنے والے اگنی میزائل کا تجربہ کیا۔ 6 دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کی تباہی اور بھارت کا ایٹمی ترقی پر بات چیت کے انکار سے تعلقات مزید خراب ہوئے۔

جنوری 1994ء میں بھارت اور پاکستان کے خارجہ سیکرٹری آپس میں ملے اور اہم نوعیت کے مسائل پر تبادلہ خیال کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن پاکستان کی طرف سے بات چیت کے لائحہ عمل میں کشمیر کو شامل کرنے پر اصرار نے تعلقات کو معمول پر لانے کے عمل میں رکاوٹ ڈال دی۔ 1990ء کی دہائی میں کلنٹن انتظامیہ کی طرف سے پاکستان کی امداد بحال ہونے پر پاکستان۔ بھارت تعلقات میں تشویش ناک صورت حال پیدا ہوئی۔

پاکستان نے بھارت سے 1997ء میں چار سال کے بعد بات چیت دوبارہ شروع کی۔ بھارتی حکومت نے وزیراعظم آئی۔ کے۔ گجرال کے عقائد کے مجموعے (Gujral Doctrine) کی روشنی میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانا چاہا۔ اسی دوران 1997ء میں نواز شریف کی حکومت میں واپسی سے بھارت کے ساتھ بات چیت اور تعاون کا پھر سے آغاز ہوا۔

سال 2000ء کے دوران بھارت۔پاکستان کے درمیان تعلقات نچلی سطح پر منجمد رہے۔ 1999ء کے دوران ہونے والے واقعات نے دونوں ممالک کے درمیان محاذ آرائی کو خطرناک سطح تک پہنچا دیا۔ لاہور میں بس سروس کے انعقاد کے بعد کارگل میں جنگ شروع ہو جانے سے بھارت میں پاکستان کی طرف سے دھوکا دہی کا احساس پیدا ہوا۔ حالانکہ کارگل کا ڈرامہ اعلان واشنگٹن کے ساتھ ختم ہوگیا لیکن بھارت نے اپنی انتخابی مہم کی خاطر پاکستان کے خلاف جھوٹی تشہیر کی جنگ شروع رکھی۔

سال 2000ء کے دوران پاکستان کے خلاف بھارت کی حکمت عملی کارگل مسئلہ کی وجہ سے تمام عرصہ مخالفانہ رہی۔ بھارت پاکستان کی طرف سے کسی بھی وقت کسی بھی جگہ پر مذاکرات کی دعوت کو کارگل کا بہانہ بنا کر ٹھکراتا رہا۔ اسی دوران بھارت نے کشمیر میں مزید فوج اور اسلحہ بھیج کر اپنی ظالمانہ کارروائیوں میں اضافہ کر دیا۔

وقت گذرنے کے ساتھ بھارت میں کچھ حقائق پسندی ظاہر ہوئی اور پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوانے میں ناکامی کے بعد حکمت عملی میں مثبت سوچ نمایاں ہوئی۔ چونکہ کشمیر کی جدوجہد آزادی میں کمی نہ آئی لہٰذا بھارت کو مجاہدین آزادی کی سب سے بڑی جماعت ''حزب المجاہدین'' کے ساتھ فائر بندی کے لیے بات چیت شروع کرنا پڑی۔ بھارت امن مذاکرات میں پاکستان کو علیحدہ رکھنا چاہتا تھا لہٰذا مذاکرات ناکام ہوگئے۔

2000ء میں بالآخر ہندوستان نے رمضان کے مہینے میں فائر بندی کی پیش کش کی۔ پاکستان نے اس پیش کش کا مثبت جواب دیا اور لائن آف کنٹرول کے ساتھ فائر بندی پر عمل درآمد کروایا۔ پاکستان نے ہندوستان کو کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی میں کمی کر کے اس کا بدلہ چکانے کی پیش کش کی۔

کارگل کا مسئلہ (Kargil Issue)

کارگل کے مسئلے پر پاک۔بھارت تعلقات ایک دفعہ پھر خراب ہوگئے۔ جنگ اس وقت شروع ہوئی جب مجاہدین نے مئی 1999ء میں کارگل دراس سیکٹر میں چند چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان کو مجاہدین آزادی جو کہ پچھلے پچاس سال سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے' کی مدد کے لیے جنگ میں کودنا پڑا۔

مئی 1999ء کے شروع میں بھارتی فوجوں نے پاکستانی علاقے لائن آف کنٹرول کے کچھ رقبے پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے ایسا اس وقت کیا جب ان کے مطابق کچھ پاکستانی دراندازکارگل سیکٹر میں گھس آئے اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر قبضہ کر لیا۔ بھارتی فوجوں کے لیے یہ بہت تشویش ناک بات تھی کیونکہ اس طرح ان کی انتہائی حساس ہائی وے جو کہ لداخ اور سیاچن کو جاتی تھی' خطرے میں آ گئی تھی۔ مجاہدین کی طرف سے سخت مزاحمت کی وجہ سے بھارت نے علاقے میں اپنی فوجوں میں بھاری اِضافہ کر دیا۔

معمول پر لانے کا عمل (The Process of Normalization)

جب جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کو برطرف کر کے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے بھارت اور پاکستان کے درمیان جاری تناؤ اور مخالفت کو ختم کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ صدر مشرف نے ہندوستان کو مذاکرات کی دعوت دے کر اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔

خوش قسمتی سے بھارت نے پاکستان کی تعلقات کو معمول پر لانے کی خواہش کا مثبت جواب دیا۔ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اور صدر مشرف نے فروری 2004ء میں مخلوط (Composite Dialogue) مذاکرات شروع کرنے پر اتفاق کیا۔ مخلوط مذاکرات سے پیشتر حالات کو معمول پر لانے کی ایک اور کوشش کی گئی۔ وزیراعظم واجپائی اور وزیراعظم نواز شریف نے 1999ء میں لاہور میں ملاقات کی۔ دونوں وزرائے اعظم نے دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کے فروغ کے لیے کوشش کی۔

وزیراعظم واجپائی اور صدر مشرف کے درمیان مخلوط بات چیت (Composite Dialogue) فروری 2004ء میں شروع ہوئی۔ اس بات چیت کا محور جموں و کشمیر' سیاچن' سر کریک' ولر بیراج' دہشت گردی اور منشیات' معاشی اور تجارتی تعاون' دوستانہ تعلقات کا فروغ اور اعتماد کی بحالی کے لیے اقدامات تھا۔

آگرہ ملاقات (The Agra Summit)

بات چیت کا پہلا دور آگرہ میں شروع ہوا۔ دونوں فریقین کارگل لڑائی کو بھول کر بات چیت میں شامل ہوئے۔ وزیراعظم واجپائی اور صدر مشرف 14 جولائی 2001ء کو آگرہ میں ملے۔

بات چیت کا مرکزی موضوع کشمیر کا مسئلہ تھا جو کہ اختلافات کی جڑ تھا۔ بات چیت کے دوران صدر مشرف نے بھارتی وزیراعظم کو پاکستان بھارت تعلقات کے لیے کشمیر کی اہمیت پر قائل کرنا چاہا۔ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے سخت رویہ اختیار کیا اور مسئلہ کشمیر کے تنازعہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

بات چیت کا اگلا دور اس عزم کے ساتھ شروع ہوا کہ کسی مسئلہ پر پہنچنے کے لیے راستہ تلاش کیا جائے گا۔ واجپائی اور پرویز مشرف میں اتفاق رائے ہوگیا۔ جب مشترکہ اعلامیہ کا مسودہ لکھا جا رہا تھا تو بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ اور وزیر داخلہ ایل۔ کے ۔ایڈوانی نے مسودہ میں تبدیلی کردی جس کی رو سے کشمیری مجاہدین کو دہشت گرد لکھا گیا۔ جنرل پرویز مشرف نے اس دھوکا دہی پر احتجاج کیا۔ اس نقطے پر مذاکرات ناکام ہوئے اور مشترکہ اعلامیہ جاری نہ کیا جا سکا۔

9 ستمبر 2001ء کے بعد بھارت نے پاکستان کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان تناؤ بڑھ گیا۔ بھارت امریکہ کے ساتھ پاکستان کے قریبی تعلقات کی وجہ سے سخت پریشان تھا اور امریکہ اور پاکستان کے درمیان قریبی تعلقات علاقے میں اپنے مفادات کے لیے سخت خطرہ سمجھتا تھا۔ آگرہ مذاکرات کی ناکامی کے باوجود پاکستان کشمیری مجاہدین کی سیاسی وسفارتی حمایت کرتا رہا۔

ان کوششوں میں اس وقت قدرے تیزی آئی جب جنرل پرویز مشرف نے اگست 2003ء میں LoC کے ساتھ مشروط فائر بندی کی پیش کش کی۔ بھارت نے بھی چند شرائط عائد کیں جنہیں پاکستان نے فروغ اعتماد اقدامات (CBMS) کے طور پر منظور کر لیا۔ پاکستان نے تین جنگجو جماعتوں سپاہ صحابہ' جیش محمد اور لشکر جھنگوی پر پابندی لگا دی۔ ان اقدامات کی وجہ سے نومبر 2003ء میں LoC کے ساتھ فائر بندی کرنے میں مدد ملی۔ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ساٹھ سالوں میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی بھارتی وزیراعظم نے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

بھارت اور پاکستان نے اپنے اپنے سفارتی عملے کو بڑھانے پر اتفاق رائے کیا اور سفارت کاروں کی نقل و حرکت سے بھی پابندی ہٹانے پر رضا مند ہوئے۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک نے جموں و کشمیر میں توانائی کے منصوبے بنانے پر اتفاق کیا۔ صدر پرویز مشرف اور اٹل بہاری واجپائی کے درمیان دوطرفہ تعلقات پر گفتگو کے لیے ملاقات ہوئی۔

بھارتی وزیراعظم سارک کی میٹنگ کے لیے اور جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کے لیے جنوری 2004ء میں اسلام آباد آئے۔ واجپائی اور ان کے پاکستانی ہم پلہ میر ظفر اللہ جمالی کے درمیان دوطرفہ معاملات پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قیام امن کے لیے مذاکرات فروری 2004ء میں شروع ہوں گے۔

اسی دوران بھارت اور پاکستان میں حکومتی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ شوکت عزیز پاکستان کے وزیراعظم بنے اور بھارت میں ڈاکٹر منموہن سنگھ وزیراعظم بنے۔ دونوں رہنماؤں نے امن عمل کو جاری رکھنے کا اعادہ کیا۔ شوکت عزیز نے منموہن سنگھ سے دہلی میں ملاقات کی اور دوطرفہ معاملات پر گفتگو کی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ پاکستان کو LoC بطور مستقل سرحد منظور نہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان امن منصوبہ (Peace Road Map for India and Pakistan)

امن کوششوں کو تیز کرنے کے لیے بھارت اور پاکستان ایک مشترکہ راستے پر متفق ہوگئے جو کہ اعلیٰ سطح پر مذاکرات کے ساتھ شروع ہوگا۔ بالآخر بھارت اور پاکستان اس پر قائل ہوگئے کہ جنگ کے ذریعے مسائل حل نہیں کیے جا سکتے۔

امن راستے میں پاکستان کے صوبہ سندھ اور ہندوستان کے راجستھان کے درمیان بس سروس شروع کرنے کے لیے مذاکرات، کشمیر بس شروع کرنے کے لیے گفت و شنید، سمگلنگ اور منشیات، ایٹمی توانائی پر اقدامات برائے تعمیر اعتماد اور کشمیر پر خارجہ سیکرٹریوں کی بات چیت شامل تھی۔ صدر مشرف نے امن کوششوں پر اطمینان کا اظہار کیا۔ دونوں ممالک نے مخلوط مذاکرات (Composite Dialogue) پر مثبت ردعمل کا وعدہ کیا۔ پاکستان اور بھارت نے 15 جنوری 2005ء کو بس شروع کرنے پر اتفاق کیا۔ بس سروس کشمیر کے مختلف حصوں کے درمیان چلے گی۔ دونوں ممالک نے امن مذاکرات کو جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا ہے۔

باب نمبر19

پاکستان کا سیاسی نظام

(Political System of Pakistan)

1947ء سے آزادی کے بعد پاکستان کا سیاسی نظام عارضی حالت میں رہا۔ پاکستان ایک مضبوط اور جمہوری بنیادوں پر استوار سیاسی نظام تشکیل نہ دے سکا۔ شروع ہی سے شدید آئینی بحران کی وجہ سے نو سال تک نوزائیدہ پاکستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی رکی رہی جس کی وجہ سے پاکستان بین الاقوامی برادری میں باعزت مقام نہ بنا سکا۔

پہلا آئین جو پاکستان نے بالآخر 1956ء میں بنایا زیادہ دیر نہ چل سکا اور 1958ء میں مارشل لاء لگنے سے منسوخ ہو گیا۔ 1958ء کا مارشل لاء ملک کی افسوس ناک صورت حال کا نتیجہ تھا جس نے فوجی کمانڈروں کو ملک کا نظم ونسق سنبھالنے پر اکسایا۔ اس کے بعد ملک کو اب تک چار مارشل لاء برداشت کرنے پڑے جس کی وجہ سے ملک میں تعطل پیدا ہوا اور ملکی ترقی کا عمل رک گیا۔ 1973ء میں کسی نہ کسی طرح منتخب اسمبلی اتفاق رائے سے آئین بنانے میں کامیاب ہوگئی جس میں متعدد اسلامی شقیں شامل کر دی گئیں۔ یہ آئین تقریباً چار سال چلتا رہا جبکہ 1977ء میں ایک اور مارشل لاء لگا دیا گیا جس نے اس آئین کو عارضی طور پر معطل کر دیا۔ سیاسی عمل اور اداروں کی کارکردگی ایک دفعہ پھر رک گئی۔

پاکستان کے پاس جمہوری نظام چلانے کے لیے مطلوبہ سیاسی ڈھانچہ موجود ہے۔ جس پر آسانی سے جمہوری نظام کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ لوگ جن پر عمارت کی تعمیر کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ جمہوری نظام کے قیام کے لیے جذبے اور ہمت سے عاری ہیں۔ سیاست دانوں کے سیمابی مزاج اور سیاسی میلان کے علاوہ دوسرے عوامل یعنی غیر منظم سیاسی جماعتیں، مضبوط سیاسی اداروں کی غیر موجودگی اور پرخلوص سیاسی قیادت کی کمی بھی ہمارے لڑکھڑاتے ہوئے سیاسی نظام کے ذمہ دار ہیں۔

پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہے جس کے چار صوبے ہیں۔ صوبوں کو گورنر چلاتے ہیں جنہیں مرکزی حکومت مقرر کرتی ہے۔ ہر صوبے کی منتخب اسمبلی ہوتی ہے اور منتخب نمائندوں پر مشتمل حکومت ہوتی ہے جس کا سربراہ وزیراعلیٰ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قبائلی علاقہ جات مرکزی حکومت کے تحت ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر مرکزی حکومت ملک کا نظم ونسق چلانے کی ذمہ دار ہے جس کا انتظامی سربراہ صدر ہوتا ہے۔ صدر کو پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے مشترکہ اجلاس میں پانچ سال کی مدت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ شروع میں صدر صرف برائے نام سربراہ مملکت تھا لیکن مارچ 1985ء کی بدنام زمانہ آٹھویں آئینی ترمیم کی وجہ سے صدر کو اسمبلی توڑنے، وزیراعظم کو برطرف کرنے، صوبائی اسمبلی توڑنے اور گورنروں کو برطرف کرنے کا اختیار مل گیا۔ اس کے بعد صدر نہایت ذی اثر سیاسی شخصیت بن گیا جو ملک کے سیاسی نظام کو الٹ پلٹ سکتا تھا۔ روزانہ کے حکومتی اختیارات وزیراعظم کے ہاتھ میں ہیں۔ حکومتی کاروبار کو چلانے کے لیے وزیراعظم کی مدد کے لیے وزراء کی کابینہ ہوتی ہے۔

سیاسی جماعتیں (Political Parties)

پاکستان میں کثیر جماعتی نظام رائج ہے۔ سیاسی جماعتوں کی کثیر تعداد جن میں اکثر علاقائی نوعیت کی ہیں اور قابل ذکر عوامی حمایت سے محروم ہیں شروع سے ہی جمہوریت کا راستہ روکنے کی ذمہ دار ہیں۔ وہ اپنی غیر سیاسی سرگرمیوں اور غیر جمہوری ہتھکنڈوں کی وجہ سے بڑی جماعتوں کا راستہ روکتی ہیں۔ یہ جماعتیں معمولی فوائد کے لیے اصولوں پر سودے بازی کر لیتی ہیں اور اس طرح جمہوریت و سیاست کو نقصان پہنچاتی ہیں ایسی سیاسی جماعتیں جن کا عوامی بھلائی کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا اور جو انتہائی تنگ نظر ہیں دراصل پاکستان کے سیاسی نظام کے لیے عذاب ہیں۔

بڑی سیاسی جماعتوں میں مسلم لیگ جس نے آزادی کی جدوجہد کی اور ملک کی بنیاد ڈالی۔ یہ جماعت اپنے اپنے علاقائی سربراہوں کے ناموں کی مناسبت سے مختلف گروپوں میں بٹ گئی ہے۔ مسلم لیگ کے ٹوٹنے سے اس کی سیاسی اہمیت بھی کم ہوگئی ہے اور یہ سخت نکتہ چینی کا نشانہ بنی ہے۔ پاکستان مسلم لیگ ایک قدامت پسند جماعت ہے جسے بڑے بڑے زمینداروں اور قبائلی سرداروں کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ دور حاضر میں مسلم لیگ کے دو دھڑے کام کر رہے ہیں جو کہ PML(N) یعنی پاکستان مسلم لیگ نواز گروپ اور PML(Q) یعنی پاکستان مسلم لیگ (قائداعظم) ہے۔ آزادی کے بعد مسلم لیگ حکومت میں شامل رہی ہے اور اکثر اوقات اس کا دور حکومت سیاسی انتشار، بدنظمی اور ملکی دولت کی لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ رہا ہے۔

PPP پاکستان پیپلز پارٹی دوسری بڑی جماعت ہے۔ 1967ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے اس جماعت کی بنیاد ڈالی۔ اس جماعت کا نعرہ اسلامی سوشلزم ہے جو کہ اسلامی اور اشتراکیت کے چیدہ چیدہ اصولوں کا مجموعہ ہے۔ اس وقت جماعت کی سربراہ سابق وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو ہیں۔

بنیاد پرست جماعت اسلامی جس کی ابتدا 1941ء میں ہوئی ملک میں سنی اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ ایک نہایت منظم اور متحرک سیاسی جماعت ہے جو تشدد سیاست میں یقین رکھتی ہے۔

روس کی حامی جماعت عوامی نیشنل پارٹی 1986ء میں معرض وجود میں آئی یہ جماعت اشتراکی طبقوں کے ملنے سے قائم ہوئی۔ یہ بائیں بازو کی ایک مضبوط اور اہم طاقت سمجھی جاتی ہے اور اس کا مرکز سرحدی صوبے میں ہے۔ مہاجر قومی موومنٹ 1986ء میں قائم کی گئی۔ بعد میں اس کا نام متحدہ قومی موومنٹ رکھا گیا۔ اس کا مرکز کراچی ہے اور الطاف حسین اس کے سربراہ ہیں۔ یہ جماعت درمیانے درجے کے اردو بولنے والے مہاجروں کی جماعت ہے جو ہندوستان سے تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ MQM نسلی بنیادوں پر ملازمت کی پابندیوں کی مخالف ہے۔ مہاجروں کے لیے کراچی، سکھر اور حیدرآباد پر مشتمل علیحدہ صوبے کے حق میں ہے جس کی وجہ سے بڑی تیزی سے سیاسی سطح پر مقبول ہوگئی ہے۔ MQM ایک جنگجو پارٹی ہے اور اپنے قیام سے اب تک مسلح جدوجہد میں مصروف رہی ہے۔ پاکستان میں پارٹی سے وابستگیاں کمزور ہیں اور زیادہ تر علاقائی تعلق اور سرپرستی پر قائم ہیں۔

اعتماد کا بحران (Crisis of Confidence)

تقسیم کے فوری بعد پاکستان کا سیاسی نظام عدم اعتماد کا شکار ہوگیا۔ آئین کی غیر موجودگی جو وفاقی یونٹوں کے حقوق و فرائض کا تعین کر سکتا دراصل ملک کے سیاسی ڈھانچہ کے تعطل کا باعث بنا۔ اعتماد کے بحران نے قوم کی جڑوں کو کھوکھلا کر ڈالا۔

ہم پچھلی ایک صدی سے باہمی بداعتمادی کی فضا میں زندگی گزار رہے ہیں۔ شروع میں تو عدم اعتماد کی بنا پر پیدا ہونے والے مخاصمانہ جذبات سیاسی راہنماؤں تک محدود رہے لیکن بتدریج یہ زہر عام آدمی کے ذہن میں بھی سرایت کر گیا۔ اب ہر وہ کام جو حکومت کرتی ہے اسے شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

بیوروکریسی (نوکر شاہی) (Bureaucracy)

تقسیم کے وقت ایسے سرکاری ملازموں کی شدید قلت تھی جو نوزائیدہ ملک کی انتظامیہ کو بہ احسن وخوبی چلا سکیں۔ اس وقت چند سیاست دان جو موجود تھے وہ ملک کا آئین بنانے سے قاصر تھے۔ اس لیے کچھ ماہرین کو اونچی جگہوں پر لگانا ضروری تھا جو فوری طور پر ملک کے انتظامی مسائل اور ضروریات کو سمجھ کر ان کے حل کی راہ نکال سکیں۔ ان ماہرین میں چوہدری محمد علی، غلام محمد اور چوہدری ظفر اللہ خان شامل تھے۔ ان کے علاوہ کچھ دوسرے بیوروکریٹس بھی شامل تھے جو سیاست میں نمایاں مقام حاصل کر گئے تھے ان میں سکندر مرزا، عزیز احمد، آغا شاہی، غلام اسحاق خان، روئیداد خان، اجلال حیدر زیدی، الطاف گوہر، ایس کے دہلوی اور ہاشم رضا شامل ہیں۔ یہ تمام حضرات انتظامی و سیاسی شعبوں میں اختیارات کی انتہا تک پہنچے۔

پاکستان کے شروع کے دنوں میں گو کہ ملک کے سیاسی حالات مستحکم نہ تھے لیکن پھر بھی بیوروکریٹس اور سیاست دانوں کی ذاتی سوچ اور اخلاق بلند اور ایمانداری تھی۔ بیوروکریسی گو کہ چھوٹی تھی لیکن چند لوگوں کو چھوڑ کر بقیہ اہلکار قابل اور وفادار تھے۔ یہ لوگ بدعنوانی سے نفرت کرتے تھے اور قوم کی خدمت کی سچی لگن کے جذبے سے سرشار تھے۔

ایوب خان کے مارشل لاء نے سیاست دانوں اور افسر شاہی کے اہلکاروں بشمول ججز کی ذاتی اقدار اور پیشہ وارانہ طور طریقوں پر کاری ضرب لگائی۔ خودداری، غیرت مندی اور جہد مسلسل کے جذبے کی جگہ آہستہ آہستہ ذاتی خواہشات، دولت کی ہوس اور اختیار و طاقت کے لالچ نے لے لی۔ آنے والی حکومتوں نے ایسی نوکر شاہی کو فروغ دیا جس میں کردار کی پستی اور قابلیت کے فقدان کو گناہ نہیں سمجھا جاتا تھا اور افسر شاہی کے اہلکار آنکھیں بند کر کے حکمرانوں اور سیاست دانوں کے ساتھ ساز باز کر لیتے۔ اس دور میں بیوروکریٹس بالخصوص افسر شاہی اور پولیس افسروں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جنہوں نے اپنی چرب زبانی اور لچھے دار تحریر سے حکمرانوں کو اپنے جال میں پھنسا لیا اور اپنے سے زیادہ قابل اور قوانین پر کاربند ساتھیوں سے آگے نکل گئے۔

بہت جلد بیوروکریسی پاکستان کے سیاسی نظام کا طاقت ور حصہ بن گئی۔ اسے فیصلہ سازی اور حکمت عملی کے عمل میں ناقابل تسخیر حیثیت حاصل ہوگئی۔ طاقت حاصل کر لینے کے بعد بیوروکریٹس میں زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ وسیع سیاسی دائرہ کار نے بیوروکریٹس کو بے پناہ فوائد سے مالا مال کر دیا۔ وہ اب اختیار و طاقت سے چمٹے رہنے کے لیے مسلسل کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

فوج (The Military)

تقسیم کے بعد پاکستان کو دفاع و تحفظ کے حوالے سے بہت سارے مسائل کا سامنا تھا۔ بھارت نے تقسیم ہند کے منصوبے کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا اور پاکستان کے لیے دفاعی مسائل پیدا کرتا رہا۔ بھارت کا خوف پاکستان کی اندرونی سیاست اور خارجہ پالیسی میں اہم کردار کا حامل رہا ہے۔ افغانستان نے بھی پاکستان کے خلاف مخالفانہ رویہ اختیار کیا۔ اس نے صوبہ سرحد کے مستقبل کے بارے میں اپنے تحفظات ظاہر کرنے شروع کر دیے اور پختونوں کے لیے علیحدہ صوبے کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔

یہ نازک صورتحال کمزور دفاعی حیثیت اور غیر مستحکم سیاسی نظام کی وجہ سے پیدا ہوئی جس نے فوج کے لیے ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت کا راستہ تیار کیا۔ ایک سپاہی کے لیے قومی یک جہتی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کو برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ ملک کی تباہی پر خاموش نہیں رہ سکتا۔

تقسیم کے بعد ملک کی افسوسناک صورتحال نے مسلح افواج میں تشویش پیدا کی جس نے فوج کی عوامی معاملات میں دخل اندازی کا وافر جواز پیدا کیا۔ 1958ء میں پہلا مارشل لاء نافذ کیا گیا اور پاکستان کی فوج نے جو کہ ایک منظم ادارہ ہے اور قوم کو درپیش ہر خطرے کو روکنے کی صلاحیت رکھتا ہے ملک کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ عوام نے پہلے مارشل لاء کو خوش آمدید کہا جو کہ جھگڑالو اور بدعنوان سیاست دانوں سے تنگ آ چکے تھے۔

پاکستان کے سیاسی نظام نے جو کہ کمزور اور جمہوری اقدار سے عاری تھا فوج کو معاشرے میں اپنا اثر و رسوخ پھیلانے کا موقع فراہم کیا جس نے معاشرے سے بدعنوانی کو موثر طریقے سے روک دیا تھا۔ فوجی افسران نے معاملات پر قابو پالیا اور اپنی حیثیت مضبوط بنالی۔ چند سینئر فوجی افسروں کی مدت ملازمت میں توسیع کرنا پڑی جس نے ان کو خودسر بنا ڈالا۔ نچلے درجے کی جمہوریت نے چار مارشل لاء کے لیے راستہ ہموار کیا جس کا یہ مطلب ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی موقع پر جمہوریت کو پنپنے کا موقع نہ ملا۔

مذہبی علماء (The Religious Ulema)

مذہبی جماعتوں اور ان کے راہنماؤں کو پاکستان کے سیاسی نظام میں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی علماء نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مذہبی راہنماؤں نے اپنی شعلہ بیان تقاریر کے ذریعے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی بحالی کے لیے کوشش کرنے کے لیے خواب خرگوش سے جگایا۔ آزادی کے بعد مذہبی جماعتیں پاکستان کو سچی اسلامی ریاست بنانے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوگئیں۔ بہرحال پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کی کوششیں ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکیں۔

اسلامی نظام کے لیے مسلسل جدوجہد کی وجہ سے مذہبی جماعتیں پاکستان کا مضبوط سیاسی طبقہ بن گئیں۔ شدید احتجاجی طریقوں اور مذہب کے بارے مختلف اور مخالفانہ سوچ نے علماء اور مذہبی جماعتوں کو پاکستان کے سیاسی نظام کے لیے دردسر بنا دیا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے کسی موڑ پر علماء اسلامی قانون سازی سے متعلق حکومت سے متفق نہیں پائے گئے۔ بالخصوص مذہبی علماء پیپلز پارٹی کی حکومت کے ساتھ ہمیشہ دست و گریبان رہے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت آخر کار مذہبی جماعتوں کے ساتھ تند و تیز جھگڑوں کی وجہ سے گرا دی گئی اور ایک عوامی طور پر منتخب وزیراعظم کی موت کی صورت میں ختم ہوئی۔

مذہبی جماعتیں حکومت سے اپنا موقف تسلیم کروانے کے لیے پرتشدد طریق کار اختیار کرتی ہیں۔ وہ حکومت کے لیے پرزور عوامی احتجاج کے ذریعے مشکل پیدا کرنے کی اہل ہیں۔ مذہبی جماعتیں اپنے احتجاج میں عوامی پراپرٹی، حکومتی ادارے اور دوسرے مقامات کو تباہ و برباد کر کے حکومت پر دباؤ ڈالتی ہیں جو کہ مضبوط سے مضبوط تر حکومت کے لیے برداشت کرنا ممکن نہیں۔ مذہبی جماعت سڑکوں پر معصوم عوام کو دھکیل کر حکومت کے لیے مشکلات پیدا کردیتی ہیں اور اکثر اوقات ان کے مطالبات ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں جنہیں مذہب کا رنگ دے کر بے بہرہ عوام کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ مذہبی جماعتوں نے ایسے دینی مدارس قائم کرلیے ہیں جہاں پر طالب علموں کو مذہبی تعلیم کی بجائے حکومت کے ساتھ جنگ جوئی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ دینی مدارس مذہبی جماعتوں کے لیے جنگجو پیروکار مہیا کرتے ہیں جو مذہبی علماء اور راہنماؤں کے ایک اشارے پر ملک میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔

پاکستان میں سیاسی عدم استحکام کی وجوہات
(Factors of Political Instability in Pakistan)

کسی بھی ملک کی معاشی ترقی کے لیے سیاسی استحکام لازمی جزو ہے۔ سیاسی استحکام اور معاشی ترقی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ معاشرے میں تمام اداروں کی مضبوطی کے لیے سیاسی اداروں کا مضبوط بنیادوں پر قائم ہونا ضروری ہے۔ سیاسی عدم استحکام لاقانونیت، انتشار اور افراتفری کو فروغ دیتا ہے جو آخر کار ملک کے ٹوٹنے کا باعث بنتا ہے۔

بدقسمتی سے تقسیم سے لیکر اب تک پاکستان شدید سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا ہے۔ پاکستان کے اکثر سیاسی ادارے کمزوری اور بدنظمی کا شکار ہیں اور ان میں یکسانیت کا فقدان ہے۔ ذیل میں ان عوامل کا ذکر کیا جارہا ہے جو پاکستان میں سیاسی عدم توازن پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

1- کثیر جماعتی نظام (Multiple Party System)

پاکستان میں کثیر جماعتی نظام رائج ہے جس میں بے شمار سیاسی جماعتیں اقتدار حاصل کرنے کے لیے کام کررہی ہیں۔ کثیر جماعتی نظام ان ممالک کے لیے موزوں ہے جہاں پر سیاسی نظام کی بنیاد مضبوط ہے اور سیاسی شعور معاشرتی زندگی کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ کثیر جماعتی نظام کا سب ضروری جزو معاشی خوشحالی اور قدرتی وسائل کی بہتات ہے۔ وسیع بنیادوں پر تعلیم کا پھیلاؤ بھی کثیر الجماعتی نظام کا ضروری عنصر ہے۔

پاکستان میں کثیر جماعتی نظام منفی اثرات چھوڑتا ہے کیونکہ پاکستان معاشی پسماندگی اور تعلیمی انحطاط کی وجہ سے کثیر جماعتی نظام کے لیے موزوں نہیں۔ کثیر جماعتی نظام کے متعدد خدوخال ملک میں سیاسی کمزوری کا باعث بنتے ہیں۔ یہ پارلیمنٹ کی افادیت اور شہرت کو سخت نقصان پہنچاتا ہے جب وزراء اور اراکین پارلیمنٹ مسلسل سازشوں میں ملوث رہتے ہیں۔ مخلوط حکومت جو کہ کثیر جماعتی نظام کا نمایاں حصہ ہے ہمیشہ کمزور اور تھوڑی مدت تک رہتی ہے۔ حکومتی پالیسی میں تسلسل کا فقدان ہوتا ہے اور پارلیمنٹ میں کسی بھی مسئلے پر اتفاق رائے حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔

پاکستان کی تاریخ مخلوط حکومتوں کی تباہ کن ناکامیوں سے بھری پڑی ہے جس کی وجہ سے ملک کی سیاسی صورت حال میں توازن برقرار نہ رہ سکا۔ کثیر جماعتی نظام نے ماضی میں ملک کے سیاسی ڈھانچہ کو تباہ کرکے رکھ دیا۔ 1950ء سے 1958ء کا دور شدید سیاسی عدم استحکام کا منہ بولتا ثبوت ہے جبکہ صرف دو سال کے عرصے میں ملک میں سات وزیراعظم آئے جن میں دو سب سے زیادہ مختصر عرصے کے لیے حکومت میں رہے۔

غیر منظم اور کمزور جماعتی ڈھانچہ (Dis-organized and Weak Party Structure)

منظم اور مضبوط سیاسی جماعتیں سیاسی استحکام برقرار رکھنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ مضبوط سیاسی نظام کا جزو ہوتی ہیں اور سیاسی نظام کے بغیر رکاوٹ عمل میں مدد دیتی ہیں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں منظم اور مضبوط جماعتی نظام کی شدید قلت رہی ہے۔ کثیر جماعتی نظام کی وجہ سے سیاسی جماعتوں میں نظم وضبط کی شدید کمی رہی ہے۔ تقسیم کے فوری بعد پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ ناقص تنظیم کی وجہ سے اپنی افادیت برقرار نہ رکھ سکی۔ نظم وضبط کی کمی کی وجہ سے یہ جماعت بدعنوان اور خودغرض سیاست دانوں کے چنگل میں پھنس گئی۔ مسلم لیگ مختلف سیاسی اور

لسانی طبقات کو آپس میں اکٹھا نہ رکھ سکی اور سیاسی بحث و تکرار میں ملوث ہوگئی۔ اس صورتحال کی وجہ سے 1971ء میں ملک دو ٹکڑے ہوگیا۔

اس کے بعد مسلم لیگ مزید دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ 1970ء اور اس کے بعد ہونے والے تمام انتخابات میں مسلم لیگ کے تین مختلف دھڑے انتخابات میں شریک ہوئے۔ اس وقت مسلم لیگ تقریباً چھ مختلف گروہوں میں اپنے اپنے علاقائی سربراہوں کے ناموں کی نسبت سے بٹ چکی ہے جو پاکستان کے کمزور اور جماعتی سیاسی نظام کی دلیل ہے۔

آئینی بحران (Constitutional Deadlock)

آزادی کے بعد پاکستان شدید آئینی بحران میں مبتلا ہوگیا۔ متعدد آئین ساز اسمبلیاں جو تقسیم کے بعد آئین بنانے کے لیے مقرر کی گئیں نو سال تک قابل عمل آئین نہ بنا سکیں۔ پاکستان کی سیاسی حالت کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہی آئینی بحران تھا۔ پاکستان میں کل تین آئین ساز اسمبلیاں آئیں۔ ایوب خان نے بھی 1962ء میں پاکستان کو ایک آئین دیا۔ پاکستان کا پہلا آئین 23 مارچ 1956ء کو نافذ کیا گیا جو پاکستان کے مختلف طبقات کو مطمئن نہ کرسکا۔ آئین نے ملک میں پارلیمانی جمہوریت متعارف کروائی جو کامیاب نہ ہوسکی۔

آٹھویں آئینی ترمیم (Eighth Constitutional Amendment)

1985ء میں 1973ء کے آئین میں آٹھویں بار تبدیلی کی گئی۔ آٹھویں ترمیم نے صدر کو اسمبلی اور حکومت کو برطرف کرنے کا اختیار دے دیا۔ اس ترمیم کے مطابق اگر صدر یہ سمجھے کہ موجودہ حکومت صحیح طور پر کام نہیں کررہی تو صدر کو اسمبلی اور حکومت برطرف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

1988ء میں آٹھویں ترمیم کی رو سے پہلی اسمبلی اور حکومت برطرف کی گئی۔ اس وقت کی حکومت اور جنرل ضیاء کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ محمد خان جونیجو اور جنرل ضیاء کے درمیان ذاتی نوعیت کے اختلافات کی وجہ سے وزیراعظم محمد خان جونیجو کو برطرف کردیا گیا۔ اس کے بعد 1990ء میں بدعنوانی اور نااہلیت کے الزامات لگا کر صدر غلام اسحاق خان نے بےنظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کردیا۔ 1993ء میں وزیراعظم نواز شریف کی حکومت کو صدر غلام اسحاق خان نے کنبہ پروری اور بدعنوانی کے الزامات کے تحت برطرف کردیا اس کے بعد ایک مرتبہ پھر بدعنوانی اور نااہلیت کے الزام لگا کر صدر فاروق لغاری نے بےنظیر کی حکومت 1997ء میں ختم کردی۔ چار منتخب اسمبلیاں اس بدنام زمانہ ترمیم کا شکار ہوئیں۔ آٹھویں ترمیم نے وزیراعظم کے اختیارات کو بہت کم کردیا اور وزیراعظم کو صدر کی توہمات کا قیدی بنا دیا۔ آٹھویں ترمیم کی لٹکنے والی تلوار نے وزیراعظم کو بری طرح محدود کردیا جو اپنے سرکاری فرائض آزادی سے ادا کرنے کے قابل نہ رہے۔

سخت وفاقی اختیار Strict Federal Control

پاکستان ایک وفاقی ریاست ہے۔ پاکستان کا وفاقی نظام مرکزی حکومت کے وسیع اختیارات کے اصول پر مبنی ہے۔ یہ مرکزی حکومت کی برتری قائم کرتا ہے اور اس کو صوبائی معاملات میں دخل اندازی کی اجازت دیتا ہے۔ صوبوں پر کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات صوبائی خودمختاری کا مسئلہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ کچھ معاملات میں تو صوبوں کو ان کے اختیارات کی تقسیم میں آئینی حق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے صوبوں میں بددلی پھیلتی ہے جو سیاسی عدم استحکام کا باعث بنتی ہے۔ وہ تمام اختیارات جو آئین صوبوں کو تفویض کرتا ہے آج کل مرکزی حکومت کے پاس ہیں۔ مرکزی حکومت کے تمام اختیارات پر قابض

ہونے کی وجہ سے صوبے کمزور اور مرکزی اہلکار طاقتور ہوگئے ہیں۔ اختیارات کے ارتکاز کی وجہ سے مرکزی اہلکاروں میں آمریت پسندی اور مطلق العنانی کے رجحانات پیدا ہوجاتے ہیں۔ درحقیقت قومی وسائل کی تقسیم کا جواز سیاسی عوامل کی نشان دہی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں صوبوں میں شدید بے چینی اور مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ بالخصوص چھوٹے صوبے مرکزی اختیار کو انتہائی مطلق العنان اور آمرانہ سمجھتے ہیں اور وسائل میں اپنا حصہ لینے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ مرکزی حکومت کا تسلط صوبوں میں غیر یقینی اور شکوک پیدا کرتا ہے اور صوبے آخرکار وفاق کے ساتھ رہنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ سابقہ مشرقی پاکستان کا معاملہ مرکزی تسلط کا منہ بولتا ثبوت ہے جو کہ مرکزی حکومت سے اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد بالآخر علیحدہ ہوگیا۔

پاکستان کی سیاسی تہذیب و ثقافت (Political Culture of Pakistan)

سیاسی تہذیب و ثقافت سیاسی رویوں، اقدار، احساسات اور قابلیت کا مجموعہ ہوتی ہے چونکہ عوام کے رویے ان کے طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے کسی قوم کی سیاسی تہذیب عوام اور راہنماؤں کے سیاسی نظام کے حوالے سے طرزِ عمل کو متاثر کرتی ہے۔

ایک قوم کی حیثیت سے ہم نے ایسے رویے اپنائے جنہوں نے ہمارے شہریوں کے طور طریقوں کو متاثر کیا اور ہمارے راہنماؤں کے طرزِ عمل پر گہرا اثر ڈالا۔ کثیر جماعتی نظام جو ہمارے سیاسی نظام کا اہم حصہ ہے ہمیں سیاسی بلوغت حاصل کرنے میں کوئی مدد نہ کرسکا بلکہ اس کی وجہ سے پاکستان میں مطلق العنانیت کو فروغ ملا۔ پاکستان کے سیاسی اداروں یعنی فوج، بیوروکریسی اور عدلیہ نے بجائے جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے کے انتظامی اور سیاسی شعبوں میں غیر جمہوری، مطلق العنان اور جی حضوری کے رجحانات کو پروان چڑھانے میں مدد دی۔ یہ انہوں نے اس لیے کیا کہ یہ ادارے خود جمہوری اقدار اور رجحانات سے بے بہرہ تھے۔ یہ نااہل، بدعنوان اور حد سے زیادہ خواہش مند سیاست دانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے جنہوں نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ان کی پیشہ ورانہ اخلاقیات اور ایمان داری کو تباہ کرکے رکھ دیا۔ اس کے علاوہ مذہبی علماء جو ہمارے سیاسی نظام کا اہم حصہ بن گئے انہوں نے ہر آنے والی حکومتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے مذہب کو استعمال کیا۔ انہوں نے ملک کے سیاسی نظام کو کمزور کرنے کے لیے اپنی احتجاجی قوت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ہمارا سیاسی کلچر سیاسی اداروں کے پھیلائے ہوئے رجحانات کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ ہمارے راہنماؤں و مذہبی جماعتوں کے متحارب نقطہ نظر کو پیش کرتا ہے پاکستان کے سیاسی تہذیب و تمدن کی نمایاں خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

1- غیر جمہوری (Undemocratic)

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد ہم نے اپنے متعصب رویوں کی وجہ سے جمہوری اداروں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ہم میں نکتہ چینی کی برداشت کا حوصلہ نہیں جو کہ جمہوریت کی کامیابی کی دلیل ہے۔

بدقسمتی سے پاکستان میں جمہوریت کی بنیاد مطلق العنان حکومت پر رکھی گئی۔ یہ کوئی مراعات یافتہ یا غیر مراعات یافتہ اور طاقت ور یا کمزور طبقوں کے درمیان رسہ کشی یا جدوجہد کا نتیجہ نہ تھی۔ اس قسم کی رسہ کشی ملک کے لیے جمہوری مطابقت پیدا کرنے کا موجب ہوتی۔

اکثر اوقات حکومتی جماعت جھگڑالو حزب اختلاف کو دبانے کے لیے غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ انہیں جھوٹے مقدمات میں ملوث کرکے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ حزب اختلاف کے جلسوں کو منتشر کردیا جاتا ہے۔ حزب اختلاف کے احتجاجی جلوس پر شدید لاٹھی چارج کیا جاتا ہے اور جلوسوں میں شامل افراد بشمول خواتین کو بے عزت کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود پاکستان کے عوام جمہوریت کے حق میں ہیں لیکن معاشرے میں ایسے خیالات موجود ہیں جو جمہوریت کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور جنہیں فوری طور پر ختم کرنا ممکن نہیں۔ ہمارے ادارے جمہوریت سے خوف ونفرت رکھتے ہیں۔ بیوروکریسی نے جمہوریت میں رکاوٹ ڈالنے کا الزام سیاسی جماعتوں پر ڈال دیا ہے۔ انہوں نے سیاسی جماعتوں پر اپنے اندر جمہوریت کی ناکامی اور اراکین پر تیزی سے جماعتی وفاداریاں تبدیل کرنے کا الزام لگایا ہے۔ ماضی میں فوجی حکومتوں نے بھی سیاسی جماعتوں کو جمہوریت کی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے اکثر برملا یہ کہا ہے کہ سویلین ملک کا نظام نہیں چلا سکتے۔ اگر ملک کو بچانا ہے تو اس کا انتظام کسی بہتر طور پر منظم ادارے کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

2- ہارس ٹریڈنگ (Horse Trading)

ہارس ٹریڈنگ کا لفظ پہلی مرتبہ امریکن سیاست میں استعمال ہوا جس کا مطلب ہے بڑی مہارت سے سودے بازی کرنا۔ بنیادی طور پر ہارس ٹریڈنگ کا تعلق سیاسی جماعت کے کسی رکن کا جب اسے دوسری طرف سے وزارتی عہدے یا بنک سے قرضے یا رہائشی پلاٹ یا کسی رشتے دار کے لیے فائدہ مند ملازمت کا لالچ دیا جائے تو وہ اپنی وفاداری تبدیل کرلے اور پارٹی سے علیحدہ ہوجائے اور دوسری پارٹی میں چلا جائے۔

سودے بازی اسی لمحے شروع ہوجاتی ہے جب کوئی رکن اسمبلی پارٹی چھوڑنے کا عمل اختیار کرتا ہے اور دوسری پارٹی کی خاطر اپنی وفاداری تبدیل کرلیتا ہے۔ اس وقت یہ ہارس ٹریڈنگ میں تبدیل ہوجاتی ہے جب پارٹی چھوڑنے والا رکن اسمبلی وفاداری تبدیل کرنے کی بہت بھاری قیمت مانگتا ہے۔ ہارس ٹریڈنگ کو انتہائی قبیح اور غیر اخلاقی سمجھا جاتا ہے۔

ہارس ٹریڈنگ یا وفاداری تبدیل کرنا ہمارے سیاسی نظام کی ایک لعنت ہے جس نے پاکستان میں جمہوریت کی جڑوں کو کھوکھلا کردیا ہے۔ یہ سیاسی عدم استحکام پیدا کرتی ہے اور بالاخر جمہوریت کو ختم کردیتی ہے۔ یہ لعنت بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں سامنے آئی جب ان کی حکومت کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ حزب اختلاف نے نواز شریف کی قیادت میں بے نظیر حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد لانے کی کوشش کی جسے بہرحال حکومت نے ناکام بنا دیا۔

بعد میں آنے والی حکومتیں اس غیر اخلاقی فعل میں ملوث رہی ہیں۔ ہارس ٹریڈنگ کی جگہ نئے نام یعنی ''لوٹا کریسی'' نے لے لی جبکہ مسلم لیگ دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ متعدد اراکین پارلیمنٹ نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کو چھوڑ کر سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو کے نام کی نسبت سے اپنا علیحدہ گروپ تشکیل دے دیا۔

سیاسی جماعتیں ہارس ٹریڈنگ کے مار آستین کو کچلنے کے لیے موثر کردار ادا کرسکتی ہیں جو سیاسی نظام میں سے جمہوری روایات کو تیزی سے نگل رہا ہے۔ یہ رائے دہندگان کو ان سیاست دانوں کے خلاف جو اپنی وفاداریاں تبدیل کرلینے میں باخبر رکھنے سے ہوسکتا ہے۔ ہارس ٹریڈنگ کے انتہائی قبیح عمل کو روکنے کے لیے نواز شریف حکومت نے اپنے دوسرے دور میں 14 ترمیم کے تحت فلور کراسنگ پر پابندی لگا دی۔

3- اقتدار کی سیاست (Power Politics)

ہمارے سیاستدانوں کی اکثریت برطانوی راج کے ساتھ مفاہمت کرنے والے خاندانوں کے وارثوں کی ہے۔ ان کے آباؤ اجداد برطانوی حکمرانوں کے زیر اثر محکوم لوگ تھے جن پر برطانوی حکمرانوں نے خدمات کے عوض بے پناہ مراعات ونوازشات کیں۔ ان معاونین نے اپنے ہم وطنوں اور بھائی بہنوں کو دبا کر برطانوی حکمرانوں کے ساتھ تعاون کیا اور ذاتی فائدے کے لیے بیرونی حملہ

آوروں کے ساتھ مل گئے۔ اپنے تعاون کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مقامی معاونین نے حملہ آوروں کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی کی۔ اس کے بدلے میں معاونین کو اپنے علاقے کے بے کس و مجبور عوام پر بیرونی حکمرانوں کی شہ پر حکومت کرنے کی اجازت مل گئی۔

معاونین کے اندر حکمرانوں کی بے انتہا اطاعت اور فرمانبرداری کا رجحان پیدا ہو گیا جو آج بھی پاکستان کے سیاسی ڈھانچے کا ضروری حصہ ہے۔ طاقت ور اقتدار کی پوجا کرنے والے صاحب اقتدار کی برائیوں سے نظر چرا لیتے ہیں وہ جو کوئی بھی اقتدار پر قابض ہوتا اس کی مدح سرائی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ تعاون کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ اقتدار کی پوجا کرنے کے رجحان کی وجہ سے ہمارا سیاسی نظام چند مراعات یافتہ طبقوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اور عوام کا کوئی کردار نہیں ہے۔

4- متعصب اور کٹر رویہ (Intolerance)

دوسروں کے موقف کو برداشت نہ کرنا ہمارے سیاسی نظام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ پاکستان میں نکتہ چینی برداشت نہیں کی جاتی بالخصوص جب کہ جس پر نکتہ چینی کی جارہی ہو کوئی مشہور اور سرکردہ سیاسی شخصیت ہو تو تنقید کو بری طرح سے جھاڑ دیا جاتا ہے۔ تنقید کرنے والے کو غدار کہا جاتا ہے جو کہ پھانسی کا حقدار قرار پاتا ہے۔ مخالف کے ساتھ نپٹنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے بیرونی ممالک کا آلہ کار کہہ دیا جائے یا CIA اور RAW کا ایجنٹ قرار دے دیا جائے۔

5- الٹی میٹم (Ultimatums)

پاکستان کے سیاسی نظام میں دھمکیاں اور الٹی میٹم جاری کرنا معمول کا کھیل ہے۔ عام طور پر حزب اختلاف کے راہنما اگر ان کے مطالبات پورے نہ کیے جائیں تو حکومت کو دھمکیاں اور الٹی میٹم جاری کرتے ہیں۔ ان کے مطالبات اکثر اوقات حکومت کے بڑے اہلکاروں کے استعفوں کے گرد گھومتے ہیں جن کے لیے ایک آخری تاریخ دے دی جاتی ہے۔ وہ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تحریک چلانے یا پہیہ جام، گھیراؤ جلاؤ اور دھرنا دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ حزب اختلاف صدر اور وزیراعظم کو حکومت چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں اور ان سے استعفی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر صدر یا وزیراعظم حزب اختلاف کے مطالبے پر عمل درآمد نہیں کرتے تو حزب اختلاف حکومت کو کمزور کرنے کے لیے مہم چلاتی ہے۔ یہ قومی جائیداد کو نقصان پہنچاتی ہے اور دہشت گردی کر کے حکومت کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

6- مرد کی برتری (Male Domination)

دوسرے معاشرتی شعبوں کی مانند پاکستان کا سیاسی نظام بھی مرد کی برتری پر قائم ہے۔ مرد کی شاونیت ہمارے سیاسی رکھ رکھاؤ کا اہم جزو ہے۔ قبائلی اور زمیندارہ نظام میں عورت ماتحت کردار ادا کرتی ہے۔ اسے مرد کے پاؤں کی جوتی کہا جاتا ہے۔ بہت سارے سیاسی راہنما جو عورتوں کی آزادی اور حقوق کے علمبردار بنتے ہیں اپنی بیویوں اور دوسری خواتین کو گھر کی چار دیواری میں مقید رکھتے ہیں۔ اگرچہ آئین میں عورت کو مساوی حیثیت دی گئی ہے لیکن انہیں باہر آ کر مرد کے مقابلے میں آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ خواتین کے سیاسی حقوق آئین میں دیئے گئے ہیں لیکن انہیں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں۔ پارلیمنٹ میں عورتوں کے لیے علیحدہ نشستیں مختص کی گئیں۔ بہرحال جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے خواتین کے لیے بہت سی مراعات دی ہیں۔ تقسیم اختیارات 2000 کے منصوبے کے تحت مقامی حکومتوں کے ڈھانچہ میں خواتین کے لیے نشستیں مختص کی گئی ہیں۔

7۔ بدعنوانی (Corruption)

ہر طرح کی بدعنوانی یعنی سیاسی بدعنوانی، اخلاقی بدعنوانی اور مالی بدعنوانی پاکستان کے سیاسی ڈھانچہ میں سرایت کر گئی ہے۔ یہ ہمارے سیاسی کلچر کا ایسا حصہ بن گئی ہے جسے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ سیاسی بدعنوانی سے مراد سیاست دانوں کا اپنے مخالف امیدواروں کو شکست دینے کے لیے ہر قسم کے غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کرنا ہے۔ سیاست دان اقتدار سے چپکے رہنے کے لیے بھی غیر اخلاقی ذرائع استعمال کرتے ہیں۔

پیسہ اور کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا سیاسی بدعنوانی کے دو موثر ذرائع ہیں۔ یہ ذرائع سیاسی وفاداری کے حصول کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب انتخابات کا اعلان ہوتا ہے تو سیاست دان آنے والے انتخابات کو اپنے حق میں کرنے کے لیے کمر کس لیتے ہیں۔ وہ سیاست دان جو انتخابات کے وقت حکومت میں ہوتے ہیں انتخابات کے نتائج کو اپنی جماعت کے حق میں کرنے کے لیے ہر قسم کی غیر قانونی اور غیر اخلاقی کارروائی میں ملوث ہوجاتے ہیں۔ حکومتی جماعت کسی بھی صورت میں انتخابات ہارنے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ رائے دہندگان کو مالی رشوت کے علاوہ بے شمار دوسرے فوائد کے وعدوں سے خریدا جاتا ہے۔

جب ووٹنگ شروع ہوتی ہے تو سیاسی بدعنوانی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ نتائج کو مخصوص امیدواروں کے حق میں یا خلاف تبدیل کردیا جاتا ہے۔ بیلٹ بکس کو تبدیل کرنا، جعلی ووٹ ڈالنا، مخالف کے حق میں ڈالے گئے ووٹوں کو ضائع کردینا اور ان بیلٹ بکسوں کو غائب کردینا جن میں مخالف امیدوار کے حق میں زیادہ ووٹ ہوسکتے ہیں پاکستان کے انتخابات میں استعمال ہونے والے غیر قانونی وغیر اخلاقی حربے ہیں۔

بدعنوانی کا ایک اور ذریعہ ملکی دولت کی لوٹ مار ہے۔ یہ اس وقت شروع ہوجاتی ہے جب حکومت اقتدار سنبھالتی ہے۔ شروع دن سے ہی مخالف جماعتوں کے اراکین پارلیمنٹ کو ساتھ ملانے کے لیے ذرائع کا استعمال شروع ہوجاتا ہے۔ انہیں طاقت ور وزارتوں، اہم منصوبہ جات، نفع بخش اداروں کی الاٹمنٹ، پلاٹس، زرعی اراضی اور دوسرے بے شمار فوائد کا لالچ دیا جاتا ہے۔

ہر حکومت اور اس کے نزدیکی شریک کار ملک کے معاشی وسائل کو لوٹنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ حکومت کے بڑے اہلکار قومی دولت لوٹنے کے لیے غیر معمولی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ نزدیکی رشتے داروں کے نام پر آسان شرائط اور جھوٹی ضمانت پر بنک سے بھاری قرضے جاری کروالیے جاتے ہیں۔

اراکین اسمبلی کو ترقیاتی کاموں کے نام پر مالی رشوت دی جاتی ہے۔ جنرل ضیاء نے اس طریق کار کو ایجاد کیا اور غیر جماعتی اسمبلی کے ہر ایک ایم این اے کو پچاس لاکھ روپیہ ادا کیا۔ اسی طرح سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو نے مقامی حکومتوں کے اراکین کو چار چار لاکھ روپے ادا کیے تاکہ اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کیا جاسکے۔ 1988ء 1990 اور 1993ء اگلے الیکشن کی تاریخ میں ہونے والے انتخابات بھی ترقیاتی کاموں کے بھیس میں قومی دولت لوٹنے کے رجحان کو نہ روک سکے۔ ''آپریشن چھانگا مانگا'' اور ''آپریشن منگورہ'' اس بدعنوان نظام کی بہترین مثال ہیں۔

پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی

(Failure of Parliamentary Democracy in Pakistan)

پاکستان میں جمہوریت کی تاریخ مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ دو دفعہ (1969ء، 1958ء) ملک کا آئین منسوخ کیا گیا اور دو دفعہ (1999ء، 1977ء) میں معطل کیا گیا۔ ابھی تک کوئی مرد یا خاتون وزیراعظم اپنی مدت پوری نہ کرسکی۔ انہیں یا تو حد سے زیادہ

خواہش مند صدر یا کسی مہم جو فوجی جرنیل نے برطرف کردیا اور یا پھر انہیں مستعفی ہونے پر مجبور کردیا۔ پاکستان میں پارلیمنٹ کبھی بھی آزاد نہ رہی ہے عام طور پر اسے کسی اور جگہ پر کیے گئے فیصلوں کی منظوری کے لیے ربڑ سٹیمپ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہ وہ سچے اور سخت حقائق ہیں جو کسی بھی مضبوط اور پرامید شخص کو پاکستان میں جمہوریت کے مستقبل کے بارے یقین کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

تقسیم کے وقت 1935ء کے قانون میں چند تبدیلیوں کے ساتھ پاکستان کے آئین کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ اس قانون نے پارلیمانی طرز حکومت قائم کیا۔ اصل قانون 1935ء کے تحت گورنر جنرل کو برطانوی حکومت کے نمائندے کی حیثیت میں بے پناہ صوابدیدی اختیارات حاصل تھے۔ حالانکہ تبدیل شدہ 1935ء کے قانون کے ذریعے بہت سارے اختیارات واپس لے لیے گئے تھے لیکن پھر بھی کچھ اسی طرح قائم تھے۔ گورنر جنرل کا سب سے اہم صوابدیدی اختیار جو کہ ابھی تک قائم تھا وہ کابینہ اور وزراء کی کونسل کے تقرر اور برطرفی سے متعلق تھا۔

آئینی حق کے علاوہ دو دوسرے عوامل نے گورنر جنرل کی حیثیت کو بہت مضبوط کردیا تھا۔ پہلا قائداعظم جو پہلے گورنر جنرل بنے اپنے بلند مقام کے حوالے سے ان سے برائے نام سربراہ بننے کی امید نہ کی جاسکتی تھی۔ دوم وقت گزرنے کے ساتھ مسلم لیگ عوام کی حمایت کھو بیٹھی اور دوسری کوئی جماعت موجود نہ تھی جو اس خلا کو پر کرسکتی۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں وزیراعظم کو ایک مضبوط اور موثر پارلیمنٹ کی حمایت حاصل نہ رہی جس نے گورنر جنرل کے مقابلے میں وزیراعظم کی حیثیت کو کمزور کردیا۔ پس جوں جوں پاکستان کی سیاسی تاریخ آگے بڑھتی گئی سربراہ مملکت کی حیثیت مضبوط ہوتی گئی اور وزیراعظم کی کمزور۔

اس حقیقت کا اظہار اس وقت ہوا جب گورنر جنرل غلام محمد نے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو 1953ء میں اس وقت برطرف کردیا جب خواجہ ناظم الدین کو پارلیمنٹ کی حمایت حاصل تھی۔ گورنر جنرل کے اس اقدام نے پارلیمانی جمہوریت کی روح پر کاری ضرب لگائی جس کا بنیادی اصول ہے کہ حکومت یا تو عدم اعتماد کے ووٹ کے ذریعے ہٹائی جاسکتی ہے یا پھر انتخابات میں رائے دہندگان کے ووٹ سے ہٹائی جاسکتی ہے۔

وزیراعظم کی برطرفی سے وہ حالات و واقعات شروع ہوگئے جو پانچ سال بعد پارلیمانی جمہوریت کے خاتمے کا باعث بنے۔ اس کے بعد 1954ء میں قانون ساز اسمبلی جو کہ وفاقی پارلیمنٹ بھی تھی کو برطرف کردیا گیا۔ گورنر جنرل کے اختیارات کو کم کرنے کے لیے اسمبلی نے مسودہ بل پاس کرلیا تھا جس کی رو سے گورنر جنرل کو وزیراعظم کو برطرف کرنے کے اختیار سے محروم کردیا گیا تھا۔ گورنر جنرل نے اسمبلی کو ختم کرکے اپنا بدلہ لے لیا۔

غلام محمد بیماری کی وجہ سے اپنے فرائض بخوبی سرانجام دینے کے قابل نہ رہے۔ ان کی جگہ سکندر مرزا آئے جو جمہوریت کے بارے اپنے پیش رو سے مختلف جذبات نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے سربراہ مملکت کی حیثیت کو مضبوط بنانا چاہا اور پارلیمانی اداروں کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔ ان کی گورنر جنرل کی مدت کے دوران ملک کا پہلا آئین 23 مارچ 1956ء کو نافذ کیا گیا اور پاکستان ایک جمہوریہ بنا۔ 1956ء کے آئین نے بھی پارلیمانی نظام رائج کیا۔ گو اس آئین نے صدر یا گورنر جنرل کو برائے نام سربراہ مملکت بنایا لیکن اس نے صدر یا گورنر جنرل کو کچھ صوابدیدی اختیارات بھی تفویض کیے۔ صدر اراکین پارلیمنٹ میں سے کسی کو بھی وزیراعظم مقرر کرسکتا تھا جو کہ پارلیمنٹ کے اراکین کی اکثریت کی حمایت حاصل کرسکتا ہو۔ کثیر جماعتی نظام اور کمزور سیاسی جماعتوں کی موجودگی میں یہ اختیار بہت زیادہ تھا۔ صدر وزیراعظم کو برطرف بھی کرسکتا تھا اگر اس کی رائے میں وزیراعظم اسمبلی کا اعتماد کھو چکا ہو۔

ایسے ملک میں جہاں روایات موجود ہوں صدر کو اپنی رائے جانچنے کے لیے اسمبلی کا اجلاس بلانا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بات پاکستان پر صادق نہ آتی تھی اور صدر سکندر مرزا نے یکے بعد دیگرے سات وزرائے اعظم کو برطرف کیا یا انہیں مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ حسین

شہید سہروردی کو ستمبر 1956ء میں وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ جب ان کے کچھ ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور اسمبلی میں ان کی پوزیشن کمزور ہوگئی تو انہوں نے سکندر مرزا کو اسمبلی کا اجلاس بلانے کی درخواست کی تا کہ یہ فیصلہ ہو سکے کہ وزیراعظم کو ابھی تک اسمبلی کی حمایت حاصل تھی کہ نہیں۔ یہ درخواست بالکل ٹھیک اور جائز تھی۔ لیکن اس درخواست کو مسترد کر دیا گیا اور سکندر مرزا نے سہروردی کو کہا کہ مستعفی ہو جاؤ ورنہ برطرف کر دیا جائے گا۔ وزیراعظم مستعفی ہو گئے۔

وزیراعظم کو مقرر کرنے اور برطرف کرنے کا اختیار صدر کے ہاتھوں میں مہلک ہتھیار کی شکل اختیار کر گیا۔ 58-1950ء کے دوران ملک میں سات وزیراعظم آئے جبکہ اس دوران بھارت میں صرف ایک وزیراعظم رہا۔ وزرائے اعظم عدم اعتماد کے ووٹ یا عام انتخابات جو کہ 1970ء تک نہ ہوئے میں رائے دہندگان کے ووٹ سے برطرف نہ کیے جاتے تھے بلکہ عجیب و غریب متلون مزاج صدارتی حکم کے تحت انہیں برطرف کیا جاتا تھا۔ پارلیمنٹ شطرنج کی بساط بن گئی جس پر صدر ایک گروہ کو دوسرے کے ساتھ لڑا کر اپنا سیاسی کھیل کھیلتا رہا۔ بہرحال صرف صدر کو ہی مورد الزام ٹھہرانا درست نہیں جبکہ سیاسی جماعتوں پر بھی کچھ الزام عائد ہوتا ہے۔ جمہوری نظام میں سیاسی جماعتیں سیاسی استحکام کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ ہمارے سامنے بھارت کی مثال موجود ہے جہاں کانگریس کی بدولت بے مثال سیاسی استحکام موجود ہے۔ پاکستان میں مضبوط سیاسی جماعتوں کی کمی تھی۔ مسلم لیگ اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ اپنی شکست کے ڈر سے مسلم لیگ نے عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جس کے نتیجہ میں 1954ء کے مشرقی پاکستان کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کو بری طرح شکست ہوئی۔ مغربی پاکستان میں بھی مسلم لیگ اپنی ساکھ برقرار نہ رکھ سکی۔ جماعت کے اندر ٹوٹنے کا عمل شروع ہوگیا جس نے ری پبلکن پارٹی جسے شاہی پارٹی کا نام دیا گیا کی تشکیل کا راستہ ہموار کیا۔

باوجود اس کے کہ سیاسی جماعتوں کے درمیان سخت چپقلش اور طاقت کے حصول کے لیے جنگ جاری تھی لیکن وہ سب اس بات پر متفق تھیں کہ صدر سکندر مرزا کو دوبارہ منتخب نہیں کیا جائے گا جو کچھ ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ جس طرح صدر سکندر مرزا کے پیش رو نے اپنے اختیارات کو کم کرنے کی کوشش کی وجہ سے آئین ساز اسمبلی توڑ دی تھی۔ بالکل اسی طرح سکندر مرزا کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ چونکہ ان کا دوبارہ منتخب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، انہوں نے اسمبلی کو توڑ دیا اور آئین کو منسوخ کر کے فوج کے سربراہ ایوب خان کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی۔ 7 اکتوبر 1958ء یعنی پہلے آئین کے ٹھیک ڈھائی سال بعد ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔

نئے حکمران ایوب خان کا یہ خیال تھا کہ پارلیمانی نظام ملک کے لیے موزوں نہیں۔ لہٰذا انہوں نے ایک ایسا نظام جاری کیا جو ان کو سب سے زیادہ طاقت ور اور اعلیٰ بنا دے۔ ان کے دیئے ہوئے 1962ء کے آئین نے ملک میں صدارتی نظام نافذ کیا۔ یہ نظام آئینی روایات اور اصولوں کی تضحیک تھا کیونکہ اس نے تمام اختیارات صدر کو تفویض کر دیے اور اسے کسی کے روبرو جواب دہ نہ بنایا۔ اس کے علاوہ یہ نظام صدارتی حکومت کے بنیادی اصول یعنی صدر کی سربراہی میں انتظامیہ اور قانون ساز اسمبلی کے درمیان علیحدگی اختیارات کی نفی کرتا تھا۔ 1962ء کا آئین صرف سات سال تک چلتا رہا اور اپنے خالق صدر ایوب خان کے ہاتھوں شدید عوامی دباؤ کے نتیجے میں مٹا دیا گیا جب انہوں نے اقتدار اگلے فوجی سربراہ جنرل یحییٰ خان کو سونپ دیا۔

موجودہ 1973ء کا آئین بھی پارلیمانی نظام تشکیل دیتا ہے۔ تمام انتظامی اختیارات وزیراعظم کی سربراہی میں کابینہ کو حاصل ہیں جو عوام کی منتخب کردہ پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہے۔ آئینی شقوں اور مضبوط حکمران جماعت پیپلز پارٹی نے وزیراعظم کی حیثیت کو مستحکم کیا اور صدر کو برائے نام سربراہ مملکت بنا دیا۔ عوام نے سمجھا کہ بالآخر پاکستان ایک مضبوط پارلیمانی جمہوریت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ملک کے دوسرے عام انتخابات 1977ء میں جن میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی نے تمام نشستیں جیت لیں۔ حزب اختلاف نے پیپلز پارٹی کی جیت کو انتخابات میں دھاندلی سے تعبیر کیا اور حکومت کے خلاف تحریک چلائی۔ حزب اختلاف نے وزیراعظم سے مستعفی ہونے اور نئے انتخابات کروانے کا مطالبہ کیا۔ حکمران جماعت

نے دھاندلی کے الزام کو مسترد کر دیا اور حزب اختلاف کو بات چیت کی دعوت دی۔ لیکن اس سے پہلے کہ بات چیت کا کوئی نتیجہ نکلتا اس وقت کے فوجی سربراہ جنرل ضیاء الحق نے مداخلت کرتے ہوئے ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔

نئے فوجی حکمران جنرل ضیاء نے 90 دنوں میں انتخابات کروانے اور اقتدار منتخب اسمبلی کو منتقل کرنے کا وعدہ کیا۔ جنرل ضیاء جمہوریت کے بارے میں کوئی زیادہ موافق نظریہ نہ رکھتے تھے اور بالخصوص پارلیمانی نظام کے حق میں نہ تھے۔ انہوں نے آئین میں متعدد ترامیم کیں جنہیں بعد میں پارلیمنٹ سے منظور کروالیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب 1985ء میں آئین بحال ہوا تو یہ بالکل مختلف آئین تھا۔

سب سے اہم آئینی ترمیم آٹھویں ترمیم تھی جس کے ذریعے شق (b)58-2 آئین میں شامل کی گئی۔ اس ترمیم نے صدر کو آئینی بحران کی صورت میں قومی اسمبلی کو توڑنے کا اختیار دیا۔ اس ترمیم نے ایک دفعہ پھر پارلیمنٹ کے اوپر صدر کی برتری کو قائم کر دیا اور وزیراعظم کو محض صدر کے مشیر کے طور پر مقرر کر دیا۔ شق نمبر (b)58-2 دراصل پارلیمنٹ کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار تھی جس نے ہر پارلیمنٹ اور وزیراعظم کو اپنا نشانہ بنایا۔ بالآخر نواز شریف کی حکومت نے اس شق کا 1997ء میں خاتمہ کر دیا۔ (b)58-2 کے ختم ہوجانے کے بعد وزیراعظم کی حیثیت ایک دفعہ پھر مستحکم ہوگئی جو فوج کے ذریعے ان کی برطرفی تک قائم رہی۔

جنرل مشرف نے آئین میں کئی ترامیم کی ہیں جس میں صدر کے اسمبلی کو توڑنے کے اختیارات کو بحال کر دیا گیا ہے اور ایک دفعہ پھر وزیراعظم اور پارلیمنٹ کو صدر کے ماتحت کر دیا ہے۔ اس اختیار کے استعمال کے خوف کی وجہ سے ہی وزیراعظم ظفر اللہ جمالی حکومت سے 2002-2004ء میں دستبردار ہوگئے۔

پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کی دو وجوہات ہیں۔ آئینی شقیں اور پارلیمانی روایات کی کمی۔ آئینی شقیں جنہوں نے صدر کو وزیراعظم اور اسمبلی کو برطرف کرنے کے اختیارات دیے ان کی وجہ سے پارلیمانی جمہوریت کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ بالکل مختلف ہوتی اگر (b)58-2 آئین کا حصہ نہ ہوتی یا صدر کو وزیراعظم کو برطرف کرنے کا اختیار نہ ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی کوئی پارلیمنٹ اپنی مقرر کردہ مدت پوری نہیں کرسکی جو انہیں آئینی شقوں کی وجہ سے ہے۔

بہرحال یہ کل حقائق نہیں ہیں۔ آئینی شقیں انتہائی ضروری ہیں لیکن یہ جمہوریت کی کامیابی کی ضمانت نہیں دیتیں۔ کاغذ پر لکھا ہوا آئین اور اصل آئین کیسے کام کرتا ہے ان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ آئینی شقوں کے پیچھے آئینی روایات ہوتی ہیں جو آخر میں یہ طے کرتی ہیں کہ اصل میں آئین کیسے کام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر بھارت اور برطانیہ میں سربراہ مملکت کو پارلیمنٹ کو برطرف کرنے کا صوابدیدی اختیار حاصل ہے۔ لیکن کیا واقعی سربراہ مملکت اپنی صوابدید میں اپنا یہ اختیار کبھی استعمال کرتے ہی نہیں کیونکہ صدارتی یا شاہی اختیار آئینی روایات کے ماتحت چلتے ہیں جو یہ بات یقینی بناتی ہیں کہ یہ اختیار مطلق العنان طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان میں مضبوط آئینی روایات کی کمی نے ہی جمہوریت کے فروغ میں رکاوٹ ڈالی ہے جو کہ جمہوریت کی ناکامی کی دوسری بڑی وجہ ہے۔ 1953ء میں وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی گورنر جنرل کے ہاتھوں برطرفی نے ان روایات کے فروغ میں رکاوٹ ڈالی جو حکومت کو بناسکتی ہیں اور توڑ بھی سکتی ہیں۔ 1954ء میں آئین ساز اسمبلی کے ٹوٹنے سے اس روایت کے فروغ میں رکاوٹ آگئی کہ اسمبلی یا تو عدم اعتماد کے ووٹ کے ذریعے ٹوٹ سکتی ہے یا پھر عام انتخابات میں رائے دہندگان کے منفی ووٹ سے وقت سے پہلے ختم ہوسکتی ہے۔ 1988ء اور 1996ء کے درمیان آٹھویں ترمیم کو منسوخ کرنے کے لیے حزب اختلاف کی طرف سے حکومت کی مدد کرنے سے انکار نے اس روایت کے فروغ کو روکا کہ دونوں اطراف سے سیاست دانوں کو پارلیمنٹ کی حاکمیت قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے۔ عدلیہ کے ساتھ نواز شریف حکومت کی رسہ کشی نے عدلیہ کی آزادی اور وقار کو ٹھیس پہنچائی اور جمہوری نظام کے عمل کے لیے ضروری قانون کی حاکمیت کے اصول کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ آئینی شقیں اور روایات مضبوط جمہوری نظام کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں۔

باب نمبر 20

پاکستان کا وفاقی نظام

Federalism in Pakistan

وفاقی ڈھانچہ اور صوبائی تنازعہ

Federal Structure and Provincial Controversy

ایک وفاقی ریاست خودمختار صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کو تقسیم کرتی ہے۔ ہر صوبہ بنیادی قانون (آئین) کے مطابق اپنے اپنے دائرہ کار میں حکومت کا کام چلاتا ہے۔ متحدہ ریاست ہائے امریکہ (USA) اور سوئٹزرلینڈ وفاقی نظام کی بہترین مثال ہیں جہاں پر نظامِ حکومت وفاقی اصولوں کے مطابق چلایا جا رہا ہے۔

وفاقی انتظام کے تحت وہ معاملات جو مجموعی طور پر بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں قومی حکومت کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ عام طور پر ان معاملات میں خارجہ تعلقات، دفاع، بیرونی تجارت اور مالی نظام شامل ہوتے ہیں۔ حکومت کے وہ کام جو بنیادی طور پر مقامی سطح کے ہوتے ہیں جیسا کہ مقامی تجارت، تعلیم، سڑکوں اور ہائی ویز کا انتظام یہ مقامی حکومتوں کے دائرہ کار میں شامل ہوتے ہیں۔ تمام وفاقی ریاستوں کے لیے دائمی طور پر مرکزی اور مقامی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے تقسیم اختیارات کا ڈھانچہ متروک ہو جاتا ہے جس سے اکثر اوقات اُن ممالک میں جہاں وفاقی نظام رائج ہو آئینی بحران پیدا ہو جاتا ہے جو مرکزی اور مقامی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا تنازعہ پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

اگر دنیا کے نقشے پر نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ تقریباً وہ تمام ملک جو وسیع علاقے پر محیط ہیں وفاقی نظام اپنائے ہوئے ہیں۔ دور دراز ممالک جو کسی نہ کسی شکل میں وفاقی نظام کے تحت چل رہے ہیں اُن میں امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، میکسیکو، ارجنٹائن، سابق سویت یونین، ہندوستان اور پاکستان شامل ہیں۔ دنیا کے جدید ممالک جہاں وفاقی نظام رائج ہے وہاں پر تاریخی و ثقافتی عوامل کی وجہ سے واحدانی نظام پر عمل درآمد تقریباً ناممکن ہے۔ اگر وفاقی اصولوں کے ساتھ مضبوط وابستگی مفقود ہو یا وفاقی نظام کو چلانے کے لیے فعال اداروں کا ڈھانچہ موجود نہ ہو تو کوئی بھی ملک قابل عمل وفاقی نظام پر عمل پیرا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

برطانوی نوآبادیاتی حکمرانوں نے ہندوستان میں وفاقی نظام کو رائج کیا۔ برطانوی حکومت جو بذاتِ خود واحدانی نظام کی پیداوار تھی ہندوستانی معاشرہ کے متنوع ثقافتی، لسانی اور جغرافیائی ڈھانچے کی وجہ سے فوری طور پر یہ سمجھ گئی کہ ہندوستان پر حکمرانی کرنے کیلئے وفاقی نظام موزوں طریقہ کار تھا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد کی آئینی اصلاحات نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ نتیجتاً برصغیر میں مقامی حکومت کا نظام متعارف کروایا گیا۔ اس کے بعد 1919ء اور 1935ء کے قوانین نے صوبوں کو خودمختاری اور بلند مقام دیا۔ ان آئینی اصلاحات کے اجرا کے بعد صوبوں کو مکمل خودمختاری اور حکمرانی کے لیے منفرد حیثیت حاصل ہوگئی۔ چونکہ 1935ء کے تحت دی گئی صوبائی خودمختاری محدود تھی اس لیے ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں یعنی مسلم لیگ اور کانگریس اور دوسرے مقامی سیاسی گروہوں نے مزید خودمختاری کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ مسلم لیگ نے زیادہ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرنے میں کانگریس سے پہل

کی۔ یہ مطالبہ تجاویز دہلی کے موقف پر کیا گیا۔ قائداعظم کے چودہ نکات میں بھی اس پر زور دیا گیا۔ گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کے دوران صوبائی خودمختاری کا مطالبہ با آواز بلند کیا گیا۔ 1940ء کی قرارداد لاہور میں یہ مرکزی مطالبہ تھا جسے 1947ء میں دہرایا گیا۔

معاشرتی نقطہ نظر سے پاکستان کے حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ اسے ایک وفاقی ریاست ہونا چاہیے۔ وسیع ثقافتی و لسانی تضادات اور اس کی وفاقی اکائیوں کے مختلف ورثہ جات کی روشنی میں پاکستان اُسی دن سے ایک وفاقی ریاست تھا جس دن یہ بحیثیت ایک آزاد اور خودمختار ملک کے معرض وجود میں آیا۔

ایک وفاق میں شامل وفاقی اکائیاں آپس میں چند مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے وفاقی مرکزی حکومت بنانے پر متفق ہوتی ہیں۔ باقی معاملات میں وہ اپنی علیحدہ حیثیت کو برقرار رکھتی ہیں۔ اکائیوں کو مرکزی حکومت قائم کرنے پر قائل کرنے کے تقریباً چھ عوامل ہوتے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

1- کسی ممکنہ بیرونی فوجی جارحیت کے خلاف مشترکہ دفاع۔
2- بیرونی دباؤ یا خطرے سے محفوظ رہنا۔
3- معاشی ترقی کی خواہش۔
4- اکائیوں میں سیاسی ہم خیالی۔
5- جغرافیائی اتحاد میں شمولیت۔
6- ایک دوسرے سے مماثل سیاسی ادارے۔

بہرحال صرف ان عوامل کی موجودگی وفاق کی راہ ہموار کرنے کی ضمانت نہیں دیتی بلکہ وفاق کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر سیاسی قائدین کی مناسب مواقع پر صحیح قیادت اور بیانات پر ہوتا ہے۔ اسی طرح عام طور پر پانچ عوامل اور ہیں جو وفاقی اکائیوں کی اپنے علیحدہ اور منفرد مقام کو برقرار رکھنے کی خواہش کے پیچھے متحرک ہوتے ہیں:

1- کسی بھی اکائی کا پہلے والا سیاسی نظام۔
2- اکائیوں کے معاشی مفادات۔
3- اکائیوں کے علیحدہ علیحدہ جغرافیائی محل وقوع۔
4- ان کے مختلف معاشرتی ادارے۔
5- منفرد قومی شناخت۔

یہ تمام گیارہ عوامل پاکستان کے معاملے میں بدرجہ اہم موجود تھے اور آگے بڑھنے کی خواہش کے پیچھے کارفرما تھے۔ صوبائی خودمختاری اور وفاقی اتحاد کی یہ خواہش پہلے سے موجود تھی جسے فعال اداروں کی شکل میں تبدیل کیا جانا تھا۔

صوبائی / علاقائی تنازعہ

Provincial / Regional Controversy

آزادی کے فوری بعد پاکستان شدید آئینی تعطل کا شکار ہوگیا۔ جس کی وجہ سے آئین سازی کا کام نو سال تک مؤخر رہا۔ بالآخر 1956ء میں مسلسل جدوجہد کے بعد پاکستان اپنا پہلا آئین بنانے میں کامیاب ہوا۔

نو سال کا عرصہ دو صوبوں یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نمائندگی کا مناسب حصہ طے کرنے پر ضائع ہوا۔ شروع ہی میں مشرقی و مغربی پاکستان وفاقی ڈھانچے میں نمائندگی اور اختیارات کی تقسیم کی فضول بحث میں الجھ گئے۔ تقسیم کے وقت پاکستان ایک منفرد جغرافیائی حیثیت کا ملک تھا جس کے دو حصے تھے جو 1000 میل بھارتی علاقے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جغرافیائی طور پر علیحدہ تھے۔ مشرقی پاکستان مجموعی علاقے کے 1/7 حصے پر مشتمل تھا جبکہ اس کی آبادی پاکستان کے دوسرے صوبوں اور شاہی ریاستوں کی مجموعی آبادی سے زیادہ تھی۔ مشرقی پاکستان مکمل طور پر ایک صوبے یعنی مشرقی بنگال پر مشتمل تھا جبکہ مغربی پاکستان کا علاقہ کئی مزید صوبوں اور ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ معاشی نقطۂ نظر سے اگرچہ مشرقی حصہ مکمل طور پر آپس میں جڑا ہوا تھا لیکن اس کی معیشت مغربی حصے کی مضبوط و مربوط معاشی ترقی کا حصہ نہ بن سکی تھی۔

صنعتی لحاظ سے مغربی حصہ زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ مشرقی پاکستان تقریباً مکمل طور پر زراعتی حصہ تھا جبکہ مغربی پاکستان بھی بڑی حد تک زراعتی علاقہ تھا۔ مشرقی پاکستان کے لیے صوبائی خودمختاری کا واویلا مچانے والوں کا یہ کہنا تھا کہ مشرقی پاکستان کے معاشی مسائل مغربی پاکستان سے مختلف تھے لیکن یہ مکمل حقیقت نہ تھی۔ ملک کے دونوں حصے پسماندہ تھے اور اُن کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی اور وسائل کی اشد ضرورت تھی۔

ثقافتی اور لسانی تضادات نے بھی دونوں حصوں کے عوام میں غلط فہمی پیدا کرنے میں کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ جغرافیائی علیحدگی نے بھی غلط فہمی کو مزید گہرا کیا اور دونوں حصوں کے درمیان فاصلوں کو وسیع کیا۔ مغربی پاکستان کے لوگ مختلف زبانیں بولتے تھے جبکہ بنگالیوں کی صرف ایک زبان بنگالی تھی۔

ان مشکلات و اختلاف کو مشرقی اور مغربی پاکستان کے چند غیر مطمئن و شرارتی سیاست دانوں نے اپنے خفیہ مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے صوبہ پرستی کے جذبات کو ہوا دی اور قومی اتحاد کو کافی نقصان پہنچایا۔ آئین سازی میں تاخیر نے ان ملک دشمن عناصر کو ملک کو متزلزل کرنے کے لیے سنہری موقعہ فراہم کیا۔

پاکستان کی مشکلات سے قطع نظر عام طور پر وفاقی ریاست کا انتظام چلانا بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ چونکہ وفاق اختلافات کو ختم کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے اس لیے اسے اتحاد کی خواہش و مفادات کے تحفظ کے درمیان سمجھوتہ حاصل کرنے کے لیے کام کرنا ہوتا ہے۔ پاکستان کے معاملے میں صوبوں کے درمیان نہ صرف یک جہتی کی کمی تھی بلکہ موجودہ پاکستان کی آبادی کے مختلف طبقوں کے درمیان اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا وفاقی انتظام و انصرام کا مسئلہ پاکستان میں شدید پیچیدہ ہوگیا ہے۔ وفاق بنانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چونکہ کچھ حکومتی معاملات انفرادی طور پر وفاقی اکائیوں کے ذریعے نہیں چلائے جا سکتے بلکہ انہیں کنٹرول کرنے کے لیے وسیع بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ حدود کے اندر رہتے ہوئے وفاق کی ضروریات و مفادات کو صوبوں اور ریاستوں کے مفادات پر ترجیح ہوتی ہے۔

فیڈرل وصوبائی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم وفاقی نظام کی نمایاں خصوصیت ہوتی ہے۔ یہ صرف پاکستان کے معاملے میں ہی نہیں بلکہ وفاقی آئین تشکیل دیتے وقت اختیارات کی تقسیم کے مسئلے سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ وفاقی اکائیوں اور وفاقی حکومت کے درمیان اختیارات کی منصفانہ تقسیم کسی بھی وفاقی ریاست کا لازمی جزو ہوتا ہے۔

جغرافیائی و تاریخی حقائق کا یہ تقاضا تھا کہ پاکستان ایک وفاقی ریاست ہو۔ ایک طرف تو یہ بات طے تھی کہ پاکستان میں وفاقی حکومت قائم ہوگی لیکن اس کے ساتھ ہی صوبائی خودمختاری کے حامیوں اور مضبوط مرکز چاہنے والوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوگئے۔ صوبائی خودمختاری کے حامی چاہتے تھے کہ مرکزی حکومت زیادہ طاقت ور نہ ہو اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات ملنے چاہئیں جبکہ دوسری طرف مضبوط مرکز کے حامی یہ چاہتے تھے کہ فیڈرل حکومت کے پاس زیادہ سے زیادہ اختیارات ہوں اور صوبوں کو محدود خودمختاری دی جائے۔ آئین بنانے والے اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے اور ان دو مختلف سمتوں میں جاتے ہوئے نظریات کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے میں بے بس نظر آتے تھے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کے درمیان باہمی اعتماد اور رواداری کی کمی نے اس صورت حال کو مزید گھمبیر بنا دیا تھا۔ نامطمئن سیاست دان صرف صوبائی خودمختاری پر اکتفا کرنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ وہ کمزور مرکز بھی چاہتے تھے۔

یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ سب سے پہلے ملک کے سب سے بڑے صوبے مشرقی پاکستان کی طرف کیا گیا جسے بظاہر مغلوب ہو جانے کا کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ یہ ڈر پہلے سے ہی مشرقی پاکستان میں جڑ پکڑ چکا تھا۔

پاکستان کی ساٹھ سالہ تاریخ میں سول وملٹری نوکر شاہی کا مستقل تسلط ایک حقیقت ہے۔ اس تسلط کی وجہ سے ملک کا سیاسی عمل رک گیا جسے نوکرشاہی نے اپنا مطیع و تابع فرمان بنا لیا تھا۔ اس صورتِ حال نے وفاقی معاشرے پر دور رس اثرات مرتب کئے جس کی وجہ سے نہ صرف معاشرے کی خودمختاری پر کاری ضرب لگی بلکہ عوامی حقوق بھی غصب کر لئے گئے۔ عوام کے اندر مرکزی حکومت کے ہاتھوں غفلت اور بے توجہی کی وجہ سے مایوسی و یاسیت پھیلتی گئی جس نے قومی یک جہتی کو نقصان پہنچایا۔ عوام انتظامیہ میں معقول، حسب ضرورت و منصفانہ حصے سے محروم تھے۔ یہ سول، ملٹری بیوروکریسی کا مربوط گروہ تھا جو پنجابی، بنگالی جھگڑے کا باعث بنا جو ابھی تک خوش اسلوبی سے حل نہیں ہو سکا۔ عوام اور بالخصوص بنگالیوں کے دل میں مرکزی حکومت کے اختیارات کے فروغ سے سخت خوف پیدا ہوا کیونکہ وہ بالکل صحیح طور پر یہ سمجھتے تھے کہ مرکزی حکومت کے اختیارات کا فروغ اُنہیں ان کی جائز آزادی وحقوق سے محروم کردے گا۔

ایک فعال سیاسی نظام بنانے کے لیے پاکستان کی تمام کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ یہ ایک قابل عمل آئین بنانے کیلئے ایک طویل اور دشوار راستہ تھا۔ قابلِ عمل آئین بنانے کی تلاش بنیادی اصولوں کی کمیٹی سے شروع ہوئی اور 1973ء تک جاری رہی۔ 1954ء میں کسی نہ کسی طرح محمد علی بوگرہ جھگڑالو گروہوں کے درمیان اتفاق رائے پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن بدقسمتی سے گورنر جنرل نے اسمبلی توڑ دی اور اس طرح حاصل کردہ اتفاق رائے آئین کو جنم نہ دے سکا۔

گورنر جنرل کے ظالمانہ اقدام نے ملک کے سیاسی نظام کو روند کے رکھ دیا اور سول ملٹری بیوروکریسی کے مجرمانہ اتحاد کی راہ ہموار کی جس نے ملک کی سیاسی فضا کو مزید پراگندہ کر دیا۔ اس کے بعد آنے والی پہلی کابینہ جس میں کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان بھی شامل تھے نے مغربی پاکستان میں ون یونٹ سکیم کا اجراء کیا۔ اس شیطانی منصوبے کے پیچھے بنگالیوں کی عددی برتری کا اثر ختم کرنا تھا تا کہ مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کے برابر لایا جا سکے۔

ون یونٹ سکیم 1956ء کے آئین کی روح رواں تھی۔ یہ 1962ء کے آئین تک زیر عمل رہی۔ باوجودیکہ مشرقی پاکستان کے چند سرکردہ راہنماؤں جس میں سہروردی اور مولوی فضل الحق شامل تھے جنہوں نے ون یونٹ سکیم کے برابری کے اصول کو سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ بنگالیوں اور مغربی پاکستان کے چند صوبوں نے بالآخر اس سکیم کو رد کر دیا۔ بدنام زمانہ ون یونٹ کو 1971ء میں جنرل یحیٰی خان کے لیگل فریم ورک آرڈر کے ذریعے ختم کر دیا گیا اور ''ایک آدمی ایک ووٹ'' کے اصول کو جاری کیا 1947ء سے 1971ء تک مرکزیت کی وجہ سے صوبوں اور مرکز کے تعلقات سخت دباؤ میں رہے۔ کچھ معاملات میں 1956, 1962ء اور 1973ء کے آئین 1935ء کے قانون کی روح کے حامل رہے۔ لیکن چند معاملات میں مرکزی اختیارات کو بڑھا دیا گیا حتیٰ کہ 1973 کا آئین 1935ء کے قانون کے تحت دی گئی خودمختاری سے بھی منحرف ہوگیا۔

وفاقی اصولوں کے مطابق پاکستان کے تینوں آئینوں میں قانون سازی کے لیے مرکزی وصوبائی فہرستیں شامل تھیں جن میں مرکزی وصوبائی حکومتوں سے متعلق تمام موضوعات شامل تھے۔ 1956ء کے آئین میں تین فہرستیں شامل تھیں جن میں مرکزی، صوبائی اور متفقہ فہرستیں شامل تھیں۔ 1962ء کے آئین میں صرف مرکزی فہرست شامل تھی جبکہ باقی ماندہ موضوعات صوبوں کی صوابدید پر چھوڑ دیئے گئے تھے۔ 1973ء کے آئین میں صرف مرکزی وصوبائی فہرستیں شامل تھیں جبکہ بقیہ معاملات صوبوں کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ ان تمام آئینوں میں تمام اہم موضوعات مرکز کے حوالے کر دیئے گئے جس کی وجہ سے صوبے لاوجود ہو کر رہ گئے تھے۔

پہلے دو آئین یعنی 1956ء اور 1962ء ناکام ہوگئے اور انہیں منسوخ کر دیا گیا۔ 1971ء میں ملک ٹوٹنے کے بعد 1973ء کا آئین بنایا گیا۔ یہ آئین تمام سیاسی جماعتوں کی مشترکہ مرضی اور رضامندی کی بنیاد پر بنایا گیا۔ 1973ء کا آئین معقول صوبائی خودمختاری کی ضمانت نہیں دیتا لیکن اس میں صوبائی خودمختاری کے حصول اور فروغ کے لے ڈھانچہ مہیا کر دیا گیا ہے جس کے ذریعے بعد میں صوبائی خودمختاری کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ پاکستان کا کوئی بھی آئین صوبائی خودمختاری کی حمایت نہیں کرتا۔ 1973ء کا آئین بھی صوبائی خودمختاری کی ضمانت نہ دے سکا اور آخرکار 1977ء میں فوجی کمانڈروں نے عارضی طور پر معطل کر دیا۔ دونوں مواقع پر آئینی حکم نامے جاری کئے گئے جس کا مقصد یہ بتانا تھا کہ آئینی ڈھانچہ محفوظ ہے لیکن حقیقت میں دونوں دفعہ فوجی کمانڈروں نے صوبائی خودمختاری کو روند ڈالا۔ دونوں دفعہ فوجی قبضے کی وجہ سے ملک میں سخت بے چینی پھیلی۔ سندھ میں ضیاء کی حکومت کے خلاف طوفان برپا ہوا جبکہ بلوچستان جنرل مشرف کی حکومت کے خلاف باغیانہ محاذ آرائی کا مرکز بنا۔ پچھلی تین دہائیوں کے دوران آئین کے بنائے ہوئے ادارے سکون سے کام نہ کر سکے۔ نیشنل فنانس کمشن تعطل کا شکار رہا اور اس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ شاید ہی کبھی یہ وسائل کی تقسیم کے لیے کوئی قابل عمل مفاہمتی فارمولا تشکیل دے سکا ہو۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مرکزی عہدے دار چاہے وہ سویلین بیوروکریٹس ہوں یا فوجی حکمران اور اُن کے ساتھی خودمختاری کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف جابرانہ اقدامات کرتے ہیں۔ قومی سلامتی کے جھوٹے اور بے معنی نعروں کے ساتھ صوبائی حقوق و شناخت دبا دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ مشرقی پاکستان اور دوسرے صوبوں کے ساتھ کیا گیا۔

صوبائی خودمختاری کو دبانے اور دھمکانے کے لیے غیر جمہوری اور جابرانہ ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے جاری نظام سے لوگوں کو ساتھ ملا لیا جاتا ہے۔ ان اقدامات سے بے چینی اور مایوسی پھیلتی ہے جو آخرکار مقامی لوگوں میں نفرت کو جنم دیتی ہے۔ اگر مقامی بے چینی سیاسی قابو سے باہر ہو جائے تو پھر جابرانہ ہتھکنڈوں کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر صوبہ فوجی کارروائی کا شکار ہو چکا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہونے کے باوجود مشرقی پاکستان اسی فوجی عمل کی وجہ سے علیحدہ ہوگیا۔ 1950, 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں بلوچستان اس کا شکار ہوا اور اب ایک دفعہ پھر فوجی کارروائی سہہ رہا ہے۔ سندھ 1960ء اور 1980ء کی دہائی میں اس کا شکار ہوا اور صوبہ سرحد کو 1970ء کی دہائی میں فوجی ایکشن برداشت کرنا پڑا۔

جابرانہ ہتھکنڈوں کے استعمال نے صوبوں اور مرکز کے درمیان مضبوط بنیادوں پر تعلقات استوار نہیں ہونے دیئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ صورتِ حال زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی۔ اب صوبے اپنے حقوق کے حصول کے لیئے واویلا مچا رہے ہیں اور وسائل میں زیادہ حصے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ملک میں معاشی ترقی کی وجہ سے بین الصوبائی معاشی رابطوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ تمام صوبے یہ چاہیں گے کہ وہ اس صورتِ حال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کریں۔ یہ اسی صورت ممکن ہے جبکہ باہمی رضامندی کے ساتھ اصولوں پر عمل درآمد کیا جائے۔ مرکز کی آمرانہ سوچ صوبوں کو پہنچنے والے فوائد کو کم کر دے گی۔

پاکستان میں وفاقی نظام اور قومی یک جہتی

یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ آزادی کے ساٹھ سال بعد ابھی تک پاکستان وفاقی نظام کے مسائل پر قابو نہیں پا سکا جس کی وجہ سے حکمرانی کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے اور سیاسی نظام پر دباؤ بڑھ گیا ہے۔

وفاقی نظام ایک ایسے سیاسی اتحاد کو جنم دیتا ہے جس میں مختلف علاقہ جات اور عوام باہمی متفقہ آئینی اور قانونی ڈھانچے کی بنیاد پر وفاقی حکام اور مقامی اکائیوں کے درمیان تعلق و رابطے کا تعین کرتے ہیں۔ یہ مختلف لسانی و ثقافتی گروہوں کے مفادات اور شناخت کو سیاسی اتحاد کے ذریعے ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرح مختلف لسانی و ثقافتی طبقے ایک بڑی اور وفاقی ریاست کے رکن بن کر فوائد سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

وفاقی نظام کثیر السطح سیاسی و انتظامی ڈھانچہ ہے جو وفاقی، صوبائی و قومی ریاستی سطح پر شرکت کار کے مواقع مہیا کرتا ہے۔ اس طرح کے مختلف و کثیر مواقع اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کو وسیع سیاسی پس منظر کے حوالے سے شراکت داری کا ماحول پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں جو پسماندہ طبقوں کی ترقی کا باعث بنتا ہے۔ یہ ایک باعمل اور فعال نظام ہے جو آئین کے ذریعے سیاسی اقتدار و اختیار کو تقسیم کر کے ایک متحد و منظم معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ وفاقی نظام کے تحت منظم معاشرے کے خدوخال کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں:

1- وفاقی اکائیوں میں باہمی اتحاد کا احساس
2- آئینی ضمانت کے ذریعے اختیارات کی تقسیم
3- آبادی اور وسائل میں تناسب
4- وسیع پیمانے پر اختیارات کی تقسیم
5- جمہوری طریقہ، حکومت اور
6- معاشی وسائل کی مساوی تقسیم

بہرحال وفاقی نظام کی ضرورت پر عمومی اتفاق رائے کے باوجود پاکستان کو ایک فعال وفاقی نظام جو ملک کے مختلف سیاسی دھڑوں میں باہمی اتحاد اور ہم آہنگی کو فروغ دے سکتا قائم کرنے میں مشکلات کا سامنا رہا ہے۔

جوں ہی خوشی کی وہ لہر جو تحریکِ آزادی کے آخری دور میں پیدا ہوئی معدوم ہوگئی تو اس کے ساتھ ہی مقامی و نسلی گروہوں نے سیاسی طور پر چپ سادھ لی۔ اب بنگالی، پنجابی، پختون اور سندھی ثقافت پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ مرکزی حکومت نے مقامی اور تنگ نظری پر مبنی جذبات کا توڑ کرنے کے لیے اسلام سے مدد مانگی اور اتحاد قائم کرنے کے لیے اسلامی اصولوں پر زور دیا۔ اس کے باوجود کامیابی حاصل نہ ہوئی اور صوبائی مفادات کے تحفظ کے لیے شراکت داری کا سیاسی نظام پنپ نہ سکا۔

پاکستان کے تینوں آئین (1973, 1962, 1956) مضبوط مرکز کے حامی تھے جس کی وجہ سے آزادی سے پہلے کے برطانوی دور کے سیاسی رجحانات کو تقویت ملی۔ مرکزی حکومت اکثر صوبوں کے عوام کے سیاسی جذبات کو نظرانداز کر دیتی اور صوبائی حکومت کو ہٹانے یا اس کی جگہ اپنی مرضی کی نئی حکومت قائم کرنے کے لیے اپنے آئینی اختیارات کو استعمال کرتی۔ اسی طرح مرکزی حکومت اپنی ہم خیال صوبائی حکومت کو کسی بھی سیاسی بحران سے بچانے کے لیے اپنے اختیارات استعمال کرتی اور عوامی ردعمل کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اس کی وجہ سے صوبائی خودمختاری پر زد پڑی اور صوبوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ مرکزی حکومت اختلاف رائے کو پسند نہیں کرتی اور صوبوں پر سختی سے حکومت کرنا چاہتی ہے۔ مرکزی حکومت نے کمزور سیاسی قوتوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔ اسے ان عوامی قائدین پر دباؤ ڈالنے کے لیے جو اس کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کرتے مقامی قائدین کو اپنے ساتھ ملانے میں کبھی مشکل پیش نہ آئی۔

مرکزیت کی بنیاد غیر شراکتی حکمرانی اور سیاسی انتظام پر رکھی گئی تھی۔ نہ تو آزادانہ انتخابات تسلسل سے کروائے گئے اور نہ کبھی مرکزی حکومت نے جمہوری اصولوں کی پاسداری کی۔ اس طرح کی غیر جمہوری اور آمرانہ حکمرانی نے صوبوں میں بے چینی پیدا کی جو انتظامی، سیاسی اور معاشی خودمختاری چاہتے تھے۔ بعض نے یہ شکایت بھی کی کہ اُنہیں وہ خودمختاری بھی نہیں دی گئی جو آئین انہیں دیتا ہے۔

درحقیقت آمرانہ اور جابرانہ سیاسی نظام وفاق کی روح کی نفی کرتا ہے اور باہمی خوف اور بدگمانی کو فروغ دیتا ہے۔ پہلے دو دساتیر نے اسی قسم کے رجحان کو پروان چڑھایا جس کی وجہ سے 1960ء کے اواخر میں مشرقی پاکستان میں سخت بددلی اور بے چینی پیدا ہوئی۔ چھوٹے صوبوں یعنی سندھ اور NWFP کے متعدد سیاسی قائدین مرکز کے تحکمانہ رویے کے سخت خلاف تھے۔

بار بار کی فوجی مداخلت اور آئینی تعطل نے پاکستان میں صوبوں کے کردار ور جمہوریت کے فروغ کو نقصان پہنچایا۔ 1973ء کے آئین نے صوبائی خودمختاری کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی اور دوسرے دساتیر کے مقابلے میں صوبوں کو زیادہ اختیارات دیئے۔ پھر بھی غیر فوجی حکومتوں نے (دسمبر 1971ء - جولائی 1977ء) اکثر اوقات صوبائی خودمختاری اور آئین میں دیئے گئے حقوق کی خلاف ورزی کی۔

جولائی 1977ء کے مارشل لاء اور آئینی تعطل کی وجہ سے تمام اختیارات چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو منتقل ہوگئے۔ 1985ء میں سیاسی و آئینی حکومت کی بحالی کے بعد بھی مضبوط مرکز کی روایت قائم رہی۔ ایک دفعہ پھر 2000-1999ء میں پاکستان میں فوجی حکومت قائم ہوئی جو بعد میں آئینی حکمرانی میں تبدیل ہوئی۔ فوجی حکومت کے ساتھ مضبوط مرکزی حکومت معاشی ترقی کا ذریعہ رہی جو کہ ریاست کی تعمیر اور فروغ کیلئے ایک ضروری عنصر ہے۔ جب معاشی ترقی کے نتائج تمام علاقوں میں مساوی طور پر تقسیم ہوتے ہیں تو یہ قومی اتحاد کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

پاکستان میں فوجی حکومت کے تحت نجی سرمایہ کاری اور ریاستی اداروں کو نجی ملکیت میں لینے کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہوگئی ہے۔ پچھلے چھ سالوں میں معاشی غیر ہمواری کی وجہ سے چھوٹے صوبوں اور غریب آدمی کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ غیر ہمواری مرکز کے خلاف صوبوں کی شکایت اور ناراضگی کا باعث بنی ہے۔ یہ بات باعثِ حیرت نہیں کہ مرکزی حکومت پچھلے تین سال سے صوبوں کے درمیان نیشنل فنانس کمیشن ایوارڈ پر اتفاق رائے پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔

معاشی مشکلات کی وجہ سے ہر صوبہ اب وفاقی فنڈز کی تقسیم کے لیے کسی فارمولے کا مطالبہ کر رہا ہے تاکہ وہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ پھر اس بات پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ قومی وسائل کو آبادی کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا ممکن ہے کہ NFC

متفق نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ دو اور معاملات توجہ چاہتے ہیں۔ صوبہ سرحد کی حکومت بجلی کے منافع میں اپنے حصے کا تقاضا کر رہی ہے اور بلوچستان گیس کی رائلٹی میں اضافہ چاہتا ہے۔ ایوارڈ کے لیے کوئی کثیر العوامل فارمولہ طے پا جائے لیکن صوبائی و مرکزی حکومت اس پر

بین الصوبائی ہم آہنگی اور جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے ایک ادارہ کونسل آف کامن انٹریسٹ (Council of Common Interests) پچھلے کئی سال سے کام نہیں کر رہا ہے۔ مالی معاملات میں بلاوجہ تاخیر سے صوبوں اور وفاقی حکومت کے درمیان غلط فہمی اور بے چینی بڑھتی ہے۔ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کی مخالفت اور دوسرے ترقیاتی منصوبوں میں رکاوٹ جن میں گوادر بندرگاہ اور دریاؤں کے پانی کی تقسیم پر جھگڑا شامل ہے دراصل صوبوں اور وفاقی حکومت کے درمیان ہم آہنگی اور بھروسہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ کالاباغ ڈیم کا مسئلہ جو کہ وفاقی حکومت کی اتفاقِ رائے حاصل کرنے کی کوشش سے اجاگر ہوا دراصل سیاسی ذرائع اور بات چیت سے حل ہوگا تا کہ کسی صوبے کو یہ احساس نہ ہو کہ اس کے حقوق غصب کئے جا رہے ہیں۔ اس معاملے میں آئین سے ہٹ کر مسئلے کو سلجھانے کی کوشش وفاق کیلئے مزید مسائل پیدا کرے گی۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ وعلاقائی اور نسلی تنوع کی روشنی میں مکمل صوبائی خودمختاری پر مبنی وفاقی نظام ہی قابل عمل راستہ ہے۔ جمہوریت کو تقویت دینے کیلئے شفاف انتخابات کروانا، تقسیم اختیارات اور صوبائی خودمختاری پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔

باب 21

عورتوں کی بحالی

Women Empowerment

عورتوں کی حالتِ زار (The Plight of Women)

عورتیں جو دنیا کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ ہیں دنیا کے کچھ حصوں میں مردوں، حکومت اور مذہبی تنظیموں کے ہاتھوں ناقابلِ برداشت، ذلت آمیز اور وحشیانہ سلوک کا شکار ہیں۔ کچھ ممالک میں تو عورت کی زندگی کا مقصد صرف بچے پیدا کرنا، اُن کی دیکھ بھال کرنا اور گھریلو محنت مشقت کی بیگار میں مصروف رہنا ہے۔ دنیا کے کچھ پسماندہ علاقوں میں عورت کو بھیڑ بکری کی طرح خریدا اور فروخت کیا جاتا ہے۔ اُنہیں عمر رسیدہ مردوں کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے اور جسم فروشی کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت کے دوران عورتوں کے لیے خرید و فروخت کیلئے بازار میں جانے کی ممانعت تھی اور نہ ہی وہ سینما، ہوٹل اور تفریح والی جگہوں پر جا سکتی تھیں۔ عورتوں کو کھیلوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں اور دفاتر میں ملازمت کے تمام دروازے عورتوں کے لیے بند تھے۔ عورتیں سیاست میں حصہ لینے، ووٹ ڈالنے اور حکومت کے کسی عہدے پر فائز ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

ترقی پذیر ممالک میں عورتوں کی حالت

بالخصوص ترقی پذیر ممالک میں عورتوں کی حالت بدترین تھی۔ افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش، مالی اور شمالی یمن کا شمار اُن بدترین ممالک میں ہوتا ہے جہاں عورت پیدا ہو، اُس کی پرورش کی جائے یا اُس کی شادی ہو۔ چند مغربی ممالک میں عورتوں کے زندہ رہنے کی اوسط 81 سال تک ہے۔ یہاں عورتیں مردوں کی نسبت سات سال زیادہ زندہ رہتی ہیں جبکہ ترقی پذیر ممالک میں زندہ رہنے کی اوسط عمر 48 سال ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں پانچ میں سے ایک لڑکی پانچ سال کی عمر تک فوت ہو جاتی ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ تعداد 100 میں سے ایک ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں سکول جانے کی عمر تک تمام بچیاں سکول میں داخل ہو جاتی ہیں جبکہ متعدد ترقی پذیر ممالک میں تین میں سے صرف ایک لڑکی پڑھنے کی عمر تک سکول میں داخل ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں پانچ میں سے دو عورتیں پیشہ ور ہوتی ہیں جبکہ ترقی پذیر ممالک میں ایک ہزار میں سے صرف تین عورتیں کام پر جاتی ہیں۔ سویڈن کی پارلیمنٹ میں عورتوں کی نشستوں کی تعداد 1/3 ہے جبکہ پسماندہ ممالک میں تین سو میں سے صرف چار نشستیں عورتوں کیلئے مختص ہوتی ہیں۔

بہت سارے ممالک میں ثقافتی اور روایتی اندازِ زندگی قائم رہتا ہے جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی شعبوں میں عورتوں کی محکومانہ اور کم تر حیثیت کو قائم رکھتا اور تقویت دیتا ہے۔ عام طور پر معاشرہ مرد کی برتری پر قائم ہے جہاں تمام فیصلے باپ، خاوند یا بڑا بیٹا کرتے ہیں۔ مرد کو قانونی وارث و نمائندہ اور تمام اختیارات کا منبع سمجھا جاتا ہے جبکہ عورت کو بچوں اور خاوند کی نگہداشت اور گھریلو ذمہ داریوں کے لیے رکھا جاتا ہے۔ عورت کیلئے فاضل آمدنی پیدا کرنا اور گھریلو ضروریات کے لیے اشیاء مہیا کرنا بھی اس کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ غیر ذمہ دار باپ کی موجودگی میں بچوں کی مکمل پرورش کی ذمہ داری بھی عورت پر آتی ہے۔

عورت کو اپنی پسند و مرضی کی شادی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں عورت بے تحاشا ظلم و ستم برداشت کرتی ہے جس میں عزت کے نام پر قتل، بوڑھے آدمی سے شادی اور کاروکاری جیسے بہیمانہ قتل شامل ہیں۔ عورتیں خاوند، بڑے بھائی اور باپ کے ہاتھوں وحشیانہ تشدد کا شکار ہوتی ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔

عورتیں مردوں کی نسبت کم تعلیم یافتہ اور باشعور ہوتی ہیں۔ جنوبی ایشیا میں عورتوں کی خواندگی مردوں کی نسبت صرف 50% ہے۔ دنیا میں پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد صرف 2/3 ہے۔ حتیٰ کہ صنعتی ممالک میں بھی سائنسی و ٹیکنالوجی شعبوں میں عورتوں کی نمائندگی انتہائی کم ہوتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں ملازمت میں مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد 50% ہے۔ صنعتی ممالک میں بھی مزدوری کی اجرت میں مردوں اور عورتوں کے درمیان واضح امتیاز پایا جاتا ہے۔ عورتوں کو ان کے کام کی اجرت کم دی جاتی ہے۔ جاپان میں عورتیں مردوں کی نسبت 51% اجرت اصول کرتی ہیں۔

سیاسی اداروں میں کم نمائندگی اور عملی سیاست سے دوری بھی فیصلہ سازی کے عمل میں عورتوں کے استیصال کو فروغ دیتی ہے۔ 1980ء تک دنیا کے قانون ساز اداروں میں عورتوں کی نمائندگی صرف 10% تھی اور کابینہ میں صرف 4% نشستیں عورتوں کے پاس تھیں۔ 1993ء میں صرف چھ ممالک میں عورتیں ملکی سربراہ تھیں۔ 1992ء تک دنیا کے قانون ساز اداروں میں عورتوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

فن لینڈ 39%، ناروے 38%، کیوبا 23%، چین 21%، تنزانیہ 11%، امریکہ 10%، برطانیہ 9%، روس 9%، ہندوستان 7%، فرانس 6% اور مصر 2%۔

پاکستانی عورتیں

انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیم نے یہ بتایا ہے کہ پاکستان میں عورتوں کے حقوق سلب کئے جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ مختلف طریقوں سے امتیازی سلوک برتا جاتا ہے۔ اُنہیں سرکاری اداروں میں جائز حصہ نہیں دیا جاتا اور معاشرے میں دوسرے پیشوں میں بھی عورتوں کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ حالانکہ پاکستان میں افغانستان جیسی صورتِ حال نہیں ہے اور لڑکیوں کو سکول و کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہے اور وہ جہاں چاہیں آزادی سے آ جا سکتی ہیں لیکن پھر بھی اُنہیں مردوں کے مساوی حیثیت دینے کیلئے بہت کچھ کرنے کی ابھی ضرورت ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کی عورتیں جو گھریلو ملازم کی حیثیت میں عرب ممالک میں جاتی ہیں اپنے مالکوں کے ہاتھوں غیر انسانی سلوک کا شکار ہوتی ہیں۔

پاکستان میں عورتوں کی صحت پر فی کس 6 روپے جو امریکی ڈالر 0.30 کے مساوی ہیں خرچ کئے جاتے ہیں جو انتہائی کم ہے۔ دیہاتی علاقوں میں عورتوں کے لیے صحت کی سہولتیں ناپید ہیں۔ ایک عورت جو بچوں کی پرورش کیلئے بیس سال گزار دیتی ہے اس کے اپنے لیے صحت کی سہولتوں کا حصول مشکل ہے۔ چونکہ مردوں کو ترجیح دی جاتی ہے اس لیے اگر غذا کی کمی ہے تو کھانا پہلے لڑکوں کو دیا جاتا ہے۔

تعلیم کے حوالے سے قومی بجٹ کا ڈیڑھ فی صد عورتوں کی تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں تعلیمی سہولتوں کی شدید کمی ہے۔ بالخصوص دیہات میں کوئی پرائمری سکول نہیں ہے اور اگر کہیں یہ سہولت موجود ہے تو سب سے پہلے لڑکوں کو سکول بھیجا جاتا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں صرف چار فی صد عورتیں پڑھ لکھ سکتی ہیں۔

پاکستان میں عورتیں بہت زیادہ کام کرتی ہیں۔ بالخصوص دیہات میں عورتیں مختلف قسم کے کام کرتی ہیں یعنی گھریلو استعمال کے لیے ایندھن اکٹھا کرنا اور کھیتی باڑی کا تمام کام کرنا عورتوں کے روزمرہ معمول کا حصہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ لڑکا پیدا کرے اور اگر پہلا بیٹا فوت ہو جاتا ہے تو اسے ایک اور بیٹے کو جنم دینا ہوتا ہے۔ اگر کوئی عورت بیٹا یا بیٹی پیدا نہیں کر سکتی تو اسے اس کے والدین کے گھر بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ بے عزتی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے۔

پاکستان میں عورتوں کی تعداد تقریباً مردوں کے برابر ہے۔ وہ صلاحیتوں کے اعتبار سے مرد کے برابر یا اُس سے برتر ہوتی ہیں پاکستان میں عورت قبائلی، شہری اور جاگیردارانہ نظام میں زندہ رہتی ہے پاکستان کی عورت بہت پُراعتماد، باصلاحیت اور پڑھی لکھی خاتون ہو سکتی ہے۔ یا پھر وہ اپنے ساتھی مردوں کے ساتھ کھیتوں میں محنت مزدوری کرتی ہوئی ایک شرمیلی اور خوداعتمادی سے محروم شخصیت ہوتی ہے۔

پاکستان میں عورتوں کی خاصی تعداد دیہات کی خاموش اور تابعدار کسان برادری یا پھر صنعتی علاقوں میں کام کرنے والے طبقات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ غریب اور ان پڑھ اکثریت ہوتی ہے جو غربت زدہ زندگی گزارتے ہیں۔ یہ لوگ لمبے اوقات تک محنت مزدوری کرتے ہیں جس کے عوض نہ تو اُنہیں معقول مالی معاوضہ ملتا ہے اور نہ ہی حسنِ سلوک۔

حالانکہ شہری خواتین کی حالت دیہاتی خواتین سے قدرے بہتر ہوتی ہے لیکن پھر بھی معاشرتی اور مذہبی پابندیوں کی وجہ سے شہری عورت کی آزادی میں بھی رکاوٹ پائی جاتی ہے۔ شہری عورتوں کی بہتر معاشرتی و معاشی حالت تعلیم کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے شہری خواتین کو ترقی کے کئی مواقع میسر آجاتے ہیں۔ ہر جگہ عورت کو دبایا جاتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے خلاف ہے۔ عورت کا استیصال اسلام کی تعلیم اور پیغام کے منافی ہے۔

عورتوں کو بااختیار بنانا (Women Empowerment)

حال ہی میں عورتوں کو بااختیار بنانے کیلئے کوششوں کا آغاز کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے خلاف ہونے والے معاشرتی استیصال اور امتیازی سلوک کی زنجیروں کو توڑ سکیں۔ عورتوں کو بااختیار بنانے کے لیے متعدد ضروری و اہم اقدامات کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں NGOs کا کردار قابلِ تحسین ہے۔ ان نجی اداروں نے عورتوں پر ہونے والے مظالم اور اُن کی حالتِ زار پر مسلسل آواز بلند کی ہے۔ متعدد حکومتی اور بین الاقوامی اداروں نے عورتوں کو بااختیار بنانے کے لیے قدم بڑھایا ہے لیکن اس سلسلے میں ابھی کئی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اس سمت میں اٹھائے گئے تمام اقدامات کا ابھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکا ہے۔

عورتوں کو بااختیار بنانے کے مسائل (Problems of Women Empowerment)

پاکستان میں عورتوں پر ہونے والے مظالم کے نتیجے میں عورتوں کو بااختیار بنانے کے لیے تحریک پیدا ہوئی ہے۔ اس تحریک کا مقصد معاشرے میں عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف شعور پیدا کرنا ہے اور عورتوں کو اپنی آزادی اور حقوق کے لیے جدوجہد کے لیے تیار کرنا ہے۔ یہ تحریک عورتوں کو مردوں پر برتری دلانے کیلئے نہیں ہے بلکہ یہ عورتوں کے لیے وہ تمام مراعات جو کہ مردوں کو حاصل ہیں کے حصول کے لیے ہے جن میں ملازمت کا حصول، سیاسی سرگرمیوں میں شرکت اور نمائندگی اور معاشی مواقع و وسائل شامل ہیں "بااختیار بنانے کا مطلب کسی بھی شخص کو وہ استعداد عطا کرنا ہوتا ہے جس سے وہ اپنی زندگی اور اپنے اردگرد کے حالات جس میں وہ زندگی گزارتا ہے کو بہتر بنا سکے۔"

اپنی صلاحیتوں کا شعور عورتوں کو بااختیار بنانے کے سلسلے کی پہلی سیڑھی ہے جو اُن کے اندر یہ احساس اُجاگر کرتا ہے کہ وہ اختیار استعمال کر سکتی ہیں اور قیادت کی ضروریات و ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا کر سکتی ہیں۔ جب عورت کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ قیادت کی ذمہ داریوں سے باآسانی عہدہ برا ہو سکتی ہے تو وہ بااختیار ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے تعلیم یافتہ اور پوری طرح باشعور ہونا لازمی ہے۔ اپنی ذات پر مکمل اعتماد، پہل کرنے کی صلاحیت ترقی کی خواہش اور غیر معمولی قومی جذبہ کسی بھی عورت کو اپنے دائرہ اثر میں کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ بہرحال چند خواتین کی ترقی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عمومی طور پر عورتیں بااختیار ہوگئی ہیں۔

عورتوں کو بااختیار بنانے کی مہم ملکی و معاشرتی ثقافت کے پس منظر میں ہی شروع کی جا سکتی ہے۔ ایسی کوشش کے نتائج کا دارومدار ملک کی سیاسی و معاشی ترقی کی رفتار پر ہوتا ہے۔ عورتیں، مردوں کے ہم پلہ کبھی نہیں آ سکتیں جب تک وہ ان پڑھ اور اپنی بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے اپنے خاوند و باپ کی دست نگر رہتی ہیں۔

پچھلے تیس سالوں کے دوران پاکستان کی عورتیں حکومت، سیاست، کاروبار اور دوسرے پیشوں میں داخل ہو رہی ہیں۔ لیکن روایتی طرزِ عمل عورتوں کی آزادی اور ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ عورتیں صوبائی و مرکزی اسمبلیوں میں داخل ہوگئی ہیں لیکن وہ بھی صرف مخصوص نشستوں پر جو کہ عورتوں کے لیے مختص ہیں۔ عام نشستوں پر مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں کے انتخابات لڑنے اور جیتنے کی بہت کم مثالیں ہیں۔

پدرسری (patsiarchal) کلچر آج کے دور کے معاشرہ میں بہت سختی سے رائج ہے اور جنسی تعصب نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ عورتوں کے اندر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ وہ جو کام اپنے خاندان کے لیے کرتی ہیں وہ اُن کا فرض ہے اس لیے وہ اپنے کام اور محنت مزدوری کے مالی یا کسی اور صورت میں معاوضے کی توقع نہیں رکھتیں جبکہ مرد جو کام کرتے ہیں وہ بلاشبہ معاشی و معاشرتی لحاظ سے قابلِ قدر ہوتا ہے۔ اسی طرح بیشتر خواتین یہ سمجھتے ہوئے کہ فیصلہ سازی مردوں کا شعبہ ہے اس میں شریک نہیں ہوتیں۔ پدرسری کے اس مذموم رہن سہن کو اتار پھینکنے کے لیے معاشرے کی مجموعی سوچ اور طرزِ عمل کو بدلنے کی ضرورت ہے اور اسی لیے جنسی تعصب صرف خواتین کے بارے میں نہیں بلکہ دونوں مردوں اور عورتوں کے بارے میں ہے۔ عورتوں کے لیے مساوی حقوق کے پروگرام پر عمل درآمد کے لیے یہ ضروری ہے کہ قومی و بین الاقوامی سطح پر مضبوط اور ہمہ تن موقوف اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے جو عورتوں کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کو سختی سے روک سکیں۔

عورتوں کی آزادی کے لیے کیئے گئے اقدامات (Steps taken for Women Empowerment)

عورتوں کی آزادی کے لیے قومی و بین الاقوامی سطح پر بیشتر اقدامات کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے ہر قسم کے امتیازی سلوک کے خلاف عورتوں کو آئینی تحفظ مہیا کیا گیا ہے۔ پاکستان کا آئین عورتوں کو وہی آزادی اور حقوق دیتا ہے جو کہ مردوں کو حاصل ہیں۔ ملکی قوانین واضح طور پر عورتوں کو مردوں کے برابر حیثیت اور حقوق دیتے ہیں۔ ایک عورت پاکستان کے بلند ترین عہدے پر فائز ہو سکتی ہے۔ وہ جو پیشہ چاہے اختیار کر سکتی ہے اور سیاست میں بھی حصہ لے سکتی ہے۔ جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے مقامی، صوبائی اور قومی قانون ساز اداروں میں عورتوں کے لیے نشستوں کا کوٹہ مقرر کیا ہے۔ عورتیں اب کابینہ میں بطور وزیر و وزیرِ مملکت شامل ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عورتوں کو مسلح افواج میں کمیشن دیا گیا ہے۔ اب عورتیں ایئر فورس میں بطور پائلٹ اور بری افواج میں کمشنڈ آفیسر بھرتی ہو رہی ہیں۔

صدر جنرل پرویز مشرف عورتوں کی ہئیت کذائی کے بارے میں انتہائی رحم دلانہ جذبہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک آرڈیننس جاری کیا اور معمولی جرائم پر قید عورتوں کو ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے تحت تقریباً 1300 خواتین کو جیلوں سے رہا کیا

گیا۔ وہ عورتیں جو قتل اور دہشت گردی جیسی جرائم کی بنا پر مقدمات میں ملوث تھیں اُنہیں رہا نہیں کیا گیا۔ شہری علاقوں میں رہنے والی عورتیں مردوں کے ساتھ ہر میدان میں مقابلہ کر رہی ہیں۔ انہوں نے حکومتی فرائض اور قانون ساز اسمبلیوں میں اپنے حصے کا مطالبہ کیا ہے۔ دیہاتی علاقوں کی خواتین کو اُن کے حقوق ابھی تک نہیں ملے۔

خواتین کی آزادی کیلئے مختلف حکومتوں کے اقدامات

Efforts of various governments for women's Empowerment

1988ء میں حکومت سنبھالتے ہی پیپلز پارٹی کی حکومت نے پاکستان کی عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق دلانے کیلئے متعدد اقدامات کئے۔ سب سے پہلے بہت ساری قیدی عورتوں کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد حکومت نے ان تمام قوانین کو جو عورتوں سے امتیازی سلوک کی حمایت کرتے تھے منسوخ کر دیا۔ 1989ء میں حکومت نے متعدد اقدامات کا اعلان کیا اور خواتین ڈویژن کو وزارت کا درجہ دے دیا گیا جس کا نام وزارت برائے ترقیٔ نسواں رکھا گیا۔ جولائی 1989ء تک حکومت نے خواتین بینک کے قیام کے لیے ایک کروڑ روپے مختص کئے۔ بنک نے فراخدلی سے عورتوں کو قرضے جاری کئے۔ 89-1988ء کے دوران (WAF) Women Action Forum اور Pakitan Women Lawyers Association (APWA) نے عورتوں کو بااختیار بنانے کیلئے قانون سازی کے حکومت پر دباؤ ڈالا۔

نواز شریف کی حکومت (Nawaz Sharif's Government)

1990ء میں جب نواز شریف حکومت میں آئے تو انہوں نے ملک کی معیشت کی بہتری کے لیے پروگرام شروع کیا۔ اس پروگرام میں عورتوں کی خواندگی کے تناسب میں ترقی، شرح پیدائش میں کمی اور عورتوں کے لیے کام اور روزگار کے مواقع بڑھانا شامل تھا۔ نواز شریف نے عورتوں کی وزارت کو جاری رکھا لیکن اس کی سرگرمیوں کو کم کر دیا گیا جس کی وجہ سے بے نظیر کے عورتوں کی بحالی کیلئے شروع کئے گئے اقدامات کو شدید نقصان پہنچا۔

مسلم لیگ کی حکومت نے ملک میں غیر سرکاری انجمنوں کی بھرپور حمایت کی۔ ان کوششوں کی وجہ سے عورتوں کو بااختیار بنانے کے بہتر نتائج ظاہر ہوئے۔ دوسرے اداروں نے بھی اپنی کوششوں کا رُخ عورتوں کو کے اس دور میں غیر سرکاری انجمنوں کے حقوق کے تحفظ پر مرکوز کر لیا۔ پاکستان کی عورتوں کی وکلاء تنظیم نے ایسی فلمیں ریلیز کیں جن کے ذریعے خواتین کو اُن کے قانونی حقوق کے بارے میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ قانونی سیل قائم کئے جو غریب خواتین کو مفت قانونی مشورے اور امداد بہم پہنچاتے تھے The Business and Professional Women's Association نے ایک جامع منصوبہ شروع کیا اور کراچی میں اورنگی پائلٹ پراجیکٹ شروع کیا گیا جو گھروں میں خواتین کو کام مہیا کرتا تھا۔ ان منصوبوں کا مقصد عورتوں کو خام مال اکٹھا کر کے تیار شدہ اشیاء کو درمیانی رابطے کے بغیر تقسیم کرنے میں مدد دینا تھا۔

بے نظیر کی دوسری حکومت (Second Government of Benazir)

بحیثیت وزیر اعظم دوسری مدت کے دوران بے نظیر نے عورتوں کے لیے قومی اسمبلی کی مخصوص نشستیں بحال کرانے کیلئے اقدامات کئے۔ حزبِ اختلاف نے اس کے خلاف بہت واویلا مچایا جس کی وجہ سے قانون منظور نہ ہو سکا۔ چھ ماہ کے بعد 28 اپریل 1994ء کو بے نظیر نے دوبارہ خواتین کی مخصوص نشستوں کی بحالی کے لیے قانون پیش کیا۔ اس قانون کے ذریعے ملکی آئین میں ترمیم تجویز کی گئی

جس کا مقصد قومی اسمبلی میں عورتوں کے لیے 25 نشستیں، سینٹ میں 9 نشستیں مختص کی گئیں اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں خواتین نشستیں بحال کر دی گئیں۔ قدامت پسند جماعت اسلامی نے اس قانون کی بھرپور مخالفت کی لیکن قانون کی منظوری کو نہ روک سکی۔

پیپلز پارٹی کی حکومت نے خواتین پولیس سٹیشن قائم کیے جن میں تمام عملہ خواتین پر مشتمل تھا۔ سب سے پہلے راولپنڈی، دوسرا ایبٹ آباد اور تیسرا خواتین پولیس سٹیشن کراچی میں 2 جون 1994ء کو قائم کیے گئے۔ خواتین تھانوں کے قائم کرنے کا مقصد پولیس کے ہاتھوں قیدی خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو ختم کرنا تھا۔

اپریل 1994 میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے پارلیمانی منظوری کے لیے ایک بل پیش کیا جس کا مقصد فیملی عدالتوں میں خواتین ججوں کا تقرر کرنا تھا۔ یہ بے نظیر کی انتخابی مہم کے دوران کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کے لیے تھا جس کے مطابق بے نظیر نے انتظامیہ اور عدالت میں اعلیٰ عہدوں پر خواتین کو مقرر کرنے کا عوام سے وعدہ کیا تھا۔

بین الاقوامی سطح پر عورتوں کی بحالی کیلئے کوششیں

Efforts for Women Empowerment on Global Level

اقوام متحدہ کی تحفظِ نسواں (UNO's Protection of Females)

عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اقوامِ متحدہ کا چارٹر ایک اہم دستاویز ہے۔ اس کا ابتدائیہ اقوامِ متحدہ کے لوگوں کے عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عزم و اعتماد کا اظہار کرتا ہے۔ بین الاقوامی اعلان کی شق 2 کے مطابق ہر کوئی رنگ، نسل، جنس اور پیدائش کی تخصیص کے بغیر ہر قسم کے حقوق حاصل کر سکتا ہے۔ شق 16 کے مطابق مرد اور عورت شادی کرنے کا مساوی حق رکھتے ہیں۔

Convention on Elimination of all forms of Discrimination Against Woman) CEDAW

ایک معاہدہ ہے جس کا مقصد عورتوں کو بااختیار بنانا ہے۔ یہ معاہدہ 1981ء میں طے پایا۔ یہ عورتوں کے خلاف امتیازی سلوک کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے اور عورتوں کی آزادی کے لیے مختلف اقدامات مہیا کرتا ہے۔

1995ء میں بیجنگ (چین) میں اقوامِ متحدہ کی عورتوں سے متعلق چوتھی سب سے بڑی کانفرنس منعقد ہوئی جسے عام طور پر بیجنگ کانفرنس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (FWCW) اس کانفرنس میں دنیا کے مختلف ممالک کے تقریباً 17000 نمائندے و مندوبین شریک ہوئے جن میں این جی اوز، انٹرنیشنل سول سرونٹس اور ذرائع ابلاغ کے نمائندے شامل تھے۔ اس کانفرنس کے ساتھ ساتھ Hvariru میں این جی اوز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں 30,000 مندوبین نے شرکت کی۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ عورتوں کی مساوی حیثیت انسانی حقوق کا لازمی جزو ہے اس کانفرنس کا بنیادی مقصد عورتوں کی ترقی کی راہ میں حائل تمام مشکلات کو ہٹانا اور انہیں کو معاشرتی زندگی کے ہر شعبے میں بااختیار بنانا تھا۔ بیجنگ کانفرنس کے بعد میں ہونے والا معاہدہ (The Beijing Platform for Action BPFA) عورتوں کے حقوق کے لیے کی جانے والی بین الاقوامی جدوجہد میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

بیجنگ کانفرنس میں ہر ملک نے نیشنل ایکشن پلان (NPA) بنانے کا عہد کیا جس میں ہر ملک میں عورتوں کے حالات اور ان کے بارے میں حکمت عملی پر تفصیل سے معلومات شامل کی گئیں تھیں۔

عورتوں کی بحالی میں غیر سرکاری اداروں کا کردار
Role of NGOs for Women Empowerment

غیر سرکاری اداروں کا فروغ
(The Rise of Non-Governmental Organizations (NGOs)

حال ہی میں پاکستان میں غیر سرکاری انجمنوں (NGOs) کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔ پاکستان میں مختلف قسم کی غیر سرکاری انجمنیں ہیں جنہیں اُن کے مقاصد اور دوسری انجمنوں سے روابط کی بنا پر پہچانا جاتا ہے۔ 1980ء کی دہائی کے دوران بیرونی امداد پر چلنے والی انجمنیں بہت تیزی سے فروغ پا گئیں۔ غیر سرکاری انجمنوں کے پھیلنے کی وجہ سے 1980ء کی دہائی کے دوران مذہبی مدارس کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔ جنہیں پاکستان اور بیرونی ممالک سے مالی امداد وصول ہوتی تھی۔

جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے دوران وسیع پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور سیاسی دباؤ نقطہ عروج پر تھا۔ بالخصوص عورتوں اور اقلیتوں کے خلاف تعصب انتہا پر تھا جس کی وجہ سے ایسے قوانین منظور کیے گئے جو کہ عورتوں کے بارے میں امتیازی سلوک کو پروان چڑھاتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے ان ظالمانہ اقدامات کی وجہ سے کچھ لوگوں نے معاشرے کے بے دست و پا و مجبور طبقوں کو تحفظ بہم پہنچانے کے لیے آپس میں مل کر چند انجمنیں اور ادارے قائم کیے۔ ذرائع ابلاغ و ثقافتی سرگرمیوں پر حکومتی کنٹرول اور جامعات سے ناپسندیدہ افراد کے زبردستی اخراج نے ان سارے عوامی خدمت کے جذبے سے سرشار معاشرتی کارکنوں کو مجبور کیا کہ وہ غیر سرکاری انجمنیں تشکیل دے کر حکومتی قہر و غضب سے پناہ حاصل کرلیں۔ نتیجتاً ضیاء دور میں اس قسم کے ادارے معرضِ وجود میں آئے جن میں

(WAF) Women Action Forum

(WAR) War Against Rape

(SAHE) Society for Advancement of Higher Education

اور دوسرے متبادل تھیٹر گروپ یعنی Lok Rehas, Ajoka, Dastak اور Lok Tamasha شامل ہیں۔

کچھ ادارے عورتوں کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک سے نبرد آزما ہونے کے اعلیٰ عزائم کے ساتھ معرضِ وجود میں آئے۔ ان میں ASR، عورت فاؤنڈیشن، HRCP، دستک، اجوکا اور شرکت گاہ شامل ہیں۔ یہ ادارے عورتوں کے حقوق اور اُن سے ہونے والے امتیازی سلوک کے حوالے سے قومی سطح پر مشہور اور اہم ہیں۔ RISE اور عورت فاؤنڈیشن صوبہ سرحد میں عورتوں اور بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ PIO's (Public Interests Organization) بھی مظلوم طبقوں یعنی خواتین کے مخصوص مفادات (Vested Interest) کے ہاتھوں استیصال کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔

ان اداروں کے کارکنان نے اپنے بیانات اور احتجاج کے ذریعے عورتوں کے حقوق کے حق میں بلند آواز اٹھائی ہے۔ انہوں نے مخصوص مفادات جن میں مذہبی راہنما، بعض سیاست دان اور حکمران شامل ہیں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ حال ہی میں مختاراں

مائی اور سونیا ناز جنہیں زنا جیسے وحشیانہ وقبیح فعل کا نشانہ بنایا گیا کا معاملہ قومی سطح پر اٹھایا گیا اور گناہ گاروں کے لیے سخت سزا کا مطالبہ کیا گیا۔ ان معاملات میں غیر سرکاری اداروں کی کارکنان عاصمہ جہانگیر اور حنا جیلانی گناہ کاروں کو منظر عام پر لانے کے لیے پیش پیش تھیں۔ غیر سرکاری اداروں کے کارکنان نے اپنی کوششوں کا محور عورتوں کے خلاف ہونے والے جرائم جن میں عزت کے لیے قتل، کاروکاری اور معصوم اور نابالغ بچیوں کی عمر رسیدہ مردوں کے ساتھ زبردستی شادی شامل ہیں پر رکھا ہوا ہے۔

عورتوں کے حقوق کے اپنے اعلیٰ وارفع مقاصد کے حصول کے لیے غیر سرکاری اداروں کے کارکنان کو مخصوص مفاد یعنی مذہبی راہنما و سرکاری اداروں کے قہر و غضب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مخصوص مفادات جن میں مذہبی علماء، نااہل و بدعنوان سیاست دان اور حکومتی اہل کار شامل ہیں غیر سرکاری اداروں کے کام کو متواتر روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ غیر سرکاری اداروں کے کارکنان کی عورتوں کے تحفظ کی مخلصانہ کوششوں کی راہ میں سخت مزاحمت کھڑی کرتے رہتے ہیں۔ مذہبی علماء غیر سرکاری اداروں کی کوششوں کو بدنام کرنے کے لیے اکثر فتوے جاری کر دیتے ہیں۔ تحفظِ حقوق کے اداروں کے کارکنان پر جسمانی حملے اور ان کی کوششوں کو بدنام کرنے کے لیے دھمکیاں دینا معمول کا کام ہے۔ اپریل 1999ء میں انسانی حقوق کی کارکنان حنا جیلانی اور عاصمہ جہانگیر کو اُن کے دفاتر میں جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی گئیں۔ 13 اپریل 1999ء کو پشاور میں جائنٹ ایکشن کے عزت کے لیے قتل کے خلاف نکالے گئے پُرامن جلوس پر حملہ کیا گیا۔ پشاور میں ہزاروں مذہبی انتہا پسندوں نے ایک جلسے میں عورتوں اور انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والوں کو انتہائی دیدہ دلیری سے دھمکیاں دیں۔ انہوں نے برملا انسانی حقوق کے کارکنان کی ٹانگیں و دست و بازو توڑ دینے کی دھمکیاں دیں۔ ان جارحانہ اقدامات پر حکومتی خاموشی اور بے گانگی تشویش کا باعث ہے۔

بہرحال مخصوص مفاد کی طرف سے سخت مخالفت کے باوجود جنرل پرویز مشرف کی حکومت عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے چند قانونی اصلاحات جاری کیں ہیں۔ پرویز مشرف کی حکومت نے عورتوں کو بااختیار بنانے کے لیے ٹھوس اقدامات کئے ہیں۔

چونکہ پاکستان میں مخصوص مفادات کے حامل افراد یعنی مذہبی علماء اور بدعنوان سیاست دان بارسوخ ہوگئے ہیں اس لیے عورتوں اور دوسرے مظلوم طبقوں کی آزادی کا ہدف حاصل کرنا انتہائی مشکل ہے۔ حکومت اور اس کے ادارے عوام کے مطالبات وضروریات سے بالکل بے بہرہ اور غیر ہمدردانہ رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ انہیں عوام اور بالخصوص بچوں اور عورتوں پر ہونے والے مظالم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ حکومتی اہل کار بدعنوان، راشی اور جابر ہیں جس کی وجہ سے وہ مخصوص مفادات کے حامل افراد کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ حکومتی اہل کاروں کے اس رویے کی وجہ سے شہریوں کی معاشرتی مقاصد کے حصول کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور حکومت سے کسی بھی قسم کا تحفظ یا امداد حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

پاکستان جیسے ملک میں ایک مصلح کا اولین فرض خواتین کو مایوسی اور نومیدی کے غار سے باہر نکالنا ہے۔ سب سے اعلیٰ مقصد خواتین کو اُن خوفناک حالات جس میں وہ زندگی گزار رہی ہوتی ہیں سے بچانا اور نجات دلانا ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں جبکہ ایک والد نے محض اس وجہ سے اپنی بیٹی کو ہلاک کر ڈالا کیونکہ اس نے والدین کی اجازت کے بغیر اپنی مرضی کی شادی کر لی تھی۔ کئی ایسے واقعات میں لڑکی کے رشتے داروں نے اُس پر زنا کا الزام لگا کر اسے اسلامی قانون کے مطابق سزا دی۔ قبائلی علاقوں کے رسم و رواج ایک باپ کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنے حریف قبیلے کے ساتھ کئے گئے کسی جرم کی پاداش میں اس قبیلے کے عمر رسیدہ شخص کے ساتھ بطور ہرجانہ ایک سے زیادہ بیٹیاں بیاہ دے۔ گھریلو تشدد بین الاقوامی امر ہے اور پاکستان اس میں سرفہرست ہے۔ عورتوں کو بااختیار بنانے سے پیشتر اس قسم کے تشدد اور ظلم وستم کا خاتمہ بہت ضروری ہے تاکہ اس سلسلے میں کی گئی کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکل سکے۔

تحفظِ نسواں قانون
Woman Protection Bill

عورتوں کی آزادی کو یقینی بنانے کے لیے جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے تحفظ نسواں قانون منظور کر کے انتہائی اہم قدم اٹھایا ہے۔ تحفظِ نسواں قانون (WPB) منظور ہوتے ہی ضیاء الحق کی اسلامی تحریک کے دوران منظور کردہ بدنام زمانہ حدود آرڈی ننس خود بخود ختم ہوگیا۔ قومی اسمبلی نے تحفظِ نسواں قانون 15 نومبر 2006ء کو منظور کیا۔ قانون کے حق میں ملک کے طول وعرض سے مظاہرے ہوئے جبکہ رجعت پسند اسلامی طبقوں نے اس قانون کی بھرپور مخالفت کی۔ بہرحال بنیاد پرستوں کی مخالفت کے باوجود قومی اسمبلی نے تحفظِ نسواں قانون (WPB) منظور کرلیا۔

انتہا پسند متحدہ مجلسِ عمل (MMA) نے اسمبلی اجلاس جس میں تحفظِ نسواں قانون (WPB) منظور ہوا کا مقاطعہ کیا۔ متحدہ مجلسِ عمل نے قانون کی منظوری کے خلاف احتجاج کے طور پر اسمبلی کی نشستوں سے استعفیٰ دینے کی دھمکی دی۔ متحدہ مجلس عمل نے بار بار یہ اعلان کیا کہ وہ کسی بھی صورت میں قانون منظور نہیں ہونے دیں گے لیکن اُن کا اعلان محض خالی بڑھک ثابت ہوا۔ متحدہ مجلسِ عمل نے اسمبلی سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ موخر کردیا جس سے سیاسی طور پر مجلس عمل کی حیثیت پر برا اثر پڑا۔

حکومت نے متعلقہ طبقوں سے مکمل مشورہ کے بعد بل اسمبلی میں پیش کیا تھا۔ مسودہ قانون کو رائے کے لیے علماء کمیٹی کے حوالے بھی کیا گیا تھا اور اُن کی سفارشات کو قانون میں شامل کرلیا گیا۔ لہٰذا اس کے بعد مجلسِ عمل کے لیے اسمبلی کا مقاطعہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ قانون میں علماء کمیٹی کی سفارشات بھی شامل کرلی گئیں تھیں بالآخر سینٹ نے بھی قانون منظور کرلیا اور صدارتی توثیق کے بعد بل قانون بن گیا۔ بلاشبہ یہ پرویز مشرف حکومت کا عظیم کارنامہ تھا۔

تحفظِ نسواں قانون کا مقصد عورتوں کو ہر قسم کے امتیازی سلوک کے خلاف تحفظ بہم پہنچانا ہے۔ یہ خواتین کو ہر قسم کے تشدد سے محفوظ رکھے گا اور اُنہیں اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے بھرپور مواقع مہیا کرے گا۔

سینٹ نے 23 نومبر 2006ء کو بغیر کسی ترمیم کے قانون منظور کرلیا۔ اس نے (MMA) مجلسِ عمل کے ممبران کے تمام اعتراض رد کر دیئے جو کہ بہت خوش آئند مرحلہ تھا۔ پارلیمنٹ سے تحفظِ نسواں بل (WPB) کی منظوری نے ملکی سیاست کو ہلا کے رکھ دیا ہے اور حزبِ مخالف کے اتحاد کو نقصان پہنچایا ہے۔ بہرحال حزب اختلاف میں شگاف ملکی بہتری کے لیے ہے جو کہ کسی بھی بہتر اقدام کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ یہ نہایت خوش آئند بات ہے کہ PPP، نیشنل عوامی پارٹی اور پختون خواہ ملی پارٹی نے حکومت کے ساتھ مل کر قانون کے حق میں ووٹ دیا۔

جیسا کہ توقع کی جاتی تھی اس قانون پر مجلسِ عمل کا ردعمل انتہائی مایوس کن تھا۔ قانون پر رائے شماری تک مجلس عمل کے کارکنان قانون کی منظوری سے روکنے کے لیے حکومت کو دھمکیاں وتنبیہات دیتے رہے کہ قانون کی منظوری اللہ کی مرضیٰ کے خلاف ہوگی جس سے قہر خداوندی نازل ہوگا۔ اس طرح کی بحث و دلائل انتہائی لغو اور قابلِ افسوس ہیں لیکن اس کی ایسے معاشرے سے توقع کی جاسکتی ہے جہاں مذہب روایتی طرزِ عمل بن چکا ہو۔

PPP اور بالخصوص عوامی نیشنل پارٹی اور متحدہ قومی موومنٹ نے قانون کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ مثبت سوچ کا مظہر ہے کیونکہ تحفظِ نسواں قانون (WPB) ان جماعتوں کے ترقی پسند اور آزاد خیال پروگراموں کے عین مطابق ہے۔ بدقسمتی سے تحریک انصاف نے مجلس عمل کی روش پر چلتے ہوئے قانون کی مخالفت کی۔ تحریکِ انصاف کے سربراہ عمران خان نے اس بناء پر قانون کی مخالفت کی کہ

حکومت خواتین کی حالت بہتر بنانے میں مخلص نہیں ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر حکومت واقعی عورتوں کی حالت کو بہتر بنانا چاہتی ہے تو اُسے سب سے پہلے تعلیم، صحت عامہ اور پولیس اور عدلیہ کے نظام کو بہتر بنانا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن ایک ایسا اقدام جو دبے ہوئے اور مجبور طبقے کی حالت بہتر بنانے کے لیے ہو اسے روکنے کے لیے یہ بہانہ نہیں ہونا چاہیے۔

حزبِ اختلاف کے شدید احتجاج اور مخالفت کے باوجود صدارتی منظوری کے بعد (WPB) تحفظِ نسواں بل بالآخر قانون بن گیا۔ منظور شدہ بل پارلیمنٹ کی سلیکٹ کمیٹی کے منظور کردہ مسودے سے مختلف ہے اور اس میں چار ترامیم شامل ہیں۔ ترامیم یہ ہیں:

1- باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط کو حدود آرڈیننس کے دائرہ سے خارج کر کے اسے تعزیری قوانین کے تحت کر دیا جائے۔
2- سزا سے موت کی سزا یا 100 کوڑوں کی سزا کو خارج کر دیا جائے۔
3- زنا کے الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار کی بجائے دو گواہ ہونے چاہئیں اور
4- سزا زیادہ سے زیادہ پانچ سال قید اور دس ہزار روپیہ جرمانہ ہونی چاہیے۔

شکایت کنندہ کو ایسے تمام معاملات عدالت کے سامنے پیش کرنا ہوں گے اور پولیس ملزم کو گرفتار نہیں کر سکے گی۔ یہ قابلِ سزا جرم ہوگا جسے مجسٹریٹ سنے گا۔ کسی پر شہوت پرستی کا جھوٹا الزام لگانے والا اُسی سزا کا مستوجب ہوگا جو کہ الزام سچ ثابت ہونے پر ملزم کو دی جا سکے گی۔

قانون میں جس طرح سے زنا پر بحث کی گئی ہے اس کی وجہ سے الجھن پیدا ہوئی ہے۔ زنا کے الزام کو یا تو حدود آرڈیننس کے دائرہ میں رہتے ہو فیصلہ کیا جا سکتا ہے یا اگر زنا کا شکار ہونے والی خاتون چار گواہ پیش نہ کر سکے تو پھر اسے تعزیری قوانین کے زمرے کے تحت حل کیا جائے گا۔ زنا کی شکار عورت اگر چار گواہ پیش نہیں کرتی تو اس پر زنا کا الزام نہیں آئے گا جیسا کہ حدود آرڈیننس میں ہوتا تھا۔ حدود آرڈیننس کی اس شق کی وجہ سے ہزاروں بے گناہ خواتین جیلوں میں پڑی پڑی مر جاتی ہیں۔ دراصل حدود آرڈیننس کی یہی شق زنا کو فروغ دینے کا ذریعہ تھی۔ حدود آرڈیننس کے ناقدین کا یہ خیال ہے کہ حدود آرڈیننس بجائے زنا کا شکار ہونے والی عورت کو تحفظ دیتا یہ دراصل چار گواہ پیش کرنے یا پھر زنا کے الزام میں جیل جانے کی وجہ سے گناہ کا سارا بوجھ عورت پر ڈال دیتا تھا اور زنا بالجبر کے مرتکب گناہ گاروں کی مدد کرتا تھا۔

تحفظِ نسواں بل (WPB) میں حدود رڈیننس کی صرف زنا کی ش پر بحث کی گئی ہے جبکہ بقیہ چار شقیں جوں کی توں چھوڑ دی گئیں ہیں۔ اس سے خواتین اور انسانی حقوق کے کارکنوں کی تشفی نہیں ہوئی جو عرصۂ دراز سے حدود آرڈیننس کے مکمل خاتمے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ دوسری جانب مجلس عمل نے (MMA) پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ساتھ مل کر پارلیمنٹ سے واک آؤٹ کر کے قانون کے بارے میں اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ دوسری جماعتوں سے تعلق رکھنے والے پچاس MNAs قانون پر رائے شماری والے دن غیر حاضر رہے تاکہ وہ رائے شماری سے بچ سکیں یا پھر اسمبلی اجلاس سے غائب رہے۔
صرف PPP پختون خواہ ملی پارٹی، MQM اور نیشنل عوامی پارٹی نے حکومتی ممبران کے ساتھ بل کے حق میں ووٹ دیا۔ بہرحال WPB کے منظور ہو جانے سے عورتوں کے مسائل ختم نہیں ہوں گے۔ عوام کو پورے جوش سے انتہا پسندوں کے عزائم کو ناکام بنانا ہوگا تاکہ وہ حکومت کی ایک اچھی کوشش کے راستے میں رکاوٹ نہ ڈال سکیں۔ عوام کو WPB کیلئے اپنی بھرپور حمایت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ صرف اسی صورت میں ایک ترقی پسند معاشرے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

تحفظِ نسواں بل پر اعتراضات
Obejections to WPB

تحفظِ نسواں قانون کی منظوری پر ملک بھر کے ملاؤں نے سخت احتجاج کیا ہے۔ مذہبی حلقوں نے تحفظِ نسواں بل (WPB) کو قرآن اور سنت کے خلاف قرار دیا ہے اور اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے مذہبی علماء نے تحفظِ نسواں قانون کو خدا کی مرضی کے خلاف قرار دیا اور کہا کہ یہ قانون منظور ہونے سے اللہ کا قہر وغضب نازل ہوگا۔ مذہبی جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلسِ عمل (MMA) نے WPB کے خلاف بطور احتجاج پارلیمنٹ کی نشستوں سے مستعفی ہونے کی دھمکی دی۔ بہرحال قانون کی منظوری پر غیر ضروری جھگڑے واحتجاج کے باوجود بل صدر کی منظوری کے بعد قانون بن گیا۔ بل کے قانون بن جانے کے بعد یہ ضروری تھا کہ ملا خاموشی اختیار کر جاتے کیونکہ ملک کے تمام حلقوں اور خواتین نے قانون کا خیر مقدم کیا۔

WPB کے مخالفیہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ اگر WPB پر نیک نیتی سے عمل درآمد ہو تو یہ خواتین کو پریشانی سے نجات دلائے گا۔ ماضی میں زنا بالجبر کا شکار خواتین پر زنا کے الزامات لگا کر انہیں سزا دی جاتی تھی کیونکہ بدنام زمانہ حدود آرڈی ننس زنا بالجبر اور بدکاری میں تمیز نہیں کرتا تھا۔ نئے قانون میں حدود سے زنا بالجبر کو نکال کر زنا کاری اور زنا بالجبر کے فرق کو واضح کر دیا گیا ہے۔

مذہبی علماء WPB کے خلاف ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ اس قانون کی وجہ سے پاکستان ایک آزاد جنسی معاشرے میں بدل جائے گا۔ اس قسم کے بے معنی دلائل دینے سے پیشتر WPB کے مخالفین کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ضیاء الحق کی اسلامی نظام کی تحریک نے بھی لوگوں کے غیر قانونی جنسی معاملات پر کوئی پابندی نہیں لگائی اور نہ ہی بالغ افراد کے درمیان بالرضا جنسی فعل کی ممانعت کی تھی۔ حقیقت میں ملا اس قسم کے فضول اعتراضات کر کے علمائے دین کی حکومت سے متعلق اپنی رائے عوام پر ٹھونسنا چاہتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کی ذاتی زندگی میں برملا دخل دے کر عوام کو اخلاق کا سبق دے سکیں۔ بدقسمتی سے حکومت یہ کام نہیں کر سکتی کیونکہ وہ زیادہ ضروری معاملات یعنی پینے کے تازہ پانی کا حصول، تعلیم، صحت، دور دراز علاقوں میں حفظانِ صحت کی سہولتیں بہم پہنچانا اور تیزی سے بگڑتی ہوئی امنِ عامہ کی صورتِ حال کو بہتر بنانے میں مصروف ہے۔ ملا یہ چاہتے ہیں کہ عوام کو اخلاق کا سبق سکھانے کیلئے پولیس کا نظام یا قانون ہونا چاہیئے جو یہ کام سرانجام دے سکے لیکن پاکستانی عوام کی اکثریت اس بات کے سخت مخالف ہے کہ حکومت ان کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرے۔ ماضی کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اگر حکومت کو عوام کے ذاتی معاملات میں جھانکنے کا اختیار مل جائے تو اس کا بے جا استعمال ہوگا۔

مذہبی حلقوں نے اس ترمیم کے خلاف سخت احتجاج کیا جس کی رو سے عدالتوں کے اختیارات ایسے زنا کاری کے مقدمات میں کم کر دیئے گئے ہیں جن میں چار شہادتیں موجود نہیں۔ اختیارات کے غلط استعمال اور حدود آرڈیننس کے نام پر ہونے والی ناانصافی کی روشنی میں اس قسم کی ترمیم کی اشد ضرورت تھی۔ اس ترمیم کی رو سے اگر کوئی یہ شکایت کرتا ہے کہ دو بالغ افراد نے جنسی بدکاری کا ارتکاب کیا ہے تو اسے جنسی بدکاری کے خلاف چار شہادتیں مہیا کرنا ہوں گی۔ یہ بلاشبہ کسی عورت جو زنا بالجبر کا شکار ہوئی ہو کو حدود آرڈیننس کے مطابق چار مسلمان مرد چشم دید گواہ مہیا کرنے کے لیے کہنے کے مقابلے میں زیادہ منطقی اور حقیقی ہے۔

ملا نے اس ترمیم پر بھی اعتراض کیا جو کسی ملزم جو کہ اصل میں بے گناہ ہے کو تعزیری سزا سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ترمیم اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ کوئی شخص یا تو مجرم ہے یا بے گناہ۔ اس ترمیم پر اعتراض یہ ثابت کرتا ہے کہ ملا قانون کی مخالفت جھوٹے اور ناقابلِ قبول دلائل کی بناء پر کر رہے ہیں۔ کیونکہ نیا قانون پاکستان کو آزاد جنسی معاشرہ بنانے سے متعلق ان (ملاؤں) کے وہم کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ بالکل ملاؤں کے خیال کے عین مطابق ہے کہ وہ ہر کسی کے اخلاقی نگہبان ہیں اور پاکستان میں ملا کی حکومت ہونی چاہئے۔

باب نمبر 22

پاکستان میں اسلامی نظام کی تشکیل

(Islamization in Pakistan)

تحریک پاکستان کا جواز ہندوستان کے مسلمانوں کی اسلامی اقدار اور اصولوں کے تحفظ کی گہری خواہش پر مبنی تھا۔ گو اس کے علاوہ دوسرے عوامل یعنی معاشی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی تحفظ بھی تحریک آزادی میں کارفرما تھے لیکن پاکستان کا مطالبہ صرف اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت تھا۔ مطالبہ پاکستان نظریاتی بنیادوں پر استوار تھا جس کی جڑیں اسلامی اصولوں پر قائم تھیں۔ لہٰذا اسلام تحریک آزادی کی تنظیم اور رہبری میں سب سے بلند مقصد تھا جو پاکستان کی شکل میں اپنی منزل مقصود تک پہنچا۔ چونکہ متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کے زیر تسلط رہتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال سکیں لہٰذا ان کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کریں۔ پاکستان کا قیام اسلامی معاشرے کی تشکیل کی جانب قدم تھا جہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کے مواقع حاصل ہوسکیں گے۔ ظہور پاکستان ان تمام طاقتوں کی کاوش کا نتیجہ تھا جنہوں نے دبے ہوئے مسلمانوں کو برصغیر میں ایک منظم قوم بننے کے لیے آپس میں تعاون کیا۔

ایک طرح سے پاکستان پیدا ہوتے ہی اسلامی ملک تھا کیونکہ مسلمان اپنے اسلامی جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے ایک ملک چاہتے تھے۔ تحریک پاکستان کبھی بھی اتنی متحرک نہ ہوسکتی اگر یہ مسلمانوں کے لیے مذہبی ملک کا مطالبہ نہ کرتی۔

لوگوں کے ذہنوں میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام کو بحیثیت ایک سیاسی و معاشرتی نظام منظم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مزید برآں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر اسلام ایک فرد کا مذہب ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو علیحدہ وطن کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ایک فرد کسی ایسے ملک میں رہتے ہوئے جہاں کی اکثریت غیر مسلم ہو اپنے خالق کے ساتھ تنہائی میں بھی رابطہ قائم رکھ سکتا ہے۔ مسلمان ہندوستان میں مستقل طور پر ایک خاموش اقلیت کے طور پر بہ آسانی رہ سکتے تھے اور اپنے مذہب پر عمل درآمد بھی کر سکتے تھے۔

لیکن اسلام محض نمازیں ادا کرنا یا مذہبی رسومات کی پیروی کرنا ہی نہیں۔ یہ ایک فرد کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے اور ایک فرد کو اپنی زندگی گذارنے کی راہ دکھلاتا ہے۔ اسلام معاشرتی مذہب ہے اور انسانی معاشرے پر اسلامی اصولوں کا اثر مرتب کرنے کے لیے ایک خودمختار اور آزاد اسلامی معاشرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے پاس اسلامی قوانین لاگو کرنے کا اختیار ہو۔ لہٰذا مطالبہ پاکستان کا مقصد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل تھا جس کے پاس اسلامی قوانین نافذ کرنے کا اختیار ہو۔ اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ مسلمانوں کو ایسا معاشرتی ڈھانچہ مہیا کرے جس میں وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں ڈھال سکیں۔

جب 14 اگست 1947 کو پاکستان قائم ہوا تو پہلی قانون ساز اسمبلی نے ملک کے لیے آئین کی تیاری کا کام شروع کیا۔ پہلی آئین ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی جو ان مقاصد پر مشتمل تھی جن پر ملک کا آئین استوار کیا جانا تھا۔ قرارداد مقاصد میں وہ اسلامی اصول بھی شامل تھے جو آئین کا حصہ بنانا تھے۔

پاکستان صرف ایک جغرافیائی وجود نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے جو ایک غیر معمولی اور بے مثل تہذیب و تمدن کو ظاہر کرتا ہے۔ پاکستان کا قیام اسلامی نظریے پر قائم ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہوگا جو تمام اسلامی دنیا کی رہبری و رہنمائی کرے گا۔ اسلام کا بنیادی مقصد بنی نوع انسان کو غلامی کے طوق سے نجات دلا کر اسے مستقل طور پر اللہ کی حاکمیت میں لانا ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے اسلام کی بحالی کی تحریکوں کو شروع کیا اور قیام پاکستان کے لیے جدوجہد آزادی کا آغاز کیا۔

پھر بھی 1947ء سے لے کر 1960ء تک پاکستان میں بننے والی مختلف حکومتوں کی طرف سے ملک کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے نیک نیتی سے کوشش نہیں کی گئی۔ پاکستان کے پہلے دو آئین ان لوگوں نے بنائے جو مغربی ذہن کے مالک تھے۔ اسی بنا پر 1956ء اور 1962ء کے آئینوں میں اسلامی شقیں بہت تھوڑی اور نمائشی تھیں۔

پہلی مرتبہ اسلامی نظام کی خواہش کا اظہار 1956ء کے آئین میں کیا گیا۔ اس نے پاکستان کو اسلامی جمہوریہ بنایا اور سربراہ مملکت ایک مسلمان کو بنایا۔ اس آئین کی رو سے کوئی قانون جو اسلام سے متصادم ہوگا نافذ العمل نہیں ہوگا۔ آئین میں اسلام کو ریاست کا مذہب بنانے کا کوئی ذکر نہ تھا۔

اپنے پیش رو کی طرح 1962ء کے آئین کے ابتدائیہ میں صرف اسلام کا ذکر تھا۔ اسلام کو پاکستان کا مذہب بنانے کا کوئی ذکر آئین میں نہ تھا۔ بعد میں ایک ترمیم کے ذریعے یہ منظور کیا گیا کہ تمام موجودہ قوانین کو قرآن و سنت کی روشنی میں ڈھالا جائے گا۔ 1956ء کے آئین میں مہیا کیئے گئے اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو جاری رکھا گیا اور پاکستان کا نام ''جمہوریہ پاکستان'' مقرر ہوا۔

جنرل ضیاء الحق کی قیادت میں نفاذ اسلام کی کوششیں

(Process of Islamization under General Zia-ul-Haq)

5 جولائی 1977ء کو پاکستان کی ہنگامہ خیز اور پرآشوب تاریخ میں پہلی بار ایک بنیاد پرست جنرل محمد ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں عوامی طور پر منتخب حکومت کو برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کیا۔ ضیاء الحق نے نوے دنوں کے اندر ''اپریشن فیئر پلے'' شروع کرنے کے بعد انتخابات کروانے کے وعدے کے ساتھ اقتدار سنبھالا۔ لیکن بعد میں چند ٹھوس وجوہات نے ضیاء کے نیک نیتی پر مبنی بنیادی تصور میں تبدیلی پیدا کی اور اقتدار میں ان کے قیام کو طویل کر دیا حتیٰ کہ ضیاء الحق ہوائی جہاز کے حادثے میں پراسرار طور پر ساڑھے گیارہ سال حکومت کرنے کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ضیاء الحق کے اقتدار میں طویل عرصے تک رہنے کے بہت سارے عوامل تھے جنہوں نے ضیاء کو نوے دنوں کے پروگرام سے آگے جانے پر مجبور کر دیا۔ سب سے پہلے ضیاء پر اپنے فوجی ساتھیوں کی طرف سے شدید دباؤ تھا جنہیں سول اختیارات کا مزا پڑ گیا تھا اور وہ اقتدار سے زیادہ سے زیادہ دیر تک چمٹے رہنا چاہتے تھے تاکہ وہ سول انتظامیہ اور اقتدار کے مزے لوٹ سکیں۔ دوم جب ضیاء نے بھٹو کو برطرف کر کے اقتدار سنبھالا تو اس وقت بھٹو کے خلاف ٹھوس شواہد موجود تھے جو انہیں اختیارات کے غلط استعمال میں ملوث کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس حقیقت نے فوجی حکومت کو مجبور کیا کہ سب سے پہلے حالات کو معمول پر لایا جائے جس کے لیے کافی وقت درکار تھا۔ تیسرے ضیاء اور ان کے قریبی ساتھی جرنیل اس بات سے خائف تھے کہ اگر بھٹو جیسا ہر دل عزیز اور منتقم مزاج دوبارہ اقتدار میں آ گیا تو وہ بے عزت ہوں گے یا انہیں جیل جانا پڑے اور یا پھر آئین توڑنے کے جرم میں انہیں برطرف ہونا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ضیاء اسلام سے شدید لگاؤ رکھتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان بنیادی طور پر اسلامی ریاست کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ اسلام کی بحالی کا عمل جو کہ 1970ء میں شروع ہوا اور 1977ء کی نظام مصطفیٰ کی پرزور تحریک جس نے پاکستان کے معاشرے میں

زیروبم پیدا کیا' نے ضیاء کو یہ باور کرایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پاکستان کو اسلامی ملک بنانے کے عزم کو پورا کرنے کے لیے چنا ہے۔ لہٰذا ان کے دل میں اپنے ملک کو ایک سچے اسلامی ملک بنانے کا ارادہ پیدا ہوا۔

ضیاء الحق کے حالات زندگی (Personal Life of Zia)

ضیاء الحق 12 اگست 1924ء کو ہندوستان کے شہر جالندھر' مشرقی پنجاب کے ایک متوسط مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اکبر علی ہندوستان کی سول انتظامیہ میں ملٹری اکاؤنٹس کے شعبہ میں جونیئر کلرک تھے۔ اکبر علی کٹر قسم کے مذہبی اور دین دار آدمی تھے۔ آپ ایک سخت قسم کے منتظم اور قدامت پسند مسلمان تھے۔ اکبر علی کی خواہش تھی کہ ان کے ساتوں بچے سچے مسلمان بنیں اور ان کے دل میں اسلامی کی محبت جاگزیں ہو۔ اکبر علی سختی سے اپنے بچوں کو نماز کی پابندی کی تلقین کرتے اور روزانہ یہ زور دیتے تھے کہ ان کے بچے صبح کی نماز کے لیے وقت پر بیدار ہوں۔ ضیاء اور ان کے چھ بہن بھائیوں کو چھوٹی عمر سے ہی قرآن پاک کی تعلیم دی گئی اور انہیں یہ تلقین کی گئی کہ وہ کبھی بھی قرآن پاک میں دیئے گئے اللہ کے الفاظ جو 1400 سال پہلے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے' پر کسی قسم کے شک وشبہ کا اظہار نہ کریں۔

1943ء میں دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج سے میٹرک کرنے کے بعد ضیاء نے ڈیرہ دون ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لیا۔ 1945ء میں بطور لیفٹیننٹ کمشن حاصل کیا اور دوسری جنگ عظیم میں برما' ملائیشیاء اور انڈونیشیا میں خدمات سرانجام دیں۔

سینٹ سٹیفن جیسے مغربی تعلیم دینے والے ادارے میں چند سال گزارنے کے باوجود ضیاء الحق ایک پرجوش بلکہ جنون کی حد تک سچے مسلمان تھے۔ 23 سال کی عمر سے ضیاء ایک ایسی فوج کے آفیسر چلے آرہے تھے جہاں سپاہیوں کو اسلام کی فوجی روایات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ضیاء اس بات پر سختی سے یقین رکھتے تھے کہ جس طرح مستعد رہنے کے لیے جسم کو جسمانی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روحانی تربیت روح کی صحت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک اچھے مسلمان کو روزانہ پانچ وقت نماز ادا کرنی چاہیے۔

1947ء میں ضیاء کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ دہلی سے لاہور تک تھکا دینے اور دم بخود کر دینے والے سفر نے ایک سچے بامقصد اور مذہبی آدمی کے دماغ پر گہرے اثرات مرتسم کیئے۔ ان ہولناک واقعات نے ضیاء کے ذہن میں ان کے یقین کو اور مضبوط کیا کہ مسلمانوں کے لیے آزاد وطن ہونا چاہیے جہاں پر وہ آزادی سے روزگار کما سکیں اور فرقہ واریت کی لعنت سے بچ سکیں۔ آرمی چیف کی حیثیت سے ضیاء الحق نے فوجی جوانوں کے لیے درس کا اہتمام کیا جس میں روزانہ نماز کی ادائیگی اور روزے کی اہمیت پر لیکچر دیئے جاتے تھے۔ انہوں نے جماعت اسلامی کے نمایاں راہنماؤں کو فوجی بیرکوں میں اس طرح کے لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ ضیاء الحق انتہائی حساس دل و دماغ کے انسان تھے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی مذہب سے دوری اور اخلاقی بے راہ روی پر کڑھتے تھے۔ ان کے ذہن میں ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ کسی طرح اپنے پسے ہوئے مجبور ہم وطنوں کی اخلاقی بہتری کے لیے کچھ کر سکیں۔

1977ء میں حزب اختلاف کی نو جماعتوں نے بھٹو کی انتخابات میں دھاندلی کے خلاف تحریک چلائی۔ انہوں نے بھٹو سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا اور نئے الیکشن کروانے پر زور دیا۔ جب بھٹو نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا تو قومی اتحاد نے عام ہڑتال کی جس کی وجہ سے ملک مفلوج ہو گیا۔ مئی 1977ء میں ضیاء نے فوجی افسران کو خط لکھا کہ وہ فوجی پیشہ وارانہ فرائض پر زور دیں اور سیاست کو پیشہ ور سیاست دانوں پر چھوڑ دیں۔ لیکن جولائی 1977ء میں قومی اتحاد کی تحریک سے جب ملک کا نظام درہم برہم ہوا تو سرکردہ فوجی افسران نے ضیاء کو مجبور کیا کہ وہ عارضی طور پر ملک کا نظم ونسق سنبھال لیں تا کہ ملک کو سول جنگ سے روکا جا سکے۔

نفاذ اسلام کے لیے ضیاء کی مہم (Zia's Campaign for Nifaz-i-Islam)

اپنی فوجی حکومت کے شروع ہوتے ہی ضیاء نے اپنے ملک کے لیے اسلامی طریقہ کار پر زور دیا۔ 5 جولائی 1977ء کو جب فوج کا حکومت پر قبضہ مکمل ہوگیا تو ضیاء نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کیا اور کہا کہ ان کا دوہرا مقصد امن عامہ کو بحال کرنا اور نوے دن کے اندر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آزادانہ انتخابات کروانا ہے۔ ضیاء نے کہا کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا اور یہ صرف اسی صورت میں قائم رہے گا جب تک ہم اسلام پر کاربند رہیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ضیاء پہلے حکمران تھے جنہوں نے پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے خلوص دل سے کوشش کی۔ ضیاء کے اقتدار سنبھالنے کے بعد نفاذ اسلام کے لیے ضروری اقدامات اختیار کئے گئے۔ تین فوجی حکومتوں میں سے یہ ضیاء اور ان کے قریبی ساتھی تھے جنہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر اسلام کو حکومت کے اہل کار نیک نیتی سے نافذ کریں تو یہ انتشار زدہ ملک کو اکٹھا کرنے میں مددگار ہوسکتا ہے۔

بھٹو کے روٹی' کپڑا اور مکان کے نعرہ نے مذہبی حلقوں کو جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ ضیاء کی حکومت نے اس نعرے کے خلاف گہری تشویش ونفرت کا اظہار کیا کیونکہ اس نے ایک پسے ہوئے اور بدحال معاشرے میں مادی فائدے کی خواہش کو ابھارہ تھا۔ دوسرے ممالک کے تجربے نے یہ حقیقت اجاگر کی کہ معاشی فوائد کی ہوس سخت طبقاتی جنگ کو فروغ دیتی ہے جو ملک کو متحد کرنے کی بجائے مزید تقسیم کردیتی ہے۔ پاکستان کے عوام باوجود نسلی و علاقائی اختلافات کے اسلام کے ساتھ گہرا لگاؤ رکھتے تھے جسے ضیاء پاکستان میں اپنے پرجوش تشکیل اسلام کے منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ضیاء نے بھٹو کے نعرہ کی پیدا کردہ ہوس کو جڑ سے اکھاڑنے کا فیصلہ کیا جو پاکستان کے سیاسی طور پر خاموش اور اطاعت گذار عوام کے استحصال پر مبنی تھا۔ ضیاء یہ یقین رکھتے تھے کہ عوام کی بہتر معاشی زندگی کی خواہش ان کی حکومت کے اسلام کے لیے بھرپور کوشش کے ذریعے پوری کی جاتی سکتی ہے۔

ضیاء کی اسلام کی خواہش کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ ضیاء شہری علاقوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتے تھے جو کہ نفاذ اسلام کی کوشش میں ضیاء کی بھرپور مدد کرسکتے تھے۔ قومی اتحاد کی بھٹو کے خلاف تحریک زیادہ تر شہری علاقوں میں چلائی گئی تھی۔ اس تحریک میں جماعت اسلامی جیسے سخت بنیاد پرست گروہ شامل تھے۔ اسلامی نظریہ اختیار کرنے سے ضیاء آسانی سے ان طبقوں تک رسائی حاصل کرسکتے تھے جو انہیں شہری علاقوں میں مضبوط بنیادوں پر پاؤں جمانے میں مدد دے سکتی تھی۔

معاشرے میں عورت کی حیثیت کے بارے میں ضیاء کے اندر ایک انوکھی سوچ پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے کسی بھی حکومت نے اسلام کے پیرائے میں عورت کی حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ماضی میں کی گئی تمام اصلاحات شہری مرد سے متعلق تھیں کیونکہ تیسری دنیا میں سیاسی تنظیم کے حوالے سے شہری علاقے اپنی ترقی یافتہ تہذیب وثقافت کی وجہ سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ ضیاء نے اسلامی معاشرہ میں عورت کے مقام کے بارے میں سرسری نظریہ قائم کرلیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کو گھر کی چار دیواری کے اندر محصور رہنا چاہیے۔ ضیاء کے تشکیل اسلامی منصوبے کا محور شہری عورت کے معاشرتی کردار پر تھا۔ لہٰذا ضیاء کے حامیوں کا نعرہ چادر اور چاردیواری یعنی پردہ اور گھر بن گیا۔

اگرچہ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی تھی پھر بھی اشتراکیت کا بھوت ضیاء اور ان کی حکومت کو ڈرانے کے لیے موجود تھا۔ بھٹو نے بنیاد پرستوں کو غیر جانبدار بنانے اور اپنی راہ پر لانے کے لیے اشتراکیت کو اسلامی اصولوں سے ملانے کی کوشش کی اور ''اسلامی سوشلزم'' کا لفظ ایجاد کیا۔ بہرحال خالص اسلامی طبقوں نے اس دام میں آنے سے انکار کردیا۔ ضیاء بائیں بازو عناصر سے ردعمل کی امید رکھتے تھے کیونکہ بھٹو کی پھانسی کی یاد ابھی تک ان کے ذہنوں میں زندہ تھیں۔ لہٰذا ضیاء اشد طور پر کسی دوسرے نظریے کی تلاش میں تھے جو بھٹو

کے ''اسلامی سوشلزم'' کا اثر زائل کر سکے اور لوگوں کی بڑی تعداد کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ ضیاء کے پاس ایک ہی راستہ تھا اور وہ اسلامی نظریہ تھا۔

پیپلز پارٹی کی منتخب حکومت گرانے کے بعد اقتدار سنبھالنے کے پانچ دن کے اندر ضیاء نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا اور CMLA بن گئے۔ فوری طور پر ضیاء نے اسلام کے قانونی نظام کو دوبارہ سے جاری کرنے کا کام شروع کیا۔ انہوں نے انتہائی ایمان داری اور خلوص دل سے نفاذ اسلام کو بھی عملی جامہ پہنانے کے عزم کا آغاز کیا۔

اسلامی سزائیں (Islamic Punishments)

مارشل لاء لگانے کے بعد ضیاء نے شریعت پر مبنی متعدد اسلامی سزائیں جاری کیں۔ ان سزاؤں میں کئی جرائم جن میں قتل، زنا، چوری، شراب پینا، جسم فروشی، کسی پر زنا کا جھوٹا الزام لگانا، حکومت کی جائیداد کو نقصان پہنچانا تھا، کے لیے سرعام کوڑے لگانے کی سزا شامل تھی۔ لوٹ مار اور چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے اور پانچ سال قید کی سزا تھی۔ ان سزاؤں کا مقصد سیاسی مخالفین کو ڈرانا اور جھوٹے مقدمات میں ملوث کر کے سزا دینا تھا۔

ان سزاؤں میں سے سرعام کوڑے لگانے کی سزا پر سب سے زیادہ عمل درآمد ہوا جس کا مقصد قانون شکنی کو روکنا تھا۔ زیادہ تر کوڑے لگانے کی سزائیں گرفتاریوں کے بعد بھٹو کے شہر لاڑکانہ میں دی گئیں۔ 79-1978ء میں ضیاء حکومت نے سیاسی جلسے اور ہڑتالیں کرنے کے جرم میں بہت زیادہ لوگوں کو کوڑے مارنے اور قید کی سزائیں سنائیں۔ یہ ہڑتالیں اور جلسے بھٹو کو دی گئی سزائے موت کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو دی گئیں۔ اس دوران نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو گرفتار کر کے گھر میں قید رکھا گیا۔ وہ 3 اپریل کو پھانسی سے چند گھنٹے پہلے بھٹو سے مل سکیں اور پھانسی کے بعد انہیں بھٹو کا چہرہ دیکھنے کی اجازت نہ دی گئی۔ بھٹو کو نہایت جلدی میں ان کے آبائی گاؤں میں دفن کر دیا گیا۔

ضیاء کی اسلامی سزاؤں پر بہت نکتہ چینی کی گئی اور ان کے خلاف عوام میں گہری نفرت و حقارت پیدا ہوئی۔ بالخصوص ہاتھ کاٹنے کی سزا پر وسیع پیمانے پر نفرت کا اظہار کیا گیا اور اسے انتہائی ظالمانہ، وحشی اور ایذا رساں قرار دیا گیا۔ پاکستان کے تمام ڈاکٹروں نے ہاتھ کاٹنے کی سزا کے حکم پر عمل درآمد سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ انسانی اعضا کاٹنا غیر انسانی، وحشیانہ اور جنگلی اقدام تھا۔ ضیاء کے گیارہ سالہ دور حکومت کے دوران متعدد چوریوں اور ڈاکوں کے باوجود ہاتھ کاٹنے کی ایک سزا پر بھی عمل درآمد نہ ہوا۔

قانون شہادت (Qanun-i- Shahadat)

ضیاء نے چادر اور چار دیواری کے قانون کے بارے میں اپنی انوکھی سوچ پر عمل درآمد کے لیے 1984ء میں مارشل لاء کا ضابطہ جاری کیا جس کی رو سے دو عورتوں کی گواہی چند قانونی معاملات میں ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دی گئی۔ اس قانون کی وجہ سے عورتوں کو کم تر شہری کا درجہ دیا گیا جس کی وجہ سے نہ صرف خواتین بلکہ معاشرے کے تمام باشعور اور وسیع القلب طبقات کے اندر عورتوں کے خلاف اس قدیم اور پسماندہ قانون کے بارے سخت نفرت پیدا ہوئی۔ ضیاء کا یہ قانون پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے میں سخت نزاع کا باعث بنا۔ جب 3 مارچ 1983ء کو مجلس شوریٰ نے یہ قانون اکثریت سے منظور کر لیا تو عورتوں کے اندر شدید تلخی اور حکومت کے خلاف نفرت و حقارت پیدا ہوئی۔

مرد کی برتری ۔ عورتوں کے خلاف اقدامات

(Male Domination - Steps Against Women)

ضیاء کی آئینی اصلاحات قرآن پاک کی روشنی میں مزید واضح کی گئیں جس کا مقصد مرد کی معاشرے میں برتری کو قرآن پاک کی روشنی میں جائز قرار دینا تھا۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ مرد عورتوں کے مالک ہیں کیونکہ اللہ نے ایک کو دوسرے سے بہتر بنایا ہے۔ وہ عورتیں بہتر ہیں جو وفادار اور تابع فرمان ہیں۔ ضیاء حکومت نے مرد کی برتری کو بے لچک اور دینی لحاظ سے قائم کرنے کی کوشش کی۔ 1978ء میں ٹیلی ویژن پر عورتوں کے ناچنے اور گانے پر اس بنا پر پابندی لگا دی گئی کہ اس قسم کے طریقے مسلمانوں کی بجائے ہندووانہ رسم و رواج کا حصہ تھے۔ 1981ء میں عورتوں کی اتھلیٹک ٹیم کو ٹوکیو جانے سے روک دیا گیا کیونکہ وہ مردوں کے سامنے کھیل میں حصہ لیں گی۔ اگلے سال خواتین ڈاکٹروں کو چادر اوڑھنے کا حکم دیا گیا کیونکہ ان کے لیے کوٹ پوری طرح سے شائستہ نہ تھے۔ عورتوں کی بڑی تعداد اور ان کی حکومت کے بڑے اہل کاروں سے عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ دفتروں میں کام کرنے سے روکنے کی بنا پر سخت ناراض تھی۔ بہت ساری عورتوں نے ضیاء کی حکومت کو خواتین اتھلیٹوں کو کھیلوں میں حصہ لینے سے روکنے پر سخت نکتہ چینی کا نشانہ بنایا۔

انتخابات کا التوا (Post Ponement of Elections)

ضیاء نے دو سال کے لیے انتخابات ملتوی کر دیے۔ انہوں نے انتخابات کے التوا کے لیے اپنی طرف سے گڑھے ہوئے اور قائل نہ کرنے والی وجوہات بیان کیں۔ اقتدار سنبھالتے وقت ضیاء نے نوے دنوں کے اندر انتخابات کروانے کا وعدہ کیا تھا۔ ضیاء کا خیال تھا کہ آزادانہ اور جمہوری انتخابات لادین سیاسی نظام کا حصہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا بھٹو کی پھانسی کے چند ماہ بعد ضیاء انتخابات کروانے کے لیے وعدے سے مکر گئے اور 30 اگست 1979ء کو ٹیلی ویژن پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات غیر اسلامی ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلام متعارف کروانا چاہتے ہیں۔ اسلام میں مغربی انتخابات کی کوئی حیثیت نہیں۔ انہوں نے کہا کہ انتخابات پاکستان کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ آج 75% لوگ ان پڑھ ہیں جو اپنے لئے اچھے یا برے میں تمیز نہیں کر سکتے۔

انتخابات ملتوی کرنے کے بعد ضیاء نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر سنسر شپ میں زیادہ سختی کر دی۔ عورتوں سے کہا گیا کہ وہ ٹیلی ویژن پر آتے وقت سادہ لباس پہنیں اور بالکل معمولی سنگھار کریں۔ ضیاء نے بذات خود مغربی لباس ترک کر دیا۔ ان کی اکثر تقاریر اردو میں ہوتی تھیں اور کلام پاک کی تلاوت سے شروع ہوتی تھیں۔ تعلیمی اداروں میں کسی بھی قسم کی تفریح کی سختی سے ممانعت کر دی گئی۔ ضیاء نے جمعہ کو سرکاری طور پر ہفتہ وار تعطیل مقرر کیا۔ موسیقی اور ناچ کی حوصلہ شکنی کی گئی کیونکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھی۔

حدود قوانین (Hudood Laws)

لفظ حد کا مطلب ہے وہ سزا جو اسلام کی روشنی میں مقرر کی گئی ہو۔ 10 جنوری 1979ء کو پانچ حدود آرڈی ننس جو اسلامی سزاؤں سے متعلق تھے نافذ کئے گئے۔ انہوں نے چوری، ڈاکہ زنی، زنا، جھوٹی گواہی اور شراب پینے کے متعلق موجودہ قوانین کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔

وفاقی شرعی عدالت (Federal Shariat Court)

حدود قوانین کے نفاذ کے بعد ہائی کورٹ میں شریعت بنچ اور سپریم کورٹ میں اپیل شریعت بنچ تشکیل دیئے گئے۔ یہ عدالتیں شریعت کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کرتی تھیں۔ سپریم کورٹ میں شریعت عدالتیں بننے کے بعد مقدمات کسی بھی قانون کی حیثیت کو چیلنج کرنے کے لیے پیش کئے جاتے تھے۔

تعلیمی نظام کی نئی سمت میں تنظیم (Re-orientation of the Educational System)

ضیاء کی نفاذ اسلام کی مہم نے ملک کے تعلیمی نظام پر دور رس اثرات مُرتب کئے۔ حکومت نے تعلیمی نظام میں اسلام کی روشنی میں تنظیم نو کے لیے متعدد کمیٹیاں، کمیشن اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ حکومت نے اسلامی مضامین پر کانفرنسوں کا انعقاد کیا۔

تمام انگریزی میڈیم اداروں میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا گیا۔ سی ایس ایس کے امتحانات اور میڈیکل میں داخلے پر ان امیدواروں کو 20 نمبر اضافی دیئے گئے جنہوں نے قران پاک حفظ کیا ہو۔ مطالعہ پاکستان کا مضمون انٹرمیڈیٹ، بی اے / بی ایس سی، میڈیکل، کامرس اور قانون کی تعلیم میں لازمی قرار دے دیا گیا۔

احترام رمضان المبارک آرڈی ننس (Sanctity of the Holy Month of Ramazan)

ضیاء کی حکومت نے نفاذ اسلام کے سلسلے میں ایک اور انقلابی قدم اٹھایا۔ رمضان المبارک کے مہینہ کے دوران صبح طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کھانے پینے کی ممانعت کردی۔ حکومت نے ایک آرڈی ننس جاری کیا جس کی رو سے طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کھلے عام کھانے پینے پر پابندی لگا دی گئی۔ تمام ہوٹلوں اور دکان داروں کو کھانا فروخت کرنے سے منع کردیا گیا۔ جو کوئی کھلے عام کھاتا پیتا ہوا پایا گیا اسے تین مہینے کی سزا اور پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا دی جائے گی۔

نماز کا نظام (Nizam-i-Salaat)

حکومت نے نماز کا نظام نافذ کیا جس کی رو سے لوگوں پر یہ زور دیا گیا کہ وہ نماز پنجگانہ روزانہ ادا کریں۔ ضلعی سطح پر نماز کمیٹیاں قائم کی گئیں جو عوام کو نماز باقاعدگی سے ادا کرنے کی تلقین کرتی تھیں۔ تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں باقاعدگی سے باجماعت نماز ظہر ادا کرنے کے انتظامات کیے گئے۔ تقریباً ایک لاکھ نماز کے وارڈن مقرر کئے گئے جو روزانہ نماز کی ادائیگی کی نگرانی کرتے تھے۔

معاشی شعبہ میں نفاذ اسلام (Islamization of the Economic Sector)

معاشی شعبہ میں بھی اسلام نافذ کرنے کے لیے حکومت نے کئی اقدامات کئے۔ ضیاء الحق زکوٰۃ وعشر کا نظام نافذ کرنے پر بضد تھے۔ حکومت نے 20 جون 1980ء کو زکوٰۃ وعشر کا آرڈیننس جاری کیا۔ یہ قانون مسلمان آبادی کے لیے تھا اور تمام مسلمان اداروں پر لاگو ہوتا تھا۔ مرکز میں زکوٰۃ فنڈ قائم کیا گیا جو ہر قسم کے تحائف و نذرانے جمع کرتا تھا۔ ہر ایک صاحب نصاب مسلمان پر زکوٰۃ دینا لازمی قرار دیا گیا۔ زکوٰۃ بچت بنک کھاتوں پر پہلی رمضان المبارک کو ڈھائی فیصد کے حساب سے کاٹی جاتی ہے۔

عشر وہ ٹیکس ہے جو زرعی زمین پر نقد یا شے کی شکل میں کاٹا جاتا ہے۔ اس آرڈیننس کی رو سے ہر زمیندار کاشت کار کو زرعی زمین کا 10 فی صد پیداواری حصہ حکومت کو عشر ٹیکس کے طور پر دینا ہوتا ہے۔ 948 کلوگرام سے کم پیداوار عشر سے مستثنیٰ ہوتی تھی۔

زکوٰۃ فنڈ میں اکٹھا ہونے والی رقم غریبوں، یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ضلعی کمیٹی اس مقصد کے لیے اپنے اراکین کا تقرر کرے گی جو مستحق افراد کی فہرست تیار کریں گے۔

بہرحال پاکستان کی شیعہ اقلیت نے سختی سے زکوٰۃ اور عشر قانون کے خلاف احتجاج کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ فقہ جعفریہ کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی ہر فرد کا ذاتی فعل ہے۔ اہل تشیع نے اس قانون کے خلاف مظاہرے کئے اور حکومت کو شیعوں پر سے زکوٰۃ ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ حکومت شیعہ۔ سنی منافرت کی وجہ سے دباؤ میں آ گئی اور اہل تشیع کو زکوٰۃ سے مبرا قرار دے دیا گیا۔

ربہ (سود) (Riba)

ربہ کا مطلب ادھار دی گئی رقم پر اضافی رقم حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اسلام میں اس کی ممانعت کی گئی ہے اور اسے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ قرار دیا گیا ہے۔

بلا سود بنک کاری (Interest Free Banking)

پہلی جنوری 1981ء کو بلا سود بنکاری کا نفاذ کیا گیا۔ اس نظام کی رو سے بنک کھاتوں پر مقررہ رقم ادا نہیں کی جاتی بلکہ کھاتہ دار بنک کے نفع و نقصان میں شراکت دار بن جاتا ہے۔ سال کے آخر میں حساب کے مطابق کھاتہ دار کو نفع یا نقصان کے مطابق ادائیگی کر دی جاتی ہے۔

باب نمبر 23

پاکستان اور اسلامی ممالک

(Pakistan and Islamic World)

برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی کی بنیاد اسلامی نظریے پر رکھی گئی تھی جس کا مقصد اسلامی طرز حیات کا تحفظ اور فروغ تھا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنا بھی تھا جو کہ زندگی کے ہر شعبے میں ہندو اکثریت کے تسلط میں زندگی گزار رہے تھے۔ پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا گیا کہ اسے اسلام کا مضبوط قلعہ بنایا جائے اور مسلمانوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا موقعہ فراہم کیا جائے۔

لہٰذا اسلام اور پاکستان ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا اسلام ہمارا اوڑنا بچھونا ہے۔ اسلام ہمارا ملک ہے۔ ان مقاصد کی روشنی میں پاکستان کو اسلامی ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ مشترکہ ثقافت و تہذیب نے بھی پاکستان کو دوسرے اسلامی ممالک کے قریب تر لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان کے دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ قریبی روابط کا جائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

1- پاکستان اور افغانستان (Pakistan and Afganistan)

افغانستان پاکستان کے سرحدی صوبے کے شمال میں واقع ہے۔ پاکستان کے ساتھ اس کی سرحد ملتی ہے اور اس کا رقبہ 251,773 مربع میل ہے۔ آبادی کی اکثریت کٹر روایت پسند سنی العقیدہ مسلمان ہے۔ یہ ایک غریب اور پسماندہ ملک ہے۔

باوجود اس کے کہ افغانستان ایک مسلمان ملک ہے پھر بھی یہ ہمیشہ پاکستان کے خلاف حکمت عملی پر عمل پیرا رہا ہے۔ پاکستان کے عوام کو اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب ایک مسلمان ملک ہوتے ہوئے افغانستان نے پاکستان کی اقوام متحدہ میں شمولیت کی مخالفت کی۔ پھر بھی پاکستان نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان کی اس دشمنی کو نظر انداز کر دیا اور افغانستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات بنانے کی خواہش ظاہر کی۔

حکومت پاکستان نے فروری 1948ء میں افغانستان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ آئی۔آئی۔ چندریگر کو افغانستان میں پاکستان کا پہلا سفیر مقرر کیا گیا۔ افغانستان نے سردار شاہ ولی خاں کو اپنا پہلا سفیر مقرر کیا۔ تعلقات شروع ہونے کے ساتھ اس امید کا اظہار کیا گیا کہ وقت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو فروغ ملے گا۔ دونوں ممالک کے سرکردہ راہنماؤں نے ایک دوسرے کے ملک کے دورے کیے۔ افغانستان کے جشن آزادی میں حصہ لینے کے لیے سردار عبدالرب نشتر کی قیادت میں ایک وفد کابل گیا۔ اسی طرح افغانستان کی سرکردہ مذہبی شخصیت ملا شور بازار نے 1949 میں پاکستان کا دورہ کیا۔

آزادی کے بعد افغانستان ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے پاکستان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ مہم کا آغاز کیا گیا۔ اس مہم کا مقصد پاکستان کو پختونستان کا مطالبہ ماننے پر مجبور کرنا تھا۔ افغانستان نے یہ مہم اپنے دوست ممالک بھارت اور روس کی شہ پر شروع

کی۔ اس وقت سے افغانستان پاکستان کے خلاف مخالفانہ رویہ جاری رکھے ہوئے ہے اور پاکستان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کر رہا ہے۔ 1954ء میں جلال آباد اور قندھار میں پاکستان کے کونسل خانہ پر منظم حملے کیے گئے۔ 1949ء میں افغان حکومت کی شہ پر فقیر آف اپی نے قبائلی عوام کو پاکستان کے خلاف اکسایا جو کہ کامیاب نہ ہو سکا۔ 30 مارچ 1955ء کو جب پاکستان نے ون یونٹ سکیم کا اعلان کیا تو ایک گروہ نے کابل میں پاکستان کے سفارت خانے پر حملہ کیا۔ شرپسندوں نے سفارت خانے کی عمارت کو آگ لگا دی اور متعلقہ ریکارڈ تباہ کر دیا۔ 1959 میں دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے جو 1962ء میں شاہ ایران کی کوششوں سے بحال ہوئے۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحد جسے ڈیورنڈ لائن کہا جاتا ہے' 1813ء میں قائم کی گئی۔ یہ دونوں ممالک کے درمیان بین الاقوامی سرحد ہے جو کہ 2240 کلومیٹر طویل ہے۔ ڈیورنڈ لائن ایک معاہدے کے ذریعے قائم کی گئی تھی جس پر اس وقت کے برطانوی حکومت کے سیکرٹری خارجہ سر مورٹیمور ڈیورنڈ نے دستخط کیے تھے۔

معاہدے میں چند چیزیں برطانوی حکومت اور افغان حکومت کے درمیان طے پائیں۔ معاہدے کی شق II کے مطابق افغانستان حکومت نے ان علاقوں میں جو کہ انڈین علاقے تھے' جو کہ موجودہ پاکستان میں شامل ہیں دخل اندازی نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اسی طرح برطانوی حکومت نے افغان علاقوں پر افغان حکومت کا قبضہ تسلیم کیا۔

لیکن آزادی کے بعد افغانستان کے صدر اور حکمرانوں نے ڈیورنڈ لائن کو افغانستان اور پاکستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً دونوں ممالک کے درمیان تعلقات ڈیورنڈ لائن کی وجہ سے متاثر ہوئے۔ دنیا کے رہنماؤں نے ڈیورنڈ لائن کو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کیا ہے۔

پھر بھی دونوں اطراف سے دو ہمسایہ ممالک کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ دنیا کے رہنماؤں سے دونوں ممالک کے درمیان ٹوٹے ہوئے تعلق کو جوڑنے کے لیے کوشش ہوتی رہی ہے۔

دونوں ممالک کے راہنماؤں نے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کے لیے کوشش کی ہے۔ اگست 1956ء میں صدر پاکستان سکندر مرزا افغانستان کے سرکاری دورے پر گئے اور افغان لیڈروں کے ساتھ دوستانہ ماحول میں بات چیت ہوئی۔ افغانستان کے وزیراعظم سردار داود خان نومبر 1959ء میں پاکستان آئے۔ پاکستان کے وزیراعظم حسین شہید سہروردی نے 1957ء میں افغانستان کا دورہ کیا۔

افغان فرمانروا شاہ ظاہر شاہ 1958ء میں پاکستان آئے۔ ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم پاکستان 1976ء میں افغانستان کے دورے پر گئے۔ دونوں ممالک کے لیڈروں کے دوروں کے تبادلے کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں بہتری آئی۔

1958ء میں افغانستان نے پاکستان سے اپنا تجارتی سامان گزارنے کا ایک معاہدہ طے پایا۔ افغان حکومت نے کئی موقعوں پر معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ افغان وزیر خارجہ شہزادہ نعیم پاکستان کے خلاف بے بنیاد الزامات لگاتے رہے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر پاکستان نے پختونستان کا مسئلہ طے نہ کیا تو افغانستان دوسرے ذرائع استعمال کرے گا۔

افغانستان کے غیر دوستانہ رویے سے مجبور ہو کر پاکستان نے 6 ستمبر 1961ء کو افغانستان کے ساتھ سفارتی تعلقات توڑنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان نے برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ کابل میں ہمارے مفادات کی نگرانی کرے۔ اس کے باوجود پاکستان نے افغانستان کو پاکستان کے ذریعے اپنی تجارتی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دی۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات 23 مئی 1963ء کو تہران میں بات چیت کے بعد بحال ہو گئے۔

افغان بادشاہ شاہ ظاہر شاہ نے پاکستان کے بارے بہتر رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے فراخ دل پالیسی اختیار کی اور پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ 1965ء کی جنگ کے دوران ظاہر شاہ نے کوئی مداخلت نہ کی اور غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کیا۔ بھارت اور روس نے انہیں پاکستان پر حملہ کرنے پر اکسایا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ صدر ایوب خان جنگ کے بعد کابل گئے اور ظاہر شاہ کا غیر جانب دار رہنے پر شکریہ ادا کیا۔ ظاہر شاہ بھی پاکستان آئے اور ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔

7 جولائی 1973ء کو ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور سردار داؤد اقتدار میں آئے۔ سردار داؤد کے اقتدار میں آتے ہی پاکستان کے بارے افغان پالیسی میں یک دم تبدیلی رونما ہوئی۔ سردار داؤد کی حکومت نے پاکستان کے خلاف زیادہ سخت پالیسی اختیار کی۔ وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے بات چیت کے ذریعے اختلافات ختم کرنے کی پیش کش کی۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات بگڑتے رہے۔ اسلامی کانفرنس کے سیکرٹری جنرل جناب حسن التہامی نے اختلافات دور کرانے کی پیش کش کی۔ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو اور سردار داؤد سے بات چیت کی۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے پہل کرتے ہوئے افغانستان کے لیے امداد پیش کی۔ سردار داؤد نے ذوالفقار علی بھٹو کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ اپنے دورے کے دوران ذوالفقار علی بھٹو نے قریبی تعلقات کے فروغ پر زور دیا۔ انہوں نے سردار داؤد کو پاکستان آنے کی دعوت دی جسے سردار داؤد نے قبول کر لیا۔

سردار داؤد 20 اگست 1976ء کو پاکستان کے سرکاری دورے پر آئے۔ ان دوروں کے بعد دونوں ممالک میں دوطرفہ تعلقات میں بہتری آئی۔ سردار داؤد کو قتل کر دیا گیا اور نور محمد ترکئی برسراقتدار آئے۔ نور محمد کو بھی قتل کر دیا گیا جب انہوں نے پاکستان کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی کوشش کی۔ ان کے بعد حفیظ اللہ امین آئے۔ انہیں بھی قتل کر دیا گیا جب انہوں نے پاکستان کے وزیر خارجہ کو افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔

27 دسمبر 1979ء کو روس کی 1,20,000 فوج افغانستان میں داخل ہوئی۔ افغان عوام نے اس شرم ناک جارحیت کی سخت مزاحمت کی۔ بابرک کارمل کو حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ افغان مجاہدین نے اپنے ملک کے دفاع کے لیے جہاد شروع کیا۔ پاکستان نے افغان مجاہدین کی بھرپور امداد کی۔ روسی افواج افغان مجاہدین کی بہادری کا سامنا نہ کر سکی اور بالآخر جنیوا معاہدہ کی رو سے افغانستان سے روسی افواج نکل گئی۔

روسی افواج کے انخلاء کے بعد افغانستان شدید قسم کی خانہ جنگی کا شکار ہوگیا۔ طالبان حکومت اور مشرقی اتحاد کے درمیان لڑائی ہوتی رہی۔ بالآخر طالبان نے حالات پر قابو پالیا۔ طالبان کو اپنی حکومت کو مضبوط کرنے میں پاکستان نے بھرپور امداد کی لیکن طالبان اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے ملک کو صحیح خطوط پر نہ چلا سکے۔ طالبان کا طرز حکومت ظالمانہ اور قدامت پرست تھا جس کی وجہ سے ان کے مغربی دنیا سے تعلقات خراب ہوئے۔

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات ہمیشہ سے دشوار اور مسائل سے دوچار رہے ہیں۔ ان مشکلات میں پختونستان کا مسئلہ اور روسی جارحیت کا پاکستان کے سیاسی و معاشی معاملات پر اثر سرفہرست ہے۔ روسی انخلاء کے بعد پاکستان اور افغانستان کے تعلقات میں کیا تبدیلی آئی یہ بھی دونوں ممالک کے درمیان قائم تعلقات کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ ذیل میں ان حقائق کی تفصیل پیش کی جارہی ہے جو پاکستان۔ افغانستان تعلقات پر اثر انداز ہوئے ہیں۔

پختونستان کا مسئلہ:

سب سے اہم معاملہ جس نے پاکستان کی افغان پالیسی پر دور رس اثرات مرتب کیے ہیں وہ نظریہ پاکستان اور مسلمان ممالک کے ساتھ نزدیکی تعلقات قائم کرنے کی خواہش تھی۔ ایک مسلمان ملک ہوتے ہوئے پاکستان نے تمام اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی ہمیشہ ضرورت سے زیادہ کوشش کی ہے۔ شروع میں ہی پاکستان نے افغانستان کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں سنجیدگی ظاہر کی کیونکہ افغانستان پاکستان کا ہمسایہ تھا اور یہاں پر پختونوں کی وسیع آبادی تھی۔

جب یہ واضح ہوا کہ برطانوی حکمران ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں گے تو 1944ء میں اس وقت کی افغان حکومت نے برطانوی حکمرانوں سے یہ یقین دہانی حاصل کرنا چاہی کہ انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد سرحدی علاقوں کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ چاہیں تو آزاد ہوجائیں یا پھر اپنے آبائی ملک کے ساتھ دوبارہ سے وابستہ ہوجائیں۔ اس کے ساتھ ہی افغان حکومت نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ افغانستان کو بلوچستان کے ذریعے سمندر کے ساتھ راستہ بھی فراہم کیا جائے۔ جوں جوں آزادی کے لمحات قریب آتے گئے افغانستان کی کوشش میں تیزی آتی گئی۔

آزادی کے وقت NWFP میں کانگریس کی حکومت قائم تھی۔ کانگریس حکومت یہ چاہتی تھی کہ NWFP کا ہندوستان سے الحاق ہوجائے لیکن صوبے کے محل وقوع اور آبادی کی ترکیب کی وجہ سے یہ ناممکن تھا۔ ایک معاہدے کے ذریعے صوبے کے عوام کی مرضی جاننے کیلئے استصواب رائے کروایا گیا۔ کانگریس نے یہ کوشش کی کہ عوام کو ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کی بجائے آزادی کو چننے کا اختیار دیا جائے۔ برطانوی حکمرانوں نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ اس موقع پر کانگریس نے یہ شکایت کی کہ NWFP کے اس وقت کے گورنر سر اولف کیرو (Sir Olaf Caroe) مسلم لیگ کے بارے ہمدردانہ سوچ رکھتے ہیں۔ وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن نے فوری طور پر گورنر کو رخصت پر بھیج دیا اور کانگریس کو پندرہ فوجی افسروں کی فہرست پیش کی جن کے ذمے استصواب رائے کروانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

6-17 جولائی 1947ء کو استصواب رائے کروایا گیا جس میں اکثریت نے پاکستان کے حق میں رائے دی۔ عوام کی اکثریت کی پاکستان کے حق میں رائے دہی نے برطانوی حکومت کو مجبور کردیا کہ NWFP کو پاکستان میں شامل کیا جائے۔ پاکستان کے حق میں اکثریت کی رائے کے باوجود افغان حکومت اپنے عدم اطمینان کا اظہار کرتی رہی۔

افغانستان کی طرف سے مسلسل دباؤ کے نتیجے میں دونوں ممالک کے درمیان تناؤ میں شدت آتی رہی۔ آزادی کے بعد پاکستان نے جب اقوام متحدہ کی رکنیت کیلئے عرضی دی تو افغانستان واحد ملک تھا جس نے پاکستان کی اقوام متحدہ کی رکنیت کے خلاف ووٹ دیا۔ نومبر 1947ء میں افغانستان کے بادشاہ کے خصوصی ایلچی پاکستان آئے اور تین مطالبات پیش کیے۔

-1 قبائلی علاقوں کو آزاد اور خودمختار صوبہ بنا دیا جائے۔
-2 پاکستان افغانستان کو سمندر تک رسائی مہیا کرے جس کیلئے کراچی میں آزاد افغان علاقہ قائم کیا جائے یا پھر مغربی بلوچستان کے ذریعے راستہ دیا جائے۔
-3 دونوں ممالک ایک معاہدہ طے کریں جس کے ذریعے کسی ایک ملک پر حملے کی صورت میں دوسرا ملک غیر جانبدار رہے۔

افغانستان کے چاروں طرف سے زمین سے گھرا ہونے کی وجہ سے پاکستان افغانستان کو اپنا مال پاکستانی علاقے سے گزارنے کی سہولت دینے پر آمادہ ہوگیا۔

1948ء میں ایک اور بحران پیدا ہوا جو افغان وزیر دفاع سردار داؤد خان کے ایما پر شروع ہوا جنہوں نے افغانستان کے فوجیوں کو پٹھانوں کے روایتی لباس پہنا کر پاکستان کے قبائلی علاقوں میں در اندازی کے لیے بھیجا۔ مجبوراً پاکستان کو اپنا بارڈر بند کرنا پڑا۔ جب سردار داؤد افغانستان کے وزیراعظم بنے تو پختونستان کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا اور پاکستان افغانستان تعلقات پر برے اثرات رونما ہوئے۔

شروع سے لے کر سوویت جارحیت تک پختونستان کی وجہ سے پاکستان کے افغانستان کے ساتھ تعلقات خراب رہے۔ آزاد پختونستان کے حق میں افغانستان کا واویلا مسلسل تناؤ کا باعث بنا رہا۔ 1950ء کی دہائی کے دوران دونوں ممالک کے درمیان تعلقات خراب رہے۔ برطانوی حکومت کو NWFP افغانستان کو دینے کیلئے رضامند کرنے میں ناکام ہونے پر حکومت افغانستان نے پاکستان کے پختون علاقوں پر مشتمل آزاد پختونستان کی ریاست قائم کرنے کے لیے پر زور مہم کا آغاز کیا۔ پختونستان کے حق میں مہم کو فقیر آف اپی کی حمایت حاصل تھی جنہوں نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دوران کئی قبائلی بغاوتیں کھڑی کیں تھیں۔

حکومت افغانستان کے مسلسل مبالغہ آمیز تشہیر کے باوجود حکومت پاکستان نے افغانستان کے ساتھ دوستانہ رویہ جاری رکھا اور افغانستان کو اپنے تجارتی مال و اسباب کو پاکستان سے گزارنے کی تمام سہولیات بہم پہنچائے رکھیں۔ وزیراعظم پاکستان نے یہ اعلان کیا کہ اگر حکومت افغانستان پاکستان کے خلاف معاندانہ رویہ ترک کردے تو پاکستان اور افغانستان کے درمیان دوستانہ تعلقات کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے۔

1950ء کی دہائی کے دوران دونوں ممالک کے تعلقات میں بہتری نہ آئی۔ 1955ء میں افغانستان نے حکومت پاکستان کی NWFP کو مغربی پاکستان میں ضم کرنے کے منصوبے ون یونٹ کی شدید مخالت کی اور کابل میں وسیع پیمانے پر احتجاجی مظاہرے کیے اور کابل میں پاکستانی سفارت خانے پر حملے بھی کیے۔ پاکستان نے الزام لگایا کہ مظاہروں کے دوران شرپسندوں نے پاکستانی جھنڈے کو پھاڑ ڈالا، سفارت خانے کے عملے کو زخمی کیا اور سفیر کی رہائش گاہ پر حملہ کر کے اسے نقصان پہنچایا۔ یہ بھی کہا گیا کہ حملے کے دوران افغان پولیس نے شرپسندوں کو روکنے کے لیے کوئی احتیاطی اقدامات نہ کیے بلکہ پولیس نے شرپسندوں کی حوصلہ افزائی کی۔

ان حملوں کی وجہ سے حکومت پاکستان کے اہلکار سخت پریشان ہوئے۔ جس کے نتیجے میں پشاور میں افغان کونسل خانے پر حملہ کیا گیا۔ ایک ریڈیو تقریر میں پاکستان کے وزیراعظم نے یہ اعلان کیا کہ افغانستان کی حکومت نے اپنے ظالمانہ طرز حکومت سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے پختونستان کا شوشہ اٹھایا ہے۔ پاکستانی وزیراعظم نے اعلان کیا کہ حکومت پاکستان اپنے داخلی معاملات میں آئندہ کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرے گی۔ انہوں نے مزید اعلان کیا کہ جب تک ہمارے جھنڈے کی توہین اور ہماری عزت نفس کو پہنچائے گئے نقصان کی تلافی نہیں کی جاتی ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ کابل میں کئی دوسرے ممالک کے سفارتی حلقوں نے پاکستانی سفارت خانے پر حملے کی شدید مذمت کی کیونکہ یہ حملہ سفارتی آداب کی خلاف ورزی سمجھا گیا۔ ان حالات کے نتیجے میں پاکستان اور افغانستان کے سفارتی تعلقات منقطع ہوگئے۔ بہرحال بعد میں چند مسلمان ممالک کی کوششوں سے سفارتی تعلقات بحال ہوگئے۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ پاکستان کے مغربی معاہدوں میں شرکت کی وجہ سے سوویت یونین سخت ناراض تھا۔ لہٰذا اس نے پختونستان کے مسئلے پر افغان پالیسی کی حمایت کرنا شروع کردی۔ ایک عالمی طاقت کے اس جھگڑے میں ملوث ہوجانے سے افغانستان اور پاکستان کے تعلقات مزید خراب ہوگئے۔ بیرونی حمایت حاصل ہونے سے افغانستان کی پاکستان کے خلاف مہم میں مزید تیزی آگئی۔ ایوب خان حکومت کے شروع میں روسی وزیراعظم خروشیف نے کابل سے گزرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ پختونستان کے مسئلے کا حل اقوام متحدہ کے چارٹر کے اصول خود اختیاری کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ جلال آباد اور قندھار کے پاکستانی کونسل خانوں کے

اہل کاروں کو مسلسل خوف و ہراس کا نشانہ بنایا جاتا رہا جس کی وجہ سے حکومت پاکستان کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ جلال آباد اور قندھار کے کونسل خانے بند کر دے گی اور کوئٹہ اور پشاور میں افغان تجارتی اداروں کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس کے جواب میں افغان حکومت نے پاکستان کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر لیے اور سرحد بند کر دی۔ پاکستان اور افغانستان میں کشیدہ تعلقات اور دشمنی کا دور اس وقت ختم ہوا جب 1963ء میں سردار داؤد کی حکومت ختم ہوئی۔

پختونستان کے مسئلے کے حوالے سے افغان حکومت عام طور پر چار مختلف دلائل پیش کرتی رہی ہے۔

1- ڈیورنڈ لائن زبردستی اور دباؤ کے تحت قائم کی گئی۔ اگر بغور دیکھا جائے کہ ڈیورنڈ لائن کس طرح قائم ہوئی تو یہ ظاہر ہوگا کہ سرحد قائم کرتے ہوئے انگریزوں کی طرف سے کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا۔ درحقیقت یہ امیر عبدالرحمٰن تھے جنہوں نے سرحدوں کو حتمی شکل دینے کا آغاز کیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے ہی ہندوستان کے باؤنڈری کمیشن کے لیے سر مورٹیمور ڈیورنڈ کا نام تجویز کیا تھا۔ عبدالرحمٰن نے 1893ء میں ڈریونڈ لائن سرحدی معاہدہ طے پا جانے کے بعد اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ ڈیورنڈ معاہدے کی قانونی حیثیت کو بعد میں آنے والی تمام افغان حکومتوں نے تسلیم کیا تھا جس میں امیر عبدالرحمٰن کے بیٹے اور پوتے امیر حبیب اللہ اور امیر امان اللہ بھی شامل تھے۔

2- افغان حکومت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ڈیورنڈ معاہدہ ہندوستان کی برطانوی حکومت اور افغان بادشاہ کے درمیان طے پایا تھا اور چونکہ اب انگریز برصغیر چھوڑ کر چلے گئے ہیں لہٰذا معاہدہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق ختم ہو جانے والی ریاستوں کے معاہدے قائم رہتے ہیں اور اس سلسلے میں تمام حقوق و فرائض آنے والی حکومتوں کو تفویض ہو جاتے ہیں۔

3- افغان حکومت کی تیسری دلیل یہ ہے کہ ڈیورنڈ معاہدہ پر دستخط کے بعد قبائلی علاقے خود مختار اور آزاد تھے۔ اگر یہ دلیل درست تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ افغانستان قبائلی علاقوں اور خیبر پختون خواہ پر مشتمل پختونستان کی آزاد مملکت کے قیام پر کیوں زور دیتا رہا ہے۔ خیبر پختون خواہ کو انتظامی وجوہات کی بنا پر صوبہ بنایا گیا جبکہ قبائلی علاقے حکومت برطانیہ کے مقرر کردہ پولیٹکل ایجنٹ کے تحت چلتے رہے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد بھی یہی صورت حال قائم رہی۔

4- افغانستان کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ پختونستان کے باشندے ایک قوم تھے اور ڈیورنڈ لائن نے ان کو زبردستی دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈیورنڈ لائن ہرگز زبردستی قائم نہ کی گئی تھی۔ یہ عام طور پر قبائلی سرحدوں کے ساتھ چلتی ہے اور ان قبائل کو جو پشاور، کوہاٹ، بنوں، ٹانک اور کوئٹہ کی تجارتی منڈیوں میں جاتے ہیں ان قبائل سے علیحدہ کر دیتی ہے جن کے خورسان کے ساتھ معاشی روابط ہیں اور جن کے کابل، غزنی اور قندھار تجارتی مراکز ہیں۔ صرف مہمند اور وزیری قبائل کا کچھ حصہ تقسیم ہوا۔ اگر افغان حکومت پختونوں کو متحد کرنے میں نیک نیت ہوتی تو یہ ان پختونوں کو بھی ساتھ ملا لیتی جو کہ افغانستان میں رہ رہے تھے۔ افغانستان صرف پاکستان میں رہنے والے پختونوں کو ہی پختون سمجھتا ہے۔ بے شک پختون ڈیورنڈ لائن کے دونوں اطراف میں رہائش پذیر ہیں۔ جب کبھی بھی متحدہ پختون ریاست کے قیام کے لیے رائے شماری کروانے کی بات ہوئی تو افغان حکومت نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور اس خیال کو مسترد کر دیا۔

1973ء میں سردار داؤد نے حکومت کا تختہ الٹ کر خود حکومت سنبھال لی۔ انہوں نے افغانستان کو جمہوریہ بنایا۔ سردار داؤد کے برسر اقتدار آنے کے بعد وقتی طور پر پختونستان کا مسئلہ دوبارہ زندہ ہوا لیکن اس دفعہ یہ مسئلہ اتنی اہمیت حاصل نہ کر سکا جتنی کہ اسے 1950ء کی دہائی میں حاصل تھی۔ 1975ء میں پاکستان کے وزیراعظم کابل کے سرکاری دورے پر گئے اور 1976ء میں سردار داؤد پاکستان کے سرکاری دورے پر آئے۔ ایک سال کے بعد بھٹو کی حکومت کو جنرل ضیا الحق نے فوجی انقلاب کے ذریعے ختم کر ڈالا۔ 1978ء میں سردار داؤد اور ان کے اہل خانہ کو بعد میں آنیوالی کمیونسٹ حکومت نے مار ڈالا۔

افغان روس جنگ۔ پاکستان پر اثر:

1978ء میں افغانستان کا کمیونسٹ انقلاب 1979ء کے آخر تک قائم رہا۔ کمیونسٹ حکومت کا سب سے بڑا مسئلہ دو بڑے گروپوں 'پرچم' اور 'خلق' کے درمیان لڑائی تھی۔ کمیونسٹ حکومت کے آتے ہی دونوں گروپوں کے درمیان اختیارات کی جنگ شروع ہوگئی۔ اس رسہ کشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرچم گروپ کے تمام سرکردہ رہنما جن میں ببرک کارمل بھی شامل تھے حکومت کے تمام اعلیٰ عہدوں سے برطرف ہوگئے۔ ببرک کارمل ڈپٹی وزیراعظم کے عہدے سے برطرف ہوگئے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کچھ عہدوں پر وسطی ایشیا کے فارسی بولنے والے روسی فائز ہوگئے۔ 1978ء کے دوران پرچم پارٹی کے اہلکاروں کو حکومت کے عہدوں سے برطرف کرنے کا عمل جاری رہا جس کی وجہ سے تجربہ کار افرادی قوت کی کمی واقع ہوگئی۔ اس طرح روسیوں پر انحصار زیادہ ہوگیا جس نے پارٹی وفاداریوں کو متاثر کیا۔

انقلاب کے موقع پر افغانستان کا معاشرہ سخت غربت میں مبتلا تھا اور اس کی معیشت انتہائی کمزور تھی۔ ترکئی حکومت کی سماجی و معاشی اصلاحات کو تیز کرنے کی کوششوں نے امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑھا دیا تھا جس کی وجہ سے دونوں طبقے ایک دوسرے سے دور ہوگئے تھے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی مایوسی کی وجہ سے کمیونسٹ اصلاحات پر عمل درآمد نہ ہوسکا اور عوام جنہیں اصلاحات سے فائدہ پہنچنا چاہیے تھا وہ ملک میں کمیونسٹ انقلاب کی مخالفت کرنے لگ گئے۔ اس بدامنی اور بے چینی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حفیظ اللہ امین نے ترکئی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ دسمبر 1979ء میں روسی افواج نے افغانستان پر قبضہ کرلیا اور حفیظ اللہ امین کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

اوپر بیان کیے گئے حالات کے علاوہ کئی دوسرے عوامل نے افغانستان پر روسی حملے کی راہ ہموار کی۔ اول روس کو یہ خدشہ تھا کہ افغانستان میں جاری اسلامی بنیاد پرستی کی لہر افغانستان میں کمیونسٹ حکومت کو ہٹا کر اقتدار پر قابض ہوجائے گی جو کہ روس کی مسلمان ریاستوں کے لیے خطرہ بن جائے گی۔ دوم افغانستان میں مضبوطی سے پاؤں جمانے کے بعد پاکستان اور ایران دباؤ میں آجائیں گے۔ سوم سوویت یونین کی سرحدوں کے اردگرد چھوٹی ریاستوں کی موجودگی جو ٹکراؤ کو روکنے میں مددگار اور روس کی سرحدوں پر بفر ریاست (Buffer States) کا کردار ادا کرسکے نے بھی افغانستان پر روسی حملے کی راہ ہموار کی۔ چوتھا چین اور ویت نام کی جنگ کے دوران روسی کردار نے یہ تاثر قائم کیا تھا کہ سوویت یونین صرف بڑے دوستوں کی مدد کرتا ہے۔ افغانستان کی صورت حال نے اس تاثر کو زائل کرنے کا سنہری موقع فراہم کیا تھا۔ پانچواں افغانستان پر قبضہ روس کی گرم پانی تک رسائی کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا موقع فراہم کرسکتا تھا اور پاکستان اور ایران کے ساتھ امریکی مشکلات کے احساس نے روس کو یہ باور کرایا کہ افغانستان پر قبضہ کرنے کا یہ سنہری موقع تھا کیونکہ امریکہ کے لیے افغانستان تک پہنچنا سخت مشکل تھا۔

امریکہ نے ہر حال میں روس کو افغانستان میں پاؤں جمانے سے روکنے کے لیے اپنی کوششوں کی حمایت میں پاکستان کو راضی کرلیا۔ امریکیوں نے نہ صرف افغانستان میں جاری مزاحمت کی حوصلہ افزائی کی بلکہ افغانستان میں روس کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تمام دنیا سے رضاکاروں کو دعوت دی۔ ویت نام میں روسیوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانے کے بعد امریکن روس کے ساتھ اپنا حساب برابر کرنے کے لیے یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جنگ دس سال تک جاری رہی اور آخرکار 14 اپریل 1988ء کو جنیوا معاہدے پر دستخط ہوجانے کے بعد ختم ہوگئی۔ فروری 1989ء تک روسی افواج اپنے نمائندے نجیب اللہ کو چھوڑ کر افغانستان سے نکل گئیں۔

بے شک روس، افغانستان کی جنگ سے پاکستان سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ پاکستان نہ صرف روس کے خلاف امریکی حکمت عملی کو پورا کرنے کے لیے آلہ کار بنا بلکہ اسے چالیس لاکھ افغان مہاجرین کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑا۔ افغان مہاجرین کی خاصی بڑی تعداد ابھی تک پاکستان میں مقیم ہے کیونکہ افغانستان کے حالات ابھی تسلی بخش نہیں ہیں۔ مسئلہ افغانستان اور بالخصوص افغان مہاجرین کی پاکستان میں موجودگی سے پاکستان کے لیے کئی مسائل پیدا ہوئے ہیں جو پاکستان کے لیے کئی مسائل پیدا کرنے کا سبب ہیں۔ ان مسائل جن میں منشیات اور اسلحے کی بھرمار سرفہرست ہیں نے پاکستان کی خارجہ حکمت عملی، سیاسی، سماجی و معاشی حالات پر گہرے منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔

خانہ جنگی اور طالبان کا عروج:

پاکستان، افغانستان تعلقات کا تیسرا دور روسی فوجوں کے انخلا سے لے کر افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے تک جاتا ہے۔ مئی 1986ء میں میجر جنرل نجیب اللہ نے افغانستان میں ببرک کارمل کی جگہ صدر کا عہدہ سنبھالا۔ چونکہ جنگ کی وجہ سے روسی اموات میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اس لیے روس کے صدر میخائل گورباچوف نے افغانستان کو 'خون بہنے والے زخم' سے تشبیہ دی لیکن فوجی کارروائی نہ روکی۔ جنیوا معاہدے کی رو سے روس نجیب اللہ کو افغانستان کا اقتدار سونپ کر فروری 1989ء میں افغانستان سے مکمل طور پر نکل گیا۔ تقریباً اسی وقت مجاہدین کے گروپوں نے پشاور میں سات پارٹیوں کا اتحاد قائم کیا اور ایک عارضی حکومت (AIG) قائم کرنے کا اعلان کیا۔ نجیب اللہ نے اقوام متحدہ کے تعاون سے انتقال اقتدار کی بھرپور کوشش کی لیکن مجاہدین نے جنہیں فتح کا احساس ہوگیا تھا فوجی حل پر زور دیا۔ نجیب اللہ نے افغانستان سے بھاگ کر ہندوستان میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اپریل 1992ء میں مجاہدین کی فوجوں نے کابل پر چڑھائی کی تو نجیب اللہ نے جان بچانے کے لیے اقوام متحدہ کے دفتر میں پناہ لے لی وہ وہاں چند برس تک قیام پذیر رہے اور بالآخر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

نجیب اللہ کے منظر سے ہٹ جانے سے لے کر طالبان کی آمد تک مجاہدین نے ملک پر حکومت کرنے کے لیے کئی کوششیں کیں۔ 24 اپریل 1992ء کو مجاہدین نے پشاور سمجھوتے پر دستخط کیے جس کی رو سے یہ طے پایا کہ دو ماہ کے لیے مجددی قائم مقام صدر ہوں گے اور اگلے چار ماہ کے لیے ان کی جگہ ربانی لے لیں گے۔ ان چھ ماہ کے بعد شوریٰ حکومت کا چناؤ کرے گی جو اٹھارہ ماہ کے لیے ہوگی جس کے بعد انتخابات کروائے جائیں گے۔ صدر کونسل کو جس میں مجاہدین کی پارٹیوں کے لیڈر شامل ہوں گے جوابدہ ہوگا۔ دو ماہ کے بعد مجددی اقتدار سے دستبردار ہوگئے اور ربانی کو حکومت کی باگ ڈور دے دی۔ ربانی نے شوریٰ کا اجلاس طلب کیا اور اگلے دو سال کے لیے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ مجاہدین کے کئی سرکردہ رہنماؤں نے اس انتخاب کو ماننے سے انکار کردیا جس کے بعد ایک دفعہ پھر خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔

ایک مضبوط افغانستان کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھتے ہوئے پاکستان کے وزیراعظم نوازشریف نے افغانستان کے آپس میں متصادم لیڈروں کے درمیان جھگڑوں کو ختم کروانے کے لیے گفت وشنید کا آغاز کیا۔ مارچ 1993ء میں سب کی رضامندی سے اسلام آباد معاہدہ طے کیا گیا۔ معاہدے پر پاکستان کے وزیراعظم، سعودی شہزادہ ترکی الفیصل اور ایران کے نائب وزیر خارجہ کی موجودگی میں دستخط کیے گئے۔ بدقسمتی سے اس معاہدے کا بھی وہی حشر ہوا جو کہ پشاور معاہدے کا ہوا اور ایک دفعہ پھر افغانستان خانہ جنگی کے گڑھے میں گر گیا۔ اسلام آباد معاہدے کی رو سے ربانی صدر کے عہدے پر قائم رہے لیکن وزیراعظم کا عہدہ حکمت یار کو مل گیا جنہوں نے فوری طور پر احمد شاہ مسعود کو وزیر دفاع کے عہدے سے برطرف کردیا۔ لیکن صدر ربانی نے اس تبدیلی سے اتفاق نہ کیا۔ جنگ کچھ عرصہ جاری رہی۔ ربانی نے کابل پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کیا لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ چونکہ کوئی بھی حتمی طور پر فاتح کی حیثیت میں ابھر کر سامنے نہ آسکا اس لیے خانہ جنگی جاری رہی۔

1994ء میں اقوام متحدہ نے افغانستان میں نیا نمائندہ محمود مستری مقرر کیا جنہوں نے قیام امن کے لیے گفت وشنید کا ایک بار پھر آغاز کیا۔ انہوں نے جنگ بندی کے لیے اپنی تجاویز پیش کیں جس میں غیر جانب دار سیکورٹی فورسز کا قیام اور لویا جرگہ کے نمائندے کو درمیانی عرصے کے لیے حکومت بننے تک نگرانی کا کام سونپا جانا تھا۔ اکتوبر 1994ء میں طالبان جو اب تک ایک نامعلوم گروپ تھا قندھار پر قبضہ کر لینے سے نمودار ہوا۔ اگلے دو سالوں کے دوران طالبان نے افغانستان کے بہت سارے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور ستمبر 1994ء میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ کابل پر قبضہ کر لینے کے بعد طالبان نے فوری طور پر نجیب اللہ کو ہلاک کر دیا۔ اکتوبر 1996ء میں ربانی نے کریم خلیلی جو حزب وحدت اور جنرل دوستم کے ایک سرکردہ راہنما تھے کے ساتھ طالبان کے مخالف اتحاد قائم کر لیا۔

نجیب اللہ حکومت کے ختم ہو جانے کے بعد افغانستان میں 96-1992ء کے دوران قیادت کا شدید بحران پیدا ہوا جس کی وجہ سے پچاس ہزار سے زائد افغان باشندے مارے گئے۔ ملک میں جاری خانہ جنگی اور انتشار سے تنگ افغان عوام کسی بھی گروپ کی حمایت کے لیے تیار ہو گئے جو ملک میں امن اور استحکام پیدا کر سکتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ طالبان سیاسی عدم استحکام اور خانہ جنگی سے بیزاری و مایوسی کی پیداوار تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ طالبان جنہیں حکومت کا تجربہ نہ تھا اور قدامت پسند تھے جلد ہی افغان باشندوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور 1997ء تک افغانستان کے 90% علاقے پر قبضہ کر لیا۔

طالبان 1994ء میں بحیثیت ایک طاقت ور گروپ افغانستان میں ظاہر ہوئے۔ بنیادی طور پر طالبان افغانستان کی عارضی حکومت کی غیر مقبولیت اور خانہ جنگی کی پیداوار تھے۔ خانہ جنگی کے دوران جتنے افغان ہلاک ہوئے اتنے روس کے خلاف جنگ میں بھی نہیں مرے۔ چونکہ صدر ربانی کی حکومت پاکستان کے خلاف ہو گئی تھی لہٰذا پاکستان نے نہ صرف طالبان حکومت کے فروغ کو خوش آمدید کہا بلکہ انہیں قدم جمانے اور اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے عمل میں ان کی بھرپور مدد بھی کی۔ شروع میں تو طالبان نے پاکستان سے حکومت کے کاموں میں مدد طلب کی لیکن جب ایک دفعہ وہ حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے اور مضبوطی سے قدم جما لیے تو پھر انہوں نے اپنی حیثیت پر زور دینا اور اکثر پاکستان کی رائے کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی پاکستانی حکام اور بالخصوص اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے کے ساتھ عدم تعاون و بے لچک مذہبی خیالات اور بین الاقوامی دہشت گردی میں ملوث ہونے کی وجہ سے پاکستان طالبان سے بدظن ہو گیا۔

ایک دفعہ افغانستان کے وسیع علاقے پر قبضہ کر لینے کے بعد طالبان حکومت نے اپنے اسلامی نظریات کے مطابق وہ اصلاحات نافذ کرنا شروع کر دیں جو ان کے مطابق افغانستان کے لیے موزوں تھیں۔ طالبان کے عورتوں کے کام کرنے پر پابندی جیسے ظالمانہ اقدامات کی وجہ سے ان کی حکمت عملی کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوا۔ پھر بھی یہاں ذکر کرنا ضروری ہے کہ طالبان ملک میں امن و امان قائم کرنے، افغان معاشرے کو ہتھیاروں سے پاک کرنے، جنگجو سپہ سالاروں کو ملک سے نکالنے، قیادت کے خلا کو پر کرنے عوام کو تحفظ کا احساس مہیا کرنے، منشیات کی پیداوار کو روکنے اور مرکزی حکومت کے نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن پھر بھی انسانی حقوق کی خلاف ورزی بالخصوص افغان خواتین کے حقوق کی پامالی کی وجہ سے بین الاقوامی برادری کی طرف سے طالبان کو شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔

1996ء سے اقوام متحدہ افغانستان میں قیام امن کے لیے کوششیں کر رہی تھی۔ اقوام متحدہ کی کوششوں اور خصوصی نمائندوں کی دلچسپی سے طالبان اور شمالی اتحاد کے نمائندے جو شمالی علاقے کے چھوٹے سے علاقے میں برسر پیکار تھے اسلام آباد میں امن مذاکرات کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مذاکرات میں افغانستان میں اقوام متحدہ کے مندوب، اسلامی کانفرنس کے اسسٹنٹ سیکرٹری اور پاکستان کے وزیر خارجہ نے بھی شرکت کی۔ لیکن مذاکرات کوئی مثبت نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہے اور دونوں متحارب گروپ اپنے

اختلافات ختم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اگست 1998ء میں طالبان نے مزار شریف پر قبضہ کرلیا جو کہ شمالی اتحاد کا مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی طالبان کے طرز عمل میں سختی آ گئی اور مزار شریف میں موجود ایرانی سفارت کار کو قتل کر دیا گیا۔ ایرانی سفارت کے قتل کی وجہ سے بین الاقوامی برادری میں سخت ردعمل پیدا ہوا۔ حکومت پاکستان کی سفارت کاروں کے قتل کو روکنے کی انتہائی کوشش کے باجود ایران نے سفارت کار کے قتل کی ذمہ داری پاکستان اور طالبان پر ڈال دی۔ 22 ستمبر 1998ء میں افغانستان کے چھ ہمسایہ ممالک پاکستان، ایران، ازبکتان، چین، ترکمانستان اور تاجکستان نے امریکہ اور روس کے ساتھ مل کر اقوام متحدہ کی زیرنگرانی مزار شریف میں ہلاکتوں کے بارے میں چھان بین کرنے کے لیے ایک وفد بھیجا۔ اس وفد نے ایک قرار داد منظور کی جس میں طالبان اور دوسری جماعتوں کے درمیان گفت وشنید پر زور دیا گیا اور ساتھ ہی افغانستان کو دہشت گردوں کو پناہ دینے سے منع کیا گیا جس کا اشارہ واضح طور پر اسامہ بن لادن کی طرف تھا۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کی سیکرٹری جنرل کے خصوصی نمائندے لکھدر براہیمی نے ایران، افغانستان کا دورہ کیا اور قیام امن کے لیے اتفاق رائے حاصل کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوسکی۔

افغانستان کے اقوام متحدہ سے عدم تعاون اور سلامتی کونسل کی قرار داد پر عمل درآمد سے انکار کی وجہ سے اقوام متحدہ کے نمائندوں کے طرز عمل میں سختی آ گئی۔ جب طالبان نے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کردیا تو پاکستان کے لیے سخت مشکلات پیدا ہوگئیں کیونکہ پاکستان کے لیے اقوام متحدہ کی قرار دادوں پر عمل درآمد کرنا ضروری تھا۔ جب ملا عمر نے افغانستان میں پناہ لینے والے مجرموں کو پاکستان کے حوالے کرنے سے انکار کردیا تو پاکستان کی مایوسی اور ناراضگی میں اور اضافہ ہوا۔

Twin Towers پر حملے نے امریکیوں کو سخت ناراض کردیا جنہوں نے اس کی ذمہ داری اسامہ بن لادن پر ڈال دی۔ امریکیوں نے اس حملے کا بدلہ لینے کے لیے افغانستان پر حملے کا فیصلہ کیا۔ حملے سے پہلے امریکہ کے صدر نے معلومات کی فراہمی، نقل و حمل کی سہولیات اور پاکستان کی فضائی حدود کے استعمال کے لیے مدد طلب کی۔ حقائق کی روشنی میں اور امریکہ کی بے پناہ فوجی طاقت اور افغان حکمرانوں کے عدم تعاون کی وجہ سے سخت سے سخت قدم اٹھانے کی صلاحیت کے پیش نظر پاکستان نے امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ اور طالبان حکومت کے خلاف امریکہ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کا فیصلہ کیا۔ اس طرح پاکستان ایک دفعہ پھر صف اول کی ریاست بن گیا۔ پاکستان کے حکمرانوں نے وہ راستہ اپنایا جو ملک کے لیے بہتر تھا۔

اپنی سرحد کو محفوظ کرنے، طالبان کے ساتھ قریبی تعلقات اور افغانستان میں دوستانہ حکومت کا قیام پاکستان کی لگاتار کوششوں کا نتیجہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد افغانستان کے ساتھ تعلقات صحیح بنیادوں پر استوار نہ ہوسکے تھے۔ افغانستان کو تجارتی راہداری مہیا کرنے اور افغانستان کی زیادہ سے زیادہ مدد جس میں چالیس لاکھ افغان پناہ گزینوں کو پناہ دینا بھی شامل ہے کے باوجود باہمی تعلقات مسائل کا شکار رہے ہیں۔ لہٰذا افغانستان میں موافق طالبان حکومت کی موجودگی پاکستان کی مغربی سرحدوں کے تحفظ کا موقع فراہم کرتی تھی۔ طالبان اپنے فروغ کے شروع کے چند سالوں کے دوران پاکستان کے مشورے پر غور کرتے رہے لیکن جوں ہی انہوں نے اپنی حیثیت کو مستحکم کرلیا اور مزار شریف کو فتح کرلیا تو انہوں نے پاکستان کے مشوروں کو نظر انداز کرنا شروع کردیا۔ 9/11 کے حملوں سے پیشتر پاکستان کی کسی کوشش کا طالبان پر کوئی اثر نہ تھا۔ طالبان نے انتہائی رعونت کے ساتھ پاکستان کے ہر دوستانہ مشورے کو پس پشت ڈالنا شروع کردیا جس میں ایرانی سفارت کار کے قتل کو روکنا، بامیان میں مہاتما بدھ کے مجسمے کو مسمار کرنے سے منع کرنا اور ہندوؤں کو زبردستی علامتی نشان پہننے پر مجبور کرنے سے باز رکھنا شامل ہے۔ سال 2001ء کے دوران طالبان نے پاکستان کی ان مجرموں کو حوالے کرنے کی درخواست ٹھکرا دی جو پاکستان میں جرائم میں ملوث ہونے کے بعد افغانستان میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ طالبان کی بے لچک حکمت عملی کی وجہ سے پاکستانی حلقوں میں سخت مایوسی پیدا ہوئی اور حکومت پاکستان اپنی طالبان کی مدد کرنے کی پالیسی پر پچھتاوے کا شکار ہوگئی۔

9/11 اور دہشت گردی کے خلاف جنگ:

11 ستمبر 2001ء کے دہشت گرد حملوں کی وجہ سے افغانستان بین الاقوامی برادری کی نظروں میں آ گیا۔ جب طالبان حکومت نے اسامہ بن لادن اور ان کے القاعدہ کے کارندوں کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کردیا تو امریکہ کی قیادت میں بین الاقوامی اتحاد نے افغانستان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ امریکی اتحاد نے سال 2001ء کے اواخر میں طالبان کو اقتدار سے بیدخل کردیا لیکن بین الاقوامی اتحاد کی کمزور حکمت عملی کی وجہ سے طالبان کو مکمل طور پر پسپا نہ کیا جاسکا۔ دسمبر 2001ء کی بون کانفرنس میں افغانستان کی بحالی اور سیاسی عمل کے لیے لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اپنی 1386 قرارداد کے ذریعے ایک بین الاقوامی حفاظتی فورس (ISAF) تشکیل کی جس کے ذمے افغانستان کی عارضی حکومت کی کابل اور گردونواح میں امن اور تحفظ کے قیام کے لیے مدد کرنا تھا۔ اس وقت سے ISAF امن و امان بحال کرنے کی کوشش کررہی ہے لیکن تاحال وہ مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوسکی۔ اس ناکامی کی تین وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اول طالبان نے اپنے آپ کو دوبارہ سے منظم کرلیا ہے اور ان کی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی ہے۔ دوم منشیات کا کاروبار نہ صرف تیزی سے بڑھ رہا ہے بلکہ افغانستان کی سیاسی و تجارتی صورت حال کا لازمی جزو بن چکا ہے۔ افغانستان کی معیشت میں منشیات GDP کا 50-60 فیصد حصہ ہے جبکہ تمام دنیا کی 80% ہیروئن افغانستان سے آتی ہے۔ سوم مقامی جنگجو سردار جو تیزی سے وفاداریاں بدلنے میں مشہور ہیں نہ صرف انسانی حقوق کی پامالی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں بلکہ بہ یک وقت کابل میں حکومت اور طالبان باغیوں کے ساتھ تعلق رکھے ہوئے ہیں۔

بین الاقوامی اتحاد میں حصہ لینے کے نتیجے میں پاکستان کو اندرونی اور بیرونی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اندرونی طور پر پاکستان کی معاشی حالت بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے اور اس کے ساتھ پاکستانی معاشرہ دو واضح گروپوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے جس سے اندرونی طور پر امن و امان کی صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ چند ہفتوں کے دوران پاکستان کے بڑے شہروں میں دہشت گردی کے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ دہشت گردوں نے پاکستانی عوام کے خلاف وحشیانہ جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ انہوں نے بے گناہ شہریوں کو بے دردی سے ہلاک کیا، غیر ملکی باشندوں کو قتل کیا اور عبادت گاہوں کے تقدس کو پامال کیا۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے پاکستان کے تصور کو بین الاقوامی سطح پر شدید جھٹکا لگا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جارہا ہے کہ پاکستان نے دباؤ کے تحت بین الاقوامی اتحاد میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن پاکستان نے اس تاثر کو رد کردیا ہے اور کہا کہ بین الاقوامی اتحاد میں شامل ہونے کی ہماری اپنی وجوہات تھیں کیونکہ پاکستان مسلسل دہشت گردی کا شکار رہا ہے۔ صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز پر قاتلانہ حملے کیے گئے۔ ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے حکومت نے تین نکاتی حکمت عملی اپنائی جو کہ دہشت گردوں کے خلاف براہ راست اقدام، ان کے نیٹ ورک اور مددگاروں کے متعلق معلومات کا حصول اور دہشت گردی کی وجوہات پر مشتمل ہے۔

پاکستان پر یہ الزام کہ وہ دہشت گردوں اور طالبان باغیوں کی مدد کررہا ہے بالکل بے سروپا اور احمقانہ ہے۔ جب سے پاکستان نے طالبان سے اپنا تعلق ختم کیا ہے اس نے اپنے دوستوں اور ہم خیال حلقوں گروپوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی ہرممکن کوشش کی ہے۔ پاکستان کے حکام نے قبائلی سرحدوں پر مشکلات کے باوجود باغیوں کے خلاف موثر کارروائی کی ہے اور ان علاقوں میں فوج بھیجی ہے جو کہ ناقابل تسخیر سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ حکومت پاکستان نے کئی ایسے ترقیاتی منصوبے بھی شروع کیے ہیں جو قبائلی علاقوں میں زندگی کی سہولیات بہم پہنچانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

حکومت پاکستان کی مخلصانہ کوششوں کو سراہنے کی بجائے افغانستان نے ہمیشہ پاکستان پر دہشت گردوں اور طالبان باغیوں کو مدد دینے کے الزامات لگائے ہیں۔ افغان حکام یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ پاکستان باغیوں پر کنٹرول کرسکتا ہے لہٰذا اسے اس سلسلے میں مدد سے زیادہ تعاون کرنا چاہیے۔ افغانستان کے صدر حامد کرزئی کئی موقعوں پر پاکستان پر افغانستان کے اندرونی معاملات میں زیادہ دخل اندازی کے الزامات لگا چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس ستمبر 2006ء میں شرکت کرتے ہوئے حامد کرزئی نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران صدر مشرف پر یہ الزام لگایا کہ وہ طالبان کی پشت پناہی کررہے ہیں اور کہا کہ صدر مشرف نے 'سانپ' پال رکھے ہیں جو واضح طور پر طالبان کی طرف اشارہ تھا۔صدر مشرف نے حامد کرزئی کے اس سفارتی آداب کے منافی بیان پر اپنا ردعمل یوں ظاہر کیا اور کہا کہ حامد کرزئی اپنے ملک کے اندرونی حالات پر توجہ دیں۔ صدر مشرف نے کہا کہ حامد کرزئی ایک ''شتر مرغ'' کی طرح اپنے ملک کے اندرونی حالات سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔ صدر مشرف نے 24 ستمبر 2006ء کو نیویارک میں اپنے ایک بیان میں یہ واضح کیا کہ افغانستان کے مسائل ان کے اپنے پیدا کیے ہوئے ہیں اور صدر حامد کرزئی کو اپنے ملک کی صورت حال کا نہ تو ادراک ہے اور نہ انہیں اپنے ملکی حالات پر دسترس حاصل ہے۔ صدر مشرف نے یہ کہا کہ پاکستان دہشت گردی اور طالبان کے خلاف پورے خلوص دل سے برسر پیکار ہے اور مستقبل میں بھی ہمارا یہی کردار ہوگا۔

افغانستان کے پاکستان کے خلاف بے سروپا الزامات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ افغان حکام کو تاریخی پس منظر، اپنے ملک کے سماجی حالات، جغرافیائی محل وقوع اور پاکستان کی مخلصانہ کوششوں کا ذرہ بھر بھی علم نہیں ہے۔

حقیقت میں پاکستان اور افغانستان کی سرحد کی وجہ سے افغان حکام پاکستان کے خلاف الزامات لگا رہے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ در انداز پاکستان کی سرحد سے افغانستان میں داخل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان حکام کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے نہ صرف افغانستان کے ساتھ معلومات کے تبادلہ کا نظام شروع کیا ہے بلکہ انہوں نے در اندازی روکنے کے لیے ستر ہزار پاکستانی فوج بھی قبائلی علاقوں میں تعینات کی ہے۔ ان الزامات کے جواب میں پاکستان نے یہ الزام لگایا ہے کہ دراصل افغانستان میں ہندوستان کے قونصل خانے پاکستان کے خلاف اس گندی مہم میں ملوث ہیں۔ افغانستان میں بھارتی قونصل خانوں کا وسیع تعداد میں قائم ہونا پاکستان کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ پاکستان کے کچھ تجزیہ نگاروں کا یہ خیال ہے کہ بھارت اپنے قونصل خانوں کے ذریعے افغانستان میں پاکستان کے خلاف سرگرمیوں کو ہوا دے رہا ہے۔

پاکستان کی طرف سے افغانستان کی نئی حکومت کے ساتھ دوستی اور بھائی چارے کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے اور بہتر تعلقات کے فروغ کے لیے کوشش کی ہے۔

2- پاکستان اور بنگلہ دیش (Pakistan and Bangladesh)

نظریاتی طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش ایک ملک کے دو حصے تھے۔ موجودہ بنگلہ دیش دسمبر 1971ء سے پیشتر پاکستان کا مشرقی حصہ تھا جو کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت میں معرض وجود میں آیا۔ بنگلہ دیش کا قیام بھارت کے اس گھناؤنے منصوبے کا حصہ تھا جو اس نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لیے شروع ہی سے بنا رکھا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی نظریہء پاکستان کے لیے عظیم دھچکا تھی۔ بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے یہ اعلان کیا کہ بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ہی دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں ڈبو دیا گیا ہے۔

بدقسمتی سے 1970ء کے عام انتخابات کے بعد ایسی سیاسی جماعتیں طاقت ور بن گئیں جو کہ علیحدگی کی خواہش مند تھیں اور متحدہ پاکستان کے مخالف تھیں۔ ان جماعتوں نے بجائے قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے علاقائی اور صوبہ پرستی کو فروغ دیا اور حالات کو

بے قابو کر دیا۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد مشرقی پاکستان کی قیادت علیحدگی پسندوں کے ہاتھ میں رہی جنہیں مشرقی پاکستان کے مقامی رسم و رواج اور ثقافتی اقدار کا بالکل علم نہ تھا۔ ان علیحدگی پسندوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی فضا کو پراگندہ کر دیا اور نوجوان طلباء کے ذہنوں میں زہریلا مواد بھر دیا۔ درحقیقت بنگلہ دیش کا قیام اس زہریلے پرچار کا نتیجہ تھا جو علیحدگی پسند اور ہندوؤں کے حامی اساتذہ تعلیمی اداروں میں پھیلاتے رہے ہیں۔

جب لڑائی ختم ہوئی تو پاکستان اور بنگلہ دیش نے حالات کا جائزہ لیا اور ٹوٹے ہوئے تعلق کو پھر سے جوڑنے کے لیے کوششیں شروع کیں۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے 1974ء کی لاہور میں اسلامی کانفرنس ملاقات کے دوران بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ بھٹو نے اسلامی ممالک کی خواہش کے پیش نظر بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم کیا۔ حکومت کے تسلیم کیے جانے کے بعد بنگلہ دیش کے پہلے وزیراعظم مجیب الرحمٰن کی قیادت میں اسلامی کانفرنس میں بنگلہ دیش کا وفد شامل ہوا۔

بنگلہ دیش سے تعلقات قائم کرنے کے بعد وزیراعظم بھٹو بنگلہ دیش گئے۔ لیکن بھارت کے ایماء پر شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان سے تعلقات قائم کرنے میں پرخلوص نہ تھے۔ حکومت بنگلہ دیش نے اثاثوں میں اپنا حصہ مانگا لیکن خود کوئی ذمہ داری قبول نہ کی۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت کا تختہ 15 اگست 1975ء کو الٹ دیا گیا۔ شیخ مجیب اپنے انجام کو پہنچ گئے جنہیں قتل کر دیا گیا۔ ان کا المناک انجام اس بات کا ثبوت ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام ان کے بھارت نواز طریقے کو پسند نہ کرتے تھے اور پاکستان کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنا چاہتے تھے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی موت کے بعد خوندکر مشتاق برسراقتدار آئے۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے فوری طور پر ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ دوستی کی علامت کے طور پر پاکستان نے کپڑا اور پچاس ہزار ٹن چاول کا نذرانہ پیش کیا۔

دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کرنے کے لیے بات چیت کا آغاز ہوا۔ جناب خورشید احمد کو پاکستان کا پہلا سفیر مقرر کیا گیا۔ بنگلہ دیش نے جناب ظہیر الدین کو اپنا پہلا سفیر مقرر کیا۔

23 جنوری 1976ء کو بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے مواصلاتی رابطہ قائم کیا گیا۔ 13 فروری 1976ء کو راولپنڈی اور ڈھاکہ کے درمیان ٹیلی فون اور ٹیلی پرنٹر رابطے کا آغاز کیا گیا۔ اس معاہدے کی وجہ سے دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب تر آ گئے۔ 24 جولائی 1976ء کو ایک اور معاہدہ طے پایا جس سے بنکنگ اور جہاز رانی کے وفود کے تبادلے کا فیصلہ ہوا۔

خوندکر مشتاق کی حکومت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور 1977ء میں ان کی جگہ جنرل ضیاء الرحمان کی حکومت قائم ہوئی۔ جنرل ضیاء الرحمان پاکستان کے سرکاری دورے پر آئے مگر جنرل ضیاء الرحمان کو 1981ء میں قتل کر دیا گیا۔ جسٹس عبدالستار حکومت میں آئے جنہیں جنرل حسین محمد ارشاد نے برطرف کر دیا۔

21 جولائی 1979ء کو مشترکہ معاشی کمیشن قائم کیا گیا جس کا مقصد مشترکہ معاشی کوششوں کا فروغ تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کمیشن کا سال میں ایک اجلاس ہوگا۔

بنگلہ دیش نے بین الاقوامی سیاست میں پاکستان کی بھرپور حمایت کی ہے۔ جب دسمبر 1979ء میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں تو بنگلہ دیش نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ صدر ضیاء الرحمان نے اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کی میٹنگ بلائی اور پاکستان کے موقف کی حمایت کی گئی۔ دونوں ممالک نے تعلیم کے میدان میں ایک دوسرے سے تعاون کا فیصلہ کیا۔

مشترکہ وزارتی کمیٹی کی میٹنگ 8 ستمبر 1984ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوئی جس میں بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان تجارت بڑھانے پر غور ہوا۔ بنگلہ دیش نے پاکستان کو چائے' پٹ سن اور قالین برآمد کرنے کی پیش کش کی اور پاکستان سے چاول' ریلوے کی بوگیاں اور فولاد کی مصنوعات درآمد کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

8 نومبر 1984ء کو دونوں ممالک کے وزرائے اطلاعات کے درمیان یہ طے پایا کہ قومی خبر رساں اداروں کے نمائندوں کا تقرر کیا جائے۔ اس سلسلے میں پاکستان سے APP اور بنگلہ دیش سے PSS کا تقرر کیا گیا۔

جنرل پرویز مشرف کے اقتدار سنبھالنے کے بعد بنگلہ دیش کے ساتھ تعلقات کے فروغ کے لیے کوششیں کی جارہی ہیں۔ دونوں ممالک ایک دوسرے سے نزدیکی تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔

3۔ پاکستان اور انڈونیشیا (Pakistan and Indonesia)

انڈونیشیا جزائر شرق الہند کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ انڈونیشیا مختلف سائز کے 13000 جزائر پر مشتمل ہے جو کہ آسٹریلیا اور فلپائن کے درمیان واقع ہیں۔ موجودہ دور میں انڈونیشیا کی آبادی 16 کروڑ ہے اور یہ دنیا کا سب سے بڑا مسلمان ملک ہے۔ اس کا کل رقبہ 788662 مربع میل ہے۔ ملک 27 صوبوں میں منقسم ہے اور اس کا دارالخلافہ جکارتہ ہے۔

مارچ 1942ء تک انڈونیشیا ہالینڈ کی نوآبادی تھا۔ 1942ء سے 1945ء تک یہ جاپان کے زیر تسلط رہا۔ 1945ء میں جب ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرنے سے جاپان کو شکست ہوگئی تو انڈونیشیا کے قوم پرستوں نے ڈاکٹر احمد سوئیکارنو اور ڈاکٹر ہتہ کی زیر قیادت 17 اگست 1945 کو انڈونیشیا کو ایک جمہوریہ قرار دیا اور اس طرح ملک بیرونی تسلط سے آزاد ہوگیا۔ انڈونیشی قوم پرستوں اور ہالینڈ کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو چار سال تک جاری رہی۔ جنگ قوم پرستوں اور ہالینڈ کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے 2 نومبر 1949ء کو ختم ہوگئی جس کی وجہ سے پورے انڈونیشیا پر قوم پرستوں کا تسلط قائم ہوگیا۔

27 دسمبر 1949ء کو ڈاکٹر احمد سوئیکارنو بطور صدر کی قیادت میں پہلی حکومت قائم ہوئی۔ 15 اگست 1950ء کو جمہوریہ انڈونیشیا معرض وجود میں آئی۔

پاکستان اور انڈونیشیا کے درمیان تعلقات پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے قبل قائم تھے۔ دونوں قوموں کے درمیان تعلقات کی ابتداء اس وقت ہوئی جب انڈونیشیا نے مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح کو اپنی جدوجہد آزادی میں مدد کرنے کی درخواست کی۔ قائداعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو انڈونیشیا کی جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے لیے کہا۔ قائداعظم نے انڈونیشی بھائیوں کے شانہ بہ شانہ لڑنے کے لیے 600 سپاہی بھیجے۔ حکومت انڈونیشیا نے ان چھ سو سپاہیوں کی بہادری کے کارناموں کو ایک کتاب میں محفوظ کرلیا جس کا نام ''پاکستان کے چھ سو بہادر سپاہی'' ہے۔ "The Six Hundred Brave Pakistani Soliders"

پاکستان نے انڈونیشیا کی جدوجہد آزادی میں ہر ممکن امداد کی۔ جب 1948ء میں ہالینڈ نے انڈونیشیا پر حملہ کیا تو پاکستان نے اس جارحیت کی سخت مذمت کی اور ہالینڈ کی ہوائی کمپنی KLM کا لائسنس منسوخ کردیا۔ پاکستان نے اقوام متحدہ میں بھی انڈونیشیا کے حق میں آواز بلند کی۔ جب 1949ء میں انڈونیشیا کو آزادی ملی تو پاکستان نے فوری طور پر اسے تسلیم کرلیا۔

1950ء میں صدر سوئیکارنو پاکستان کے سرکاری دورے پر آئے۔ انہوں نے پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان سے تبادلہ خیال کیا اور مہمان نوازی دکھانے پر پاکستان کے عوام کا بھرپور شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے انڈونیشی جدوجہد کے لیے افواج بھیجنے پر حکومت پاکستان کا شکریہ ادا کیا۔

انڈونیشیا اور پاکستان کے درمیان دوستی کا معاہدہ طے پایا جس کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان قریبی تعلقات مضبوط بنیادوں پر استوار ہوئے۔ پہلی افریقی ایشیائی کانفرنس انڈونیشیا کے شہر بنڈونگ میں اپریل 1955ء میں ہوئی جس میں پاکستان اور انڈونیشیا کے رہنماؤں کو ملنے کا موقع ملا۔ اپریل 1955ء میں پاکستان اور انڈونیشیا کے درمیان ثقافتی تعلقات کے فروغ کے لیے ایک ثقافتی انجمن قائم کی گئی۔ 1959ء میں دونوں ممالک کے درمیان کراچی میں تجارتی معاہدہ طے پایا۔

1964ء میں صدر سوئیکارنو نے پاکستان کا ایک اور دورہ کیا۔ اس دورے سے پاکستان اور انڈونیشیا کے درمیان تعلقات کا نیا دور شروع ہوا۔ دونوں ممالک کے درمیان معاشی اور ثقافتی تعلقات کے فروغ کے لیے ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کو (IPECC) یعنی انڈونیشیا۔ پاکستان معاشی اور ثقافتی تعاون کہا جاتا ہے۔ (Indonesia Pakistan Economic and Cultural Co-operation) اس معاہدے کا مقصد دونوں ممالک کے درمیان معاشی اور ثقافتی شعبوں میں تعاون تھا۔ 29 جون 1965ء کو ایک اور سمجھوتہ طے پایا جس کا مقصد جہاز رانی کے شعبے میں تعاون کرنا تھا۔

1965ء کی جنگ کے دوران انڈونیشیا نے پاکستان کی بھرپور امداد کی۔ صدر سوئیکارنو نے کھلے عام بھارتی جارحیت کی مذمت کی اور پاکستان کو ہر ممکن امداد کی پیش کش کی۔ پاکستان پر بھارتی حملے کو شرمناک جارحیت قرار دیا۔ انڈونیشیا نے ہندوستان کے ساتھ سفارتی تعلقات توڑ لیے۔ انڈونیشیا کے وزیر خارجہ ڈاکٹر سوباندریو نے تمام مسلمان ممالک سے پاکستان کی مدد کی اپیل کی۔

انڈونیشیا اور پاکستان نے 14 جنوری 1966ء کو ایک ہوائی معاہدہ طے کیا۔ 18 فروری 1988ء کو ایک تجارتی معاہدہ طے پایا جس کی رو سے پاکستان نے انڈونیشیا کو 8 کروڑ روپے کی اشیاء دیں۔

مئی 1971ء میں انڈونیشیا کے صدر جنرل سہارتو نے مشرقی پاکستان پر پاکستان کے موقف کی حمایت کی اور پاکستان کے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت کی مذمت کی۔ انڈونیشیا نے بھارت پر پاکستان کے جنگی قیدی رہا کرنے کا دباؤ ڈالا۔

پاکستان اور انڈونیشیا نے جکارتہ میں 19 اپریل 1980ء کو ایک دوسرے کے ساتھ ایٹمی توانائی کا تبادلہ کرنے کا معاہدہ کیا۔ صدر سہارتو 1980ء میں پاکستان آئے اور علاقے میں امن برقرار رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

صدر ضیاء الحق 2 نومبر 1982 کو انڈونیشیا کے سرکاری دورے پر گئے جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

4- پاکستان اور لیبیا (Pakistan and Libya)

لیبیا تیل کی دولت سے مالا مال ایک اہم ملک ہے جو کہ شروع میں سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد مال غنیمت کے طور پر اسے تقسیم کر کے فرانس اور اٹلی کو دے دیا گیا۔ کئی سال تک لیبیا بیرونی تسلط کے زیر اثر رہا۔ 1951ء میں اسے بیرونی تسلط سے آزادی ملی اور شاہ ادریس کی بادشاہت قائم ہوئی۔ پاکستان نے لیبیا کی جدوجہد آزادی کی بھرپور حمایت کی جس کی وجہ سے دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

ایک نوجوان فوجی آفیسر کرنل معمر قذافی نے 1969ء میں شاہ ادریس کو فوجی انقلاب کے ذریعے برطرف کر دیا۔ کرنل قذافی ایک بہادر انقلابی ہیں جو اپنے عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ پاکستان میں کرنل قذافی کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کرنل قذافی اپنے وفد کے سربراہ کے طور پر دوسری اسلامی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے لاہور آئے۔ انہوں نے لاہور سٹیڈیم میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کیا۔ لاہور سٹیڈیم کا نام تبدیل کر کے ان کے نام کی نسبت سے قذافی سٹیڈیم رکھ دیا جو کہ پاکستان کے عوام کے دلوں میں ان کی محبت کا ثبوت ہے۔

اس وقت سے پاکستان اور لیبیا میں قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم ہیں اور انشورنس کے شعبوں میں مشترکہ کوششوں کا آغاز کیا گیا۔ دونوں ممالک میں اسلامی مراکز قائم کئے گئے۔ لیبیا میں ہونے والی وزارتی کمیشن کی ملاقات میں مشترکہ پاک۔لیبیا کمپنی قائم کی گئی جو دونوں ممالک کے درمیان طے پانے والے ترقیاتی منصوبوں کا جائزہ لے گی۔

لیبیا کی حکومت نے ہمیشہ پاکستان کو ضرورت کے موقع پر مالی امداد پیش کی ہے۔ اس نے پاکستان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھاری قرضے اور معاشی امداد دی ہے۔ 1974ء میں لیبیا کے مرکزی بنک نے پاکستان کو 5 کروڑ ڈالر کا قرضہ دیا۔

1977 میں صدر ضیاء الحق لیبیا گئے اور کرنل قذافی کے ساتھ دوطرفہ مفادات پر بات چیت کی۔ لیبیا کے نائب صدر عبدالسلام جلود پاکستان آئے اور پاکستان کو اسلامی دنیا کا دل کہا۔ 1979ء میں پاک۔لیبیا ہولڈنگ کمپنی قائم کی گئی۔ پاک۔لیبیا چیمبر آف کامرس قائم کیا گیا ہے۔ 1971ء کی جنگ میں لیبیا نے پاکستان کو بھاری مالی امداد دی۔ لیبیا نے کشمیر پر پاکستان کے موقف کی حمایت کی ہے۔

صدر پرویز مشرف کی حکومت لیبیا کے ساتھ نزدیکی روابط قائم کرنا چاہتی ہے جس کے لیے کوشش ہو رہی ہے۔

5۔ پاکستان اور ایران (Pakistan and Iran)

ایران ایک مسلمان ملک ہے جس کی پاکستان کے ساتھ مشترکہ سرحد ہے۔ ایران پاکستان کا قابل اعتماد ہمسایہ ہے جس نے ہر کڑے وقت میں پاکستان کا ساتھ دیا ہے۔

تقسیم کے بعد ایران وہ پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کی حکومت کو تسلیم کیا۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان ایران کے سرکاری دوسرے پر گئے۔ ایران کے فرمانروا رضا شاہ پہلوی پاکستان کے دورہ پر آئے۔ 1950ء میں پاکستان اور ایران کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے ایران نے پاکستان کو تیل دینے کا وعدہ کیا۔

پاکستان اور ایران نے عراق کے بعد سینٹو معاہدہ میں شرکت اختیار کی۔ دونوں ممالک 1979ء تک سینٹو کے رکن رہے۔

شاہ ایران پاکستان کے قابل اعتماد ساتھی تھے۔ انہوں نے کئی مواقع پر پاکستان اور افغانستان کے درمیان جھگڑا ختم کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ شاہ ایران علاقائی امن میں گہرا یقین رکھتے تھے۔ وہ ایران کو خلیج میں فوجی قوت بنانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علاقائی امن کے لیے مضبوط ایران کا وجود ضروری ہے۔

پاکستان نے بھی طاقت ور ایران کی حمایت کی۔ تقسیم سے لے کر اب تک ایران اور پاکستان کے درمیان قریبی تعلقات قائم رہے ہیں۔ پاکستان کا خیال تھا کہ بھارت کے ساتھ کشیدہ تعلقات کی موجودگی میں طاقت ور اور مضبوط ایران علاقائی امن کے لیے بہت ضروری ہے۔

اسی طرح ایک دوست اور مضبوط پاکستان بھی ایران کی ضرورت تھا۔ کیونکہ یہ اس کی مشرقی سرحد کے تحفظ کے لیے ضروری تھا۔ ایران پاکستان کے سمندری ساحل مکران کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا تھا کیونکہ یہاں پر کسی دشمن ملک کا قبضہ ایران کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔

پاکستان اور ایران 21جولائی 1974ء کو مشہور زمانہ ''تعاون برائے علاقائی ترقی'' RCD "Regional Cooperation for Development" میں رکن بنے۔ RCD کے معاہدہ کی وجہ سے دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے بہت سارے مواقع میسر آئے۔ اس معاہدے کی بنیاد باہمی اشتراک پر رکھی گئی تھی جو کہ معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور

دوسرے شعبوں سے متعلق تھے اور اس کا مقصد رکن ممالک کے عوام کی فلاح و بہبود اور ترقی تھا۔ RCD کو اب ECO (Economic Cooperation Organization) میں تبدیل کر دیا گیا جس کا زیادہ زور تینوں رکن ممالک کی معاشی ترقی پر ہے۔

ایران نے ہمیشہ کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان کے موقف کی بھرپور حمایت کی ہے۔ بھارت کے ساتھ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے دوران ایران نے پاکستان کی ضرورت کے مطابق امداد دی۔

پاکستان اور ایران کے درمیان 28 جولائی 1987ء کو ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے دوطرفہ مال برداری بذریعہ سڑک پر اتفاق ہوا۔ پاکستان۔ایران مشترکہ کمیٹی کا اجلاس 17 جون 1987ء کو اسلام آباد میں ہوا جس میں مختلف شعبوں میں حاصل نتائج اور تعاون کا جائزہ لیا گیا۔ دونوں طرف سے مواصلات، انشورنس، زراعت صنعت اور ثقافتی شعبوں میں تعاون کے امکانات کا جائزہ لیا گیا۔

2 دسمبر 1986 کو ایران کا 13 رکنی وفد پاکستان آیا۔ انہوں نے پاکستان کی وزارت اطلاعات کے افسران سے گفت وشنید کی۔ دونوں اطراف سے ٹیلی ویژن، نشرواشاعت اور اطلاعات کی تبدیلی کو جاری رکھنے پر اتفاق کیا گیا۔

ایک دوسرا وفد جناب حسین مہلوجی، رکن مجلس ایران کی قیادت میں 12 جولائی 1987ء کو پاکستان آیا۔ وفد کا مقصد دو صنعتی یونٹوں کو جو عرصہ تین سال سے بند پڑے تھے، دوبارہ سے چلانے کا انتظامات کرنا تھا۔

ایران نے پاکستان کی معاشی ترقی کے لیے فراخدلی سے امداد دی ہے۔ 1973ء میں ایک مشترکہ وزارتی کمیشن قائم کیا گیا جس کا مقصد مشترکہ تعاون کے لیے لائحہ عمل وضع کرنا تھا۔ ایران نے پاکستان کو قرضہ جات جاری کئے تاکہ انسانی ترقی کا کام ہو سکے۔ بلوچستان میں بولان میڈیکل کالج اور خضدار انجینئرنگ کالج قائم کرنے میں ایران کی مدد کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ایران نے بھارت کے ساتھ کشیدگی میں پاکستان کا ساتھ دیا اور بنگلہ دیش کو اس وقت تک تسلیم نہ کیا جب تک پاکستان نے خود اعلان نہ کیا۔ جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دینے کی شاہ ایران نے کھل کر حمایت کی۔ 1970ء کی دہائی کے شروع میں پاکستان نے ایران کے ذریعے اسلحہ حاصل کیا۔ ایران نے امریکہ کو 1971ء میں لگائی گئی ہتھیاروں کی پابندی پاکستان سے اٹھانے کی حمایت کی۔

79-1977ء میں دونوں ممالک کی اندرونی سیاست میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں جس کی وجہ سے تعلقات کو جھٹکا لگا۔ 1977ء میں بھٹو کی حکومت کو جنرل ضیاء الحق نے برطرف کر دیا تھا اور پاکستان کی نئی حکومت اندرونی مسائل میں گھری ہوئی تھی۔ جبکہ دوسری طرف ایران میں بھی دور رس سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایک عظیم اسلامی انقلاب نے شاہ ایران کو حکومت سے برطرف کر دیا تھا۔ شاہ ایران اسلامی بنیاد پرستوں کے قہر وغضب سے بچنے کے لیے ملک چھوڑ گئے تھے۔ جنرل ضیاء کی قیادت میں پاکستان کی نئی حکومت نے اس صورت حال کے پیش نظر غیر جانب دار رویہ اپنایا۔ پاکستانی عوام نے ایران کے اسلامی انقلاب کی بھرپور حمایت کی۔ جب فروری 1979ء میں ایران اسلامی جمہوریہ قائم ہوئی تو پاکستان نے سب سے پہلے اسے تسلیم کر لیا۔

1979ء میں افغانستان پر روسی قبضے پر پاکستان اور ایران کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ ایران اور پاکستان نے افغانستان سے روسی فوجوں کے فوری اور مکمل انخلاء کا مطالبہ کیا۔ ایران اور پاکستان نے افغانستان کے لاکھوں پناہ گزینوں کو اپنے ملک میں پناہ دی جو روسی حملے سے بچنے کے لیے اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

1982ء میں دونوں طرف سے حکومتی اہل کاروں کے دوروں کی وجہ سے تعلقات میں نئی سرگرمی پیدا ہوئی۔ دونوں ممالک کے درمیان تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور معاشی اور ثقافتی تعلقات کے فروغ کے لیے کئی اقدامات کیے گئے۔

1986ء میں ایران کے صدر حجتہ الاسلام علی خامنائی پاکستان کے دورے پر آئے۔ دورے کی وجہ سے ایران اور پاکستان کے تعلقات میں نئی راہیں سامنے آئیں۔ دونوں ممالک نے علاقے کے امن و سلامتی اور پوری اسلامی دنیا میں یک جہتی کے فروغ کے لیے اپنے عہد و اقرار کا اعادہ کیا۔ پاکستان اور ایران نے خلیج کی جنگ کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ قریبی رابطہ رکھا۔ 1989ء میں امام خمینی کی وفات پر دس روزہ سوگ منایا گیا۔

پاکستان نے ایران کے ساتھ مل کر بھارت کو گیس کی فراہمی کا ایک معاہدہ کیا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے پاکستان ہر سال 2010ء تک ایران سے 1 بلین ڈالر کی گیس خریدے گا۔ بھارت کو جانے والی گیس پائپ لائن پاکستان سے گزرے گی جس کی وجہ سے عوام کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔ پاکستان کو سالانہ 700 ملین ڈالر راہ داری کی مد میں آمدنی ہوگی۔

6- پاکستان اور سعودی عربیہ (Pakistan and Saudi Arabia)

پاکستان اور سعودی عربیہ کے درمیان تعلقات اسلام کے رشتے پر قائم ہیں۔ دونوں ممالک میں مذہبی اور ثقافتی مماثلت بہت نمایاں ہے۔ سعودی عربیہ پاکستان کا قابل اعتماد ساتھی ہے جس نے ہر مشکل وقت میں پاکستان کا ساتھ دیا ہے۔ دونوں ممالک نے ہر سطح پر اپنے روابط قائم رکھے ہیں اور باہمی مفادات پر ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے عوام اور حکومت سعودی فرمانروا کو حرمین شریفین کا محافظ سمجھتے ہوئے انتہائی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سعودی عربیہ نے پاکستان کے متعدد منصوبوں کے لیے پاکستان کی تہ دل سے مدد کی ہے۔ پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد سعودی عربیہ میں روزگار کے حصول کے لیے کام کر رہی ہے اور اس طرح قومی ترقی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔

پاکستان سعودی عربیہ کو فوجی تربیت دے رہا ہے۔ سعودی کیڈٹ پاکستان میں فوجی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ پاکستان کے فوجی انسٹرکٹر سعودی عربیہ کے جوانوں اور افسروں کو تربیت دیتے ہیں۔ سعودی عربیہ نے ہمیشہ پاکستان کی معاشی ترقی کے لیے دل کھول کر امداد دی ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان معاشی تعاون کے لیے بنک الجزیرہ قائم کیا گیا ہے۔ سعودی عربیہ نے کھاد کے کارخانے، سیمنٹ پلانٹ اور صنعتی یونٹوں کے قیام کے لیے بھاری امداد دی ہے۔ فیصل مسجد کی تعمیر کے لیے سعودی عربیہ نے مالی اعانت مہیا کی ہے۔ سعودی عربیہ پاکستان کو تیل اور پٹرولیم کی مصنوعات مہیا کرتا ہے۔

سعودی عربیہ نے بین الاقوامی سیاست میں ہمیشہ پاکستان کے موقف کی حمایت کی ہے۔ پاکستان اور سعودی عربیہ کے درمیان پہلا معاہدہ 1951ء میں طے پایا۔ 1954ء میں سعودی عربیہ کے بادشاہ سعود بن عبدالعزیز پاکستان کے سرکاری دوسرے پر آئے۔ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے دوران سعودی عربیہ نے پاکستان کی ہر ممکن مدد کی۔ سعودی عربیہ نے اس وقت تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کیا جب تک کہ پاکستان نے خود تسلیم نہ کر لیا۔

سعودی شہنشاہ عبداللہ بن عبدالعزیز اور وزیر اعظم شوکت عزیز نے تمام شعبوں میں پاکستان اور سعودی عربیہ کے درمیان تعاون بڑھانے پر زور دیا ہے۔

7- پاکستان اور ترکی (Pakistan and Turkey)

اسلامی دنیا میں ترکی کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہاں پر صدیوں تک خلافت اسلامیہ کا مرکز رہا ہے۔ جس کی بناء پر ترکی دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے باعث عزت وتکریم رہا ہے۔ اس حیثیت سے برصغیر کے مسلمان ترکی کے خلیفہ کو اپنا دینی اور ملی رہنما سمجھتے رہے۔ جب پہلی جنگ عظیم کے بعد اتحادی ممالک نے ترکی کے کئی حصے بخرے کیے اور عہد خلافت کو ختم کیا تو ہندوستان میں خلافت کی بقاء کے لیے عظیم تحریک ابھری جسے تحریک خلافت کہتے ہیں۔ ترکی اور پاکستان اسلامی اخوت کے بے مثال رشتے میں منسلک ہیں اور دونوں ممالک کے عوام اس لحاظ سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ترکی نے پاکستان کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے فوراً تسلیم کر لیا تھا اور دونوں ملک ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی، ثقافتی اور معاشی رشتوں میں منسلک ہوگئے۔ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور تعاون کا پہلا معاہدہ 1951ء میں ہوا جس کے تحت دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے طلباء کو تعلیمی وظائف دیئے۔ دوسرا معاہدہ اپریل 1954 میں ہوا جس کے تحت دفاعی امور میں تعاون پر زور دیا۔

1964ء میں معاہدہ آر۔سی۔ڈی طے پایا جو پاکستان، ایران اور ترکی کے درمیان تھا اس معاہدے کی رو سے ترکی اور پاکستان اور زیادہ قریب آ گئے۔

ترکی اور پاکستان کے قائدین اور سربراہان ایک دوسرے کے ممالک کا دورہ کرتے رہے ہیں۔ ترکی کے صدر جلال بایار نے دو دفعہ پاکستان کا دورہ کیا۔ وزیراعظم عدنان میندریس بھی ایک دفعہ پاکستان آئے۔

صدر ایوب خان نے دو دفعہ ترکی کا دورہ کیا۔ ترکی کے وزیراعظم سلیمان ڈیمرل نے بھی پاکستان کا دورہ کیا۔ مارشل لاء کے بعد ترکی فوجی حکومت کے سربراہ جنرل کنعان ایورن نے پاکستان کا دورہ کیا۔ صدر جنرل ضیاء الحق بھی ترکی کے دورے پر تشریف لے گئے۔

ترکی نے ہمیشہ پاکستان کے موقف کی پرزور حمایت کی۔ کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی ہمیشہ حمایت کی۔ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں پاکستان کو ہر ممکن امداد دی۔

پاکستان نے بھی ہمیشہ ترک مسائل پر ترکی کی حمایت کی ہے۔ مسئلہ قبرص پر پاکستان نے بلند بانگ لہجے میں ترکی کے موقف کی حمایت کی اور اقوام متحدہ پر زور دیا کہ قبرص کا مسئلہ بین الاقوامی اصولوں کی روشنی میں طے کیا جائے۔ 1962ء کی چین بھارت جنگ میں ترکی نے بھارت کو فوجی امداد دینا چاہی۔ پاکستان نے ترکی سے یہ امداد روکنے کی درخواست کی اور کہا کہ یہ اسلحہ دراصل پاکستان کے خلاف استعمال ہوگا تو ترکی نے پاکستان کے موقف سے اتفاق کرتے ہوئے بھارت کی امداد روک دی۔

1999ء میں جنرل پرویز مشرف حکومت میں آئے جب سے پاکستان اور ترکی کے درمیان تعلقات کو آگے بڑھانے کے لیے کوشش ہو رہی ہے۔ وزیراعظم شوکت عزیز نے ترکی کا دورہ کیا اور ترک راہنماؤں کے ساتھ دوطرفہ تعلقات کے حوالے سے تبادلہء خیال کیا۔

8- پاکستان اور مصر (Pakistan and Egypt)

مصر شمالی افریقہ کا ایک اہم ملک ہے۔ آبادی کی اکثریت مسلمان ہے۔ یہاں پر شروع سے ہی بادشاہت قائم رہی ہے جسے جنرل نجیب نے انقلاب کے ذریعے ختم کیا تھا۔ مصر اگرچہ اسلامی ملک ہے لیکن بدقسمتی سے پاکستان کے ساتھ اس کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے ہیں۔ تحریک پاکستان کے دوران مصری حکومت نے مطالبہ پاکستان کے بارے میں سردمہری کا اظہار کیا تھا۔ اگرچہ مصری عوام نے ہمیشہ مطالبہ پاکستان کی حمایت کی ہے۔ مصر کے شاہ فاروق کا رویہ بھارت کے ساتھ زیادہ دوستانہ رہا ہے۔

پاکستان کی جانب مصر کے اس سرد رویہ کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پاکستان اسلامی دنیا میں سب سے بڑی مملکت کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا تھا۔ جب کہ مصر نے ہمیشہ اسلامی دنیا کی قیادت کا دعویٰ کیا ہے۔ مصری لیڈر اور حکومت پاکستان کے قیام کو اپنی قیادت کے لیے ایک خطرہ سمجھتے تھے اس لئے مطالبہ پاکستان کے سلسلے میں سردمہری کا ثبوت دیتے رہے۔

جنرل نجیب کے دور اقتدار میں پاکستان اور مصر کے تعلقات میں بہتری پیدا ہوئی اور دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور تعاون کا عمل شروع ہوا۔ لیکن اسی دوران جمال عبدالناصر کے اقتدار میں آ جانے سے یہ بہتری کا عمل پھر رک گیا۔ ناصر عرب نیشنلزم کا حامی تھا جب کہ پاکستان کی بنیاد ملت اسلامیہ کے بین الاقوامی تصور پر رکھی گئی تھی جو کہ ناصر کے نظریات سے بالکل مختلف تھی اس کے علاوہ پاکستان شروع سے ہی سیٹو اور سینٹو کا رکن بن گیا تھا جس کی وجہ سے پاکستان کو امریکہ اور برطانیہ کا حلیف سمجھا جاتا تھا۔ مصر کی یہ خواہش تھی کہ پاکستان امریکہ اور برطانیہ کا دوست نہ بنے۔

پاکستان کے بارے میں مصر کے مخالفانہ رویے کی بنیادی وجہ مصر کا روس اور بھارت کے قریب ہونا تھا۔ مصر روس اور ہندوستان کی دوستی کی وجہ سے یہ پسند نہ کرتا تھا کہ پاکستان، امریکہ یا برطانیہ کے قریب رہے اور نہ ہی ان کے ساتھ کسی قسم کے معاہدوں میں شریک ہو۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ناصر نے بھارتی موقف کی حمایت کی تھی اور ہندوستان کو خوش کرنے کے لیے پاکستان کی طرف مخالفانہ رویہ روا رکھا تھا۔ مصر نے مسئلہ کشمیر پر خاموشی اختیار کئے رکھی اور 1962ء میں مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ میں رائے شماری میں حصہ نہ لیا تھا۔

صدر ناصر کے مخالفانہ رویہ کے باوجود ایک مسلمان ہونے کے ناطے پاکستان نے ہمیشہ مصر کے موقف کی حمایت کی ہے اور نہر سویز پر مصر کے حقوق کو تسلیم کیا۔ عرب اسرائیل جنگ میں پاکستان نے اسرائیل کی پرزور مذمت کی۔ مصر پر برطانوی' فرانسیسی اور اسرائیلی حملے کی پاکستان نے مذمت کی۔ اس ضمن میں پاکستان کے وزیراعظم حسین شہید سہروردی کے ایک بیان کی وجہ سے مصر اور پاکستان کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی تھی۔ پاکستان کے عوام نے بھی اپنے وزیراعظم کے اس بیان کو پسند نہ کیا تھا۔ اس کشیدگی کے باوجود پاکستان نے مصر اور اسرائیل جنگ میں مصری موقف کی حمایت کی۔ 1958ء میں صدر ایوب کے برسراقتدار آنے کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اپریل 1960ء میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے پاکستان کا دورہ کیا۔ مصر کے صدر کے دورے کے دوران صدر ایوب نے نہر سویز کے مسئلے پر پاکستان کے نمائندے کے غیر ذمہ دارانہ بیان پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نہر سویز کے معاملے میں پاکستان کی تمام ہمدردیاں مصر کے ساتھ ہیں۔[1]

پاکستان کے اس دوستانہ رویہ کے باوجود مصری حکومت کے پاکستان کی طرف سے معاندانہ رویہ میں کمی نہ ہوئی۔ 1971ء کی جنگ کے دوران پاکستان کے لیے اسلحہ لے کر آنے والے جہازوں کو نہر سویز سے گذرنے کی اجازت نہ دی گئی۔

1967ء میں مصر اسرائیل جنگ میں مصر کو شکست ہوئی اور ناصر کے عرب نیشنلزم کے تصورات کو زبردست زک پہنچی۔ اس شکست کے بعد مصری عوام اور حکومت پاکستان ایک دوسرے کے نزدیک آئے کیونکہ پاکستان نے اس جنگ میں مصری موقف کی بھرپور حمایت کی تھی اور اقوام متحدہ کو اسرائیل پر پابندی لگانے پر زور دیا تھا۔ 1970ء میں صدر ناصر کی وفات کے بعد انور السادات برسر اقتدار آئے تو پاکستان اور مصر کے تعلقات میں پیش رفت ہوئی۔ صدر سادات نے 1974ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی وفود کا تبادلہ ہوا۔ جس سے دونوں ممالک کے تعلقات میں خوش گوار تبدیلی ہوئی۔ صدر سادات 6 اکتوبر 1981ء کو قتل کر دیئے گئے۔ پاکستان نے مصر کے اس عظیم سانحہ کے دوران اپنے مصری بھائیوں کے غم میں شرکت کی۔ پاکستان کے ایک وفد نے صدر سادات کی آخری رسومات میں شرکت کی اور پاکستان کا قومی پرچم صدر سادات کے سوگ میں سرنگوں رہا۔

پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کے برسراقتدار آنے کے بعد مصر اور پاکستان کے درمیان تعلقات کو مزید آگے بڑھانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

10- پاکستان اور ملائشیا (Pakistan and Malaysia)

ملائشیا جنوب مشرقی ایشیا کا ایک اہم ملک ہے۔ اگرچہ یہاں پر آبادی کی اکثریت مسلمان ہے لیکن ہندو آبادی کی وجہ سے اس ملک کا رجحان زیادہ تر ہندوستان کی طرف رہا ہے۔ پاکستان نے ملائشیا کی جنگ آزادی میں اس کی بھرپور حمایت کی ہے۔

ملائشیا میں ہندو بڑی تعداد میں آباد ہیں جس کی وجہ سے حکومت کا جھکاؤ زیادہ تر ہندوستان کی طرف ہے۔ 1965ء کی جنگ میں ملائشیا نے ہندوستان کی حمایت کی تھی اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے خلاف بڑے مخالفانہ انداز میں تقریر کی تھی۔ حکومت پاکستان نے ملائشیا کے اس طرز عمل کی بناء پر ملائشیا سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تھے جو کہ بعد میں شہنشاہ ایران کی کوششوں سے بحال ہوئے تھے۔

ملائشیا کے مخالفانہ رویہ میں پھر بھی کمی نہ آئی۔ 1971ء میں ملائشیا نے سب سے پہلے بنگلہ دیش کو آزاد ملک کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا۔ مئی 1978ء میں ملائشیا کے وزیراعظم نے پاکستان کا دورہ کیا تھا جس کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان ایک ثقافتی معاہدہ عمل میں آیا۔ 1982ء میں پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق نے ملائشیا کا دورہ کیا اور دونوں ممالک کے درمیان تعلقات پر زور دیا۔ اس دورے سے دونوں ملک پہلے سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں۔

11- پاکستان اور متحدہ عرب امارات (Pakistan and United Arab Emirates)

متحدہ عرب امارات خلیج فارس کی سات ریاستوں پر مشتمل وفاق ہے جس کی کل آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ ان ریاستوں میں قابل ذکر ریاستیں ابوظہبی، دوبئ، شارجہ اور قطر ہیں۔ متحدہ عرب امارات کی یہ ریاستیں تیل کی دولت سے مالا مال ہیں اور اس وفاق کے سربراہ ابوظہبی کے صدر زید بن سلطان النہیان ہیں۔

جون 1971ء میں ان ریاستوں کی آزادی کے بعد پاکستان نے فوری طور پر انہیں تسلیم کر لیا تھا اور اپنے سفارتی تعلقات قائم کر لئے تھے۔ دونوں ممالک کے درمیان ثقافتی، تجارتی اور دیگر شعبوں میں تعاون کی فضا موجود ہے۔ کئی معاہدے بھی عمل میں آ چکے ہیں جن سے دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں۔

1972-73 میں پاکستان کے سربراہ نے عرب امارات کے کئی دورے کئے۔ مئی 1974ء میں زید بن سلطان النہیان نے پاکستان کا دورہ کیا۔ سلطان زید پاکستان سے گہری محبت رکھتے تھے اور ہمیشہ پاکستان کی ترقی میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ کئی عرب ریاستیں پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کر رہی ہیں۔ 1979ء میں متحدہ عرب امارات کے کئی تجارتی وفود نے پاکستان کا دورہ کیا۔

متحدہ عرب امارات کے تعاون سے ملتان میں کیمیاوی کھاد کا ایک کارخانہ لگایا گیا جسے پاک عرب کھاد فیکٹری کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈیری فارم، شہری ہوابازی، اور مواصلات کے شعبوں میں تعاون کے لیے دونوں ملکوں کے درمیان کئی منصوبوں پر غور ہو رہا ہے۔ پاکستان متحدہ عرب امارات کو فنی امداد فراہم کرتا رہا ہے اور دفاعی شعبے میں جدید ٹریننگ کی سہولت بھی فراہم کر رہا ہے۔ پاکستان کے انجینئرز، ڈاکٹرز، استاد، فنی ماہرین اور لاکھوں کی تعداد میں مزدور عرب امارات میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

متحدہ عرب امارات کے صدر نے پاکستان کو فراخ دلی سے امداد دی ہے۔ رحیم یار خان اور لاہور میں بنائے گئے عظیم الشان ہسپتالوں کے لیے سرمایہ عرب امارات کے صدر نے فراہم کیا ہے۔ خلیج فارس کی دوسری ریاستوں کویت، اومان، بحرین اور قطر کے بھی پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔ کویت نے 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی ہر ممکن مدد کی۔ کویت کی اسمبلی نے پاکستان کی حمایت میں ایک قرارداد منظور کی اور بھارتی جارحیت کی پرزور مذمت کی۔ ان ریاستوں میں بھی پاکستانی ماہرین اور مزدور ملازمت کر رہے ہیں اور وہاں کے ترقیاتی منصوبوں میں کام آ رہے ہیں۔

پاکستان اور خلیج فارس کی ریاستیں اسلامی رشتے میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ پاکستان میں حالیہ اسلامی نظام کے نفاذ کی کوششوں سے دونوں ممالک کے عوام زیادہ قریب آئے ہیں۔

باب نمبر 24

نسلی اختلافات

Ethnic Discord

پاکستان کے سیاسی، معاشی و معاشرتی ڈھانچے کو کمزور کرنے میں بڑے پیمانے پر نسلی تحریکوں کا معرض وجود میں آنا نہایت اثر انگیز عنصر ہے۔ نسلی منافرت کی بنا پر پاکستان کو اپنے مشرقی حصے سے محروم ہونا پڑا۔ 1971ء میں ملک کا ٹوٹنا پاکستان کی اذیت ناک تاریخ کا سب سے زیادہ قابل نفرت واقعہ ہے۔ اس واقعہ میں نسلی منافرت میں ملوث طبقات نے زیادہ کردار ادا کیا اور ملک کے 54 فیصد عوام نے بالآخر یہ کہا کہ اب بہت ہو چکا ہم اب آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ملک ٹوٹنے اور بعد میں فوج کی ہزیمت سے کسی نے سبق نہ سیکھا اور کسی نے اس عظیم واقعہ پر ایک آنسو نہ بہایا اور نہ کسی کو کوئی سزا دی گئی۔

سیاسی جھگڑے جس نے ہمارے ملک کے سیاسی نظام کو تباہ کر دیا ہے وہ دو عناصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اول ملک میں جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے آئینی ڈھانچے کی تیاری کے لیے جدوجہد اور دوسرا ملک کے مختلف نسلی گروہوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے لیے رسہ کشی۔ پاکستان کی سیاست کے ان دو عناصر نے سندھ، بلوچستان، پنجاب اور صوبہ سرحد کے کچھ علاقوں میں نسلی فساد کو بہت زیادہ فروغ دیا ہے جو ہماری آزادی کے لیے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے۔

نسلی فساد کی سیاسی، معاشی اور انتظامی وجوہات ہوتی ہیں۔ ان میں غیر مساوی وسائل کی تقسیم، صوبوں پر مرکزی حکومت کا سخت تسلط، عوام کو جمہوری حقوق دینے سے انکار، بیوروکریسی اور فوج میں کسی مخصوص نسلی گروہ کی برتری، ثقافت کے دبنے کا ڈر اور ابلاغ عامہ کے منفی و مخالفانہ کردار شامل ہوتے ہیں۔ ان عوامل نے پاکستان میں موجودہ نسلی اضطراب کو فروغ دینے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

1947ء میں آزادی کے بعد پاکستان ایک انوکھے جغرافیائی محل وقوع پر مشتمل تھا۔ اس کو بالکل ٹھیک طور پر ''دوہرا ملک'' (Double Country) کا نام دیا گیا۔ پاکستان کے دو صوبے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان تھے جو ایک ہزار میل بھارتی علاقے کی وجہ سے ایک دوسرے سے علیحدہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر ایک ایسا حکومتی ڈھانچہ قائم تھا جو نہ صرف جغرافیائی طور پر مختلف عناصر پر مشتمل تھا بلکہ سخت قسم کے نسلی تضادات سے بھی پر تھا۔ مغربی پاکستان میں چار بڑی قومیتیں تھیں جن میں پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان شامل تھے۔ اس کے علاوہ پانچواں گروہ مہاجروں کا تھا جو ہندوستان کے صوبوں بمبئی اور اترپردیش سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے۔

مغربی پاکستان کی مختلف اور غیر مشابہ نسلی و ثقافتی صورت حال کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کا یک رنگ نسلی و ثقافتی ڈھانچہ تھا۔ مشرقی پاکستان کل آبادی کا 54 فیصد حصہ تھا اور ثقافتی لحاظ سے مکمل طور پر بنگالی قومیت کا حامل تھا۔ ملک کے دونوں حصوں میں ثقافتی اور نسلی تنظیم کے گہرے اختلافات ہی دراصل نسلی فساد کو فروغ دینے کے ذمہ دار تھے اور آزادی کے بعد پاکستان کے راہنماؤں کے لیے مشکلات پیدا کرنے کا موجب بنے۔

پنجابیوں، بنگالیوں اور دوسرے گروپوں یعنی سندھی، پختون اور مہاجروں کے درمیان علاقائی نفرت تیزی سے بڑھ گئی جس نے مسلم لیگ کی قیادت کے لیے مشکلات پیدا کردیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیوروکریسی اور فوج کے پاس اختیارات اکٹھے ہوگئے اس نے نسلی گروہ بندی کو مزید تقویت دی کیونکہ فوج اور بیوروکریسی کے اثر و رسوخ میں اضافے کا مطلب تھا کہ مغربی پاکستان کے مختلف گروپ زیادہ طاقت ور ہوگئے ہیں۔

لیاقت علی خان کے 1951ء میں قتل کے بعد بیوروکریسی کو اختیارات کے استعمال اور فیصلہ سازی میں ناقابل تسخیر حیثیت حاصل ہوگئی۔ وہ تمام فیصلے اپنے نسلی مفادات کی روشنی میں دوسرے گروپوں یعنی بنگالیوں کو نظر انداز کر کے کرتے تھے جس سے بنگالیوں میں بددلی اور مایوسی پھیلتی گئی۔ اس خطرناک صورتحال سے بچا جاسکتا تھا اگر مسلم لیگ انتخابات کروالیتی۔ منتخب نمائندے آسانی سے بیوروکریسی کے تسلط کو روک سکتے تھے اور انتظامیہ میں سیاسی بالادستی قائم کرسکتے تھے۔ مسلم لیگ کی پارلیمانی جمہوریت کو تقویت دینے میں ہچکچاہٹ دراصل نسلی وجوہات کی وجہ سے تھی جو بنگالیوں کو سیاسی نظام میں اہمیت نہ دینا چاہتے تھے۔

پاکستان میں نسلی فساد کے فروغ کی بڑی وجہ مسلم لیگ کی ایک فعال سیاسی نظام قائم کرنے میں ناکامی اور اس کا بیوروکریسی کے سامنے خوشامدانہ رویہ تھا۔ اس کے علاوہ کوئی نمائندہ اداروں کا نظام موجود نہ تھا جو سیاسی جماعتوں کو بیوروکریسی کے مفتوح ادارے بننے سے روک سکتا۔ مرکزی بیوروکریسی کے اراکین یا تو مسلم اقلیت صوبوں کے رفیوجی تھے یا ان کا تعلق پنجاب سے تھا۔ بنگال، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے سرکردہ طبقے ملک کے اختیاراتی ڈھانچے سے نمایاں طور پر خارج تھے۔ ایک ایسا سیاسی ڈھانچہ جو ملک کے پانچ سرکردہ طبقوں میں سے چار کو اپنے اندر سمو نہ سکتا ہو کسی صورت بھی مضبوط حکومت قائم نہیں کرسکتا۔

ایک قابل عمل آئین بنانے میں پاکستان نے نو سال کا عرصہ لگا دیا۔ آئین سازی میں اتنے طویل عرصے کی وجہ یہ تھی کہ مرکز میں برسر اقتدار طبقہ اختیارات میں بنگالیوں کو ساتھ نہ ملانا چاہتا تھا۔ شروع سے ہی برسر اقتدار جماعت نے بنگالیوں کو سیاسی و انتظامی اختیارات میں ان کا جائز حصہ دینے میں پس و پیش سے کام لیا۔ نتیجتاً بنگالی عوام کو ساتھ ملانے سے مرکزی بیوروکریسی کی ہچکچاہٹ نے مغربی پاکستان کے بیوروکریٹس اور بنگالی سیاست دانوں کے درمیان دشمنی کو فروغ دیا جس کی وجہ سے وہ جلد ہی مایوسی کا شکار ہوگئے۔ چوہدری محمد علی اور مشتاق احمد گورمانی نے خواجہ ناظم الدین کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی میں شامل تجاویز کی صرف اس وجہ سے مخالفت کی کہ وہ پنجاب کے مفادات کے خلاف تھیں۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے راہنما تھے جو بنگالیوں کو جائز نمائندگی دینے کے حق میں نہ تھے۔ ممتاز دولتانہ تو مشرقی پاکستان کو برابری دینے کے سرے سے ہی مخالف تھے۔

بنگالیوں کی عددی فوقیت نے ان کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے پرزور مطالبہ کرنے پر مجبور کیا۔ مشرقی پاکستان کی عددی برتری کا اثر زائل کرنے کے لیے مسلم لیگ نے مغربی پاکستان کی نوکر شاہی کے ساتھ ساز باز کی اور شرم ناک دیدہ دلیری کے ساتھ مشرقی پاکستان کے حق رائے دہی کے اثر کو زائل کرنے کے لیے رسہ کشی شروع کی۔ مشرقی پاکستان کے ساتھ برابری حاصل کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا گیا اور مغربی پاکستان کے چار صوبوں کو ایک صوبے میں مدغم کردیا گیا۔ اس ادغام کے ذریعے مشرقی و مغربی پاکستان کے دو صوبے تشکیل دیے گئے۔ دونوں صوبوں کو مساوی نمائندگی دی گئی اور بنگالیوں کی اکثریت کے اثر کو زائل کردیا گیا۔

ون یونٹ سکیم کے شیطانی منصوبے کے خالق چوہدری محمد علی اور ممتاز دولتانہ تھے۔ ممتاز دولتانہ سیاسی جوڑ توڑ اور شعبدہ بازی میں وسیع سطح پر بدنام تھے۔ دولتانہ نے ون یونٹ سکیم تیار کرتے وقت اپنی سیاسی دھوکے بازی کی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ مکاری اور طاقت کے استعمال جو ون یونٹ کے مسودے نے تجویز کیا ثابت کرتے ہے کہ مصنف نے اپنے منصوبے کی بنیاد بدنام زمانہ میکاولی کی سوچ اور طرز عمل پر رکھی۔

1952ء میں مرکزی حکومت نے اردو کو سرکاری زبان بنانے کی خواہش کی۔ بنگالیوں نے مرکزی حکومت کی اس مضر تجویز پر سرعت سے ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے مسلم لیگ اور مغربی پاکستان کی نوکر شاہی کی اس تجویز میں اجنبی زبان کو مسلط کرنے کی خواہش کو اپنے ثقافتی ورثے کو بگاڑنے کی کوشش سے تعبیر کیا۔ مشرقی پاکستان شدید لسانی فسادات کی لپیٹ میں آ گیا جس نے مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کی ثقافتی برتری قائم کرنے کی کوشش پر گہری ناراضگی کو ظاہر کر دیا۔ انتظامی عہدوں اور حکومتی اداروں میں جانے کے خواہش مند بنگالی زبان بولنے والوں نے اس تجویز کو اپنے مفادات کے خلاف امتیازی سلوک سمجھا۔

مارچ 1954ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ کو ذلت آمیز شکست ہوئی کیونکہ مسلم لیگ طاقت ور مرکز کے حق میں تھی۔ رائے دہندگان نے وسیع پیمانے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کیونکہ مسلم لیگ مرکزی سطح پر عوام کی نمائندگی کرنے میں بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ انتخابات میں رائے دہندگان نے احتجاجی شرکت کر کے صوبائی حکومت کے خلاف بھی اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا جس نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء پر جو بنگالی زبان کے حق میں مظاہرہ کر رہے تھے گولی چلائی تھی۔

نسلی اختلاف کی شدت کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یونائیٹڈ فرنٹ نے 21 نقاطی منشور کی بنا پر انتخاب لڑا جس میں نسبتاً کمزور مرکز کا مطالبہ رکھا گیا تھا۔ انہوں نے بنگالی زبان کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا اور سوائے دفاع، کرنسی اور خارجہ امور کے تمام دوسرے معاملات میں مشرقی پاکستان کے لیے مکمل خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ یونائٹڈ فرنٹ کے منشور میں مشرقی پاکستان میں اسلحہ سازی کی فیکٹری اور نیوی کا ہیڈکوارٹر بنانے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اس نے مالی خود مختاری اور مرکزی تسلط سے مکمل آزادی کا بھی مطالبہ کیا۔ یونائیٹڈ فرنٹ مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں کا اتحاد تھا۔ اس نے واضح اکثریت سے انتخابات میں کامیابی حاصل کی جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بنگالی عوام مکمل صوبائی خود مختاری اور کمزور مرکز کے حق میں تھے۔ یونائیٹڈ فرنٹ کی غالب اکثریت نے پہلی بار پنجابیوں اور مہاجروں کی سیاسی نظام میں بالادستی کے خلاف بنگالیوں کی مایوسی کی طرف اشارہ کیا۔

یونائیٹڈ فرنٹ نے اے کے فضل الحق کی قیادت میں مشرقی پاکستان میں وزارت قائم کی۔ وزارت قائم ہوتے ہی بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان خونریز فسادات شروع ہو گئے۔ صوبائی حکومت نے شرپسندوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جس کی وجہ سے مرکزی حکومت سخت ناراض ہوئی۔ فضل الحق کو بات چیت کے لیے کراچی طلب کیا گیا۔ وزیراعلیٰ نے گفتگو کے دوران حیران کن بیان دیا اور پاکستان کے قیام کو جھٹلا دیا۔ ایک انٹرویو کے دوران فضل الحق نے کہا کہ مرکز کے ساتھ بات چیت کے دوران میری حکومت سب سے پہلے آزادی کا سوال اٹھائے گی۔ فضل الحق نے اپنے ایک بھارتی دورے کے دوران برصغیر کی تقسیم کی مخالفت کی اور بنگال کے ادغام کی تجویز پیش کی۔ فضل الحق نے کہا کہ وہ بھارتی عوام کی مدد سے دونوں بنگال کے درمیان مصنوعی رکاوٹیں دور کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ بنگالی عوام مشترکہ ثقافت کی وجہ سے ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ان کی صدیوں پرانی روایات ہیں۔

29 مئی 1954ء کو فضل الحق کے باغیانہ بیانات اور غیر ذمہ دار حرکات کے نتیجہ میں یونائیٹڈ فرنٹ کی وزارت توڑ دی گئی اور صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ سکندر مرزا جو ایک ملٹری بیوروکریٹ تھے اور اس وقت کے سیکرٹری دفاع تھے کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے کہا کہ اب مرکز دوبارہ کبھی بھی صوبے کو ملک توڑنے کی اجازت نہ دے گا۔

پس نسلی اور سیاسی اختلافات کی جڑیں صوبوں میں قائم تھیں۔ بالخصوص مشرقی پاکستان نے صوبے کو اپنا محکوم بنانے کی کوشش کے خلاف بھرپور ناراضگی اور دشمنی کا اظہار کیا۔ بنگالی بولنے والے نچلے طبقوں کا ابھرنا پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ انہوں نے آئینی ارتقا پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور آئین ساز اسمبلی جو کہ نمائندگی کے اصولوں اور کردار سے مبرا تھی کے طریق کار پر سخت فکرمندی کا اظہار کیا۔

علاقائی تناؤ میں اضافے کے ساتھ ہی خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئیں۔ اس کے باوجود برسر اقتدار اہلکاروں نے اس صورتحال کی طرف توجہ نہ دی اور نسلی فساد اور سیاسی رنجشوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا حکومت کا ان خطرات کو سمجھنے میں ناکامی اور بنگالیوں کی جائز شکایتوں کو دور کرنے کے انکار سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ 1952ء اور 1954ء کے واقعات نے بنگلہ دیش کے قیام کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔

سیاسی و معاشرتی عوامل کے علاوہ 48-1947ء کے دوران معاشی ناہمواری نے بھی مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نسلی فساد کو فروغ دینے میں بڑا کردار ادا کیا۔ پاکستان کے دو ثقافتی طور پر مختلف صوبوں میں شدید قسم کا معاشی عدم توازن پایا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد شروع کے سالوں میں سیاسی افراتفری کی بنیاد مشرقی صوبے میں معاشی ناانصافی کے احساس پر قائم تھی۔ معاشی دوڑ میں مشرقی پاکستان ہمیشہ پیچھے رہا ہے۔ دو دہائیوں میں دونوں صوبوں کے درمیان معاشی فرق بہت بڑھ گیا تھا۔

58-1951ء کے دوران مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کے مقابلے میں اپنی معاشی جدوجہد میں قدرے تیزی سے ترقی کر گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی پاکستان کی معاشی جدوجہد میں مشرقی پاکستان کے وسائل نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کے باوجود مغربی پاکستان میں وسیع وسائل کی موجودگی نے بھی مغربی پاکستان کی معاشی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مغربی پاکستان اپنی زرخیز زمین، ترقی یافتہ زراعت اور مقابلتاً مضبوط صنعتی بنیاد کی بنا پر پاکستان کی آمدن میں بہت بڑا حصہ دیتا رہا ہے۔ دوسری جانب مشرقی پاکستان برطانوی حکمرانوں کی غفلت کی وجہ سے مضبوط صنعتی بنیاد اور زراعت کی ترقی حاصل کرنے سے محروم رہا۔ اس حقیقت کے باوجود بنگالی عوام ہمیشہ مغربی پاکستان کی معاشی خوشحالی پر شدت سے کبیدہ خاطر تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مغربی پاکستان کی معاشی بہتری مشرقی پاکستان کی زرمبادلہ کی آمدن، مشرقی پاکستان کے صنعتی منافع اور حکومتی ٹیکسوں کی بدولت تھی۔ بنگالیوں کو یہ یقین ہوگیا کہ وہ مغربی پاکستان سے سیاسی تعلق کے بغیر کہیں زیادہ خوشحال رہ سکتے تھے اور یہ کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہتے ہوئے انہیں سوائے خستہ حالی اور معاشی پسماندگی کے قہرناک عذاب کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ پھر بھی اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان معاشی عدم مساوات نے نسلی فساد کو ہوا دینے میں بڑا کردار ادا کیا اور دسمبر 1971ء میں علیحدگی کی وجہ بنا۔

58-1951ء کے واقعات نے ناراض بنگالیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے سیاسی و معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے جدوجہد کریں۔ یہ صرف مرکز میں اختیار حاصل کرنے سے ہی ہوسکتا تھا۔ قدرتی طور پر بنگالیوں نے اقتدار میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ پنجابیوں اور مہاجروں کے تسلط سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا بنگالیوں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا جو کہ جمہوری طرز پر آزادانہ انتخابات تھے جس میں بنگالی اپنی عددی برتری کی بنا پر مرکزی حکومت پر قبضہ جما سکتے تھے۔ بنگالی عوام کی جمہوری نظام قائم کرنے کی مہم کا مقصد دراصل اقلیت نسلی گروپ کی برتری کو ختم کرنا تھا جس نے شرمناک طور پر ان کی معاشی خوشحالی کی جدوجہد کو ناکام بنا دیا تھا۔ پھر بھی بنگالیوں کی اپنے حقوق کے لیے جائز کوشش کو مغربی پاکستان کی بیوروکریسی نے لگاتار ناکام بنائے رکھا۔ مغربی پاکستان کی بیوروکریسی اقتدار کے ساتھ چمٹے رہی اور بنگالیوں کو خود مختار بننے کی اجازت نہ دی۔ اس کے نتیجہ میں 70-1951ء کے دوران ہونے والے واقعات نے تباہ کن خاتمے کی راہ ہموار کی اور 1971ء میں ملک خود مختار اور آزاد بنگلہ دیش کے قیام کے بعد دو ٹکڑے ہوگیا۔

سندھ Sindh

بنگلہ دیش کے قیام اور 70-1947ء کے دوران مشرقی بنگال میں سیاسی افراتفری نے باقی ماندہ پاکستان کے سیاسی حالات پر گہرا اثر ڈالا۔ پاکستان میں جمہوری نظام کے قیام کا مطالبہ اٹھا جس نے پاکستان کی آنے والی نسلوں کے لیے سخت امتحان پیدا کیا۔

مغربی پاکستان کے سرکردہ علاقائی راہنما جو اقتدار میں نہ آ سکے تھے جمہوری حکومت کے قیام کے لیے میدان میں آ گئے۔ صوبہ بلوچستان اور NWFP میں عبدالولی خان کی قیادت میں نیشنل عوامی پارٹی نے مرکز میں جمہوری حکومت کے قیام کے لیے مہم کا آغاز کیا۔

1977ء میں مارشل لگنے سے جمہوری نظام کے لیے جدوجہد کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ ایک دفعہ پھر یہ تحریک ان نسلی گروہوں نے شروع کی جو کہ دوسرے نسلی گروہ جو کہ زیادہ طاقت ور تھے کی وجہ سے زیر تسلط آ گئے تھے۔ 87-1977ء میں سندھ میں نسلی ہیجان پیدا ہوا جس نے پاکستان میں مشرقی بنگال کے نسلی فسادات کی یاد تازہ کر دی۔

1977ء میں مارشل لاء لگنے کے بعد اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا اور ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو جو ملک کے وزیراعظم اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین تھے انہیں قتل کیس میں ملوث کر کے آخرکار پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ بھٹو کی پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں انتخابات جیت گئی تھی۔ جب مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا تو بھٹو کو باقیماندہ پاکستان میں حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ لہٰذا بھٹو پہلے سندھی سیاست دان تھے جو عوامی انتخابات جیت کر ملک کے وزیراعظم بنے۔

بھٹو کے وزیراعظم بنتے ہی صوبہ سندھ میں بسنے والے دوسرے نسلی گروہوں کے مقابلے میں سندھیوں کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی ترقی کے لیے منصوبے شروع کیے گئے۔ بھٹو کٹر سندھی ہوتے ہوئے اپنے سندھی بھائی بہنوں کی خوشحالی میں دلچسپی رکھتے تھے۔ کراچی اور ملک کے دوسرے حصوں میں سندھیوں کے لیے ملازمت کے مواقع پیدا کیے گئے۔ سکولوں میں سندھی زبان کو لازمی قرار دیا گیا جس کی وجہ سے سندھی ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ سندھیوں کو نمایاں کرنے کے لیے میرٹ پالیسی پر عمل درآمد نہ ہوتا تھا۔ ایک سندھی جس کی کوئی تعلیم نہ ہوتی اور جس کے پاس مطلوبہ اہلیت کا معیار نہ ہوتا اسے دوسرے نسلی گروپ سے تعلق رکھنے والے امیدواروں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ ان دنوں ممتاز بھٹو جو ذوالفقار علی بھٹو کے "ذہین و فطین چچا زاد" بھائی تھے صوبہ سندھ کے وزیراعلیٰ تھے۔ انہوں نے سندھی ادب کو فروغ دینے اور سندھ سے دوسری زبانوں کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ ان کے سیاسی معاملات سے نپٹنے کا انتہائی نامعقول رویہ تھا جس کی وجہ سے صوبہ سندھ میں لسانی فسادات پھوٹ پڑے۔

بھٹو پہلے سندھی راہنما تھے جو ملک کی نمایاں سیاسی حیثیت تک پہنچے۔ وہ پہلے سندھی وزیراعظم تھے جنہوں نے سندھیوں کے ساتھ ماضی میں ہونے والے امتیازی سلوک کو ختم کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ لہٰذا جنرل ضیاء الحق کے ذریعے ان کے خاتمے نے سندھیوں کی بحالی کے پروگرام کو روک دیا۔ فوجی حکومت جس میں پنجابیوں کی اکثریت تھی کے اقدام نے وسیع پیمانے پر سندھیوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی۔ بھٹو کی پھانسی کو ملک کے دوسرے علاقوں کے اقتدار میں حصہ طلب کرنے کے مطالبے کو پنجابیوں کے ناقابل برداشت طرز عمل سے تعبیر کیا گیا۔ سپریم کورٹ میں چار پنجابی ججوں کے بھٹو کو پھانسی دینے اور تین غیر پنجابی ججوں کے بھٹو کو بری کرنے کے فیصلے نے بھی پنجابیوں کے ذریعے اپنے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک جسے بھٹو نے ختم کرنے کی ان تھک کوشش کی، نے سندھی تصور کو مزید تقویت دی۔

وسیع پیمانے پر پیپلز پارٹی کے خلاف انتقامی و ظالمانہ اقدامات کیے گئے جس نے پہلے سے موجود نسلی نفرت کو مزید تیز کیا۔ حکومت کے سندھی اہلکاروں کی جگہ فوجی افسروں کو تعینات کیا گیا۔ حکومت کے تمام اداروں میں فوجی افسر تعینات کیے جس سے نسلی نفرت و حقارت کو تقویت ملی۔

سندھ کی صوبائی حکومت کے آمرانہ فیصلوں کے خلاف نفرت و تشویش پہلی بار عوامی ردعمل کی شکل میں 1983ء میں سامنے آئی۔ سیاسی جماعتوں کے اتحاد جس میں پیپلز پارٹی سب سے نمایاں تھی نے بحالی جمہوریت کی تحریک شروع کی۔ فوجی حکومت نے تحریک کو سختی سے دبانے کی کوشش کی۔ تحریک تیزی سے صوبے کے دوسرے علاقوں میں پھیل گئی اور شہری و دیہاتی علاقے اس کی زد میں آ گئے۔ تحریک کو دبانے اور صورتحال پر قابو پانے میں فوجی حکومت کو چار ماہ کا طویل عرصہ لگ گیا۔

صوبے کے دوسرے سیاسی گروپوں نے بھی MRD کے احتجاج میں حصہ لیا۔ پیپلز پارٹی میں چونکہ سندھیوں کی اکثریت تھی اس لیے اس نے سرکردہ کردار ادا کیا۔ سندھی عوامی تحریک ایم آر ڈی میں سب سے طاقتور جماعت تھی۔ رسول بخش پلیجو جو کبھی ماؤزے تنگ کے جوشیلے پیروکار تھے SAT کے مرکزی راہنما تھے، اور سندھی قومیت کے انتہائی فعال کارکن تھے۔ جئے سندھ بھی سندھی قومیت کی حامی تھی جس کے لیڈر جی ایم سید تھے۔

ایم آر ڈی تحریک دراصل فوجی حکومت کے صوبہ سندھ میں کیے گئے سخت اقدامات کے خلاف سندھیوں کی ناراضگی کا اظہار تھا۔ سندھی عوام فوجی حکومت سے اس قدر اکتا گئے تھے کہ انہوں نے فوری طور پر ایم آر ڈی کی تحریک میں حصہ لیا جس کا مقصد فوجی حکومت کو لعن طعن کرنا تھا۔ سندھی خود کو اپنے ہی صوبے میں اقلیت میں تصور کرنے لگے جس نے ان کے اندر احساس محرومی کو جنم دیا۔ وہ بجا طور پر دوسرے گروپوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ انہوں نے ان کی اقلیتی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ سندھی عوام کو مایوسی سے نکالنے اور قومی دھارے میں لانے کے لیے زیادہ آئینی تحفظات کی ضرورت ہے۔

صوبہ خیبر پختون خواہ

سندھ کے مقابلے میں صوبہ خیبر پختون خواہ میں حالات بہتر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پٹھانوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان کے حکمران حلقوں میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ سندھیوں اور بلوچی عوام کے مقابلے میں پٹھان بیوروکریسی اور فوج میں بھی داخل ہوگئے ہیں۔ اس چیز نے صوبہ سرحد میں قومی وابستگی کے جذبات کو فروغ دیا ہے اور صوبے میں نسلی یک جہتی کو پروان چڑھانے میں مدد دی ہے۔ افغانستان میں روسی مداخلت نے بھی صوبہ سرحد کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورتحال پر مثبت اثرات مرتب کیے۔ افغانستان کے عوام نے پختونستان کے مار آستین کو کچلنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ پاکستان میں افغانی رفیوجیوں کی آمد اور بالخصوص صوبہ سرحد میں بڑی تعداد میں موجودگی نے پختونستان کی قریب المرگ تحریک کو آخری دھکا دیا اور یہ تحریک اپنی موت آپ مرگئی۔ پاکستان میں افغان مہاجرین کی رہائش سے درحقیقت پختونستان قائم ہوگیا جس نے سیاسی دھوکے بازی پر مبنی پختونستان کی تحریک کو ختم کر کے رکھ دیا۔

صوبے میں معاشی ترقی کی وجہ سے علاقائی اور نسلی گروہ بندی کو ختم کرنے میں بہت مدد دی۔ ملک کے دوسرے حصوں کو ہجرت اور گلف میں روزگار کے حصول نے پٹھانوں کی معاشی حالت کو تیزی سے ترقی دی۔ پٹھانوں کی بہت بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں پنجاب اور کراچی کو نقل مکانی کر گئی۔

بہرحال افغان رفیوجی اپنے ساتھ اسلحہ اور منشیات کی برائیاں لے کر آئے جس نے پاکستانی معاشرے پر منفی اثرات مرتب کیے۔ افغان پناہ گزینوں کے جنگجویانہ عادات سے پاکستان کی ثقافت میں دور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ افغان رفیوجیوں کے آنے سے فوری طور پر جو تبدیلی آئی وہ اسلحہ کی وسیع پیمانے پر پاکستان میں موجودگی تھی۔ اس کے علاوہ افغان پناہ گزینوں کی آمد سے ملک میں وسیع پیمانے پر منشیات پھیل گئیں۔ افغان رفیوجیوں پر منشیات کی سمگلنگ کا الزام تھا۔ منشیات کی آمد سے پاکستان کے معاشرے پر برے اثرات پڑے اور ہزاروں کی تعداد میں نشہ باز پیدا ہوگئے جس کی وجہ سے رفیوجیوں اور پاکستان کے عوام کے درمیان نفرت و دشمنی پیدا ہوئی۔ پاکستان کے عوام کے دلوں میں یہ خوف پیدا ہوا کہ رفیوجی اپنے گھروں کو واپس نہ جائیں گے اور مستقل طور پر پاکستانی معاشرہ میں گندگی پھیلانے کا ذریعہ بنیں گے۔

رفیوجیوں کی موجودگی سے پاکستان پر روسی اور افغان عذاب نازل ہوا۔ روسی اور افغان حکمرانوں نے پاکستان پر ہوائی حملوں اور دھماکوں کا سلسلہ شروع کیا جس نے ملک میں امن عامہ کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ رفیوجیوں کے بھیس میں افغان گوریلا افواج پاکستان میں

موجود تھیں جو عوامی جگہوں پر بموں کے دھماکے کر رہی تھیں۔ افغانستان کی خفیہ ایجنسی خاد نے حکومت پاکستان کو کمزور کرنے کے لیے بہت بے رحمانہ طریقہ اختیار کیا۔ اس نے پاکستان کے اہم شہروں کراچی اور پشاور کو اپنی سرگرمیوں کا نشانہ بنایا۔ کراچی کے وہ مقامات جہاں رفیوجی چھپے ہوئے ہو سکتے تھے بم دھماکوں کا نشانہ بنایا گیا۔

بلوچستان Balochistan

بلوچستان نسبتاً ایک پرسکون علاقہ ہے۔ لیکن 1979ء سے یہ صوبہ مرکزی حکومت کے ساتھ حقوق کی جنگ میں برسرپیکار رہا ہے۔ چند سیاسی گروپوں بالخصوص بلوچستان کے ممتاز طبقہ کے رویوں میں سختی آ گئی ہے۔ بلوچستان کے سرکردہ سیاسی رہنماؤں نے برملا مرکزی حکومت کی پالیسیوں کی مخالفت کی ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ چونکہ اب مرکزی حکومت کے ساتھ گزارہ ممکن نہیں لہٰذا ان کا واحد مقصد آزاد بلوچستان کا قیام ہے۔ بلوچستان کے سابق وزیراعلیٰ عطاء اللہ مینگل نے ایک انٹرویو کے دوران مرکزی حکومت پر سخت تنقید کی اور علیحدگی کے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ایوب اور بھٹو کے دور میں ہم نے اپنی جنگ لڑی۔ اسے ہم نے حکومت پاکستان اور عوام کے درمیان ایک جھگڑا خیال کیا۔ اس وقت ہم اپنے آپ کو پاکستان کے عوام سمجھتے تھے اور ملک کے ساتھ وفادار تھے۔ لیکن اب صورت حال مکمل طور پر بدل گئی ہے۔ اب ہمارے لیے پاکستان میں رہنے کی گنجائش نہیں اور اب ہماری جنگ آزادی کے لیے ہے۔

ایوب اور بھٹو کے دور میں بلوچستان پسماندہ علاقہ تھا اور اس کی ترقی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس وقت زندگی کے ہر شعبے میں بلوچ عوام کا استحصال کیا جا رہا تھا۔ حکومت کے نظام یعنی فوج اور بیوروکریسی میں بلوچ عوام کو نمائندگی حاصل نہ تھی۔ بلوچ نہ صرف حکومت کے اداروں میں موجود نہ تھے بلکہ صوبے کے اندر بھی اختیار سے محروم تھے۔ حکومت کی طرف سے صوبے کے معاشی و ترقیاتی منصوبوں سے لاپروائی نے بلوچ عوام کے پہلے سے موجود احساس محرومی کو اور تقویت دی۔ 1970ء میں بھٹو کی طرف سے بلوچ عوام کو نیچا دکھانے کے لیے فوج کے استعمال نے انہیں باقیماندہ ملک سے پرے دھکیل دیا۔ بلوچ حکومت کی کوشش کو ناکام کرنے کے لیے پہاڑوں میں چلے گئے لیکن دنیا کی بہترین فوج سے محاذ آرائی کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

حکومت نے بلوچوں کی رنجش کو دور کرنے کے لیے صوبے کے لیے ترقیاتی فنڈز جاری کیے۔ سڑکوں اور پلوں کا جال تعمیر کیا گیا جس سے نقل و حرکت میں قدرے آسانی پیدا ہوئی۔ بنیادی ڈھانچہ میں بہتری آنے سے قدرتی وسائل کی تلاش میں آسانی آئی۔ لیکن قدرتی وسائل کی تلاش نے بلوچ عوام کے غصہ میں تیزی پیدا کی کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ وسائل صوبے سے باہر دوسرے علاقوں کی ترقی کے لیے استعمال ہوں گے۔ سوئی گیس کراچی اور لاہور میں تجارتی استعمال کے لیے ترجیحی بنیادوں پر مہیا کی گئی جس کی وجہ سے بلوچ عوام میں سخت ناراضگی پیدا ہوئی کیونکہ وہ گیس کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ گیس پر رائلٹی بلوچ عوام کی امید سے بہت کم تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ رائلٹی کم از کم دوسرے گیس پیدا کرنے والے ممالک کی طرح 45% ہونا چاہیے۔ 12.5% کے حساب سے رائلٹی بلوچ عوام کی توقع سے بہت کم تھی جسے بلوچستان کے عوام کے سخت استحصال سے تعبیر کیا گیا۔

بہر حال افغانستان کے بحران اور شاہ ایران کی مطلق العنان حکومت کے خاتمے اور اندرونی چپقلش نے بلوچستان کے سیاسی لائحہ عمل کو دوبارہ سے طے کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بیرونی تبدیلیوں کی وجہ سے بلوچستان کی جغرافیائی و سیاسی اہمیت میں اضافہ ہوا جس کی وجہ سے بے تحاشا وسائل صوبے کو ملے۔ 1982ء میں امریکہ، سعودی عربیہ، EEC اور جاپان کی امداد سے خاص ترقیاتی پروگرام شروع کیا گیا۔ US Aid کے ذریعے بلوچستان کے ایریا ترقیاتی پروگرام پر عمل درآمد کیا گیا جسے BALAD کہا جاتا ہے۔ پانچ نئے ہوائی اڈے تعمیر کیے گئے اور گوادر پر نیوی ہیڈکوارٹر کی تعمیر شروع کی گئی۔

بیرونی تبدیلیوں اور اندرونی گرماگرمی اور محاذ آرائی سے مرکزی حکومت کے ساتھ بلوچ عوام کی دشمنی میں تھوڑی کمی آئی۔ حزب اختلاف اور دوسرے سیاسی گروہوں کے درمیان اختلافات وسیع ہوتے گئے۔ صوبے کے اندر بھی سیاسی اختلاف وسیع پیمانے پر پھیلے

جس کی وجہ سے بلوچستان میں مختلف سیاسی گروہ پیدا ہوئے۔ ان سیاسی گروہوں کی قیادت عطا اللہ مینگل اور خیر بخش مری کررہے تھے۔ اس کے علاوہ نواب اکبر بگٹی کی قیادت میں ڈیرہ بگٹی اور کوہلو کے بلوچ عوام مرکزی حکومت کے خلاف صف آراء ہوئے۔

چونکہ ضیا بلوچ عوام کو اقتدار میں شامل نہ کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کے دور حکومت میں صوبے کے حالات میں بہتری نہ آئی۔ حالانکہ ضیاء نے پٹھان اور پشتون راہنماؤں پر مقدمے چلانے کے لیے قائم کردہ حیدرآباد ٹریبونل توڑ دیا تھا لیکن ضیاء کی طرف سے کسی قسم کا معافقانہ اشارہ نہ ملنے پر بلوچ عوام کو بہت زیادہ پریشان کیا کیونکہ فوجی حکومت کا جاری رہنا پنجابی برتری کا جاری رہنا تھا۔

جنرل پرویز مشرف کے اقتدار میں آتے ہی ایک دفعہ پھر بلوچستان مرکزی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے بلوچستان میں عوام کی بہتری کے لیے چند ترقیاتی منصوبے شروع کرنا چاہے جنہیں وہاں کے مقامی سرداروں نے پسند نہ کیا۔ اس کے علاوہ گوادر بندرگاہ کی تکمیل کو بھی مقامی سرداروں نے تخریب کاری کے ذریعے روکنے کی کوشش کی۔ مقامی سرداروں کا خیال تھا کہ اگر مشرف حکومت کے شروع کردہ منصوبے مکمل ہوجاتے ہیں تو اس سے عوام پر ان کے اثر و رسوخ میں کمی آجائے گی۔ نیز گوادر بندرگاہ کے مکمل ہوجانے سے صوبے میں معاشی ترقی کا عمل زور پکڑے گا جو مقامی سرداروں کی طاقت کے لیے خطرہ تھا۔

نواب اکبر بگٹی نے مرکزی حکومت سے گیس کی رائلٹی میں اضافہ کا مطالبہ کیا اور اس کے ساتھ ہی کوہلو اور ڈیرہ بگٹی میں گیس کی تنصیبات پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ حکومت نے نواب اکبر بگٹی کی کارروائیوں کو روکنے کے لیے کوہلو میں فوجی چھاؤنی بنانے کی تیاری کی جسے اکبر بگٹی نے بزور طاقت روکنے کی کوشش کی۔ بہرحال آج کل مرکزی حکومت کے خلاف بلوچ عوام ایک دفعہ پھر برسرپیکار ہیں۔

بلوچستان رقبے کے لحاظ سے ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس کا 43 فیصد زمینی حصہ ابھی تک غیر ترقی یافتہ ہے جہاں جدید زندگی کی سہولیات میسر نہیں ہیں۔ عوام کو ذرائع رسل و رسائل تک رسائی حاصل نہیں۔ اس سلسلے میں ماضی میں حکومتوں نے علاقے کی ترقی کے بارے بلند بانگ دعوے کیے جو سب کے سب غلط ثابت ہوئے۔

صوبے کی پسماندگی کی وجوہات سے قطع نظر اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی کی صوبائی و وفاقی حکومتوں نے ملک کے اس حصے کو بہت بری طرح سے نظر انداز کیا۔ یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ ملک کا وہ حصہ جہاں وافر وسائل موجود تھے جو کہ قومی معاشی ترقی میں مددگار ثابت ہوسکتے تھے کو سستی و کاہلی کی بنا پر نظر انداز کیا گیا۔

بلوچستان کی پسماندگی جہاں حکومتی لاپرواہی کی بنا پر ہے وہاں بلوچ عوام کا اپنا رویہ بھی صوبے کی خستہ حالی کا ذمہ دار ہے۔ بلوچ عوام نے کبھی بھی ظالم سرداروں کے چنگل اور پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور خاموشی سے ظالم سرداروں کے ظلم کو سہتے رہے۔ لہٰذا بلوچ سرداروں کا غالبانہ اثر بھی بلوچستان کی ترقی کو روکنے کا بہت حد تک ذمہ دار ہے۔ ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیا الحق سب نے نیک نیتی اور خلوص سے صوبے کی ترقی کے لیے کوشش کی لیکن بلوچ سرداروں کی مخالفت کی وجہ سے کامیابی نہ ہوسکی۔ مختلف حکومتوں نے اپنے اپنے ادوار میں ترقیاتی منصوبے شروع کیے جنہیں بلوچ سرداروں کی مزاحمت کی وجہ سے ادھورا چھوڑنا پڑا۔ بلوچ سردار یہ سمجھتے تھے کہ صوبے کی ترقی وخوشحالی بلوچ عوام کو ان کے جابرانہ تسلط کے خلاف ابھارے گی جس سے ان کا اثر ونفوذ ختم ہوجائے گا۔

بلوچ سردار حکومت سے روپیہ وصول کرتے تھے جو کہ علاقے کی ترقی و بلوچ عوام کی بہتری کے لیے ہوتا تھا۔ لیکن سردار یہ روپیہ اپنے عیش و آرام کے لیے خرچ کرتے یا جدید اسلحہ خرید لیتے تھے۔ اپنے عوام کو دبانے کے لیے سرداروں نے نجی جیل خانے بنا رکھے تھے جہاں ان بے بس عوام کو قید کردیا جاتا تھا جو سرداروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے تھے۔ ایسے سرداروں میں اکبر بگٹی، عطاء اللہ مینگل اور خیر بخش مری کا شمار ہوتا ہے جو کافی عرصے سے وفاقی حکومت کو بلیک میل کرتے چلے آرہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے شروع کردہ ترقیاتی منصوبوں کی شدید مخالفت اور عوامی بے حسی نے حکمرانوں کو بددل کردیا اور علاقے کی ترقی اور خوشحالی کے لیے خاطر خواہ کام نہ ہوسکا۔

چونکہ پاکستان میں اکثر حکمرانوں کا تعلق صوبہ پنجاب سے رہا ہے اس لیے بلوچ پنجابیوں کو بجا طور پر اپنے استیصال اور پسماندگی کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بلوچستان کے وسائل پنجاب کی ترقی اور خوشحالی کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جب سابقہ مشرقی پاکستان میں یہی تاثر قائم ہوگیا تھا کہ مشرقی پاکستان کی کمائی مغربی پاکستان کی ترقی پر خرچ ہو رہی ہے۔ اس تاثر کو بنگال کے ہندوؤں نے وسیع پیمانے پر پھیلایا جو بالآخر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنا۔ اسی طرح بلوچ عوام کے اندر بھی پنجاب کے خلاف نفرت کو ہوا دی جا رہی ہے اور پنجاب کو تمام برائیوں کا ذمہ دار کہا جا رہا ہے۔

اس زہریلے پراپیگنڈے کی وجہ سے بلوچ عوام کی مسلح مزاحمت کا نشانہ پنجابی بن رہے ہیں جس کی وجہ سے بلوچستان میں رہنے والے پنجابی عدم تحفظ کا شکار ہوگئے ہیں۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا ہے کہ وفاقی حکومت کے اہلکار بلوچستان میں تعیناتی سے کترانے لگ گئے ہیں۔ اکثر وفاقی افسران بلوچستان میں تعیناتی رکوانے کے لیے سفارشیں کرواتے ہیں کیونکہ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ بلوچستان پنجابی افسران کے لیے غیر محفوظ جگہ بن گئی ہے۔ حکومت کو مجبوراً افسران کی تنخواہوں اور دوسری مراعات میں اضافہ کرنا پڑا تاکہ بلوچستان میں تعیناتی کے لیے محرکات دیئے جاسکیں۔

2002ء میں عام انتخابات ہوئے۔ انتخابات کے نتیجے میں بننے والی اسمبلی نے بلوچستان کے سابق وزیراعلیٰ اور ایک سردار میر ظفر اللہ خان جمالی کو وزیراعظم کے عہدے کے لیے منتخب کرلیا۔ میر ظفر اللہ خان جمالی پرانے سیاست دان تھے اور حکومت کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کا آغاز ٹھیک انداز میں کیا۔ لیکن حکومتی سازشوں کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہوسکے اور 2004ء میں انہیں وزیراعظم کے عہدے سے استعفیٰ دینے پر مجبور کردیا گیا۔

ظفر اللہ جمالی کے بعد چوہدری شجاعت وزیراعظم بنے جس نے بلوچ عوام کے دلوں میں پہلے سے موجود پنجابیوں کے خلاف نفرت کو تقویت دی۔ بلوچ عوام نے خیال کیا کہ میر ظفر اللہ خان جمالی کو پنجاب کے سیاست دانوں نے سازش کے ذریعے حکومت سے برطرف کیا ہے۔ میر ظفر اللہ خان پہلے بلوچ سیاست دان تھے جو حکومت کے اعلیٰ عہدے پر پہنچے۔ ان کے وزیراعظم بننے سے بلوچ عوام کے اندر ملک سے وابستگی کے جذبات پیدا ہوئے جو ان کے برطرف ہونے سے یکدم دشمنی میں بدل گئے۔ ظفر اللہ خان جمالی کے ساتھ ہونے والے سلوک نے بلوچ عوام کے اندر مایوسی اور بددلی پیدا کی۔

بلوچ عوام کے جذبات کو سرداروں نے بھڑکایا جنہوں نے پرویز مشرف حکومت کے خلاف مسلح مزاحمت کا آغاز کیا۔ بلوچوں نے حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کے لیے حساس تنصیبات پر حملے کیے جس سے صوبے میں امن عامہ کی نازک صورتحال پیدا ہوئی۔ بالخصوص کوہلو میں سوئی گیس کی تنصیبات پر تخریب کاروں نے لگاتار حملے کیے۔ حکومت نے حساس تنصیبات کی حفاظت کے لیے کوہلو میں فوجی چھاؤنی قائم کی جسے ڈیرہ بگٹی کے عوام نے سخت لڑائی کے ذریعے روکنے کی کوشش کی۔

جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے بلوچستان کی حالت پر قابو پانے کے لیے ایک طرف تو فوجی اقدام کیا لیکن اس کے ساتھ ہی بڑے بڑے منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کا کام شروع کیا۔ ان منصوبوں میں گوادر کی بندرگاہ اور میرانی ڈیم کی تعمیر سرفہرست ہیں۔ یہ منصوبے شروع کرتے وقت صدر مشرف نے کہا کہ ہم بلوچستان میں پائی جانے والی مایوسی کو ختم کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے گوادر کی بندرگاہ، میرانی ڈیم اور ساحلی شاہراہ کی تعمیر کا کام شروع کردیا گیا ہے تاکہ صوبے میں ترقی کا عمل شروع کیا جاسکے۔

بڑے منصوبوں میں سے ایک ساحلی شاہراہ (Coastal Highway) کی تعمیر مکمل ہوگئی ہے۔ پاکستان کا ساحلی علاقہ 800 کلومیٹر ہے جو کراچی سے لیکر ایران کی بین الاقوامی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ کراچی کے نزدیک حب سے لیکر جیوانی تک کے علاقے کو مکران کا ساحل کہا جاتا ہے۔ یہاں پر ساحل کے ساتھ اورمارہ (Ormara)، پسنی (Pasni)، گوادر (Gwadar) اور جیوانی (Jiwani) کی چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں موجود ہیں۔ کراچی کے مغرب کا ساحلی علاقہ (Coastline) بہت دیر سے بنیادی ڈھانچے کے نہ ہونے سے غیر ترقی یافتہ تھا جس سے علاقہ معاشی اور سماجی ترقی سے محروم رہا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ماضی کی کسی حکومت نے اس علاقے کے پسے ہوئے عوام کی ترقی وخوشحالی کی طرف توجہ نہ دی۔ اگر ان علاقوں کے عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تھوڑی سی کوشش بھی کی جاتی تو وہ پورے ملک کی معاشی حالت پر مثبت اثرات مرتب کرسکتی تھی۔ باوجودیکہ ملکی ابلاغ عامہ صاحب اقتدار لوگوں کی اس حالت زار کی طرف توجہ مبذول کرانے کی بھرپور کوشش کررہا ہے پھر بھی بیشتر مسائل ابھی تک حل نہیں ہوسکے۔

گوادر کی گہرے پانی کی بندرگاہ سب سے اہم منصوبہ ہے۔ 10 اگست 2001ء کو چین اور پاکستان نے بیجنگ میں ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کی رو سے چین کی حکومت گوادر بندرگار اور مکران کی ساحلی شاہراہ کی تعمیر کے پہلے مرحلے کے لیے 200 ملین ڈالر کی امداد دے گی۔ اس عظیم منصوبے پر کام ہورہا ہے اور اس کا دوسرا مرحلہ تقریباً مکمل ہونے والا ہے۔ گوادر کا گہرے پانی کی بندرگاہ کا منصوبہ علاقے میں تجارتی مرکز بننے کی صلاحیت رکھتا ہے یہ منصوبہ وسطی ایشیا کی ریاستوں کے ساتھ رابطہ قائم کرے گا۔ یہ بندرگاہ چین کی صنعت جو شاہراہ قراقرم، شاہراہ سندھ اور خضدار کے راستے مغربی حصے میں قائم ہوچکی ہے کے لیے گرم پانی تک مختصر اور آسان رسائی فراہم کرے گی۔

دوسرا عظیم منصوبہ میرانی ڈیم ہے۔ میرانی ڈیم کو واپڈا 5.861 بلین روپے کی لاگت سے تیار کررہا ہے جو کہ عنقریب مکمل ہوجائے گا۔ اس عظیم منصوبے کی تکمیل سے تقریباً 32,200 ایکڑ رقبہ زیر کاشت آئے گا اور 500 کلوواٹ بجلی پیدا کی جاسکے گی۔ اس کے علاوہ دریائے ہنگول پر ڈیم کی تعمیر سے علاقے کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی سیاحت میں اضافہ ہوگا کیونکہ مکران ساحلی شاہراہ کا منصوبہ باب پاکستان کراچی کو ملک کے دوسرے ساحلی علاقوں سے ملائے گا۔ مکران ساحلی شاہراہ اورمارہ کے نیوی کے اڈے تک راستہ فراہم کرے گا اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کے ساتھ رابطہ قائم کرے گا۔ امید کی جارہی ہے کہ جنرل مشرف کی حکومت کے شروع کردہ عظیم منصوبوں کے نتیجہ میں بلوچستان میں معاشی ترقی نئی لہر آئے گی جس سے علاقے کے عوام کی مایوسی ختم کرنے میں مدد ملے گی۔

مہاجر Muhajirs

بلوچستان اور سندھ میں نئے سرے سے اٹھنے والے نسلی طوفان نے مہاجروں کے نسلی احساس برتری کو بھڑکایا ہے۔ ان کے صوبے میں نسلی اختلاف نے مہاجروں کی اب تک دبی ہوئی نسلی سوچ کو جگا دیا تھا۔ سندھیوں کے نسلی طوفان نے مہاجروں کو حیران کردیا تھا اور انہیں یہ ڈر پیدا ہوا کہ وہ اس طوفان میں بہہ جائیں گے۔ صوبہ سندھ کا حصہ ہوتے ہوئے مہاجروں نے فوری طور پر اندازہ لگالیا کہ اگر وہ صوبے پر سندھی تسلط قائم کرنے کی کوششوں کو نہیں روکتے تو ان کی عددی برتری دبی ہوئی اقلیت میں بدل جائے گی اور ان کی نسلی شناخت ہمیشہ کے لیے تتر بتر ہوجائے گی۔

مہاجر شمالی ہندوستان اور بمبئی سے ہجرت کرکے پاکستان آئے تھے۔ تقسیم نے ہندوستان کے نسلی نقشے کو تبدیل کردیا تھا۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کی کئی قسمیں تھیں۔ مہاجروں کا ایک طبقہ وہ تھا جو نسلی حقائق کے عمل کی وجہ سے ہجرت کر گئے بالخصوص پنجاب کے لوگ۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو پاکستان میں بہتر اور خوشحال مستقبل کی امید لیکر آئے۔ خوش وخرم زندگی گزارنے کی تمنا ہی ہجرت کرنے کی وجہ نہ تھی بلکہ دوسرے بھی عوامل تھے جنہوں نے مہاجرین کو اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی وجہ تھی جس نے مہاجرین کو اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا۔ یہ ہندو برتری کا خوف تھا جو تقسیم کے بعد انتہائی ظالمانہ ہوسکتا تھا۔ درحقیقت جنہوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا ان کے لیے ہندوستان میں اب کوئی مواقع نہ رہ گئے تھے۔ نوزائیدہ ملک میں نئے آنے والوں کے لیے ترقی کے بے تحاشا مواقع تھے اور مہاجر جو انتہائی موقعہ شناس تھے فوری طور پر نوزائیدہ پاکستان میں حاصل مواقع پر جھپٹ پڑے۔

ہندوستان سے آنے والے جو پاکستان میں پچپن سال خوش وخرم رہنے کے بعد بھی اپنے آپ کو مہاجر کہتے ہیں وہ لوگ ہیں جو

ہندوستان کے صوبوں میں اقلیت میں تھے۔ پاکستان میں آنے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو مغربی پاکستان کے چار نسلی گروپوں سے علیحدہ پایا۔ انہیں مغربی پاکستان جہاں انہوں نے رہائش اختیار کی کے موجودہ نسلی و ثقافتی سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے میں دقت پیش آئی۔ اس کے علاوہ موجودہ ثقافتی گروپوں جن کی اپنی زبان اور ثقافت تھی کی موجودگی میں اپنے گروہی نام کی شناخت میں بھی دشواری پیش آئی جس کی بنا پر انہوں نے اپنی شناخت کے لیے لفظ مہاجر اپنایا۔

مہاجر اپنے آپ کو پاکستان کا معمار تصور کرتے ہیں اور پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ جدوجہد آزادی میں کسی دوسرے گروپ کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کسی پنجابی جرنیل کے تحت لڑی جانے والی جنگ کی صورت میں معرض وجود میں نہیں آیا اور نہ ہی سکھوں کے ہاتھوں پنجابی مسلمانوں کے قتل عام کا تقسیم ہند کے قصے پر کوئی اثر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 1947ء میں ہونے والا قتل عام اس وقت شروع ہوا جب کہ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا۔

پاکستان کی جدوجہد آزادی کے متعلق مہاجروں کی سوچ حقیقت پر مبنی نہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ تحریک پاکستان کے سرکردہ راہنماؤں کا تعلق ان علاقوں سے نہ تھا جو آج پاکستان کا حصہ ہیں اور نہ ہی وہ کسی بڑے ثقافتی گروپ میں سے تھے اس لیے تحریک آزادی میں ان کے حصے کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر پنجابی بولنے والے خضر حیات ٹوانہ نے گجراتی بولنے والے ایم اے جناح کی بجائے تحریک آزادی میں ذرہ بھر بھی کام کیا ہوتا تو آج صورتحال مختلف ہو سکتی تھی اور پنجابی مسلمان پاکستان کی آزادی میں قربانیوں کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

مہاجروں کا پنجابی مسلمانوں اور دوسرے گروپوں کی تحریک آزادی میں شرکت اور قربانیوں سے انکار قابل مذمت ہے۔ اس مخالفانہ نظریے کے پیچھے مہاجروں کا وہ احساس محرومی ہے جو ان کے اندر اپنے آپ کو ایک نسلی اقلیت میں آنے سے پیدا ہوا۔ دوسرے نسلی گروپوں کو دبانے کے عمل میں مہاجر پنجابیوں کے سب سے نزدیکی شریک کار تھے۔ دوسرے ثقافتی گروپوں کو محکوم بنانے کے لیے مہاجروں نے لسانی نفرت پیدا کی اور قومی اتحاد کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ ان کی ثقافتی رعونت اور اپنے ہم مذہبوں کے لیے معاشرتی نفرت نے پہلے بنگلہ دیش کو جنم دیا، اس کے بعد سندھ میں لسانی فسادات پھٹ پڑے اور آخر کار پنجاب نے بھی ان سے دوری اختیار کی۔

نسلی رعونت اور دوسرے ثقافتی گروپوں سے بیزاری نے مہاجروں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی نسلی برتری کو جائز و ناجائز طریقوں سے قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے مہاجروں نے سندھیوں کے ساتھ دوبدو کیا کیونکہ سندھیوں کی برتری میں مہاجروں کو اپنی محکومیت نظر آتی تھی۔ انہوں نے صوبے پر سندھیوں کے حقوق کی سختی سے مخالفت کی اور کراچی، سکھر اور حیدرآباد پر مشتمل مہاجروں کے لیے علیحدہ صوبے کا مطالبہ کیا۔

باوجود لاکھ کوشش کے مہاجر سندھیوں کو گرا نہ سکے۔ حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لیے مہاجروں نے اپنے طریق کار میں تبدیلی پیدا کی۔ اب انہوں نے پنجابیوں کو اپنی مہم کا نشانہ بنایا اور ان کے خلاف جارحانہ تحریک کا آغاز کیا۔ مہاجر پنجابیوں سے شدید نفرت کرتے ہیں اور انہیں کم تر ثقافتی و نسلی گروپ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ شدید نفرت و حقارت سے یہ سمجھتے ہیں کہ پنجابیوں نے پاکستان جسے اردو بولنے والے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بنایا تھا میں تمام اختیارات و طاقت پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ پنجابیوں پر تحریک آزادی میں رکاوٹ ڈالنے اور بنگلہ دیش کے قیام کی ذمہ داری ڈالتے ہیں۔ وہ اس پر پکا یقین رکھتے ہیں کہ اگر پاکستان نے قائم رہنا ہے تو صوبہ پنجاب کو دو ثقافتی حصوں میں تقسیم کر کے سرائیکی اور پوٹھوہار صوبے بنانا چاہئیں۔

بلاشبہ مہاجروں کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی جغرافیائی حدود میں رہتے ہوئے اپنی نسلی شناخت کے لیے کوشش کریں۔ یہ ان کی ثقافتی و معاشرتی ضرورت ہے۔ ان کی اس ضرورت کی سمجھ آتی ہے اور ہر کوئی ان کی اس وقتی تحریک کو ماننے کے لیے تیار ہے۔ لیکن اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سیاسی تشدد، تاریخ کو مسخ کرنا اور دھوکے بازی جو کہ مہاجروں نے دوسرے ثقافتی گروپوں کو زیر کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں وہ انتہائی قبیح اور قابل اعتراض عوامل ہیں۔

اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے MQM مہاجروں کی جماعت نے جو لائحہ عمل اختیار کیا ہے اس کی بنیاد دوسروں سے نفرت اور بغض پر قائم ہے۔ لیکن یہ طرز عمل کامیاب نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ ایسے وقت شروع کیا گیا جبکہ ملک کے تمام حصے علاقہ پرستی کی تنگ نظری سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سوچ کا نتیجہ اس وقت سامنے آیا جب 1990ء اور 1993ء کے انتخابات میں وہ جماعتیں جو مذہبی و نسلی بنیادوں پر انتخاب لڑ رہی تھیں انہیں عوام نے مسترد کر دیا۔ یہ جمہوریت اور مختلف نسلی سوچ کا فروغ تھا۔ اس وقت پاکستان ایک متحد ملک ہے جو ایم کیو ایم کے نفرت پھیلانے والے نعروں کو نظر انداز کر کے قومی نظریات کو پیش کر رہا ہے۔ نسلی مسئلہ اگرچہ پوری طرح سے ختم نہیں ہوا اس کے باوجود اس کا زہریلا اثر کسی حد تک ختم ہو گیا ہے۔

پنجاب کو مطعون کرنے کی مہم کا آغاز کر کے دراصل ایم کیو ایم نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی کا اظہار کیا ہے۔ پنجاب مخالف اچھی حکمت عملی نہ ہے کیونکہ یہ پنجاب کی نفرت کو ابھارے گی جو پنجابیوں کو مہاجروں سے دور لے جائیگی۔ حقیقت میں صوبائی سرحدوں کی نئے سرے سے نشان دہی کی حمایت کر کے مہاجر چاہتے کہ پنجابی بھی تنگ نظری اور جنونی صوبہ پرستوں کی طرح ردعمل کا اظہار کریں تاکہ مہاجر یہ کہہ سکیں کہ اس تنگ نظری میں مہاجر اکیلے نہیں ہیں۔ لیکن قومی مسائل کے بارے میں پنجابیوں کی سوچ کبھی بھی نسلی ترجیحات کے حوالے سے نہیں بلکہ زیادہ وسیع الذہن اور دلیل پر مبنی ہوتی ہے۔

نسلی فسادات پھوٹ پڑنے کے بعد صوبہ سندھ سخت قسم کی لاقانونیت اور خونی فسادات کا شکار رہا ہے۔ روزانہ ہزاروں انسان قتل کیے جاتے تھے۔ معصوم عوام کی بلا امتیاز ہلاکت روزانہ کا معمول تھی۔ بالخصوص کراچی جیسا پرامن اور خوبصورت شہر ان خونیں فسادات کا نشانہ رہا ہے۔ روزانہ کراچی میں ہزاروں انسانوں کو قتل کر دیا جاتا، لوٹ لیا جاتا اور اغوا کر لیا جاتا تھا۔ 1992ء میں وسیع پیمانے پر امن عامہ کی صورت حال بگڑ گئی جس کے لیے فوج کو طلب کرنا پڑا۔ اندرون سندھ میں حالات بہت بگڑ گئے۔ ٹرینوں پر حملے، اغوا برائے تاوان اور ہائی ویز ڈاکے بہت بڑھ گئے جس سے صورت حال بہت بگڑ گئی۔

لاقانونیت کا بھوت کراچی کی پرامن زندگی کو تباہ کر گیا۔ اسلحہ اور منشیات کے تاجر صاحب اقتدار اہل کاروں سے مل کر کراچی کے امن کو اپنے مذموم عزائم کے حصول کے لیے تباہ کر رہے تھے۔ اسلحہ اور منشیات کی سمگلنگ نے نہ صرف پاکستان کے معاشرے پر بھیانک اثرات مرتب کیے بلکہ اپنے ساتھ فرقہ وارانہ تشدد اور نسلی دشمنی کی برائیاں بھی لائی جس نے پاکستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو پراگندہ کر دیا۔

خونیں اور مہلک فسادات کی جڑیں اندرونی عوامل سے ملتی ہیں۔ نسلی خیالات کی حامی سیاسی جماعتوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ ان جماعتوں کی پشت پر سرکاری اہلکار ہوتے ہیں جو اپنے مفادات کے حصول کے لیے ان کو استعمال کرتے ہیں۔ اہل اقتدار کے ایماء پر ایم کیو ایم میں دراڑ پیدا کی گئی۔ متحدہ ایم کیو ایم کراچی میں غالب سیاسی قوت بن رہی تھی جسے حکومت میں شامل سرکردہ افراد پسند نہ کرتے تھے۔ علیحدگی پسندوں کے ایک گروپ کی سرپرستی کی گئی جس سے ایم کیو ایم (حقیقی) پیدا ہوئی۔ ایم کیو ایم (حقیقی) نے بڑی بے رحمی سے ایم کیو ایم (الطاف) کے اتحاد میں شگاف ڈالا اور اس کی سیاسی طاقت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

ایم کیو ایم کے دو ٹکڑوں میں منقسم ہونے سے کراچی کی امن عامہ کی صورتحال مزید بگڑ گئی۔ علیحدہ ہونے والے دونوں گروپوں کی قیادت جنونی افراد کے ہاتھوں میں تھی جو معمولی باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف خونیں جھگڑوں میں ملوث ہو رہے تھے۔ کراچی کی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ بہرحال جنرل پرویز مشرف کی حکومت کے ساتھ ہی کراچی میں قدرے امن پیدا ہوا۔ ایم کیو ایم پرویز مشرف کے ساتھ حکومت میں شامل ہو گئی جس کی وجہ سے ان کے مخالف دھڑے خود بخود غیر موثر ہو گئے۔ تقسیم اختیارات کے منصوبے پر عمل شروع ہوتے ہی مقامی حکومت میں ایم کیو ایم کو اکثریت مل گئی اور اس کی سب سے بڑی دشمن جماعت اسلامی کو کراچی سے اپنی سیاسی بساط لپیٹنا پڑی۔

باب نمبر 25

پاکستان میں فرقہ وارانہ تشدد

(Secretarian Violence in Pakistan)

فرقہ واریت اور مذہبی منافرت کسی بھی معاشرے کے لیے دردسر ہے یہ اسلام کے اصولوں اور عقائد کے منافی ہے۔ اسلام کا مطلب امن اور یک جہتی ہے اور یہ مذہبی جنون اور تعصب کی ممانعت کرتا ہے۔ یہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو بھی رحم دلی اور فراخ ذہن کی تعلیم دیتا ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے قیام کا مطلب دراصل یہ تھا کہ اب مسلمان اسلام کے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں گے اور اسلامی اقدار اور اصولوں کو فروغ حاصل ہوگا۔ اسلام ہر ایک کے لیے رنگ و نسل سے قطع نظر مساوات، غیر طبقاتی معاشرہ، انصاف اور قانون کی حاکمیت کی تلقین کرتا ہے۔ یہ فرقہ وارانہ تعصب کو نہیں مانتا اور نہ ہی مسلمان امت کو شیعہ، سنی، وہابی یا کسی اور فرقہ میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ تمام فرقے قائداعظم کی عظیم اور فعال قیادت میں ختم ہوگئے۔ جب انہوں نے تحریک پاکستان کی قیادت کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کیا۔ جب کسی نے قائداعظم سے یہ سوال کیا کہ آپ کا تعلق کس فرقے سے ہے تو آپ نے زور دے کر فوری جواب دیا کہ اسی فرقے سے جس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔

بدقسمتی سے پاکستان یں فرقہ وارانہ اختلافات انتہائی وحشیانہ انداز سے دوبارہ شروع ہوئے ہیں۔ حالیہ لہر جو غالباً تاریخ کی سب سے ہولناک اور ظالمانہ ہے، نے ملک کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ اس نے بالخصوص صوبہ پنجاب کو اپنا نشانہ بنایا ہے اور اسے قتل گاہ بنا دیا ہے۔ صوبہ سندھ سے فرقہ وارانہ فسادات کا ایک ایسے وقت صوبہ پنجاب منتقل ہونا سیاسی و مذہبی منافرت کی نشان دہی کرتا ہے، ہمارے رہن سہن کا حصہ بن چکا ہے۔ اس فرقہ وارانہ تصادم میں مسلمان ایک دوسرے کو انتہائی بے دردی سے قتل کررہے ہیں۔ معصوم اور بے خبر عبادت گزاروں کو امام بارگاہوں اور مساجد میں اسلام کے نام پر بے رحمی سے قتل کردیا جاتا ہے۔ عام طور پر جاہل اور متعصب مولویوں کے اکسانے پر ایسا ہوتا ہے جو ان پڑھ اور ناواقف عوام کو گمراہ کردیتے ہیں۔ پاکستان کم تر خواندگی شرح کی بنا پر پیروں، اماموں اور کم پڑھے لکھے مولویوں کے لیے مذہب کے نام پر باغیانہ سرگرمیوں کے لیے بہترین جگہ ہے۔

پاکستان میں فرقہ واریت پھیلنے کی وجوہات

(Factors for the Rise of Sectarianism in Pakistan)

1۔ مذہبی عصبیت (Religious Intolerance)

فرقہ واریت معاشرے میں موجود مذہبی گروپوں کی سرگرمیوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اس کا تعلق مذہب یا نسلی شناخت سے ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ فرقہ واریت سے متعلق دوسرے عوامل یعنی لسانی، معاشی یا ثقافتی شناخت بھی ہوسکتے ہیں۔ جغرافیائی و نسلی تعصب بھی اس کے فروغ میں کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ عوامل تعصب و نفرت کو پھیلاتے ہیں جو عصبیت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

مذہب کی بنیاد پر قائم ہر فرقہ یہ دعویٰ کرتا ہیں کہ صرف وہی صحیح اور خالص نظریہ کا حامل ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں پر زور دیتا ہے کہ چونکہ صرف ہم ہی ٹھیک اور نیک نظریات پر قائم ہیں اس لیے انہیں بے چوں و چرا ہماری بات اور نظریہ پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ تمام فرقے دوسرے فرقوں کو جھوٹا اور غیر اخلاقی کہہ کر مطعون کرتے ہیں۔

وہ فرقے جو سچے نظریات پر اپنا حق جتلانے میں معاشرے میں موجود دوسرے فرقوں کے بارے میں نفرت اور تعصب کا اظہار کرتے ہیں۔ کسی ایک گروہ کا دوسرے کے بارے میں اس طرح کا رویہ اور سرگرمیاں عصبیت کو فروغ دیتا ہے جو فرقہ واریت کو بدترین صورت میں پھیلانے میں زود اثر کردار ادا کرتا ہے۔ فرقہ وارانہ تشدد جو آج کل ہمارے معاشرے میں موجود ہے سخت نفرت اور عصبیت کی وجہ سے ہے۔ اس تصادم کا مقصد چھوٹے اور کمزور گروپ کو اقلیت قرار دینا اور اسے کافر کا لیبل لگانا ہوتا ہے۔ کوئی بھی مذہبی گروہ ایک مسلمان کی تعریف اور معنوں پر متفق نہیں۔

سر سے پاؤں تک عصبیت میں ملوث مذہبی گروہ ایک دوسرے کے خلاف تشدد پر اکساتے ہیں۔ وہ ملکی قوانین کو روند ڈالتے ہیں۔ یہ صورت حال اس وقت انتہائی خطرناک او رپیچیدہ ہوجاتی ہے جب کہ مذہبی فرقوں کی رسائی مہلک ہتھیاروں اور پیسے تک ہوجاتی ہے۔ حکومت کے لیے ایسے مذہبی فرقوں کو روکنا مشکل ہوجاتا ہے جنہیں اندرون ملک اور بیرون ملک سے مالی امداد ملتی ہے۔

بیرون ملک سے امداد اور چندہ اکٹھا کرنے کے لیے مذہبی گروہ بیرونی طاقتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ملک کی حکومت وقت کو کمزور کرنے کے لیے باغیانہ سرگرمیاں شروع کردیتے ہیں۔ بیرونی ممالک کے اپنے ہمسایہ ممالک کو کمزور کرنے میں مذموم مقاصد ہوتے ہیں جو حکومت وقت کو سیاسی مشکلات میں ڈالنے کے لیے ایسے مذہبی گروہوں کا استعمال کرتے ہیں۔

پاکستان کے شروع کے سالوں میں فرقہ واریت مفقود تھی اور بھائی چارے اور برداشت کی فضا قائم تھی۔ پاکستانی معاشرہ میں آزاد اور فراخ دل جذبات موجزن تھے جس کی وجہ سے مذہبی عصبیت اور تعصب ناپید تھا۔ لیکن قائداعظم کی بے وقت موت نے اس آزادانہ اور وسیع القلب ماحول کو ختم کردیا۔ قائداعظم کی موت اور لیاقت علی خان کی سرکردگی میں قرار داد مقاصد کی منظوری پاکستان میں مذہبی گروہوں کے فروغ کا باعث بنے۔

شیعہ اور سنی طبقوں کے درمیان روایتی دشمنی پاکستان میں فرقہ ورانہ تصادم کی بڑی وجہ ہے۔ دونوں طبقے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہے ہیں جس نے ملک کی سیاسی و مذہبی فضا کو پراگندہ کردیا ہے۔ شیعوں کی جماعت تحریک نفاذ فقہ جعفریہ 1988ء میں انتخابات میں کود پڑی۔ یہ پیپلز پارٹی کی ساتھی جماعت تھی جس کی وجہ سے اسے زبردست سیاسی پذیرائی حاصل ہوئی۔

بہت سے لکھنے والے اور تجزیہ نگار فرقہ واریت کی ابتدا ضیاء الحق کے دور سے کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ضیا الحق کی دینی مدارس کو بے پناہ مالی امداد سے فرقہ واریت کی لعنت کو تقویت ملی۔ مذہبی گروہوں کے اراکین کی خاصی تعداد ان مدارس سے آئی جو 1980ء میں یک دم پھیل گئے اور جو ضیاء الحق کے زکوٰۃ فنڈ کے پروردہ تھے۔ دراصل ضیا الحق ملک کے طاقت ور مذہبی حلقوں میں اپنے لیے ایک حلقہ انتخاب بنانا چاہتے تھے جو حقیقت میں مذہبی عصبیت کے فروغ کا باعث بنا۔ دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم محض بنیادی اصولوں پر زور دیتی اور اسلام کی انسانیت سے متعلق تعلیم سے عاری ہوتی تھی۔ یہاں پر سوالات کرنے کی اجازت نہ ہوتی اور خیالات و اعتقاد کو ذہنوں میں دلائل کی بجائے طوطے کی طرح بار بار رٹا دیا جاتا۔ یہ مدارس ملاؤں کی زیرنگرانی چلتے جہاں سے ایسے پیروکار نکلتے جو اپنے سرپرستوں اور آقاؤں کے ایک اشارے پر اپنی جان تک نثار کرنے کے لیے تیار ہوجاتے تھے۔

وسیع پیمانے پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ضیا نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے مذہبی حلقوں کی حمایت حاصل کرنا چاہی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دینی مدارس اور دوسرے مذہبی اداروں کے لیے زکوٰۃ کا ایک منظم نظام جاری کیا۔ اس کے علاوہ افغان جہاد

میں ملوث ہونے سے کم تعلیم یافتہ کو نمایاں حیثیت میں آنے کا موقع ملا۔ ابلاغ عامہ پر سخت حکومتی کنٹرول کی وجہ سے مذہبی فرقوں کو کوئی بھی ترقی پذیر اور ترقی کی حامل سرگرمی کو موثر طریقے سے روکنے میں مدد ملی۔

سیاسی عوامل (Political Factors)

پاکستان میں کثیر جماعتی نظام رائج ہے جو باہمی نفرت اور گروہ بندی کو پروان چڑھاتا ہے۔ جب مذہبی جماعتیں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو یہ برائیاں شدت اختیار کر لیتی ہے۔ مذہبی جماعتیں مذہب کو سیاست میں ملوث کرتی ہیں اور رائے دہندگان پر دباؤ ڈالتی ہیں کہ انہیں ووٹ دیے جائیں تاکہ معاشرے سے تمام برائیوں کو ختم کیا جا سکے۔ رائے دہندگان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے وہ دوسری سیاسی جماعتوں کو بدنام کرتی ہیں اور بالخصوص دوسری سیاسی جماعتوں پر غیر اسلامی ہونے اور عوام کو گمراہ کرنے کا الزام لگاتی ہیں۔ اس طرح کے کیچڑ اچھالنے سے ملک کی سیاسی فضا مکدر ہوئی ہے اور نفرت اور دشمنی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

1970ء میں پہلی بار تین مذہبی جماعتیں جماعت اسلامی، جمعیت العلماء اسلام اور جمعیت العلماء پاکستان انتخابات میں کو دپڑیں۔ مجموعی طور پر انہوں نے 124 نشستوں میں سے 16 نشستیں حاصل کر لی۔ صوبائی انتخاب میں JUI نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں قابل ذکر کامیابی حاصل کی۔ اس نے NAP کے ساتھ مل کر بلوچستان میں مخلوط حکومت قائم کی۔ JUP سندھ اسمبلی میں دوسری بڑی جماعت تھی۔ جماعت اسلامی پارلیمنٹ میں داخل نہ ہو سکی لیکن اس کے باوجود پنجاب اور سندھ میں پارلیمنٹ سے باہر منظم سٹریٹ پاور کی حامل تھی۔ پارلیمنٹ سے باہر موثر سٹریٹ پاور نے جماعت اسلامی کو ایک طاقت ور جماعت بنا دیا جس سے وہ حکومت وقت کے لیے سخت مسائل پیدا کر سکتی تھی۔

NAP اور JUI کا سیاسی اتحاد بہت اہمیت کا حامل تھا کیونکہ نظریاتی طور پر دونوں جماعتیں ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتی تھیں۔ دوسری جانب JUI کے راہنما مفتی محمود نے قومی اسمبلی میں جہاں پیپلز پارٹی کی اکثریت تھی قائد حزب اختلاف بننے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح کا اتحاد یعنی بلوچستان میں NAP اور JUI کا مخلوط حکومت بنانا انتہائی حیران کن تھا کیونکہ پیپلز پارٹی کے لیے JUI کی نسبت مکمل طور پر بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی NAP میں زیادہ کشش تھی اس قسم کی تبدیلیوں نے سیاسی مخالفت کو اور بڑھا دیا جس پر بھٹو کی مذہب کے بارے لچھے دار شعلہ بیانی اور آمرانہ طور طریقوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا جو مذہبی سیاسی جماعتوں کے پھیلاؤ کا موجب بنا۔

حالات اس وقت بہت زیادہ خراب ہوگئے جب سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد کو شروع سے ہی سیاست میں ملوث کیا گیا۔ دونوں جماعتیں جدید اسلحہ سے لیس تھیں۔ دونوں ایک دوسرے پر پاکستان میں فرقہ واریت کو فروغ دینے کا الزام لگاتی تھیں۔ پچھلے چند سالوں کے دوران ان کے کارکن فرقہ وارانہ قتل و غارت میں ملوث رہے ہیں۔ دونوں جماعتوں کے سربرآوردہ راہنما بموں کے دھماکوں میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ دونوں جماعتوں سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد کو روز روشن میں ہلاک کر دیا گیا جس سے فرقہ وارانہ تصادم میں شدید اضافہ ہوا۔

اگرچہ سپاہ صحابہ انتخابات میں کچھ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن پھر بھی اگر نمایاں سیاسی جماعتیں اس کے ساتھ نہ ملتی تو اس کے اثر و رسوخ کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ سرکردہ سیاسی جماعتوں نے سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد جیسی جنگجو جماعتوں کے اثر کو ختم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی۔ جب مذہبی جماعتوں نے سیاسی اختیار حاصل کر لیا تو کسی نہ کسی طرح انہوں نے بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان طاقت کے توازن پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ سیاسی جماعتوں کے ساتھ کھیلتی رہیں جو مذہبی

جماعتوں کے ہاتھوں اپنی کمزوری سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے خیال سے خوفزدہ تھیں۔ مذہبی جماعتیں جو سیاسی جماعتوں کی نازک حیثیت سے بخوبی آگاہ تھیں انہوں نے سیاسی اقتدار میں شامل ہونے کے لیے ان کی اونچی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ دائیں یا بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی سیاسی جماعتوں کے پاس اقتدار حاصل کرنے یا اقتدار میں رہنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ مذہبی جماعتوں کے ساتھ نزدیکی تعلق قائم رکھیں۔ پیپلز پارٹی نے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے ساتھ انتخابی اتحاد قائم کرلیا اور مسلم لیگ (ن) نے 1997ء کے انتخابات میں اس جماعت کو اپنے انتخابی دائرے میں شامل کرلیا۔ یہ چیز تباہ کن ثابت ہوئی کیونکہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) ایک فرقہ وارانہ تشدد پسند جماعت کو ملک کے سیاسی دھارے میں لانے کے ذمہ دار بنے۔ اسلامی جمہوری اتحاد فرقہ وارانہ گروہوں کو ملکی سیاست میں متعارف کروانے کی ایک اور مثال ہے۔

قومی سیاست کو مذہب کے ساتھ ملانے کا عمل لیاقت علی خان کے دور سے شروع ہوا اور اس وقت سے بغیر کسی رکاوٹ کے اب تک جاری ہے۔ ہر حکومت نے اپنی نااہلی، کنبہ پروری اور بدعنوانی کو چھپانے اور معصوم اور بے خبر عوام کو دھوکا دینے کے لیے نظام مصطفیٰ، شریعت بل اور اسلامی رفاہی ریاست کے تصور کو اچھالا۔ علماء جو ہمیشہ سے قائداعظم کے جدید، ترقی پسند اور جمہوری تصورات کی مخالفت کرتے رہے انہوں نے اسلام کے نام پر سیاسی اقتدار اور جاہ وحشمت حاصل کرنے کے لیے تشدد آمیز جدوجہد شروع کی۔

اگرچہ اس شدید فرقہ واریت کے فروغ میں ضیا الحق کی دینی مدارس کی سرپرستی کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے لیکن پھر بھی ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف اس مارِ آستین کو پروان چڑھانے میں برابر کے شریک رہے ہیں۔

1977ء میں اپنی انتخابی مہم کے دوران ذوالفقار علی بھٹو نے بڑی ہوشیاری سے اپنے سیاسی رہن سہن میں اسلامی اشتراکیت کے اصول کو متعارف کروایا۔ ایسا کرکے حقیقت میں بھٹو PNA کی تحریک کو کمزور کرنا چاہتے تھے جنہوں نے اپنی انتخابی مہم کی بنیاد معاشرتی اصلاحات اور عوام کی آزادی پر استوار کی تھی۔ بھٹو کی اسلام کے بارے شعلہ بیانی نے PNA کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ PNA نے بھٹو کو نیچا دکھانے کے لیے ایک اور چال چلی اور چند مطالبات پیش کیے۔ بھٹو نے بھی PNA کو شکست دینے کی خاطر ان کے مطالبات من وعن منظور کرلیے اور 17 جولائی 1977ء کو اپنی پریس کانفرنس میں جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا، جوا اور شراب پر پابندی اور تمام ہوٹلوں میں قرآن پاک رکھنے کا حکم دیا۔ یہ غیر مشروط طور پر ہتھیار پھینکنے کے مترادف تھا۔ ایسا کرکے بھٹو PNA کی شکل میں متحد مذہبی جماعتوں کے قہر وغضب سے بچنا چاہتے تھے۔ بھٹو کی پسپائی نے ضیاء کے پرشور اور وسیع پیمانے پر تشہیر کردہ تشکیل اسلام کے پروگرام کی راہ ہموار کی۔ بدقسمتی سے تشکیل اسلام کے عمل نے بجائے امن، مذہبی یک جہتی اور بھائی چارے کو فروغ دینے کے فرقہ واریت اور مذہبی عصبیت کو پروان چڑھایا جس نے ملک کا اتحاد پارہ پارہ کردیا۔

فرقہ وارانہ تشدد کے اثرات (Impact of Sectarian Violence)

فرقہ وارانہ تشدد نے ہماری معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ سب سے زیادہ اثر مذہب پر آیا ہے جہاں پر مذہبی عصبیت نے پاکستان کے معاشرتی نظام کو بگاڑنے میں کردار ادا کیا ہے۔ اس گہری مذہبی عصبیت کی بنا پر اسلام ایک دہشت گرد، جنونی اور تشدد پسند مذہب کے طور پر سامنے آیا ہے جو کہ اس کی اصل روح کے منافی ہے۔

اسلام کے نام پر اس قدر غلط اطلاعات، بدامنی اور ابتری پھیلادی گئی ہے کہ عام شہری بری طرح سے الجھن اور بدحواسی کا شکار ہوگیا ہے اور اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کو اپنی زندگی اور جائیداد کے لیے خطرناک سمجھتا ہے۔ مسجد میں جاکر نماز پڑھنے کو خطرناک اور غیر محفوظ سمجھا جاتا ہے کیونکہ مساجد جنونی افراد کے بموں کے حملوں اور بندوق کی جنگ کا گڑھ بن گئی ہیں۔ عوام کو روز روشن میں پرہجوم جگہوں پر ہلاک کردیا جاتا ہے۔

فرقہ واریت نے امن عامہ کو بھی متاثر کیا ہے۔ امن عامہ کی خراب صورت حال کسی خاص علاقہ تک محدود نہیں بلکہ سارا ملک اس کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ بگڑتی ہوئی امن عامہ کی صورت حال کو روکنا مشکل ہوگیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مذہبی گروہوں کے پاس اپنے فوجی و نیم فوجی دستے موجود ہیں جن کے پاس جدید اسلحہ بھاری تعداد میں موجود ہے۔ مذہبی گروہوں کے پاس جدید اسلحے کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ قاتل گروہوں کو بیرونی امداد ملتی ہے۔ قاتل اسلحہ استعمال کرنے میں ذرہ بھر نہیں ڈرتے۔ وہ ہمارے عدالتی و قانونی نظام کی غیر موثر اہمیت و اثر و نفوذ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

وسیع پیمانے پر مذہبی سرگرمیوں نے نہ صرف ہمارے سیاسی نظام کو انتہائی ضرر پذیر بنا دیا ہے بلکہ ملک کے صنعتی شعبے کو بھی کمزور کر کے معاشی نظام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ غیر یقینی امن عامہ کی صورت حال کی وجہ سے صنعتی پیداوار میں شدید کمی آئی ہے۔ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ فرقہ واریت کے بھوت کا سر کچل دیا جائے اور معاشی و سیاسی نظام کو پٹڑی پر چڑھا دیا جائے۔ حکومت کو ایسی افراتفری پھیلانے والے عناصر سے سختی سے نپٹنا چاہیے۔

باب نمبر 26

تنازع کشمیر

Kashmir Dispute

تعارف Introduction

ہندوستان کی شاہی ریاستیں جن کی تعداد 562 تھی برصغیر کے ایک تہائی رقبے اور ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل تھیں۔ مگر برطانوی حکومت کے انتظامی کنٹرول سے باہر تھیں۔ ان پر ہندوستان کے شہزادوں کی حکومت تھی جنہوں نے برطانیہ کو حاکم اعلیٰ مان لیا تھا۔ ان ریاستوں کی اکثریت علاقہ کے حساب سے چھوٹی تھیں لیکن حیدر آباد، میسور اور کشمیر آبادی اور علاقے کے حساب سے اتنی وسیع تھیں جتنے کے ہندوستان کے صوبے۔

20 فروری 1947 کو برطانوی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ برطانیہ کا اعلیٰ اختیار ہندوستان کی کسی بھی حکومت کو منتقل نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان اور شاہی ریاستوں پر برطانوی اقتدار اعلیٰ جون 1948ء میں ختم ہوجائے گا۔ برطانیہ کی حکومت نے یہ عوام کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں یا تقسیم کے بعد کسی حکومت کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔

15 اگست 1947ء تک سوائے جونا گڑھ، کشمیر اور حیدر آباد کے بقیہ تمام شاہی ریاستوں نے ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ اپنے الحاق کا اعلان کردیا تھا۔ یہ ریاستیں بعد میں ہندوستان کی جارحیت کا شکار ہوئیں۔

تاریخی پس منظر Historical Background

ریاست جموں وکشمیر برصغیر پاک و ہند کا انتہائی مشرقی حصہ ہے۔ یہ کوہ ہمالیہ، قراقرم اور کوہ ہندوکش میں گھرا ہوا ہے۔ رقبے کے لحاظ سے یہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ اس کا رقبہ 84471 مربع میل ہے۔ تبت، چین، افغانستان اور روس کے ساتھ سرحدوں کی وجہ سے اسے بے پناہ فوجی اہمیت حاصل ہے۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیر کی آبادی تقریباً 4,000,000 ہے جس میں سے 77 فیصد مسلمان ہیں۔ ریاست کے ہر صوبے میں مسلمان اکثریت میں ہیں جس میں صوبہ کشمیر میں 93%، جموں میں 61%، اور مشرقی گلگت میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً 100% تھی۔ اس وقت وادیء کشمیر 70 لاکھ کی آبادی اور تمام علاقے کے 10% رقبے کے ساتھ شاہی ریاستوں کے درمیان واقع ہے جس میں سے 2.7 ملین آبادی آزاد کشمیر اور گلگت، ہنزہ اور بلتستان کے شمالی علاقوں میں رہائش پذیر ہے۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیر کی کل آبادی 4,021,616 میں سے 3,100,000 ہندو اور 809,000 مسلمان ہیں۔ 1941ء سے آبادی میں ردوبدل اور سیاسی تقسیم کے باوجود کشمیر بدستور مسلمان اکثریت کا علاقہ ہے۔

کشمیر کا المیہ اس وقت شروع ہوا جب انگریزوں نے 1846ء میں معاہدہ امرتسر کے تحت ریاست جموں وکشمیر کو ہندو ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کے ہاتھ صرف 75 لاکھ روپے میں فروخت کردیا۔ لارڈ لارنس جنہوں نے اس معاہدے پر بات چیت کی انہوں نے

اس معاہدے کو "عیارانہ منصوبہ" قرار دیا۔ مسلم اکثریت کے وسیع علاقے کی فروخت کو وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ اپنی خط وکتابت میں جائز قرار دیا اور کہا کہ یہ معاہدہ سکھوں کے خلاف جنگوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ضروری تھا۔ مہاراجہ اور اس کے قریبی رشتہ داروں نے ریاست میں ایک صدی تک مطلق العنان اور آمرانہ حکومت قائم کی۔ عوام کے ساتھ بے رحمی سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا اور ان پر بھاری ٹیکس عائد کیے جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ بدحال اور سخت غربت زدہ زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً انتہائی ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ حکومتی عہدوں پر ہندوں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ گائے کی قربانی منع تھی۔ اگر کوئی مسلمان اپنے خاندان کی پرورش کی غرض سے گائے ذبح کرتا تو اس کی سزا موت ہوتی جو بعد میں گھٹا کر دس سال قید کردی گئی۔ کشمیری انتہائی باصلاحیت قوم ہیں لیکن سخت سزا اور ظالمانہ اقدامات کی وجہ سے ان کے جذبات وعزائم کو تباہ کردیا گیا۔ ہندوستان میں رہنے والے بہت سارے انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف مہاراجہ کی ظالمانہ روش کی سخت مخالفت کی۔ 1925ء میں پونچھ کی جاگیر بھی مہاراجہ کے حوالے کردی گئی۔ مہاراجہ کے جابرانہ اقدامات نے ریاست کے مسلمان کشمیریوں کو اس سے سخت بدظن کردیا تھا۔

1930ء کی دہائی میں تعلیم پھیلنے سے بنیادی سیاسی مطالبات کی مانگ شروع ہوئی۔ 1931ء میں کشمیری مسلمانوں نے احتجاجی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے لیڈر شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس تھے۔ انہوں نے جموں وکشمیر کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ مہاراجہ نے تحریک کو دبانے کے لیے جابرانہ اقدامات کیے جس کے نتیجے میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں حکومت ہندوستان نے گلینسی کمیشن مقرر کیا جس کی سفارشات کی روشنی چند آئینی اصلاحات جاری کی گئیں۔

1939ء میں شیخ عبداللہ گاندھی اور نہرو کے اثر میں آگئے۔ کانگریسی راہنماؤں نے شیخ عبداللہ مسلم کانفرنس فرقہ وارانہ تنظیم میں بدل دینے کی شرط پر مہاراجہ کے خلاف جدوجہد میں حمایت کا یقین دلایا۔ لہٰذا شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کانگریس کے حق میں حکمت عملی اپنانا شروع کردی۔ اس کے نتیجہ میں چودھری غلام عباس اور میر واعظ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہوگئے اور اپنی الگ تنظیم مسلم کانفرنس کے نام سے قائم کرلی۔ شیخ عبداللہ نے اپنے کانگریسی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے نیشنل کانفرنس قائم کی۔ اس صورت حال سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آگئے۔

جلد ہی تحریک ڈوگرہ حکومت کے خلاف وسیع احتجاج کی شکل اختیار کرگئی۔ آزاد اور خودمختار پاکستان کے مطالبے نے نئی صورت حال پیدا کردی۔ جوں ہی مطالبہ پاکستان میں تیزی آئی شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس جو کہ کانگریس کی ساتھی جماعت تھی اپنی مقبولیت کھو بیٹھی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے شیخ عبداللہ نے قائداعظم سے مدد مانگی۔ قائداعظم خاص طور پر خود کشمیر گئے تاکہ دونوں جماعتوں کو اکٹھا کیا جاسکے لیکن ان کی تمام کوششوں پر شیخ عبداللہ نے پانی پھیر دیا کیونکہ وہ کانگریس کی طرف بہت زیادہ مائل ہوچکے تھے۔ قائداعظم شیخ عبداللہ سے سخت ناراض ہوئے اور ان کے طرز عمل کو ماننے سے انکار کردیا۔

شیخ عبداللہ نے اسمبلی کے انتخابات کا مقاطعہ کیا جبکہ مسلم کانفرنس نے انتخابات میں حصہ لیا اور اکثریت حاصل کی۔ کشمیر کے وزیراعظم پنڈت کاک نے 1946ء میں برصغیر کی آزادی کے موقع پر شیخ عبداللہ کو جیل میں ڈال دیا۔ پنڈت کاک مہاراجہ کے ساتھ مل کر جموں وکشمیر کی آزادی کا اعلان کرنا چاہتا تھا جو کہ شیخ عبداللہ اور دوسرے سرکردہ کشمیری راہنماؤں کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ شیخ عبداللہ نے مہاراجہ سے چھٹکارہ پانے کے لیے اپنی "کشمیر خالی کرو" (Quit Kashmir) کی تحریک بھی شروع کی ہوئی تھی۔ کشمیر کے اعلان آزادی کے متعلق پنڈت کاک کی نیت کا کسی نہ کسی طرح کانگریس کے لیڈروں کو پتہ لگ گیا۔ پنڈت نہرو جو اس وقت کیبنٹ مشن کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے اپنے ذاتی دوست شیخ عبداللہ کو جیل سے رہا کروانے کے لیے جلدی سے کشمیر

پہنچے۔ وہ شیخ عبداللہ کو پوری طرح سے کانگریس کے ساتھ ملانا چاہتے تھے۔ دوسری جانب گاندھی نے ماؤنٹ بیٹن سے مل کر اپنے کشمیر کے دورے کا بندوبست کیا۔ گاندھی اگست 1947ء میں کشمیر پہنچے اور مہاراجہ اور وزیراعظم پنڈت رام چندرا کاک سے ملاقات کی۔

گاندھی کا مقصد پنڈت کاک کو برطرف کروانا اور مہاراجہ کو کشمیر کے ہندوستان سے الحاق پر راضی کرنا تھا۔ گاندھی نے اپنے روحانی پیشوا کے ذریعے مہارانی کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کے لیے ریاکارانہ رویہ اپنایا۔ ہندوؤں کے دلوں میں گاندھی کے لیے عزت نے آسانی سے گاندھی کو اپنے مذموم سیاسی مقاصد حاصل کرنے میں مدد دی۔ گاندھی نے مہارانی کے ذریعے مہاراجہ پر شدید دباؤ ڈالا۔

گاندھی کے دورۂ کشمیر کے دس دنوں کے اندر پنڈت کاک کو برطرف کردیا گیا۔ ایک مہینے بعد شیخ عبداللہ کو جیل سے رہا کردیا گیا لیکن چودھری غلام عباس اور دوسرے مسلمان لیڈر بدستور جیل میں بند رہے۔ کشمیر کا مسئلہ اب گاندھی کے مطابق طے ہونے کے راستے پر آچکا تھا۔ مہاراجہ پر ہندوستان سے الحاق کے لیے دباؤ بڑھا دیا گیا۔

جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو کشمیر پر مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت تھی جو اپنے پیش رو کی طرح ظالم اور جابر حکمران تھا۔ تقسیم کے وقت کشمیر کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی بنا پر مہاراجہ کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرے گا۔ کشمیر کے عوام کی خواہشات کا اظہار اس وقت کیا گیا جب 15 اگست 1947ء کو ریاست کے طول وعرض میں پاکستان ڈے کے طور پر منایا گیا۔ کشمیر کے عوام نے مہاراجہ پر پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کرنے کے لیے دباؤ بڑھانا شروع کردیا۔

چونکہ برطانوی حکومت کشمیر کا الحاق ہندوستان سے چاہتی تھی اس لیے ان کی جغرافیائی و سیاسی سوچ تقسیم کے طے کردہ اصولوں سے بالکل مختلف تھی۔ وزیراعظموں کا بار بار بدلنا، ماؤنٹ بیٹن، گاندھی، نہرو اور وی پی مینن کے کشمیر کے دورے اور شیخ عبداللہ کی مہاراجہ سے صلح کے بعد جیل سے رہائی بڑے اونچے پیمانے پر بڑی بڑی شخصیات کے درمیان خفیہ ساز باز کی نشان دہی کرتی ہے۔ شیخ عبداللہ کو اندھیرے میں رکھ کر آلہء کار بنایا گیا۔ مہاراجہ کو خفیہ طور پر مسلمانوں کے قتل عام کا اشارہ دیا گیا۔ اس منصوبے پر عملدرآمد کے لیے ڈوگرہ جرنیل جانک سنگھ کو کشمیر کا وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے ہتھیار کشمیری حکام کے حوالے کردیں۔ آزادی کے موقع پر گلگت ایجنسی مہاراجہ کو ساٹھ سالہ ٹھیکے پر دینے سے مسلمانوں کے خدشات میں اضافہ ہوا۔ ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے خلاف سازش تیار کی گئی۔ شیخ عبداللہ کی جیل سے اس وقت رہائی جبکہ وہ اپنے انتخابات کے مقاطعے کی وجہ سے انتخابی استحقاق نہیں رکھتے تھے نے بہت سے ماتھوں پر شکنیں پیدا کیں۔ شیخ عبداللہ کو مہاراجہ کے ساتھ رسمی معذرت پیش کرکے صلح پر مجبور کیا گیا۔ حالانکہ مہاراجہ شیخ عبداللہ کو پسند نہ کرتا تھا لیکن پھر بھی انہیں تابعداری دکھانے پر نوازا گیا اور حکومت میں شامل کرلیا گیا۔ 26 اکتوبر 1947ء کو وی پی مینن نے مہاراجہ سے کشمیر کے ہندوستان کے الحاق کی منظوری بہ زور حاصل کرلی۔

چونکہ عوام نے مہاراجہ کو بیدخل کردیا تھا اس لیے مہاراجہ الحاق کی دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے قانونی اختیار نہیں رکھتا تھا۔ اسی اثنا میں پونچھ، بلتستان اور گلگت کی بغاوت تمام وادی میں پھیل گئی۔ ہری سنگھ جان بچانے کے لیے جموں بھاگ گیا۔ ہمسایہ شاہی ریاستوں میں فرقہ وارانہ فسادات نے پونچھ میں صورت حال مزید خراب کردی۔ پنجاب اور فرنٹیئر سے رضا کاروں نے پونچھ میں اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے سری نگر کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ حسب معمول بھارت نے کشمیر میں بغاوت کو فروغ دینے کا الزام پاکستان پر لگایا۔

لوگوں کی توجہ ہٹانے اور بڑھتے ہوئے دباؤ کو کم کرنے کے لیے ہندو راجہ نے پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ طے کیا۔ حکومت پاکستان کو اس معاہدے کی رو سے یہ یقین دلایا گیا کہ ریاست میں حالات پرامن رکھے جائیں گے اور یہ کہ پاکستان کے ساتھ مذہبی

وثقافتی تعلقات جاری رکھے جائیں گے۔ اس معاہدے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کے لیے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا گیا۔ عوام نے معصوم لوگوں کے قتل عام کے خلاف بغاوت کردی۔ 2,37,000 سے زائد معصوم و بے گناہ مسلمانوں کو قتل کردیا گیا اور تقریباً 5,00,000 انسانوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور کردیا گیا۔

ہندو راجہ نے بھارتی حکومت سے بغاوت کو کنٹرول کرنے کے لیے مدد مانگی۔ ہندوستان نے فوری طور پر اپنی فوجیں کشمیر میں اتار دیں۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم نے جنرل گریسی کو کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ جنرل گریسی نے حکم ماننے سے انکار کردیا اور کہا کہ وہ ہندوستان، پاکستان کی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکن لیک کے حکم کے بغیر ایسا نہیں کرسکتے۔

کشمیر کے عوام بھارتی فوجوں کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے۔ بہت سارا علاقہ بھارتی قبضے سے آزاد کرالیا گیا۔ بھارتی فوجوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا اور کشمیر میں ان کی پوزیشن بہت نازک ہوگئی۔

پھر بھی پاکستان نے جھگڑے کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی۔ قائداعظم بذات خود مہاراجہ سے بات چیت کرنے کے لیے کشمیر جانا چاہتے تھے لیکن مہاراجہ نہیں چاہتا تھا کہ قائداعظم کشمیر آئیں۔ 2 اکتوبر 1947ء کو لیاقت علی خان کشمیر کے لیے امداد کے بارے گفتگو کرنا چاہتے تھے لیکن کشمیر کے وزیراعظم نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر ملنے سے انکار کردیا۔ اس کے باوجود حکومت پاکستان نے وزارت خارجہ کے ایک سینئر افسر کرنل شاہ کو کشمیری حکام سے بات چیت کے لیے بھیجا۔ کشمیر کے وزیراعظم نے ان کے ساتھ بات کرنے سے انکار کردیا۔ قائداعظم 1 نومبر 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن سے ملے اور مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز دیں۔

1- دونوں گورنر جنرل اڑتالیس گھنٹوں کے اندر فائر بندی کا حکم جاری کریں۔
2- کشمیر سے بھارتی افواج اور قبائلی رضا کاروں کا انخلاء بیک وقت شروع کیا جائے۔
3- دونوں گورنر جنرلوں کو امن قائم کرنے کے لیے مکمل اختیارات دیے جائیں اور وہ کشمیر میں رائے شماری کروانے کا بندوبست کریں۔

جب یہ تجاویز بھارت کی حکومت کو پیش کی گئیں تو نہرو نے اعلان کیا کہ جب کشمیر میں امن بحال ہوجائے گا تو حکومت ہندوستان بین الاقوامی نگرانی میں رائے شماری کروائے گی۔

نہرو نے بڑا ضدی رویہ اختیار کرلیا تھا۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے ہر تجویز نہرو نے ٹھکرا دی۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ تیسری پارٹی کی مداخلت کے بغیر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ برطانوی وزیراعظم نے بھی نہرو کو پرامن اور منصفانہ حل کے لیے قائل کرنا چاہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ماؤنٹ بیٹن کے خیال میں اقوام متحدہ میں جانا سب سے بہتر حل تھا۔ لہٰذا ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی کے انکار کے باوجود نہرو کو اقوام متحدہ میں پاکستان کے خلاف شکایت داخل کرنے پر راضی کرلیا۔

یکم جنوری 1948ء کو حکومت ہندوستان نے سیکورٹی کونسل سے یہ کہا کہ پاکستان کے فوجی وسول افراد کو ریاست جموں وکشمیر پر حملہ کرنے سے روکا جائے، پاکستان کے دوسرے باشندوں کو ریاست کے اندر جاری لڑائی میں حصہ لینے سے روکا جائے اور حملہ آوروں کو ریاست کی زمین پر قبضہ کرنے یا کسی اور قسم امداد کو روکنے سے باز رکھا جائے۔ بھارت کی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ جب امن قائم ہوجائے گا تو ریاست کے لوگ بین الاقوامی نگرانی میں رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

حکومت ہندوستان نے کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ میں اس امید پر پیش کیا کہ اس طرح وہ پاکستان پر سفارتی فتح حاصل کر لے گا۔ 1952ء تک نہرو یہ کہتا رہا ''ہم نے کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کیا ہے اور اس کے پرامن حل کے لیے ہم نے وعدہ کیا ہے۔ ایک بڑی قوم ہوتے ہوئے ہم اپنے الفاظ سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ ہم نے مسئلے کے آخری حل کو کشمیریوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے اور ہم ان کے فیصلے کو ماننے کو تیار ہیں۔'' نہرو کشمیر میں نظریاتی اور جذباتی اہمیت کی بنا پر اپنے الفاظ کو بدل دیتے تھے۔ 1950ء کی دہائی میں برطانیہ کے ہائی کمشنرز دنیا کے مسائل پر نہرو کے انداز گفتگو سے بہت پریشان تھے۔ اسی وقت نہرو نے کشمیر کے بارے میں مختلف بیانات دیے۔ 1950ء میں اقوام متحدہ کے سفیر سر اوون ڈکسن نہرو کے متضاد طرز عمل سے سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے نہرو کو انتہائی لغو قسم کا جھوٹا قرار دیا۔ ڈکسن نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے اپنا فارمولا پیش کیا جو دونوں متحارب ممالک کے مطالبات کو پورا کرتا تھا۔ حکومت پاکستان نے ڈکسن فارمولا مان لیا جبکہ بھارتی حکومت اسے مسترد کر دیا۔

کشمیریوں کا نقطہ نظر Kashmir Factor

کشمیر کے بارے میں کوئی بھی تجویز جو کشمیری عوام کے نقطۂ نظر یا جذبات کو سمجھے اور پرکھے بغیر دی جائے وہ بالکل بے سود ہوگی۔ پچھلے پندرہ سالوں سے کشمیریوں کے نقطہ نظر میں بڑی اہم تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ کشمیری عوام جو واضح طور پر کشمیر کے مسئلہ کے بارے بین الاقوامی بے حسی کی وجہ سے سخت ناراض اور مایوس ہیں انہوں نے انڈین یونین میں کشمیر کے انضمام کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ اب ان کا دھیان کشمیر کی نسلی قومیت کی طرف مڑ گیا ہے جس میں جغرافیائی الحاق، تاریخ، تہذیب و تمدن اور مذہب پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کشمیریوں کے نقطہ نظر میں ایسی تبدیلی کو جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) نے کشمیریات کا نام دیا ہے۔

دوسری جانب چند متحرک کشمیری گروپوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام نسلی پہچان کا سب سے اہم اور ضروری حصہ ہے۔ باوجود اس کے کہ بھارت پچھلے 58 سالوں سے ریاست پر جابرانہ تسلط قائم کیے ہوئے ہے اسلام اسی طرح مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ بھارت میں مذہبی و نسلی پارٹیوں جیسا کہ BJP کے احیاء نے کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو بہت زیادہ آگے بڑھایا۔ موجودہ دور کے سخت قسم کے افسر شاہی اور مرکزیت کے ڈھانچے نے واضح نسلی جھکاؤ کی وجہ سے جنوبی ایشیاء میں نسلی احساس کو متحرک رکھا۔ اس نے کشمیری عوام کے نقطہ نظر پر ان مٹ تاثر قائم کیا اور پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے نظریے کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

کشمیر کے مسلمانوں کو اسلام کے پیروکار ہوتے ہوئے اپنی امتیازی شناخت کا سختی سے احساس ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہندوستانی معاشرہ سے علیحدہ اور امتیازی حیثیت کا حامل سمجھتے ہیں اور ہندوستان کے معاشرتی دھارے میں ضم ہو جانے کے خیال کو یکسر رد کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی امتیازی مذہبی و قومی شناخت کو جغرافیائی علیحدگی اور ہندوؤں کے غیر منصفانہ تسلط کی بنا پر سمجھتے ہیں۔ کشمیریوں کے باشعور اور ذی فہم طبقوں نے ابھی تک ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے نظریے کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ اکثر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ریاست میں رائے شماری کروانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کے سیاسی و اخلاقی حیثیت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ پاکستانی ایجنٹ اور بنیاد پرستی کے الزامات نے ان کے علیحدگی کے احساس کو زیادہ گہرا کر دیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے جدوجہد آزادی کو دبانے کے لیے ظالمانہ حربوں کے استعمال نے تحریک آزادی کو تیز کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

کشمیریوں کے متحرک گروپوں نے اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کر لی ہے۔ وہ آپس میں لڑنے کی بجائے اب متحدہ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک 13 جماعتی اتحاد تحریک حریت کشمیر قائم کیا گیا ہے (THK) جو مختلف کشمیری گروپوں میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ THK نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا مطالبہ کیا ہے۔ THK کے منتظم ابوعبیدہ کا کہنا ہے کہ THK

کے اراکین کا اتحاد قرآن پاک کی راہنمائی پر مبنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم پہلے مسلمان اور بعد میں کشمیری یا کچھ اور ہیں۔ ہمیں اسلام کے دھارے میں رہنے کے لیے پاکستان کے ساتھ ملنا پڑے گا۔ کیونکہ پاکستان وہ واحد ملک ہے جس کی سرحد میں ہمارے ساتھ ملتی ہیں۔

کشمیری گروپ بجائے ریاست کے مستقبل کے بارے میں آپس میں لڑنے کے اب مشترکہ مقاصد پر زور دے رہے ہیں جو کہ کسی بھی قیمت پر بھارت سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اپنے مضبوط اتحاد کے اظہار کے لیے سوپور کے عوام جنہوں نے 6 جنوری 1994ء کو BSF اور بھارتی فوجوں کے ہاتھوں قتل عام کا بڑی بہادری سے سامنا کیا انہوں نے بھارتی حکومت کی طرف سے امداد کی پیش کش حقارت سے ٹھکرا دی۔

بھارتی حکومت نے ان تبدیلیوں کی جانب اپنے روایتی طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کشمیریوں کے لیے اصلاحات کا ایک فارمولا پیش کیا جس میں انتخابات کا انعقاد اور JKLF کے ساتھ گفتگو شامل ہے۔ بھارتی حکومت JKLF کے ساتھ ایسا معاہدہ کرنا چاہے گی جو کشمیریوں کو انڈین یونین کا حصہ بنائے۔ لیکن JKLF نے کئی بار اپنے مطالبے یعنی بھارت سے آزادی کو دہرایا ہے۔ JKLF کے سربراہ جاوید میر نے کہا "ہم ایسی کسی بات چیت کا حصہ نہیں بنیں گے جو بھارتی آئین کے تحت ہوگی۔ براہ مہربانی یہ یاد رکھیں ہم بھارت سے آزادی کے علاوہ کسی اور بات پر متفق نہیں ہوں گے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ JKLF نے وادیء کشمیر کے عوام کی رائے کو منظم کرنے میں بہت کچھ کیا۔ موجودہ مسلح جدوجہد JKLF نے جولائی 1988ء میں شروع کی جس کا مقصد ریاست کی بھارت سے آزادی ہے۔ اس وقت وادی میں JKLF آزادی کے لیے لڑنے والی سب سے مقبول تنظیم ہے۔ اس کے باوجود کشمیریوں کا خاصا بڑا حصہ ابھی تک پاکستان کے ساتھ الحاق کا خواہش مند ہے۔ JKLF نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ کشمیری عوام کی بڑی اکثریت اب JKLF کی کشمیر آزادی کی پالیسی کی حمایت کرتی ہے حالانکہ ایک سال پہلے وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کی حامی تھی

مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے چند تجاویز

Some Proposals for the Solution of The Kashmir Dispute

کشمیر کے جھگڑے کی وجہ سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تعلقات انتہائی طور پر بگڑ چکے ہیں۔ جنوبی ایشیا کے رہنے والے دو ہمسایوں کو ایک دوسرے کے قریب تر ہونا چاہیے تھا لیکن کشمیر کی وجہ سے دونوں متحارب ممالک بن چکے ہیں۔ دونوں ہمسایہ ممالک دو جنگیں لڑ چکے ہیں جن کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ برصغیر کی آزادی سے لیکر اب تک بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے سخت دشمن چلے آ رہے ہیں اور دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوئی ہے جس کی وجہ سے تمام علاقے کی سیاسی اور معاشی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ جب تک ہندوستان اور پاکستان آپس میں جھگڑتے رہیں گے پورے علاقے میں کبھی امن اور استحکام نہیں آ سکتا۔ اس وقت جاری خطرناک صورتحال کو قابو میں کرنے کے لیے کسی قابل عمل فارمولے کی سخت ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پر غور کیا جا سکتا ہے۔

1- ہندوستان اپنی فوجیں کشمیر سے ہٹالے Demilitarization by India

کشمیر کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے ہندوستان نے جو جابرانہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے اس کی وجہ سے وادی کشمیر میں موجودہ تعطل جاری رہنے کا امکان ہے اور کوئی مثبت حل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ہندوستان نے یہ ظالمانہ طریقہ اس امید پر اختیار کیا کہ اس

طرح تحریک اور دوسرے متحرک گروپ تھک جائیں گے اور ڈر کے تحریک ختم کر دیں گے۔ موجودہ وحشیانہ طرزِ عمل نے تمام دنیا کی نگاہیں ہندوستان کی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے دعویٰ پر جما دی ہیں۔ لہٰذا فوری طور پر ہندوستان کو اپنے مطلق العنان اور جابرانہ رویے کو چھوڑ کر کشمیر سے اپنی فوجیں ہٹا لینی چاہئیں۔

2- دوطرفہ بات چیت Bilateral Dialogue

ماضی میں ہندوستان اور پاکستان سفارتی سطح پر بات چیت کرتے رہے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ بے سود اور بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ پاکستان اور ہندوستان معنی خیز اور براہ راست بات چیت کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکے جس کی وجہ سے ہندوستان کا کشمیر کو اپنا داخلی مسئلہ کہنے پر اصرار ہے۔ بہرحال اس پر معنی خیز دوطرفہ بات چیت کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان یہ بات چیت شروع ہوچکی ہے اور اس کے نتائج حوصلہ افزا ہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان مخلوط بات چیت Composite Dialogue شروع ہوچکی ہے جس کی نتیجے میں مختلف معاملات میں حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے۔

3- اقوام متحدہ کی ثالثی UN Arbitration

اس وقت کشمیر کے مسئلے پر اقوام متحدہ کے کردار کی سخت ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں کہ شملہ معاہدہ کے ہونے سے کشمیر پر اقوام متحدہ کا کردار ختم ہوگیا ہے۔ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قرار دادیں بین الاقوامی ذمہ داریاں ہیں۔ لائن آف کنٹرول پر اقوام متحدہ کے مبصروں کی موجودگی اور سیکرٹری جنرل کی سالانہ رپورٹ میں کشمیر کے غیر حل شدہ جھگڑے کا ذکر مسئلہ کے حل میں اقوام متحدہ کے کردار کی تصدیق کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کی راہنمائی میں رائے شماری جو کسی غیر جانب دار طریقے سے کروائی جائے، ابھی تک کشمیر کے جھگڑے کے حل کے لیے صحیح طریقہ ہے۔

4- وادی کا مشترکہ انتظامی کنٹرول Joint Administrative Control

کچھ تجاویز سامنے آئی ہیں کہ کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ کنٹرول میں دے دیا جائے۔ یہ تجویز بھی دی گئی کہ کشمیر کو ایک خود مختار تنظیم بنا دیا جائے اور اس کے نظام پر نظر رکھی جائے۔ غیر کشمیریوں کو وادی میں رہنے کی اجازت نہ دی جائے اور ہندوستان و پاکستان کو کشمیری متحرک گروپوں کے ساتھ مل کر مقررہ مدت کے اندر ہمیشہ کے لیے جھگڑے کے حل کی راہ نکالنی چاہیے۔

5- آزاد کشمیر Independent Kashmir

پچھلے کچھ مہینوں میں ''آزاد کشمیر'' یا ''تیسری ترجیح'' Third Option کی تجویز کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن شدید نسلی اختلاف کی روشنی اور لازمی سیاسی و معاشی محرکات کی موجودگی میں مسئلے کے حل کے لیے شاید یہ صحیح طریقہ نہ ہو۔

اوپر دی گئی اور دوسری ترجیحات ہندوستان کی طرف سے مثبت ردِعمل کی متقاضی ہیں۔ علاقے کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے ہندوستان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کی طرف سے جابرانہ طرزِ عمل اور اس سے پیدا ہونے والا اثر ہندوستان کو بین الاقوامی سیاسی صورت حال میں کافی مہنگا پڑے گا۔

پاکستان کے لیے حکمت عملی Policy Choices for Pakistan

حکومت پاکستان 5 جنوری 1949ء کی UNCIP کی قرار داد پر مسئلے کے حل کے لیے عمل درامد کی خواہش مند ہے۔ UNCIP کی قرار داد وادی میں رائے شماری کروانے کے لیے کہتی ہے۔ حکومت پاکستان کو پاکستان کو دنیا سے علیحدہ کرنے کی کوشش

کا موثر طریقے سے ازالہ کرنا چاہیے۔ ہندوستان کی ان کوششوں کے اثر کو زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بیرونی صحافیوں کو وادی کا دورہ کرنے کے لیے بلایا جائے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے ہندوستان کے بے گناہ کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم دیکھ سکیں۔

کشمیر کے مسئلے کی سنگینی اب عالمی سطح پر محسوس کی جارہی ہے۔ کئی بین الاقوامی تنظیمیں، تھنک ٹینک اپنی اپنی سطح پر اس مسئلے کے تمام فریقوں کو یکجا کرکے آپس میں تبادلہ خیال کا موقع فراہم کررہے ہیں۔ ایسی ہی ایک کانفرنس اسلام آباد میں جمعہ کے مبارک روز منعقد ہوئی جہاں صدر جنرل پرویز مشرف نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بھارتی قیادت پر زور دیا کہ وہ کشمیر کو غیر فوجی علاقہ قرار دے کر اس کے دونوں حصوں سے پاک بھارت افواج کا انخلا کرکے اسے مشترکہ کنٹرول میں دینے اور وہاں کشمیریوں کی خود مختار نمائندہ حکومتیں قائم کرنے کے بارے میں ان کی تجاویز کا بروقت جواب دے کیونکہ ان کی روشنی میں تنازع کشمیر کے کسی حتمی تصفیہ تک پہنچنے کے لیے سرحدوں کی تشکیل نو کی ضرورت ہے نہ لائن آف کنٹرول کو مستقل قرار دینے کا کوئی مسئلہ۔ اس لیے اس علاقے کو غیر فوجی بنانا ہر دو ممالک میں اعتماد کو بڑھانے والا ایک ایسا اہم قدم ہوگا جس سے نہ صرف شدت پسندی کی حوصلہ شکنی ہوگی بلکہ کشمیریوں کو بھی اس سے غیر معمولی تسکین ملے گی۔ اسی تعلق میں صدر مملکت نے یہ بھی کہا کہ انہیں یقین ہے کہ اس سلسلے کو حل کرنے کے لیے ماحول جتنا سازگار اب ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا اور کانفرنس میں ہر قسم کی رائے رکھنے والے کشمیری راہنماؤں کی شمولیت ایک بہت اچھا شگون ہے اور اگر ایسی کوئی کانفرنس نئی دہلی یا سری نگر میں ہو تو وہ وزیراعظم من موہن سنگھ کے ساتھ اس میں شرکت کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ بھارتی وزیراعظم انہیں اس کے لیے دعوت دیں۔

مسئلہ کشمیر کا کوئی ایسا دیرپا اور مستقل حل تلاش کرنا جو اس تنازع کے تینوں فریقوں پاکستان، بھارت اور کشمیریوں کے لیے قابل قبول ہو جنوبی ایشیا میں قیام امن کے لیے اس قدر ناگزیر ہے کہ کوئی بھی ہوشمند انسان اس کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں کرسکتا کیونکہ گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصہ میں ہر دو ممالک کے درمیان تین بڑی جنگیں ہوچکی ہیں جن کے نتیجے میں نہ صرف کشیدگیوں اور تلخیوں میں اضافہ ہوا بلکہ اس سے کشمیریوں کے انسانی مسائل بھی بے حد سنگین ہوگئے اور لاکھوں خاندان نہ صرف ایک دوسرے سے جدا رہنے پر مجبور ہوئے بلکہ ان حالات میں اس قدر شدت پیدا ہوئی کہ کشمیر کے دونوں حصوں میں بسنے والے کشمیری اپنے خاندانوں میں شادیوں اور اموات کے مواقع پر بھی آپس میں ملنے سے محروم ہوگئے۔ نائن الیون کے بعد بدلے ہوئے بین الاقوامی حالات میں عالمی برادری کی توجہ پاک بھارت تعلقات کو معمول پر لاکر جنوبی ایشیاء کے افق پر جنگ کے منڈلاتے ہوئے بادلوں کی طرف زیادہ شدت کے ساتھ مرکوز ہوئی تو لامحالہ مسئلہ کشمیر کے کسی قابل قبول حل تک پہنچنے کی ضرورت بھی ان کی نظروں میں اجاگر ہوئی لیکن چونکہ یہ ایک بہت پیچیدہ مسئلہ ہے اس لیے اس کے جلد تر حل کی اہمیت کو محسوس کرنے کے باوجود عالمی برادری نے اس بارے میں کسی عجلت پسندی سے کام نہیں لیا اور پاکستان و بھارت کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے پہلے تو مشترکہ سرحدوں پر ایک دوسرے کے مقابل صف آراء افواج کو واپس بلانے پر آمادہ کرنے کے لیے تگ و تاز کی گئی اور ازاں بعد دونوں ممالک میں تجارتی و ثقافتی روابط کو بڑھانے کے لیے پیش قدمی کی گئی اور جب باہمی اعتماد میں کسی قدر اضافہ ہوا تو پھر مقبوضہ کشمیر سے کشمیری قیادت کو آزاد کشمیر میں آکر اس حصے کے رہنماؤں سے تبادلہ خیالات کا موقع فراہم کیا۔ مظفر آباد، سری نگر بس سروس شروع کرنے کے علاوہ بچھڑے ہوئے کشمیری خاندانوں کو آپس میں ملنے کے لیے لائن آف کنٹرول پر پانچ انٹری پوائنٹ بنائے گئے۔ 8 اکتوبر 2005ء کے تباہ کن زلزلے کے بعد بھی اس پار کی کشمیری قیادت کو اپنے بھائیوں کے غم بانٹنے کی اجازت دی گئی اس پس منظر میں واشنگٹن میں اپنا ہیڈکوارٹر رکھنے والی ایک فکری تنظیم کی جانب سے اسلام آباد میں مسئلہ کشمیر پر ایک ایسی کانفرنس کا انعقاد جس میں آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے کشمیری رہنماؤں کے ساتھ ساتھ آل پارٹیز حریت کانفرنس کے سینئر لیڈر پروفیسر عبدالغنی بھٹ، ممتاز

کشمیری رہنما شیخ عبداللہ کے پوتے اور بھارت کے سابق وزیر مملکت عمر عبداللہ، بھیم سنگھ ایسے لیڈروں نے شرکت کی اس امر کا اظہار ہے کہ خود مقبوضہ کشمیر کی قیادت بھی اس بات کو محسوس کر رہی ہے کہ مذاکرات میں کشمیریوں کو شامل کرنے کا وقت آن پہنچا ہے اور اب جامع مذاکرات میں تیزی آنی چاہیے۔ بھارتی حکومت کی جانب سے کشمیری رہنماؤں کو اس کانفرنس میں شرکت کی اجازت دینا بھی یقیناً ایک مثبت قدم ہے اور اس کی تحسین کی جانی چاہیے کیونکہ اس نوع کی کانفرنسوں سے اگرچہ اس پیچیدہ مسئلے کے فوری حل کی کوئی توقع کرنا تو ممکن نہیں لیکن آزادانہ طریقے سے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے ایسے موقعوں اور تبادلہ خیالات سے کوئی ایسا فارمولا یقیناً سامنے آ سکتا ہے جس پر اس تنازع کے تینوں فریق متفق ہو سکتے ہیں۔

صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے پیش کی جانے والی تجاویز پر اگرچہ بعض بھارتی رہنماؤں نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان پر جوابی الزام تراشی کرنے میں بھی کوئی کمی نہیں کی لیکن جناب عبدالغنی بھٹ، محمد ترمیو، عمر عبداللہ نے صدر پرویز مشرف کی تجاویز کی جس طرح سرگرم حمایت کی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ سرحد کے اس پار بسنے والے کشمیریوں میں بھی اب یہ احساس پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے اب عالمی ماحول زیادہ سازگار ہوتا جا رہا ہے اس لیے بھارتی حکمرانوں کو بھی اب اپنے روایتی طرز عمل پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس تنازع کو جلد تر طے کرنے کے لیے ٹھوس اور مثبت پیش رفت کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ صدر جنرل پرویز مشرف کی جانب سے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے پیش کی جانے والی تجاویز کسی بھی طرح آخری اور قطعی نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہے بلکہ یہ تجاویز تو اس امر کی علامت ہیں کہ اگر بھارت سنجیدگی کے ساتھ تنازع کشمیر کے تینوں فریقوں کے لیے کوئی قابل قبول حل تلاش کرنے کے لیے ٹھوس پیش رفت کرنے کے لیے تیار ہو تو پاکستان امکانی حد تک لچک کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن یہ دیرینہ مسئلہ محض کسی ایک فریق کی جانب سے لچک کا اظہار کرنے سے حل نہیں ہوگا اس کے لیے کشمیریوں، پاکستان اور بھارت تینوں فریقوں کو مفاہمت، جرأت اور دلیری سے کام لیتے ہوئے ماضی کی ان عصبیتوں سے جان چھڑانا ہوگی جو اب تک اس مسئلے کے حل کی راہ میں سد سکندری بنی ہوئی ہے۔

جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کا قیام اب صرف پاکستان اور بھارت کی ہی نہیں عالمی برادری کی بھی ضرورت ہے کیونکہ برصغیر کے ان دونوں ممالک کے ایٹمی طاقت بن جانے کے بعد اب ان کے درمیان تصادم کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایٹمی جنگ ایک ایسی جنگ ہوتی ہے جس میں فتح کا جشن منانے کے لیے کوئی باقی نہیں رہتا اور اس کے علاوہ موجودہ دور میں پوری دنیا جس طرح ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر گئی ہے اس میں مختلف ملکوں کے مفادات آپس میں اس طرح منسلک ہو کر رہ گئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ان حالات میں عالمی برادری کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بھارتی حکمرانوں پر دباؤ ڈالے کہ وہ پاکستان کے ساتھ اپنے جذبہ خیر سگالی کے اظہار کو صرف تجارتی و ثقافتی وجود کے تبادلے، سفری و مواصلاتی سہولتوں میں اضافے اور کانفرنسوں تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ کشیدگی کے بنیادی عامل مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے بھی ٹھوس پیش رفت کے لیے اقدامات کریں کیونکہ اگر یہ معاملہ اسی طرح لٹکا رہے گا تو جنوبی ایشیا میں قیام امن کا خواب تشنۂ تعبیر ہی رہے گا۔ اگر زیادہ تاخیر کی گئی تو کسی وقت بھی کوئی بڑا تصادم ہو سکتا ہے جس کے شعلے آس پاس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

باب نمبر 27

پاکستان میں تعلیم

Education in Pakistan

تعلیمی نظام کے مسائل اور ان کا حل

Problems of Educational System and Their Remedies

سیاسی پس منظر Historical Background

پاکستان کے تعلیمی نظام کی ابتدا برصغیر میں برطانوی حکومت سے پہلے اور اس کے دوران پائی جانے والی سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقیقتوں سے ہوتی ہے۔ بیرونی حکمرانوں نے ہندوؤں پر مسلمانوں کی ثقافتی برتری ختم کردی۔ ہندوؤں نے برصغیر کے نئے حالات سے فوری سمجھوتہ کرلیا تاکہ مسلمانوں کے ساتھ اپنا حساب چکتا کیا جاسکے۔ ان کے لیے یہ محض حکمرانوں کی تبدیلی تھی جس نے انہیں مسلمانوں کے قابل نفرت تسلط سے نجات دلائی تھی۔

برطانوی حکمرانوں نے جو تعلیمی نظام متعارف کروایا اس کا مقصد مسلمانوں کو جو برطانوی تسلط کو انتہائی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، علیحدہ کرنا تھا۔ مسلمان بدستور برطانوی حکومت کی مخالفت کرتے رہے جس نے برطانوی حکمرانوں کو مسلمانوں سے بیزار کردیا۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں نے نئے حکمرانوں سے تعاون کا فیصلہ کرکے بے پناہ فوائد حاصل کیے اور آخر کار برصغیر کے سیاسی دھارے میں شامل ہوگئے۔ اس کے نتیجے میں مسلمان ہندوؤں اور انگریزوں کے قہر وغضب کا نشانہ بننے کے لیے اکیلے رہ گئے۔

برطانوی تعلیمی نظام نے یکسر اسلامی طریقہ تعلیم کو مٹا دیا۔ فارسی اور عربی زبانیں جو کبھی مسلمانوں کے حکمران طبقے کے تفاخر کی نشانیاں تھیں ان کی جگہ انگریزی زبان کو رائج کیا گیا۔ نصاب کو اس طرح وضع کیا گیا جس کا مقصد سامراجی حکومت کے مفادات کا تحفظ وفروغ تھا نہ کہ طالب علم کی ذہنی صلاحیت کی ترقی۔ مکتب سکولوں کی جگہ استعماری انتظامیہ کے قائم کردہ اداروں نے لے لی۔

ہندوستان میں برطانوی راج جو کہ مغلیہ حکومت کی بربادی پر استوار کیا گیا نے اس تعلیمی نظام پر کاری ضرب لگائی جو مسلمانوں کو برصغیر کے دوسرے فرقوں سے امتیازی حیثیت دیتا تھا۔ برطانوی تعلیمی نظام نے مسلمانوں کی برتری اور احساس فخر میں شگاف ڈال دیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے برطانوی نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کیونکہ ان کے نزدیک برطانوی حکمرانوں کا مقصد اسلامی ثقافت کو نقصان پہنچا کے اس کی جگہ اپنا نظام رائج کرنا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ مسلمان اکیلے ہوتے چلے گئے اور ان کا تعلیمی نظام بری طرح متاثر ہوا۔ حکومتی سرپرستی کی کمی اور برطانوی حکمرانوں کی لاتعلقی نے مسلمانوں کے سکولوں کے معیار اور تعداد کے انحطاط کو تیز تر کردیا۔

مقامی لوگوں کو ہر ایک شعبے اور بالخصوص مذہب میں محکوم بنانے کے لیے عیسائی تبلیغی اداروں نے تعلیمی اداروں کا مربوط سلسلہ قائم کیا جس کے ذریعے برصغیر میں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان اداروں میں مقامی امراء اور باا ثر لوگوں کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ ان تبلیغی اداروں کا ایک ہی مقصد تھا کہ ایسے ہندوستانیوں کا ایک طبقہ پیدا کیا جائے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوں لیکن سوچ، نظریات اور تصور کے لحاظ سے انگریز ہوں۔

اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے برطانوی حکمرانوں کو ایک ایسے انتظامی ڈھانچے کی ضرورت تھی جو نوآبادیاتی حکومت کو پھیلانے کا ذریعہ بن سکے۔ اس مقصد کے لیے انہیں انتظامیہ میں مقامی اہلکاروں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومت نے دفاتر میں صرف ان لوگوں کو ملازمت دی جائے گی جنہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ انگریزی کو حکومت کے دفاتر میں سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ برطانوی تعلیمی حکمت عملی کا مقصد مخصوص قسم کی تعلیم جس میں انگریزی پر خصوصی توجہ دی گئی ہو کو فروغ دینا تھا تاکہ مقامی تعلیمی نظام کو بے دخل کیا جاسکے۔ اس قسم کی تبدیلیوں نے مسلمانوں کے سیاسی و معاشی اثر و نفوذ کو کم کردیا جس سے مسلمانوں کا تعلیمی نظام زوال کا شکار ہوگیا۔

اس روایت کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمان تعلیمی لحاظ سے انتہائی پسماندہ اور کمزور رہ گئے۔ آزادی کے موقع پر پاکستان کی تعلیمی اساس انتہائی مختصر تھی۔ 90% جاہلیت اور چند تعلیمی اداروں کی موجودگی میں نئے ملک کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ وہ درپیش مسائل سے نبردآزما ہونے کے لیے جارحانہ لائحہ عمل اختیار کرے۔ بدقسمتی سے یہ سب خوش فہمی ثابت ہوئی کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ملک کو سیاسی عدم استحکام بدعنوانی اور ناقص انتظامیہ کا شکار ہونا پڑا جس نے تعلیمی بہتری کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

تعلیمی اصلاحات اور منصوبہ بندی Educational Reforms and Planning

تقسیم کے وقت غیر منقسم ہندوستان کی بیس یونیورسٹیوں میں سے پاکستان کے حصے صرف دو یونیورسٹیاں آئیں۔ مشرقی پاکستان میں کل 39000 پرائمری سکولوں میں سے صرف 29000 سکول تھے۔ سیکنڈری کی سطح پر یہ تناسب اور زیادہ بگڑ گیا کیونکہ مغربی پاکستان میں 9000 میں صرف 5500 سکول حصے میں آئے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں تقریباً ہر ایک صوبے میں 100 کے لگ بھگ پرائمری سکول تھے۔ سیکنڈری سکولوں کی تعداد بہت کم تھی اور صرف ایک انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ اوسطاً نئے ملک میں 83 کالج، 3 انجینئرنگ کالج، 108 اساتذہ کی تربیت کے سکول اور 71 ٹیکنیکل، صنعتی اور زرعی ادارے تھے۔

پاکستان میں تعلیمی نظام کا انتظامی ڈھانچہ نہ وسیع پیمانے پر استوار تھا اور نہ ہی موثر و مربوط تھا۔ 1947ء سے 1955ء تک تعلیم مقامی اداروں کی ذمہ داری تھی۔ ون یونٹ سکیم کے بعد تعلیم صوبائی انتظامیہ کے پاس آ گئی۔ پہلے چند سالوں میں صورت حال جامد رہی۔ اصلاحات اور منصوبہ بندی غیر مربوط اور اتفاقیہ بنیادوں پر ہوتی تھی۔ 1947ء سے 1958ء تک تعلیمی حکمت عملی ملک میں جاری سیاسی عدم استحکام اور افراتفری کی علامت تھی۔

پاکستان میں پہلی ایجوکیشنل کانفرنس نومبر 1947ء میں منعقد ہوئی۔ قائداعظم نے پاکستان کی تعلیمی ضروریات کی نشان دہی کی جس میں اسلامی تعلیم کی روایات اور جدید سائنس، ٹیکنالوجی کی ضروریات شامل تھیں۔ کانفرنس نے کئی سفارشات پیش کیں جن کا مقصد تعلیمی نظام کو مضبوط بنانا تھا۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اس نے نصاب کی تبدیلی کورسز کی توسیع، لازمی مذہبی تعلیم اور انتظامی مشینری کی ترقی و ترویج سے متعلق سفارشات شامل تھیں۔

1947ء سے 1958ء تک کوئی معنی خیز اصلاحات متعارف نہ کروائی گئیں۔ صرف پرائمری اور سیکنڈری کی سطح تک غیر مربوط نصابی تبدیلیاں کی گئیں۔ اعلیٰ تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی گئی اور نہ ہی کوئی نئی یا جدید تبدیلی لانے کی کوشش کی گئی۔ تاہم بالخصوص ایوب خان کے دور میں تعلیمی نظام کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس دور کی چند اہم اصلاحات میں "تعلیمی قومی کمیشن 1959ء، طلبہ کے مسائل و فلاح و بہبود کا کمیشن 1961ء ایوب دور کے بعد، افرادی قوت اور تعلیم کا کمیشن 1969، نئی تعلیمی پالیسی 1970ء اور قومی تعلیمی پالیسی شامل ہیں۔

ایوب کے دور میں تعلیمی منصوبہ بندی محکمہ تعلیم کے سپرد کر دی گئی۔ ان اقدامات کی وجہ سے تعلیمی منصوبہ بندی کا معیار بلند ہوا۔ منصوبہ بندی کمیشن کو منصوبے پر عمل درآمد اور اس کے نتائج جانچنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سالانہ ترقیاتی پروگرام متعارف کروائے گئے جس کی وجہ سے طویل عرصہ کی ترقیاتی ضروریات منصوبہ بندی کے دائرہ کار میں آ گئیں۔

بھٹو حکومت نے 15 مارچ 1972ء کو اپنی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا۔ اس میں وہ تمام سفارشات شامل تھیں جو یحییٰ خان کے مارشل لاء کے دوران قائم کردہ مختلف سٹڈی گروپس نے دی تھی۔ نجی ملکیت میں چلنے والی تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا جو کہ بھٹو دور کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ پرائمری سے دسویں تک تعلیم مفت اور لازمی قرار دی گئی۔ تمام یونیورسٹیوں کے پروگراموں اور سہولیات میں ربط پیدا کرنے کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کیا گیا۔

ضیا کے مارشل لاء کے دوران قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا گیا جس میں نجی شعبہ کی تعلیم کے فروغ کے لیے حوصلہ افزائی کی گئی۔ مکتب سکولوں کو دوبارہ سے شروع کیا گیا۔ پہلے سے موجود 65000 پرائمری سکولوں کے علاوہ تقریباً 28200 مسجد سکول کھولے گئے۔ سیکنڈری سکولوں کا درجہ بڑھا دیا گیا اور 200 نئے سیکنڈری سکول کھولے گئے۔ تمام سطحوں کے لیے اسلامی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔

جونیجو حکومت نے جو حکمت عملی اختیار کی اس کا مقصد وسیع پیمانے پر تعلیم کا فروغ تھا۔ اپنے پانچ نکاتی پروگرام میں جونیجو حکومت نے تعلیم کے لیے 27400 ملین روپے مختص کیے۔ جونیجو کے پروگرام میں سب سے زیادہ زور شرح خواندگی بڑھانے اور سکول چھوڑ کر چلے جانے والے طلبا کو دوبارہ سکولوں میں واپس لانا تھا۔ نئی روشنی سکیم اس مقصد کے حصول کے لیے اہم اور جارحانہ حکمت عملی تھی۔

نئی تعلیمی پالیسی 1992 میں پرائمری تعلیم، خواندگی اور عوامی معلومات کی بہتری پر زور دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے جانچنے، پرکھنے کی قومی سروس کا قیام، تعلیمی شعبے کے انتظامی ڈھانچے میں اختیارات کا پھیلاؤ اور وسائل کی پیداوار کے لیے باقاعدہ نظام تشکیل دیا گیا۔ پرائمری تعلیم کے حوالے سے پالیسی میں ہر پاکستانی کے لیے بنیادی تعلیم کے حصول کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے اپنے سوشل ایکشن پروگرام کے ذریعے تعلیم اور خواندگی کی شرح بڑھانے پر بہت زور دیا۔

ہائر ایجوکیشن کمیشن Higher Education Commission

ہائر ایجوکیشن کے مضبوط ادارے اور اعلیٰ تحقیق معاشی و مسلسل تعلیمی ترقی کے لیے انتہائی اہم ہوتے ہیں۔ پاکستان کی یونیورسٹیاں سوائے چند کے وسائل کی کمی، غیر موثر انتظامیہ اور اداروں کی کمزوری جیسے مسائل سے دوچار ہیں۔ حکومت کے تحت چلنے والے تمام اداروں میں بدانتظامی اور وسائل کی کمی ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو اس بات کا علم ہے کہ عوام تبدیلی چاہتے ہیں۔ عوام نچلی سطح سے اصلاح کے خواہش مند ہیں لیکن حکمران اوپر سے تبدیلی کرتے ہیں جس کا مثبت نتیجہ نہیں نکلتا۔

حکومت نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن توڑ دیا ہے اور اس کی جگہ ہائر ایجوکیشن کو مضبوط کرنے کے لیے 2002ء میں ایک آرڈیننس کے ذریعے ہائر ایجوکیشن کمیشن قائم کیا ہے۔ اس کمیشن کا مقصد پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر تحقیق کا فروغ ہے۔ یہ منصوبہ 2005ء تک نجی شعبے کے تعاون سے ہائر ایجوکیشن تک رسائی میں 2.6 فی صد سے 5 فیصد اضافے پر عمل درآمد کرے گا۔ اس مقصد کے لیے حکومتی انجینئرنگ یونیورسٹیوں میں Endowment Fund قائم کیا جائے گا۔ تمام حکومتی اداروں میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تعلیم کا فروغ اور انسانی مضامین کی بجائے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر زور دیا جائے گا۔ اداروں میں بہتر کارکردگی لانے کے لیے ایک آرڈیننس پر غور ہو رہا ہے جو یونیورسٹی کے ڈھانچے کو اصول وضوابط کے تحت چلائے گا۔ اس وقت 1999ء کے مقابلے

میں 96 یونیورسٹیاں ، ڈگری دینے والے ادارے کام کر رہے ہیں۔ حکومت نے اپنے جدید پروگرام پر عملدرآمد کے لیے یونیورسٹیوں کو کارکردگی کی بنیاد پر ترغیب دینے کے لیے اضافی فنڈ مہیا کرنے شروع کر دیے ہیں۔

ہائر ایجوکیشن کمیشن کا بنیادی مقصد پاکستان کو فعال معاشی ملک بنانا ہے جس کے لیے سائنسی نظام اور اپنے اداروں جہاں تعلیم دی جاتی ہے کو مضبوط بنانا ہے اور اس عمل کو تیز کرنے کے نظام کو مربوط کرنا ہے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کی سٹینڈنگ کمیٹی کی رپورٹ (2001) کے مطابق پاکستان میں ہائر ایجوکیشن میں طلباء کی کل تعداد 475,000 تھی۔ ہائر ایجوکیشن نظام کی بہتری کے لیے ہائیر ایجوکیشن کمیشن طریقہ کار میں تحقیق اور سیکھنے کا عمل اور اس کا معیشت کے ساتھ تعلق شامل ہے۔

پیشہ ورانہ مہارت کو بڑھانے کے لیے سرمایہ کاری کو ترجیح دی جائے گی۔ تاکہ تدریس کے معیار کو بڑھایا جاسکے اور سیکھنے کے ماحول کو زیادہ موثر بنایا جاسکے۔ ہائر ایجوکیشن تک رسائی 23-17 سال کے طلبا کے لیے 5 فیصد بڑھائی جائے گی۔ ہائر ایجوکیشن میں داخلے کا معیار صرف اہلیت کی بنیاد پر ہوگا جس کے لیے داخلے کے امتحان ہوں گے۔ مشہور تعلیمی اداروں کو خود مختاری اور ڈگری دینے کا اختیار دے دیا جائے گا۔ مشہور بیرونی یونیورسٹیوں کے تعاون سے Phd کے پروگرام شروع کیے جائیں گے اور سال میں کم از کم 100 سکالرز کو تربیت دی جائے گی۔ تمام قسم کے کوٹہ جات اور مختص نشستیں ختم کر دی جائیں گی۔

پرائمری تعلیم Primary Education

پاکستان میں تعلیم پرائمری اور سیکنڈری سطح پر تین درجوں میں منقسم ہے۔

(i) پرائمری کلاس I سے پانچویں تک

(ii) نچلے درجے کی سیکنڈری کلاس چھٹی سے ساتویں تک

(iii) سیکنڈری نویں کلاس سے دسویں تک اور ثانوی سیکنڈری تعلیم کلاس گیارہویں سے کلاس بارہویں تک۔

پرائمری تعلیم سب سے اہم ہے کیونکہ یہ سکول جانے والی بچوں کی ذہنی استعداد کو فروغ دیتی ہے۔ ملک میں تقریباً 86000 پرائمری سکول ہے جن میں سے آدھے سکولوں کے پاس اپنی عمارتیں نہیں ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں تقریباً 6000 سکول کھلے آسمان تلے قائم ہیں جبکہ کچھ کرایے کی عمارتوں میں قائم ہیں۔

پاکستان میں تقریباً آدھے سے زیادہ سکول جانے والے بچے سکول نہیں جاتے۔ لڑکیوں کے حوالے سے یہ تناسب اور بھی زیادہ خراب ہے۔

پرائمری تعلیم کا شعبہ تمام حکومتوں کی لاپروائی کا شکار رہا ہے۔ ہر آنے والی حکومت نے شرح خواندگی اور پرائمری تعلیم کے فروغ کے لیے وعدے کیے تاہم آبادی کے بڑھنے، اخراجات میں بدانتظامی اور سیاسی عزم کی کمی نے جاہلیت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

پہلے پنج سالہ منصوبے 60-1955ء میں پرائمری تک لازمی اور مفت تعلیم پر زور دیا گیا۔ اس وعدے کے باوجود پہلے منصوبے میں مختص کی گئی رقم کا صرف 37% پرائمری تعلیم پر خرچ کیا گیا۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے (65-1960) میں کم و بیش اسی قسم کے دعوے کیے گئے لیکن تعلیمی بجٹ کا صرف 16 فیصد پرائمری تعلیم پر خرچ کیا جاسکا۔

تیسرے پنج سالہ منصوبے (70-1965) میں پرائمری تعلیم کے لیے مختص رقم میں کمی کر دی گئی جو کہ کل منصوبے کا صرف 14% تھا۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں 1980 تک UPE (یونیورسل پرائمری ایجوکیشن) کا ہدف پورا کرنے کا دعویٰ کیا گیا۔

1970ء کی دہائی میں نجی تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان کیا گیا۔ چوتھے پنج سالہ منصوبے (75-1970) کا زیادہ تر بجٹ قومیائے جانے کے عمل پر خرچ کر دیا گیا۔ اس میں پرائمری تعلیم کا حصہ صرف 15% تھا۔

پانچویں پنج سالہ منصوبے (83-1978) میں 1413 ملین روپے پرائمری تعلیم کے لیے مختص کر دیے گئے۔ پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلے میں بدترین بدانتظامی دیکھنے میں آئی۔ ناکافی فنڈز، تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور سیاسی عزم کی غیر موجودگی نے یونیورسل پرائمری ایجوکیشن کے ہدف کا حصول ناممکن بنا دیا۔ چھٹے پنج سالہ منصوبے (88-1983) کے دوران پاکستان میں پرائمری تعلیم کی بہتری کے لیے کوئی قابل ذکر کوشش نہ ہو سکی۔

ساتویں پنج سالہ منصوبے میں ان علاقوں میں جہاں شدید ضرورت تھی نئے سکول کھولنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بہرحال اس وقت تعلیمی شعبہ فنڈز کی کمی اور حکومتوں کی سستی اور لاتعلقی کی وجہ سے تباہ حال ہو چکا تھا۔ آٹھویں پنج سالہ منصوبے (98-1993) کے دوران بے نظیر بھٹو کی حکومت نے سوشل ایکشن پروگرام کا منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد بنیادی تعلیم اور خواتین کی شراکت کو فروغ دینا تھا۔ حکومت نے مقررہ مدت کے اندر سوشل ایکشن پروگرام کے ہدف کو حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

سیکنڈری ایجوکیشن Secondary Education

سیکنڈری سطح پر تعلیم طالب علم کو تیزی سے سیکھنے اور آسانی سے تربیت حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ اس سطح کو قومی تعلیمی نظام میں اعلیٰ اہمیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ تربیت یافتہ اور ماہر افرادی قوت اسی سطح پر تیار کی جاتی ہے۔ سیکنڈری سطح کی تعلیم کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے کہ یہ طالب علم کو یونیورسٹی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ اگر سیکنڈری تعلیم کا معیار پست ہو اور وہ پوری طرح سے تربیت یافتہ نہ ہوں تو وہ نہ تو یونیورسٹی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی ملازمت کے لیے مواقع حاصل کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں سیکنڈری تعلیم مندرجہ ذیل نقائص کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہے۔

1- اس میں زیادہ تر انسانی تہذیب و تمدن اور کلاسیکی ادب کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔
2- اس میں ماہرانہ اور پیشہ ورانہ تعلیم کی کمی ہے۔ مزید برآں یہ جدید مضامین یعنی ریاضی اور سائنسی علوم پر زور نہیں دیتی۔
3- یہ طالب علم کو کریئر چننے کے کافی مواقع فراہم نہیں کرتی اس لیے طالب علم کو مضامین چنتے وقت والدین کی مرضی پر عمل کرنا پڑتا ہے۔
4- اس میں نصاب کے تنوع کی کمی ہے جس کی وجہ سے یہ ملک کی معاشی و معاشرتی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں۔
5- یہ طالب علم و استاد کے بلند تناسب کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہے۔ سائنس لیبارٹریز، ورکشاپس اور لائبریری کی کمی بھی سیکنڈری تعلیم کی چند مشکلات ہیں۔

سیکنڈری سکولز Secondary Schools

1947ء میں 2190 مڈل سکولز اور 408 ہائی سکولز تھے۔ اب ملک میں تقریباً 10000 ہزار مڈل سکولز اور 12000 ہائی سکولز ہیں۔ مڈل سکولز کی سطح پر طلبا کی تعداد حوصلہ افزا ہے جو کہ 73% ہے۔

پاکستان میں پرائمری/سیکنڈری تعلیم کے مسائل
The Problems of Primary/ Secondary Education in Pakistan

1- سکولوں کا حفظانِ صحت کے منافی ماحول
Unhygenic or Inhospitable School Environments

1991ء کی ورلڈ بنک رپورٹ نے ہمارے پرائمری اور سیکنڈری سکولوں کے ماحول کی بہت خراب تصویر پیش کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق سارے پرائمری اور سیکنڈری سکولوں میں اساتذہ اور طلبا کے لیے حفظانِ صحت کے منافی اور ناسازگار ماحول ہے۔ چونکہ حکومت اور معاشرہ اساتذہ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے اس لیے پاکستانی اساتذہ کسمپرسی اور معاشی عدم استحکام کا شکار ہیں۔

پاکستان کے پرائمری اور سیکنڈری سکولوں کی حالت بالکل ایذا رسانی کے کیمپوں سے ملتی جلتی ہے۔ اکثر کلاس روم تباہ حال اور خستہ حالت میں ہوتے ہیں، سوائے ان سکولوں کے جہاں حکومت نے سیاسی دباؤ کی وجہ سے معقول عمارتیں مہیا کی ہیں۔ اکثر کلاسز کھلے آسمان کے نیچے پڑھائی جاتی ہیں۔ سکولوں کی عمارتیں قدرتی آفات کے سامنے بے بس ہیں۔ ان میں بنیادی سہولتوں یعنی پینے کا پانی، بجلی، فرنیچر اور دوسری ضروریات کی کمی ہوتی ہے۔ طلبا زمین پر چٹائیوں پر بیٹھتے ہیں۔ طلبا کو گرمی اور سردی سے بچاؤ کے لیے کوئی سہولت میسر نہیں۔

2- غیر تربیت یافتہ اساتذہ Unskilled Teachers

پرائمری سکولوں کے اساتذہ اکثر غیر تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ حکومت کے پرائمری سکولوں کے اساتذہ تو پڑھانے کے قابل نہیں ہوتے۔ کوئی شخص جو دس جماعتوں تک پڑھا ہو اور 39 ہفتوں کا تربیتی کورس کیا ہو وہ استاد بن سکتا ہے۔ زیادہ تر وہ کلاس میں لیکچر دیتے ہیں یا طلبا کو اونچی آواز میں پڑھنے اور سوالات کا جواب دینے کے لیے کہتے رہتے ہیں۔ سکول کے روزانہ کے پروگرام میں کھیلوں اور غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے کوئی وقت نہیں ہوتا۔ نصابی کتب رٹ لی جاتیں ہیں اور امتحان میں وہی جوابات دے دیے جاتے ہیں۔ اساتذہ کلاس میں پڑھائے گئے مضمون کے بارے میں سوالات کرنے کے حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ ورلڈ بنک کی رپورٹ نے مزید بتایا کہ طلبا کا طرزِ عمل ست ہے۔

3- پڑھائی چھوڑ دینا Dropouts

ہماری پرائمری و سیکنڈری تعلیم کی ایک خرابی طلبا کی اکثریت کا تعلیم مکمل ہونے سے قبل سکول سے علیحدہ ہو جانا ہے۔ پاکستان کا شمار ان ممالک میں دوسرے نمبر پر ہوتا ہے جہاں طلبا پرائمری تعلیم مکمل نہیں کرتے۔

پرائمری اور سیکنڈری سطح پر طلبا کی خاصی تعداد اپنی تعلیم کا دورانیہ پورا نہیں کر پاتی۔ پچھلے 45 سالوں سے یونیورسل پرائمری ایجوکیشن ملک کا سنگین مسئلہ رہا ہے اور سکولوں میں درج ہونے والے طلبا کی تعداد میں اضافہ بھی ہو رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی سکول چھوڑ کر جانے والے طلبا کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور تعلیم مکمل کرنے والے طلبا کا تناسب کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔

سکول چھوڑنے کے بلند تناسب کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے نمایاں وجہ غربت اور جہالت ہے۔ اگر کسی کم آمدنی والے گھرانے میں کمانے والوں کی تعداد زیادہ ہے تو یہ ممکن ہے کہ جب کوئی گھر کا نوجوان فرد کمانے کے قابل ہو جائے تو وہ بھی پڑھائی

کے بے فائدہ عمل کو اختیار کرنے کی بجائے روٹی کمانے پر لگ جائے۔ اس کے علاوہ سکول چھوڑنے کی بڑی تعداد کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے کوئی مشاورتی سہولت موجود نہیں جو طلبا کو اپنی قابلیت کو صحیح راستے پر لے جانے میں راہنمائی کر سکے۔

اس وقت سیکنڈری تعلیم کو زیادہ سے زیادہ پیشہ ورانہ بنانے کی ضرورت پر زور دیا جا رہا ہے جس کے لیے مالی وسائل اور ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے حکومت کی دلچسپی، مقامی اداروں کی مستعد شراکت داری، آجر کی ضروریات کا شعور اور فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے قومی لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔

4- استاد اور طالب علم کا تناسب Student Teacher Ratio

1947ء سے 1990ء تک استاد اور طالب علم کا تناسب بہت برا تھا۔ اگرچہ پرائمری سکول اساتذہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن یہ پرائمری سکولوں میں طلبا کی تعداد سے مماثلت نہیں رکھتا تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے صورت حال مزید گھمبیر ہے۔

اعلیٰ تعلیم Higher Education

اعلیٰ تعلیم وہ سطح ہوتی ہے (گیارہویں اور بارہویں جماعت) جہاں طلبا کو یونیورسٹی تعلیم یا پیشہ ورانہ تعلیم یعنی میڈیکل، قانون، کامرس، بزنس ایڈمنسٹریشن اور انجینئرنگ کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی ایجوکیشن University Education

تقسیم کے وقت صرف دو یونیورسٹیاں پاکستان کے حصے میں آئیں جو کہ پنجاب یونیورسٹی اور ڈھاکہ یونیورسٹی تھی۔ پاکستان نے یونیورسٹی ایجوکیشن کے پھیلاؤ میں قابل ستائش کام کیا اور ڈیرہ اسماعیل خان جیسے دور دراز علاقے میں بھی گومل یونیورسٹی کا اجرا کیا ہے اس وقت نجی شعبہ میں بھی بہت سی یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں۔ وفاقی حکومت کی زیرنگرانی ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) وسیع پیمانے پر تحقیق کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

امتحانی نظام Examination System

پاکستان کا تعلیمی نظام مخلوط امتحانی نظام پر قائم ہے جس کا مطلب کہ تمام درجات کے امتحانات کورسز کے ختم ہونے پر ہوتے ہیں۔ اس طریقہ امتحان کی بنا پر تعلیم کا معیار بری طرح متاثر ہوا ہے جو رٹہ بازی پہ انحصار کرتا ہے۔ پاکستان میں تعلیم کا ایک ہی مقصد ہے کہ بچوں کو امتحان میں بیٹھنے کے لیے تیار کیا جائے۔ امتحانات میں رٹے لگائے ہوئے جوابات پر اونچے گریڈ مل جاتے ہیں۔ امتحانی نظام پاکستان کے تعلیمی نظام کو خراب کرنے میں سب سے بڑا محرک ہے۔

پاکستان میں جدید علم وتحقیق کے فروغ اور انوکھے اور نئے تجربات کی راہ میں امتحانی نظام سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایک طالب علم جو کسی مضمون پر دسترس نہ رکھتا ہو پھر بھی وہ امتحان میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتا ہے کیونکہ امتحانی پرچہ جات میں سوالات کورس کے منتخب حصوں سے بنائے جاتے ہیں جو کہ امیدوار نے رٹا لگائے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ منتخب مطالعہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ سوالوں کے جوابات مقررہ وقت کے اندر دینا ہوتے ہیں جو طالب علم کو مختصر اور منتخب مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں نتیجتاً طلبا پوری تیاری نہیں کر پاتے اور اندازے پر کام چلاتے ہیں۔

1- جوابی کاپیوں کی دوبارہ سے جانچ پڑتال بالکل ختم کردی جائے۔ صرف حاصل کردہ نمبروں کی دوبارہ جانچ پڑتال کی جاسکتی ہے یا وہ سوالات جو ممتحن کی نظر میں نہیں آسکے ان کی پڑتال ہوسکتی ہے۔ کسی بھی عدالت کو جوابی کاپیوں کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کا حکم دینے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

2- موجودہ قوانین میں تبدیلی کی جائے اور امتحانات میں دھاندلی کرنے، سوالات کو افشاء کرنے، جوابی کاپیوں کو کمرہ امتحان سے باہر پہنچانے، جانچی گئی جوابی کاپیوں میں ردوبدل کرنے اور دھونس و دھمکی دینے پر سخت سزا دی جائے۔ خفیہ گروپوں کو ختم کرنے کے لیے سخت ترین قوانین بنائے جائیں۔

3- جو افراد امتحانی جرائم میں ملوث پائے جائیں ان کے مقدمات کا جلد از جلد فیصلہ سنا کر سزائیں دی جائیں۔

4- امتحانی نظام اور اس کا متعلقہ ریکارڈ مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ ہونا چاہیے۔

5- امتحان کی خفیہ برانچ مکمل طور پر مسلسل نگرانی میں رہنی چاہیے۔

6- مرکزی جانچ پڑتال کا نظام رائج ہونا چاہیے۔ حل شدہ کاپیاں بورڈ ریونیورسٹی کی حدود سے کسی بھی شکل میں باہر نہیں لے جانی چاہئیں۔

پاکستان میں تعلیم اور سیاست The Education and Politics in Pakistan

پاکستان کا تعلیمی نظام پچھلے پندرہ بیس سالوں سے وسیع پیمانے پر سیاسی ہوچکا ہے۔ تعلیمی ادارے بالخصوص یونیورسٹیاں اور کالج سیاسی جماعتوں کی دخل اندازی کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے ہیں۔ سیاسی جماعتوں نے تعلیمی اداروں میں اپنے دفاتر قائم کر رکھے ہیں اور وہ بلاخوف وخطر اداروں کے تعلیمی اور انتظامی معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ تعلیم کے ہر شعبے میں سیاسی جماعتوں کی وسیع مداخلت نے پاکستان کی سیاسی و تعلیمی فضا کو بہت بری طرح متاثر کیا ہے۔

پاکستان میں معاشرتی ناہمواری، معاشی عدم مساوات اور پسماندگی عوامی نمائندوں کو اساتذہ کی تقرری اور پوسٹنگ کے معاملات میں دخل پر مجبور کرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی حکومتی احکامات و پالیسی کے مخالف طلبا کی سرپرستی کو بھی عوامی نمائندوں کے لیے ضروری بنا دیتی ہے۔ اس طرح کی سیاسی دخل اندازی رائے دہندگان جن کے ہاتھ انتخابات میں کامیابی کی کنجی ہوتی ہے کے لیے فوائد حاصل کرنے کی غرض سے کی جاتی ہے۔ پاکستان کے انتخابی نظام کے چار نمایاں اجزا یعنی طلبا، اساتذہ، نصاب اور امتحانات اس سیاسی دخل اندازی کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ اس طرح کی سیاسی سرگرمیوں نے نئے اداروں کا اجرا، ان کی ترقی اور فنڈز مہیا کرنے، نصابی کتب کے مصنفین اور امتحانات سے متعلق معاملات میں فیصلہ سازی کے عمل پر اپنا قبیح اثر ڈالا ہے۔ ان اداروں پر سیاسی سرگرمیوں کے اثرات کا ذیل میں جائزہ لیا جارہا ہے۔

طلبا Students

پاکستان میں تعلیمی ادارے بالخصوص سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ بن گئے ہیں۔ طلبا کی شدید احتجاجی سیاست نے طلبا تنظیموں کو اتنا طاقت ور بنا دیا ہے کہ ان کا توڑ ممکن نہیں۔ نوجوان اور مسلسل متحرک طلبا کی قوت سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے سیاسی جماعتیں طلبا کے معاملات میں دخل اندازی کرتیں ہیں۔ دو متحارب سیاسی گروہوں کے درمیان چپقلش تعلیمی اداروں میں امن وسکون جو تعلیم کے عمل کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے تباہ کردیتی ہے۔ طلبا تنظیمیں قومی و علاقائی سیاسی جماعتوں کی ذیلی شاخیں ہوتی ہیں جو طلبا، سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبا، انجمن طلبا اسلام، اسلامیہ طلبا تنظیم، پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن مختلف سیاسی جماعتوں کے ذیلی ادارے یا شاخیں ہیں۔ تعلیمی اداروں میں صورت حال انتہائی

خطرناک صورت اختیار کر گئی ہے تمام طلبا تنظیموں نے اپنے جنگجو ادارے قائم کر لیے ہیں۔ ان طلبا تنظیموں کو ان کے سرپرست ہتھیار مہیا کرتے ہیں۔ یہ ہتھیار زیادہ تر مذہبی جماعتیں مہیا کرتیں ہیں۔

طلبا تنظیمیں اکثر آپس میں تکرار و جسمانی جھگڑوں میں ملوث ہوتی ہیں۔ ان گروہوں میں طاقت دکھانے کی دوڑ لگ جاتی ہے جو اکثر اوقات خونیں جھگڑوں کا باعث بنتی ہے۔ یونیورسٹیاں احیائے ابلاغ تعلیم کی بجائے جنگ و جدل کا میدان بن گئی ہیں۔ سیاسی جماعتیں انتخابات میں اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لیے طلبا کو اس لڑائی میں جھونک دیتی ہیں۔ ہر حکومت نے طلبا کو سیاست سے علیحدہ کرنے کی پرخلوص کوشش کی ہے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ مذہبی جماعتیں اپنی سٹریٹ پاور کے زور پر حکومت کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتی ہیں۔

اساتذہ Teachers

اساتذہ سازگار تعلیمی ماحول پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ دراصل تعلیمی اداروں کو سیاسی سرگرمیوں سے پاک رکھنا اساتذہ کا کام ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب استاد پیشہ ورانہ صلاحیت رکھتا ہو اور ذہنی اعتبار سے اس فرض منصبی کی جانب پوری طرح سے راغب ہو۔ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور تمام برائیاں سیاست میں ملوث ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اساتذہ کی تربیت کے اداروں میں اہلیت کے اصول کو اکثر اوقات سیاسی دباؤ و دخل اندازی کی بنا پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

نصاب تعلیم Curriculum

بدقسمتی سے پاکستان میں حکومتیں نصاب تعلیم طے کرنے میں پرخلوص نہیں رہی ہیں۔ ہر حکومت اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق نصاب مرتب کرتی ہے۔ بالخصوص پرائمری اور سیکنڈری سطح پر نصاب میں اکثر تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ نصابی کتب میں سیاسی نعرے اور نظریے بھر دیئے جاتے ہیں۔ مضامین حکومت وقت کے پروگرام پر مبنی ہوتے ہیں۔ نصابی کتب کی تیاری اور چھپائی بھی حکومت کے قریبی دوستوں کو دی جاتی ہے۔

امتحانات Examinations

ہمارے تعلیمی اداروں کے سیاست میں ملوث ہونے کی وجہ سے امتحانات کا شعبہ سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ پرامن امتحانات کا انعقاد ناممکن ہو چکا ہے جس کی وجہ سے ایماندار ممتحن امتحان کو چلانے سے قاصر ہیں۔ بدعنوانی کی وجہ سے حق دار طلبا پیشہ ورانہ اداروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ جو کسی خوف یا ڈر کے بغیر بدعنوانی میں ملوث طلبا اعلیٰ نمبروں سے امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ امتحانی ادارے اپنی افادیت گنوا چکے ہیں۔

خلاصہ Summary

تعلیم ترقی کا مضبوط ستون ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تعلیم ملازمت کے حصول، روزگار، پیداوار، صحت اور آبادی پر کنٹرول میں مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ کوئی بھی ملک جو معاشرتی و معاشی میدان میں ترقی کرنا چاہتا ہے اس کو تعلیم پر زور دینا پڑتا ہے۔ انسانی وسائل کی ترقی قومی ترقی کے لیے لازمی ہونا چاہیے کیونکہ تعلیم اور ترقی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جنوبی ایشیا کے ممالک اس اصول کی زندہ مثال ہیں۔

پاکستان کا تعلیمی اعداد وشمار مایوس کن ہے۔ معاشی ترقی کی خشت اول تعلیم ہے۔ اس کو بدقسمتی ہی سے تعبیر کیا جائے گا کہ دسمبر 1948ء سے آج تک پاکستان میں تعلیم اور تعلیمی نصاب کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا اب پھر وفاقی وزارت تعلیم نے ملک گیر سطح پر نصاب میں اور مختلف امتحانوں کی تشکیل نو کے پروگرام کا اعلان کیا ہے۔ جس کے تحت آئندہ تعلیمی سال سے بعض اہم تبدیلیوں کا فیصلہ کیا جاچکا ہے اور بعض امور پر مختتم فیصلہ ہونے والا ہے۔ اختیاری مضامین 46 سے کم کر کے 27 کیا جارہا ہے۔ 19 مضامین کو اسکیم آف اسٹڈیز سے نکالا جارہا ہے۔ الفسہ میں انگریزی، اردو، عربی اور صوبائی زبانوں کے علاوہ فارسی، بنگالی، گجراتی، ترکی، فرانسیسی، اسپینی، روسی، جاپانی اور جرمن زبانوں کی تدریس ختم کردی جائے گی۔ ثانوی سطح پر سائنس، فنون (ہیومنیٹیز) اور کیمیکل گروپس ہوں گے۔ ان تینوں گروپس میں انگریزی، اردو، اسلامیات اور غیر مسلموں کے لیے اخلاقیات، ریاضی اور مطالعہ پاکستان لازمی مضامین ہوں گے۔ سائنس گروپ میں طبیعات، کیمیا، حیاتیات، کمپیوٹر سائنس اور ٹیکنیکل مضامین ہوں گے۔ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر مطالعہ پاکستان کو لازمی مضمون کی بجائے اختیاری کردیا جائے گا اس کا نیا نصاب تیار کیا جارہا ہے۔

ملک بھر کے تمام صوبوں کے تعلیمی اداروں میں تعلیمی سیشن یکم اپریل کے بجائے یکم ستمبر سے شروع ہوگا اپریل اور مئی میں امتحانات ہوں گے، جون جولائی میں پرچے جانچے جائیں گے۔ اگست میں نتائج جاری ہوں اور یکم ستمبر سے نیا سال شروع ہوجائے گا۔ نئے تعلیمی سال سے موسم گرما کی تعطیلات دو ماہ کے بجائے تین ماہ کی ہوا کریں گی۔ نویں اور گیارہویں جماعتوں کے امتحان اس سال نہیں ہوں گے۔ 2007ء میں میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے دونوں کلاسوں کے مشترکہ امتحانات ہوں گے۔ عملی امتحانات (Precticals) کے نمبر 25 سے کم کر کے 15 اور نظری (Written) امتحانات کے نمبر 75 سے بڑھا کر 85 کردیے جائیں گے۔ میٹرک کے کل نمبر 850 ہوں گے۔ پرچوں میں آبجکٹو اور سبجکٹو دونوں قسم کے سوالات ہوں گے۔ نصف سوالوں کے جواب مختصر طور پر دینا ہوں گے۔ ملک بھر میں میٹرک کے امتحانات ایک دن ہوں گے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق پورے ملک میں یکساں تعلیمی نظام اور نصاب جاری کردیا جائے گا۔

تعلیمی لحاظ سے ملک کو یکساں سطح پر لانے کی مجوزہ پروگرام کے ساتھ صوبوں کے اپنے منصوبے بھی ہیں جیسے اس وقت پنجاب میں ثانوی تعلیم کے رہنمہ بورڈ ہیں۔ یہ بورڈ پرائمری، ثانوی، میٹرک اور انٹر کے پرچے الگ الگ تیار کر کے امتحانات لیتے ہیں اور نتائج میں کافی فرق ہوتا ہے اب صوبائی امتحانات کو یکساں اور معیاری بنانے کے لیے پنجاب امتحانی کمیشن بنایا گیا ہے جو پانچویں، آٹھویں، دسویں جماعتوں اور انٹر کے پرچے بنائے گا اور مارک شیٹوں کے خاکے تیار کر کے تمام بورڈوں اور اضلاع کو بھیجا کرے گا، یوں ایک ہی پرچہ سارے صوبے میں استعمال ہوگا اور مبروں میں بھی یکسانیت پیدا ہوجائے گی۔ کمیشن کی سربراہی کے واسطے ایک سال کے لیے ایک آسٹریلین پروفیسر کا تقرر ہوگا جو عملے کو نئے نظام کی تربیت دے گا۔ اس وقت سندھ میں چار تعلیمی بورڈ ہیں وہ بھی پنجاب کی طرح کا نظام اپنانے پر غور کررہے ہیں۔ نیز سندھ میں میٹرک میں زراعت کو بطور لازمی مضمون پڑھانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ زراعت سندھ کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی ہے۔ 70 فیصد دیہی آبادی کا گزارہ زراعت پر ہے اور اس شعبے میں جدید ٹیکنالوجی اختیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں میں زراعت کا مضمون پہلے ہی سے پڑھایا جاتا ہے لہٰذا اس کو موثر بنانے کے لیے میٹرک میں لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے گا نیز سندھ گورنمنٹ کمپیوٹر کی تعلیم کو عام کرنے کی منصوبہ بندی بھی کررہی ہے۔

صوبہ سرحد میں انگریزی کو پہلی جماعت سے لازمی کردیا گیا ہے۔ نجی اسکولوں کے 12 ہزار اساتذہ کی تربیت کے لیے اکیڈمی قائم کی جارہی ہے جہاں ان کو مختصر مدت کے لیے تربیت دی جائے گی۔ صوبے کے تین اضلاع کے دیہات میں لڑکیوں کے اسکولوں کے لیے استانیاں نہیں مل رہی ہیں چنانچہ ان کی بھرتی کے لیے تعلیمی معیار میٹرک سے گھٹا کر آٹھویں کلاس کردیا گیا۔

باب نمبر28

پاکستان کی معیشت

The Economy of Pakistan

پاکستان کی معیشت کا تاریخی پس منظر (Pakistan's Economy in Historical Prospective)

جب 1947ء میں پاکستان ایک خودمختار و آزاد ریاست کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا تو یہ زیادہ تر ان علاقوں پر مشتمل تھا جو غیر ترقی یافتہ اور پسماندہ تھے۔ یہ علاقے زیادہ تر خام مال پیدا کرتے تھے جو مقامی طور پر استعمال نہ ہو سکتا تھا کیونکہ متعلقہ صنعتیں دوسرے علاقوں میں قائم تھیں۔ پاکستان کی تاریخ کے دوران معاشی ترقی اور جمود ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ پاکستان کی بیمار معیشت کی سب سے بڑی وجہ معاشی پالیسوں میں عدم استحکام اور شدید طور پر ڈگمگاتا ہوا سیاسی نظام ہے۔

موجودہ پاکستان کی آزادی کے وقت آبادی 3 کروڑ 50 لاکھ تھی۔ قدرتی وسائل کی بہتات تھی جنہیں پوری طرح سے استعمال نہ کیا جا سکا۔ 1947ء میں اس کی فی کس آمدنی 600 ڈالر سالانہ تھی۔ موجودہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاقے جنوبی ایشیاء کے سب سے پسماندہ علاقے تھے۔ ہندوستان کے پاس تقریباً تمام بنیادی صنعتیں موجود تھیں جبکہ پاکستان کے پاس آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے محدود صنعتی کارخانے تھے۔ اوپر سے توانائی کی شدید قلت نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا تھا۔

پاکستان میں صرف دو نقد آور فصلیں تھیں۔ موجودہ پاکستان میں روئی اور بنگلہ دیش (سابقہ مشرقی پاکستان) میں پٹ سن۔ ان دونوں فصلوں کی پیداوار کو مختلف اشیا بنانے کے لیے ہندوستان لے جانا پڑتا تھا۔ چند سیمنٹ اور چینی بنانے والے کارخانے موجود تھے جو ملکی ترقی میں کوئی کردار ادا نہ کر سکتے تھے۔

ہندوستان اور پاکستان کے معاشی وسائل میں بہت بڑا فرق تھا۔ آزادی کے وقت پاکستان کی معیشت میں صرف ایک مثبت عنصر تھا یعنی پاکستان خوراک میں خودکفیل تھا۔ مغربی پاکستان میں جو غذائی اشیاء پیدا ہوتی تھیں وہ مشرقی پاکستان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھیں۔ دونوں حصوں کے بنیادی ڈھانچے کی سہولتیں انتہائی بری حالت میں تھیں۔ پاکستان کو بالکل نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ جس کے لیے بنیادی ڈھانچے اور صنعتی کارخانوں کا قیام ضروری تھا۔

معاشی ترقی کے لیے سیاسی استحکام لازمی ہوتا ہے۔ سیاسی عدم استحکام معاشی بالیدگی (Economic Growth) کو جھنجوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ بدقسمتی سے تقسیم کے فوراً بعد پاکستان شدید سیاسی عدم استحکام سے دوچار ہو گیا۔ سیاسی مسائل و جھگڑے جنہوں نے پاکستان بننے کے ساتھ ہی سر اٹھا لیا تھا' پاکستان کی معاشی ترقی کو شدید نقصان پہنچایا۔ سب سے نمایاں مسئلہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کا جھگڑا تھا۔ کشمیر کے مسئلہ پر تو تکار نے ملک کے قدرتی وسائل کا بہت بڑا حصہ ہڑپ کر لیا تھا۔

ہندوستان کے ساتھ سیاسی مخاصمت کے علاوہ اندرونی سیاسی بدامنی اور افراتفری نے ملک کی معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی۔ بدقسمتی سے پاکستان ایک قابل عمل اور ہموار سیاسی نظام تشکیل نہ دے سکا۔ حکومتوں کا تیزی سے بدلنا اور نااہل اور بدعنوان

سیاست دانوں نے معاشی بالیدگی کی راہ میں ناقابل تسخیر رکاوٹیں پیدا کیں۔ ہر آنے والی حکومت نے اپنے سے پہلے کی حکومتوں کے کام کو رد کر دیا۔ انہوں نے اپنی حکمت عملی نئے سرے سے وضع کی اور اپنے پیشرو کا کیا ہوا ترقیاتی کام مٹا دیا۔

حکومتی اہل کاروں کا افسر شاہی رویہ بھی ملک کی معاشی پسماندگی کا ذمہ دار ہے۔ معاشی منصوبہ سازوں کو ملک کی معاشی مشکلات کا شعور نہیں وہ معاشی بالیدگی (Economic Growth) کی راہ میں حائل رکاوٹوں سے بے خبر اور ان پر قابو پانے سے قاصر ہیں۔

کم ترقی یافتہ ممالک (Less Developed Countries) کے لیے کساد بازاری اور معاشی پسماندگی سے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی پیدا کردہ غربت کے شکار ہوتے ہیں۔ پاکستان ایک کم ترقی یافتہ ملک ہوتے ہوئے اپنی غربت پر قابو نہ پا سکا۔ مفلس اور قلاش عوام معاشی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ پاکستان غربت کے موذی چکر (Vicious Circle of Poverty) کا شکار ہوگیا جو کم پیداوار، سرمایہ کی کمی، منڈی کی ناکامیلات (Market Imperfection)، معاشی پسماندگی اور کم ترقی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی جہالت، سائنس اور ٹیکنالوجی کی عدم دستیابی بھی معاشی پسماندگی کے ذمہ دار تھے۔ پاکستان سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں وسائل کی کمی اور ہر آنے والی حکومت کی بے ربط سیاسی اور معاشی پالیسوں کی وجہ سے ترقی نہ کر سکا۔

ست زرعی ترقی بھی پاکستان میں پست معاشی سرگرمیوں کی ذمہ دار ہے۔ زرعی ترقی ملک کے مفادات کے مطابق نہیں ہوئی۔ زرعی پیداوار کی کمی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی نے کسان کی آمدنی پر منفی اثرات مرتب کیے جو دوسرے پیشے اپنانے پر مجبور ہوگیا۔

آزادی سے پہلے برطانوی حکمرانوں نے چند علاقوں کی ترقی پر توجہ نہیں دی جو پاکستان کا حصہ بنے۔ غیر ملکی حکمرانوں نے موجودہ وسائل کو صرف اپنی حکومت کو مضبوط کرنے اور مقامی لوگوں کو غلام بنانے کے لیے استعمال کیا۔ ان علاقوں کو قصداً پسماندہ رہنے دیا گیا تاکہ وہ برطانوی باشندوں کی فیکٹریوں کے لیے خام مال مہیا کرتے رہیں۔ برطانوی حکمرانوں نے صرف بنیادی صنعتوں یعنی کان کنی، چائے، کافی، ربڑ اور تیل کی تلاش میں سرمایہ کاری کی۔ لہٰذا شروع میں پاکستان نے برطانوی حکمرانوں کے تحت جو نقصان اٹھایا وہ قومی ترقی کی راہ میں مستقل رکاوٹ بن گیا۔

بہر حال بہت ساری رکاوٹوں اور مسائل کے باوجود پاکستانی معیشت نے جنوبی ایشین اور جنوبی مشرقی ایشین ممالک کے مقابلے مین اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ حالانکہ بہت سارے اہداف حاصل نہ کئے جا سکے پھر بھی معیشت سوائے قیمتوں اور بڑے پیمانے پر صنعتی اشیاء کی تیاری کے دوسرے تمام محاذوں پر تیزی سے ترقی پذیر ہے۔

1994-95ء میں حکومت کی ناکامی کے باوجود معیشت نے تیزی دکھائی اور شاندار لچک کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنی اندرونی طاقت کو منوالیا اور پچھلے سال 3.8 کے مقابلے میں 4.7% سے ترقی کی ہے۔ زرعی پیداوار میں بڑھوتی پیدا ہوئی اور پچھلے سال کی نسبت بہتر کارکردگی سامنے آئی۔ صنعتی شعبہ ست رہا۔ اس کی ترقی میں 5.6 سے 4.4 فی صد پر کمی آئی۔ بڑے پیمانے پر صنعتی اشیاء کی پیداوار میں مایوس کن کمی دیکھنے میں آئی۔

پاکستان کی موجودہ معاشی صورت حال (Pakistan's Current Economic Situation)

1999ء میں جب فوج نے اقتدار سنبھالا تو اس وقت سے ملک کی معاشی حالت غیر یقینی کا شکار رہی ہے۔ کچھ تجزیہ نگار معیشت کی بڑی مایوس کن تصویر کھینچتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فوج کے اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی معاشی ترقی رک گئی، بے روزگاری اور غربت بڑھ رہی ہے اور سرمایہ کاری کم ہوگئی ہے۔ زرمبادلہ میں اضافہ کو کھلی مارکیٹ سے ڈالر کی خرید کے ساتھ ملایا جا رہا ہے۔

اسی طرح کچھ معاشی معاہرین پاکستان کی موجودہ معاشی صورت حال کے بارے میں بہت خوش فہمی کا شکار ہیں۔ ان کے مطابق ملک نے موجودہ مالی سال کے پہلے آٹھ ماہ میں 1.6 بلین ڈالر کا منافع حاصل کیا ہے۔ زرمبادلہ کے محفوظ اثاثہ جات 5 بلین ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔ ان تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ معیشت بحالی کی طرف گامزن ہے اور جلد ہی یہ مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو جائے گی۔

اصل صورت حال یہ ہے کہ اگر کچھ شعبوں کے کاروبار میں اچانک تیزی آگئی ہے تو دوسرے کئی شعبے مکمل ترقی کرنے میں ناکام رہے ہیں اور ان کی ترقی کے لیے زیادہ کوششوں کی ضرورت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ معیشت کے بیرونی شعبے نے بہت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ سال کے دوران برآمدات میں ترقی نہیں ہوئی پھر بھی جولائی۔فروری 2002-2001ء کے دوران 1.6 بلین ڈالر کا منافع دکھایا ہے۔ اس کی وجہ گھریلو ادائیگیوں میں تیزی، درآمدات میں کمی، بیرونی قرضوں کو دوبارہ سے جاری کروانے کی وجہ سے سود میں کمی اور بیرونی امداد اور IMF کی مدد ہے۔ اس کے ساتھ ہی ملک کے زرمبادلہ کے محفوظ اثاثہ جات 5 بلین ڈالر تک پہنچ گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سٹیٹ بنک نے جو کھلی مارکیٹ سے ڈالر کی خریداری کی، اس کی وجہ سے اثاثہ جات میں اضافہ ہوا لیکن ابھی تک افراط زر قابو میں ہے اور یہ امید کی جارہی ہے کہ یہ آئندہ بھی قابو میں رہے گا۔ بیرونی شعبہ میں ترقی کے نتیجے میں پاکستان کی بیرونی قرضہ کی حد میں کافی بہتری آئی اور بیرونی عطیات دینے والے پاکستان کی معیشت میں اعتماد کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ چند سال پہلے تک بیرونی قرضوں کا جو بوجھ پاکستان کی معیشت کو ڈراتا رہا ہے۔ وہ مضبوط زرمبادلہ کے محفوظ اثاثہ جات کی وجہ سے کم ہوگیا ہے۔

موجودہ معاشی صورت حال کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ پاکستان گندم میں خودکفیل ہوگیا ہے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں کہ موجودہ حکومت کے پہلے چار پانچ سالوں میں ہم گندم دوسرے ممالک کو بیچنے کے قابل ہوگئے۔ اس کے علاوہ پچھلے تین سالوں کے دوران کپاس کی فصل بہت اچھی رہی ہے جس کی وجہ سے ملک کے صنعتی سامان بنانے والے شعبے اور درآمدات میں بہت بہتری آئی ہے۔

گو کہ حکومت کی کوشش کے باوجود لگان کا ہدف حاصل نہیں ہو سکا لیکن پھر بھی حکومت لگان کی وصولی کو بہتر بنانے میں کامیاب رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے اپنے اخراجات میں کمی کی جس کی وجہ سے مالی خسارے کو کم کرنے میں مدد ملی۔

پھر بھی معیشت کے کچھ موضوعات ایسے ہیں جنہوں نے حکومت کی کوششوں سے ابھی تک فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان میں سب سے پہلے خام داخلی پیداوار ہے (GDP) جو ابھی تک 4 فیصد سے کم ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ 1990ء کے دوران جو کہ معیشت کی سب سے بڑی دہائی تھی GDP کی ترقی کی رفتار 4 فی صد تھی۔ اگر یہ درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی موجودہ حکومت GDP کو ترقی دینے کی کوششوں میں کئی عوامل یعنی امریکہ میں معاشی ترقی کا سست پڑ جانا، پاکستان میں بدترین خشک سالی جس نے زرعی پیداوار کو سخت نقصان پہنچایا، پاکستان کا امریکہ کے دوست کی حیثیت سے صف اول کی ریاست کا کردار جس نے صنعتی کارخانوں اور درآمدات کو سخت نقصان پہنچایا، نے اپنا منفی کردار ادا کیا۔ امریکہ کی قیادت میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کی وجہ سے پیدا عدم استحکام اور ایک دشمن ہمسایہ کی موجودگی جس کی وجہ سے حکومت کی طاقت اور دولت کو قومی تعمیر کے کام کی بجائے مادر وطن کے تحفظ کی طرف موڑنا پڑا، نے اہم کردار ادا کیا۔

معاشی ترقی کے رک جانے سے حکومت کی ٹیکسوں کی وصول یابی بھی رک گئی۔ اس صورت میں ترقیاتی کاموں یعنی تعلیم، صحت، روزگار کے مواقع پیدا کرنا اور غربت کے خاتمے کے لیے بجٹ سے رقم مختص کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حکومت مکمل

قرضوں کی سہولت، خوش حال پاکستان، فوڈ سٹیمپ اور زکوٰۃ کے نظام کو بہتر بنانے کے باوجود بے روزگاری اور غربت پر قابو نہیں پا سکی۔ اوپر دیئے گئے محاذوں سے آگے نکلنے کے لیے حکومت کو GDP کی ترقی کو تیز اور ٹیکسوں کی وصولیابی کو سب سے پہلے بہتر بنانا ہوگا۔

دوسری جانب سرمایہ کاری بشمول دیگر اشیاء کے سرمایہ کاری میں بنیادی ڈھانچے کی کمی، تعلیم یافتہ اور ماہر افرادی قوت کی کمی، سیاسی عدم استحکام، امن عامہ کی مخدوش صورت حال اور ہندوستان۔ پاکستان کی سرحدوں پر تناؤ کی وجہ سے سرمایہ کاری میں پیش رفت نہیں ہو سکی۔

صدر جنرل پرویز مشرف نے کہا ہے بہتر منافع کے لیے پاکستان میں سرمایہ کاری کا سنہری موقع موجود ہے۔ حکومت کی اقتصادی پالیسیوں کے نتیجے میں فی کس آمدن میں اضافہ ہوا ہے اور پاکستان کم آمدنی والے ملکوں کی فہرست سے نکل گیا ہے۔ عوام کی قوت خرید بڑھی ہے، مصنوعات کی مانگ میں اضافے سے رسد اور طلب میں توازن برقرار نہیں رہ سکا اس لئے مصنوعات پر منافع کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ ٹیکسٹائل کے شعبہ کو پاکستانی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی قرار دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم اس شعبہ میں مزید توسیع چاہتے ہیں۔ ہم اس سیکٹر میں مقدار اور معیار دونوں میں اضافہ کریں گے۔ اس وقت پاکستان میں ٹیکسٹائل کے شعبہ میں 5.5 بلین ڈالرز کی سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ اضافی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہم توانائی کے تمام ذرائع بروئے کار لائیں گے۔ ٹیکسٹائل میں مزید محنت اور سرمایہ کاری سے ہم اپنی اقتصادی ترقی اور برآمدات میں اضافے کو برقرار رکھ سکیں گے۔

صدر جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں میں ملک کی اقتصادی ترقی، روزگار کے مواقع میں اضافہ، بیروزگاری اور غربت و افلاس کو کم کرنا، سرمایہ کاری کے فروغ کے لیے ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کو تمام سہولتوں اور مراعات کی فراہمی، دہشت گردی اور انتہا پسندی پر قابو پانے کے لیے بعض انضباطی اور قانونی اقدامات کے ساتھ ساتھ ان دونوں رجحانات کے پس پردہ اسباب وعلل کو ختم کر کے عوام کو آزادی کی نعمتوں اور برکتوں سے بہرہ ور کرنے کو محور و مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے لیے کراچی کے بعد حال ہی میں لاہور میں بھی ایک ایکسپو سینٹر کی بنیاد رکھی گئی ہے اور کراچی کے ٹیکسٹائل سٹی میں 80ہزار سے زائد افراد کو روزگار کی سہولت میسر ہے۔ ملک کے بڑے بڑے صنعتی شہروں میں ڈرائی پورٹس قائم کی جا رہی ہیں۔ حال ہی میں اسلام آباد میں ایک ڈرائی پورٹ کا افتتاح وزیراعظم شوکت عزیز نے کیا۔ لاہور میں وزیراعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی کی کوششوں سے سندر انڈسٹریل اسٹیٹ پر کام جاری ہے جسے ایک زبردست صنعتی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگی۔

سٹیٹ بنک کے سابق گورنر عشرت حسین کے مطابق ملک میں اس وقت 63لاکھ خاندان غربت کی سطح سے نیچے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عوام کی قوت خرید میں کس قدر اضافہ ہوا اور کتنی کمی آئی اس تجزیے کے لیے بھی کچھ وقت درکار ہے۔ جہاں تک ٹیکسٹائل کی صنعت کا تعلق ہے بلاشبہ اسے قومی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے اور ٹیکسٹائل مصنوعات کی برآمد سے پاکستان بھاری زرمبادلہ کماتا ہے۔ ماضی میں بعض حکومتوں کی کوتاہی اور غلط اقتصادی پالیسی کے نتیجے میں یہ صنعت ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ایک بحران کا شکار رہی لیکن اب یہ صنعت بڑی حد تک اپنی پیداواری صلاحیت کو پوری طرح بحال کر چکی ہے لیکن ڈبلیو ٹی او کے چیلنجز سے نمٹنے، عالمی مارکیٹ میں بڑھتے ہوئے جذبہ مسابقت کا مقابلہ کرنے اور ٹیکسٹائل سمیت تمام دوسرے صنعتی شعبوں میں ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دینے کے لیے بڑے انقلابی اور نتیجہ خیز اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

اقتصادی محاذ پر اس وقت پاکستان کو تجارتی خسارے کی صورت میں بڑا اور توجہ طلب مسئلہ درپیش ہے۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان کی ایک رپورٹ کے مطابق جولائی 2005ء سے جنوری 2006 تک پاکستان کا تجارتی خسارہ 6ارب 49 کروڑ 70لاکھ

ڈالرز کی ریکارڈ سطح پر پہنچ گیا۔ گزشتہ سال اسی مدت کے دوران تجارتی خسارے کا حجم 2 ارب 85 کروڑ 80 لاکھ ڈالر تھا۔ اس طرح گزشتہ سال کی نسبت تجارتی خسارے میں 3 ارب 63 کروڑ 90 لاکھ ڈالر کا اضافہ ہوا۔ فروری کے پہلے ہفتے میں زرمبادلہ کے ذخائر مزید کم ہو کر 11 ارب 44 کروڑ 24 لاکھ ڈالر تک آ گئے۔ بعض اطلاعات کے مطابق سارک ممالک کے درمیان ہونے والے آزادانہ تجارتی معاہدہ سافٹا پر عمل درآمد کے معاملے میں پاکستان آٹو موبائل سیکٹر اور ٹیکسٹائل سیکٹر کے درمیان بعض اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جن کے باعث جنوبی ایشیائی خطے میں آزاد تجارت کے معاہدہ پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی۔ حکومتی سطح پر اقتصادی ترقی، سرمایہ کاری کے فروغ اور برآمدات میں اضافے کے لیے کی جانے والی کوششوں کو آگے بڑھانا اور انہیں نتیجہ خیز بنانے میں پرائیویٹ سیکٹر کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نہ صرف وطن عزیز میں سرمایہ کاری کے فروغ، مصنوعات کا معیار بلند کرنے اور عالمی مارکیٹ کا رجحان جاننے کے لیے پرائیویٹ سیکٹر کو آگے آنا ہوگا بلکہ ڈبلیو ٹی او کے چیلنجز سے نمٹنے کے لیے مسلم ممالک کے درمیان تجارتی حجم بڑھانے کے لیے نجی شعبہ کو موثر کردار ادا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

برآمدی مصنوعات کا معیار بلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کے حصول اور تمام صنعتی شعبوں میں ریسرچ سیلز کا قیام عمل میں لایا جائے اس کے ساتھ ساتھ ہر صنعتی ادارے میں افرادی قوت کے لیے تربیتی ادارے بھی قائم کئے جائیں تاکہ تربیت یافتہ اور جدید ٹیکنالوجی پر دسترس رکھنے والے ماہرین کے لیے ہمیں دوسرے ملکوں کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ ٹیکسٹائل سمیت تمام صنعتوں کے لیے درکار مشینری بھی ملک کے اندر تیار کرنے پر توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے اس سے نہ صرف ملک مکمل طور پر صنعتی شعبے میں خودکفیل ہو جائے گا بلکہ مصنوعات کی پیداواری لاگ میں کمی بھی ممکن ہو سکے گی۔ صنعتی ترقی کے لیے اس پورے عمل میں تسلسل برقرار رہنے سے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی اور اس مقصد کے لیے کی جانے والی تمام کوششیں بھی نتیجہ خیز ثابت ہوں گی۔

پاکستان ٹیکسٹائل کی صنعت کے لیے کپاس کی صورت میں بہترین خام مال پیدا کرنے والا ملک ہے۔ ملکی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ بڑی مقدار میں کپاس برآمد بھی کر دی جاتی ہے۔ ہماری ٹیکسٹائل کی صنعت بین الاقوامی شناخت رکھتی ہے اور اس قسم کی نمائشیں نہ صرف جدید ٹیکنالوجی متعارف کرانے اور برآمدات کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں بلکہ ان سے سرمایہ کاری کو بھی فروغ ملتا ہے۔ توقع رکھنی چاہیے کہ حکومت کے ساتھ ساتھ نجی شعبہ میں اس صنعت کی ترقی اور فروغ کے لیے اپنا کردار ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گا۔

پاکستان کی کلی معاشیات کی کارکردگی (Pakistan's Macro-Economic Performance)

حالیہ دنوں میں پاکستان نے اپنی ملکی معاشیات کی کارکردگی میں بہتری دکھائی ہے۔ جنرل پرویز مشرف کے 12 اکتوبر 1999ء کے اقتدار سنبھالنے کے بعد آخری سالوں کے دوران حکومت کے معاشی اصلاحات متعارف کروانے۔ اور کلی معاشیات (Macroeconomic) کا استحکام حاصل کرنے کی کوشش کو بہت کامیابی ملی ہے۔ مالی خسارے میں بتدریج کمی آئی ہے۔ جبکہ موجودہ کھاتے میں جمع رقم کے خسارے میں کمی نہیں ہوئی بلکہ 2004-2001 سے ملک کی منڈیوں کے ادائیگیوں میں توازن اور زرمبادلہ کے محفوظ اثاثہ جات کی وجہ سے اس میں اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان فی روپے کے مبادلہ زر کی سطح بھی بہتر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی 1999ء میں افراط زر دو حرفی ہندسے سے گر کر 1999ء کے اواخر تک 3.4 فی صد تک آ گئی۔ اس کی وجہ سے بنک کے سود کی شرح میں کمی آئی ہے جس سے تمام ملک نے فائدہ اٹھایا ہے۔

آئی۔ایم۔ایف نے حکومت کے دعویٰ کی حقائق کی روشنی میں حمایت کی ہے۔ لیکن پھر بھی آئی۔ایم۔ایف یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس ترقی نے غربت یا سماجی صورت حال پر کوئی مثبت اثر ڈالا ہے۔ اس نے بڑے محتاط انداز میں وفاقی حکومت کی قیادت میں ترقی کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے ہونے والی تحقیق کی افادیت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

آئی۔ایم۔ایف ملک کی کلی معاشیات(Macro-economic) کی کارکردگی پر مطمئن ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ مضبوط مقامی طلب اور بیرونی شعبے کی مدد کی وجہ سے ہے۔ اس کی سوچ کے مطابق بیرونی شعبے نے گھریلو شعبے کو 2002-2003 میں بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا جب کہ باہر سے آنے والی آمدنی اصل میں 460.7 فی صد بڑھی اور عام حالات میں 541.5 فی صد بڑھی۔ سال 2004-2005ء میں باہر سے آنی والی نقد آمدنی حقیقی معنوں میں 30 فی صد منفی ہوگئی۔

-معاشی کارکردگی کو مختلف زاویوں سے پرکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے 9/11 سے پہلے اور بعد کا دور ہے۔ مالی سال 2001-2002ء دنیا کی معاشی حالت کے لیے نہایت مشکل اور کٹھن تھا۔ بہت سارے اہم واقعات بین الاقوامی اور قومی سطح پر وقوع پذیر ہوئے جنہوں نے بشمول پاکستان معاشی ترقی پر گہرا اثر ڈالا۔ 11 ستمبر 2001 اور 13 دسمبر 2001 کے واقعات اور ان کے بعد پیدا ہونے والے حالات اور پھر تباہ کن خشک سالی نے پاکستان کی معاشی بحالی کی رفتار کو نقصان پہنچایا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی وجہ سے پاکستان جنگی علاقہ بن گیا تھا لہٰذا بیرونی کمپنیوں نے اپنا سرمایہ واپس نکال لیا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ القاعدہ تنظیم پاکستان میں دہشت گردی کرے گی۔ پاکستان کی درآمدات میں 1/3 کمی آ گئی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس عرصے میں پاکستان کی معیشت نے 2 بلین ڈالر کے کاروبار کا نقصان برداشت کیا۔ سب سے زیادہ نقصان ٹیکسٹائل کے شعبے کو پہنچا جو پاکستان کی سالانہ درآمدات کا 50 فیصد اور صنعتی افرادی قوت کا 60 فیصد مہیا کر رہا تھا۔ اس دوران پاکستان کی معیشت نے آبادی بڑھنے کے مقابلے میں کم ترقی کی۔

9/11 کے پہلے کا ٹیکس کے شعبہ میں جمود حکومت کے لیے سب سے زیادہ مایوس کن تھا' جبکہ ترقی صرف نا قابل ٹیکس شعبہ میں ہوئی۔ یہ اچھی معاشی کارکردگی کا ثبوت نہیں ہے۔ اخراجات میں موجودہ کمی زیادہ تر سود کی ادائیگی کے نیچے آنے کی وجہ سے ہوئی۔ فوجی اخراجات میں کمی محض فریب نظر ہے کیونکہ سال 2000ء سے پنشن میں سول انتظامیہ کی وجہ سے ادائیگی کا انبار لگ گیا ہے۔

باوجود اس کے کہ حکومت کی ترجیح ترقیاتی اخراجات کے حق میں تبدیل ہوئی ترقیاتی اخراجات میں معمولی سی بہتری آئی۔ نا قابل ٹیکس آمدنی اور امداد میں اضافہ اور موجودہ اخراجات میں کمی کی وجہ سے مالی خسارے میں 9/11 سے پہلے کی سطح 5.3 فی صد میں 1993-94 سے 2001-2002 تک 9/11 کے بعد کے عرصے میں 2.3 فی صد کمی آئی ہے جن کی وجہ سے حکومت کو وافر مالی فائدہ ہوا۔

بیرونی محاذ پر حکومت تجارتی خسارے کو کم کرنے میں کامیاب رہی اور نجی سرمایہ داروں سے بھی مدد ملی۔ بیرون ملک سے پاکستانیوں کی ادائیگیوں نے بلاشبہ ترقی پر خوش کن اثرات مرتب کئے جو 9/11 کے بعد کے نئے دور سے پیدا ہوئے۔ حکومت اس صورت حال سے بیرون ملک پاکستانیوں کی ادائیگیوں سے ترغیبی مراعات کے ذریعے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہی جس سے بیرون ملک پاکستانیوں کی آمدنی کے بہاؤ میں بہت تیزی آ سکتی تھی۔ حکومت اس عرصے کے دوران براہ راست بیرونی سرمایہ کاری F.D.I کو تمام مشکلات کے باوجود کھینچنے پر تعریف کی حق دار ہے۔ گو کہ براہ راست بیرونی سرمایہ کاری F.D.I کے لیے صورت حال مثالی نہ تھی لیکن پھر بھی 2004-2005 کے دوران براہ راست سرمایہ کاری F.D.I 1 بلین ڈالر پر بند ہوئی جبکہ 9/11 سے پیشتر یہ 283 ملین ڈالر تھی۔ بہرحال اس سلسلے میں نمایاں حصہ حبیب بنک اور UBL کی نج کاری اور PTCL کی بیرونی سرمایہ کاروں کو موبائل فون بیچنے کے لائینس دینے کا ہے جو کہ اصل سرمائے کے علاوہ نہیں۔

حکومت کی پالیسی کے مخالفین ایک اور دلیل دیتے ہیں کہ گھریلو طلب اور صنعتی شعبہ کی ترقی کا دارومدار قرضوں پر ہے۔ یہ دلیل یا تو لاعلمی کی وجہ سے اور یا ضد پر مبنی ہے۔ صنعتی سامان بنانے کی استعداد 870 ملین روپے ہے جبکہ قرضے میں صارفین کا حصہ

75 بلین روپے ہے۔ 8 فیصد سے تھوڑا اوپر۔ صنعتی مال بنانے کا شعبہ خام داخلی پیداوار (Gross Domestic Product) GDP کا صرف 17.5 فی صد ہے۔ یہ انتہائی فضول بات ہے کہ 17.5 کا 5 فی صد حصہ ترقی کی کارکردگی پر دباؤ ڈال سکتا ہے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک دونوں میں صارفین کے قرضہ جات معاشی سرگرمی کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ یہ عام آدمی کی قرضوں تک رسائی کو بڑھانے کے طریق کار کا حصہ ہیں۔

طلب کے شعبہ میں سب سے بڑا حصہ زرعی پیداوار سے آیا جس میں دو سالوں 2003-2004 اور 2004-2005 کے دوران عام GDP سے دوگنا زیادہ اضافہ ہوا جس کی وجہ زرعی پیداوار کی بلند قیمتیں تھیں۔ زرعی افراط زر 2004-2005 کے دوران 22 فیصد کے حساب سے بڑھی لیکن حقیقت میں زرعی پیداوار صرف 2.6 فیصد بڑھی۔

پچھلے چار سال زراعت کی تاریخ میں پانی کی کمی اور خشک سالی کی وجہ سے بہت مشکل تھے۔ اس کے باوجود زرعی شعبہ نے GDP کی ترقی میں مثبت کردار ادا کیا۔ غذائی اشیاء آسانی سے حاصل ہوتی رہیں جس کی وجہ سے افراط زر کی سطح نیچی رہی۔ پچھلے چار سالوں میں افراط زر کی نچلی سطح معاشی کارکردگی کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اس کی وجہ سے سودی منافع کی شرح اس سطح پر آ گئی جو پہلے کبھی نہ تھی۔ سود کی کم شرح کی وجہ سے پچھلے سال کے دوران سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا۔ سود کی کم شرح نے پچھلے سال کے دوران قرضوں کے اجرا پر بھی مثبت اثر ڈالا۔ پاکستان نے اپنے گھریلو قرضہ جات کے ہدف میں بہتری حاصل کی اور سود کی ادائیگی کی شرح کافی حد تک نیچے رہی۔ سود کی کم ادائیگی اور مالی خسارے میں معقول کمی کی وجہ سے ملک میں کلی معاشیات (Macroeconomic Stability) کو مستحکم کرنے میں مدد ملی ہے۔

اوپر دیئے گئے حقائق کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 9/11 کے بعد ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے زیادہ ادائیگیاں آئی ہیں لیکن براہ راست بیرونی سرمایہ کاری F.D.I میں قابل ذکر اضافہ نہیں ہو سکا۔ تجارت میں توازن' مالی خسارے میں کمی' ٹیکسوں اور گھریلو طلب کی بہتری کلی معاشیات کے استحکام کو پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ یہ قابل بحث ہے کہ موجودہ ترقی کی رفتار کہاں تک قائم رہتی ہے لیکن یہ ایک بات واضح ہے کہ موجودہ معاشی بحالی مکمل طور پر مقامی اور قومی سطح پر آنے والی تبدیلیوں کی وجہ سے ہے۔

پھر بھی پچھلے ایک سال یعنی 2004-2005 کے دوران کلی معاشیات کا استحکام جو کہ 1999ء کے فوجی انقلاب کے بعد حاصل ہوا غیر یقینی کی صورت حال کا شکار ہے۔ باوجود کہ مالی خسارہ نچلی سطح پر قائم ہے موجودہ منافع خسارے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ تجارتی عدم استحکام میں اضافہ ہوا ہے اور پاکستانی روپے کی متبادل قیمت نہ صرف امریکی ڈالر کے مقابلے میں بلکہ دوسری بین الاقوامی کرنسیوں یعنی جاپانی ین کے مقابلے میں بھی گر گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ افراط زر کے چار عددی سطح تک بڑھنے کے خطرات ہیں۔ پھر بھی حکومت اور سٹیٹ بنک آف پاکستان کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے دسمبر 2005ء میں افراط زر میں 7.3 فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کے باوجود خام تیل کی قیمتوں اور خوردنی اشیاء یعنی گندم اور چینی کی قیمتوں میں اچانک اضافہ کی وجہ سے افراط زر کے بڑھنے کے خطرات بدستور موجود ہیں۔ پچھلے پانچ سالوں کے دوران حکومت مجموعی طور پر مالی خسارے میں GDP کے 6 فیصد میں 1999ء سے 2004-2005 تک 3.3 فی صد کمی کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اس کے لیے ٹیکسوں میں اضافہ اور اپنے اخراجات میں کمی کرنا پڑی۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ترقیاتی بجٹ میں بھاری اضافے کے باوجود مالی خسارہ قابو میں رہا ہے۔

پاکستان کے معاشی مسائل (Economic Problems of Pakistan)

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ پاکستان کے موجودہ علاقے تقسیم سے پہلے برطانوی حکمرانوں کی بے توجہی کی وجہ سے ترقی نہ کر سکے۔ تقسیم کے وقت پاکستان کا زرعی شعبہ بالکل تباہ حال تھا جس کی وجہ سے پاکستان کے علاقے معاشی بدحالی کا شکار

ہو گئے۔ پاکستان کی متعدد حکومتوں کو معاشی ترقی کے لیے مسلسل کوششیں کرنا پڑیں۔ ان کوششوں کے باوجود پاکستان کے تباہ حال معاشی ڈھانچہ کو ٹھیک نہ کیا جا سکا۔ جس کی وجہ سے معاشی بالیدگی (Economic Growth) کا عمل شدید مشکلات کی وجہ سے رکا رہا۔ پست آمدنی، بے روزگاری، افراط زر، غربت، جہالت، ناکافی بنیادی ڈھانچہ، قرضوں کا بوجھ اور سیاسی عدم استحکام جیسے عوامل نے معاشی پسماندگی کو بد سے بدتر کر دیا اور ملک ختم ہونے کے دہانے پر پہنچ گیا۔

اس وقت ملک کے قومی و افرادی وسائل غیر ترقی یافتہ ہیں۔ 1971ء میں ملک کا آدھا حصہ اپنی وسیع آبادی کے ساتھ علیحدہ ہو گیا جس سے ملکی سرحدیں نئے سرے سے معرض وجود میں آئیں۔ ملک کا 50 فیصد ٹیکسوں کا حصہ قرضوں اور دفاع کی ضروریات پر خرچ ہو جاتا ہے۔ باقی کا 20 فیصد حصہ افسر شاہی ہڑپ کر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بدعنوان اور نااہل سیاست دانوں کی لوٹ مار نے ملکی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ملکی معیشت کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

1- انتظامی رکاوٹیں (Administrative Obstacles)

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں اہل اور قابل منتظمین کی شدید کمی رہی ہے جو معاشی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ سرکاری اداروں کو چلانے کے لیے کثیر تعداد میں منتظمین اور فیصلہ ساز افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان میں ماہر منتظمین اور اعلیٰ پایہ کے فیصلہ ساز افراد کی نہ صرف کمی ہے بلکہ سرکاری کارندے عموماً بدعنوانی اور کام چوری میں ملوث رہتے ہیں۔ سرکاری افسران رشوت ستانی، غبن، بد دیانتی اور کنبہ پروری جیسی قبیح سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ سرکاری اہل کاروں کی بدعنوانی معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ سرکاری منتظمین کی بدعنوانی کی وجہ سے دفتری فیصلوں میں تاخیر ہوتی ہے جو ترقی کے عمل کو روک دیتی ہے۔ چنانچہ مختلف ادوار میں بدعنوان سرکاری افسران کو ملازمت سے جبری ریٹائرڈ کیا جاتا رہا۔ ماہر منتظمین کی کمی کو پورا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے:

1- پبلک ایڈمنسٹریشن کی تربیت کے ادارے قائم کیے جائیں۔
2- تعلیم کی سہولتوں میں توسیع کی جائے خصوصاً اعلیٰ تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔
3- ملازمت کے دوران تربیت کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔
4- مختلف شعبوں میں تخصیص (Specialization) اور مہارت مہیا کرنے کے لیے مناسب تعلیمی اور تربیتی ادارے قائم کیا جائیں۔

2- سیاسی رکاوٹیں (Political Obstacles)

پاکستانی ماضی میں برطانیہ کی نو آبادی (Colony) رہا ہے اور برطانوی حکومت کو پاکستان و بھارت کی معاشی ترقی کی نسبت ان علاقوں سے اپنی صنعتوں کے لیے ضروری خام مال حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

پاکستان بننے کے بعد حکومت کو ترقی کے لیے کوششیں کرنا پڑیں۔ ہر آنے والی حکومت نئے سرے سے معاشی حکمت عملی وضع کرتی جس سے شدید سیاسی عدم استحکام پیدا ہوا۔ حکومتوں کا بار بار اور اچانک بدلتے رہنا اور سماجی بے چینی (Social unrest) معاشی ترقی کے منصوبوں اور معیشت کی ترقی اور بالیدگی پر برے اثرات مرتب کرتے رہے۔ ملک میں آئے دن ہونے والی ہڑتالیں، فسادات اور احتجاج سماجی بے چینی ظاہر کرتے ہیں۔ اس بے چینی کی وجہ سے نہ صرف قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے بلکہ اس کی بدولت نئی سرمایہ کاری رک جاتی ہے اور لوگ اپنے کام کرنے کی بجائے ہڑتالوں اور احتجاج میں شرکت کے لیے بازاروں اور سڑکوں پر آ جاتے ہیں۔ اس طرح سے امن عامہ کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح سیاسی بحران معاشی ترقی کو روک دیتا ہے۔

پاکستان آزادی سے لے کر آج تک شدید سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا ہے۔ 1950ء سے پہلے آئے دن حکومتیں بدلتی رہیں۔ 1958 سے 1969 تک کے دور میں ملک میں کچھ سیاسی استحکام آیا جس کی وجہ سے اس عرصے میں پاکستان کی معاشی ترقی بھی نمایاں رہی۔ دسمبر 1970ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والی سیاسی بدامنی نے ملک کی معاشی حالت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

دسمبر 1971ء میں پیپلز پارٹی کے بینکوں اور بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے سے سرمایہ داروں میں تشویش اور خوف پیدا ہوا جس کی وجہ سے ملک میں سرمایہ کاری کی شرح گر گئی۔ 1977ء کے انتخابات کے بعد قومی اتحاد کی پیپلز پارٹی کے خلاف تحریک کی بدولت ملک شدید سیاسی بحران کا شکار ہوا اور معاشی سرگرمیاں بری طرح متاثر ہوئیں۔ صدر ضیا الحق کے دور میں 1977 سے 1988 تک ملک میں قدرے سیاسی استحکام پیدا ہوا جس سے معاشی ترقی کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔

1988ء میں مرکز میں بے نظیر بھٹو کی حکومت آئی اور صوبہ پنجاب میں نواز شریف کی قیادت میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت بنی۔ مرکزی اور پنجاب کی حکومتیں پاکستان کی تاریخ کی بدترین سیاسی محاذ آرائی میں ملوث ہوئیں جس کی وجہ سے ملک میں شدید سیاسی بحران پیدا ہوا۔ دونوں حکومتیں آٹھویں ترمیم کے ذریعے توڑ دی گئیں۔ 1990ء میں پھر اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت بنی لیکن اسے 1993ء میں توڑ دیا گیا۔ 1993ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت آئی لیکن دو سال بعد نومبر 1996ء میں اسے بھی صدارتی حکم کے تحت ختم کر دیا گیا۔ اس عرصے کے دوران حکومت اور حزب مخالف کے درمیان شدید محاذ آرائی کی وجہ سے ملک سیاسی بحران کا شکار رہا اور کراچی میں سخت بدامنی پیدا ہوئی جس کی وجہ سے معاشی و سماجی عدم استحکام عروج پر رہا۔ فروری 1997ء میں نواز شریف کی قیادت میں بھاری مینڈیٹ کے ساتھ مسلم لیگ کی حکومت برسراقتدار آئی لیکن سیاست دانوں کی ریشہ دوانیاں، حکومت اور عدلیہ کی محاذ آرائی اور دہشت گردی نے شدید سیاسی عدم استحکام پیدا کیا۔ 12 اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف کی قیادت میں فوج نے نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

3- غیر پیداواری اخراجات (Non-Productive Expenses)

پاکستان کے سماجی، سیاسی اور معاشی ڈھانچہ کی وجہ سے غیر پیداواری اخراجات میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے جغرافیائی و سیاسی حالات کی وجہ سے ملکی دفاع پر بہت توجہ دینی پڑتی ہے۔ سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے آئے دن حکومتیں بدلتی رہتی ہیں اور ملک کسی واضح سیاسی و معاشی پروگرام کے بغیر چل رہا ہے۔ اس صورت حال کا فائدہ نوکر شاہی اٹھا رہی ہے۔ ایک طرف تو دن بدن نوکر شاہی کے اہل کاروں میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف انتظامی اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ 2004-2005ء میں نوکر شاہی کے کارندوں کے اخراجات کا تخمینہ 304 ملین روپے ہے جبکہ الاؤنسز اور پنشن کے لیے 42 بلین روپے رکھے گئے ہیں۔

پاکستان میں ٹیکسوں کا نظام فرسودہ اور پیچیدہ ہے۔ ٹیکس چوری اور رشوت ستانی بہت بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے ٹیکس وصولی کا ہدف پورا نہیں ہو پاتا۔ ملک میں ٹیکس گزاروں کی تعداد صرف 15 لاکھ ہے۔ کوئی بھی شخص ٹیکس گزار بننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس صورت حال میں حکومت کے غیر پیداواری اخراجات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جبکہ حکومت کی آمدنی نہیں بڑھ رہی۔ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے حکومت کو بیرون ملک اور اندرون ملک سے قرضے لینے پڑتے ہیں جن پر بھاری سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ نتیجتاً بجٹ کا 80 فیصد حصہ تین مدوں دفاعی اخراجات، انتظامی اخراجات اور قرضوں کے سود جیسے غیر پیداواری اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے۔

4- غربت (Poverty)

وہ افراد جن کی روزانہ کی فی کس آمدنی (Per capita Income) ایک ڈالر سے کم ہے وہ غربت کی لائن سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ پاکستان میں غربت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جس کی بڑی وجہ آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی ملکی وسائل اور معیشت پر بہت بوجھ ڈالتی ہے۔ آبادی بڑھنے سے ایک خاندان میں غیر کماؤ افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے یعنی ایک کمانے والے کو کئی غیر کمانے والوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے فی کس آمدنی میں کمی ہو جاتی ہے۔ حکومت کو غیر پیداواری اخراجات پر بہت خرچ کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے روزگار اور آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا اور ملک میں غربت کم نہیں ہوتی۔

ہمارا زرعی شعبہ پسماندہ ہے۔ کسان کا 50 فیصد رقبہ غیر معاشی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی آمدنیاں محدود رہتی ہیں اور غربت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

5- بے روزگاری (Unemployment)

بے روزگاری معیشت کے لیے بہت بڑی لعنت ہے۔ یہ غربت میں اضافے کا باعث ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرہ غربت کے ہولناک چکر (Vicious Circle of Poverty) میں پستا رہتا ہے اور غربت میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

بے روزگاری میں اضافہ کی سب سے بڑی وجہ آبادی کا بڑھنا ہے۔ گو کہ پچھلے دس سالوں یعنی 1994-2004ء میں شرح پیدائش میں کمی رہی اس کے باوجود دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں پاکستان کی شرح پیدائش بہت زیادہ ہے۔ پاکستان کے زرعی اور صنعتی شعبے اس قابل نہیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی کو اپنے اندر سمو سکیں جس کی وجہ سے بے روزگاری میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

مالیاتی نظم ونسق کو تبدیل کیا جا رہا ہے جو خسارے کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ملازمین کے سائز کو کم کیا جا رہا ہے۔ IMF کی شرائط پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے جس کے تحت سیلز ٹیکس کو معیشت کے بہت بڑے حصے پر لاگو کیا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں آجرین کے مصارف میں اضافہ ہو جائے گا۔ وہ پیداوار کو کم کر دیں گے جس سے روزگار میں کمی آ جائے گی۔

6- توانائی کی کمی / لوڈشیڈنگ (Loadsheding / Power Shortage)

توانائی کی کمی اور لوڈشیڈنگ ہمارے سماجی و معاشی نظام کی سردردی بن گئے ہیں۔ صنعتی ترقی کے لیے توانائی اشد ضروری ہے۔ توانائی کی قلت معاشی ترقی کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ پاکستان میں توانائی کی کمی نے صنعتی ترقی کو سست کر دیا ہے۔

7- افراط زر (Inflation)

افراط زر کی بلند شرح ہمارے معاشی نظام کی بیماری بن گئی ہے جو دن بدن ملکی معیشت کو اندر اندر ہی سے کھائے جا رہی ہے۔ بڑھتی ہوئی افراط زر پاکستان کے معاشی ماہرین کا سب سے بڑا مسئلہ ہے کیونکہ کوئی حکومت اس قابل نفرت معاشی مسئلے کو قابو کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ پچھلے سالوں کے جائزہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پاکستان میں افراط زر دن بدن بڑھتی رہی ہے۔ افراط زر کا سب سے برا اثر یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اور عام آدمی کی قوت خرید گھٹ جاتی ہے۔ یہ چیز ہماری معیشت کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔

8- ماہر افرادی قوت کی کمی (Lack of skilled Manpower)

پاکستان میں ماہر افرادی قوت کی شدید کمی ہے۔ چونکہ ملک میں ٹیکنکل تعلیم کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں اس لئے قومی ضروریات کے مطابق ماہر افرادی قوت پیدا نہیں ہو رہی ۔ پاکستان کے لوگوں میں قومی جذبے کی کمی ہے جو چند لوگ ماہرانہ تعلیم حاصل کر لیتے ہیں وہ ملازمت کے لیے دوسرے ممالک کا رخ کر رہے ہیں جہاں سے انہیں بہتر سہولتیں اور بھاری مشاہرہ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ یہ نظریہ بھی ہماری معیشت کے لیے سنجیدہ مسئلہ ہے کیونکہ اگر ماہر افراد نہ ہوں گے تو صنعتی کارخانے پیداوار نہیں بڑھا سکیں گے۔

9- بری حکمرانی (Bad Goverance)

ماہرین معاشیات معاشی ترقی کو اچھی حکمرانی یا انسان دوست حکمرانی (Good Governace) سے منسلک کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر ملک کا انتظامی' سیاسی و سماجی ڈھانچہ مضبوط بنیادوں پر ایستادہ ہوں گے تو یہ معیشت کی ترقی پر اچھا اثر ڈال سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں گڈ گورننس کا نظریہ سرے سے ہی ناپید ہے۔ پاکستان میں سیاست دانوں اور حکمرانوں کے پیش نظر اپنے مفادات ہوتے ہیں جس کی وجہ سے حکمران اور سیاست دان شدید بدعنوانی میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ وہ قومی مفادات کو پس پشت ڈال کر اپنے مفادات کے تحفظ اور لوٹ کھسوٹ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے ادوار میں بری حکمرانی کا راج تھا اور عوامی مفادات کا کسی کو کوئی خیال نہ تھا۔

پاکستان میں اختیارات پھیلے ہونے کی بجائے اوپر کی سطح پر اعلیٰ انتظامیہ کے ہاتھوں میں مرتکز ہیں۔ عوام کو شہری اور بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ عوام کو چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور سرخ فیتہ کی کاروائیوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ انتظامیہ کا رویہ خادم کی بجائے مالک اور ان داتا جیسا ہوتا ہے۔ سرکاری دفتروں میں کھلے عام رشوت چلتی ہے۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے حکمران کھلی کچہریوں کا بازار لگا دیتے ہیں جہاں عوام کو جھوٹی تسلی دی جاتی ہے۔ بری حکمرانی کی وجہ سے سرمایہ کار صنعتوں میں پیسہ لگانے سے گھبراتے ہیں۔

اس صورت حال کو بدلنے کی سخت ضرورت ہے۔ ریاست کی سرگرمیوں کو اس کی استعداد کے مطابق ہونا چاہیے لیکن پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔ حکومت کا سائز بہت بڑا ہے جس سے غیر پیداواری اخراجات میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اور اس کے ساتھ وسائل کو غلط طریقے سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے افراط زر میں اضافہ ہوا ہے جس سے معاشی ترقی کا عمل متاثر ہو رہا ہے۔ چنانچہ ''گڈ اکنامک گورننس'' (Good Economic Governance) کا تقاضا ہے کہ کلیاتی معاشی سطح (Macro Economic Level) پر معاشی استحکام ہو اور مالیاتی خسارے میں کمی آئے۔ معیشت میں سٹہ بازی جیسی کاروائیوں کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔ منڈی میں ترغیبات کا نظام رائج ہو اور جنس' مذہب اور زبان کی بنیاد پر کوئی کسی دوسرے سے اعلیٰ نہ ہو۔ پاکستان میں یہ کچھ موجود نہیں۔ یہاں خاندان' تعلقات' رشتہ داریوں اور سیاسی بنیادوں پر ملازمتیں فراہم کی جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں تبدیلی کا عمل شروع نہیں ہوتا۔

پاکستان کا شعبہ زراعت
(Agricultural Sector of Pakistan)

جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ کیونکہ اس کی آبادی کا 60 فیصد حصہ زراعت سے منسلک ہے۔ شعبہ زراعت خام قومی پیداوار (GDP) میں 24 فی صد سے زیادہ حصہ دیتا ہے۔ باروزگار افراد کا تقریباً 43 فیصد اسی شعبے سے وابستہ ہے۔ شعبہ زراعت ملک کو خوراک اور صنعتوں کے لیے خام مواد مہیا کرتا ہے۔ اس کے شعبہ زراعت ہی ملک کے لیے سب سے زیادہ زرمبادلہ کماتا ہے۔ اس طرح اس شعبے کو پاکستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت حاصل ہے۔

معاشی ترقی میں زراعت کا کردار
(Role of Agriculture in Economic Development)

1۔ سب سے بڑا ذریعہ آمدنی (Major source of Income)

زرعی شعبہ پاکستان کی قومی آمدنی یا خام ملکی پیداوار (GDP) میں سب سے بڑا حصہ ڈالتا ہے۔ وہ ممالک جہاں صنعتی شعبہ پسماندہ ہو معاشی پسماندگی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ زراعت ملکی آبادی کے بڑے حصے کو روزگار مہیا کرتی ہے۔

2۔ خوراک کی فراہمی (Source of Food)

پاکستان کی کثیر آبادی کو خوراک مہیا کرنے کی ذمہ داری شعبہ زراعت پر عائد ہوتی ہے۔ زراعت کا شعبہ پاکستان کی آبادی کے لیے اناج، سبزیاں، پھل، گوشت اور دودھ مہیا کرتا ہے۔ اگر زراعت کا شعبہ متحرک ہوگا تو بڑھتی ہوئی آبادی کو خوراک مہیا کی جا سکے گی۔ ورنہ خوراک کو درآمد کرنا پڑے گا جس سے زرمبادلہ خرچ ہوگا اور ادائیگیوں کا توازن اور معاشی ترقی متاثر ہوگی۔

3۔ ملکی صنعت کے لیے خام مال کی فراہمی (Raw Material for Industries)

زرعی شعبے کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہ ملکی صنعت کے لیے خام مال مہیا کرتا ہے۔ ٹیکسٹائل جو کہ پاکستان کا بڑا صنعتی شعبہ ہے کبھی ترقی نہ کر سکتا اگر پاکستان میں کپاس آسانی سے میسر نہ ہوتی۔ یہ شعبہ صنعتی ترقی کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ چینی کی صنعت کے لیے گنا اور سگریٹ سازی کے لیے تمباکو، بناسپتی گھی کی صنعت کے لیے تیلوں کے بیج اور کاغذ اور بورڈ کی صنعت کے لیے ضروری خام مال اور اونی کپڑے کی صنعت کے لیے اون زرعی شعبے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں مثلاً فرنیچر، کھیلوں کے سامان کے لیے لکڑی، مشروبات کی صنعت کے لیے مطلوبہ پھل، فلور ملوں کے لیے گندم اور ماچس کی صنعت کے لیے لکڑی زراعت کے شعبے سے حاصل ہوتے ہیں۔

4۔ صنعتوں کی ترقی کے لیے محنت کش افراد کی فراہمی
(Source of Manpower for Industrial Development)

غریب ممالک کے زرعی شعبہ میں مزدوروں کی بہتات ہوتی ہے لہٰذا اس شعبے سے فاضل مزدوروں کو نکال کر صنعتی شعبے کے قیام اور ترقی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

5- زرمبادلہ کمانے کا بڑا ذریعہ (Source of Foreign Exchange Earnings)

پاکستان کا زراعت کا شعبہ زرمبادلہ کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے۔ زرعی شعبے کی بدولت ہی ملک زرعی اشیاء کو برآمد کر سکتا ہے اس طرح غیر ملکی زرمبادلہ کمایا جا سکتا ہے۔ شروع کے سالوں میں چاول' کپاس' خام اون اور جانوروں کی کھالوں کا پاکستان کی برآمدات میں حصہ 48 فیصد تھا۔ جبکہ نیم تیار اشیاء جو زرعی شعبہ کے خام مال سے تیار کی جاتی ہیں مثلاً سوتی دھاگہ اور چمڑہ کی برآمدات کا حصہ 13 فیصد تھا۔ تیار اشیاء مثلاً کپڑے' جوتے' آلات جراحی' کھیلوں کے سامان' تیار شدہ لباس اور ہوزری کی مصنوعات کی برآمدات میں 39 فیصد حصہ تھا۔ اب بھی پاکستان کی معیشت میں زراعت کو زرمبادلہ کمانے میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

6- مصنوعات کے لیے منڈی کی وسعت (Extention of Market)

زراعت کا شعبہ چونکہ صنعتوں کی تیار کردہ اشیاء کے لیے ایک وسیع منڈی فراہم کرتا ہے اس لیے اگر زراعت تیزی سے ترقی کرے گی تو اس شعبہ سے وابستہ لوگوں کی آمدنیاں بڑھیں گی جس سے صنعت کی مصنوعات کی طلب میں اضافہ ہوگا اور اسی طرح منڈیاں وسیع ہوتی جائیں گی۔

زرعی شعبے کے مسائل اور خامیاں

(Problems and Drawbacks of Agricultural Sector)

1- قابل کاشت رقبے کی کمی (Less Area for Cultivation)

پاکستان میں کل قابل کاشت رقبہ تقریباً 55 ملین ہیکٹر ہے جس میں سے صرف 21 ملین ہیکٹر رقبہ پر کاشت کاری ہوتی ہے۔ اتنے کم رقبہ کو کاشت میں لانے کی وجوہات ہیں جن میں سرمائے کی کمی' پانی کی قلت' ناقص حکومتی پالیسیاں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ غیر حاضر زمیندارہ نظام' شکار گاہوں کا قیام اور آبادی میں اضافہ بھی کم رقبہ کاشت میں لانے کا موجب ہیں۔

2- غیر اقتصادی قطعات زمین (Uneconomic Holdings)

ایسا قطعہ اراضی جس پر جدید مشینی آلات مثلاً ٹریکٹر استعمال کر کے فائدہ ہو وہ اقتصادی قطعہ زمین کہلاتا ہے۔ پاکستان کے کاشت کاروں کے قطعات زمین بہت چھوٹے چھوٹے ہیں جن پر محنت اور کفایت سے کاشت کاری ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہی مالک کے قطعات زمین مختلف جگہوں پر بکھرے پڑے ہیں۔ اس طرح ان قطعات زمین کی پیداواری قوت بہت کم ہوگئی ہے۔

3- زمین کا چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہونا (Fragmentation of Land Holding)

پاکستان میں مسلسل آبادی میں اضافہ' قانون وراثت اور عیت کی بناء پر زمین چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جانے سے زمین کی پیداواری صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے کیونکہ اگر زمین چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جائے تو اس پر کاشت کاری مہنگی اور مشکل ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال کو دور کرنے کے لیے تعاونی کاشت کی تجویز زیر غور ہے لیکن جہالت کی بناء پر یہ سکیم بھی قابل عمل نظر نہیں آتی۔

4- سیم اور تھور (Water-logging and Salinity)

سیم وتھور کا دوہرا خطرہ (Twin Menace) پاکستان کی زراعت کی ترقی کے لیے سنگین خطرہ ہے۔ 8 ملین ہیکٹر رقبہ پر جو کل قابل کاشت رقبے کا 39 فیصد ہے اندرون زمین پانی کی سطح، زمین کی سطح سے 10 فٹ سے کم فاصلے پر ہے۔ سیم کی وجہ سے زیر زمین پانی کی سطح اونچی ہو جاتی ہے اور تھور کی بنا پر زمین میں جو نمکیات موجود ہوتے ہیں وہ زمین کی سطح پر آ جاتے ہیں جس کی وجہ سے زمین کاشت کاری کے قابل نہیں رہتی۔ سیم وتھور کی بڑی وجہ ہمارا نہری نظام ہے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق زراعت کے شعبے کا 20 فیصد حصہ سیم وتھور سے متاثر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ تیز بارشوں اور ندی نالوں کے تیز بہاؤ کی وجہ سے پاکستان کے بالائی علاقوں کی بہت سی زمین کٹاؤ کا شکار ہو کر ناکارہ ہوگئی ہے۔

5- بہتر کوالٹی کے بیجوں اور کھاد کی کمی (Lack of Good Quality Seeds and Fertilisers)

پاکستان میں کاشت کاروں کو اچھی نوعیت کے بیج اور کھاد حاصل کرنے میں بے شمار دشواریوں کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں جو بیج استعمال ہوتے ہیں وہ پچھلے سالوں کی بچی ہوئی اجناس پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس وقت ملک میں مصنوعی کھاد مثلاً یوریا، امونیم نائٹریٹ، امونیم سلفیٹ اور سپر فاسفیٹ تیار کرنے کے دس کارخانے ہیں لیکن ان کی پیداوار زراعت کے شعبے کی ضرورتوں سے بہت کم ہے۔ ہمارے ہاں کیمیائی کھادیں بہت مہنگی ہیں اور کسان گوبر کھاد استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ مختلف سالوں کے دوران مصنوعی کھاد درآمد بھی کرنا پڑی ہے۔

6- زرعی منڈیوں کا ناقص نظام (Defective Agricultural Market System)

ہمارے ہاں زرعی پیداوار میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں کسان بددل ہو جاتا ہے اور اگلے سال اس شے کو کم کاشت کرتا ہے جس سے اس کی پیداوار کم ہوجاتی ہے اور قیمت بڑھ جاتی ہے۔ یہ تمام صورت حال زرعی اشیاء کی قیمتوں میں غیر یقینیت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ آڑھتی کسانوں کی کم تر صورت حال کا ناجائزہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کسان کی اشیاء کی کم قیمت لگاتے ہیں۔

7- کاشت کاروں کی قدامت پسندی اور غربت
(Backwardness and Poverty of Cultivators)

پاکستان کے اکثر کاشت کار ان پڑھ اور لکیر کے فقیر ہیں۔ وہ جدید آلات کاشت کاری اپنانے سے ڈرتے ہیں۔ اس کے علاوہ غربت کے باعث وہ زیادہ بچت بھی نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے زراعت کی بہتری کے لیے ضروری سامان، سرمایہ کاری اور جدید مشینری و بیج خریدنے سے قاصر رہتے ہیں۔

8- آبپاشی کی ناکافی سہولتیں (Lack of Irrigation Facilities)

گو پاکستان میں دنیا کا سب سے بڑا نہری آبپاشی کا نظام موجود ہے لیکن اس کے باوجود ملک کے زرعی شعبے کو آبپاشی کی ناکافی سہولتوں کا سامنا ہے۔ پاکستان میں آب پاشی کی ناکافی سہولتیں اور نکاسی آب کے ناقص انتظامات فی ہیکٹر پیداوار کی کمی کا بڑا سبب ہیں۔ اگر آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ کر دیا جائے تو نئے رقبے زیر کاشت لائے جا سکتے ہیں۔

9۔ ناسازگار موسمی حالات اور قدرتی آفات
(Hostile Climatic Conditions and Natural Calamities)

موسمی حالات بھی زراعت پر بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ پاکستان میں خشک سالی اور بارشیں وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے فصلوں کو نقصان ہوتا ہے اور پیداوار بہت گر جاتی ہے۔ اسی طرح پاکستان میں آنے والے سیلاب، طوفان، ٹڈی دل جیسی قدرتی آفات بھی زرعی پیداوار کو بہت کم کر دیتی ہیں۔ اس طرح ہماری زراعت کو ناسازگار موسمی حالات اور قدرتی آفات کا بھی سامنا ہے۔

شعبہ زراعت کے مسائل کے حل کے لیے حکومتی اقدامات
Steps taken by the Government to Solve the Problems

حکومت پاکستان نے زرعی شعبے کی ترقی کے لیے متعدد اقدامات کئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کاشت کاروں کو بہت سے محرکات (Incentives) بھی مہیا کئے ہیں جن کی بناء پر زراعت کے شعبے میں خاطرہ خواہ ترقی ہوئی ہے۔ حکومت کے اقدامات مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ اصلاحات اراضی (Land Reforms)

پاکستان میں زمین کی ملکیت کے حوالے سے بہت سارے نقائص پائے جاتے تھے جس کی وجہ سے زرعی پیداوار میں ترقی نہیں ہو رہی تھی۔ حکومت نے 1959ء میں اصلاحات اراضی متعارف کروائیں جس کے ذریعے بڑی زمینداریاں ختم کر دی گئیں۔ ان اصلاحات کے مطابق کوئی زمیندار 500 ایکڑ آبپاشی زمین اور 100 ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ فالتو بچ جانے والی زمین کاشت کاروں میں تقسیم کر دی گئی۔ مزارعین کو تحفظ مہیا کیا گیا جس سے انہوں پوری دلجمعی کے ساتھ پیداوار بڑھانے پر توجہ دی۔ ان اصلاحات کے تحت زمین کی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم روک دی گئی اور بکھرے ہوئے ٹکڑوں کا اشتمال اراضی لازمی قرار دیا گیا۔ زمین کو بے کار رکھنے والے مالکان کے خلاف سخت کاروائی کی سفارش کی گئی۔ ان اصلاحات کی بدولت ملک کی زرعی پیداوار تیزی سے بڑھنے لگی۔ ان اصلاحات کے تحت 2.5 ملین ایکڑ فالتو رقبہ بڑے زمینداروں سے واپس لے لیا گیا اور اس میں سے 2.3 ملین ایکڑ رقبہ بے زمین مزارعین اور چھوٹے کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا گیا۔

1972ء کی اصلاحات کے تحت زمین کی ملکیت زیادہ حد سے گھٹا کر آبپاشی والی زمین 150 ایکڑ اور غیر آبپاشی والی زمین 300 ایکڑ مقرر کی گئی۔ ان اصلاحات کے تحت 13 ملین ایکڑ رقبہ بلامعاوضہ زمینداروں سے حاصل ہوا اور اس میں سے 0.9 ملین ایکڑ زمین 76 ہزار بے زمین مزارعین اور چھوٹے کاشت کاروں میں بلامعاوضہ تقسیم کر دی گئی۔

1977ء کی اصلاحات اراضی کے تحت حد ملکیت آبپاشی زمین 100 ایکڑ اور غیر آبپاشی زمین کی صورت میں 200 ایکڑ مقرر کی گئی۔ ان اصلاحات کے تحت 1.8 ملین ایکڑ رقبہ زمینداروں سے حاصل ہوا۔ ان زمینداروں کو بانڈز کی شکل میں زمین کی قیمت ادا کی گئی۔ اس طرح حاصل شدہ رقبے میں سے 0.9 ملین ایکڑ رقبہ چھوٹے کسانوں میں مفت تقسیم کیا گیا۔

2- دیہاتوں میں زرعی صنعتوں کا قیام

(Establishment of Agrobased Industries in Villages)

ہمارے ملک کے کسان زیادہ تر فارغ رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہاتوں سے شہروں کی جانب نقل مکانی کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ دیہاتوں میں ایسی صنعتیں قائم کی جائیں جن کے لیے خام مال اور مزدور دیہاتوں سے ہی دستیاب ہو سکیں۔ اس طرح زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور کسان آڑھتیوں کے استحصال سے بچ جائیں گے۔

3- سیلاب، سیم اور تھور کا انسداد (Control of Floods, Watr-logging and Salanity)

سیلاب و سیم اور تھور ہمارے زرعی شعبے کا بہت خطرناک مسئلہ ہیں۔ سیم و تھور زمین کے کینسر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ زمین کی پیداواری صلاحیت کو ختم کر دیتا ہے۔ سیلاب بھی زرعی پیداوار کے لیے نہایت نقصان دہ ہیں کیونکہ یہ کھڑی اور تیار فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ حکومت نے سیم و تھور کو قابو کرنے کے لیے ٹیوب ویلوں کا جال بچھا دیا ہے۔ اس منصوبے کو SCARP کہتے ہیں۔ یہ ٹیوب ویل زمین کی سطح کے نیچے سے فالتو پانی کھینچ لیتے ہیں۔ سیلاب کو کنٹرول کرنے کے لیے سیلاب کنٹرول سسٹم کو موثر بنانا چاہیے۔ زمین کے کٹاؤ کو روکنے کے لیے پہاڑوں پر کاشت کاری ہونی چاہیے۔

4- نئی قسم کے بیجوں کی فراہمی (Provision of New Kinds of Sees)

بیجوں کی قلت ہمارے زرعی شعبہ کا بہت بڑا مسئلہ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری زرعی پیداوار بڑھ نہیں سکی۔ نئی اقسام کے کئی بیج پیداوار کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اعلیٰ قسم کے بیج بڑی بڑی فصلوں کے رقبے پر استعمال کئے جائیں گے لیکن توقع سے کم رقبے پر یہ بیج بوئے گئے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی کاشت کا جامعہ منصوبہ بنایا گیا۔ غذائی پیداوار بڑھانے کے لیے میکسیکو سے بیج منگوائے گئے جن کی مدد سے پاکستان میں گندم کے بہت زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی نئی قسم دریافت کی گئی۔

نئے زیادہ پیداوار دینے والے دوغلے بیجوں (Hybrid Sees) کی نجی شعبے کے تحت پیداوار بڑھانے کی حوصلہ افزائی کے لیے زرعی بیجوں کے کاروبار کو حکومت نے بیج کی صنعت (Seed Industry) کا درجہ دے دیا ہے اور بیجوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے مختلف مراعات دی گئی ہیں۔

5- مشینی کاشت کاری (Mechanization)

زرعی پیداوار میں مشینی کاشت کی وجہ سے بہتر نتائج سامنے آئے ہیں۔ حکومت نے زرعی پیداوار بڑھانے کی غرض سے مشینی کاشت کو رائج کیا ہے۔ پاکستان کے کئی علاقوں میں مشینی کاشت سے ایک ہی زمین سے دو یا تین فصلیں حاصل ہو رہی ہیں۔ حکومت نے ٹریکٹروں کی درآمد بہت آسان کر دی ہے اور کسانوں کو ٹریکٹر خریدنے کے لیے آسان شرائط پر قرضے دیئے جا رہے ہیں۔ ان اقدامات سے فی ہیکٹر پیداوار بڑھانے میں کافی مدد ملی ہے۔

6- آبپاشی کی سہولتیں (Irrigation Facilities)

حکومت پاکستان نے آبپاشی کی سہولتوں کو بہتر بنانے کے لیے کئی اقدامات کئے ہیں۔ زرعی شعبے کی ترقی کا دارومدار نہری آبپاشی کے نظام پر ہوتا ہے۔ بالخصوص وہ ممالک جہاں بارشیں کم ہوتی ہیں، وہاں نہری آبپاشی کا نظام بہت بہتر ہونا چاہیے۔ پاکستان کے نہری

نظام کو بہتر کرنے کے لیے آزادی کے بعد حکومت نے بھاری سرمایہ خرچ کیا ہے۔ آزادی کے بعد غلام محمد بیراج سے 3 نہریں نکالی گئیں۔ گدو بیراج تعمیر کیا گیا اور دریائے سندھ سے تین نہریں نکالی گئیں۔ تونسہ بیراج سے نہریں نکال کر ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ کی بہت سی زمینیں زیر کاشت لائی گئیں۔

بھارت کے ساتھ 1960ء میں نہری پانی کا معاہدہ کیا گیا جس کے تحت تین مشرقی دریاؤں ستلج، بیاس اور راوی کے پانی پر بھارت کا تسلط ختم ہونے کے بعد ان دریاؤں میں سے نکلنے والی نہروں کو پانی پہنچانے کے لیے دریائے جہلم اور چناب سے کئی رابطہ نہریں تعمیر کی گئیں اور منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم بنائے گئے۔

7۔ زرعی تعلیم، تحقیق اور توسیعی خدمات

(Facilities Agricultural Education and Research)

زرعی شعبے کی کارکردگی اور افادیت کو فروغ دینے کے لیے زرعی تعلیم، تحقیق اور توسیعی خدمات کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ حکومت پاکستان نے زرعی تعلیم کے فروغ کے لیے فیصل آباد، پشاور اور ٹنڈو جام میں زرعی یونیورسٹیاں قائم کر رکھی ہیں۔ اسی مقصد کے لیے راولپنڈی میں بارانی یونیورسٹی بھی قائم کی گئی ہے۔

قومی سطح پر زراعت پر تحقیق کو فروغ دینے کے لیے وفاقی وصوبائی اداروں میں اشتراک عمل پیدا کرنے کے لیے پاکستان ایگریکلچر ریسرچ کونسل (PARC) قائم کی گئی ہے۔ یہ کونسل ملک کے مختلف حصوں میں ایگریکلچر ریسرچ کو فروغ دینے میں مشغول ہے۔ اس کونسل نے 15000 کے قریب فصلوں، سبزیوں اور پھلوں کی نئی اقسام متعارف کروائی ہیں۔ کونسل نے مویشیوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے حیوانی غذائیت اور حیوانوں کی صحت کو بہتر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

آب پاشی کے نئے طریقے مثلاً چھڑکاؤ کے ذریعے آبپاشی (Gun Sprinklar System) اور نیچے پانی گرانے کے ذریعے آبپاشی (Frickle Irrigation) کے طریقے متعارف کروائے ہیں۔

پاکستان میں سبز انقلاب

Green Revolution in Pakistan

1960ء کی دہائی میں ایشیاء اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک نے زراعت کے شعبے میں انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ شاندار کامیابیاں حاصل کیں جن کے نتیجے میں جنوب مشرقی ایشیاء کے ممالک یعنی فلپائن، تھائی لینڈ، پاکستان اور سری لنکا میں زرعی پیداوار یعنی چاول، گندم اور مکئی کی پیداوار بہت بڑھ گئی۔ اس صورت حال کو سبز انقلاب کا نام دیا گیا۔ یہ ممالک زرعی شعبے کی پسماندگی کی وجہ سے غذائی مسائل اور زرمبادلہ کی کمی جیسی مشکلات کا شکار تھے لیکن سبز انقلاب کے بعد نہ صرف اپنی غذائی مشکلات پر قابو پالیا بلکہ اپنی فالتو زرعی پیداوار برآمد کرنا شروع کر دی۔ پاکستان میں 1959ء کی زرعی اصلاحات کی بناء پر زبردست نتائج حاصل ہوئے اور 69-1967ء تک پاکستان گندم کی پیداوار میں خودکفیل ہوگیا۔ اسی طرح چاول کی پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ کم ترقی یافتہ ملکوں میں سے پاکستان نے زرعی شعبہ میں جو ترقی کی وہ دوسری قوموں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔

پاکستان میں زرعی رقبہ میں جدید ذرائع کے استعمال سے زراعت میں ایک انقلاب آ گیا جس نے ہر کسی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ زرعی جدت و اختراعات کا تعلق اچھے اور اعلیٰ بیجوں، کھاد، کرم کش ادویات کے سپرے، سیم وتھور پر کنٹرول کاشت کاری کے

لیے جدید مشینری کا استعمال کی وجہ سے زرعی پیداوار میں یک دم اضافہ ہوا جسے ''سبز انقلاب'' کا نام دیا گیا۔ سبز انقلاب کی وجہ سے بہتر ٹیکنالوجی' کھاد اور اعلیٰ بیجوں کا حصول ممکن ہوگیا جس کی وجہ سے زرعی شعبہ میں پیداوار کا عمل تبدیل ہوجاتا ہے اور فصل کی پیداواری صلاحیت میں زبردست اضافہ ہو جاتا ہے۔ سبز انقلاب کا تعلق فنی تبدیلیوں سے ہوتا ہے جو کہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ 1۔ حیاتیاتی تبدیلیاں 2۔ مکینکل تبدیلیاں

1۔ حیاتیاتی تبدیلیاں (Biological Changes)

ان تبدیلیوں کی وجہ سے زمین کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان تبدیلیوں میں یہ عوامل کارفرما ہوتے ہیں جیسے بلند پیداوار دینے والے بیج (HYU) کھادوں اور بیجوں کا استعمال اور کاشت کاری کی ترتیب و راستوں میں تبدیلی شامل ہوتے ہیں۔

2۔ مکینکل تبدیلیاں (Mechanical Changes)

ان تبدیلیوں کا تعلق مشینی کاشت سے ہوتا ہے جس میں ٹریکٹر کا زیادہ استعمال' ہارویسٹروں اور ویٹ تھریشروں کا استعمال اور بلڈوزروں کا استعمال شامل ہے۔

ان تبدیلیوں کی وجہ سے ملک کے زرعی شعبہ کے مسائل حل کرنے میں مدد ملتی ہے جس کی وجہ سے پیداوار میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے جسے سبز انقلاب کا نام دیا گیا ہے۔ 1965ء تک پاکستان میں صرف 12 ہزار ایکڑ رقبہ پر گندم کاشت کی جاتی تھی لیکن 1969-70ء میں 71,21,000 ایکڑ رقبے پر گندم کاشت کی گئی۔ 1966-67ء میں 15,000 ایکڑ رقبہ پر چاول کی نئی قسم ''اری پاک'' کو کاشت کیا گیا جبکہ 1969-70ء میں 1239000 ایکڑ رقبہ پر چاول کاشت کیا گیا۔ 1965-66 میں مکئی کے Hybrid بیج 10,000 ایکڑ رقبہ پر کاشت کئے گئے جبکہ 1969-70ء میں Hybrid بیجوں کو 375000 رقبے پر کاشت کیا گیا۔

ان فصلوں کی پیداواری استعداد میں اضافہ صرف اعلیٰ قسم کے بیجوں کے استعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ ان میں کیمیکل کھاد کے استعمال' ٹیوب ویلوں میں اضافے نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان کے علاوہ کیڑے مار ادویات اور ٹریکٹروں کے استعمال کا بھی اہم حصہ ہے۔ سبز انقلاب کے زیادہ اثرات گندم' چاول اور مکئی کی پیداوار پر ہوئے۔ 1965-66ء میں گندم کی پیداوار 385400 ٹن تھی جو 1969-70ء میں 7123000 ٹن ہوگئی۔ چاول کی پیداوار 1272000 ٹن تھی جو بڑھ کر 2372000 ٹن ہوگئی۔

پاکستان کا شعبہ صنعت (Industrial Sector of Pakistan)

آزادی کے بعد پاکستان کے صنعتی شعبے نے ترقی کی۔ پاکستان کے سب ترقیاتی منصوبوں میں صنعت کے شعبے کو ترجیح دی جاتی رہی ہے۔ 1949-50 میں خام ملکی پیداوار (GPD) کا 7.75 فی صد حصہ صنعتی شعبے سے حاصل ہوتا تھا۔ صنعتی ترقی کی بدولت یہ حصہ 1990-02ء تک بڑھ کر 16.7 فیصد ہوگیا ہے۔

صنعتی ترقی کی اہمیت (Importance of Industrial Development)

پاکستان کی معاشی ترقی کے لیے صنعتوں کو ترقی دینا بہت ضروری ہے کیونکہ صنعتی ترقی سے معیشت کے دوسرے حصوں کی ترقی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یورپ' امریکہ اور جاپان جیسے ممالک کی معاشی خوشحالی صنعتی ترقی کی وجہ سے ہے۔ ان ممالک نے بے پناہ صنعتی ترقی کی وجہ سے دنیا پر تسلط قائم کر رکھا ہے۔ صنعتی ترقی سے قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے ادائیگیوں کا توازن بہتر ہو جاتا ہے

اور ملک میں روزگار کے مواقع بڑھتے ہیں۔ چونکہ پاکستان کی معیشت ابھی تک زرعی نوعیت کی ہے اس لئے تیز صنعتی ترقی زراعت اور صنعت میں توازن پیدا کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ صنعت کی ترقی و اہمیت مندرجہ ذیل ہے:

1۔ زراعت کی ترقی کا ذریعہ (Source of Agricultural Development)

پاکستان کی معیشت زرعی شعبے پر قائم ہے۔ لیکن صنعتی ترقی کے بغیر زراعت کا شعبہ بھی ترقی نہیں کر سکتا کیونکہ زرعی شعبے سے حاصل ہونے والا خام مال کارخانوں میں ہی استعمال ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ زراعت میں استعمال ہونے والی مشینری، آبپاشی کا سامان، سیمنٹ، لوہا اور نہروں کی کھدائی کے لیے ضروری مشینری صنعتی شعبے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

2۔ قومی آمدنی میں اضافہ (Increase in National Income)

صنعتی ترقی کے لیے ملک کے معدنی اور انسانی وسائل کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں ملک میں تیار شدہ اور نیم تیار شدہ اشیاء کی پیداوار بڑھ جاتی ہے۔ اس وجہ سے قومی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔

3۔ روزگار میں اضافہ (Increase in Employment)

پاکستان میں آبادی میں اضافہ کی وجہ سے بے روزگاری اور بے کاری عام ہے۔ خصوصاً دیہاتی علاقوں میں بے روزگاری اور بے کاری عام ہے۔ آبادی میں اضافہ کی وجہ سے زرعی شعبے پر دباؤ بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے ملک کی افرادی قوت کا بڑا حصہ بے کار ہو جاتا ہے۔ اگر ملک میں تیزی سے چھوٹے اور بڑے پیمانے کی صنعتیں قائم کر دی جائیں تو ملک میں روزگار کے مواقع پیدا ہو جائیں گے اور بے کاری پر بھی قابو پایا جا سکے گا۔

4۔ دوسرے شعبوں کی ترقی (Development of Other Sectors)

صنعتی ترقی دوسرے شعبوں کی ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مثلاً بجلی، نقل و حمل اور خبر رسانی کے شعبوں کی ترقی کے لیے صنعتی ترقی بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر ملک میں سٹیل ملز قائم کی جاتیں ہیں تو ایک طرف اس سے سٹیل اور لوہے کی پیداوار میں اضافہ ہوگا جس سے ملک میں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں قائم کرنے میں مدد ملے گی اور دوسری طرف لوہے کی تلاش کا کام بھی بڑھ جائے گا۔ اس کے علاوہ موٹریں، ٹرک، ریلوے کے انجن، ریل کی پٹریاں، سڑکوں کی تعمیر کا سامان اور ٹیلی فون کے تار وغیرہ سب صنعتوں سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔

5۔ معاشی استحکام (Economic Stability)

پاکستان کی معیشت زرعی شعبے پر قائم ہے جس کی وجہ سے معیشت غیر متوازن ہوگئی ہے۔ چونکہ زرعی شعبہ میں قدرتی آفات، بارشوں، سیلابوں کی وجہ سے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں جس سے زرعی پیداوار کی قیمتوں میں تسلسل قائم نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ زرمبادلہ کمانے کے لیے ہمیں زرعی خام مال پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے اور بین الاقوامی منڈی میں زرعی خام مال کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ان کی قیمتیں بہت تیزی سے گر جاتی ہیں یا بہت سستی سے بڑھتی ہیں۔ اس وجہ سے پوری معیشت میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور ہماری زرمبادلہ کمانے کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے۔ جب ہم زرعی شعبہ کے خام مال سے زرمبادلہ کمانے میں ناکام رہتے ہیں تو معیشت کے دوسرے منصوبوں کی ترقی متزلزل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ملک میں صنعتی ترقی کا عمل وسیع پیمانے پر شروع کیا جائے تاکہ معیشت میں استحکام پیدا ہو۔

6- دفاعی ضرورتوں کے لیے اہمیت (Importance for Defence Requirement)

تقسیم سے لیکر اب تک پاکستان دفاعی مسائل سے دوچار ہے۔ ملک کے چاروں طرف دشمن ممالک کی موجودگی سے پاکستان کے دفاعی مسائل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ دور حاضر میں کوئی ملک دفاعی معاملات میں اس وقت تک خودکفیل یا مضبوط نہیں ہوسکتا جب تک ملک کی دفاعی ضرورتوں کے لیے ضروری سامان مثلاً اسلحہ وغیرہ مکمل طور پر ملکی وسائل سے حاصل نہ ہو جو ملک اپنی صنعتوں کو ترقی دیتے ہیں انہیں دفاعی ضرورتوں کے لیے اسلحہ، ٹینک، گولہ بارود، گاڑیاں دوسرے ممالک سے خریدنا نہیں پڑتیں۔

پاکستان کو اپنی دفاعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صنعتی ترقی کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ دوسرے ممالک کی طرف سے ہماری دفاعی امداد آئے دن کم ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہم دفاعی ضروریات کو پورا نہیں کرسکیں گے تو اس سے اسلحہ کی رسد متاثر ہوسکتی ہے جو کہ ملکی دفاع کے حوالے سے بہت خطرناک ہے۔

پاکستان کی صنعتی پسماندگی کے اسباب

Causes of Industrial Backwardness

1- تقسیم سے پہلے برطانوی پالیسی (British Policy)

تقسیم سے پہلے انگریز حکمرانوں نے برصغیر کے کئی علاقوں کی ترقی کی طرف توجہ نہ دی۔ انہوں نے برصغیر کو محض ایک منڈی بنا رکھا تھا جہاں سے وہ اپنی مصنوعات کے لیے خام مال حاصل کرنے اور پھر تیار شدہ اشیاء کو مہنگے داموں فروخت کرتے تھے۔ بالخصوص وہ علاقے جو تقسیم کے بعد پاکستان کا حصہ بنے وہاں کوئی ترقیاتی کام نہ ہوسکا۔ اس وجہ سے ہماری صنعتی ترقی نہ ہوسکی۔

2- معدنیات کی کمی (Shortage of Minerals)

پاکستان کے حصے میں جو علاقے آئے وہاں تقسیم سے قبل ہی صنعتوں کے لیے ضروری معدنیات کی کمی تھی مثلاً لوہا اور تیل کی کمی تھی جو کہ صنعتی ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے ان علاقوں میں صنعتیں قائم نہ ہوسکیں۔

3- زرمبادلہ کی کمی (Shortage of Capital)

پاکستان کی زرمبادلہ کمانے کی صلاحیت محدود ہے اور صنعتیں قائم کرنے کے لیے مشینیں اور ان کے فالتو پرزے باہر سے منگوانے پڑتے ہیں جن پر کثیر زرمبادلہ خرچ ہوتا ہے۔ زرمبادلہ کی کمی صنعتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

4- قرضوں کی کمی (lack of Credit Facilities)

صنعتی ترقی کے لیے لمبی مدت کے لیے قرضوں کا انتظام ہونا چاہیے لیکن پاکستان میں صنعتیں قائم کرنے کے لیے قرضوں کی سہولت نہ ہونے کے برابر ہے۔

5- تربیت یافتہ افراد کی کمی (Lack of skilled Manpower)

صنعتوں کے قائم اور انہیں چلانے کے لیے تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن پاکستان میں ماہر افرادی قوت کی زبردست کمی ہے۔ یہاں پر انجینئرز، ٹیکنیشنز اور میکنکوں کی شدید کمی ہے جو صنعتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

6۔ ذرائع نقل وحمل (Means of Transportation)

صنعت کی ترقی کے ذرائع نقل وحمل کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ خام مال آسانی سے کارخانوں میں پہنچایا جا سکے اور تیار شدہ مصنوعات تیزی سے صارفین تک پہنچ سکیں۔ اسی طرح صنعتیں چلانے کے لیے بجلی اور وسائل قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن پاکستان میں ذرائع نقل وحمل اور بجلی اور وسائل قوت کی سخت کمی ہے جس کی وجہ سے ہماری صنعتی ترقی نہیں ہو سکی۔ ان رکاوٹوں کے باوجود آزادی کے بعد پاکستان نے صنعت میں خاطر خواہ ترقی کی ہے۔

پاکستان کا موجودہ صنعتی ڈھانچہ
Present Industrial Set up of Pakistan

پاکستان کا موجودہ صنعتی ڈھانچہ تین اجزاء پر مشتمل ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

1. بڑے پیمانے کی صنعتیں
2. سرکاری شعبے کی صنعتیں
3. چھوٹے پیمانے کی صنعتیں

پاکستان کی بڑے پیمانے کی صنعتیں (Large Scale Industries)

پاکستان میں بڑے پیمانے کی صنعتوں کا مجموعی پیداوار میں حصہ 67.5 فیصد ہے اور 2004-2005ء کے مالی سال میں مصنوعات کی شرح افزائش 17.10 فیصد رہی جبکہ اس کا ہدف 8.8 فیصد تھا۔ یہ ترقی پاکستان کے صنعتی شعبہ کی سب سے بڑی کامیابی تصور کی جاتی ہے اور اس کی بڑی وجہ کلیاتی معاشی استحکام (Macroeconomic Stability) ہے۔

پاکستان میں بڑے پیمانے کی صنعتیں سوتی دھاگہ، کپڑا، سگریٹ، پٹ سن، کیمیاوی کھاد، کاغذ، گتے اور بورڈ، سیمنٹ، کاسٹک سوڈا، چینی، موٹر سائیکل، موٹرز، ٹائر اور ٹیوب، بائیکل، شیشے کی مصنوعات اور فولاد بنانے کی صنعتوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر صنعتیں نجی شعبے میں کام کر رہی ہیں۔

1۔ ٹیکسٹائل کی صنعت (Textile Industry)

پاکستان کی ٹیکسٹائل کی صنعت سوتی دھاگا اور کپڑا بنانے میں مصروف ہے اور یہ صنعت ملک کے صنعتی ڈھانچہ میں سب سے اہم صنعت ہے۔ ملک کے بڑے پیمانے کی صنعتوں میں ٹیکسٹائل کی صنعت کا حصہ % 46 ہے اور برآمدات میں اس شعبہ کا حصہ 68 فیصد ہے جس کی مالیت 7 ملین ڈالر بنتی ہے۔ ملک کے کل روزگار میں ٹیکسٹائل کی صنعت کا حصہ 38 فیصد ہے جبکہ GDP میں اس کا حصہ 8 فیصد ہے۔ 2004-2005ء میں مجموعی صنعتی پیداوار میں ٹیکسٹائل کا حصہ 20 فیصد تھا۔ 2004-2005ء میں اس صنعت میں 363 ملیں کام کر رہی تھیں جن میں 9.6 ملین سپنڈل (Spindles)، 146 ہزار روٹرز (Roters) اور 11 ہزار لومز (Looms) یعنی کھڈیاں نصب تھیں۔ یہ صنعت 2 لاکھ 38 ہزار افراد کو روزگار مہیا کر رہی ہے۔

ٹیکسٹائل کی پیداوار کاٹن جننگ، کاٹن یارن، کاٹن فیبرک پروسیسنگ، ہوم ٹیکسٹائل، تولیئے، ہوزری، نٹ ویر اور ریڈی میڈ گارمنٹس پر مشتمل ہوتی ہے۔

2- کیمیاوی کھاد کی صنعت (Fertilizer Industry)

کیمیاوی کھاد شعبہ زراعت کے مداخل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ پاکستان میں 2004-2005ء میں کیمیاوی کھاد کے 11 کارخانے کام کر رہے تھے جن میں 6 پنجاب 3 سندھ اور 2 سرحد میں قائم ہیں اور ان کی پیداواری صلاحیت 6 ملین نائٹروجن کھادیں اور ایک ملین ٹن فاسفیٹ کھادیں شامل ہیں۔ 2004-2005ء تک کیمیاوی کھاد کی مجموعی پیداوار بڑھ کر 5.31 ملین ٹن ہوگئی۔

3- بناسپتی گھی (Vegetable Ghee Industry)

ملک میں بناسپتی گھی اور کھانا پکانے کے تیل کے 155 کارخانے تھے جن کی پیداواری صلاحیت 3.6 ملین ٹن سالانہ تھی۔ گھی کارپوریشن آف پاکستان کے تمام کارخانے نجکاری کے مختلف مراحل میں تھے اس لئے نجی کارخانے ہی آج کل بناسپتی گھی کی زیادہ پیداوار کا ذریعہ ہیں۔

4- چینی کی صنعت (Sugar Industry)

2004-2005ء تک ملک میں چینی کی 77 ملیں کام کر رہی تھیں۔ ان میں 38 پنجاب، 32 سندھ اور 6 صوبہ سرحد میں قائم ہیں۔ ان کی سالانہ کرشنگ صلاحیت 5 ملین ٹن تھی۔ 2004-2005ء میں چینی کی پیداوار 4.02 ملین ٹن تھی۔

5- سیمنٹ کی صنعت (Cement Industry)

ملک میں سیمنٹ کے 27 بڑے کارخانے ہیں جن میں 17.6 ملین ٹن سیمنٹ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ پچھلے چند سالوں کے دوران سیمنٹ کی پیدا کرنے کی استعداد تقریباً دوگنا ہو چکی ہے جبکہ اسی عرصے میں سیمنٹ کی طلب 7.7 ملین ٹن سے بڑھ کر 9.8 ملین ٹن ہوگئی۔

6- سگریٹ سازی کی صنعت (Cigarette's Industry)

2004-2005ء تک سگریٹ کی پیداوار 55.4 بلین تھی۔ پاکستان کے مختلف حصوں میں تمباکو کی کاشت کی جاتی ہے اور سال میں کافی مقدار میں تمباکو پیدا ہوتا ہے۔ شروع میں تمباکو کی مصنوعات بنانے کا کوئی کارخانہ نہ تھا اور تمباکو کو خام حالت میں درآمد کرنا پڑتا تھا اور تمباکو کی تیار شدہ اشیاء باہر سے منگوانی پڑتی تھی۔ آج ہم نہ صرف تمباکو کی صنعت میں خودکفیل ہو چکے ہیں بلکہ تمباکو کی اشیاء کی بڑی مقدار دوسرے ممالک کو دینے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اس وقت ملک میں تقریباً 40 سگریٹ سازی کے کارخانے قائم ہیں جو جہلم، ملتان، کراچی، سکھر اور نوشہرہ میں واقع ہیں۔

7- فولاد بنانے کی صنعت (Iron and Steel Industry)

فولاد کی صنعت ملکی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تقسیم کے وقت پاکستان کے پاس فولاد بنانے کا کوئی کارخانہ نہ تھا۔ صرف چٹاگانگ میں فولاد سازی کا ایک کارخانہ تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باعث پاکستان کو اس سے بھی محروم ہونا پڑا۔ بہرحال اس وقت ہم نے کراچی میں پپری کے مقام پر ایک بڑا فولاد سازی کا کارخانہ روس کی مدد سے قائم کیا ہے جس کی سالانہ پیداواری صلاحیت 1 ملین ٹن سالانہ ہے۔ پاکستان سٹیل مل کی خام لوہا پیدا کرنے کی صلاحیت 1.1 ملین ٹن سالانہ ہے۔ اس وقت سٹیل مل کوک،

پگ آئرن، بلٹ، شیٹس اور چینل بنا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکسلا کے مقام پر چین کی مدد سے ایک اور ہیوی کمپلکس کام کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹے بڑے کارخانے بھی فولاد سازی میں مصروف ہیں۔

8- کپڑے بنانے کی صنعت

قیام پاکستان کے بعد کپڑے میں ملک میں انحصار زیادہ تر درآمدی کپڑے پر تھا۔ کیونکہ ملک میں کپڑے کے کارخانے کیاب تھے آزادی کے وقت کل سترہ کارخانے پاکستان کے حصے میں آئے تھے۔ جن میں سے بعض کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ مناسب پیداوار دے سکیں۔ حکومتی پالیسی کی وجہ سے 1959ء تک ملک میں کپڑے کے کارخانوں کی تعداد 104 ہو چکی تھی اور اب یہ تعداد بڑھ کر 503 تک پہنچ گئی ہے۔

آزادی کے وقت ملک میں اونی کپڑا تیار کرنے کا کوئی کارکناہ موجود نہ تھا۔ ریشمی کپڑے کا بھی کوئی کارخانہ نہ تھا۔ حکومت کی حوصلہ افزائی سے اب کپڑے کی صنعت نے ترقی کی ہے اور اب اونی کپڑے کی 15 کارخانے قائم ہو چکے ہیں۔ ملک میں سوتی کپڑے اور دھاگے کی پیداوار بڑھائی گئی ہے اور حکومت نے اس صنعت کے فروغ کے لیے ٹیکسوں میں چھوٹ دی ہے۔ سوتی کپڑے کے کارخانے فیصل آباد، ملتان، حیدر آباد، راولپنڈی، جوہر آباد، رحیم یار خان اور کراچی میں قائم کیے گئے ہیں۔

ریشمی دھاگے کے کارخانے لاہور، گوجرانوالہ، فیصل آباد، ملتان، سکھر اور حیدر آباد میں قائم کے گئے ہیں۔ اونی کپڑوں کے مراکز ہرنائی، بنوں، نوشہرہ، لارنس پور، جھنگ، قائدآباد اور کراچی میں قائم ہیں۔

9- جہاز سازی

کراچی میں جہاز سازی کے لیے شپ یارڈ قائم کیا گیا ہے جہاں پر بحری جہاز بنائے جاتے ہیں اور ان کی مرمت کی جاتی ہے۔ کراچی شپ یارڈ میں بحری جہازوں کے علاوہ لانچیں اور چھوٹے بحری جہاز بھی بنائے جاتے ہیں۔ یہاں پر ملکی ضروریات کے علاوہ دوسرے مملک کے آرڈر پر بھی کام کیا جاتا ہے اور دوسرے ممالک کے لیے جہاز بنائے جاتے اور مرمت بھی کی جاتی ہے۔

10- چمڑے کی صنعت

پاکستان میں چمڑے کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے ہیں۔ یہاں پر چمڑے کو رنگ کیا جاتا ہے اس کے علاوہ جانوروں کی کھالوں کو برآمد کیا جاتا ہے۔ جس سے زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ چمڑے کے جوتے بنانے کے کئی کارخانے ملک میں چل رہے ہیں۔

11- کھیلوں کا سامان

پاکستان کھیلوں کے سامان بنانے میں پوری دنیا میں مشہور ہے۔ سیالکوٹ میں کھیلوں کا سامان بنایا جاتا ہے جو دنیا میں اپنی عمدگی کی وجہ سے بہت مشہور ہے اس کے علاوہ لاہور میں بھی کھیلوں کا سامان بنانے کے کارخانے لگ گئے ہیں۔

9/11 حملے کے پاکستان کی معاشی حالت پر اثرات

The Impact of 9/11 Attach on Pakistan Economy

11 ستمبر 2001ء کو نیویارک کے Twin Towers پر دہشت گرد حملے نے تمام دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ امریکہ اور دنیا کے لیے اس دہشت گرد حملے نے ان کی معاشی حالت کو جھنجھوڑا تھا لیکن پاکستان کی معیشت پر اس حملے کے نتائج نے دوررس اثرات مرتب کیے۔ اس کے علاوہ افغانستان میں بے چینی اور بھارت کے ساتھ آمنا سامنا بھی پاکستان کی معیشت کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوئے۔

11 ستمبر 2001ء کو امریکہ پر ہونے والا حملہ دراصل دنیا کے مسلمان ممالک کے لیے ایک ڈراؤنے خواب کی شروعات تھی۔ یہ حملہ پاکستان کی معیشت کے لیے ایک شدید جھٹکا تھا۔ پاکستان کی دہشت گردی کے خلاف حمایت نے تمام صورت حال تبدیل کر دی تھی۔ پاکستان کی امریکہ کی قیادت میں دہشت ردی کے خلاف جنگ میں شامل ہونے پر رضامندی نے ملک کے سیاسی، معاشی اور بین الاقوامی منڈی میں مالی صورت حال پر گہرا اثر ڈالا۔

ان حالات کی وجہ سے اگرچہ پاکستان نے حملے کے بعد ایک سال کے دوران چند فوائد حاصل کیے لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ فوائد صرف ہندسوں کی حد تک تھے لیکن جو نقصانات اٹھانے پڑے انہوں نے پاکستان پر 140 ملین عوام کے بوجھ پر میں اضافہ کیا۔ پاکستان کو 7 فیصد کے پریشان کن بجٹ خسارے کا سامنا کرنا پڑا۔

9/11 کے حملے کے بعد پاکستان کو حاصل ہونے والے فوائد میں 600 ملین ڈالر کی امداد، 300 ملین ڈالر ان امریکی فوجیوں کی دیکھ بھال کے لیے جو پاکستان کے اڈوں پر متعین ہوں گے اور 143 ملین ڈالر کی برآمدات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ 12 بلین ڈالر کے قرضوں کی معافی جس کی وجہ سے 2003-2002ء کے بجٹ میں 87 بلین ڈالر کی Fiscal Space شامل ہیں۔ لیکن امریکہ نے پاکستانی برآمدات کے محصولات میں کوئی رعایت نہ دی۔ یورپین یونین (EU) نے بھی پاکستان کو زیادہ زرمبادلہ کمانے میں مدد دی جو کہ 01-2000 میں 1.2 بلین ڈالر سے بڑھ کر 02-2001 میں 1.5 بلین ڈالر تک ہوگئی۔

ایٹمی دھماکے کے بعد لگائی جانے والی پابندیاں ہٹالی گئیں جو کہ سب سے بڑا فائدہ تھا جو پاکستان کو 9/11 کے حملے کے بعد حاصل ہوا۔ Asian Development Bank نے اپنی امداد 950 ملین ڈالر میں اضافہ کر دیا۔ Abu Dhabi Development Fund نے چھ ترقیاتی منصوبوں کے لیے 265 ملین ڈالر کے رعایتی قرضے میں اضافے پر اتفاق کیا۔ 2001ء میں جب جنرل پرویز مشرف امریکہ کے دورے پر گئے تو صدر بش نے 1 بلین ڈالر کے قرضوں کی معافی کا وعدہ کیا۔ ناروے نے سالانہ امداد پروگرام کے تحت امداد میں دی جانے والی رقم کو دوگنا کر دیا جو کہ 33 ملین ڈالر سے 66 ملین ڈالر کر دی گئی۔ جاپان نے 300 ملین ڈالر کی امداد دی۔ پاکستان کے تمام قرضوں کو 38 سال کے لیے دوبارہ جاری کیا گیا۔ ان اقدامات کی وجہ سے پاکستان نے 4.8 بلین ڈالر کے زرمبادلہ کے ذخائر اکٹھے کر لیے اور موجود مالی خسارے میں 300 ملین ڈالر کمی کر کے اسے منافع میں تبدیل کر لیا۔

9/11 کے حملے کا پاکستان کی معیشت کے حوالے سے جو سب سے بڑا منفی اثر سامنے آیا وہ یہ تھا کہ ہمیں 1 بلین ڈالر کی برآمدات کا نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن اس کے ساتھ مثبت پہلو یہ ہے کہ بیرونی ادائیگیوں میں کافی حد تک اضافہ ہوا۔ ہمیں 600 ملین ڈالر بجٹ کی امداد کے لیے حاصل ہوئے اور امریکہ نے ہماری برآمدات کو بیرونی منڈی میں متعارف کروانے میں مدد دی۔ اس سے

ہیں نئی بین الاقوامی منڈی تک رسائی حاصل ہوئی۔ مجموعی طور پر 9/11 سے پہلے کے مقابلے میں ہماری معیشت میں 3.6 فیصد اضافہ ہوا۔ پاکستان نے تھائی لینڈ اور ملائشیا کے مقابلے میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا جنہوں نے بالترتیب 2.7 اور 3 فیصد ترقی ظاہر کی۔

بہرحال 9/11 کے واقعات نے بیرون ملک خریداروں کے اندر خوف پیدا کیا جس کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر معاشی سرگرمیوں میں سستی پیدا ہوئی۔ بالخصوص امریکی اور یورپی یونین کی مارکیٹوں میں پاکستانی برآمدات کے لیے مشکل صورت حال پیدا ہوئی۔ ڈالر کی قیمت 70 روپے سے 60.45 پر آجانے سے پاکستانی برآمدات کو بین الاقوامی مارکیٹ میں سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ 9/11 کے بعد چند مثبت تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ UAE میں 'حوالہ' اور 'ہنڈی' کے خلاف اقدامات نے بنکوں کے ذریعے ادائیگیوں کے لیے چیلنج پیدا کیا ہے جس کے نتیجہ میں بنکوں کی منڈی میں ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر میں استحکام پیدا ہوا ہے۔

باب نمبر 29

پاکستان میں پانی کا بحران

Water Crisis in Pakistan

حالیہ دنوں میں پانی کے شدید بحران نے بدترین خشک سالی پیدا کر کے ملک کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ حکومتی بیانات اور حکمت عملی میں بتائی گئی اطلاعات سے اصل صورتحال زیادہ گھمبیر ہے۔ پانی کی وجہ سے صوبوں کے درمیان لڑائی علاقائی جھگڑے کی صورت اختیار کرسکتی ہے۔ کم بارش اور دریائے سندھ میں پانی کے سست بہاؤ کی وجہ سے ملک کئی ماہ سے پانی کے بحران سے دوچار ہے۔

تازہ پینے کا پانی صرف انسانوں کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ یہ جانوروں اور زراعت کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ تازہ پینے کا پانی پوری دنیا کے پانی کے وسائل کا صرف 50 فیصد ہے۔ موجودہ پینے کا پانی بارشوں سے یا دریاؤں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مشکل سے پانی کی ضروریات پوری کرتا ہے کیونکہ پانی کی ضرورت میں ہر سال اضافہ ہورہا ہے۔ اس وقت دنیا کے تقریباً بیس ممالک کو پانی کے وسائل کی کمی اور غیر یقینی بارش کی وجہ سے پانی کے بحران کا سامنا ہے۔

ورلڈ بنک کی تحقیق نے یہ انکشاف کیا ہے کہ تقریباً تازہ پانی کا 60 فیصد حصہ یا تو چوری ہوجاتا ہے یا کٹے پھٹے پائپوں کی وجہ سے خارج ہوکر ضائع ہوجاتا ہے۔ کٹے پھٹے پائپوں سے رسنے والا پانی زمین میں سرایت کرجاتا ہے جو زمین کی پیداواری صلاحیت کے لیے خطرناک ہے۔ ضائع شدہ پانی کی وجہ سے پانی کی کمی پیدا ہوتی ہے جس کا ابھی تک کوئی علاج نہیں ہوسکا۔ ورلڈ بنک کے مطابق آنے والے دس سالوں کے اندر بین الاقوامی برادری کو پانی کے بحران سے بچنے کے لیے سالانہ 60 سے 80 بلین ڈالرخرچ کرنے پڑیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سال 2050ء تک دنیا کی آدھی آبادی کو اپنے استعمال کے لیے 5 گیلن پانی روزانہ میسر آسکے گا۔ پانی کی یہ شدید قلت بیماری پھیلانے کا باعث بنے گی کیونکہ آلودہ پانی بیماری پھیلانے کی سب سے بڑی وجہ ہوتی ہے۔ تقریباً 80 فیصد چھوت لگانے والے امراض آلودہ اور حفظان صحت کے منافی پانی کی وجہ سے پھیلتے ہیں۔ پاکستان کا شمار بھی ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں تازہ اور صاف پانی وافر مقدار میں موجود نہیں جس کی وجہ سے معدے کی خطرناک بیماریاں پھیل رہی ہیں۔

IMF نے 84 ممالک کی ایک ملاقات میں یہ کہا ہے کہ اب پانی انسانی خرچ کے لیے ایک اہم اور ضروری پیداوار ہے۔ ملاقات میں اس بات پر زور دیا گیا کہ پانی کی پیداوار کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ اس ملاقات کا مقصد پانی کے وسائل کی ترقی اور اس سلسلے میں سرمایہ کاری کی مشکلات کو ختم کرنا تھا۔ یہ ملاقات پانی کے وسائل پر بااثر ممالک کی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لیے WTO اور NEFTA کے منصوبوں پر عمل درآمد بھی کرنا چاہتی تھی۔

اس وقت آٹھ بین الاقوامی تنظیمیں تیسری دنیا کے ممالک کی پانی کے وسائل کو ترقی دینے کی کوششوں کی مخالفت کررہی ہیں۔ ان تنظیموں نے ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کو تیسری دنیا کے وہ ممالک جو دریاؤں پر ڈیم تعمیر کررہے ہیں کی امداد بند کرنے کو کہا ہے۔ ان تنظیموں میں روس کے سابق صدر میخائل گورباچوف کی قیادت میں چلنے والی Green Peace، World Water، Institute، UN Programme for Environment, World Resources Institute،

Friends of Earth International اور Pera Cluk ،International Rivers Networks شامل ہیں۔ یہ تنظیمیں بڑے بڑے ڈیم بنانے کی بجائے پرانے دریاؤں کے پانی کو زیادہ استعمال کرنے کے حق میں ہیں کیونکہ یہ سمجھتی ہیں کہ بڑے ڈیم دریاؤں کے قدرتی حسن کو ختم کر دیتے ہیں۔ World Bank ،IMF اور WWF ان تنظیموں کے پروگرام کی روشنی میں کام کر رہے ہیں۔ اگر ان تنظیموں کی طرف سے مخالفت جاری رہتی ہے تو تمام دنیا کے لیے تازہ پانی کی فراہمی پر برے اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں چین جیسے بڑے ملک کو بھاری قیمت ادا کر کے امریکہ سے پانی خریدنا پڑے گا۔

پاکستان کے پانی کے مسائل Pakistan's Water Problems

پاکستان پہلے ہی پانی ذخیرہ کرنے کی ناکافی سہولیات، پانی جمع ہونے کی جگہ کی تہ میں مٹی جمع ہو جانے اور خشک سالی کی وجہ سے پانی کی کمی کا شکار ہے۔ پانی رسنے سے بھی 65 ملین ایکڑ فٹ (MAF) پانی ضائع ہو جاتا ہے۔ پاکستان پانی کی کمی اور وسیع زمین والا ملک ہے جہاں پر تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی پانی کو جمع کرنے کی سہولتوں میں دن بدن کمی اور سیلابوں کے بچے پانی کے سمندر میں چلے جانے سے پانی کی کمی واقع ہوتی ہے۔ اس صورتحال سے نبرد آزما ہونے کے لیے پانی کو ذخیرہ کرنے کی استعداد کو بڑھانا بہت ضروری ہے تاکہ مزید پانی کے وسائل پیدا کیے جا سکیں۔

یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ ماضی میں پاکستان نے اپنی پانی کی ضروریات کی طرف دھیان نہیں دیا۔ نہ تو پانی کی ضرورت جاننے کے لیے کوئی مثبت منصوبہ بندی کی گئی اور نہ ہی لوگوں کو پانی کے صحیح استعمال کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔ بھارت، میکسیکو اور چین کی مانند پاکستان میں دریاؤں کی سطح ایک میٹر سالانہ کے حساب سے گھٹتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں بہنے والے تمام دریا ہندوستان کے علاقوں سے شروع ہوتے ہیں جو ان کے پانیوں کو اپنی ضرورت کے مطابق کنٹرول کرتا ہے۔ لہٰذا پاکستان کی پانی کی مشکلات میں حکومتی سردمہری اور ہمارے دریاؤں کے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان کے پانی کے مسائل کو جاننے کے لیے WWF کے محقق رچرڈ گارسی ٹینک نے صوبہ بلوچستان اور سندھ کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ اس نے رپورٹ میں کہا "پاکستان کی موجودہ خشک سالی ان خطرات کی نشان دہی کرتی جو مستقبل قریب میں پیدا ہونے والے ہیں۔ جس حساب سے پانی کی مقدار ہم استعمال کر رہے ہیں وہ اگلے 25 سال کے اندر پانی کے وسائل کو ختم کر دے گی اور 33 فیصد آبادی کو پانی کی کمی کے باعث زندہ رہنے کے لیے بہت کوشش کرنا پڑے گی۔" انہوں نے کہا کہ بلوچستان میں پانی کی سطح 11.5 فٹ سالانہ کے حساب سے گر رہی ہے اور اگر یہ اسی طرح گرتی رہتی ہے تو بلوچستان میں پانی کے وسائل خشک ہو جائیں گے۔ معدنی ڈھانچے میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جو کہ زمینی پانی کے ذخیرے کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔"

دریائے سندھ پاکستان کا سب سے بڑا دریا ہے۔ یہ ہمارے ملک کے مرکز سے گزرتا ہے۔ پاکستان دریائے سندھ کا طاس ہے۔ دریائے سندھ پاکستان کے عظیم دریائی نظام کا حصہ اور اس میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ بنجی کے مقام پر ہمالیہ سے گزرنے کے بعد یہ جنوب مغرب کی طرف مڑتا ہے اور پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ دوسرے تمام دریا جو دریائے سندھ کے نظام کا حصہ ہیں یعنی راوی، ستلج، بیاس، چناب اور جہلم پنجند کے مقام پر دریائے سندھ میں داخل ہوتے ہیں اور دریائے سندھ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ دریا اپنے سفر کا بقیہ حصہ دریائے سندھ کی ہمراہی میں طے کرتے ہیں۔

پاکستان کے پانی کے مسائل کم بارش کی وجہ سے ہیں۔ دریائے سندھ کے زیریں میدان میں 30 سے 40 انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ اوسطاً سالانہ بارش 2.5 سے 5 انچ تک ہوتی ہے۔ ابھی تک بارش کے پانی کو کنٹرول کرنے اور اس کے بہترین استعمال کے لیے منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ ہمارے ملک میں سال بہ سال بارش کی مقدار میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے اسے

کنٹرول کرنا اور بہتر طور پر استعمال کرنا ممکن نہیں۔ بارشوں کی غیر یقینی صورتحال اور ردوبدل کی وجہ سے دریاؤں کے بہاؤ میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ جس سے پانی کو زراعتی مقاصد کے لیے پھیلانا مشکل ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات گرمیوں کی بہ نسبت موسم سرما میں پانی کی سطح اونچی ہوجاتی ہے۔ ستمبر کے درمیان سے لیکر مارچ کے وسط تک پانی کا بہاؤ عام طور پر بہت سست ہوتا ہے۔ اس موسم میں دریائے سندھ کو زمین سے پانی ملتا ہے جو کہ دریا کی دیواروں اور تہہ سے رسنے سے آتا ہے۔ مارچ میں جب پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے تو پانی دریاؤں میں آجاتا ہے۔ جون سے ستمبر تک بارش پانی کا بڑا ذریعہ ہے۔

پاکستان میں ہونے والی بارش کاشتکاری کے موسم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ موسم گرم میں پانی کی کمی کی وجہ سے ربی اور خریف کی فصل کا کچھ حصہ کاشت کرنا ممکن نہیں۔ پاکستان میں دریائے سندھ کے دہانے کا کل حصہ صرف 13.10 کروڑ مربع میل ہے۔ اس میں سے صرف 2.10 کروڑ مربع میل رقبے کو آبپاشی کے نظام کے ذریعے سیراب کیا جاسکتا ہے کیونکہ بارش کی کمی کے باعث آب پاشی کے لیے پانی مہیا کرنا ممکن نہیں۔ چونکہ تمام دریا سندھ کے دریائی نظام کا حصہ ہیں تو ان میں بھی دریائے سندھ میں پانی کی کمی کی وجہ سے پانی کی سطح گر جاتی ہے۔ جب بارشوں اور پہاڑوں پر برف پگھلنے سے دریائے سندھ میں پانی کی سطح اونچی ہوجاتی ہے تو راوی، چناب، ستلج، بیاس اور جہلم میں پانی کا بہاؤ بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا سندھ کا دریائی نظام ہمارے کاشتکاری کے موسم سے غیر مطابقت اور باشوں کی غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے یہ یک وقت ''خشک سالی اور سیلاب'' کی دوہری سردردی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اگر کافی بارشیں ہوجائیں تو دریاؤں میں سیلاب آجاتا ہے اور اگر بارش نہ ہو تو خشک سالی اور پانی کی کمی ہوجاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں فصلیں اور جائیداد تباہ ہوجاتی ہیں اور پینے کے پانی کی سخت کمی واقع ہوجاتی ہے۔

یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ آزادی کے 58 سالوں کے دوران ہم نے نہ تو اپنے عظیم دریائی نظام کی استعداد کو جانچنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی سندھ کے دریائی نظام پر کوئی تحقیق کرنے کو ضروری سمجھا ہے۔ موسم گرما میں ہوا میں بخارات بننے سے کتنا پانی ضائع ہوجاتا ہے اس کے بارے میں کوئی اعداد و شمار موجود نہیں۔ ایوب خان کے دور میں تیار کی گئی رپورٹ میں ماہرین 1960ء تک آبادی بڑھنے کے لحاظ سے 31,24 ملین ایکڑ فٹ (MAF) پانی کی ضرورت کا اندازہ لگایا تھا۔

دریائے سندھ کے دریائی نظام سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے تقریباً 100 ملین ایکڑ فٹ (MAF) پانی کی ضرورت ہوگی۔ جبکہ پاکستان کے پاس موجود پانی کی تعداد صرف 25 (MAF) ہے۔ پاکستان اس وقت 40 (MAF) پانی پیدا کرنے کی پوزیشن میں ہے جس کا مطلب ہے کہ 30 سے 40 فیصد پانی ضائع ہوجاتا ہے جو آب پاشی کے لیے بچایا جاسکتا ہے۔ اس طرح جو پانی ضائع ہوجاتا ہے وہ سیلاب لانے کا باعث بنتا ہے جو فصلوں اور جائیداد کو نقصان پہنچاتا ہے۔ 1992ء میں وسیع سیلاب کی وجہ سے اربوں روپے کی فصلیں اور جائیداد تباہ ہوگئیں۔ اسی طرح 1973، 1976ء اور 1988ء میں آنے والے سیلابوں نے کھڑی فصلوں اور جائیداد کو بہت نقصان پہنچایا۔ بدقسمتی سے ہم نہ تو سیلابوں پر قابو پاسکیں ہیں اور نہ ہی فالتو پانی سے استفادہ حاصل کرسکیں ہیں۔

پانی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے پاکستان نے دریائے سندھ پر بڑے بڑے ڈیم تعمیر کیے ہیں جن میں تربیلا اور منگلا ڈیم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وارسک ڈیم، سالمی ڈیم اور 81 دوسرے چھوٹے ڈیم شامل ہیں۔ سندھ کے دریائی نظام میں 19 بیراج، 12 مختلف جگہوں پر دریائی رابطے اور 38000 نہریں شامل ہیں۔ سندھ کا دریائی نظام 105(MAF) پانی حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہے جس میں سے 45 فیصد پانی سمندر میں چلا جاتا ہے۔

سندھ کا دریائی نظام صوبہ پنجاب اور بلوچستان کی غیر یقینی موسمی صورتحال کی وجہ سے متاثر ہوتا ہے۔ کراچی کی آب و ہوا سخت گرم اور مرطوب ہے۔ پنجاب کا موسم گرم مرطوب ہے۔ بلوچستان اور تھر میں اکثر آندھی اور طوفان آتے رہتے ہیں۔ گرم مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے پانی تیزی سے ہوا میں تحلیل ہوجاتا ہے جس سے پانی کی کمی واقع ہوتی ہے۔

عالمی بینک کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ تربیلا اور منگلا ڈیم کی تعمیر پاکستان کے پانی کے مسائل کا حتمی حل نہیں ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ ڈیم مٹی کی وجہ سے بھرتے جا رہے ہیں اور ان میں پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش کم ہوتی جا رہی ہے، اس لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نئے ڈیم بنائے جائیں۔ دی پاکستان واٹر اسٹریٹجی جس کے لیے ایشیائی ترقیاتی بینک نے فنڈز مہیا کیے ہیں اور واپڈا وژن 2025ء نے مستقبل کی ضروریات کا جائزہ لے کر نئے ڈیم بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ بڑے ڈیموں سے نہ صرف پانی کی دستیابی یقینی ہو جاتی ہے بلکہ ان سے بڑی مقدار میں بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے۔ تربیلا ڈیم اگرچہ آب پاشی کے لیے بنایا گیا ہے، مگر اس کے فوائد میں بجلی کا 60 فیصد حصہ ہے۔ کالا باغ اور بھاشا ڈیم سے ہونے والے فوائد میں بجلی کی پیداوار کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہوگا۔

جب سندھ طاس پر ڈیم بنانے کی منصوبہ بندی ہو تو یہ سفارش کی گئی تھی کہ تربیلا اور منگلا ڈیم مکمل ہونے کے ساتھ تیسرے بڑے ڈیم کی تعمیر شروع ہو جائے گی، مگر 30 سال گزرنے کے بعد بھی اس پر بحث جاری ہے اور ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ ڈیم بنا کب شروع ہوگا۔ بظاہر اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ فائدہ پنجاب کو ہوگا جو پہلے ہی استحقاق حاصل کیے ہوئے ہے۔ 1991ء کے پانی کے معاہدے کے مطابق اضافی پانی دستیاب ہونے کی صورت میں ہر ایک کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ اضافی پانی کی تقسیم کے اس فارمولے کے تحت چھوٹے صوبوں بلوچستان اور سرحد کو نئے پانی میں سے ان کے موجودہ حصے سے زیادہ حصہ ملے گا اور نسبتاً پنجاب زیادہ نقصان میں رہے گا، پھر یہ بدگمانی اور دشمنی کیوں پیدا ہوگئی ہے کہ نئے ذخائر میں سے پنجاب کو بے قاعدہ طور پر زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ کچھ حد تک یہ وجہ درست ہو سکتی ہے، مگر اسے حل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کی ایک اور وجہ تاریخی اور سیاسی شکایات بھی ہیں، جن کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے وفاقی حکومت کو یہ غلط فہمیاں دور کرنا ہوں گی۔ وفاقی حکومت کو چاہیے کہ وہ بلوچستان اور سرحد میں انفراسٹرکچر کی تعمیر کو ترجیح دے تاکہ وہاں مختص کردہ اضافی پانی استعمال کیا جا سکے۔

نئے ڈیم کی تعمیر میں جیسے جیسے تاخیر ہو رہی ہے، معاشی لاگت اور سماجی نقصانات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ ڈیم کے علاقے میں جائیداد کی قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے اور آبادی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

کالا باغ ڈیم:

کالا باغ ڈیم کا منصوبہ اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام (United Nations Development Programme) کی مدد سے 1984ء میں تیار کیا گیا۔ یہ منصوبہ ورلڈ بنک نے اپنے Client واپڈا پاکستان کے لیے اپنی نگرانی میں تیار کروایا۔ منصوبے کی تیاری کے بعد اس عظیم منصوبے پر کام شروع کرنے سے پہلے منظوری کے لیے اسے صوبائی و وفاقی حکومتوں کو پیش کیا گیا۔ اسی دوران منصوبے پر کام کرنے والے عملے کو تفصیلی ڈیزائن اور معاہدے کے کاغذات تیار کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ منصوبے پر عمل درآمد کے لیے تیاری کی جا سکے۔ یہ کام ڈھائی سال میں مکمل ہو گیا اور 1987ء کے وسط تک منصوبہ تعمیر کے لیے تیار ہو گیا۔

1987ء میں 3.46 بلین ڈالر کے اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا۔ ڈیم چھ سال کے عرصے میں مکمل ہونا تھا اور 1993ء میں بجلی کی پیداوار کے لیے پہلے یونٹ نے کام شروع کر دینا تھا لیکن بدقسمتی سے صوبائی حکومتوں کی مخالفت جو کہ زیادہ تر سیاسی وجوہ کی بنا پر تھی کی وجہ سے یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ملک کے معاشی ماہرین، سیاسی راہنما، صنعت کار، انجینئرز اور زمینداروں کے درمیان ڈیم کی شدید ضرورت کے بارے متفق سوچ کے باوجود اس کی تعمیر کے لیے سیاسی اتفاق رائے حاصل نہ کیا جا سکا۔ آنے والی بیشتر حکومتوں کی طرف سے ڈیم کی تعمیر کے لیے بار بار کوشش کی گئی لیکن ہر دفعہ مطلوبہ اتفاق رائے مختلف وجوہات کی بنا پر موخر ہوتا رہا۔

اس منصوبے کی تکمیل میں بارہ سال کی تاخیر کی وجہ سے ملک کے زرعی اور توانائی کے شعبے کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اس تاخیر نے صنعتی اور افرادی قوت کے شعبوں کو نقصان پہنچایا ہے، جن کی ترقی بجلی کی کمی کی وجہ سے سست ہوگئی۔

کالا باغ ڈیم پانی ذخیرہ کرنے کا عظیم منصوبہ ہے جو حکومت پاکستان دنیا کے ایک بڑے دریا سندھ پر بنانے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ ڈیم کے لیے تجویز کردہ زمین ضلع میانوالی میں کالا باغ میں صوبہ سرحد کے ساتھ واقع ہے۔

کالا باغ ڈیم کا منصوبہ شروع ہی سے نزاع کا باعث رہا ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے دسمبر 2005ء میں اعلان کیا کہ وہ ہر صورت میں کالا باغ ڈیم تعمیر کریں گے۔

تاریخی پس منظر

کالا باغ کا علاقہ پنجاب میں خود مختار جاگیر تھا۔ 1822ء میں اسے سکھوں نے فتح کر لیا۔ جب انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا تو انگریزوں کے لیے کی گئی خدمات کے عوض نواب کالا باغ کو جاگیر بخش دی گئی۔

منصوبے کی شق P-II کے مطابق حکومت پاکستان نے 1953ء میں کالا باغ ڈیم کے منصوبے پر کام شروع کیا اور 1973ء تک یہ منصوبہ آب پاشی کی ضروریات کے لیے پانی ذخیرہ کرنے کے لیے تھا۔ اس کے بعد جب بجلی کی قیمت میں اضافہ ہوا تو بجلی کی پیداوار کے لیے بھی اس کی صلاحیت کو بڑھایا گیا۔ منصوبے کی کاغذی کارروائی اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کی مدد سے 1984ء میں مکمل ہوگئی جو کہ ورلڈ بنک کی زیر نگرانی پایہ تکمیل کو پہنچی۔

ڈیم کے متعلق جھگڑا

کالا باغ ڈیم کی تعمیر کی وجہ سے پاکستان کے چار صوبوں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور خیبر پختون خواہ کے درمیان سخت تکرار اور جھگڑا شروع ہوا۔ پنجاب وہ واحد صوبہ ہے جو دوسرے صوبوں کی نسبت طاقت ور ہے اور ڈیم بنانے کے حق میں ہے۔ باقیماندہ تین صوبوں نے ڈیم کے بارے عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے اور اپنی اپنی صوبائی اسمبلیوں پر یہ زور دیا ہے کہ وہ منصوبے کے خلاف قرار داد منظور کریں۔ اسی وجہ سے ڈیم ابھی تک زیر غور ہے۔

تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پانی کی تقسیم کے بین الاقوامی قانون کے مطابق دریا کے نیچے والے حصے کو دریا پر زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی بڑا منصوبہ یا آبی ذخیرہ تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں پر صوبہ سندھ دریا کے اختتام پر واقع ہے جو کہ ڈیم کی تعمیر سے سب سے زیادہ متاثر ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر دریا کا آخر والا علاقہ پانی استعمال نہ کر رہا ہو تو پھر دریا کے اوپر والے حصے میں آبی ذخیرہ یا ڈیم تعمیر کیا جاسکتا ہے۔

مجوزہ ڈیم کے اثرات کا اندازہ لگانے پر یہ ظاہر ہوا ہے کہ اگر یہ منصوبہ بجلی اور پانی کی سہولت پیدا کرے گا تو ساتھ ہی یہ ماحولیات پر بھی برا اثر مرتب کرے گا جیسا کہ ایک عظیم ڈیم کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد بھی بے گھر ہوجائے گی۔ اگر منصوبے کی حمایت کرنے والوں نے اس کے بے شمار فوائد بتائے ہیں تو اس کے مخالفین نے بھی اس کے نقصانات کی نشان دہی کی ہے۔ اس جھگڑے کے نتیجے میں ڈیم 1989ء سے معرض التوا میں ہے۔

پنجاب کا نقطہ نظر

پنجاب جو پاکستان کا اناج پیدا کرنے کا گڑھ ہے اسے آبادی بڑھنے کی وجہ سے اپنی صنعتی اور زرعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پانی کی اشد ضرورت ہے کالا باغ ڈیم سستی برقی توانائی بھی مہیا کرے گا جو صنعتی شعبے کی ترقی میں اہم کردار ادا کرے گی۔ پنجاب کا خیال ہے کہ جو پانی بحیرہ عرب میں بغیر استعمال ہوئے گر کر ضائع ہو جاتا ہے اسے پاکستان کی بنجر زمینوں کی آبپاشی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

پنجاب کی ضرورت صرف کالا باغ ڈیم سے پوری نہیں ہوسکتی بلکہ اس کو سندھ پر بھاشا اور سکردو کے مقام پر دو مزید بڑے ڈیموں کی ضرورت ہے۔ پنجاب سمجھتا ہے کہ دوسرے علاقوں کی بہ نسبت کالا باغ کا علاقہ ڈیم کی تعمیر کے لیے زیادہ موزوں ہے لہٰذا یہاں پر سب سے پہلے ڈیم تعمیر ہونا چاہیے۔

صوبہ سندھ کا نقطہ نظر

صوبہ سندھ نے سب سے پہلے کالا باغ ڈیم کے منصوبے پر اعتراض کیا۔ یہ صوبہ دریائے سندھ کے نچلی طرف واقع ہے اور کالا باغ ڈیم کا سب سے شدید مخالف ہے۔ لیکن اس کی مخالفت زیادہ تر پنجاب کی وجہ سے ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ ڈیم بننے کی صورت میں پنجاب زیادہ پانی استعمال کرے گا جبکہ اس کے حصے میں بہت تھوڑا پانی بچے گا۔ اس نے پنجاب پر پانی کی چوری کا بھی الزام لگایا ہے۔ سندھ کا خیال ہے کہ سندھ کے پانی پر اس کا زیادہ حق ہے کیونکہ نام کی مطابقت سے دریائے سندھ مکمل طور پر صوبہ سندھ کا حصہ ہے۔ لہٰذا پہلے تربیلا اور منگلا ڈیموں کی تعمیر اور اب کالا باغ ڈیم کے ذریعے پانی کی چوری صوبہ سندھ کے آب پاشی کے نظام کو بالکل تباہ کردے گی۔ سندھ کے ڈیم کے بارے اعتراضات مندرجہ ذیل ہیں۔

1- کالا باغ ڈیم کا پانی صوبہ پنجاب اور NWFP کی زمینوں کو پانی دے گا جس کی وجہ سے سندھ کے حصے میں کمی آجائے گی جو سندھ کی زمینوں کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ سندھی یہ سمجھتے ہیں کہ بین الاقوامی قانون کے مطابق دریا کی نچلی طرف کے حصے میں رہتے ہوئے دریا کے پانی پر ان کا زیادہ حق ہے۔

2- سندھ کے ساحلی علاقے کو دریائے سندھ سے بحیرہ عرب تک مسلسل پانی کے بہاؤ کی ضرورت ہے کیونکہ پانی کا بہاؤ سمندری پانی کو اندرون علاقوں میں آنے سے روکے گا۔ سمندری پانی سندھ کے بہت سارے ساحلی علاقے کو بنجر ریگستان بنا دے گا اور سندھ کے ساحل پر اگے ہوئے جنگلات (mangrooves) کو تباہ کردے گا۔

3- سندھی یہ سمجھتے ہیں کہ تربیلا اور منگلا کی تعمیر کے بعد دریائے سندھ اپنی پہلی جیسی طاقت اور خوبصورتی کا شائبہ بھی نہیں رہا اور اب ایک مزید نئے اور عظیم ڈیم کی تعمیر کا متحمل نہیں ہوسکتا کیونکہ پہلے ڈیم بننے کی وجہ سے اس میں پانی کی کمی آگئی ہے۔

4- ڈیم بنانے کی وجہ سے ماحولیاتی مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن پر ابھی تک توجہ نہیں دی گئی۔ کالا باغ ڈیم میں ریت جمع ہونے سے منچھر جھیل اور دوسری جھیلوں کی پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت میں کمی آجائے گی۔

5- صدر جنرل مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز نے یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ سندھ کو پانی کا پورا حصہ دینے کے لیے سخت قسم کے آئینی تحفظات دیئے جائیں گے۔ لیکن سندھیوں کے لیے یہ یقین دہانی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ 1991ء کے Indus Water Sharing Accord جس کی آئینی ضمانت دی گئی تھی کی کئی بار خلاف ورزی کی جاچکی ہے اور پنجاب نے ان کے حصے کا پانی چرا لیا ہے۔

سندھ میں کالا باغ ڈیم کے متعلق وسیع پیمانے پر مخالفت جاری ہے۔ حتیٰ کہ وہ سیاسی جماعتیں جو جنرل پرویز مشرف کی حکومت میں شامل ہیں یعنی ایم کیو ایم نے بھی ڈیم کی سخت مخالفت کی ہے۔

صوبہ خیبر پختون خواہ کا نقطہ نظر

صوبہ خیبر پختون خواہ کے ڈیم کے متعلق دو اعتراضات ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1- ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ ڈیم کا آبی ذخیرہ صوبہ خیبر پختون خواہ میں ہوگا جبکہ بجلی پیدا کرنے والی ٹربائن پنجاب میں ہوں گی۔ لہٰذا پنجاب مرکزی حکومت سے بجلی پیدا کرنے کا معاوضہ (Royalty) طلب کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس پنجاب نے یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ کسی قسم کا معاوضہ طلب نہیں کرے گا۔ لہٰذا صوبہ خیبر پختون خواہ کا یہ کہنا کہ وہ ڈیم کے پانی کے ذخیرہ کی وجہ سے نقصان اٹھا سکتا ہے اور اسے کسی قسم کا معاوضہ بھی ادا نہ کیا جائے سراسر غلط ہے۔

2- صوبہ خیبر پختون خواہ کا خیال ہ کہ ضلع نوشہرہ کا وسیع علاقہ ڈیم کے پانی میں ڈوب سکتا ہے اور اس کے علاوہ بہت سارے علاقوں میں سیم اور تھور کی صورت پیدا ہوسکتی ہے جیسا کہ تربیلا ڈیم کی وجہ سے ہوا ہے۔

بلوچستان کا نقطہ نظر

منگلا ڈیم کا بلوچستان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن بلوچ عوام کالاباغ ڈیم کو پنجاب کے ذریعے دوسرے چھوٹے صوبوں کو دبانے کا ایک اور ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ڈیم کی مخالفت کرکے وہ سب سے غریب اور حکومتی بے حسی کا شکار ہونے کی' پر اپنی ناراضگی کا اظہار کررہے ہیں۔

تجزیہ

بہت سارے تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ کالاباغ ڈیم کے بارے سب سے بڑا مسئلہ پنجاب اور دوسرے تین صوبوں کے درمیان عدم اعتماد ہے۔ ایک عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ باقیماندہ پاکستان آخر کیوں پنجاب کے مخالف ہے۔ اس کی وجہ عام طور پر یہ سمجھی جاتی ہے کہ چونکہ زیادہ تر فوجی انقلاب پنجاب کی فوج نے لائے ہیں جس کی وجہ سے پاکستان کے تمام اداروں میں پنجاب کا اثر ونفوذ بڑھا ہے۔ اس کی وجہ سے پنجاب کو ملک کے وسائل پر اجارہ داری قائم کرنے میں آسانی پیدا ہوئی ہے اور دوسرے صوبوں کے حقوق کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب کوئی صوبہ پنجاب پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان پانی کی شدید کمی کا شکار ہے۔ لہٰذا جتنی جلدی ہوسکے پانی کا انتظام ہونا چاہیے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کالا باغ ڈیم پر کام شروع ہو بھی جاتا ہے تو اسے مکمل ہونے میں آٹھ سال کا عرصہ لگے گا اور اس دوران ملک میں پانی کی صورت حال مزید خراب ہوجائے گی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ جب تک کالا باغ مکمل ہو اس وقت چھوٹے ڈیم، بیراج اور نہریں بنائی جائیں اور پانی کے وسائل کی حفاظت کے لیے طریقہ کار متعارف کروایا جائے۔

چونکہ واپڈا نے ڈیم کے بارے میں اپنے اعداد وشمار میں کئی دفعہ تبدیلی کی ہے اس لیے اب کوئی بھی واپڈا کے دیئے ہوئے اعداد وشمار تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حکومت پاکستان کالاباغ ڈیم کے تکنیکی فوائد کا جائزہ لینے کے لیے اے۔ این۔ جی عباسی کی زیر نگرانی ایک کمیٹی قائم کی۔ کمیٹی کی چار جلدوں پر مشتمل رپورٹ میں یہ کہا گیا کہ اس سے پہلے کہ کالاباغ کے معاملات مزید خراب ہوجائیں۔ بھاشا اور کانڈرا کے مقام پر ڈیم تعمیر کرنے چاہئیں۔

میرانی ڈیم

میرانی ڈیم بلوچستان کے ضلع گوادر میں واقع ہے۔ یہ صوبہ بلوچستان کی تحصیل مکران میں تربت سے 30 میل مغرب میں دریائے دشت پر واقع ہے۔ یہ دریا کے دونوں کناروں پر زمین کو زرعی مقاصد کے لیے پانی فراہم کرے گا۔

پاکستان کے پانی کے شعبے کے مسائل

پاکستان میں پانی کے شعبے کو درپیش مشکلات مندرجہ ذیل ہیں۔

1- آبادی کا بڑھنا اور شرح اموات و پیدائش میں تبدیلیاں۔
2- زرعی شعبے کی پانی کی بڑھتی ہوئی ضروریات۔
3- پانی کے تیزی سے کم ہوتے ہوئے وسائل۔
4- پانی کی ناقص منصوبہ بندی اور حکمرانی۔

سندھ کے خدشات:

1- اس پروجیکٹ سے سندھ ریگستان میں تبدیل ہوجائے گا۔
2- کالا باغ ڈیم میں بھرنے کے لیے پانی دستیاب نہیں ہوگا۔
3- اس ذخیرے سے پانی لے جانے کے لیے بڑی بڑی نہریں نکالی جائیں گی۔
4- سیلابی علاقوں میں کاشت بری طرح متاثر ہوگی۔
5- دریائے سندھ میں سمندر کا پانی چڑھ آئے گا۔
6- بحری نباتات کو نقصان پہنچے گا۔
7- کوٹری سے نیچے مچھلی کی پرورش اور پینے کا پانی بری طرح متاثر ہوگا۔

خدشات کے جوابات:

1- ڈیم خود پانی استعمال نہیں کرتے بلکہ سیلاب کے دنوں میں یہ پانی کا ذخیرہ کرلیتے ہیں اور پھر سال کے خشکی کے دنوں میں فصل کی ضرورت کے مطابق پانی مہیا کرتے ہیں۔ اس حقیقت کا مظاہرہ 1976ء میں تربیلا ڈیم بھرنے کے بعد ہوا۔ اس ڈیم کے بننے سے پہلے 67-1960ء میں سندھ کی نہروں میں پانی کی اوسط سالانہ مقدار 35.6 ملین ایکڑ فٹ دستیاب تھی لیکن تربیلا ڈیم بننے کے بعد یہ مقدار بڑھ کر 44.5 ملین ایکڑ فٹ ہوگئی۔ 22 فیصد اضافہ صرف ربیع کی فصل میں ہوا جو 10.7 سے بڑھ کر 15.2 ملین ایکڑ فٹ ہوگئی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے بعد سندھ کی نہروں کے پانی میں مزید اضافہ ہوگا۔

2- 1991ء کے معاہدے کے تحت صوبوں کو اوسطاً 102 ملین ایکڑ فٹ اضافی پانی مختص کیا گیا تھا جو تقریباً تمام کا تمام خریف کی فصل میں آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اضافی پانی سیلاب کے زمانے میں 70 سے 100 دن تک کے لیے دستیاب ہوتا تھا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پورے سال صوبوں کو اضافی پانی مہیا کرنے کے لیے 3.6 ملین ایکڑ فٹ پانی خریف کی فصل یعنی اپریل سے جولائی تک ضروری ہوگا۔

3- ابتدائی مطالعے سے معلوم ہوا کہ کالا باغ ڈیم میں سے نہریں نکالنا معاشی طور پر سودمند نہیں ہوگا، اگر کوئی نکالے گا بھی تو اس کے پانی کا حصہ سختی کے ساتھ 1991ء کے پانی کے معاہدے کے مطابق ہوگا۔

4- (a) یہ خیال بھی عام ہے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے کچے کے علاقے جنہیں سیلابی زمین کہا جاتا ہے، پیداوار ختم ہو جائے گی، کیونکہ سیلابی پانی پر کنٹرول کرلیا جائے گا۔ سیلابی علاقے کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے، سیلابی فصلیں دریا کے ساتھ کی زمین اور کھاڑیوں میں اگائی جاتی ہیں۔ یہ فصلیں سیلاب کے بعد نرم زمین پر بوئی جاتی ہیں اور ہر انہیں ایک سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے سیلابی زمین میں پیداوار کم ہوتی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے کاشتکاروں کو ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں آبپاشی کے لیے ٹیوب ویل کے ذریعے پانی مہیا کیا جائے لیکن سیلاب کے زمانے میں کنوؤں سے موٹر وغیرہ ہٹا لیے جاتے ہیں تاکہ انہیں نقصان نہ ہو۔

(b) گدو بیراج سے سمندر تک اس وقت 660,000 ایکڑ کا سیلابی زمین کا علاقہ زیر کاشت ہے۔ بنیادی طور پر اس علاقے میں اس نمی کی وجہ سے فصل بوئی جاتی ہے جو دریا کے 300,000 کیوسک یا اس سے زیادہ پانی آنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

(c) کالا باغ بننے کے بعد بھی 300,000 کیوسک سے زیادہ بلندی کے سیلاب آئیں گے، جن سے موجودہ تہذیبی عمل کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، البتہ بڑے سیلابوں کو روکا جائے گا۔ اس طریقہء کار سے سیلابی علاقوں میں اطمینان سے مستقل طور پر ٹیوب ویل لگائے جاسکتے ہیں تاکہ سیلابی پانی زمین میں آبپاشی کی سہولت مہیا کی جاسکے۔

5- حقیقی اعداد و شمار سے اس خوف کو بھی کوئی تقویت نہیں ملتی کہ کالا باغ ڈیم سے دریا کے ڈیلٹا میں سمندری پانی کے چڑھنے میں اضافہ ہوگا۔ مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ سمندری پانی سے متاثر ہونے والا علاقہ ڈیلٹا کے زیریں ترین حصے تک محدود ہے جو گروہ Groh اور جاؤ گیزو (Chowgazo) پر ختم ہو جاتا ہے۔ گروہ کی پانی کی بلندی پر دریا کے پانی کے 700,000 کیوسک بلند اخراج سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سمندری پانی کا چڑھاؤ اس وقت آخری حد پر ہے جس میں کالا باغ ڈیم کی وجہ سے کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

(e) ایک اور خدشہ یہ ہے کہ اس وقت موجود زیر زمین پانی میں سمندری پانی داخل ہو کر اس کے معیار کو خراب کر دے گا۔ اس وقت زیر زمین پانی شمال میں حیدر آباد تک کے علاقے میں نمکین ہے۔ اس لیے ڈیلٹا کے کناروں سے سمندری پانی کے داخل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دوسرے اس زیر زمین پانی کے ذخیرے کا ڈھلان جنوب کی طرف ہے۔ ڈیلٹا کے علاقے میں بہت کم پانی منتقل ہو سکتا ہے، اس سے سمندری پانی کے شمال کی طرف چڑھنے کا خدشہ غلط ہے۔

6- (a) تاریخی ڈیلٹا کے کل 1.51 ملین ایکڑ علاقے میں سے 0.32 ملین ایکڑ علاقہ تیمر (Mangoves) جنگلات پر مشتمل ہے جو مغرب میں کراچی سے شروع ہو کر مشرق میں رن آف کچھ تک جاتا ہے، ان میں سے 95 فیصد پودے نمک برداشت کر لیتے ہیں۔

(b) مندرجہ بالا تاریخی ڈیلٹا کے برعکس موجودہ ڈیلٹا کا علاقہ 294000 ایکڑ ہے۔ اس میں تیمر کا علاقہ 17400 ایکڑ یا علاقے کا 25 فیصد ہے اور باقی علاقہ کیچڑ کی شکل میں ہے۔ اسی طرح تیمر کا علاقہ بہت کم ہے۔ این ای ڈی انجینئرنگ کی تحقیق کے مطابق جس کا عنوان What really threaten us and our mangroves تھا، معلوم کیا کہ تیمر کے علاقے کے کم ہونے کی وجہ مدوجزر اور اس کی بلندی میں کمی ہے ناکہ اوپر کی طرف تازہ پانی کی کمی ہے۔ تازہ پانی کی کمی کا سلسلہ 1932ء میں سکھر بیراج بننے کے بعد سے شروع ہوا تھا۔ تیمر کے کم ہونے کی دوسری وجوہات کراچی کی آبادی کی وجہ سے درختوں کی کٹائی اور اس علاقے میں زیادہ چوری ہونا ہے۔

لہٰذا تیمر کو بڑھانے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ یہاں پر ایسے درخت اگائے جائیں جو کھارے پانی کو برداشت کر سکیں اور اس کے ساتھ ہی ضرورت کے مطابق پانی مہیا کرنا ہے۔ اس طرح اس کام میں کالا باغ ڈیم بننے سے آسانی ہوگی۔

7- (a) ایک حالیہ مطالعہ سے یہ بھی اشارہ نہیں ملا کہ کوٹری سے نیچے کے پانی میں مچھلیوں کی تعداد میں کمی اوپر کم پانی آنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اعداد و شمار سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ مچھلیوں کی افزائش میں کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے کالاباغ ڈیم کی تعمیر سے مچھلیوں کی افزائش پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

کوٹری بیراج کے نیچے کچے کے علاقے میں پانی کھارا ہے جو آبپاشی کے کام نہیں آ سکتا اور نہ ہی استعمال کے لائق ہے۔ کالاباغ بننے کے بعد سردیوں کے موسم میں پانی کا اضافہ ہوگا اور پینے کے لیے مزید پانی حاصل ہو سکے گا۔

باب نمبر 30

پاکستان کا ایٹمی توانائی کا پروگرام

Nuclear Programme of Pakistan

پاکستان نے 28 مئی 1998ء کو کامیابی کے ساتھ چاغی کے مقام پر چھ ایٹمی دھماکے کیے۔ یہ ہندوستان کے ایٹمی دھماکوں کے ردعمل میں کیے گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کو ہندوستان کے جارحانہ اور احمقانہ فیصلہ کے نتیجے میں ایٹمی دوڑ میں شامل ہونا پڑا۔ ہندوستان میں دھماکوں پر خوشی کے اظہار اور اس کے بعد پاکستان کے خلاف جارحانہ رویہ نے بھی پاکستان کو ایٹمی قوت بننے پر مجبور کیا۔ پاکستان اس وقت ایٹمی طاقت بنا جب ہندوستان نے جنوبی ایشیا کو ایٹم سے پاک علاقہ بنانے کے لیے پاکستان کی مثبت کوششوں کا جواب دینے سے انکار کردیا۔

1971ء سے بھارتی دھماکوں سے متعلق حالات کا غیر جانبدارانہ جائزہ یہ ثابت کرے گا کہ پاکستان نے ہندوستان کو ایٹمی راہ اپنانے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی اور اس کے سیاسی ماہرین نے پاکستان کی جنوبی ایشیا کو ایٹم سے پاک علاقہ رکھنے کی پرخلوص خواہش پر کان نہ دھرا اور بالاخر پاکستان کو ایٹمی دھماکہ کرنے پر مجبور کردیا۔

چھ ایٹمی دھماکے کرنے کے بعد پاکستان نے برصغیر میں طاقت کے توازن کو بحال کردیا ہے جو پہلے ہندوستان کے حق میں جھک گیا تھا۔ طاقت کے توازن کی بحالی نے بہت حد تک برصغیر میں امن اور دفاع کی صورتحال کو مضبوط بنا دیا ہے۔ (Mutually Assurd Destruction) MAD کا مسلسل دباؤ برصغیر میں ضبط وتحمل اور عقل کے استعمال کو فروغ دے گا جو کہ برصغیر میں امن کے قیام کے لیے بہت ضروری ہے۔ پاکستان کے ایٹمی قوت بنتے ہی ہندوستان کے وزیراعظم اور دوسرے سرکردہ راہنماؤں کے لب ولہجہ میں تبدیلی آئی ہے۔

برصغیر کے ایٹمی علاقہ بننے کا سب سے مثبت پہلو یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر اب بین الاقوامی موضوع بن گیا ہے۔ اب یہ ایک عام خیال اجاگر ہوا ہے کہ برصغیر میں اگر ایٹمی جنگ شروع ہوجاتی ہے تو وہ براہ رست یا بالواسطہ طریقے سے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لی گی۔ ایٹمی دوڑ کے جلد بھڑک جانے کی وجہ نے پوری دنیا کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ کشمیر کا جھگڑا ہی تمام مسائل کی جڑ ہے جسے برصغیر میں طویل قیام امن کے لیے حل کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ایٹمی دوڑ کا ایک اور خوش آئند پہلو یہ بھی ہے کہ یہ اسلامی بلاک کے قیام کا عمل تیز کرے گا۔ تمام دنیا کے مسلمان ممالک نے پاکستان کے ساتھ ہم آہنگی اور بھائی چارے کا اظہار کیا ہے اور کسی بھی وقت ہر قسم کی امداد کی یقین دہانی کرائی ہے۔

ایٹمی قوت بننے کی مجبوریاں Pressing Reasons for Going Nuclear

اس سے پہلے کہ ہم CTBT پر تبادلہء خیال کریں یہ بہتر لگتا ہے کہ ہم ان مجبوریوں اور وجوہات پر ایک نظر ڈالیں جو پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کا باعث بنی۔ ایٹمی قوت بننے کی سب سے بڑی وجہ بھارت کی طرف سے مسلسل خطرات تھے۔ قوموں کے درمیان

جنگیں لڑنے کا عام طور پر ایک مشترکہ بہانہ ہوتا ہے کہ وہ علاقائی جھگڑوں کو فوجی قوت سے حل کرنا چاہتی ہیں۔ بالکل اسی طرح بھارت اور پاکستان کئی مرتبہ اپنے علاقائی مسائل پر جو کہ سرحدوں کے غیر تصفیہ شدہ تعین کی وجہ سے پیدا ہوئے مسلح تصادم میں ملوث ہو چکے ہیں۔ ان غیر تصفیہ شدہ حدود کی وجہ سے پاکستان مسلسل اپنے طاقتور ہمسائے جس نے بارہا علاقے میں اپنا آمرانہ تسلط قائم کرنے کا اظہار کیا کی جانب سے اپنے دفاع کو درپیش مسائل کا سامنا کرتا آیا ہے۔ ہندو قیادت نے پاکستان کو شروع ہی میں کمزور کرنے کے لیے ہر قدم اٹھایا۔ دونوں ممالک کے درمیان 1965,1948 اور 1971ء میں تین جنگیں لڑی گئیں۔

بھارت کی طرف سے مسلسل خطرات اور غالبانہ نقطہ نظر کے نتیجے میں پاکستان کی فوجی انتظامیہ نے یہ ٹھیک اندازہ لگایا کہ صرف معقول طاقت کا توازن ہی دو مسلح طاقتوں کے درمیان مستقبل میں ہونے والے تصادم کو روک سکتا ہے۔ بھارت کی طرف سے درپیش خطرات کے بارے میں پاکستان کا اپنا نقطہ نظر ہے کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوجاتا پاکستان غیر محفوظ ہے۔ پاکستان کشمیر کو اپنی معاشی اور دفاعی ضرورت کے لیے ''شہ رگ'' سمجھتا ہے۔

پاکستان بھارت کے تابع نہیں رہنا چاہتا اور اپنی سالمیت اور آزادی کے تحفظ کے لیے معقول طاقت برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ پاکستان سمجھتا ہے کہ وہ آبادی، علاقہ اور فوجی صلاحیت کے اعتبار سے اتنا بڑا ملک ہے کہ بھارت کے دباؤ کا سامنا کر سکے۔

پاکستان کے قدامت پسند حلقے بھی پاکستان کی نظریاتی حدود کے تحفظ پر زور دیتے ہیں جس کو ان کے مطابق بھارت اور مغربی دنیا کی طرف سے زبردست یورش کا خطرہ ہے۔ وہ بھارت کی طرف سے ثقافتی یلغار کی وجہ سے سخت پریشان ہیں اور بیرونی ثقافت کے اثرات سے اپنی اقدار کو بچانے میں پرعزم ہیں۔

پاکستان کا ایٹمی پروگرام Pakistan's Nuclear Programme

پاکستان میں ایٹمی پروگرام تشکیل دینے کی تجویز صدر امریکہ آئزن ہاور کی 1954ء کی ایٹم برائے امن کی تجویز کی مرہون منت ہے۔ امریکہ کی اس سوچ نے پاکستان کی حوصلہ افزائی کی اور اس نے پہلا ایٹمی انسٹیٹیوٹ جنوری 1955ء میں قائم کیا۔ اس کے بعد 1956ء میں پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن (PAEC) قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کو اس کا پہلا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ چونکہ ڈاکٹر نذیر احمد خود سائنس دان نہ تھے اور نہ ہی حکومت کی حمایت حاصل تھی اس لیے PAEC ڈاکٹر نذیر احمد کی سربراہی میں زیادہ ترقی نہ کر سکا۔

1960ء میں ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی جو کہ لندن کے امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے تعلیم یافتہ تھے اور فزکس کے ماہر تھے کو PAEC کا سربراہ بنایا گیا۔ ڈاکٹر عثمانی کے PAEC کا چیئرمین بنتے ہی پاکستان میں ایٹمی توانائی کے حصول کے لیے موثر حکمت عملی کا آغاز ہوا۔

1963ء میں ڈاکٹر عثمانی نے ایٹمی پروگرام برائے امن مقاصد کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے پاکستان انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (PINSTECH) کی اسلام آباد کے قریب نیلور اور کراچی نیوکلیئر پلانٹ (KANUPP) کی کراچی میں کینیڈا کی مدد سے بنیاد رکھی جس کا افتتاح نئے چیئرمین PAEC ڈاکٹر منیر احمد خان نے 1972ء میں کیا۔ ڈاکٹر عثمانی نے بہت سے سائنس دانوں کو بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا جو اعلیٰ تربیت لے کر ملک واپس آئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نوبل انعام یافتہ اور ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت ایٹمی توانائی کے وزیر تھے کی حوصلہ افزائی پر ڈاکٹر عثمانی ایٹمی پروگرام برائے امن کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

جب بھارت نے 1964ء میں فوجی استعمال کے لیے اپنے پاور ری ایکٹر پر ایندھن بنانے کا کام شروع کیا تو ذوالفقار علی بھٹو نے بھی جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ 1965ء کی جنگ نے بھٹو کی سوچ کو تقویت دی۔ 1970ء میں پاکستان نے بھٹو کی قیادت میں فرانس سے ایک ری پروسیسنگ پلانٹ خریدنے کا معاہدہ کیا لیکن فرانس امریکی دباؤ پر اپنے تحریری وعدے سے منحرف ہوگیا۔ امریکہ پاکستان کے کسی ایسی سہولت حاصل کرنے کے خلاف تھا جس سے جوہری مواد پیدا کرنے میں مدد مل سکتی ہو۔

1974ء میں جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو کینیڈا نے بھی KANUPP کے لیے ایندھن اور فالتو پرزے دینے بند کردیئے۔ یہ چیز بظاہر بری لیکن حقیقتاً اچھا شگون ثابت ہوئی کیونکہ پاکستان کے ایٹمی توانائی کمیشن PAEC نے KANUPP میں استعمال ہونے والا یورینیم خود بنانا شروع کردیا۔ لہٰذا کینیڈا کی طرف سے ایندھن کی سپلائی بند ہوجانے کے باوجود کراچی ایٹمی ری ایکٹر چلتا رہا۔

2 جنوری 1972ء کو ملتان میں ایک ملاقات کے دوران وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے سامعین سے کہا "میں نے ہمیشہ یہ خواہش کی کہ پاکستان ایٹمی رستے پر چلے لیکن کسی نے میری بات پر دھیان نہ دیا۔" چند سائنس دان جو اس ملاقات میں موجود تھے ان کی طرف دیکھتے ہوئے یہ کہا "کیا آپ یہ کام کرسکتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ ہاں اگر ہمیں وسائل اور سہولتیں دی جائیں۔" بھٹو کا جواب تھا "میں آپ کے لیے وسائل اور سہولتیں مہیا کروں گا" بھٹو نے اعلان کیا کہ "پاکستان دو سال کے اندر ایٹمی بم بنالے گا۔" 1974ء میں بھارتی ایٹمی دھماکے نے بھٹو کو ملتان میں کیا ہوا وعدہ دو سال کے بعد پورا کرنے کی ترغیب دی۔

بھٹو جو اپنے اردگرد ہونے والے واقعات سے پوری طرح آگاہ تھے کسی ایسے پاکستانی سائنس دان کی تلاش میں تھے جو اس کام کو بخوبی سرانجام دے سکے۔ بھٹو کی تیز نگاہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر پڑی جنہوں نے فزیکل میٹالرجی (Physical Matallurgy) میں بلجیئم سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ بھٹو نے ڈاکٹر قدیر خان سے رابطہ کیا اور انہیں پاکستان واپس آنے کا کہا۔ جب قدیر خان وزیراعظم بھٹو سے ملے تو انہوں نے ان سے کہا کہ "سٹیل مل کو بھول جائیں اور ہمیں صرف یہ بتائیں کہ یورینیم کو کس طرح تقویت دی جاسکتی ہے۔"

جب قدیر خان دوبارہ دسمبر 1975ء میں پاکستان واپس آئے تو بھٹو نے انہیں Enrichment Plant پر کام شروع کرنے کو کہا اور وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے میں بالکل آزاد ہوں گے۔ پلانٹ پر کام 1976ء میں شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی یورینیم کو تقویت دینے کے لیے ایک لیبارٹری قائم کردی گئی جس کا کوڈ نام پراجیکٹ 706 تھا۔

جنرل ضیاء الحق نے بھی ڈاکٹر قدیر خان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی ضرورت کے مطابق تمام امداد اور سہولت مہیا کی۔ حقیقت میں تمام حکومتوں نے خان ریسرچ لیبارٹری (KRL) جو ڈاکٹر قدیر خان کے نام کی نسبت سے قائم کی گئی تھی کو تمام ضروری امداد جاری رکھی اور قدیر خان اور ان کی ٹیم اور وہ جو PAEC میں اسی منصوبے پر کام کررہے تھے کو آزادانہ کام کرنے کی اجازت تھی۔ KRL مکمل طور پر خودمختار تھی اور PAEC کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا۔

بھٹو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی موت کی کوٹھری سے یہ لکھا کہ جب میں نے حکومت چھوڑی تو ہم ایٹمی قوت حاصل کرنے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اگرچہ بھٹو کے دور میں پراجیکٹ 706 تیزی سے ترقی کررہا تھا لیکن پھر بھی بھٹو کے دعوے میں اتنی حقیقت نظر نہیں آتی۔

بہت سی مشکلات، فنڈز کی کمی اور یورینیم کی افزودگی سے تعلق رکھنے والی اشیاء کی درآمد پر پابندیوں کے باوجود KRL کے سائنس دانوں نے اپنا ہدف صرف سات سالوں میں حاصل کرلیا۔ پاکستان نے فروری 1984ء میں اعلان کیا کہ ہم نے ہتھیار بنانے

والا یورینیم تیار کرلیا ہے۔ یورینیم کی افزودگی ایٹمی استعداد حاصل کرنے کا صرف ایک حصہ تھی۔ ایٹم بم بنانے کے لیے اس سے پہلے اسے چلانے کے طریق کار کی ابتدائی خاکہ کشی، اجزا کو جوڑنا اور بچھانا اور دوسرے بے شمار اقدام تھے وہ PAEC نے مکمل کیے۔ PAEC کے سائنس دان بھی KRL کی ٹیم کے برابر خراج تحسین کے حق دار ہیں۔

قوم نے 1987ء میں ایٹمی استعداد حاصل کرلی۔ مغربی ممالک کے فوجی تجزیہ نگاروں نے یہ تسلیم کرلیا کہ پاکستان نے تھوڑے عرصے میں ایٹم بم بنانے کی مہارت حاصل کرلی۔ اس کے بعد بھارت کی طرف سے امریکہ اور دوسری جگہوں پر بھارت نواز حلقوں نے نام نہاد اسلامی بم کے خطرے کو بہت اچھالا۔

امریکہ کی طرف سے دباؤ آنا شروع ہوگیا جس کی وجہ سے یورینیم کی افزودگی کا عمل 1994 اور 1997 کے درمیان بند ہوگیا۔ جنرل اسلم بیگ سابقہ آرمی چیف اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ یورینیم افزودگی بند کرنے کا فیصلہ بیرونی دباؤ کی وجہ سے کیا گیا۔ ان کا کہناہ ہے کہ پاکستان نے 1997ء میں یورینیم کی افزودگی کو اس لیے بند کیا کہ اب اس کی مزید ضرورت نہ تھی۔

ایٹمی دھماکے کے اثرات The Impact of Nuclear Detonations

بھارت نے ایٹمی دھماکہ کرکے جو فوجی برتری پاکستان پر حاصل کرلی تھی پاکستان کے ایٹمی دھماکے کے بعد ختم ہوگئی۔ فوجی توازن برقرار ہوگیا اور آزاد کشمیر کو لاحق خطرہ ٹل گیا۔ بھارت میں جو خوشی کی لہر آئی تھی وہ ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ بی جے پی کی حکومت پر شدید نقطہ چینی ہورہی تھی کیونکہ انہوں نے اپنی طفلانہ سیاست سے کشمیر کے مسئلے کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کروا دیا تھا۔ مغربی طاقتوں کو اب یہ احساس ہوگیا تھا کہ برصغیر میں ایٹمی جنگ کو روکنے کے لیے انہیں اب زیادہ مثبت کردار ادا کرنا ہوگا۔ پاکستان نے کشمیر پر زیادہ سخت رویہ اختیار کرلیا کیونکہ اب وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ بات چیت کرسکتا تھا۔

بھارت کے سابق وزیراعظم آئی۔کے۔گجرال کا خیال تھا کہ بی جے پی کی حکومت نے ملک کو سیاسی وجوہات کی بنا پر جوہری توانائی کی دوڑ میں ملوث کردیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب انہوں نے حکومت چھوڑی اس وقت دفاع کو کوئی خطرہ درپیش نہ تھا۔

بھارت نے اپنے امریکہ کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ پیدا کرلیا جب امریکی صدر بل کلنٹن کے منع کرنے کے باوجود اس نے دوسرا دھماکہ کیا۔ امریکہ صدر نے بھارت کو تنبیہ کی تھی کہ وہ اب مزید دھماکے نہ کرے۔ اس کے بعد بی جے پی کے راہنماؤں کے بیانات نے بھارت اور امریکہ کے درمیان مراسم کو زیادہ نقصان پہنچایا۔

بھارت کو سلامتی کونسل میں نشست ملنے کے مواقع ختم ہوگئے جبکہ P-5 نے دو نئی پیدا ہونی والی ایٹمی طاقتوں کو جوہری ہتھیاروں والی ریاستیں ماننے سے انکار کردیا۔ وہ NPT میں ترمیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کیونکہ NPT کے مطابق صرف وہی ممالک جوہری ہتھیاروں سے لیس ممالک کی صف میں آتے ہیں جنہوں نے یکم جنوری 1967ء سے پہلے ایٹمی دھماکہ کرلیا ہو۔

ہندوستان اور پاکستان کے سربراہان کی یقین دہانی کے باوجود کہ وہ اب مزید ایٹمی آزمائشیں نہیں کریں گے، دونوں متحارب ممالک کے درمیان ایٹمی اور میزائل کی دوڑ جاری رہے گی کیونکہ مزاحمت کا عمل کبھی رکتا نہیں۔

پاکستان کا ایٹمی پروگرام

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ پاکستان کو مجبوراً ایٹمی راستہ اپنانا پڑا۔ چاغی کے ایٹمی دھماکے کے بعد پاکستان کو ایٹمی مملکت تسلیم کرلیا گیا۔ پاکستان کے ایٹمی طاقت بن جانے پر مغربی ممالک نے اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کیا اور اس پر معاشی پابندیاں عائد

کردیں۔ بالخصوص امریکہ کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں کی وجہ سے ہر قسم کی معاشی وفوجی امداد روک دی گئی۔ پابندیاں عائد ہونے کے بعد پاکستان میں معاشی بحران پیدا ہوا۔

امریکہ کی طرف سے امداد رکنے پر ملک میں معاشی ہنگامی صورتحال کا اعلان کیا گیا اور حکومت کو تمام بیرونی کھاتے منجمد کرنا پڑے کیونکہ بہت سارے بیرونی کھاتہ داروں نے اپنے کھاتے محفوظ اداروں میں منتقل کرانے شروع کردیے جس کے بعد حکومت کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہ بچا سوائے اس کے کہ تمام بیرونی کھاتوں کو منجمد کردیا جائے۔

معاشی پابندیوں کے بعد یہ سمجھا جارہا تھا کہ پاکستان کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا جو کہ زرمبادلہ کے کم ذخائر کی وجہ سے ہوگا۔ دھماکے کے وقت پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر تقریباً 1.4 بلین ڈالر تھے جو کہ گھٹ کر 900 ملین ڈالر پر پہنچ گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر IMF اور ورلڈ بنک امداد نہیں دیتے تو پاکستان قرضوں کے بوجھ تلے دب جاتا۔ سب سے زیادہ اثر توانائی کے شعبے، پانی کے وسائل، سڑکوں اور ہائی ویز کی تعمیر اور بالخصوص نجی شعبے پر پڑا جو کہ (International Finance Corporation) IFC سے قرضے لے کر اپنا کام چلا رہا تھا۔

پابندیوں کی وجہ سے پاکستان کے ادائیگیوں کے توازن میں خلل پیدا ہونے کا قوی امکان پیدا ہوگیا۔ ملک پہلے ہی تقریباً 2 بلین ڈالر کے مالی خسارے میں مبتلا تھا۔ اس کے علاوہ 3 بلین ڈالر قرضوں کی سہولت کے لیے درکار تھے۔ اگلے مالی سال کے لیے پاکستان کو 5 بلین ڈالر کی ضرورت تھی جو کہ بہت مشکل نظر آتا تھا۔ پابندیاں لگنے سے پہلے پاکستان کو ملکی اور غیر ملکی باشندوں کے کھاتوں سے 1 بلین ڈالر آنے کی توقع ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ 800-700 ملین ڈالر بیرونی سرمایہ کاری سے حاصل ہوجاتے تھے اور ورلڈ بنک کی 800-700 ملین ڈالر کی امداد IMF کے 600-500 ملین، 300-200 ملین ڈالر ایشین ترقیاتی بنک اور 1.5-1.4 ملین ڈالر Pakistan Development Forum سے حاصل ہوتے تھے۔

پابندیاں لگنے کے بعد کہیں سے بھی کوئی امداد یا ادائیگی آنا بند ہوگئی۔ سب سے پہلے بیرون ملک پاکستانیوں نے بدتر معاشی حالت کی وجہ سے پاکستانی بنکوں کے ذریعہ ملک میں رقوم بھیجنی بند کردیں۔ بیرونی ادائیگیوں کو حاصل کرنے کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ حکومت پاکستان اپنے روپے کی قیمت میں کمی کردے لیکن حکومتی اعلانات کی روشنی میں یہ ممکن نظر نہ آتا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان میں بیرونی سرمایہ کاری بالکل مفقود تھی۔ OPIC، Exim Bank اور Pakistan Development Forum کے لیے مختص کردہ رقوم واپس نکالنے سے بیرونی سرمایہ کاروں پر بڑا اثر پڑا۔ جن میں سے اکثر نے رقوم مندرجہ بالا امریکی اداروں کی وجہ سے ادا کی تھیں۔ ان اداروں کی مدد کے بغیر کوئی نیا منصوبہ پاکستان میں شروع نہ کیا جاسکا۔

بھارت اور پاکستان کا معاملہ The Case of India and Pakistan

روایتی ہتھیاروں میں بھارت کو اپنی مقامی دفاعی پیداوار کی استعداد کی وجہ سے پاکستان پر برتری حاصل ہے۔ اس کے علاوہ بھارت اپنی جارحانہ قوت کو بڑھانے کے لیے ترقی یافتہ ہتھیار بھی حاصل کرتا رہا ہے۔ بھارت کے پاس اس وقت دنیا کی چوتھی بڑی فوج ہے، وہ اپنی نیوی کی طاقت کو بڑھانا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ICM کا بڑھتا ہوا جال ہے اور روایتی ہتھیاروں میں تقریباً خود کفیل ہے۔

بھارت 1965 اور 1971ء کی جنگوں میں پاکستان کے خلاف اپنی جارحانہ قوت کے استعمال سے ذرہ بھر نہ ہچکچایا۔ 1974ء میں اس نے اپنے ایٹم بم کا دھماکہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کو بھی ایٹمی مزاحمت کی استعداد حاصل ہوئی۔ اگر پاکستان CTBT پر دستخط کردیتا ہے تو یہ اپنی ایٹمی ہتھیاروں کی استعداد کو بڑھانے سے دستبردار ہوتا ہے۔ معاہدے پر یک طرفہ دستخط خودکشی کے مترادف ہوں گے جو پاکستان کو بھارت کے بہتر اور روایتی ہتھیاروں کے رحم وکرم پر ڈال دیں گے۔

اگر بھارت CTBT پر دستخط کر بھی دیتا ہے تو بھی پاکستان کو اس پر دستخط نہیں کرنے چاہیں۔ پاکستان کس طرح اپنی ایٹمی مزاحمت کے خوف کو بھارت کے بہتر روایتی قوت کی موجودگی میں چھوڑ سکتا ہے۔ پاکستان کے لئے ایٹمی مزاحمت کے خوف کی ضرورت 1987ء اور 1990ء میں بہت زیادہ محسوس ہوئی جبکہ پاکستان پر بھارتی حملے کی کارروائی پاکستان کی ایٹمی استعداد کی وجہ سے رک گئی۔ اس وقت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ابتدائی سطح پر ایٹمی مزاحمت کا خوف موجود ہے۔

پاکستان کو اس وقت تک معاہدے پر دستخط نہیں کرنے چاہیں جب تک ہمارے دفاع کے مفادات کے تحفظ کے لیے معقول اقدامات نہیں کیے جاتے۔ برصغیر میں ایک مضبوط اور پرامن طرز حکومت کا قیام پاکستان کے لیے بھارت کے ساتھ معاہدے میں شرکت کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے دو لازمی عناصر بھارت اور پاکستان کے درمیان ہتھیاروں پر کنٹرول کا معاہدہ جس میں مسلح افواج کی حدود اور مقدار کا ذکر ہو بشمول ہتھیار اور ان کی تقسیم کا نظام جو پاکستان اور بھارت کو معقول دفاعی قوت دے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کے خوف سے بھی بچائے۔ اس طرز حکومت کا دوسرا اہم جزو جس کے بغیر پہلے حصے پر موثر طریقے سے عمل درآمد نہیں ہوسکتا وہ ہے کہ مسئلہ کشمیر بامعنی مذاکرات اور دوسرے ذرائع کے ذریعے حل کیا جائے جو کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی میں ثالثی کے ذریعے طے پاسکتا ہے۔ اس مسئلے کا حل سیاسی و ذہنی ماحول پیدا کرنے میں مدد دے گا۔ جو برصغیر میں جاری تباہ کن ہتھیاروں کی دوڑ کو ختم کروے گا۔ دسرے اعتماد بحال کرنے والے اقدامات (CBM) ازخود اس اہم مسئلے کے حل میں فوی طور پر مددگار ثابت ہوں گے۔